# بزمِ ارجمنداں



محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ

بزمِ ارجمنداں



محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ
غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاھور

اشاعت ——— 2006ء



مکتبہ قدوسیہ
رحمان مارکیٹ ⊙ غزنی سٹریٹ ⊙ اردو بازار ⊙ لاہور پاکستان
ابوبکر قدوسی نے موٹروے پریس سے چھپوا کر شائع کی۔
Ph:042-7230585-7351124
Email: qadusia@brain.net.pk

# ترتیب




ابتدائیہ ۵

حرفے چند ۷

حرفِ گفتنی ۹

1- مولانا ابوالکلام آزاد ۱۷

2- مولانا ثناء اللہ امرتسری ۱۳۷

3- مولانا محمد علی لکھوی ۱۹۵

4- حافظ عبداللہ روپڑی ۲۵۹

5- مفتی محمد حسن امرتسری ۲۸۹

6- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ۳۰۹

7- مولانا عبدالکریم گرنتھی ۳۳۹

8- شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی ۳۵۱

9- مولانا عبدالمجید سوہدروی ۴۰۱

10- رئیس احمد جعفری ندوی ۴۲۱

11- قاضی عبدالعزیز منصورپوری ۴۷۳

12- مولانا محمد صدیق لائل پوری ۴۹۱

13- حکیم عبدالشکور شکراوی ۵۰۳

-14 مفتی جعفر حسین ۵۱۹
-15 میاں محمد شفیع (م ش) ۵۲۷
-16 مولانا معین الدین لکھوی ۵۳۳
-17 ڈاکٹر اسرار احمد ۵۶۷
-18 مولانا عبداللہ گورداس پوری ۶۰۱
-19 ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری ۶۱۵

# ابتدائیہ



جناب محمد اسحاق بھٹی کے سوانحی خاکوں کا یہ دوسرا مجموعہ ہے جو قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے-اس سے کچھ عرصہ قبل "نقوش عظمت رفتہ" کے نام سے پہلا مجموعہ شائع ہوا تھا' جسے ملک اور بیرون ملک کے پڑھے لکھے حلقوں میں نہایت پذیرائی حاصل ہوئی- اخبارات نے اس پر بہترین تبصرے کیے' بے شمار حضرات نے خطوط کے ذریعے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور بہت سے دوستوں نے زبانی اپنے تاثرات بیان کیے ------یہ مجموعہ تھوڑے عرصے میں ختم ہو گیا تھا-اب دوبارہ شائع کیا جارہا ہے-

بھٹی صاحب کا اسلوب نگارش ایسا دلچسپ ہے کہ قاری اسے پڑھنا شروع کرے تو اس میں جذب ہو جاتا ہے- وہ جس شخصیت پر لکھتے ہیں' اس کا پورا سراپا اپنے قارئین کے سامنے لے آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس شخصیت کو اس کی تمام عادات و اطوار اور عملی سرگرمیوں کے ساتھ اپنے روبرو کھڑا اسے دیکھ رہا ہے اور اس سے محو گفتگو ہے-

لکھنے کا یہ انداز کم ہی لوگوں کے حصے میں آتا ہے- اللہ کی یہ بہت بڑی نعمت ہے جو بھٹی صاحب کو عطا فرمائی گئی ہے- ان کی زبان سلیس اور ادیبانہ ہے- حافظے کی دولت سے بھی اللہ نے ان کو خوب نوازا ہے-

بھٹی صاحب ان حضرات کے بارے میں اپنے تاثرات و مشاہدات ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں' جن سے ان کے تھوڑے یا زیادہ مراسم و تعلقات رہے ہیں یا جن سے ان کی ملاقاتیں ہوئی ہیں اور ان سے بات چیت کے مواقع ملے ہیں- ان میں سیاسی شخصیتیں بھی ہیں' تصنیف و تالیف کے دلدادہ لوگ بھی ہیں' مقرر و واعظ بھی ہیں' میدان صحافت کے شہسوار بھی ہیں اور درس و تدریس سے تعلق رابطہ رکھنے والے بھی ہیں ----- پھر ہر مسلک فقہی کے حضرات اس وسیع فہرست میں شامل ہیں- اہل حدیث بھی' شیعہ بھی اور احناف کے دیوبندی اور بریلوی نقطۂ نظر کے حاملین بھی ------ بھٹی صاحب ان میں سے

ہر ایک کے بارے میں اپنی یادداشتیں اور واقعات نہایت بے تکلفی سے صفحاتِ قرطاس پر منتقل کرتے چلے جاتے ہیں۔

بھٹی صاحب بے شک ایک خاص فقہی مسلک کے حامل ہیں اور اس پر سختی سے عامل بھی ہیں، لیکن ان کے ذہن و قلب کی دنیا بڑی وسیع ہے۔ ان کے نزدیک کسی خاص مسلک سے وابستگی کے معنے یہ ہرگز نہیں کہ دوسرے مسالک کے حاملین سے تعصب کا برتاؤ کیا جائے۔ یہ ان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے، ورنہ ہم بالعموم دیکھتے ہیں کہ کسی مسلک کے اہل قلم اور اصحابِ علم اپنے حلقۂ خاص کے علاوہ دوسرے حلقے کے کسی شخص کا ذکر نہیں کرتے، اگرچہ وہ کتنا بڑا عالم و مصنف اور معلم و مقرر ہو۔ ان کے نزدیک وہی بڑا عالم اور بڑا مسلمان ہے جو ان کے خاص حلقے سے منسلک ہے۔ دوسرے کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ذہن و فکر کو ماؤف اور محدود کر دینے والے تعصب کے اس مرض سے اللہ تعالیٰ نے بھٹی صاحب کو قطعی طور سے محفوظ رکھا ہے۔ الحمد للّٰہ علی ذالك۔

ان کے تحریر کردہ سوانحی خاکوں کا یہ مجموعہ جو "بزمِ ارجمنداں" کے نام سے لائق احترام قارئین کے زیرِ مطالعہ ہے، انیس شخصیتوں کے واقعات و حالات پر محیط ہے۔ اس مجموعے میں پندرہ حضرات وہ ہیں جو اپنی اپنی باری سے سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں اور چار اللہ کے فضل سے زندہ ہیں اور اپنے زاویۂ فکر کے مطابق عمل و حرکت کے مختلف میدانوں میں مصروفِ تگ و تاز ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور موجودین کے لیے زیادہ سے زیادہ خدمتِ علم و فن کے مواقع فراہم کرے۔ آمین

مکتبہ قدوسیہ آئندہ بھٹی صاحب کی جو کتابیں شائع کر رہا ہے، ان میں شخصیات کے تیسرے مجموعے کے علاوہ برصغیر میں اہل حدیث کی علمی، تدریسی، تصنیفی، صحافتی اور سیاسی تگ و تاز۔ بناتِ اسلام (یا خواتینِ اسلام) ارمغانِ قرآن، ارمغانِ حدیث وغیرہ شامل ہیں -----

اللہ تعالیٰ انھیں صحت و عافیت میں رکھے۔ آمین

ابوبکر قدوسی

مکتبہ قدوسیہ۔ غزنی سٹریٹ، اردو بازار۔ لاہور

6-مارچ 1999ء

# حرفے چند



اس سے پہلے ”نقوشِ عظمتِ رفتہ“ خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آچکی ہے جو ان اکیس حضرات کے سوانحی خاکوں پر مشتمل ہے، جن سے میرا کسی نہ کسی سطح پر تعلق رہا ہے۔ اب اس موضوع کا دوسرا مجموعہ ”بزمِ ارجمنداں“ کے نام سے اپنے کرم فرماؤں کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، جس اس میں انیس شخصیتوں کے چند واقعات و کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد بشرطِ زندگی ان شاء اللہ تیسرا اور چوتھا مجموعہ نذرِ قارئین کیا جائے گا۔

میرا شیوہ نہ کسی کی خواہ مخواہ مخالفت ہے، نہ بے جا حمایت۔ اصل مقصد فقط اپنی یادداشتوں کی وساطت سے بعض شخصیات سے متعلق چند باتیں حیطۂ تحریر میں لانا ہے۔ اگر قابلِ تکریم قارئین میں سے کوئی صاحب میری معروضات کے کسی حصے کو کسی کی مخالفت یا حمایت قرار دیتے ہیں تو یہ ان کا اپنا تاثر ہے، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ البتہ ضرور ہے کہ جس طرح مختلف امور و معاملات کے بارے میں ہر شخص ایک پیمانۂ فکر رکھتا ہے، میں بھی ایک پیمانۂ فکر رکھتا ہوں، جس کے اظہار کا مجھے اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح کسی اور کو حاصل ہے۔ یہ حق کوئی شخص کسی سے چھین نہیں سکتا۔ لیکن اس کے اظہار میں بعض لوگوں کی طرح کسی کا دل دکھانا، کسی کے احساس کو مجروح کرنا، کسی کے ذہن کو اذیت پہنچانا یا کسی کے بارے میں کسی نوع کی عصبیت یا عناد کا مظاہرہ کرنا میری عادت نہیں۔ میں بغیر کسی ذہنی تحفظ اور بلا کسی ادنیٰ تعصب کے بات کرنے کا عادی ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ قارئین کرام اسی نقطۂ نظر سے میری گزارشات کا مطالعہ فرمائیں گے۔

بزمِ ارجمنداں کے انیس لائقِ اکرام شرکا میں سے چار حضرات اللہ کے فضل سے زندہ ہیں۔ ذہن میں آیا کہ زندہ لوگوں نے کون سا اتنا بڑا گناہ کیا ہے کہ ان کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ چنانچہ اس مجموعے کے لیے ”تجرباً“ چار شخصیتوں کا انتخاب کیا گیا اور ان کے بارے

میں جن باتوں کا مجھے علم تھا' وہ بیان کر دی گئیں۔

میں اپنے لائق احترام اور کرم فرما بزرگ دوست جناب میرزا ادیب کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے متعلق بے حد حوصلہ افزا الفاظ تحریر فرمائے۔

میرزا صاحب برصغیر کے موجودہ ادیبوں میں سب سے قدیم دور کے ادیب اور مصنف ہیں۔ انھوں نے پچاس کے قریب کتابیں لکھی ہیں جو مختلف اداروں کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ میں نے آزادیٔ وطن سے کئی سال قبل ان کی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" پڑھی تھی اور یہ ان کی پہلی کتاب تھی جو چھوٹی عمر میں میرے مطالعہ میں آئی تھی۔ اس کتاب کے ادبی نقوش اب تک لوحِ ذہن پر مرتسم ہیں۔

میرزا صاحب پر ان شاء اللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا۔ ادبی و فنی اعتبار سے وہ ہمارے ملک کا گراں بہا سرمایہ ہیں۔ اللہ انھیں صحت و توانائی سے نوازے۔

"نقوشِ عظمتِ رفتہ" کی طرح "بزمِ ارجمنداں" بھی مکتبہ قدوسیہ نے شائع کی ہے۔ یہ مکتبہ ہمارے دوست مولانا عبدالخالق قدوسی (شہید ۲۳ مارچ ۱۹۸۷ء) نے قائم کیا تھا جو دینیات و اسلامیات سے متعلق کتابوں کی نشر و اشاعت کا بے پناہ جذبہ رکھتے تھے۔ اور انھوں نے بالخصوص عربی کی بڑی اہم کتابیں شائع کی تھیں۔ ان کے حالات اور ان کی مطبوعات کی تفصیل سے مطلع ہونے کے لیے "نقوشِ عظمتِ رفتہ" ملاحظہ کیجیے۔

ان کی شہادت کے بعد مکتبہ قدوسیہ کی زمامِ اہتمام ان کے لائق فرزند عزیزی ابو بکر نے سنبھالی۔ وہ بڑی محنت سے بہترین کتابیں شائع کر رہے ہیں جن میں قرآن' حدیث' نبی ﷺ کی سیرتِ طیبہ' فقہی مسائل' اسلامی تاریخ اور معلوماتِ عامہ کے سلسلے کی معیاری اور مفید کتابیں شامل ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں خدمتِ دین کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے۔ آمین

آئندہ مجموعوں میں بھی ان شاء اللہ چند زندہ شخصیات کا ذکر آئے گا۔

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی۔ ساندہ۔ لاہور

۲۵۔ مارچ ۱۹۹۹ء

۶۔ ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ

میرزا ادیب

# حرفِ گفتنی

یہ واقعہ کافی مدت گزرنے کے باوجود اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

ہوا یہ کہ میں ریگل کے سامنے ایک نمبر کی بس کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے ارد گرد اور بھی کئی لوگ اسی زحمت سے گزر رہے تھے۔ آخر کار بس آ گئی۔ کھڑکی تک جانا مشکل اور کھڑکی کے اندر داخل ہونا مشکل تر ------ بہر حال یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ اندر پہنچا تو کھڑے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اتنے میں ایک آواز کان میں پڑی۔

"آیئے میرزا صاحب! بیٹھ جایئے۔"

یہ آواز کدھر سے آئی ہے ------ میں سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور دوسرے ہی لمحے میں سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میرا محسن میرے قریب کھڑا تھا۔

میانہ قد' سیاہ چھوٹی داڑھی اور چہرے پر مسکراہٹ کی روشنی بکھری ہوئی۔

"آپ نے کیوں زحمت فرمائی؟" میں نے رسماً سوال کیا۔

"بعض اوقات زحمت' رحمت بن جاتی ہے۔" ان کا غیر رسمی جواب تھا۔

اگلے سٹاپ پر جو صاحب میرے ساتھ بیٹھے تھے' اتر گئے تو میں نے فوراً پیچھے ہٹ کر ان کے لیے جگہ خالی کر دی۔ اب سلسلہ گفتگو شروع کرنے میں کوئی دقت نہیں تھی۔ سب سے پہلے میں نے ان سے یہی پوچھا۔

"آپ میرا نام جانتے ہیں؟"

بولے۔ "جانتا نہ ہوتا تو پکارتا کیسے۔ میرزا ادیب کو بھلا کون نہیں جانتا۔"

خیر' آپ کا شکریہ بلکہ دہرا شکریہ کہ آپ میرا نام بھی جانتے ہیں اور آپ نے میرے لیے زحمت بھی گوارا فرمائی ہے۔ اب مزید احسان کیجیے' مجھے خود سے متعارف ہونے کا

موقع دیجیے۔"

مسکرائے اور کئی لمحے مسکراتے رہے۔

"میرا نام محمد اسحاق بھٹی ہے۔ساندہ خرد میں رہتا ہوں۔"

ان کے مسکراہٹوں میں لپٹے ہوئے چہرے پر میں نے یہ تاثر پڑھ لیا۔"کچھ اور پوچھنا ہے تو خود پوچھیے۔"

"میں کرشن نگر کے آخری سرے پر رہتا ہوں جسے چوہان روڈ کہتے ہیں" میں نے گفتگو آگے بڑھا کے لیے اپنا پتا بتا دیا۔

"یہ بھی جانتا ہوں۔" ان کی مسکراہٹیں کچھ گہری ہو گئیں۔

"وہ کیسے؟"

"آپ کے ساتھ والے گھر میں قاضی محی الدین رہتے ہیں جو آپ کے بہنوئی اور ریاست فرید کوٹ میں میرے ہمسائے تھے۔ان کے یہاں اکثر آنا جانا رہتا ہے۔"

"بہت خوب---- تو آپ کا مشغلہ کیا ہے؟"

اس وقت محمد اسحاق بھٹی صاحب نے اپنے بارے میں خاصی معلومات سے نواز دیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں بطور ایک رفیق ادارہ کے کام کرتے ہیں۔کام لکھنے پڑھنے کا ہے۔ ابن ندیم کی "الفہرست" کا ترجمہ کر چکے ہیں جو چھپ چکا ہے۔ میں "الفہرست" کا نام سن چکا تھا اور مجھے یہ بات بھی معلوم تھی کہ اردو میں اس نہایت اہم کتاب کا ترجمہ چھپ چکا ہے۔ بھٹی صاحب نے یہ انکشاف کیا تو مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت اس امر پر کہ ایک اہم شخصیت ایک عام آدمی کی طرح بس میں سفر کرتی ہے اور خوشی اس بات پر کہ اتفاق سے ایک ایسے آدمی کے قریب ہونے کا موقع مل گیا ہے جس سے ملاقات کے لیے نہ جانے کتنی زحمت اٹھانی پڑتی' زیادہ حیرت اور خوشی اس بات پر تھی کہ اسحاق بھٹی صاحب بڑے سادہ مزاج شخص محسوس ہوتے تھے۔

وہ پہلی ملاقات اور آج کا دن' وہ میرے اتنے قریب ہو چکے ہیں کہ جب بھی ان سے ان کے دفتر میں یا ہم میں سے کسی کے گھر میں ملاقات ہوتی ہے تو مجھے لامحالہ یہ احساس ہوتا ہے جیسے ایک بہت ہی پرانے دوست سے باتیں کر رہا ہوں۔وہ میرے ہم دمِ دیرینہ بن چکے ہیں۔

ان کی ایک تو سادگی مزاج نے مجھے متاثر کیا ہے اور ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کی باطنی کیفیت کیسی بھی ہو' ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹوں کے پھول کھلے رہتے ہیں۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی علمی کاوشوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ آگے چل کر کروں گا' پہلے قارئین کرام کو ان کی ابتدائی زندگی کے کچھ پہلوؤں کا علم ہونا چاہیے' یہ ضروری ہے اور اس وجہ سے ضروری ہے کہ آخر وہ کون سا ماحول تھا جس نے آغاز بلوغت میں ان کی سیرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

میرے اصرار کے باوجود انھوں نے اس طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اپنے آپ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کہتے ہیں میں کیا اور میری زندگی کیا۔ میں نے بار بار کوشش کر کے بھٹی صاحب کے کچھ حالات کریدے جو انہی کے الفاظ میں یہاں لکھ رہا ہوں۔

''۱۵ مارچ ۱۹۲۵ء کو کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ' مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ تعلیم کے سلسلے میں اگرچہ والد مکرم میاں عبدالمجید مرحوم کی کوششیں بھی کچھ کم نہ تھیں' لیکن دادا مرحوم میاں محمد اس معاملے میں بہت سخت مزاج تھے۔ وہ کھیل کود کے لیے بھی کچھ وقت دے دیتے تھے مگر ان کی اصل خواہش یہی تھی کہ زیادہ وقت حصول تعلیم ہی میں صرف کیا جائے۔

''وہ دینیات کے دلدادہ تھے۔ انھوں نے مجھے بھی اس راہ پر لگا دیا۔ یہ اگرچہ نہایت کٹھن اور مشکل راہ تھی لیکن آہستہ آہستہ تمام مشکلات دور ہوتی گئیں۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے اپنے علاقے اور علاقے سے باہر نامور اساتذہ سے کسب فیض کے مواقع ملے۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں میں نے کافی کچھ حاصل کر لیا' اس کے بعد ایک سال تک محکمہ نہر میں ملازمت کی۔ اس سے الگ ہو کر ایک سکول میں معلّمی کے فرائض انجام دینے لگا۔ ۱۹۴۶ء میں ریاست کے اندر ریاستی پرجامنڈل کی طرف سے آزادی تحریر و تقریر کی تحریک شروع ہوئی' میں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گرفتار ہو کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس تحریک میں ریاست کے آزادی پسند لوگوں کے دوش بدوش ہندوستان کے سابق صدر گیانی ذیل سنگھ نے بھی اپنا نمایاں رول ادا کیا تھا۔

''اگست ۱۹۴۷ء میں میں اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان آ گیا۔ یہاں بڑی مشکلات کا

سامنا کرنا پڑا۔ قدرت نے صبر و استقلال کی کچھ صلاحیت عطا کر دی ہے۔ ہمت سے ان تمام مشکلات کا مقابلہ کیا اور پھر اس راہ پر گام زن ہو گیا جس پر اب تک گام زن ہوں اور آخری سانس تک گام زن رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

میں مولانا بھٹی سے ان کی زندگی سے متعلق یہی کچھ اگلوا سکا ہوں۔ میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ بھٹی صاحب اپنے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے شرماتے ہیں۔ بہر حال جو کچھ انھوں نے بتایا ہے اس سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

ان کے والد گرامی اور دادا جان دونوں دینی شخصیتیں تھیں۔ والد نے کم اور دادا جان نے زیادہ ان کی ذہنی تربیت میں حصہ لیا اور انہی کی پیہم کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وہ دینی علوم کے حصول میں شب و روز مصروف ہو گئے۔

آزادیٔ فکر و نظر کے شروع ہی سے قائل تھے' چنانچہ ریاست فرید کوٹ میں جب آزادیٔ تحریر و تقریر کا آغاز ہوا تو وہ ایک لمحہ توقف کیے بغیر اس میں شامل ہو گئے۔

جو لوگ ریاستی زندگی گزار چکے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ریاست کے اندر حکومت کی نافرمانی کا مرتکب شخص سخت سے سخت سزا کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ انتظامیہ ایسے مجرم کو فوراً گرفتار کر کے جیل بھجوا دیتی تھی اور جیل میں اس پر بڑی سختی کی جاتی تھی۔ بھٹی صاحب بھی سختی کا شکار ہوئے۔

مولانا بھٹی ایک خاص مقناطیسی قوت کے مالک ہیں۔ یہ قوت عبارت ہے ان کے دلی خلوص سے۔ ہر ایک سے بڑے خلوص سے ملتے ہیں۔ سود و زیاں سے بلند ہو کر' مفادات سے الگ رہ کر۔ ان میں کسی قسم کی بھی عصبیت موجود نہیں ہے۔ میں انھیں مولانا کہہ کر مخاطب کرتا ہوں مگر خوب جانتا ہوں کہ ان میں "مولانیت" قسم کی کوئی شے نہیں ہے۔

دینی علوم میں خاصا درک رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں ان کی بصیرت گہری بھی ہے اور وسعت پذیر بھی۔ مذہبیات میں ان کی قابلیت ان کی ان تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے قرآنی آیات کی تفسیر اور علم فقہ کے سلسلے میں پیش کی ہیں ---- ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کو جب اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے لیے قرآن مجید پر توضیحی مقالوں کی ضرورت پیش آئی تو ان کی نظر انتخاب محمد اسحاق بھٹی صاحب پر ہی پڑی۔ چنانچہ ان کے مقالے قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں سے متعلق جو دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں'

اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی جلد ۱۶ (الف) میں شامل ہیں۔ان کے اس نوعیت کے اور مقالات بھی اس انسائیکلو پیڈیا میں درج ہیں۔

بھٹی صاحب کی کتاب ''الفہرست'' کا ذکر ہو چکا ہے۔ان کی کچھ اور علمی کاوشیں یہ ہیں۔

## برصغیر پاک و ہند میں علمِ فقہ:

یہ چار سو سے زائد صفحات پر محیط ہے۔اور جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہوتا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ برصغیر میں علم فقہ کی ابتدا کب ہوئی' کیوں کر ہوئی اور اس علم سے متعلق مختلف موضوعات پر کن کن اہل علم نے کیا کاوش کی اور اس کاوش کے نتیجے میں کون کون سی کتابیں منظر عام پر آئیں۔کتاب کے آغاز میں ایک مبسوط اور تفصیلی مقدمہ بھی ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ علم فقہ کیا ہے اور کب عالم وجود میں آیا اور کن حالات میں آیا۔

## فقہائے ہند:

یہ بھی بھٹی صاحب کا معرکہ آرا کارنامہ ہے۔

دس جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک کے ان فقہائے کرام کے سوانح حیات بیان کیے گئے ہیں جو مختلف اوقات میں برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے مختلف مقامات میں پیدا ہوئے۔نیز یہ کہ انھوں نے کہاں کہاں تعلیم پائی اور کیا علمی کارنامے سر انجام دیے۔ان دس جلدوں میں ان فقہائے کرام کی فقہی' علمی' تدریسی اور تصنیفی خدمات کی پوری تفصیل الگ الگ بیان کر دی گئی ہے۔

## ارمغانِ حنیف:

مولانا محمد حنیف ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ایک بڑے محترم رکن (رفیق) تھے۔بھٹی صاحب نے اپنے قابل احترام رفیق کار سے متعلق مشاہیر ملک سے مضامین لکھوا کر اس کتاب میں جمع کر دیے ہیں۔ان مضامین میں سب سے طویل مضامین خود بھٹی صاحب کے اپنے قلم سے ہیں۔مصنف نے اپنے ان مضامین میں مولانا حنیف ندوی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

مولانا بھٹی صاحب مولانا حنیف ندوی کے سچے مزاج شناس تھے' اس لیے انھوں نے اپنے بے تکلف دوست کی ان ''کم زوریوں'' کا بھی ذکر کر دیا ہے جن کا ذکر عموماً سوءِ ادب

تصور کیا جاتا ہے- مگر انھوں نے یہ ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ اسے پڑھ کر مولانا حنیف ندوی سے کچھ زیادہ ہی محبت ہو جاتی ہے-

## برصغیر میں اسلام کے اولین نقوش:

یہ ان کی وہ قابلِ ذکر کتاب ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں کتنے صحابی' کتنے تابعی اور کتنے تبع تابعین تشریف لائے- اس پر ایک طویل مقدمہ ہے جو بہت سی معلومات پر مشتمل ہے-

مولانا بھٹی صاحب نے نہ صرف کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں بلکہ کئی رسالوں کی ادارتی ذمے داریاں بھی نبھائی ہیں-

مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" اگست ۱۹۴۹ء میں جاری ہوا اور بھٹی صاحب اس کے مدیر معاون مقرر کر دیئے گئے- ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی تھے-

۱۹۵۱ء میں مولانا حنیف ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے تو "الاعتصام" کے تمام ادارتی فرائض بھٹی صاحب کے سپرد ہو گئے' انھوں نے جون ۱۹۶۵ء تک یہ فرائض بڑی خوش اسلوبی سے پورے کیے-

مولانا بھٹی نے اپنا ایک ذاتی پرچہ "منہاج" کے نام سے جاری کیا جو سہ روزہ تھا اور چودہ ماہ تک اپنی زندگی کا سفر ختم کر کے بند ہو گیا- ان کے علاوہ ایک پرچے "توحید" کی بھی ادارت کی- یہ پرچہ مولانا داؤد غزنوی کے صاحب زادے سید ابو بکر غزنوی نے جاری کیا تھا- اور ہفت روزہ تھا-

۱۲۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو محمد اسحاق بھٹی کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا اور وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہو گئے اور پھر وہاں وہ خدمات سرانجام دیں جن کا ذکر ابھی کر چکا ہوں- اس ادارے سے وہ بتیس سال وابستہ رہے- بیس بائیس برس ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ترجمان ماہنامہ "المعارف" کے ایڈیٹر رہے-

مولانا اسحاق بھٹی کا حافظہ بہت اچھا ہے- وہ اپنے ذہن میں ماضی کی یادوں کی ایک وسیع دنیا آباد کیے ہوئے ہیں- جب بھی انھیں کسی خاص شخصیت کے کسی پہلو سے متعلق

خاص باتیں لکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو انھیں ان یادوں کو ذہن کے پردوں میں سے نکال کر قلم کی نوک تک پہنچانے میں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی۔ پھر ان کا انداز بیان رواں دواں ہوتا ہے۔ جس موقعے پر بھی کوئی بات لکھ دیتے ہیں لگتا ہے یہ بات اپنے مناسب مقام پر ہی آئی ہے۔

دلچسپ پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں۔ پھر انھیں یہ ہنر بھی آتا ہے کہ جہاں کہیں محسوس کرتے ہیں کہ ان کی تحریر دیر ہضم ہونے لگی ہے تو جھٹ لطیفوں کا چورن استعمال میں لا کر اسے زود ہضم بنا دیتے ہیں۔ ان کی شگفتگی خاطر ان کی ہر تحریر میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

آدمی بیسیوں شخصیتوں کو موضوع گفتگو بنائے تو وہ کوشش کے باوجود کہیں نہ کہیں اپنی عصبیت کا اظہار کر دیتا ہے۔ یہ عمل غیر شعوری ہوتا ہے' لیکن بھٹی صاحب ہر جگہ سے مسکراتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک بدستور برقرار رہتی ہے۔ ان کی "اپنائیت" کا بھی یہی عالم رہتا ہے۔ "غیریت" ان کے یہاں کہیں بھی اپنی ناگوار جھلک نہیں دکھاتی۔

بھٹی صاحب نے اس کتاب میں اپنی کئی حیثیتیں واضح کر دی ہیں۔ وہ ایک مورخ ہیں۔ ایک مورخ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے انھوں نے بہت سی شخصیتوں کی تاریخ قلم بند کر دی ہے۔

وہ ایک خاکہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے بیسیوں شخصیتوں کی الگ الگ سیرت پر بھر پور روشنی ڈالی ہے۔ ہر شخص اپنے مزاج' اپنی افتاد طبع' اپنے رجحانات' اپنے نظریات' اپنے تصورات کے لحاظ سے دوسروں سے الگ تھلگ نظر آتا ہے۔

وہ ایک انشائیہ نگار بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں وہ اپنائیت موجود ہے جو ایک سچے انشائیہ نگار میں ہونی چاہیے۔

میں تو یہ بھی کہوں گا کہ وہ اپنی تحریر میں ایک مجلسی آدمی کے علاوہ ایک لطیفہ باز کے روپ میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور یہ ساری خوبیاں جو کتاب کے فاضل مصنف سے مختص ہیں' کتاب کو بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ بنا دیتی ہیں۔

(میرزا ادیب)

# مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۳۴ء میں جب کہ میری عمر آٹھ نو سال کی تھی' پہلی دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام اور ان کا ایک بیان سہ روزہ اخبار "مدینہ" (بجنور) میں پڑھا- یہ اخبار بہت عرصہ ہوا بند ہو چکا ہے- اس کے بعد ایک روز نامے میں ان کی تصویر دیکھی- نہایت خوب صورت تصویر تھی- ان کی ہلکی سی کھڑی مونچھیں اور فرنچ کٹ داڑھی بہت بھلی لگی- میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ جب میرے چہرے پر داڑھی آئے گی تو اسی قسم کی داڑھی اور اسی قسم کی مونچھیں رکھوں گا-

۱۹۴۳ء میں میرا چہرہ بالوں سے آشنا ہوا' اور میں نے وہی کیا' جس کا ایک مدت پہلے دل میں فیصلہ کر چکا تھا اور میں یہی کر سکتا تھا- نہ اپنے ظاہر کو ان کے ظاہر سے ہم رنگ کر سکتا تھا' نہ باطن کو ان کی بے پناہ صلاحیتوں کی آماج گاہ بنا سکتا تھا اور نہ قلب و ذہن کو ان کے اوصاف و خصوصیات کے جذب کرنے کی نعمت سے بہرہ ور کرنا میرے لیے ممکن تھا- یہ اس کی دین ہے' جسے پروردگار دے-

شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات "تذکرہ" اور "ترجمان القرآن" وغیرہ کا مطالعہ کر لیا تھا- "الہلال" کا فائل مجھے مولانا عبیداللہ احرار مرحوم نے تحفے کے طور پر دیا تھا' وہ پورا پڑھ لیا تھا- "البلاغ" بھی اول سے آخر تک دیکھ لیا تھا- تقسیم ملک سے تھوڑے دن پیشتر "الہلال" کا وہ فائل مجھ سے ایک ہندو دوست نے پڑھنے کے لیے مانگا اور پھر اسی کے پاس رہا-

مولانا کے حالات میں سب سے پہلے جو چھوٹی سی کتاب پڑھی وہ روشن لال پٹیالوی کی تصنیف تھی- اس میں لکھا تھا کہ مولانا جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل ہیں- یہ بات مہادیو ڈیسائی نے بھی لکھی ہے جو غلط ہے- پھر ابو سعید بزمی کی کتاب پڑھی جو بڑی دلچسپ تھی' اس کا نام ہے "مولانا ابوالکلام آزاد"- یہ آزادی سے بہت پہلے کی بات ہے- اس میں بزمی مرحوم نے مولانا سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے-

۱۹۳۹ء کی بات ہے کہ میں فیروزپور میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف سے علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کرتا تھا- اس زمانے میں روزانہ اخبار ایک آنے میں ملتا تھا- مجھے اخبار پڑھنے کی لت پڑ گئی تھی' لیکن روزانہ ایک آنہ خرچ کرنا مشکل تھا- ایک اور لڑکے سے بات کی تو ہم نے دو دو پیسے اکٹھے کر کے اخبار خریدنا شروع کیا- سہ روزہ "زمزم" (لاہور) اور "مدینہ" (بجنور) مولانا عطاء اللہ صاحب منگواتے تھے' وہ بھی پڑھنے کو مل جاتے تھے- یہ دونوں اخبار ملکی سیاسیات میں نیشنلزم کے حامی تھے' اور ان کا حلقہ قارئین اور دائرہ اثر بہت وسیع تھا- طویل مدت سے یہ اخبار بند ہو چکے ہیں- اب ان کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں- وہ بھی بہت کم لوگوں کو معلوم ہوں گے-

مولانا عبیداللہ احرار عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے' اور ذہنی ہم آہنگی کی بنا پر بے حد شفقت کا اظہار کرتے تھے- قیامِ پاکستان کے بعد وہ فیصل آباد آگئے تھے اور کچھ عرصے بعد مجلس احرار پاکستان کے صدر منتخب کر لیے گئے تھے- ۲۰ فروری ۱۹۷۵ء کو فیصل آباد میں ان کا انتقال ہوا- خدا غریق رحمت کرے' نہایت دلچسپ اور سراپا خلوص آدمی تھے- فیروزپور کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور چمرقند کی جماعت مجاہدین اور حریت خواہ حضرات سے ان کے خاندانی روابط تھے-

ایک دن وہ صبح صبح میرے پاس آئے اور کہا [illegible] ایکسپریس سے مولانا ابوالکلام آزاد یہاں سے گزریں گے' وہ لاہور جا رہے ہیں- [illegible] ایکسپریس صبح ساڑھے سات بجے فیروزپور ریلوے اسٹیشن پر آتی تھی- ہم بھاگم بھاگ وہاں پہنچے اور ایک ایک آنے کا پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر آگے گئے تو لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا- گاڑی آئی تو لوگوں نے [illegible] ابوالکلام آزاد زندہ باد--- امام الہند زندہ باد--- کے زوردار نعروں سے آسمان سر پر اٹھا [illegible] ادھر ادھر بھاگ کر گاڑی کے تمام ڈبے دیکھ ڈالے' مگر مولانا نہیں تھے- یہ خبر یوں ہی کسی نے اڑا دی تھی- ہم منہ لٹکائے واپس آگئے-

۱۹۴۰ء کے فروری کی کوئی تاریخ تھی کہ شام کو مولانا معین الدین لکھوی فیروزپور آئے اور میرے پاس ٹھہرے- صبح کو حسب معمول دو دو پیسے اکٹھے کر کے اخبار خریدا- اخبار کے پہلے صفحے پر یہ خبر تھی کہ مولانا آزاد لاہور تشریف لائے ہیں اور میاں افتخار الدین کی کوٹھی پر ٹھہرے ہیں--- آج تین بجے سہ پہر موچی دروازے کے باہر جلسہ عام میں تقریر

کریں گے۔

فیروز پور سے لاہور کا فاصلہ پچاس میل ہے اور اس زمانے میں وہاں سے لاہور کا کرایہ پانچ آنے تھا۔ موگا سے نندہ بس سروس اور بندہ بس سروس دو کمپنیوں کی بسیں چلتی تھیں جو فیروز پور سے ہوتی ہوئی لاہور پہنچتی تھیں۔ فیروز پور میں ان کا بس سٹینڈ ملتانی دروازے کے باہر تھا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ نندہ بس سروس کے مالک گلزاری لال نندہ تھے جنھیں پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات کے بعد عارضی طور پر ہندوستان کا وزیر اعظم بنایا گیا تھا۔ پھر دوسری دفعہ غالباً یہ اس وقت چند روز کے لیے ہندوستان کے وزیر اعظم بنائے گئے تھے، جب وہاں کی عدالت کے ایک فیصلے کے نتیجے میں اندرا گاندھی کی پارلیمنٹ کی رکنیت اور وزارت عظمیٰ ختم ہو گئی تھی۔ گلزاری لال نندہ دراصل ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے ایمن آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کی نندہ بس سروس لمبے لمبے روٹوں پر چلتی تھی۔ موگا سے لاہور اور لاہور سے سری نگر تک کی بہت سی سڑکوں پر اس کے پہیے گھومتے تھے۔

بہر حال میں اور مولانا معین الدین پانچ پانچ آنے کرایہ خرچ کر کے لاہور پہنچے اور شاہ عالم دروازے اترے جہاں ان بسوں کا اڈا تھا۔ وہاں سے پوچھ کر موچی دروازے گئے، لیکن میدان خالی تھا اور جلسے کے کوئی آثار نہ تھے۔ نہایت کوفت ہوئی کہ اتنے پیسے بھی خرچ کیے اور کوئی بات بھی نہ بنی۔ مایوسی کے عالم میں لوٹے تو اخبار فروش کی ایک دکان پر نظر پڑی۔

اس سے پوچھا:



آج کہیں مولانا ابوالکلام تقریر کر رہے ہیں؟

اس نے بتایا: مولانا تقریر تو کہیں نہیں کر رہے، البتہ گول باغ میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے انھیں چائے کی دعوت دی گئی ہے، اس میں تشریف لائیں گے۔

میں نے معین الدین سے کہا: ایک آدمی کو سارا شہر مل کر چائے پلائے گا؟ ایک آدمی نہیں پلا سکتا؟

بولے: ہمیں اس سے کیا مطلب، شاید یہاں کا یہی رواج ہو گا۔

ہم نے اخبار والے سے پوچھا: گول باغ کہاں ہے؟

اس نے بتایا: تھوڑا آگے جاؤ گے تو بائیں جانب انار کلی بازار آئے گا۔ اس کے اختتام

پر ایک سڑک آئے گی جس کا نام مال روڈ ہے-وہاں سے دائیں طرف گھوم گے تو سامنے بھنگیوں کی توپ دکھائی دے گی-اس سے چند قدم آگے گول باغ ہے-اس میں قناتیں لگی ہوں گی-

یہ سب چیزیں ہمارے لیے نئی تھیں-ہم سوچنے لگے انار کلی ---مال روڈ--- بھنگیوں کی توپ---گول باغ---یہ سب کیا بلا ہے-

معین الدین نے کہا: یہ چاروں نام اچھی طرح یاد کر لو-شاید آگے چل کر کسی سے پوچھنا پڑے-

میں نے کہا: یاد ہے' بس آگے چلیے-

بولے: دو نام میں یاد کر لیتا ہوں' انار کلی اور مال روڈ-دو تم یاد رکھو' بھنگیوں کی توپ اور گول باغ-

ہم انار کلی میں داخل ہوئے تو عجب منظر تھا-قسم قسم کے مرد اور قسم قسم کی عورتیں' اور ان کے رنگ برنگ لباس---میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا-یہ نظارہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا-

معین الدین نے میری طرف دیکھا تو بولے: کدھر دیکھ رہے ہو' سیدھے چلو-

میں نے کہا: کسی طرف نہیں دیکھ رہا-یاد کر رہا ہوں' انار کلی---مال روڈ--- بھنگیوں کی توپ---گول باغ-

ہم گول باغ پہنچے تو بے شمار آدمی جمع تھے-لوگ کاروں اور تانگوں پر آتے تھے اور اتر کر قناتوں میں داخل ہو جاتے تھے-ہماری طرح بہت سے لوگ وہاں کھڑے بھی تھے جو مولانا کو دیکھنا چاہتے تھے---اتنے میں شور ہوا: "مولانا ابوالکلام آزاد آ گئے"---ساتھ ہی نعرے گونجنے لگے-

ہم دوڑ کر ہجوم کی طرف گئے تو دیکھا کہ سڑک کے عین وسط میں سیاہ رنگ کی ایک کار ہے جو نہایت دھیمی رفتار سے چل رہی ہے-اس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے چاروں طرف بہت سے نوجوان لمبے لمبے بانسوں کی دیواریں سی بنائے کار کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں تاکہ لوگ مولانا کو دیکھنے کے بے تابانہ شوق میں یوں آگے نہ بڑھ جائیں کہ گاڑی کا چلنا مشکل ہو جائے-----اس طرح آگے جانے کا راستہ بنتا جاتا تھا-مولانا دونوں طرف

کھڑے ہوئے لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے خیر مقدمی سلام کا جواب دیتے جاتے تھے۔ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہ بچھڑ نہ جائیں' ہجوم میں گھسے اور مولانا کے بالکل قریب پہنچ گئے۔انھوں نے کندھوں پر گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔اس کے بعد زور کا دھکا لگا اور لوگ دور تک پیچھے کو چلے گئے۔

یہ مولانا کا پہلا دیدار تھا جو میں نے کیا۔وہاں سے چلے' بس سٹینڈ پر آئے اور بس پہ سوار ہو کر فیروز پور کو روانہ ہو گئے۔اس سفر میں ہمارے دس دس آنے خرچ ہوئے' لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کو دیکھنے کی بے پناہ خوشی میں ہم پھولے نہ سماتے تھے۔

دوسرے دن اخبار خریدا تو صفحہ اول پر نمایاں الفاظ میں یہ خبر دی گئی تھی کہ آج موچی دروازے کے باہر مولانا ابوالکلام آزاد جلسہ عام میں تقریر کریں گے۔ معین الدین میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔پوچھا:

کیا ارادہ ہے؟

انھوں نے معذرت کر دی اور اپنے گھر ''لکھوکے'' کے قریب ''مرکز الاسلام'' چلے گئے۔لیکن میرا عشق صادق تھا اور جیب میں دو روپے تھے۔بس سٹینڈ پر آیا' پانچ آنے کا ٹکٹ لیا' بس میں بیٹھا اور پچاس میل کا سفر طے کر کے لاہور آ اترا۔اب موچی دروازے جانا کوئی مشکل کام نہ تھا' کل اسے اچھی طرح دیکھ گیا تھا۔

جس طرف سے مولانا کو جلسہ گاہ میں داخل ہونا تھا' وہاں دونوں طرف آمنے سامنے پہلے تو احرار رضاکار سرخ قمیصیں پہنے' ہاتھوں میں کلہاڑیاں اٹھائے اور کلہاڑیوں کو ایک دوسری سے ملائے کھڑے تھے۔ان کے ساتھ اسی طرح سکھ رضاکار کرپان کے ساتھ کرپان کی نوک لگائے ہوئے تھے۔خاکسار بیلچے سے بیلچہ ملائے اور پھر ہندو نوجوان لاٹھی سے لاٹھی کا سرا جوڑے ہوئے تھے۔یہ ایک محراب سی تھی' جس کے بیچ میں سے مولانا کو گزرنا تھا۔دروازے پر ایک بڑا سا کپڑا آویزاں تھا' جس پر موٹے موٹے سنہری حروف میں مرقوم تھا۔۔۔۔۔''ہندوستان کا بے تاج بادشاہ مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد''۔

مولانا اس سے چند روز پیشتر آل انڈیا کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

بے شمار لوگ جلسہ گاہ میں موجود تھے۔دور تک انسانوں کے سر ہی سر نظر آتے تھے۔میں ہجوم میں گھس گھسا کر سٹیج کے قریب جا پہنچا۔ سٹیج پر کئی رہنما بیٹھے تھے' مرد بھی'

عورتیں بھی----ان میں سے دو کو میں پہنچانتا تھا جن کا تعلق ضلع فیروز پور کے شہر "زیرہ" سے تھا-ایک کا نام علی محمد تھا اور دوسری ان کی اہلیہ تھیں' غلام فاطمہ ---- یہ خاتون شاعرہ بھی تھیں-دونوں میاں بیوی پچاس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے-

جلسہ گاہ کے ارد گرد کے مکانوں کی چھتیں لوگوں سے بھری ہوئی تھیں-درختوں پر بھی لوگ چڑھے ہوئے تھے-میں نے وہاں نصب لاؤڈ سپیکر گنے تو چودہ تھے-اتنے میں ایک صاحب سٹیج پر آئے-گورا سرخ رنگ' خوب صورت کالی داڑھی' سفید کھدر کی پگڑی' کھدر کا کھلے پائنچے کا پاجامہ اور شیر وانی پہنے ہوئے-بارعب شخصیت کے مالک----کچھ آوازیں بلند ہوئیں' مولانا آزاد آگئے-

میرے قریب کھڑے ہوئے ایک سکھ نوجوان نے کہا: "ایہہ مولانا داؤد غزنوی نیں"-

جلسہ گاہ میں ایک شور بپا تھا' مولانا داؤد غزنوی نے مجمعے سے مخاطب ہو کر کہا:

"حضرات! مولانا ابوالکلام آزاد' جن کا آپ کو انتظار ہے' تشریف لانے والے ہیں-آپ مہربانی کر کے خاموش ہو جائیں تاکہ مولانا کی تقریر سن سکیں"-

لیکن شور بدستور جاری رہا-

سٹیج سے اعلان ہوا' اب عبدالرحیم عاجز نظم پڑھیں گے ----وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے اور مجلس احرار سے تعلق رکھتے تھے-ان کے سینے پر کتنے ہی تمغے لٹک رہے تھے-مائک پر آئے تو تمغوں کی چھنن چھنن کی آوازیں مائک میں سے گزرتی ہوئی لوگوں کے کانوں میں گونجنے لگیں-انھوں نے عالم گیر جنگ اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں پنجابی نظم پڑھی-نظم میں پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں کا نام بھی آیا' جن کی اس نظم میں مخالفت کی گئی تھی-(اس زمانے میں صوبائی وزیر اعلیٰ کو وزیر اعظم کہا جاتا تھا) عاجز کو بہت داد ملی -----ایک نظم غلام فاطمہ نے پڑھی-بڑی تیکھی اور موثر آواز تھی---"ہم تو اپنا ہی مگر گھر مانگتے ہیں"-ان کی نظم کا ایک مصرع تھا---ان کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی حکومت سے ہم کوئی اس کی چیز نہیں مانگتے-ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ ہمارا ملک ہمارے حوالے کر دے' جس پر اس نے قبضہ کر رکھا ہے-

اب اعلان ہوا' مرزا غلام نبی جانباز نظم سنائیں گے-سانولا رنگ' میانہ قد' انگریزی

کٹ کے گھنگھریالے بال' کھدر کا صاف ستھرا کرتا پاجامہ --- جانباز نے ترنم سے نظم پڑھی:

"آؤ بخاری سید احرار کی باتیں کریں"۔

اب مولانا تشریف لائے' جو لوگ بیٹھے تھے' وہ ان کو دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور جو کھڑے تھے' وہ انھیں ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے اور "مولانا ابوالکلام آزاد زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔

مولانا کرسی پر بیٹھ گئے --- مجمعے کی سطح ساکن اب متحرک ہو گئی تھی۔ مولانا داؤد غزنوی نے لوگوں سے خاموش رہنے کی اپیل کی' لیکن جلسہ گاہ میں ایک ہنگامہ بپا تھا اور ہر شخص آگے بڑھ کر مولانا آزاد کو دیکھنے اور سننے کے لیے مضطرب تھا۔ سٹیج کے پیچھے شور مچا ہوا تھا اور لوگ درختوں پر چڑھ رہے تھے۔

اعلان کیا گیا اب ملک نصر اللہ خاں عزیز کی نظم سنیے ---! ملک صاحب پرانے اور مشہور صحافی تھے اور مولانا سے بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ گونڈہ سنٹرل جیل میں قید بھی رہے۔ زندگی کا طویل عرصہ کانگرس میں گزرا۔ پھر جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے تھے۔ یہاں ان کی وہ نظم ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے اس جلسے میں پڑھی تھی۔ نظم کا عنوان تھا۔ "امام الہند" نظم خاصی طویل ہے اور اس کا ایک ایک لفظ مولانا آزاد سے محبت و عقیدت کا مظہر ہے۔ ملک صاحب نے ترنم سے پڑھنا شروع کیا اور ان کی دل کش اور پیاری آواز نے سماں باندھ دیا۔

اے امام محترم ! اے رہبر عالی مقام!
علم و تدبیر و سیاست ہیں ترے در کے غلام
تیری تحریر و خطابت نازش اسلام ہے
تیرا ہر اک لفظ گویا پارۂ الہام ہے
عزم تیرا کوہ پیکر' حزم تیرا بے مثال
صدق تیرا بے عدیل اور عدل تیرا لازوال
تجھ پہ کھولے حق نے راز و معنی ام الکتاب
فیض ہے روح القدس کا' جس سے تو ہے فیض یاب
تو علم بردار ہے اسلام کی توحید کا

تو امیں ہے اس صدی میں رتبہ تجدید کا
تجھ سے زندہ ہیں مسلماں کی روایات کہن
مستقیم و مخلص و بے خوف و ہمدرد وطن

تجھ سے قائم ہے وطن میں آبرو اسلام کی
تو لگاتا ہے لگن دل میں خدا کے نام کی
کوئی لالچ ہو تو اس لالچ میں آسکتا نہیں
آسماں بھی رفعتوں کو تیری پا سکتا نہیں

قلب مسلم میں جو نور حریت ہے موجزن
تیرے ہی قول و عمل کی شمع کی ہے وہ کرن
بے نیاز شہرت و عزت غنی مال و جاہ
اللہ ! کتنی اونچی ہے ترے دل کی نگاہ

عزم و ہمت سے اگرچہ دل ترا آسودہ ہے
فکر خدمت سے مگر تیری جبیں آلودہ ہے
استقامت میں نہ کوئی لا سکا تیری نظیر
وہ الہ آباد کا برنا ہو یا وردھا کا پیر

کانگرس کو فخر تیری فہم کا' اخلاص کا
رہنمائے محترم ہے عام کا اور خاص کا
غیر مسلم کو بھی تیری عدل پر ہے اعتبار
ہے بھرم اسلام کا تیرے سبب سے برقرار

حبذا پھر سوئے قوم بے نوا آیا ہے تو
مژدۂ لا تقنطوا پنجاب میں لایا ہے تو
آہ وہ پنجاب' جو مظلوم ہے مقہور ہے
جس میں باطل مقتدر ہے اور حق مجبور ہے

پانچ دریاؤں سے ریگستان تک سیراب ہے
کشت حریت مگر ویران ہے بے آب ہے

اس کے ایوانوں میں انسانوں کے بکتے ہیں ضمیر
کھول کر بیٹھے ہیں دکانیں شہ و میر و وزیر

جھوٹ کے صدقے میں ہوتے ہیں سروں کے سربلند
اہل حق کے واسطے پاداش حق ہے قید و بند

فرقہ پرور اس طرح پھرتے ہیں اس میں آشکار
جس طرح تاریک جنگل میں درندے نابکار

اس متاعِ ظلم کو شعلہ نوائی چاہیے
خطہ پنجاب کو بھی رہنمائی چاہیے

پھونک دے خاشاک ظلم و جبر کو تدبیر سے
آگ سی ہر سو لگا دے شعلہ تقریر سے

قافلہ ستا رہا ہے، پھر اسے ہشیار کر
سو رہی ہے ملک کی تقدیر، اسے بیدار کر

نام ہے آزاد تیرا، ہند بھی آزاد ہو
یہ غلام آباد بھی آزاد ہو، دل شاد ہو

اس نظم کے ایک ایک مصرعے پر ملک نصر اللہ خاں عزیز کو داد ملی، لیکن سنا ہے کہ ان کے کلام کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے، اس میں یہ نظم شامل نہیں کی گئی۔

نظم کے بعد مولانا تقریر کے لیے مائک پر آئے۔ اونچی دیوار کی کالے رنگ کی ٹوپی، قدرے چھوٹی موری کا پاجامہ، شیروانی زیب تن، کندھوں پر دونوں طرف لٹکتی ہوئی گرم چادر۔ دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے ہوئے ---- وہ مائک پر آئے تو ان کی زیارت کے شائقین کی آوازیں باہم ٹکرا کر پھر شور کا رنگ اختیار کر گئیں۔ انھوں نے تقریر شروع کی اور کہا: "بہنو اور بھائیو" ----!

لیکن شور بند نہیں ہوا ---- مولانا چند سیکنڈ خاموش رہے۔

پھر فرمایا: "کیا جو لوگ میری پشت کی جانب ہیں، خاموش رہیں گے؟"

یہ کہنا تھا کہ سناٹا چھا گیا۔ جو لوگ درختوں پر چڑھ رہے تھے، وہ جہاں تھے، وہیں رک گئے۔ اب وہ چمگادڑوں کی طرح درختوں سے چمٹے ہوئے تھے۔

ان دنوں یورپ کی باہر سے گوری' اندر سے کالی فضاؤں میں دوسری عالم گیر جنگ زوروں پر تھی اور اس کے لیے ہندوستان کی فوجی امداد انگریزی حکومت کے لیے نہایت ضروری تھی- مولانا نے اسی موضوع پر تقریر کی- تقریر کے بعض حصے اب بھی ذہن میں محفوظ ہیں- انھوں نے فرمایا:

یورپ جنگ کی لپیٹ میں آچکا ہے اور برٹش گورنمنٹ مشکلات کے طوفان میں گھر گئی ہے- ہمارا اس سے براہ راست تعلق ہے- وہ کامیابی کے لیے ہندوستان سے فوجی امداد حاصل کرنا چاہتی ہے- غلام ہندوستان بغیر کسی واضح یقین دہانی کے اس کی طرف دست تعاون نہیں بڑھا سکتا- جو لوگ جنگ کی ہولناکیوں' خوفناکیوں' الم ناکیوں' ہیبت ناکیوں اور وحشت ناکیوں سے واقف ہیں' انھیں اس آگ کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے بار بار سوچنا پڑے گا-

انھوں نے کہا: ہم عدم تشدد کے حامی ہیں اور ہمیشہ ہمارا یہی نقطہ نظر رہا ہے- اس سے انحراف کر کے ہم تشدد کی راہ نہیں اختیار کر سکتے-

انھوں نے فرمایا: میں اپنی آواز آپ کے کانوں تک پہنچا سکتا ہوں' آپ کے دل میں نہیں اتار سکتا- دل میں وہی اتار سکتا ہے جس نے دلوں کو پیدا کیا ہے اور علیم بذات الصدور ہے-

تقریر پینتیس (۳۵) منٹ جاری رہی- فضا بالکل ساکت و صامت اور مجمع ہمہ تن گوش---ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف نور کی چادر تنی ہوئی ہے-

مجھے مولانا کو اتنا قریب سے دیکھ کر اور ان کی تقریر سن کر جو خوشی ہوئی' وہ بیان سے باہر تھی- تقریر ختم ہوئی تو بس پر سوار ہوا اور دل میں بے انتہا مسرتیں سمیٹے فیروز پور پہنچا- دوسرے دن اخباروں میں بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ تقریر شائع ہوئی تو جھوم جھوم کر پڑھی-

مولانا آزاد کی یہ پہلی اور آخری تقریر تھی جو میں نے سنی- اس کا نشہ اب بھی باقی ہے---یہاں اس تقریر کے بارے میں ایک اور روایت بھی سنتے جایئے---!

ہندوستان کے ممتاز عالم اور دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو کے مہتمم سید ابوالحسن علی ندوی کے عزیزوں میں ایک بزرگ سید احمد الحسنی تھے جو میرے مہربان تھے- کسی زمانے

میں وہ لاہور میں مقیم تھے اور سعودی حکومت کے کلچر سنٹر میں خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی' لیکن عربی اور انگریزی میں بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ شرافت و نجابت کے اوصاف ان کو اپنے آباو اجداد سے ورثے میں ملے تھے۔ متانت و تہذیب کا پیکر اور اسلامی ثقافت کا بہترین نمونہ۔۔۔ان کی یادداشتوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور حافظہ مضبوط پایا تھا۔ لاہور سے ان کا دفتر اسلام آباد چلا گیا تھا اور وہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ لاہور آتے تو ملاقات کے لیے ہمارے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) ضرور تشریف لاتے۔ بڑی پیاری اور میٹھی باتیں کرتے تھے۔

آخری مرتبہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ادارے میں تشریف لائے۔ اس سے کچھ عرصہ بعد لاہور میں وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس ملاقات میں ان سے بہت سی باتیں ہوئیں' مولانا آزاد کی اس تقریر سے متعلق بھی گفتگو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ جس دن مولانا نے یہ تقریر کی تھی اس دن وہ لاہور میں تھے اور انھوں نے تقریر سنی تھی۔ اس وقت ان کی عمر بیس برس کے لگ بھگ تھی۔ مولانا نے تقریر کرتے ہوئے فارسی کا یہ شعر پڑھا تھا۔

گر گفتہ زعشق گہے حرف آشنا
آنہم حکایتست کہ ازما شنیدۂ

۱۹۴۶ء میں ریاست فرید کوٹ (مشرقی پنجاب) میں پرجامنڈل کی تحریک شروع کی گئی تھی' جس میں مجھ سمیت کئی افراد کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو ان دنوں آل انڈیا کانگرس کے اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو پنجاب کانگرس کے صدر تھے۔ وہ فرید کوٹ آئے اور والیٔ ریاست مہاراجا ہراندر سنگھ سے گفتگو کی تو گرفتار شدہ لوگوں کو رہا کر دیا گیا تھا' لیکن ان سے جو شرائط صلح طے ہوئی تھیں' مہاراجا ان پر قائم نہیں رہا تھا۔ اس اثنا میں ہم نے ایک میمورنڈم تیار کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں دہلی بھیجا' جس میں واقعات کی تفصیل درج تھی اور لکھا تھا کہ مہاراجا اپنے وعدے پر قائم نہیں رہا۔ یہ میمورنڈم ۱۹۴۷ء کے مارچ میں بھیجا گیا تھا۔ اس سے ڈھائی تین مہینے پہلے ۱۵ جنوری ۱۹۴۷ء کو مولانا عارضی حکومت میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے تھے۔ سکھ صاحبان اس حکومت کو "ڈنگ ٹپاؤ راج" کہا کرتے تھے جو انٹرم گورنمنٹ کا صحیح ترین پنجابی ترجمہ تھا۔

میں اور میرے ایک بزرگ دوست قاضی عبیداللہ اپنے ریاستی مسائل مولانا کے گوش گزار کرنے کی غرض سے دہلی کے لیے تیار ہوئے تو مولانا معین الدین لکھوی نے بھی ہمارے ساتھ جانے کا عزم کر لیا۔ اس سے چار سال قبل مولانا معین الدین کی شادی دہلی کے ممتاز اہل حدیث عالم دین مولانا محمد جوناگڑھی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ ہم دہلی گئے تو انہی کے مکان پر ٹھہرے۔ یہ ۲۰ جون ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ دوسرے دن ۲۱ جون کو گیارہ بجے کے قریب ہم تینوں جمعیت علمائے ہند کے دفتر پہنچے اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا سیوہاروی سے اثنائے گفتگو میں ہم نے عرض کیا کہ ہم مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ مہربانی فرما کر آپ ٹیلی فون کر کے ان سے ہماری ملاقات کی کوئی صورت پیدا کرا دیجیے۔

انھوں نے فرمایا مجھے ٹیلی فون کرنے میں کوئی عذر نہیں' مولانا میرے مہربان ہیں' لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ ٹیلی فون کرنے یا کرانے کی غلطی نہ کریں۔ مولانا خود تو ٹیلی فون سنتے نہیں' ان کے سیکرٹری اجمل خاں صاحب سنیں گے اور کہہ دیں گے مولانا مصروف ہیں' ان کے پاس ملاقات کے لیے وقت نہیں ہے۔ آپ یوں کریں کہ صبح پانچ یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ بجے مولانا کی کوٹھی پر پہنچ جائیں۔ وہ ۲۲ پرتھوی راج روڈ (نئی دہلی) میں رہتے ہیں۔ کوٹھی کے ایک دروازے پر "IN" لکھا ہے اور ایک پر "OUT"---! جس دروازے پر IN لکھا ہے' وہاں ایک گورکھا پہرے دار بیٹھا ہوگا' اسے اپنے نام کی چٹ لکھ کر دے دیں' وہ مولانا کو پہنچا دے گا اور مولانا آپ کو اندر بلا لیں گے۔ آؤٹ والے دروازے کی طرف نہ جائیں' ادھر اجمل خاں کا کمرہ ہے۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ قد لمبا اور جسم فربہ ہے۔ سر پر بال بہت کم ہیں (یعنی تقریباً ٹنڈ) کرتا اور پاجامہ پہنتے ہیں۔ اگر انھوں نے دیکھ لیا تو مولانا سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔

ہم نے مولانا سیوہاروی کا شکریہ ادا کیا اور اجازت لے کر چلے آئے۔

اس زمانے میں معروف مصنف و مدرس مولانا محمد عبدہ صاحب دہلی کے مدرسہ رحمانیہ میں فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ شام کو ہم ان سے ملنے گئے۔ انھیں بتایا کہ کل ہم مولانا آزاد سے ملنا چاہتے ہیں' یہ سن کر وہ بھی تیار ہو گئے۔ اب ہم چاروں دوسرے دن یعنی ۲۲ جون کو پانچ بج کر دس منٹ پر مولانا کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ دیکھا تو وہی نقشہ تھا جو مولانا

حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے بتایا تھا۔ مولانا معین الدین نے گورکھے پہرے دار کو چٹ دی جس پر لکھا تھا:

"وفد ریاست فرید کوٹ"

وہ چٹ لے کر اندر چلا گیا اور ہم جلدی سے کوٹھی کے برآمدے میں جا کھڑے ہوئے۔ ہمیں اجمل خاں صاحب کا ڈر تھا کہ وہ دیکھ نہ لیں۔

لیکن ہم نے ان کو دیکھ لیا تھا۔ ان کا رخ دوسری طرف تھا اور وہ ٹہل رہے تھے۔

برآمدے میں دیوار کے ساتھ لگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ابھی مولانا معین الدین نے اپنی کلّے اور طرّے والی پگڑی دیکھنا اور ٹھیک کرنا شروع کی تھی کہ گورکھا باہر آیا اور ہمیں ایک کمرے میں لے گیا۔ کہا بیٹھیے' مولانا تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے بیٹھتے ہی چاروں طرف نظر دوڑا کر کمرے کا جائزہ لیا' قالین بچھا ہوا تھا' دروازوں پر بادامی رنگ کے کھدر کے پردے لٹک رہے تھے' صوفوں پر بھی کھدر کا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ درمیان میں دیوان رکھا تھا جو اونچائی میں صوفوں سے قدرے کم تھا۔ الماریوں میں کتابیں تھیں' جن کی جلدیں نہایت خوب صورت تھیں اور سنہری حروف میں ان کے نام لکھے تھے۔ اتنے میں میرے بالکل سامنے کے دروازے کا پردہ ہلا' مولانا کمرے میں داخل ہوئے اور فرمایا: "السلام علیکم"۔

اس واقعے پر پچاس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے' لیکن یہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ مولانا نے انگوٹھے والی براؤن رنگ کے چمڑے کی چپل پہن رکھی تھی جو عام طور پر اس زمانے میں گھر میں پہنی جاتی تھی۔ اب اس چپل کا رواج نہیں رہا۔ سر پر اونچی دیوار کی سیاہ رنگ کی ٹوپی' سفید کھدر کا قدرے تنگ پائنچے کا پاجامہ' سفید کھدر کی بغیر کالر کے قمیص جس کے بٹن کھدر کے دھاگوں کو اکٹھا کر کے بنائے گئے تھے۔ اوپر کا بٹن کھلا ہوا اور آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئیں۔ ہم ایک دم کھڑے ہو گئے۔ میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کروں گا۔ خدا جانے اس کے بعد موقع ملے یا نہ ملے۔ میرے ساتھیوں نے ایک ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا جو ان کی وہابیت کی علامت تھی۔ مولانا نے بھی ان سے ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کیا' لیکن میں نے فرطِ عقیدت سے سر جھکا کر دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ مولانا نے بھی ازراہِ نوازش دونوں ہاتھوں سے مصافحہ فرمایا۔

ہم کھڑے تھے' فرمایا: "تشریف رکھیے"۔

ہم اسی طرح صوفوں پر بیٹھ گئے، جس طرح ان کی آمد سے پہلے بیٹھے تھے۔ مولانا نے چپل اتاری اور آلتی پالتی مار کر دیوان پر بیٹھ گئے۔ دیوان اونچائی میں صوفوں سے قدرے چھوٹا تھا۔ ہم نے اپنی نشست کو کچھ اونچی محسوس کیا اور یہ سوئے ادب خیال کیا کہ مولانا سے اونچی جگہ پر بیٹھیں۔ ہم صوفے سے اٹھ کر نیچے قالین پر بیٹھنے لگے تو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے فرمایا:

نہیں نہیں، آپ یہیں تشریف رکھیے۔

چنانچہ ہم تعمیل ارشاد میں صوفے پر بیٹھ گئے۔

میں نے کلائی کے اندر کی طرف گھڑی باندھ رکھی تھی اور مولانا کی گھڑی کلائی کے اوپر تھی۔ میں نے پہلا کام یہ کیا کہ گھڑی کو حرکت دے کر کلائی کے اوپر کر لیا۔

مولانا نے بیٹھتے ہی فرمایا: ''کہیے کیا ارشاد ہے؟''

میں توقع رکھتا تھا کہ اس کا جواب میرے ساتھیوں میں سے کوئی صاحب دیں گے جو عمر میں مجھ سے بڑے تھے، مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند ثانیے خاموشی رہی تو میں نے سوچا، اگر تھوڑی دیر کوئی نہ بولا تو مولانا ہمیں باہر نکال دیں گے کہ یہ گونگے میرا وقت ضائع کرنے کو یہاں آگئے ہیں، میں نے جرأت کر کے عرض کیا:

''جناب! ہم ریاست فرید کوٹ سے حاضر ہوئے ہیں، میں وہاں کی پرجامنڈل کا جنرل سیکرٹری ہوں''۔

اس کے بعد تین چار منٹ میں وہ حالات بیان کیے جن سے ہم گزر رہے تھے۔ مولانا محمد عبدہ کے پاس چھتری تھی، مولانا نے چھتری پکڑی اور اس کی موٹھ کو انگشت شہادت سے گھماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

تین مہینے قبل مارچ کے آخری ہفتے میں آپ کا میمورنڈم مجھے ملا تھا۔ میں نے اسے پڑھا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ کے راجا مکر جانے میں ماہر ہیں۔ آپ لوگوں کی گرفتاری کے زمانے میں جواہر لال وہاں گئے تھے، اور راجا سے جو شرائط طے ہوئی تھیں، ان میں ایک شرط گرفتار شدہ افراد کی رہائی تھی اور اسی دن آپ کو رہا کر دیا گیا تھا۔ یہ سب باتیں جواہر لال نے مجھے بتائی تھیں۔ لیکن اس کے بعد آپ کے میمورنڈم سے اور آج خود آپ سے معلوم ہوا کہ راجا فرید کوٹ ان شرائط پر قائم

نہیں رہے- ملک کے حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں' اس کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کا ازسر نو جائزہ لینے کی کوشش کریں- میں جواہر لال سے بات کروں گا اور اگر موقع ملا تو آپ کے راجا کے سامنے بھی مسئلے کی صحیح تصویر پیش کروں گا-

ہم حیران ہوئے کہ ہزاروں آدمی ان کے پاس آتے ہیں اور خط بھیجتے ہیں' لیکن ان کا حافظہ کتنا مضبوط ہے کہ ہم لوگوں کی معمولی سی باتیں بھی جو ان کے علم میں آئیں' انھیں ذرہ ذرہ یاد ہیں-

ہم میں سے کسی نے کہا: ہم صرف آپ سے ملاقات کے لیے اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آئے ہیں اور آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ملاقات کے لیے وقت دیا-

فرمایا: اس میں شکر گزار ہونے کی کون سی بات ہے- مسلمان کا مسلمان سے ملنا اور ملنے کے لیے کہیں آنا جانا عین عبادت ہے-

یہ بات یہیں ختم ہو گئی اور سلسلہ کلام آگے چلا-

اس زمانے میں کانگرس کے صدر آچاریہ کرپلانی تھے جو مولانا کے دورِ صدارت میں کانگرس کے جنرل سیکرٹری رہ چکے تھے- کچھ عرصہ پیشتر نواکھلی میں جو ہندو مسلم فساد ہوا تھا' وہ اس کے اسباب و وجوہ کا کھوج لگانے اور اس کی تحقیقات کے لیے وہاں گئے تھے- واپس آکر انھوں نے ورکنگ کمیٹی میں اس سے متعلق تفصیلی رپورٹ پیش کی تھی اور اخبارات میں بھی مفصل بیان دیا تھا- بعد ازاں گڑھ مکتیشر میں فساد ہوا' جس میں مسلمانوں کو شدید جانی اور مالی نقصان پہنچا تھا- میں نے عرض کیا کہ گڑھ مکتیشر میں جو فساد ہوا ہے' وہ اچاریہ کرپلانی کے اخباری بیان کا نتیجہ ہے- انھیں ورکنگ کمیٹی کو تو تفصیلی رپورٹ دینا چاہیے تھی' لیکن اخبار میں تفصیل سے بیان دینا مناسب نہ تھا- انھوں نے اس طرح بیان دیا ہے جس طرح سیکرٹری' صدر کو رپورٹ پیش کرتا ہے- وہ بھول گئے کہ اب وہ کانگریس کے جنرل سیکرٹری نہیں' صدر ہیں- ان کے بیان میں فرقہ پرستی کا زہر بھرا ہوا تھا جس کا ہندوؤں پر یہ رد عمل ہوا کہ انھوں نے گڑھ مکتیشر میں مسلمانوں کا قتل عام کیا- میں نے یہ بھی عرض کیا کہ پٹیل اور کرپلانی دونوں فرقہ پرست ہیں اور مسلمانوں کے قتل کی ذمے داری ان پر عائد ہوتی ہے-

یہ بات بہت سخت تھی، لیکن میں نے جرأت کر کے کہہ دی۔ اگر مولانا سے نہ کہی جاتی تو اور کس سے کہی جاتی۔ مولانا نے ساری بات نہایت تحمل سے سنی اور فرمایا:

میرے بھائی! اس ملک کی مٹی میں فرقہ پرستی رچی ہوئی ہے۔ پٹیل اور کرپلانی ہوں یا کوئی اور --- جو بھی اس سرزمین میں پیدا ہوا ہے، وہ اپنے دامن کو فرقہ پرستی کی آلودگی سے بچا نہیں سکا۔ میں نے مستقبل کے ہندوستان کے لیے اس کا جو حل سوچا تھا، وہ ۶۔اپریل ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن کے ممبروں کے سامنے رکھا تھا۔ اس کے بعد ۱۲۔اپریل کو اسے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں پیش کیا اور خاصی بحث کے بعد ورکنگ کمیٹی نے اسے منظور کر لیا تھا۔ پھر ۱۵۔اپریل کو ایک بیان کی صورت میں اخبارات میں شائع کرادیا تاکہ مسلمان اور دوسری اقلیتیں اس پر غور کر سکیں۔ اگر اسے مان لیا جاتا تو میرے نزدیک یہ فرقہ وارانہ مسئلے کا بنیادی حل تھا، کیوں کہ اب اہم مسئلہ ہندوستان اور برطانیہ کے سیاسی اختلافات کا نہیں رہا بلکہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔

مولانا نے گروپنگ سکیم کے سلسلے میں فرمایا کہ:

اس کی رو سے ہندوستان کے تمام صوبے اے، بی، سی تین گروپوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ میرے فارمولے سے ہندوستان کے مسلمان، اکثریت کے خدشے سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مرکز میں پانچ وزیر ہندو اور پانچ مسلمان ہوں گے۔ ایک سکھ، ایک اچھوت، ایک عیسائی اور ایک پارسی ہو گا۔ اس طرح چودہ وزرا میں سے پانچ وزیر مسلمان ہوتے اور مسلمان اقلیت کو ہندو اکثریت کے برابر نمائندگی ملتی۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جن تین یا پانچ سالوں میں جیسا بھی آئین میں فیصلہ کیا جائے، ملک کا صدر ہندو ہو گا تو وزیراعظم مسلمان ہو گا۔ صدر مسلمان ہو گا تو وزیراعظم ہندو ہو گا۔ یعنی مرکزی حکومت میں مسلمان اور ہندو برابر ہوں گے۔ میں نے یہ بھی تجویز پیش کی تھی کہ اس فارمولے کو دس سال کے لیے آزمایا جائے، اگر اس مدت میں یہ فارمولا کامیاب نہ رہا تو ملک تقسیم کر دیا جائے۔ موجودہ دور کھچاؤ کا دور ہے، اس میں تقسیم سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچے گا۔ حالات ایسی نازک منزل میں داخل ہو چکے ہیں

کہ تقسیم کے نتیجے میں جو اقلیت، اکثریت کے علاقوں میں ہو گی، وہ خطرات میں گھر جائے گی۔

مولانا نے فرمایا:

گروپنگ اسکیم جو کرپس نے پیش کی تھی، فرقہ وارانہ کشیدگی سے بچنے کے لیے یہ سکیم میں نے ہی کرپس کے حلق میں ڈالی تھی۔ میں نے یہ سب باتیں کانگریس سے منوالی تھیں۔

انھوں نے فرمایا:

میں نے لیاقت علی سے کہا تھا کہ آدھے پنجاب، آدھے بنگال، ایک سلہٹ کے ضلع اور سندھ اور سرحد کے دو صوبوں پر اکتفا نہ کرو، یہ دو صوبے تو پہلے ہی مرکز کی امداد کے محتاج ہیں۔

انھوں نے کہا: "پھر کیا کریں؟"

میں نے کہا:

"پورے پنجاب، پورے بنگال اور پورے آسام کا مطالبہ کرو، جہاں مجموعی حیثیت سے مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اگر یہ مطالبہ نہ مانا جائے تو تحریک چلاؤ، جس کا رخ برٹش گورنمنٹ کی طرف بھی ہو اور کانگریس کی طرف بھی۔ گرفتاریاں دو اور تحریک اس وقت تک جاری رکھو جب تک مطالبہ مان نہیں لیا جاتا۔ انگریز کسی ایک فریق کو حکومت دے کر نہیں جائے گا۔

مولانا نے فرمایا: لیاقت علی مان گئے تھے، لیکن آگے منوا نہ سکے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے مولانا نے فرمایا: میں نے لیاقت علی سے یہ بھی کہا تھا کہ انتظامیہ، فوج، پولیس اور دوسرے محکموں کے افسروں کے لیے پاکستان جانے کا اعلان نہ کرو، ان کو یہیں رہنے دو، البتہ جو شخص اپنی مرضی سے جانا چاہتا ہے، وہ چلا جائے۔ فوج اور پولیس میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے مسلمان اس وقت زیادہ تعداد میں ہیں، ان کا ہندوستان میں رہنا ضروری ہے۔ آزادی کے بعد ملک کے مختلف صوبوں میں بکھرے ہوئے پانچ کروڑ مسلمانوں کا تحفظ وقت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ملک جن حالات میں تقسیم ہو رہا ہے، اس کے پیش نظر آئندہ مسلمانوں کو نئی ملازمتوں کے حصول میں مشکلات پیش آئیں گی۔

مولانا نے فرمایا: میں نے لیاقت علی سے یہ بھی کہا تھا کہ مسلم لیگ کے جن بڑے رہنماؤں کا تعلق ہندوستان سے ہے' ان کو اپنے ملک کی سکونت ترک نہیں کرنی چاہیے۔ انھیں یہاں رہ کر مسلمانوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ان کی حفاظت اور خدمت کا اصل وقت اب آیا ہے۔

اثنائے گفتگو میں مولانا نے ہندوستان کی ریاستوں کا ذکر بھی کیا۔ فرمایا میری تجویز تھی کہ کشمیر اور حیدر آباد دونوں ریاستوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔

پھر کچھ تامل کے بعد ارشاد فرمایا: حیدر آباد میں بے شک مسلمان اقلیت میں ہیں' لیکن یہ ریاست ان کی تہذیب اور ثقافت کی مظہر ہے۔ کشمیر کا حکمران غیر مسلم ہے' لیکن وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔۔۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ اب تیزی کے ساتھ معاملات کچھ دوسرا رخ اختیار کر رہے ہیں۔

اس وقت یہ تو کسی کو معلوم نہ تھا کہ ہم ترکِ وطن پر مجبور ہوں گے۔ مولانا معین الدین نے سوال کیا کہ ہم لوگ جو مختلف مقامات میں دینی مدارس چلا رہے ہیں' آزاد ہندوستان میں ہمیں کس طرح کام کرنا چاہیے۔

مولانا نے اس سے چند روز پہلے لکھنو میں مسلمانوں کے ایک تعلیمی اجلاس میں مستقبل کی تعلیمی پالیسی کے بارے میں چند تجاویز پیش کی تھیں' اس کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

"اس سلسلے میں جو تجاویز میں نے لکھنو کے اجلاس میں پیش کی تھیں' وہ آپ نے پڑھی ہوں گی' دینی مدارس کے تمام حلقوں نے ان پر اطمینان کا اظہار کیا ہے۔

فرمایا: اجلاس میں دارالعلوم دیوبند کے اصحاب انتظام بھی موجود تھے' میری ان سے بات ہوئی' انھوں نے میری تائید کی اور مجھے اپنے تعاون کا یقین دلایا"۔

مولانا نے فرمایا: "اس معاملے میں آپ فکر مند نہ ہوں' آپ حالات کے مطابق کام کرتے رہو۔ (مولانا نے اسی طرح فرمایا تھا۔ دو تین مرتبہ انھوں نے بات "آپ" سے شروع کی اور "کرو" پر ختم کی) ہر شخص کو اپنی طاقت کے مطابق کام کرنا چاہیے' وہ طاقت سے زیادہ کام کرنے کا مکلّف نہیں۔ لا یکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا۔

یقین جانیے جب انھوں نے قرآن کے یہ الفاظ پڑھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ الفاظ اسی سلسلے میں اترے ہیں اور یہی ان کا شانِ نزول ہے۔

ایک موقعے پر ہمارے ایک ساتھی نے بعض مسلم لیگی لیڈروں کی مخالفت میں کچھ الفاظ کہے' لیکن مولانا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور دوسری بات شروع کر دی۔

تمام گفتگو کے دوران میری نظریں مولانا کے چہرے پر جمی رہیں اور میں ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتا اور لب و لہجے کا جائزہ لیتا رہا۔ جی چاہتا تھا' مولانا باتیں کرتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ انھوں نے گھڑی دیکھی تو باتیں کرتے ہوئے پینتالیس منٹ ہو چکے تھے۔۔۔۔ فرمایا

"آٹھ بجے کیبنٹ میٹنگ ہے' اب اجازت چاہتا ہوں"۔

یہ کہہ کر چھتری رکھ دی جو پینتالیس منٹ ان کی انگلیوں میں گھومتی رہی تھی اور کھڑے ہو گئے۔ سب نے ایک ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے پھر جوشِ عقیدت سے دونوں ہاتھ آگے کر دیے۔ انھوں نے بھی ازراہِ کرم مجھ سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔

ہم سوا پانچ بجے مولانا کے کمرے میں داخل ہوئے تھے' چھ بجے باہر نکلے۔ دیکھا تو باہر ہجومِ عاشقاں تھا۔ بہت سے سکھ' مسلمان اور ہندو ملاقات کے انتظار میں کھڑے تھے۔ کوٹھی کے گیٹ کے باہر بھی لوگ موجود تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حسد نہیں' تو رشک و رقابت کی نگاہوں سے یہ لوگ ہمیں ضرور دیکھ رہے ہوں گے۔ اجمل خاں صاحب بھی دوسری طرف کھڑے تھے۔ باہر نکلتے ہوئے انھوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ وہ ہماری کامیابی اور اپنی شکست پر حیران ہوتے ہوں گے۔

ہم اپنی اس فتح پر پھولے نہ سماتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کے لیے دل سے بے ساختہ دعا نکلتی تھی' جنھوں نے مولانا سے ملاقات کا یہ نسخہ کیمیا ہمیں بتایا تھا۔

ایک ساتھی نے کہا' اب واپس جانے کے لیے بس پر سوار ہو جائیں۔ بس آئی تو اس کو روکنے کے لیے مولانا محمد عبدہ صاحب نے چھتری سے اشارہ بھی کر دیا' لیکن وہ بس سٹاپ نہیں تھا' لہٰذا بس نہیں رکی۔ میں نے کہا' بھائی' پیدل چلیں اور مولانا نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے' مشترکہ طور پر اس کا وظیفہ پڑھیں۔

میں نے مولانا کے بارے میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ نے ان کو جہاں بے پناہ

فہم و فراست اور حسنِ بیان سے نوازا ہے' وہاں شکل و صورت کی نعمت بھی فراوانی سے عطا کی ہے اور بڑے پیار سے ان کا ہیولا تیار کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے حافظ نے یہ شعر انہی کے لیے کہا تھا:

نصاب حسن در حد کمال است
زکوتم دہ کہ مسکین و فقیرم

اس پیکرِ حسن نے ہمیں خالی ہاتھ نہیں لوٹایا تھا' اپنے افکار و دیدار کی زکوۃ سے ہمارا دامن طلب بھر دیا تھا۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دو تین دفعہ ایسا ہوا کہ دورانِ گفتگو میں مولانا نے ہمیں "آپ" سے خطاب کر کے بات شروع کی اور "کرو" پر ختم کی۔ یعنی آپ یوں کرو۔ میں اس پر انتہائی متعجب ہوا۔ جی چاہا کہ ان سے پوچھوں حضرت یہ کیا اسلوب تخاطب ہے؟ لیکن ادب مانع تھا۔ باہر آکر ساتھیوں سے کہا کہ مولانا نے ایسا کیوں کیا؟ جو بات لفظ "آپ" سے شروع کی جائے' اس کا محلِ اختتام "کریں" یا "کیجیے" ہونا چاہیے' اگر محلِ اختتام "کرو" ہے تو آغاز "تم" سے ہونا چاہیے۔

مولانا معین الدین نے ہنستے ہوئے جواب دیا کہ مولانا جب بات شروع کرتے تھے تو ہمیں "معزز مہمان" سمجھ کر "آپ" کہتے تھے' لیکن جملہ ختم کرنے پر آتے تو انھیں خیال آتا کہ یہ برخوردار ہیں' انھیں "کرو" کہنا چاہیے۔

بہرحال مولانا کا یہ اندازِ تخاطب ذہن میں رہا' جس کا بعض حضرات سے ذکر بھی کیا۔ بہت بعد میں پتا چلا کہ دلی اور اس کے ارد گرد کے بعض علاقوں کی بول چال کی گھریلو زبان میں یہ اسلوبِ تخاطب چلتا ہے جو بڑے چھوٹوں کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس سے پہلے میں "سلہٹ" کو جو بکسر سین ہے "سلہٹ" بفتح سین پڑھتا اور بولتا تھا۔ اب مولانا کی زبان سے سنا تو معلوم ہوا کہ لفظ سلہٹ سین کے کسرے کے ساتھ ہے۔

مولانا "فرقہ وارانہ" اور "ذمہ وارانہ" (واؤ سے) بولتے تھے۔ اس سے قبل' میں یہ الفاظ "فرقہ دارانہ" اور "ذمہ دارانہ" (دال سے) بولتا تھا--- مولانا داؤد غزنوی بھی واؤ سے بولتے تھے۔

یہ مولانا سے پہلی باقاعدہ نشہ آور ملاقات تھی۔ اس کا نشہ اب بھی اسی طرح ہے

جس طرح پچاس سال پہلے تھا- مولانا کی یہ باتیں اپنے وطن جا کر بے شمار لوگوں کو سنائیں- یہ میری کمزوری کہیے یا مولانا سے انتہا درجے کا تعلق خاطر اور فراوانی عقیدت کہ اب بھی کوئی دوست بات شروع کر دے تو نہایت ذوق و شوق سے تمام باتیں بتفصیل سناتا ہوں- آج آپ حضرات کو بھی اس محفل رنگیں میں شریک کر لیا-

مجھے سیاسیات سے کوئی خاص تعلق یا دلچسپی نہیں اور اس کا کوئی گوشہ بھی میرا موضوع نہیں- لہٰذا اس بحث میں ہرگز نہیں پڑوں گا کہ پچاس سال قبل کے حالات میں سیاسی نقطہ نظر سے مولانا کی یہ باتیں لائق تائید تھیں یا نہیں تھیں- میں نے جو کچھ ان سے سنا تھا' بیان کر دیا- یہ میری یادداشتوں کا حصہ تھا جسے تحریری شکل دے دی گئی ہے-----اور اس کی فقط یہی حیثیت ہے-

مولانا سے یہ ملاقات ۲۲- جون ۱۹۴۷ء کو ہوئی تھی- اس سے دو مہینے بعد ملک میں فسادات کا ہولناک سلسلہ شروع ہو گیا- ہماری ریاست فرید کوٹ میں راولپنڈی وغیرہ کے علاقوں سے اروڑے سکھ اچھی خاصی تعداد میں چلے گئے تھے جن کی وجہ سے فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا- اس سلسلے میں کچھ دوستوں کے کہنے سے میں اور قاضی عبیداللہ دہلی گئے اور ۱۳- اگست کو مولانا سے ملے- ان دنوں مولانا خود بھی بہت پریشان تھے- ہم نے ان کو اپنی ریاست کے حالات سے آگاہ کیا اور تفصیلات عرض کیں- ان دنوں اتفاق سے راجا فرید کوٹ دہلی میں تھے' مولانا نے ان سے ٹیلی فون پر بات کی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست فرید کوٹ کی حدود میں مسلمانوں کو کوئی گزند نہیں پہنچا' حالاں کہ ان دنوں پنجاب کی تمام سکھ ریاستوں اور پورے مشرقی پنجاب میں کشت و خون کا بہیمانہ کھیل جاری تھا-

یہ مولانا سے میری دوسری ملاقات تھی جو پندرہ منٹ کی تھی- اس میں ریاست فرید کوٹ کے علاوہ کوئی اور بات نہیں ہوئی-

چلتے چلتے یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ ریاست فرید کوٹ میں ایک گاؤں "ارائیاں والا" تھا- اس گاؤں کی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی جن کا تعلق ارائیں برادری سے تھا اور ان میں زیادہ تر پڑھے لکھے اور متمول لوگ تھے- بعض حضرات تو ریاست کے اچھے خاصے مناصب پر فائز تھے اور والی ریاست اور دیگر اہل کاروں کے نزدیک انھیں احترام کا مقام حاصل تھا- آزادی کے بعد پاکستان میں بھی ان میں سے بعض لوگ اونچے سرکاری عہدوں

پر متمکن ہوئے۔

اراایاں والا کی حدود میں اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات میں دو آدمی سکھوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ آزادی کے بعد پاکستان سے کچھ لوگ فرید کوٹ گئے تو وہ اپنے پہلے حکمران مہاراجا فرید کوٹ سے بھی ملے۔ انھوں نے راقم الحروف کو بتایا کہ مہاراجا نے خود ان سے اراایاں والے کے ان مقتولین کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے ان کے قتل پر بہت افسوس ہوا۔ یہ بھی کہا کہ انھیں جو اطلاعات پہنچی تھیں' ان سے پتا چلا تھا کہ وہ دونوں معزز آدمی غلطی سے مارے گئے تھے اور اس میں خود اراایاں والے کے لوگوں کی بھی غلطی تھی۔ وہ سکھوں کے ایک قافلے کو روکنے کے لیے آگے بڑھے تھے جو اس طرف سے گزر رہا تھا۔ سکھوں نے سمجھا کہ یہ لوگ ہم پر حملہ کر رہے ہیں' اس طرح وہ مارے گئے۔

مہاراجا نے کہا کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی ریاست میں کسی قسم کا فساد اور ہنگامہ بپا ہو اور ریاست کا کوئی شخص کسی کے ہاتھوں مارا جائے۔

کئی سال ہوئے ریاست فرید کوٹ کا یہ آخری حکمران مہاراجا ہراندر سنگھ وفات پا چکا ہے۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا' وہ باپ کی زندگی ہی میں عالم جوانی میں فوت ہو گیا تھا۔ اب نہ وہ ریاست رہی ہے' نہ اس کا حکمران دنیا میں موجود ہے' نہ اس کا کوئی وارث ہے اور نہ ہم اس کی رعیت ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مہاراجا ہراندر سنگھ معقول اور ہمدرد حکمران تھا۔ وہ اپنی رعایا کے سب لوگوں کو برابر کا درجہ دیتا تھا۔ سکھ' مسلمان' اچھوت' چمار وغیرہ اس کے نزدیک بہ طور رعیت کے مساوی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے آبا و اجداد کے بارے میں بھی پرانے لوگ اچھے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

سیاسیات میں ہم لوگ مہاراجا ہراندر سنگھ کے شدید مخالف تھے۔ ریاستی پرجا منڈل کی طرف سے ہم نے اس کی حکومت کے خلاف تحریک بھی چلائی اور گرفتار بھی ہوئے۔ لیکن بلاشبہ وہ بحیثیت حکمران کے بھی اور بحیثیت انسان کے بھی شریف آدمی تھا اور لوگوں سے ہمدردی اور خیر خواہی کا برتاؤ کرتا تھا۔

گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ مولانا آزاد نے ہم سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ انھوں نے لیاقت علی خاں کو مسلم اکثریت کے تمام صوبوں کا مطالبہ کرنے اور مطالبہ

منظور نہ ہونے کی صورت میں تحریک چلانے کا مشورہ دیا تھا' جس کا رخ برطانوی حکومت کی طرف بھی ہو اور کانگرس کی طرف بھی---!

۱۹۷۱ء کے دسمبر میں مشرقی پاکستان کے سقوط پر اظہار افسوس کرتے ہوئے یہ بات میں نے مولانا عطاء اللہ حنیف کے مکان پر ملک حسن علی جامعی شرق پوری مرحوم کو بتائی۔ انھوں نے میری بات سن کر کہا کہ مجھ سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر ہندوستان) نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ۱۴۔ جون ۱۹۴۷ء کو جب کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے تقسیم ہند کی قرارداد منظور کر لی تو میٹنگ سے فارغ ہو کر مولانا اسی وقت نواب زادہ لیاقت علی خاں کے پاس نئی دہلی میں ان کی قیام گاہ "گل رعنا" پہنچے۔ اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ مولانا نے اردلی سے کہا:

لیاقت علی کو میری آمد کی اطلاع دو۔

اس نے کہا: وہ سو رہے ہیں۔

مولانا نے فرمایا: انھیں جگاؤ اور کہو آزاد آئے ہیں۔

اتفاق سے بیگم رعنا لیاقت علی خاں جاگ رہی تھیں۔ انھوں نے مولانا کی آواز سنی تو جلدی سے باہر آئیں--- آداب عرض کیا اور اس وقت زحمت فرمانے کی وجہ پوچھی۔

مولانا نے فرمایا: لیاقت علی کو جگاؤ۔

لیاقت علی خاں آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور مولانا کو سلام کیا۔ مولانا نے فرمایا: ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ختم کر کے سیدھا یہاں آیا ہوں۔ تقسیم ہند کی تجویز میری مخالفت کے باوجود منظور ہو گئی ہے۔ اب تقسیم کی اس صورت کے خلاف تحریک چلاؤ--- (پھر مولانا اور لیاقت علی خاں کے درمیان وہ گفتگو ہوئی جو پہلے بیان ہو چکی ہے)

یہاں یہ عرض کر دوں کہ میں نے کئی پرانے سیاست دانوں سے سنا ہے کہ مولانا آزاد اور لیاقت علی خاں کے باہمی تعلقات بہت اچھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لیاقت علی خاں نے سیاسیات کے اس ہنگامہ خیز دور میں مولانا سے متعلق کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو ذہنی اذیت کا باعث ہو--- مولانا تو کوئی ایسی بات زبان سے نکالتے ہی نہیں تھے جو دوسرے کے لیے کسی صورت میں تکلیف دہ ہو سکتی ہو۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں پروفیسر محمد سرور جامعی ادارہ ثقافت

اسلامیہ سے منسلک تھے۔ میں بھی وہیں خدمات انجام دیتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی شکست سے دوسرے دن چوہدری فضل الٰہی (جو بعد میں پاکستان کے صدر بنائے گئے) سرور صاحب سے ملاقات کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ آئے اور اس المیے پر گفتگو کرنے لگے۔ میں بھی موجود تھا، لیکن خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ سرور صاحب نے بھی اپنے آپ کو سماعت تک محدود رکھا۔

چوہدری صاحب مرحوم نے بتایا کہ ۱۹۵۶ء میں جب وہ مغربی پاکستان اسمبلی کے سپیکر تھے، کسی حکومتی معاملے میں دہلی گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنا توان کے پروگرام میں شامل تھا، لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں حاضری دینا ان کے پروگرام کا حصہ نہ تھا۔ تاہم وہ اپنے طور پر مولانا کو سلام کرنے اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش رکھتے تھے۔ اس لیے کہ (بقول ان کے) کسی زمانے میں وہ مولانا سے بہت متاثر تھے۔ نہایت ذوق و شوق سے ان کی تقریریں سنتے اور تحریریں پڑھتے تھے۔ تحریک خلافت میں بھی ان کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ کسی زمانے میں ان کا شہر اور ضلع (گجرات) سیاسی تحریکوں بالخصوص تحریک خلافت کا مرکز رہا تھا اور مولانا کئی مرتبہ وہاں گئے تھے اور تحریک عدم تعاون کے دور میں ان کے نام سے گجرات میں آزاد ہائی سکول بنایا گیا تھا، وہ اس سکول کے طالب علم رہے تھے۔ اب دہلی گئے تو ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی باتیں سننے کو جی چاہا۔ لیکن پہلے سے وقت طے کیے بغیر ان سے ملنا مشکل تھا۔ اس لیے کہ

ایک تو وہ طبعی طور پر بہت کم آمیز تھے اور لوگوں سے زیادہ میل جول نہ رکھتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ وہ مرکزی حکومت کے وزیر تھے اور وزیر کے زیادہ تر پروگراموں کا تعلق سیکرٹری سے ہوتا ہے۔ اگر سیکرٹری کہہ دے کہ ملاقات کے لیے وقت نہیں ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ ان دنوں ہندوستان کی پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا اور مولانا اس میں مصروف تھے۔

چوہدری صاحب نے بتایا کہ ایک دن وہ پارلیمنٹ ہاؤس میں جواہر لال سے مل کر جا رہے تھے کہ دیکھا ایک کمرے کے دروازے پر مولانا کے نام کی تختی نصب ہے۔ وہ وہیں رک گئے، دروازے پر بیٹھے ہوئے سنتری سے پوچھا:

مولانا تشریف رکھتے ہیں؟

اس نے ''جی ہاں'' کہہ کر جواب دیا---اتنے میں کمرے سے ایک شخص باہر آیا تو ہم جلدی سے اندر گھس گئے- سنتری روکنے کے لیے ہمارے پیچھے دوڑا مگر ہم آگے نکل چکے تھے- مولانا تنہا بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے-ان کو سلام کیا' چند لفظوں میں اپنا تعارف کرایا اور بلا اجازت آنے پر معذرت چاہی-

فرمایا: ''تشریف رکھیے''-

ابھی بات شروع نہیں ہوئی تھی کہ اردلی آیا اور کہا باہر پنڈت جی کھڑے ہیں اور ملاقات کی اجازت چاہتے ہیں- میں حیران ہوا کہ وزیراعظم خود آیا ہے اور باہر کھڑا اجازت طلب کر رہا ہے-

فرمایا: ''آجائیں-''

جواہر لال آئے اور آداب بجالا کر بیٹھ گئے- مولانا ان کی آمد پر نہ اپنی جگہ سے اٹھے اور نہ ان سے آمد کی وجہ پوچھی-

چوہدری صاحب نے کہا: میں نے مولانا سے خیر وعافیت پوچھنے کے بعد عرض کیا: ''مولانا! آپ تو فرماتے تھے پاکستان نہیں بنے گا' بن گیا تو چل نہیں سکے گا---پاکستان بن بھی گیا ہے اور کامیابی سے چل بھی رہا ہے''-

جواہر لال خاموش بیٹھے سنتے رہے-

فرمایا: ''میرے بھائی! میں نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ پاکستان نہیں بنے گا' بن گیا تو چل نہیں سکے گا- میں اس قسم کی باتیں کرنے کا عادی نہیں- میں نے یہ کہا تھا کہ پاکستان نہیں بننا چاہیے-یہ دس کروڑ مسلمانوں کے مسئلے کا حل نہیں ہے-----اب پاکستان بن گیا ہے'لیکن میری بات یاد رکھو' ہندوستان ایک ملک تھا اور ایک ملک ہے' پاکستان ایک تجربہ ہے' اسے کامیاب بناؤ''-

چوہدری فضل الٰہی مرحوم نے یہ واقعہ سنا کر غم اور صدمے میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا: مشرقی پاکستان ختم ہونے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے یہ الفاظ کانوں میں گونج رہے اور ذہن میں گردش کر رہے ہیں:

''پاکستان ایک تجربہ ہے اسے کامیاب بناؤ-''

مولانا اپنے پرانے ساتھیوں پر شفقت فرماتے اور ان کے کام سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں ایک بزرگ خواجہ عبدالحی فاروقی تھے جو ہمارے ملک کی گراں مایہ علمی متاع تھے۔ وہ دراصل ضلع گورداس پور (پنجاب) کے باشندے تھے اور مولانا کے اس مدرسے میں خدمات انجام دیتے رہے تھے جو انھوں نے کسی زمانے میں دارالارشاد کے نام سے کلکتے میں قائم کیا تھا۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ دہلی میں استاد تفسیر مقرر ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان سے کئی سال بعد دہلی سے لاہور آئے اور اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) میں تفسیر قرآن کے پروفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔۔۔۔۔ میرے وہ مشفق تھے۔

ایک دن خواجہ صاحب نے بتایا کہ جب انھوں نے مستقل طور پر دہلی سے لاہور آنے کا فیصلہ کیا تو روانگی سے ایک روز پہلے مولانا کی خدمت میں گئے اور کہا کہ کل وہ دہلی کی سکونت ترک کر کے لاہور جا رہے ہیں۔ آئندہ ملاقات کا بظاہر کوئی امکان نہیں۔ عرصے تک آپ سے قریبی تعلق رہا ہے۔ اگر کسی موقعے پر کوئی لغزش ہوئی ہو تو معافی کی درخواست ہے۔

یہ الفاظ کہہ کر خواجہ صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، مولانا بھی آب دیدہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر فرمایا: "اللہ آپ کو ہر حال میں خوش رکھے۔ کسی زمانے میں خوب محفلیں جمتی تھیں، اب وہ دور ختم ہو گیا ہے۔ آپ یہاں سے جا رہے ہیں، میرے لائق کوئی کام ہو تو بتایے"۔

خواجہ صاحب نے بتایا کہ میں نے مولانا سے عرض کیا۔ "ایک ضروری کام ہے"۔

فرمایا: "کیا؟"

عرض کیا: "وہی چائے پلا دیجیے جو آپ کسی زمانے میں اپنے ہاتھ سے بنا کر پلایا کرتے تھے"

مولانا مسکراتے ہوئے اٹھے۔ اسی قسم کی چائے بنائی اور خود فنجانوں میں ڈالی۔ ایک فنجان مجھے دیا اور ایک خود لیا۔ پرانی یاد تازہ کرنے کے لیے سگریٹ سلگایا اور چائے کے پہلے گھونٹ کے ساتھ پہلا کش لگایا اور آخری گھونٹ کے ساتھ سگریٹ ختم کر دیا۔

خواجہ صاحب نے بتایا کہ مولانا انھیں رخصت کرنے دروازے تک آئے، بغل گیر ہوئے، مصافحہ کیا اور دعاؤں کے ساتھ خدا حافظ کہا۔۔۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔

(خواجہ صاحب کے مفصل حالات "نقوش عظمت رفتہ" میں پڑھیے)

مولانا کا سیاسیات میں ایک خاص نقطہ نظر تھا- وہ خود تو اس پر سختی سے قائم تھے' لیکن دوسروں کو (اگرچہ ان سے کتنا ہی تعلق ہوتا) اس پر عمل کرنے کے لیے کبھی نہ کہتے تھے- مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک دفعہ مولانا لاہور آئے- میں بھی ملاقات کو گیا' مولانا داؤد غزنوی بھی وہیں تھے- انھوں نے مولانا سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہیں تو ہمارے ہم خیال' لیکن کھل کر اس کا اظہار نہیں کرتے- مولانا نے فرمایا ہر شخص کا ایک طریق کار اور اسلوب عمل ہوتا ہے- وہ اسی کے مطابق اپنی منزل طے کرتا ہے-

قیام پاکستان سے تھوڑا عرصہ پہلے میں ضلع حصار (موجودہ صوبہ ہریانہ) کے ایک قصبے روڑی گیا- وہاں مولانا حکیم عبداللہ قیام پذیر تھے جو بہت سی طبی کتابوں کے مصنف تھے- ان کے والد مولانا محمد سلیمان تھے جو صالح اور متقی بزرگ تھے اور میرے دادا میاں محمد مرحوم کے دوست تھے- قیام پاکستان کے بعد وہ ضلع ملتان میں جہانیاں منڈی آکر آباد ہو گئے تھے' وہاں بھی میں ان کی خدمت میں سلام عرض کرنے کی غرض سے حاضر ہوا تھا- حکیم عبداللہ میرے کرم فرما تھے- وہ لاہور تشریف لاتے تو مجھے ضرور یاد فرماتے- پرانے بزرگوں کی وہ بہت سی باتیں سنایا کرتے تھے-

حکیم عبداللہ مرحوم کے ہاں روڑی میں ایک صاحب کو دیکھا جو لمبے تڑنگے کڑیل جوان اور متشرع و متواضع بزرگ تھے- وہ حکیم صاحب کے مہمان خانے میں کپڑے دھو رہے تھے- حکیم صاحب نے تعارف کرایا- ان کا نام چوہدری نذیر احمد تھا- اسی نواح سے غالباً ان کا تعلق تھا- دو مضامین میں انھوں نے ایم اے کیا تھا اور نائب تحصیل دار تھے- مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر تھے--- چوہدری صاحب نے کہا میں ملازمت چھوڑ رہا ہوں اور خدمت دین کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینا چاہتا ہوں- میں نے عرض کیا آپ کو ملازمت نہیں چھوڑنی چاہیے' نائب تحصیل داری اچھا خاصا منصب ہے' اس پر متمکن رہنا چاہیے- افسر نیک نیت ہو تو زیادہ بہتر طریقے سے خدمت دین ہو سکتی ہے-

انھوں نے بتایا کہ ملازمت چھوڑ کر خدمت دین کے سلسلے میں' میں نے تین علمائے کرام کو خطوط لکھے- مولانا ابوالکلام آزاد کو' مولانا سید حسین احمد مدنی کو اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو---! ان سے استفسار کیا کہ مجھے ملازمت ترک کر کے خدمت دین کے لیے وقف ہو جانا چاہیے یا نہیں؟

مولانا مدنی نے تحریر فرمایا کہ میرے نزدیک انگریز کی ملازمت جائز نہیں۔ مولانا مودودی نے لکھا کہ ملازمت سے استعفادے کر اقامت دین کی تحریک یعنی جماعت اسلامی میں شامل ہو جاؤ۔ بقول چوہدری نذیر احمد کے مولانا ابوالکلام آزاد نے تفصیل سے جواب دیا۔ انھوں نے لکھا کہ آپ کو نائب تحصیل داری کا منصب کسی صورت میں نہیں چھوڑنا چاہیے۔ معیشت کا مسئلہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں آپ کے گھریلو حالات کیسے ہیں۔ ممکن ہے ترک ملازمت سے معاشی پریشانیاں لاحق ہو جائیں۔ اس وقت کوئی شخص آپ کا معاون نہیں ہو گا' بلکہ الٹا لوگ آپ پر طعنہ زن ہوں گے۔ معلوم ہوتا ہے آپ دیانت دار افسر ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی جگہ کوئی راشی اور بددیانت افسر آ جائے اور لوگوں کو تنگ کرنا شروع کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی جگہ کوئی غیر مسلم لے لے اور مسلمانوں کو اس کے رویے سے تکلیف پہنچے۔ ملازمت چھوڑ دینا خدمت دین کے لیے شرط نہیں' حالت ملازمت میں خدمت دین زیادہ احسن طریقے سے ہو سکتی ہے اور لوگوں پر اس کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اگر کسی محکمے کا سربراہ دیانت دار ہو' تو ماتحت عملہ بھی آسانی سے بددیانتی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کی جگہ کوئی ایسا افسر آ گیا' جس نے لوگوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا تو میرے نزدیک اس کی ذمے داری آپ پر بھی عائد ہو گی۔

مولانا نے مزید لکھا کہ ہندوستان ہمارا ملک ہے اور اس میں رہنے والوں کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے' اگرچہ اس کا کوئی طریقہ ہو' انگریز ملازموں کو جو تنخواہ دیتا ہے' وہ اپنی گرہ سے نہیں دیتا' ہماری ہی کمائی سے دیتا ہے۔ اس میں اچھے لوگوں کو آنا چاہیے۔

اس خط پر چوہدری نذیر احمد تعجب کا اظہار کرتے تھے کہ مولانا آزاد انگریز کے اتنے بڑے مخالف ہونے کے باوجود اس کی ملازمت کو جائز ہی نہیں ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے مضبوط دلائل دیتے ہیں' لیکن چوہدری صاحب نے ملازمت سے استعفا دے کر جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ملتان میں مقیم ہو گئے تھے اور وہیں فوت ہوئے۔ میری ان سے لاہور میں دو تین مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔

یہ واقعہ اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہم دردی اور خیر خواہی ہر آن مولانا کے سامنے رہتی تھی بلکہ یہی ان کا پیمانہ فکر اور مقصد حیات تھا۔

۱۹۸۲ء کے اپریل میں حضرت الاستاذ مولانا عطاء اللہ مرحوم دہلی گئے۔ انھوں نے

بتایا کہ ایک دن وہ مولانا کے مزار پر گئے (مزار' میں کہہ رہا ہوں' انھوں نے قبر کہا تھا) وہاں ایک صاحب نہایت عقیدت سے کھڑے دعا مانگ رہے تھے- میں نے ان کا نام اور پتا پوچھا تو بتایا کہ وہ نئی دہلی کی مسجد کے خطیب ہیں- مولانا آزاد اس مسجد میں جمعہ پڑھا کرتے تھے- کبھی کبھی نماز فجر میں بھی تشریف لاتے تھے- ایک دن انھوں نے مولانا سے عرض کیا' حضرت آپ کسی دن قرآن مجید کی کسی آیت کا درس ارشاد فرمادیا کریں تو ہم لوگوں کو آپ سے مستفید ہونے کا موقع ملتا رہے-

فرمایا: اب ہمارا نہیں' آپ لوگوں کا زمانہ ہے----- یہ کہہ کر تشریف لے گئے-

ان خطیب صاحب کے حوالے سے مولانا عطاء اللہ مرحوم و مغفور نے بتایا کہ ایک بوڑھی عورت سفید برقعے میں مولانا کے مزار پر آیا کرتی ہے اور دیر تک یہاں بیٹھی دعا کرتی رہتی ہے----- مولانا نے بتایا اتنے میں اتفاقاً وہ عورت آگئی- خطیب نے کہا-----

"یہ ہے وہ عورت!"

خطیب صاحب نے بتایا کہ اس عورت سے ایک دن میں نے پوچھا: آپ کی مولانا سے کوئی عزیزداری ہے' آپ کو اکثر یہاں بیٹھے اور دعا کرتے دیکھا گیا ہے-

اس نے کہا: کوئی عزیزداری نہیں- جب دہلی میں قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہوا تو بے شمار لوگ مولانا کی کوٹھی پر آگئے تھے اور کوٹھی ایک کیمپ کی شکل اختیار کر گئی تھی- ان کے خرچ اخراجات مولانا ادا کرتے تھے- آہستہ آہستہ حالات ٹھیک ہوتے گئے تو سب لوگ چلے گئے اور سائبان اکھڑ گئے- میں اکیلی وہاں رہ گئی- ایک دن مولانا نے مجھ سے پوچھا:

"بہن! آپ کون ہیں' اپنے گھر کیوں نہیں چلی جاتیں-"

میں نے عرض کیا' جناب میں دہلی کے فلاں علاقے کی رہنے والی ہوں' میرے گھر پر شرنارتھیوں نے قبضہ کر لیا ہے اور میرے دو بیٹے اس ہنگامے میں مر گئے ہیں' اب میرا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا- اس لیے یہاں بیٹھی ہوں-

مولانا نے کوشش کر کے مجھے ایک مکان دلا دیا اور میں وہاں چلی گئی- میرا پتا انھوں نے ڈائری میں لکھ لیا تھا- ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مولانا میرے کھانے پینے کا سامان اور کچھ روپے بھجوادیتے تھے- میں اس کے لیے ان کے ہاں کبھی نہیں گئی- مولانا کے انتقال کے بعد مجھے پریشانی ہوئی اور سوچنے لگی کہ اب کیا ہوگا- کچھ دن گزرے تھے کہ ایک شخص آیا اور مجھے

وہی کچھ دے گیا جو مولانا دیتے تھے۔ میں نے پوچھا تم کون ہو اور یہ سب کس نے بھیجا ہے؟ اس نے بتایا کہ مولانا بہت سے لوگوں کی اسی طرح مدد کرتے تھے اور ان کے نام اور پتے ان کی ڈائری میں لکھے ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا کی ڈائری دیکھی تو یہ ذمے داری انھوں نے قبول کر لی۔ یہ سب چیزیں اور روپے انھی نے بھیجے ہیں اور ہر مہینے ملتے رہیں گے۔ چنانچہ مولانا نے میری امداد کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ جواہر لال کی موت تک جاری رہا۔

مولانا کی کوٹھی میں ان دنوں جن لوگوں نے پناہ لی تھی، ان کو شمار میں لانا مشکل ہے۔ انجمن ترقی اردو کے رہنما بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی بھی مولانا نے اس وقت مدد کی تھی اور اپنے مکان پر ٹھہرایا تھا، حالانکہ وہ مولانا سے ناراض رہتے تھے۔ اگست ۱۹۹۵ء کے "قومی زبان" (کراچی) میں "مولوی عبدالحق" کے عنوان سے جناب مظفر حسین شمیم صاحب کا ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے، جس میں مولوی عبدالحق کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو مصرح کیا گیا ہے۔ اس کا ایک اقتباس جس کا تعلق مولانا آزاد سے ہے، قارئین کی دلچسپی کے لیے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں۔

> "مولانا ابوالکلام آزاد سے مولوی عبدالحق کی ناراضی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مجھے اچھی طرح علم واطلاع ہے کہ مولانا آزاد نے انجمن کا ڈائریکٹر بننے کی کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ مولوی صاحب نے خود انجمن کے مفاد میں مولانا سے درخواست کر کے ان کا نام مجلس نظما میں دیا تھا۔ مولانا آزاد کے مولوی صاحب سے کسی قسم کے ذاتی تعلقات نہیں تھے، لیکن جب مولوی صاحب انجمن لے کر دلی چلے گئے تو جب بھی انھوں نے مولانا آزاد سے انجمن کے لیے کسی قسم کی مدد چاہی، مولانا نے انجمن کی فی سبیل اللہ مدد کی اور تقسیم ہند کے بعد دلی کے ہنگامے میں انجمن کا جو سرمایہ بچ گیا وہ محض مولانا آزاد کی ذاتی کوشش اور شرافت نفسی کا نتیجہ تھا۔ مولوی صاحب نے جب دلی کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد مولانا کے مکان پر قیام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مولانا نے نہایت خندہ پیشانی سے مولوی صاحب کو اپنے مکان پر ٹھہرایا۔"

مولانا آزاد اور مولوی عبدالحق سے متعلق اس بظاہر چھوٹے مگر درحقیقت بہت

بڑے واقعے کے بعد ایک اور واقعہ بھی سنتے جایئے، جس کا ذکر ہندوستان کے مشہور ادیب و شاعر جناب جگن ناتھ آزاد نے "قومی زبان" (کراچی) کے اگست ۱۹۹۴ء کے شمارے میں کیا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے "۔ مولوی عبدالحق یادوں کے آئینے میں"

اس مضمون سے پتا چلتا ہے کہ مولانا عبدالقادر قصوری کے ہاں بھی مولوی عبدالحق کی آمد و رفت تھی۔ جگن ناتھ آزاد اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مجھے مولوی (عبدالحق) صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع لاہور میں ملا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ مولانا عبدالقادر قصوری کے دولت کدے پر ان کا قیام تھا۔ میں ایک دوست کے ہمراہ ان کے ہاں حاضر ہوا۔ وہ انجمن اردو کی صوبائی شاخ قائم کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں پہنچا تو بہت مصروف تھے۔ اندر بلا تو لیا لیکن زیادہ وقت نہ دے سکے۔ فرمانے لگے شام کو میاں بشیر احمد کی کوٹھی پر آجانا، وہاں ایک بہت اہم جلسہ منعقد ہوگا۔ اسی جلسے میں انجمن کی صوبائی شاخ کے قیام کا باضابطہ اعلان کیا گیا تھا۔"

یہ اقتباس اس لیے دیا گیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالقادر قصوری کے باہم بڑے مستحکم عائلی تھے، مولانا آزاد کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کا ذکر آیا تو ذہن اس طرف منتقل ہو گیا کہ یہ بھی بتا دیا جائے کہ مولانا آزاد کے ساتھی مولانا عبدالقادر قصوری سے بھی مولوی عبدالحق کے مراسم تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا قصوری کی وفات ۱۶ نومبر ۱۹۴۲ء کو ہوئی تھی -----

میاں بشیر احمد سے مراد میاں بشیر احمد ہمایوں ہیں۔ رسالہ "ہمایوں" کے مالک و مدیر۔

مولانا آزاد کی وفات ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ مولانا عبدالقادر قصوری کے بڑے بیٹے مولانا محی الدین احمد قصوری کے پاس ان کے بہت سے خطوط تھے، جنھیں ایک فائل میں انھوں نے انتہائی احتیاط اور پیار سے محفوظ کر رکھا تھا۔ یہ معلوماتی اور علمی خطوط تھے۔ مجھ سے ان کی اشاعت کے متعلق انھوں نے مشورہ کیا اور پھر ان کی خواہش کے مطابق ہم دونوں مولانا غلام رسول مہر کے پاس گئے اور مہر صاحب نے مرتب کر کے چند دیگر حضرات کے خطوط کے ساتھ یہ خطوط "تبرکات آزاد" کے نام سے چھپوا دیے۔ اس سے پہلے مولانا کے جو خطوط مہر صاحب کے نام آئے تھے، وہ "نقش آزاد" کے نام سے شائع ہو چکے تھے۔

مولانا محی الدین احمد قصوری نے بتایا کہ ایک خط میں انھوں نے مولانا ابوالکلام سے سورۂ ملک کے بارے میں بعض استفسارات کیے تھے۔ مولانا آزاد نے جواب میں چالیس صفحے کا ایک مبسوط و مفصل خط لکھا تھا جو سورۂ ملک کی تفسیر پر مشتمل تھا۔ مولانا قصوری فرماتے ہیں اس خط میں مولانا آزاد نے ایسے ایسے تفسیری نکات بیان کیے تھے جو اس سے پہلے نہ کبھی کسی سے سنے تھے، نہ کہیں پڑھے تھے اور نہ ذہن میں آئے تھے۔ یہ نہایت علمی اور تحقیقی خط تھا، لیکن جب انھیں مولانا آزاد سے تعلق کے جرم میں برطانوی حکومت نے گرفتار کر کے دسوہہ (ضلع ہوشیارپور) میں تین سال کے لیے نظر بند کر دیا تو ان کی بیوی نے تمام کاغذات جمع کر کے مکان کی چھت پر رکھ دیے، تاکہ پولیس تلاشی کے لیے آئے تو ان کاغذات کو اٹھا کر نہ لے جائے۔ کئی دن وہ چھت پر پڑے رہے۔ اس اثنا میں آندھی آئی اور تمام کاغذات اڑ گئے، جن میں مولانا کی تحریر فرمودہ سورۂ ملک کی تفسیر بھی تھی۔

مولانا محی الدین احمد قصوری نے اُس حادثے کا مجھ سے کئی دفعہ ذکر کیا اور ہر دفعہ اس پر اظہار افسوس فرمایا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا آزاد کی یہ ایک بہت بڑی علمی متاع تھی جو میرے گھر سے ضائع ہو گئی۔ مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا محی الدین احمد قصوری سے مولانا آزاد کے تعلقات و مراسم کی تفصیل راقم کی کتاب ''قصوری خاندان'' میں بیان کی گئی ہے۔

مولانا ہر سوال یا ہر اعتراض کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور نہ بعض لوگوں کی طرح ہر بات کو اہم قرار دیتے تھے۔ ملک نصراللہ خاں عزیز مرحوم نے ایک دفعہ بتایا کہ میں گونڈہ جیل میں، مولانا کے ساتھ قید تھا۔ ایک دن ایک نوجوان سیاسی قیدی میرے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں انگریزی کی ایک کتاب تھی جس میں دنیا کے دیگر نظاموں پر کمیونزم کی برتری ثابت کی گئی تھی۔ تمام مذاہب بالخصوص اسلام کو اس میں ہدف تنقید ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ نوجوان اس کتاب کے مندرجات سے بہت متاثر تھا۔ اس نے اسلام پر اعتراضات کرنا شروع کر دیے اور اس سلسلے میں اس کتاب کے حوالے دینے لگا۔ میں برداشت نہ کر سکا اور اس سے الجھ پڑا۔ میری اس کمزوری سے اس نے اور فائدہ اٹھایا اور میں جذبات میں آ گیا۔ کئی دن بحث و تکرار کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے تنگ آ کر کہا کہ مولانا آزاد کے پاس چلتے ہیں اور یہ اعتراضات ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ ہم گئے تو مولانا نے فرمایا:

ہاں! میرے بھائی کیسے آنا ہوا؟

ہم دونوں نے اپنے اپنے اسلوب سے اپنی بات بیان کی۔

فرمایا: اچھا میرے بھائی یہ مسئلہ ہے۔

یہ کہہ کر اس نوجوان سے مخاطب ہوئے اور کہا:

مجھے بھی اس کتاب کے وہ حصے سنایئے جو آپ کے درمیان وجہ اختلاف بنے ہیں۔ اس نے وہ حصے پڑھنا شروع کیے' مولانا آرام سے بیٹھے سنتے رہے اور ٹھیک! ٹھیک!! کہتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے قریب اس سے کتاب سنی---- پھر فرمایا۔

کل پھر آیئے' لیکن وہ پھر نہیں گیا اور اس کے بعد اس موضوع پر اس نے کبھی گفتگو بھی نہیں کی۔ اس طرح میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

مولانا نے مجھ سے کہا: آج کل نوجوان کمیونزم سے متاثر ہیں۔ جس قسم کی بحث ان سے آپ کرتے ہیں' اس سے وہ اور تیز ہوتے ہیں۔ انداز گفتگو بدلا جائے گا تو بات بنے گی۔

ہم "وہابی" ٹھہرے' جب تک اپنے مسلک کی بات نہ کر لیں تسلی نہیں ہوتی۔ "اطمینان قلب" کے لیے اس کا ذکر ضروری ہے' لیطمئن قلبی

ایک دن میں نے مولانا داؤد غزنوی مرحوم سے کہا کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ مولانا آزاد اہل حدیث تھے اور اہل حدیث کے نزدیک رفع الیدین اور آمین بالجہر سنت ہے' کیا مولانا اس پر عامل تھے؟ (ہماری آج کل کی اہل حدیثیت اسی قسم کے چار پانچ مسائل تک محدود ہے)

۲'۳-اپریل ۱۹۵۵ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تیسری سالانہ کانفرنس لائل پور (حال فیصل آباد) میں منعقد ہو رہی تھی۔ جمعیت کی ورکنگ کمیٹی میں فیصلہ کیا گیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس میں شمولیت اور ایک اجلاس کی صدارت فرمانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ مولانا غزنوی نے تفصیلی خط ان کی خدمت میں تحریر کیا۔ مولانا آزاد نے بذریعہ تار اس کا جواب دیا اور لکھا کہ میں شکر گزار ہوں' آپ نے مجھے جمعیت اہل حدیث کی کانفرنس میں شامل ہونے اور ایک اجلاس کی صدارت کرنے کی دعوت دی' لیکن بہت مصروف ہوں اس لیے شامل نہیں ہو سکتا۔ عدم شمولیت کا مجھے افسوس ہے۔

مولانا کا یہ تار مولانا عبیداللہ احرار نے بطور تبرک اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

اب مولانا کے ان مکتوبات گرامی کے بارے میں چند الفاظ عرض کرنا چاہتا ہوں جو انھوں نے ان سطور کے راقم کو ارسال فرمائے تھے۔

۱۹ اگست ۱۹۴۹ء کو ہفت روزہ "الاعتصام" گوجرانوالہ سے جاری ہوا۔ میں اس زمانے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا ناظم دفتر تھا اور جمعیت کا دفتر لاہور میں شیش محل روڈ پر تھا۔ الاعتصام کے اجرا کے پانچ مہینے بعد فروری ۱۹۵۰ء کو مجھے دفتر کی طرف سے گوجرانوالہ بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولانا محمد حنیف ندوی تھے اور مجھے معاون ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے وہاں جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے متعدد اکابر علما و زعما کو خطوط لکھے اور ان سے "الاعتصام" کا تعارف کرایا۔ ان کے نام اخبار بھی جاری کیا۔ جن حضرات نے جو جواب دیے ان میں سے افسوس ہے زیادہ تر ضائع ہو گئے' تاہم چند بزرگوں کے خطوط میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔

۱۹۵۰ء کے آخر میں ایک خط مولانا آزاد کو لکھا' جس میں دو باتیں عرض کی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ "الاعتصام" آپ کی خدمت میں باقاعدہ پیش کیا جا رہا ہے' دوسرے یہ کہ تفسیر ترجمان القرآن کی تیسری اور آخری جلد کس مرحلے میں ہے اور کب تک اس کے مکمل ہونے کی امید ہے۔

مولانا نے ازراہ کرم جواب سے نوازا اور میرے نام مکتوب گرامی ارسال فرمایا۔ "الاعتصام" کے متعلق لکھا کہ مجھے پہنچ رہا ہے' میں اسے پڑھتا ہوں --- آپ لوگ مثبت انداز میں خدمت دین کر رہے ہیں' میری دعا ہے' اللہ اسے قبول فرمائے --- تفسیر ترجمان القرآن کے بارے میں تحریر فرمایا کہ بہت جلد مارکیٹ میں آجائے گی۔

افسوس ہے یہ خط ضائع ہو گیا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو میں نے دکھایا تو فرمایا تم خوش قسمت ہو' مولانا نے اپنے قلم سے تمھارے خط کا جواب دیا۔ تفسیر کے متعلق مولانا غزنوی نے کہا کہ مولانا نے یہ تفسیر ابھی تک نہیں لکھی۔ "بہت جلد مارکیٹ میں آجائے گی" سے ان کا مطلب یہ ہے کہ تمام مواد ان کے ذہن میں ہے اور ان کا خیال ہے کہ جب لکھنے بیٹھیں گے' تھوڑے عرصے میں یہ مواد کاغذ پر منتقل کر دیں گے' مگر ان کی مصروفیات اتنی زیادہ اور گوناگوں ہیں کہ اب اس کی تکمیل مشکل معلوم ہوتی ہے۔ مولانا غزنوی نے فرمایا کہ میں نے تفسیر کے سلسلے میں جب بھی ان سے بات کی انھوں نے یہی جواب دیا:

"بس جلد ہی مکمل ہو جائے گی۔ ذرا مصروفیتیں ختم ہوتی ہیں تو اس طرف متوجہ ہوں گا"۔

لیکن نہ مصروفیتیں ختم ہوں گی اور نہ یہ اہم کام پایہ تکمیل کو پہنچ سکے گا۔

اس سے چند روز بعد مولانا غلام رسول مہر سے بات ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ مولانا تفسیر مکمل کر چکے ہیں اور اس کا مسودہ تیار ہے' صرف نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مسودے کا کچھ حصہ مولانا نے مجھے خود دکھایا تھا۔ مولانا کی وفات کے بعد مہر صاحب مرحوم کو اصرار تھا کہ تفسیر کا مسودہ مولانا کے بھتیجے نورالدین احمد صاحب کے قبضے میں چلا گیا ہے اور وہ کسی کو نہیں دکھاتے۔ کیوں نہیں دکھاتے؟ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مہر صاحب بتایا کرتے تھے کہ مولانا کے اور بھی بعض مسودات و تحریرات نورالدین احمد نے چھپا لیے ہیں۔ وہ مولانا کے گھر میں رہتے تھے اور انھیں معلوم تھا کہ مولانا کی کون سی چیز کہاں ہے ----- افسوس ہے نورالدین احمد بھی وفات پا گئے۔

ترجمان القرآن کی دوسری جلد سورۂ المومنون کے آخر تک تھی۔ چند سال پہلے اس کے بعد کی سورۂ نور کا مسودہ مولانا کے کاغذات سے مل گیا تھا جو دوسری جلد میں آزاد ساہتیہ اکادمی دہلی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ یعنی اب ترجمان القرآن کی دوسری جلد میں سورۂ نور کی تفسیر موجود ہے۔

ایک حلقے کے بعض حضرات نے ایک زمانے میں مولانا آزاد کی مخالفت کو اپنا فرض منصبی قرار دے رکھا تھا۔ حالاں کہ اس مخالفت کی بظاہر کوئی وجہ نہ تھی۔ میں نے اور مولانا محمد حنیف ندوی نے الاعتصام میں مولانا کا دفاع کیا اور ان کے مخالفین کے حدود علم کا جائزہ لیا۔ اس سلسلے میں ۱۱۔ مئی ۱۹۵۴ء کو میں نے مولانا آزاد کو خط لکھا۔ اس خط کا جواب ان کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب محمد اجمل خاں نے دیا۔ مولانا ان دنوں ۴۔ کنگ ایڈرورڈ روڈ نئی دہلی میں اقامت گزیں تھے۔ اجمل خاں صاحب نے مجھے ۲۰۔ مئی ۱۹۵۴ء کو خط لکھا جو میرے پاس محفوظ ہے اور درج ذیل ہے۔

جناب محترم زیدت الفضائل۔ السلام علیکم

گرامی نامہ مورخہ ۱۱۔ مئی ۱۹۵۴ء حضرت مولانا کو مل گیا۔ جو سلسلہ مضامین آپ نے شروع کیا ہے' وہ بھی ان کی نظر سے گزر رہا ہے۔ مطمئن رہیے۔ بہر حال

گر نبیند بروز شپرہ چشم کے مصداق جو لوگ ہیں' ان کے سامنے یہ کہنا کہ چاند پر خاک ڈالنے سے وہ تاریک نہیں ہو سکتا' بے سود ہے۔ زیادہ۔ والسلام

نیاز مند

محمد اجمل خاں

مولانا مناظر احسن گیلانی مشہور دیوبندی عالم تھے جن کے حدود مطالعہ بہت وسیع تھے۔ انھوں نے دیوبند کے ماہانہ رسالے "دارالعلوم" میں ایک سلسلہ مضمون شروع کیا تھا جس کا عنوان تھا "احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن"۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۱ء میں شروع کیا گیا تھا جو ۱۹۵۴ء تک جاری رہا تھا۔ اس کی ایک قسط میں بتایا گیا ہے کہ جب ندوۃ العلما (لکھنؤ) سے مولانا شبلی کی علیحدگی کا واقعہ پیش آیا تو ندوہ کے طلبا نے احتجاجاً ہڑتال کر دی تھی اور تمام ہندوستان کے علمی حلقوں میں ایک شور بپا ہو گیا تھا۔ ان دنوں دہلی میں اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ملک کے بہت سے علما و زعما جمع ہوئے تھے' جن میں دیوبند' علی گڑھ اور ندوہ سے تعلق رکھنے والے حضرات سبھی شامل تھے' اس مجلس میں جو وفد دارالعلوم دیوبند سے دہلی بھیجا گیا تھا' اس میں خود مولانا مناظر احسن شامل تھے۔ مولانا ابوالکلام بھی اس مجلس میں شریک تھے۔

اس سے آگے مولانا مناظر احسن گیلانی کے الفاظ ملاحظہ ہوں جن سے مولانا ابوالکلام کے فقہی مسلک کا پتا چلتا ہے۔

"ندوہ کے اسی "یوم مشہود" کے سلسلے میں جو ایک واقعہ پیش آیا تھا' قریب قریب چالیس سال گزر جانے کے بعد آج بھی اس کی یاد تر و تازہ ہے۔ مطلب یہ ہے جیسا کہ عرض بھی کر چکا ہوں کہ اس تقریب میں یہ اتفاق کی بات تھی کہ ایک طرف دیوبند کے علما اور' دوسری طرف علی گڑھ کے زعما کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید ان دونوں طبقات میں برزخی حیثیت کہیے یا اعرافی مقام کے مالک' ندوہ کے فضلا یا سفرا اس کا کام انجام دے رہے تھے۔

"بڑے چھوٹے سب ہی سمٹ سمٹا کر ملک کے مختلف گوشوں سے جمع ہو گئے' یہ وہ زمانہ تھا کہ "الہلال" مولانا ابوالکلام آزاد کا تاریخی مجلّہ غراء نکل چکا تھا' الہلال کے توسط سے دل کا ایک خاص تعلق مولانا کی ذات سے قائم ہو چکا تھا۔ دلی پہنچنے کے بعد سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ کسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات و مکالمہ کا موقع مل جائے۔ حق سبحانہ

وتعالیٰ نے اس دشوار مسئلے کو آسان کر دیا- بغیر کسی سابقہ تعارف کے حکیم اجمل خان مرحوم کے مکان میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گیا- مولانا کے ریعان شباب کا زمانہ تھا- سیاہ کمانی کی عینک اور سر پر کافوری عمامہ اس زمانے میں باندھا کرتے تھے- فقیر اپنے ٹھیٹھ دیوبندی بانے میں حاضر ہوا تھا' سر پر سفید طاقیہ 'لمبا کرتا' خالص دیوبند کا ایک طالب علم- مگر ملنے کے ساتھ ہی مولانا غیر معمولی طور پر متوجہ ہو گئے' تا آں کہ عصر کے بعد سے مغرب تک مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے رہے' یہی اپنی زندگی میں مولانا سے پہلی ملاقات تھی اور شاید یہی آخری ملاقات بھی-

"مغرب کی نماز مولانا کے ساتھ ہی حکیم جی مرحوم کی مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی گئی- نماز میں ایک خاص لطیفہ پیش آیا- فرض میں میں نے دیکھا کہ مولانا نے "رفع الیدین" نہیں کیا- لیکن سنت میں انہی کو "رفع الیدین" کرتے ہوئے جب میں نے پایا' تو مسجد سے نکلتے ہوئے وجہ دریافت کی گئی- مولانا مسکرائے اور فرمانے لگے کہ جناب یہ بھی احادیث کی تطبیق کی ایک شکل ہے' دیوبند میں یہ توجیہ آپ نے نہ سنی ہو گی- پھر ایک تقریر کی جس کا حاصل غالباً یہی تھا کہ احادیث سے رفع و عدم رفع دونوں باتیں ثابت ہیں' ایک مقدمہ تو یہ ہوا- دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مکتوبات یعنی فرض نمازوں اور سنن و نوافل کا منجملہ دوسرے امتیازات و فروق کے ایک فرق یہ بھی ہے کہ سنن و نوافل میں گونہ حرکات کی گنجائش ہے' جن کا تحمل فرائض نہیں کر سکتے- تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ رفع و عدم رفع میں ظاہر ہے کہ رفع کا تعلق حرکت سے ہے اور عدم رفع میں سکون ہے-

"انہی تینوں مقدمات کو پیش نظر رکھ کر مولانا نے فرمایا کہ سنن و نوافل میں تو میں رفع الیدین کرتا ہوں' لیکن فرائض میں بعض اوقات نہیں کرتا-"

اس کے بعد مولانا گیلانی فرماتے ہیں' واقعی مولانا کی طرف سے مسئلہ رفع الیدین کی یہ نئی توجیہ تھی' جو اس وقت کان میں پڑی تھی' اور اس وقت تک کسی کتاب میں باوجود طویل مطالعہ کے یہ توجیہ نظر سے نہیں گزری-

سیاسیات میں مولانا کا جو نقطہ نظر تھا' ذاتی طور سے تو بلاشبہ اس پر وہ سختی سے پابند تھے' لیکن ہر شخص کو اسے اختیار کرنے کی دعوت نہیں دیتے تھے' بلکہ بعض لوگوں کو اپنے سیاسی مسلک کے بالکل الٹ عمل کی تلقین فرماتے تھے- اس ضمن کے بہت سے واقعات میں

سے ایک واقعہ لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف مرحوم نے سنایا۔

انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ مولانا نے صوبہ سرحد جاتے ہوئے ایک دن کے لیے لاہور میں قیام کیا۔ لاہور سے مولانا پشاور کے لیے ریل میں سوار ہوئے تو وہ (شیخ صاحب) بھی اس میں بیٹھ گئے' وہ مولانا سے کچھ باتیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ان سے پوچھا کہ ہمیں کس سیاسی جماعت میں شامل ہو کر کام کرنا چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے فوراً جواب دیا' مسلم لیگ میں شامل ہو کر مسلمانوں کی خدمت کیجیے۔

سیاسیات میں مولانا کے کچھ اصول تھے' جو ہر وقت ان کے پیش نگاہ رہتے تھے اور جن پر وہ عامل تھے' جس طرح وہ خود اپنے اصولوں کو ترک نہیں کرنا چاہتے تھے' اسی طرح دوسروں کے اصولوں کا بھی احترام کرتے تھے۔ میاں محمود علی قصوری بیرسٹری پاس کر کے آئے تو ان کے رجحانات مسلم لیگ کی طرف تھے۔ مولانا لاہور تشریف لائے اور مولانا عبدالقادر قصوری کے مکان پر قیام فرما ہوئے۔ انھوں نے مولانا سے کہا کہ وہ محمود علی کو مسلم لیگ سے الگ رہنے کے لیے کہیں۔

مولانا نے فرمایا: سیاسیات میں نوجوانوں کا راستہ نہیں روکنا چاہیے' جس طرف وہ اپنے علم و مطالعہ کی روشنی میں جانا چاہتے ہیں' جائیں۔ ساتھ ہی میاں محمود علی کو مخاطب ہو کر فرمایا آپ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ میاں صاحب کہا کرتے تھے کہ وہ مولانا آزاد کے کہنے سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔

یہاں میں مولانا کے سیاسی اصول کے بارے میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں' لیکن اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ جب سے وہ کانگرس میں شامل ہوئے' ہمیشہ اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے' بلکہ دو مرتبہ اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ ایک مرتبہ ۱۹۲۳ء میں' دوسری مرتبہ ۱۹۴۰ء میں۔ ۱۹۳۹ء میں قائم مقام صدر بھی بنائے گئے۔ یہ تینوں مواقع ملکی سیاست میں نہایت اہم تھے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک وہ مسلسل چھے سال صدر رہے۔ آل انڈیا کانگرس کی تاریخ میں صدارت کا یہ سب سے طویل دور ہے جو مولانا کے حصے میں آیا۔ برصغیر کی سیاست میں یہ زمانہ انتہائی اہمیت کا حامل تھا اور ملک اس وقت بے حد نازک مراحل سے گزر رہا تھا۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن یہاں آیا جس سے مولانا نے صدر کانگرس کی

حیثیت سے گفتگو کی۔ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں ان کی صدارت میں کانگرس نے "کوئٹ انڈیا" (ہندوستان خالی کرو) ریزولیوشن پاس کر کے برطانوی حکومت سے فیصلہ کن ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس کے نتیجے میں انھیں ۹۔ اگست کی شب کو گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر میں قید کر دیا گیا۔ تقریباً تین سال کے بعد ۱۵۔ جون ۱۹۴۵ء کو رہا ہوئے تو جون ہی کے مہینے میں شملہ کانفرنس شروع ہو گئی' اس میں شرکت فرمائی اور آزادیٔ ملک کے سلسلے میں کانگرس کا نقطہ نظر پیش کیا۔ پھر اپریل' مئی اور جون ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن سے بات چیت کا طویل سلسلہ چلا۔ ۱۵۔ جنوری ۱۹۴۷ء کو آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیر تعلیم مقرر کیے گئے۔

اس سے قبل بالکل ابتدائی زندگی میں مختلف اوقات میں کئی رسائل و جرائد جاری کیے۔ متعدد کے ایڈیٹر رہے۔ زندگی کے ماہ و سال میں اضافہ ہوا تو گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کئی دفعہ گرفتار ہوئے اور دس سال جیلوں میں رہے۔ بہت سی مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے اجلاسوں کی صدارت کی۔ ان میں بعض جماعتیں ملک گیر سطح کی' بعض صوبائی سطح کی اور بعض مقامی سطح کی تھیں۔ ان سب امور کی تفصیلات اردو اور انگریزی کی بہت سی کتابوں میں درج ہیں اور سیاسی و علمی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کے چھوٹے بڑے تمام گوشوں سے آگاہ ہیں' لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اس کے باوجود مولانا کم آمیز ہیں اور عام میل جول اور عوامی جلسوں اور اجتماعوں میں شریک ہونے سے گریز فرماتے ہیں۔

تقریر و تحریر میں پورے ہندوستان میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ علم و فضل میں بھی وہ اونچے مقام پر فائز تھے اور سیاسیات میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ ان کی وفات کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں ان کے بارے میں بے شمار کتابیں چھپی ہیں اور روز بروز چھپ رہی ہیں۔ ان کے افکار و خیالات اب نکھر کر لوگوں کے سامنے آ رہے ہیں اور لوگ نہایت دلچسپی سے ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ برصغیر میں جتنا کچھ ان کے بارے میں لکھا گیا ہے' کسی مذہبی اور سیاسی رہنما کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی کم آمیزی اور عوام میں آنے سے گریز نے ان کی سیاسی زندگی کو بے حد نقصان پہنچایا۔ ایک طرف وہ ایڈیٹر ہیں' مصنف ہیں' محقق ہیں' مقرر ہیں' عالم دین ہیں' سیاسی لیڈر ہیں' ادیب ہیں' لیکن دوسری طرف یہ حالت ہے کہ عوام سے دور رہتے ہیں۔ اگر وہ دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح عوام

میں آتے اور کھل کر اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے رکھتے تو آزاد برصغیر کا سیاسی نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اتنے بڑے سیاست دان کا عوام سے دور رہنا اور لوگوں سے کم آمیزی اختیار کیے رکھنا اور اسے اصول قرار دینا' سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ مولانا کو اس طرف توجہ بھی دلائی گئی اور بعض اہم شخصیتوں نے اس طرز عمل پر نہایت ادب کے ساتھ نظر ثانی کی درخواست کی 'مگر وہ اپنے انداز فکر میں تبدیلی کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ نظر ثانی کی درخواست کرنے والے حضرات میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو اس دور میں ان سے قریب تر تھے۔

اس ضمن میں چند باتیں ملک نصر اللہ خان عزیز کی زبانی سنیے! وہ اپنی کتاب "زندگانی کی گزرگاہوں میں" کے صفحہ ۹۷ پر لکھتے ہیں۔

> "مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے جو اس وقت کانگرسی علما کے پنجاب میں سرخیل تھے' مولانا سے عرض کیا کہ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کرنے کے لیے اپنی کم آمیزی میں کمی کریں۔ مولانا نے ساری بات سن کر اپنے انداز خاص میں ایک آہ بھری اور کہا: "میرے بھائی میں اصولوں کا آدمی ہوں' اگر کسی شخص کو میری رائے سے اتفاق ہے تو میں اس کا شکر گزار ہوں' اگر نہیں تو کوئی شکایت نہیں' کوئی شکایت نہیں' کوئی شکایت نہیں۔"
>
> اس سے آگے ملک صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا مرحوم کی عادت تھی کہ جس بات پر زور دینا چاہتے تھے' اس کو تین مرتبہ دہراتے تھے۔ اور "کوئی شکایت نہیں" کا جملہ انھوں نے تین مرتبہ دہرایا اور اپنے استغنا کا نقشہ کھینچ دیا' اور محسوس کرادیا کہ قوم میں محبوبیت حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے طرز عمل میں تغیر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی قیادت کے معاملے میں ان کی ناکامی کی اصل وجہ ان کا یہی طرز عمل تھا۔

مولانا نہایت بلند حوصلہ اور بدرجہ غایت صابر و ضابط تھے۔ بے شمار لوگوں نے ان کے خلاف لکھا اور ان پر شدید تنقید بلکہ تنقیص کی' مگر انھوں نے کبھی کسی کا جواب نہیں دیا' بلکہ ان کی کوشش رہی کہ کوئی اور بھی ان کا دفاع نہ کرے۔ ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ جماعت اسلامی کے ایک رکن ماہر القادری مرحوم نے اپنے ماہانہ رسالے "فاران" میں مولانا کی

زندگی کے بعض گوشوں پر لکھنا اپنے آپ پر فرض قرار دے لیا تھا۔

۱۹۵۲ء میں ہندوستان کے مشہور محقق و مصنف جناب مالک رام صاحب کراچی آئے تو ماہر صاحب نے ان کو فاران کے کچھ رسالے دیے اور ایک مضمون کے بارے میں جو مولانا کے خلاف لکھا تھا' کہا کہ یہ خاص طور پر آپ کے دیکھنے کا ہے۔

ماہر صاحب کا یہ مضمون پڑھ کر مالک رام صاحب دہلی میں مولانا کی خدمت میں گئے اور ان سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ معلومات حاصل کرنے کی وجہ بتائی اور اس سلسلے میں مضمون لکھنے کا خیال ظاہر کیا تو بقول مالک رام کے مولانا نے ان سے فرمایا:

"کیا آپ کے پاس کرنے کو کوئی اور کام نہیں کہ آپ کو لوگوں کے اعتراضات کا جواب لکھنے کی سوجھی ہے۔ یہ بالکل فضول اور بے کار کام ہے۔ اگر معترض نے کوئی صحیح بات لکھی ہے تو اپنی اصلاح کر لیجیے اور اگر غلط لکھا ہے تو اس سے درگزر کیجیے۔ اس سے آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا اور تلخی میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اس سے جو وقت بچے گا' اس میں کوئی اور مفید کام کیجیے"۔

مالک رام کہتے ہیں' مولانا نے جواب لکھنے سے سختی سے منع کر دیا اور ان کا یہ فرمان زندگی کے لیے میرا رہنما اصول بن گیا۔

یہاں مولانا آزاد کی تقریر کے بارے میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کا ایک دلچسپ لطیفہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے جو مولانا غلام رسول مہر کے حوالے سے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے اپنی تصنیف "مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت" کے صفحہ ۲۷ پر نقل کیا ہے۔ مہر صاحب بیان فرماتے ہیں۔

> مولانا (آزاد) نے پہلی مرتبہ انجمن (حمایت اسلام لاہور) کے سالانہ اجلاس میں تقریر فرمائی تھی تو وہ عمر کی سولھویں منزل میں تھے۔ اس زمانے میں انجمن کے اسٹیج پر ممتاز اصحاب علم و فن کو بھی بہ مشکل بار ملتا تھا۔ یہ تقریر اتنی مسلسل' مربوط اور عام تقریروں سے بہ ہر لحاظ اتنی مختلف تھی کہ مولانا ثناء اللہ مرحوم و مغفور نے فرمایا:
>
> "ہم تو تھے پسنجر ٹرین' ہمارے بعد کلکتہ میل آ رہی ہے۔"

اس زمانے میں کلکتہ میل کو رفتار کی تیزی اور ہنگامہ خیزی کے باعث تمام ٹرینوں پر بہ درجہا فوقیت حاصل تھی۔ مولانا آزاد کے وطن کی نسبت سے "کلکتہ میل" کے ساتھ

تشبیہ میں جو لطف تھا' وہ تشریح سے بے نیاز ہے۔

مہر صاحب کہتے ہیں "یہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ تھا۔ آئندہ سال مولانا دوسری مرتبہ انجمن کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۰۵ء میں شریک ہوئے۔ ۲۲۔ اپریل کو انھوں نے تقریر فرمائی۔ اس کا موضوع تھا "اسلام زمانہ آئندہ میں" اس وقت مولانا سترھویں سال میں تھے۔ یہ تقریر اس قدر پسند کی گئی کہ صدر اجلاس نے حاضرین کو خوش خبری سنائی "آزاد کل پھر تقریر کریں گے" ۔۔۔ چنانچہ ۲۳۔ اپریل کو مولانا نے دوبارہ تقریر کی۔ انجمن کی روداد مظہر ہے کہ تقریر پر صدر اجلاس نے لیکچرار کی خوش بیانی کی داد دی اور ان کی درازیٔ عمر کے لیے دعا کی"۔

مشاہیر کے حالات و سوانح اور واقعات و کوائف کے سلسلے میں مولانا کے مکتوبات کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہمارے دور کے اکابر کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ علامہ اقبال' سید سلیمان ندوی' مولانا محمد علی جوہر' مولانا عبدالماجد دریا بادی اور دیگر بہت سے حضرات کے مکتوبات گرامی نہایت اہتمام سے جمع کیے گئے اور شائع ہو کر شائقین کے علم و مطالعہ میں آئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات بھی متعدد اصحاب کی سعی و کوشش سے اشاعت پذیر ہوئے اور لوگوں نے دلچسپی سے ان کا مطالعہ کیا۔ ان اکابر کے کتنے ہی ایسے مکتوبات ان کے عقیدت مندوں کی تحویل میں ہوں گے جو ابھی کسی کتاب یا رسالے یا مجموعے میں نہیں چھپے ہوں گے۔ آئندہ سطور میں مولانا ابوالکلام آزاد کے پانچ مکتوب پیش خدمت ہیں' ان کے مطالعہ سے پہلے چند تمہیدی الفاظ پڑھ لیجیے۔

ستمبر ۱۹۸۳ء میں مجھے بہاول پور سے جناب محمد کامران فاروقی صاحب کا خط موصول ہوا' جس میں لکھا تھا کہ مولوی فضل محمد ۲۶۔ جولائی ۱۹۸۳ء کو انتقال کر گئے ہیں۔ ان کے نام "المعارف" آتا تھا' ان کی مدت خریداری ختم ہونے کے بعد ان کے نام رسالہ نہ بھیجا جائے۔

محمد کامران فاروقی نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ مولوی فضل محمد (سابق ریاست بہاول پور میں سول جج تھے اور ان کے والد مولوی فیض محمد ڈسٹرکٹ جج تھے۔ مولوی فضل محمد نے بہاول پور کے محلّہ قاضیاں میں جہاں وہ سکونت پذیر تھے' ایک لائبریری قائم کی تھی جس کا نام اپنے باپ کے نام کی نسبت سے الفیض لائبریری رکھا تھا۔ یہ لائبریری کئی ہزار کتابوں پر مشتمل ہے' جس میں بہت سی نایاب کتابیں' سیکڑوں کی تعداد میں پرانے رسائل و

جرائد، متعدد مشاہیر اہل علم کے غیر مطبوعہ خطوط اور تقریباً ایک سو قلمی کتابیں موجود ہیں۔ یعنی یہ لائبریری نوادر ونایاب یا کم یاب اشیا کا دل آویز مجموعہ ہے۔

انھوں نے خط میں وضاحت کی تھی کہ مولوی فضل محمد کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے، وہ ان کے بھانجے ہیں اور کالج میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ فارغ وقت میں وہ لائبریری کی کتابیں ترتیب دیتے ہیں اور ان مختلف رسائل و مکتوبات کو جو بکھرے پڑے ہیں ایک جگہ جمع کر رہے ہیں اور ان کی گرد و غبار جھاڑ کر الگ الگ مرتب کرنے کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔

اپنے خط میں انھوں نے اشارہ کیا تھا کہ وہ یہ لائبریری اور تمام مکتوبات و رسائل کسی علمی ادارے کو دینا چاہتے ہیں تاکہ اہل علم اس سے مستفید ہو سکیں۔

انھوں نے بتایا تھا کہ مکتوبات کے اس مجموعے میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر ہندوستان) مولانا حسرت موہانی، مولانا غلام رسول مہر اور دیگر بہت سی مشہور شخصیتوں کے خطوط موجود ہیں اور یہ وہ خطوط ہیں، جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔

انھوں نے لکھا تھا کہ اگر آپ "المعارف" میں ان مکتوبات میں سے کسی بزرگ کا کوئی مکتوب چھاپنا چاہیں تو اس کی فوٹو کاپی بھیج دی جائے گی۔

کامران فاروقی صاحب کا یہ خط پڑھ کر مجھے نہایت خوشی ہوئی۔ اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر پروفیسر محمد سعید شیخ تھے۔ میں نے یہ خط ان کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کی کہ کسی اہل علم کو بہاول پور بھیج کر الفیض لائبریری کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں اور اس ذخیرۂ علمی کو ادارے میں منتقل کرنے کی سعی کی جائے، لیکن افسوس ہے میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ یہ ہوا کہ میں نے کامران صاحب سے خط و کتابت جاری رکھی اور ان سے بعض مشاہیر کے خطوط کی فوٹو کاپیاں حاصل کر لیں اور پھر یہ خطوط "المعارف" کے دسمبر ۱۹۸۳ء --- فروری، مارچ ۱۹۸۴ء اور اپریل، مئی ۱۹۸۵ء کے شماروں میں شائع کیے گئے۔

دسمبر ۱۹۸۴ء میں مجھے اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی طرف سے خط آیا کہ میں کیم

جنوری ۱۹۸۵ء کو وہاں پہنچوں اور ایم اے کے بعض مضامین کا زبانی امتحان لوں - سفر سے میں بہت گھبراتا ہوں' لیکن وہاں پہنچا' زیادہ تر باعث کشش الفیض لائبریری تھی - یونیورسٹی کے مہمان خانے میں سامان رکھتے ہی اپنے عزیز دوست ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر کی معیت میں محلہ قاضیاں گیا - پرانے دور کی میٹھی سی تنگ گلی میں داخل ہوتے ہی ایک مکان پر الفیض لائبریری کا چھوٹا سا بورڈ نظر آیا - دروازے پر دستک دی تو ایک نوجوان باہر آئے - تعارف ہوا تو پتا چلا کہ محمد کامران فاروقی یہی ہیں - وہ بھی مل کر خوش ہوئے اور مجھے بھی ان سے مل کر نہایت مسرت ہوئی - پر تکلف چائے پلائی' لائبریری کا ذکر چھڑا تو معلوم ہوا کہ دو دن پہلے لائبریری زاہد ملک صاحب نے خرید لی ہے اور وہ نوادر کا تمام ذخیرہ صادق آباد لے گئے ہیں -

مختلف ذرائع سے پتا چلا کہ مولوی قاضی فضل محمد جو بعد میں محمد فضل اللہ کہلانے لگے تھے' بے حد علمی ذوق کے مالک تھے - نہایت شریف النفس اور بڑے ہی نیک طینت بزرگ تھے - پرانی کتابیں' رسائل و جرائد اور مشاہیر کے خطوط جمع کرنے کا انھیں انتہائی شوق تھا - کسی بڑے آدمی کا جو خط کہیں سے ملتا' قبضے میں کر لیتے' اس طرح ان کے ذخیرۂ نوادر میں بہت سے خطوط جمع ہو گئے تھے -

مولانا ابوالکلام آزاد سے انھیں بہ درجہ غایت عقیدت تھی اور ان کا ذکر وہ بہت ہی احترام سے کرتے تھے - مولانا سے ان کی خط و کتابت بھی تھی' مولانا بھی ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور ان کے پرخلوص جذبات کی قدر کرتے تھے - ان کے ذخیرۂ مکتوبات سے ان کے بھانجے محمد کامران فاروقی صاحب نے مختلف اوقات میں مولانا کے پانچ مکتوبات مجھے بھیجے تھے جو میں نے "المعارف" کے ان شماروں میں شائع کیے' جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے - جی چاہتا ہے' یہ خطوط یہاں بھی شائع کر دیے جائیں - اس کی دو وجوہ ہیں - ایک یہ کہ یہ کتابی شکل میں محفوظ ہو جائیں گے - دوسری وجہ یہ کہ جن حضرات کے نام یہ خطوط لکھے گئے تھے' "المعارف" میں ان میں سے بعض کا انتساب صحیح نہیں لکھا جا سکا تھا - پھر ان میں جن بزرگوں کا ذکر کیا گیا ہے' ان کا تعارف بھی کماحقہ نہیں کرایا جا سکا تھا - بعد میں جو معلومات حاصل ہوئیں' ان کی روشنی میں یہاں مکتوب الیہم کے اصل نام بھی لکھے جا رہے ہیں اور ان کا مختصر تعارف بھی کرایا جا رہا ہے' نیز جن شخصیتوں کا ان میں ذکر ہوا ہے' ان کے بارے میں بعض ضروری باتیں درج کی جا رہی ہیں -

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ جب یہ خطوط "المعارف" کے چند شماروں میں شائع ہوئے تو ہمارے دوست ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے ایک مکتوب کے ذریعے ان حضرات کی نشان دہی کی جن کے نام مولانا نے یہ خطوط تحریر فرمائے تھے۔اس کی اطلاع خود مولوی محمد فضل اللہ (معروف بہ فضل محمد) نے ڈاکٹر ابو سلمان کو بذریعہ خط وکتابت دی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو انھوں نے ان میں سے بعض مکتوبات کی نقل بھی بھجوائی تھی۔ڈاکٹر صاحب کی ان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

میں ڈاکٹر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ان مکتوبات کے سلسلے میں بعض ضروری امور سے مطلع فرمایا۔

یہ پانچوں خطوط مندرجہ ذیل تاریخوں کے تحریر فرمودہ ہیں۔

(۱) ۱۸ فروری ۱۹۳۷ء

(۲) ۱۹ جون ۱۹۳۷ء

(۳) ۲۴ اگست ۱۹۳۸ء

(۴) ۷ اگست ۱۹۳۹ء

(۵) ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء

ان میں سے پہلا خط جو مولانا نے ۱۸ فروری ۱۹۳۷ء کو تحریر فرمایا مولوی قاضی فضل محمد (محمد فضل اللہ مرحوم) کے دوست چوہدری حفیظ اللہ صاحب کے نام ہے۔وہ اصلاً سیالکوٹ کے رہنے والے تھے اور بہاول پور کے صادق دین ہائی سکول میں ماسٹر تھے' مولانا عبدالعزیز کے 'جن کا اس خط میں ذکر ہوا ہے' رفقا میں سے تھے۔ تحریک خلافت کے سرگرم اور فعال رکن تھے' ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کے علمائے کرام نے ترک موالات کا جو فتویٰ دیا تھا' اس سے متاثر ہو کر چوہدری حفیظ اللہ نے سکول کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا تھا۔ اسی زمانے میں مولانا عبدالعزیز اور ماسٹر حفیظ اللہ بہاول پور سے کلکتے گئے اور دونوں نے تحریک نظمِ جماعت کے سلسلے میں مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی۔

تحریک خلافت کے ختم ہونے کے بعد ترک موالات کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا اور ماسٹر حفیظ اللہ نے دوبارہ سکول کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔بعد ازاں ترقی کر کے وہ اسی سکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے تھے اور پھر اسی منصب سے ریٹائر ہو کر پنشن حاصل کی۔

مولانا عبدالعزیز کا شمار ریاست بہاول پور کی ممتاز شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ ادب و انشا اور تصنیف و تالیف میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے ایک کتاب ''صبح صادق'' ہے، جس میں ریاست بہاول پور کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی تھی۔ ''العزیز'' نام کا ایک ماہانہ رسالہ بھی انھوں نے جاری کیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔

مولانا عبدالعزیز کچھ عرصہ سرکاری ملازمت بھی کرتے رہے۔ ریاست بہاول پور میں ضلع دار کے عہدے پر فائز تھے۔ ترک موالات کا فتویٰ شائع ہونے کے بعد سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ استعفے میں لکھا تھا کہ:

''ریاست بہاول پور کا انتظام کونسل آف ریجنسی کے ہاتھ میں ہے جو انگریزی حکومت کی نمائندہ ہے اور موجودہ حالات میں انگریزی ملازمت جائز نہیں، لہٰذا میں ریاست کی نوکری سے مستعفی ہوتا ہوں''۔

بہاول پور کی عدالت کا قادیانیوں سے متعلق ایک مقدمہ بہت مشہور ہے۔ اس میں مولانا عبدالعزیز کو خاص تعلق تھا۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ ماسٹر حفیظ اللہ کے ایک بھائی محمد شفیع تھے۔ یہ دونوں بھائی اور مولانا عبدالعزیز ریاست بہاول پور میں سیاسی خدمات کے علاوہ معاشرتی اور اصلاحی و رفاہی خدمات بھی سرانجام دیتے رہے۔ جمعیت المسلمین (۱۹۲۵ء) انجمن خدام الدین (۱۹۳۲ء) اور جماعت حزب اللہ (۱۹۳۴ء) کے سلسلے میں ان کی سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے۔

مولانا عبدالعزیز نے پینسٹھ سال کی عمر پا کر ۲۶ جون ۱۹۴۸ء کو بہاول پور میں انتقال کیا۔

ان کے والد کا اسم گرامی شیخ اللہ بخش تھا۔ وہ ریاست بہاول پور میں تحصیل دار تھے۔

اب مولانا آزاد کا وہ خط ملاحظہ فرمایے جو انھوں نے ۱۸ فروری ۱۹۳۷ء کو ماسٹر چوہدری حفیظ اللہ کے نام ارسال فرمایا تھا۔ اس خط میں قرآن مجید کی جو دو آیتیں مولانا نے لکھی ہیں، حاشیے میں ہم نے ان کا پورا حوالہ اور ترجمہ دے دیا ہے۔

یہ مولانا کے ان پانچ خطوط میں سے، جو مجھے الفیض لائبریری کے ذخیرۂ مخطوطات سے جناب محمد کامران فاروقی صاحب نے بھیجے تھے، پہلا خط ہے۔

(۱)

کلکتہ

۱۸ - ۲ - ۳۷ء

عزیزی خط پہنچا اور مولوی عبدالعزیز صاحب کے سفر حج کا حال معلوم ہوا' اللہ تعالیٰ ان کا یہ عمل خیر قبول فرمائے اور خیر و عافیت کے ساتھ گھر واپس پہنچائے۔

اپنے کام میں لگے رہیے اور اتار چڑھاؤ سے افسردہ خاطر نہ ہوئیے۔ ان شاء اللہ آپ کی راہ محمود ہے۔ اپنے کو روشنی میں پائیں گے' تاریکی سے دوچار نہ ہوں گے۔

اس راہ میں عارضی انقباض ناگزیر ہے' بعض اوقات خطرات و وساوس کا ہجوم بھی بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور قلبی حالت متزلزل ہونے لگتی ہے' لیکن اگر طبیعت میں چونک اٹھنے اور متنبہ ہو جانے کی قوت برابر کام کر رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ نتیجے کی طرف سے اندیشہ لاحق ہو۔ جوں جوں تنبہ کی قوت بڑھتی جائے گی' وساوس کا استیلا کم زور ہوتا جائے گا۔

اصل کار اس راہ میں یہ ہے کہ نفس امارہ کی قہر و سلطانی سے نجات حاصل ہو جائے اور نفس لوامہ بیدار ہو جائے۔ یہ حالت اگر حاصل ہو گئی ہے تو پھر نفس مطمئنہ کا مقام دور نہیں۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ نزغات و وساوس بالکل معدوم نہیں ہو جا سکتے۔ جو بات مطلوب ہے' وہ ان کا معدوم ہو جانا نہیں ہے' بلکہ ان کے مقابلے میں تنبہ و تذکر کی قوت کا پیدا ہو جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متقی انسانوں کی یہ علامت بتلائی کہ:

إِذَا مَسَّهُمْ طَٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ[1]

اور غافلوں کا حال یہ ہوا کہ:

وَإِخْوَٰنُهُمْ يَمُدُّونَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُونَ[2]

بہر حال اپنی طلب و سعی میں سرگرم رہیں۔ ان شاء اللہ روز بروز اپنے کو بہتر عالم میں پائیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ابوالکلام کان اللہ لہ

---

[1] یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۰۱ ہے۔ پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: جو لوگ متقی ہیں' اگر انھیں شیطان کی وسوسہ اندازی سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چونک اٹھتے ہیں' اور پھر (پردۂ غفلت اس طرح ہٹ جاتا ہے کہ گویا) اچانک ان کی آنکھیں کھل گئیں۔

[2] یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۰۲ ہے' اس کا ترجمہ یہ ہے: مگر جو لوگ شیطانوں کے بھائی بند ہیں تو انھیں وہ گمراہی میں کھینچے لیے جاتے ہیں اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے۔

مکتوب مورخہ ۱۹ جون ۱۹۳۷ء چوہدری حفیظ اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی چوہدری محمد شفیع سیالکوٹی کے نام ہے۔ محمد شفیع صاحب بھی بہاول پور میں مقیم تھے اور وہیں کے پتے پر حضرت مولانا آزاد کا یہ خط آیا تھا۔

یہ دونوں بھائی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا' حضرت مولانا آزادؒ سے عقیدت رکھتے تھے اور قاضی محمد فضل اللہ مرحوم سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن ذوق علمی میں قاضی صاحب کا مرتبہ ان سے بہت بلند تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ قاضی صاحب نے ان سے یہ خطوط لے کر اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے۔

## (۲)

کلکتہ

۳۷ - ۶ - ۱۹

عزیزی خط پہنچا۔ اللہ تعالیٰ طمانیت قلب کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ آپ کے اقربا نے ملازمت کی جو راہ نکالی ہے' بہتر ہے کہ اس سے گریز نہ کریں۔ اس کے لیے ساعی ہوں اور ملے تو اختیار کر لیں۔ معیشت کے بارے میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ وقت اور حالات کے تقاضے کا ساتھ دیا جائے۔ علاوہ بریں اگر والدین مصر ہیں' تو ضروری ہے کہ ان کی خواہش کی تعمیل کی جائے۔

باقی تمام معاملات دل اور نیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر حال میں رہ کر ایک طالب سعادت اپنے باطن کی نگرانی کر سکتا ہے۔

آپ کی بھاوج کی علالت کی خبر معلوم ہوئی' اللہ تعالیٰ فضل و کرم فرمائے' دعا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فقیر ابوالکلام

مکتوب مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۳۸ء مولوی قاضی فضل اللہ صاحب کے نام ہے۔ اس خط میں مولانا عبدالعزیز کا ذکر آیا ہے۔ ان دونوں حضرات کا تعارف گزشتہ سطور میں کرایا جا چکا ہے۔

اس خط کے آخر میں قرآن مجید کی ایک آیت کا جو ٹکڑا مولانا نے درج فرمایا ہے' اس

کا حوالہ اور ترجمہ ہم نے حاشیے میں دے دیا ہے-

(۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جبی فی اللہ -السلام علیکم -خط پہنچا- آپ لکھتے ہیں کہ مولوی عبدالعزیز صاحب کسی وجہ سے ناراض ہیں اور میں اس بارے میں انھیں لکھوں- مجھے معلوم نہیں آپ میں اور ان میں رنجش کے اسباب کیا ہیں؟ لیکن بہر حال دو مسلمانوں میں اصل معاملہ صلح و صفائی ہے نہ کہ رنجش و نااتفاقی- آپ میرا یہ خط ان کے پاس بھیج دیجیے -اگر آپ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو چاہیے آپ اس کا اعتراف کریں اور وہ اسے خوش دلی کے ساتھ معاف کر دیں- مجھے امید ہے کہ وہ ایک مسلمان کی طرف سے ہرگز بلاوجہ اپنا دل مکدر نہ رکھیں گے- وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ[1]

فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ

کلکتہ ۲۴- اگست ۱۹۳۸ء

جواب کے لیے ٹکٹ کی ضرورت نہ تھی،

جواب دینا اخلاقی فرض ہے-

یہ خط بھی مولوی فضل محمد مرحوم کے نام ہے' جو مولانا نے ۱۷ اگست ۱۹۳۹ء کو بذریعہ رجسٹری کلکتہ سے ارسال فرمایا-اس کے لفافے پر اردو اور انگریزی میں مکتوب الیہ کا جو پتا لکھا گیا ہے' وہ بھی یہاں درج کیا جارہا ہے-

(۴)

کلکتہ

۱۷ - ۸ - ۱۹۳۹ء

جبی فی اللہ - معلوم ہوتا ہے آپ کی ڈاک کا انتظام درست نہیں ہے اور خطوط تلف ہوتے ہیں- یہاں سے متواتر دو خط آپ کے نام جا چکے ہیں- پہلا خط سیکرٹری نے لکھا تھا' خط

---

[1] یہ سورہ اعراف کی آیت نمبر ۱۲۸ کے آخری الفاظ ہیں- ترجمہ یہ ہے: "اور انجام کار انہی کے لیے ہے جو متقی ہیں-"

کی رسید اور میری علالت کی بنا پر اعتذار کہ جواب کے لیے کسی قدر توقف کیجیے- دوسرا میں نے لکھا تھا' غالباً اسی دن جس دن آپ کا پہلا تار ملا- تعجب ہے آپ لکھتے ہیں اس وقت تک آپ کو جواب نہیں ملا- اب یہ خط احتیاطاً رجسٹرڈ بھیجا جارہا ہے'

اللہ تعالیٰ آپ کے اس جذبہ خدمت علم و دین کو اور زیادہ کرے- میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سردست عربی کی طرف متوجہ ہو جائیں اور ضروری حد تک اس کی تکمیل کر لیں- اگر یہ خانہ خالی رہ گیا تو نقشہ ناقص رہے گا- آپ تھوڑے عرصے کے اندر یہ منزل طے کر لے سکتے ہیں-

میں نے آپ سے بعض امور دریافت بھی کیے تھے' پھر انھیں دہراتا ہوں- انگریزی میں آپ کی طبیعت کو ادب سے مناسبت ہوئی یا نہیں؟ انگریزی ادبیات کے ذوق و مطالعہ کا کیا حال ہے؟ انگریزی میں تحریر و کتابت کی طرف طبیعت متوجہ رہی یا نہیں؟ کیا آپ دو چار مصنفوں کے نام لکھیں گے جن کے انشاء و اسلوب کتابت سے طبیعت خاص طور سے متاثر ہوئی ہے- ان امور سے بہ تفصیل مطلع کیجیے- والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ-

ابوالکلام کان اللہ لہ

مولوی فضل محمد صاحب

معرفت مولوی فیض محمد صاحب

ڈسٹرکٹ جج

بہاول نگر (بہاول پور اسٹیٹ)

اب پانچواں خط ملاحظہ ہو جو ۱۶ جولائی ۱۹۴۵ء کا تحریر کردہ ہے جب کہ مولانا کو قلعہ احمد نگر سے رہا ہوئے چند روز گزرے تھے- یہ خط مشہور صحافی اور مولانا کے عقیدت مند ابوسعید بزمی مرحوم کے نام ہے-

ابوسعید بزمی اپنے دور میں میدان صحافت کے معروف شہسوار تھے- وہ دراصل ہندوستان کے شہر بھوپال کے رہنے والے تھے- سہ روزہ "مدینہ" (بجنور) کے ایڈیٹر رہے- کچھ عرصہ سہ روزہ "زمزم" (لاہور) کی ادارت کی- پھر مختلف اوقات میں لاہور کے روزنامہ "احسان" اور "شہباز" کی ادارتی ذمے داریاں ان کے سپرد رہیں-

آزادی کے بعد بھی کچھ عرصہ صحافتی خدمات سرانجام دیتے رہے- بڑے دلچسپ

آدمی تھے۔ قیام لاہور کے زمانے میں ماڈل ٹاؤن رہتے تھے اور روزانہ بس یا تانگے سے سرکلر روڈ پر "احسان" کے دفتر آتے تھے۔ اگست ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے کا ایک دن انھوں نے لطیفہ سنایا کہ وہ دفتر آنے کے لیے گھر سے نکلے تو نہ کوئی بس ملی نہ تانگہ۔ پیدل چلتے چلتے اچھرے آگئے۔ وہاں سے بھی کوئی سواری نہ ملی تو سنٹرل جیل کی طرف رخ کر لیا (جسے منہدم کر کے شادمان کالونی بنادیا گیا ہے) جیل روڈ عبور کر کے ریس کورس روڈ پر آگئے' پھر لارنس روڈ کو گھومے اور ریس کورس روڈ اور لارنس روڈ کے چوک کے قریبی گیٹ سے لارنس گارڈن میں داخل ہوگئے۔ جم خانہ کلب (جہاں اب قائداعظم لائبریری ہے) کے قریب سے ہوتے ہوئے وہ مال روڈ پر آنا چاہتے تھے' اور وہاں سے اپنے دفتر جانا مقصود تھا۔ لارنس گارڈن میں مسلح گورکھے فوجی بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھ کر ایک پہرے دار فوجی نے زور سے آواز دی۔

کون----؟

بولے: بزمی----!

فوجی کی طرف سے جواب آیا: بھجنی۔ ٹھیک ہے' جاؤ۔

اس طرح بزمی کو بھجنی سمجھنے کی وجہ سے ان کی جان بچ گئی۔

وہ امریکی حکومت کی دعوت پر ایک صحافی کی حیثیت سے جون ۱۹۵۱ء میں امریکہ کے دورے پر گئے تھے کہ وسط ستمبر ۱۹۵۱ء میں حرکت قلب بند ہو جانے سے وہیں انتقال کر گئے اور ان کی میت لاہور لائی گئی اور میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

ان کی اہلیہ پڑھی لکھی' حوصلہ مند خاتون تھیں۔ انھوں نے خواتین کے لیے لاہور سے "بنت راوی" ایک رسالہ جاری کیا تھا جو بڑا مقبول ہوا تھا۔

۱۹۴۵ء میں جب مولانا آزاد رہا ہوئے' ابوسعید بزمی لاہور میں تھے' انھوں نے کسی سلسلے میں (جس کی تفصیل کا پتا نہیں چل سکا) مولانا کو خط لکھا' مولانا نے اس کے جواب میں مندرجہ ذیل مکتوب تحریر فرمایا۔

## (۵)

۱۲۔ جولائی ۱۹۴۵ء

عزیزی! خط پہنچا' میں تین برس کے بعد دنیا میں پھر واپس آیا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ

آپ اب لاہور میں ہیں- بہر حال آپ کا خط پڑھ کر وہ خوشی ہوئی جو مدتوں کے بعد ایک عزیز کو دیکھ کر ہوتی ہے-

میں نہیں سمجھتا کہ صورت حالات آپ کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟ پریشانی کی کوئی وجہ نہیں' معاملہ بالکل صاف اور روشن ہے- ذرا مجھے دم لینے کی مہلت ملے تو خط و کتابت کیجیے-

گاندھی جی سے ملیے' لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کی ملاقات اس بات کے لیے سود مند ہو سکتی ہے- شاید آپ کو معلوم نہیں کہ برسوں سے میں سیاسی مسائل میں ان سے اختلافات رکھتا ہوں اور میری راہ کانگرس میں ان سے الگ ہے- البتہ ہمارا اختلاف ہمارے ذاتی تعلق کو آلودہ نہیں کرتا- والسلام علیکم

ابوالکلام



اب مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے بارے میں چند باتیں عرض کی جاتی ہیں-

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کی کبھی باہم ملاقات نہیں ہوئی- وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ مولانا بے شمار شعرا کے اشعار اپنی مختلف کتابوں میں درج کرتے ہیں لیکن اقبال کا کوئی شعر درج نہیں فرماتے- مندرجہ ذیل سطور میں اس قسم کے تمام اعتراضات رفع ہو جائیں گے اور صحیح صورت حال واضح ہو کر سامنے آجائے گی-

لاہور میں میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بار ایٹ لا) کی کوٹھی (بیرون یکی دروازہ) کو کسی زمانے میں برصغیر کے سیاسی رہنماؤں کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی- مختلف اوقات میں اس میں قائداعظم محمد علی جناح' مولانا ابوالکلام آزاد' گاندھی جی' مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' ڈاکٹر مختار احمد انصاری' مولانا انور شاہ کاشمیری' سید عطاء اللہ شاہ بخاری' حکیم محمد اجمل خاں' موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو وغیرہ کئی دفعہ تشریف لائے- علامہ اقبال تو لاہور سے تعلق رکھتے تھے اور کہنا چاہیے کہ میاں صاحب کا گھر ان کا اپنا گھر تھا-

اب یہ کوٹھی منہدم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ مالواڈہ کیمپلیکس تعمیر کیا جا چکا ہے اور اس کے مکین اسد جان روڈ پر چھاؤنی منتقل ہو گئے ہیں- جب یہ حضرات اس کوٹھی میں مقیم تھے' میاں عبدالعزیز مرحوم کے صاحب زادے میاں عبدالمجید مرحوم بعض کمروں میں لے جا کر باقاعدہ ماہ و سال اور وقت کا تعین کر کے بتایا کرتے تھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد آئے تو

ان سے ملاقات کے لیے علامہ اقبال اور فلاں فلاں حضرات تشریف لائے- مولانا یہاں بیٹھے تھے' علامہ یہاں تشریف فرما تھے اور فلاں فلاں بزرگ اس صوفے یا اس قالین پر اس انداز سے بیٹھے تھے اور فلاں مسئلے پر اس اسلوب میں بحث ہوئی تھی- وہ سب کے محل جلوس اور جائے قیام کی نشان دہی کیا کرتے تھے اور موضوع گفتگو کی تفصیلات بیان فرمایا کرتے تھے- یہ ایک تاریخی کوٹھی تھی اور اس میں بہت سے ہندو مسلم اکابر کی آمدورفت رہتی تھی-



مندرجہ ذیل سطور میں ہم یہ واضح کریں گے کہ مولانا ابوالکلام اور علامہ اقبال کے درمیان کن کن مواقع پر ملاقات ہوئی' کن امور کے متعلق خط و کتابت ہوئی اور کہاں کہاں مولانا نے علامہ کے اشعار درج کیے- مولانا اور علامہ کو باہم لڑانے اور دونوں کو ایک دوسرے سے دور رکھنے والے حضرات غور سے ان سطور کا مطالعہ فرمائیں-

۱--- علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے درمیان بقول میاں عبدالمجید کے نہایت خوش گوار طریقے سے مختلف مسائل پر سلسلہ کلام جاری رہتا تھا- میاں صاحب کا بیان ہے کہ ان حضرات کی گفتگو سب لوگ انتہائی غور اور توجہ سے سنتے اور اس سے استفادہ کرتے تھے-

۲--- ان دونوں حضرات کے مراسم و تعلقات کی نزاکت اور گہرائی کا اس حقیقت سے بھی پتا چلتا ہے کہ جہاں یہ علوم و فنون کے مختلف گوشوں میں مہارت رکھتے ہیں' وہاں ملکی سیاسیات کے نشیب و فراز سے بھی دونوں کو گہرا تعلق ہے اور پھر دونوں ذہنی اور عملی طور پر سیاسیات کے الگ الگ کیمپوں سے وابستہ ہیں- دونوں کا دور سیاسیات کا بھرپور دور ہے' لیکن نہ کبھی علامہ نے کسی سیاسی معاملے میں مولانا کے خلاف کوئی بیان دیا اور نہ کبھی مولانا نے علامہ کے کسی سیاسی نقطہ نظر کو محل تنقید ٹھہرایا- اس زمانے کا تمام سیاسی ریکارڈ دیکھ لیجیے' ایک دوسرے کی مخالفت میں دونوں کی کوئی تحریر نہیں ملے گی- یہ ان کے پر خلوص باہمی روابط کی بہت بڑی دلیل ہے اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے سے انتہائی تکریم کا برتاؤ کرتے تھے نہ سیاسی میدان میں ایک دوسرے کی مخالفت کرتے تھے' نہ علمی میدان میں----!

۳--- ماہنامہ "خدنگ نظر" منشی نوبت رائے نظر کا رسالہ تھا جو لکھنو سے نکلتا تھا- ۱۹۰۳ء میں مولانا چند مہینے اس کے حصہ مضامین کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے- ڈاکٹر ابو سلمان شاہ

جہان پوری "مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت" میں (ہماری زبان علی گڑھ' یکم نومبر ۱۹۶۹ء کے حوالے سے) لکھتے ہیں کہ "خدنگ نظر" کے مارچ ۱۹۰۳ء کے شمارے میں "عرض حال" کے عنوان سے اس کے مہتمم نے لکھا:

"ہم نے اپنی کوششوں میں اپنے دلی دوست ابوالکلام مولوی محی الدین صاحب آزاد دہلوی کو بھی شریک کر لیا ہے' جن کے اکثر مضامین خدنگ نظر اور دوسرے معزز اردو جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں' آئندہ سے وہ خدنگ نظر کے حصہ مضامین کے لیے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض ادا کریں گے جو انھوں نے بخوشی قبول فرمائے ہیں۔"

اس وقت مولانا عمر کے پندرھویں سال میں تھے۔ علامہ اقبال کے بارے میں پہلا تعارفی مضمون اسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ مولانا اس وقت اس کے عملہ ادارت میں شامل تھے اور اس قسم کے مضامین کی اشاعت کے ذمے دار وہی تھے۔

۴--- اپریل ۱۹۰۵ء میں جب مولانا انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں تشریف لائے' اس وقت وہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر تھے اور عمر ابھی سترہ سال کی نہیں ہوئی تھی۔ ان کی تقریر سے لوگ نہایت متاثر ہوئے تھے۔ علامہ اقبال سے اولین ملاقات اسی موقعے پر ہوئی تھی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اپنی کتاب "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے صفحہ ۳۲۳ پر رقم طراز ہیں:

"اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو "مخزن" نے نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا' لیکن بہت جلد ہی لوگوں میں غیر معمولی شہرت ہو گئی تھی۔ انجمن میں ان کی نظم خوانی خاص طور پر شوق و ذوق سے سنی جاتی تھی۔ ان سے بھی پہلی مرتبہ اس سفر میں ملاقات ہوئی۔"

۵--- مولانا نے "الہلال" جاری کیا تو علامہ اقبال نے اس میں پوری دلچسپی لی اور اس کا حلقہ اشاعت بڑھانے کے لیے تگ و دو کی۔ چنانچہ ۹۔ اکتوبر ۱۹۱۲ء کے "الہلال" کے صفحہ اول پر مولانا نے مندرجہ ذیل نوٹ تحریر فرمایا۔

"الہلال کی توسیع اشاعت کے لیے ابتدا سے بغیر کسی تحریک اور طلب کے جو احباب سعی فرما رہے ہیں' دفتر ان کا شکر گزار ہے۔ ایسے حضرات تو بکثرت ہیں'

جنھوں نے ایک ایک دو دو خریدار بہم پہنچائے‘ مگر جن احباب نے خاص طور پر اس بارے میں سعی کی ہے‘ ان کے اسمائے گرامی شکریے کے ساتھ درج ذیل ہیں- اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ وہ اپنے کسی بندے کو مخلص اور بغیر منت و طلب‘ احسان کرنے والے احباب عطا فرمائے-

اس فہرست میں چودہ حضرات کے نام درج ہیں‘ ان میں سے کسی نے سات‘ کسی نے آٹھ‘ کسی نے چار اور کسی نے چھے خریدار بہم پہنچائے‘ مگر مولانا فرماتے ہیں‘ دہلی کے ایک بزرگ نے جنھوں نے اپنا نام ہم پر بھی ظاہر نہیں کیا بارہ‘ جناب شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹرایٹ لا (لاہور) نے دس اور جناب مولانا سید عبدالحق صاحب بغدادی نائب پروفیسر عربی محمڈن کالج علی گڑھ نے دس خریدار (بہم پہنچائے)

۶--- "جواب شکوہ" اقبال کی مشہور نظم ہے- اس کی تائید میں (سابق) ریاست رام پور (یوپی) کے ہوم سیکرٹری جناب صاحب زادہ مصطفیٰ خاں شرر کی نظم ۲۶- فروری ۱۹۱۳ء کے "الہلال" کے بہرہ ادبیات میں "جواب شکوہ کا اقبال" کے عنوان سے چھپی- یہ نظم "الہلال" کے دو صفحات (۱۲ - ۱۳) پر مشتمل ہے-

نہایت شان دار اور طویل نظم ہے-

۷--- قاضی افضل حق قرشی نے اپنی کتاب "اقبال کے ممدوح علما" میں شمشیر قلم ۲۷ فروری ۱۹۱۴ء کے صفحہ ۲ سے مندرجہ ذیل اقتباس درج کیا ہے-

> ۱۹- فروری ۱۹۱۴ء کو مولانا آزاد انجمن ہلال احمر قسطنطنیہ کے وفد کے ساتھ لاہور آئے اور اقبال سے بھی ملاقات ہوئی- یہ وفد مسلمانان ہند کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہندوستان آیا تھا- ریلوے اسٹیشن پر وفد کا پرجوش استقبال کیا گیا- شام چار بجے باغ بیرون موچی دروازہ میں جلسہ عام منعقد ہوا- ارکان وفد اور مولانا آزاد جب جلسہ گاہ میں آئے تو حاضرین جلسہ کی طرف سے ان کے گلے میں ہار ڈالے گئے اور بے شمار پھول برسائے گئے- اس کے بعد حاجی شمس الدین سیکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور نے نواب ذوالفقار علی خاں رئیس مالیر کوٹلہ وسابق وزیراعظم ریاست پٹیالہ کے صدر جلسہ بنائے جانے کی تجویز پیش کی جو اقبال کی تائید سے منظور ہوئی- نواب ذوالفقار علی خاں نے افتتاحی تقریر کی- ان

کے بعد ڈاکٹر عدنان بے اور عمر کمال بے نے ترکی میں تقاریر کیں' جن کا ترجمہ علامہ توفیق بے ایڈیٹر رسالہ "سبیل الرشاد" قسطنطنیہ نے فارسی میں سنایا۔ ان کے بعد چوہدری غلام حیدر خاں اسسٹنٹ ایڈیٹر "زمیندار" اور حاجی شمس الدین نے تقاریر کیں۔ مولانا آزاد وفد کے ہمراہ اسی شام واپس چلے گئے کہ دوسرے دن دہلی میں بھی جلسہ ہو رہا تھا۔ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خاں نے مولانا آزاد پر زور دیا کہ مزید ایک روز لاہور میں قیام فرمائیں۔

۸--- ۱۸۔ نومبر ۱۹۱۴ء کے "الہلال" میں "الہلال پریس کی ضمانت طلبی" کے عنوان سے سب ایڈیٹر کی طرف سے حسب ذیل اعلان شائع ہوا۔

"بنگال گورنمنٹ نے ۱۶۔ نومبر ۱۹۱۳ء کو "الہلال" پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کرلی اور "الہلال" کے دو نمبر مورخہ ۱۴ و ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۱۴ء بھی جو مشترکہ صورت میں ایک ساتھ شائع ہوئے تھے' ضبطی میں آئے۔ بنگال گورنمنٹ نے جن مضامین کو قابل اعتراض قرار دیا وہ "حدیث الجنود" اور "سقوط انٹورپ" ہیں۔ ایک بلجیم تصویر بھی قابل اعتراض قرار دی گئی ہے' جس کے نیچے قرآن حکیم کی یہ آیت درج ہے۔

وما ظلمهم الله ولكن كانوا انفسهم يظلمون

مولانا اس وقت کلکتے سے باہر دورے پر تھے۔ ضبطی اور خانہ تلاشی کا وارنٹ ان کی عدم موجودگی میں آیا تھا۔ دفتر کی طرف سے ان کو اس واقعے کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے بذریعہ تار ہدایت فرمائی کہ جو نمبر چھپ رہا ہے' اسے فوراً شائع کردو اور ایک مختصر نوٹ میں ضبطی کی اطلاع کے ساتھ یہ اعلان کردو کہ ہم اپنی ذات سے آخر وقت تک "الہلال" جاری رکھنا چاہتے ہیں اور ان شاء اللہ العزیز جاری رکھیں گے۔ اس لیے ہم حسب ہدایت یہ شمارہ شائع کر رہے ہیں اور اس کی آئندہ زندگی کی قارئین کرام کو کامل توقع دلاتے ہیں۔" ومن يقنط من رحمة ربه الا الضالون"

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے میں دو ہزار کی ضمانت ضبط کرلینے کے بعد دس ہزار کی ضمانت طلب کی جاتی تھی۔ اس قانون کے مطابق الہلال پریس کی دو ہزار کی ضبطی ضمانت کے بعد دس ہزار کی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

اس کے بعد ایک سال اخبار بند رہا۔ پھر ہفت روزہ "البلاغ" جاری کیا گیا۔ اس کا پہلا

شمارہ ۱۲- نومبر ۱۹۱۵ء (۴ محرم ۱۳۳۴ھ) کو شائع ہوا- اس کے صفحہ اول پر "ادبیات" کے تحت علامہ اقبال کی مشہور نظم شائع کی گئی جو بانگ درا میں "عرفی" کے عنوان سے چھپی ہے-

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانہ سینا و فارابی

آخری شعر ہے-

صدا تربت سے آئی شکوۂ اہل جہاں کم کن
نوارا تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

مولانا نے "البلاغ" میں اس نظم کا عنوان عرفی کے مصرع اول کو بنایا ہے-

نوارا تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی

اقبال کی یہ نظم مولانا نے "البلاغ" کے پہلے شمارے کے پہلے صفحے پر شائع کی- اقبال کی نظم کے علاوہ کسی کی نظم الہلال یا البلاغ کے صفحہ اول پر کبھی جگہ نہیں پا سکی- "الہلال" میں علامہ شبلی کی نظمیں بھی شائع ہوتی رہی ہیں، لیکن صفحہ اول پر نہیں، اندر کے صفحات پر---! صفحہ اول پر اشاعت کا اعزاز صرف اقبال کے کلام کو حاصل ہوا-

۹--- علامہ کی کتاب "رموز بے خودی" ۱۹۱۸ء میں چھپی تھی- اس وقت مولانا رانچی میں نظر بند تھے- وہیں انھوں نے مولانا کو کتاب بھیجی- مولانا نے کتاب وصول فرمائی اور انھیں بذریعہ خط اس کی اطلاع دی- اس کا ذکر وہ ۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں کرتے ہیں جو سید سلیمان ندوی مرحوم کو ارسال فرمایا-

"والا نامہ ابھی ملا ہے- رموز بے خودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی- ریویو کے لیے سراپا سپاس ہوں-

"آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے- انھوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے"-

یہ خط اقبال نامہ حصہ اول میں مندرج ہے-

۱۰--- مولانا کا ذکر کسی نہ کسی اسلوب میں اقبال نے مختلف مکتوبات میں کیا ہے- ان کی تصنیفات میں "تذکرہ" خاص اہمیت کی تصنیف ہے جو رانچی کی نظر بندی

(۳۰-مارچ ۱۹۱۶ء تا یکم جنوری ۱۹۲۰ء) کے زمانے کی نہایت دلچسپ علمی یادگار ہے- یہ کتاب جون ۱۹۱۶ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک پانچ مہینے میں قلم بند ہوئی- مقدمہ کتاب میں اس کے ناشر مرزا فضل الدین احمد ایک جگہ لکھتے ہیں-

"ڈاکٹر اقبال کا مذہبی عقاید میں پچھلا حال جو کچھ سنا ہے' اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے- "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" فی الحقیقت "الہلال" کی صداے بازگشت ہے"-

ان الفاظ کے سلسلے میں علامہ اقبال نے ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کے نام خط لکھا- ملاحظہ فرمایے:

"مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا' بہت دلچسپ کتاب ہے' مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد مرزا لکھتے ہیں: "اقبال کی مثنویاں الہلال کی صداے بازگشت ہیں"- شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں' ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں- اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریروں --- نظم و نثر --- اردو و انگریزی میں موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں- بہر حال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا' مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے' نہ نام آوری- البتہ اس بات کا رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال' تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا' تحریک الہلال نے اسے مسلمان کر دیا- ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے' ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو --- میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی' مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے- وہ لکھتے ہیں کہ اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے' ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے- معلوم نہیں انھوں نے کیا سنا' اور سنی سنائی بات پر اعتماد کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنے ہو سکتے ہیں' کسی طرح ان لوگوں کے شایان شان نہیں جو اصلاح کے علم بردار ہوں- مجھے معلوم نہیں' مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں' ورنہ یہ متوخر الذکر شکایت براہ راست ان سے کرتا- اگر آپ کی ان سے

ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہنچا یے----"

اگرچہ مولانا کو مرزا فضل الدین احمد کی رائے اور تحریر کے ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا، تاہم جب سید سلیمان ندوی نے ڈاکٹر صاحب کے اس خط کی طرف مولانا کو توجہ دلائی تو انھوں نے واضح الفاظ میں لکھا:

"ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی، لیکن لوگوں کا پیمانہ نظر یہی باتیں ہیں، تو کیا کیا جائے؟ دراصل اس "تذکرہ" کی ساری باتیں میرے لیے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لیے بھیجا تھا، اس لیے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کرکے شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے۔ صرف اتنا ٹکڑا حد درجہ ضمنی مطولات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہو گا۔ خیال کیا کہ مقدمے کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہو گا، لیکن انھوں نے بجنسہ چھاپ کر، جلد باندھ کر یکایک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاح سمجھتے رہے۔ علاوہ ڈاکٹر اقبال وغیرہ کے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرز تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے--- لطف یہ کہ اس مرتبہ وہ جلسے کے موقعے پر آئے اور میں نے پوچھا کہ اقبال کی نسبت آپ نے کیوں کر تبدیلی معلوم کی تو خود میرے ہی ایک قول کا حوالہ دیا جو کبھی کہا تھا۔ حال آنکہ میں نے جو بات کہی تھی، وہ صرف یہ تھی کہ اقبال پہلے آج کل کے عامتہ الناس کے تصوف میں مبتلا تھے، اب ان کے خیالات اس طرف سے ہٹ گئے اور وہ دونوں مثنویوں میں جو بات ظاہر کرنی چاہتے ہیں، وہ وہی ہے جو میں ہمیشہ لکھتا رہا ہوں۔"

مولانا کا یہ خط ۲- جنوری ۱۹۲۰ء کا تحریر فرمودہ ہے اور اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ سید صاحب نے اس کی اطلاع یقیناً ڈاکٹر صاحب کو دی ہو گی اور وہ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد انھوں نے اس ضمن میں کوئی بات نہیں کی۔

۱۱--- اقبال نامہ حصہ اول (مرتبہ شیخ عطاء اللہ) میں سید سلیمان ندوی کے نام علامہ کا ایک خط درج ہے، جس میں مولانا آزاد کی رانچی سے رہائی پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"الحمد اللہ مولانا آزاد کو آزادی ملی----

"مولانا آزاد اب کہاں ہیں؟ پتا لکھیے 'ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں"۔

مولانا یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے تھے۔علامہ کا یہ مکتوب گرامی انھی دنوں کا ہے۔

۱۲--- ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو مولانا سے انتہائی عقیدت مندانہ تعلق رکھتے ہیں۔انھوں نے "مولانا ابوالکلام آزاد (ایک شخصی مطالعہ)" کے نام سے کتاب لکھی ہے جو بہت سے معلومات پر محتوی ہے۔اس کتاب کا صفحہ ۱۸ دیکھیے "میاں عبدالعزیز کی کوٹھی پر ملاقات" کے عنوان کے تحت وہ رقم فرماتے ہیں:

مولانا جب کبھی لاہور تشریف لاتے تو عموماً میاں عبدالعزیز بیرسٹر کی کوٹھی میں ٹھہرا کرتے تھے۔ایک مرتبہ مجھے ان کی آمد کا علم ہوا تو میں اپنے ایک ہم سبق دوست ڈاکٹر محمد شاہ مرحوم ساکن ڈیرہ اسماعیل خاں کے ساتھ کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اُس دن انھوں نے چند اکابر لاہور کو خطاب کرنے کے لیے مدعو کیا تھا۔ فرشی نشست تھی۔ بہت سے اکابر موجود تھے۔ علامہ اقبال مرحوم مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ہم بھی اس محفل میں گھس کر بیٹھ گئے۔ مولانا کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک سلپ تھی' جس پر تقریر کے پوائنٹ لکھے ہوئے تھے۔ موضوع تو اب یاد نہیں رہا' البتہ یہ بات ذہن پر نقش ہے کہ تقریر کرنے کے بعد مولانا آزاد علامہ اقبال کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

علامہ صاحب! "کیا یہ ٹھیک ہے؟"

علامہ مرحوم نے زوردار الفاظ میں تائید کرتے ہوئے فرمایا: "بالکل ٹھیک ہے"۔

معلوم ہوتا ہے یہ ۱۹۲۱ء کے پس و پیش کا واقعہ ہے۔

۱۳--- مولانا غلام رسول مہر نے مولانا آزاد اور علامہ اقبال کی ایک ملاقات کا ذکر اپنے مکتوب گرامی (بنام فیض لدھیانوی مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۷۱ء) میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔

جناب افضل حق قرشی کی تصنیف "اقبال کے ممدوح علما" کے حوالے سے الفاظ ملاحظہ فرمایے۔

"ایک ملاقات میرے سامنے نواب ذوالفقار علی خاں مرحوم کی دعوت طعام پر

ہوئی تھی۔ حضرت علامہ نے بطور خاص فرمایا تھا کہ ہمیں مولانا آزاد کے ساتھ بٹھایا جائے تاکہ ان سے باتیں کر سکیں۔ میں نے اس کا انتظام کیا اور کھانے کے دوران میں دونوں بزرگ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔"

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ ملاقات کب اور کس سن میں ہوئی۔ ممکن ہے یہ بھی ۱۹۲۱ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہو۔

۱۴--- بعض اہم مسائل کی گرہ کشائی کے لیے علامہ اقبال خود تو مولانا کے باب تحقیق پر دستک دیتے ہی تھے، دیگر تشنگان علوم کو بھی ان سے رجوع کرنے کے متعلق فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ افضل حق قرشی (خطوط اقبال صفحہ ۱۶۳-۱۶۷ شائع کردہ مکتبہ خیابان ادب کے حوالے سے) "اقبال کے ممدوح علما" میں لکھتے ہیں کہ سید محمد سعید الدین جعفری کے نام ایک خط میں علامہ نے ان کو "اسلام کا مطالعہ زمانہ حال کی روشنی میں" کے متعلق لکھا:

"میری رائے میں بحیثیت مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں، مگر شاہ صاحب موصوف کی حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ حکما میں ابن رشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے۔ علی ہذا القیاس غزالی اور رومی علیہم الرحمہ، مفسرین میں معتزلی نقطہ خیال سے زمخشری، اشعری نقطہ خیال سے رازی اور زبان و محاورے کے اعتبار سے بیضاوی --- میری رائے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام اس بارے میں بہتر مشورہ دے سکیں گے۔"

۱۵--- یکم اپریل ۱۹۲۳ء کو مولانا نے کلکتے سے عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں عربی کا پندرہ روزہ "الجامعہ" جاری کیا تھا۔ اس کا آخری شمارہ ۱۹۲۴ء کے مئی جون کا مشترک شمارہ شائع ہوا تھا۔ یہ اخبار ایک سال سے زائد عرصہ جاری رہا۔

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ مولانا آزاد نے اس نام کا ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری فرمایا تھا، لیکن یہ رسالہ کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۸۵ء کی بات ہے کہ بہت عرصے کے بعد پرانی انارکلی میں ایک پرانے واقف حافظ ابوبکر صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ یہ مولانا عبدالعزیز آفندی کے بیٹے ہیں جو مولانا آزاد کے بے حد معتقد تھے اور جنھوں نے لاہور کے محلّہ فاروق گنج میں الہلال بک ایجنسی کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا۔ اس ادارے کی

طرف سے مولانا کی کئی کتابیں شائع ہوئی تھیں- امام ابن تیمیہ کی چند کتابوں کے اردو ترجمے بھی شائع ہوئے تھے جو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے کرائے گئے تھے-

مولانا عبدالعزیز آفندی کو میں نے دیکھا ہے' وہ بڑے خوب صورت اور خوش مزاج شخص تھے- میں تقسیم ملک کے کچھ مدت بعد مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا- اس وقت وہ فالج کے مرض میں مبتلا تھے' لیکن نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور مولانا آزاد سے اپنے دیرینہ تعلقات کے بارے میں چند باتیں بیان کیں-

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حافظ ابوبکر صاحب مجھے ٹولنٹن مارکیٹ میں شمیم بیکرز میں لے گئے' وہاں انھوں نے لکڑی کا ایک صندوق رکھا تھا' جس میں ان کے والد کے کچھ کاغذات اور الہلال اور البلاغ کے چند فائل تھے- "الجامعہ" کے چند شمارے بھی مجلد صورت میں موجود تھے-

میں نے الجامعہ کی ورق گردانی کی تو اس کے ایک شمارے میں علامہ اقبال کے مشہور اور مقبول "ترانہ ملی" کا عربی نظم میں ترجمہ کیا گیا تھا--- شروع میں ایک طویل نوٹ تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ "ترانہ ملی کا شمار عمدہ ترین نغموں میں ہوتا ہے اور یہ قارہ ہند کے ممتاز شاعر اور نامور فلسفی علامہ اقبال کے زور قلم کا نتیجہ ہے- اقبال یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ و سندیافتہ ہیں- ہندوستان کی اس بلند پایہ شخصیت کو جدید علوم پر عبور حاصل ہے اور اپنے اقران و معاصرین میں ان کو نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے- ان کی شاعری خدمت اسلام اور احیاے دین کا بہترین ذریعہ ہے- باشندگان وطن انتہائی شوق سے ان کا کلام پڑھتے اور اس سے بے حد متاثر ہوتے ہیں- انگلستان میں ان کے اشعار کا اچھا خاصا حصہ انگریزی میں منتقل ہو چکا ہے' جو وہاں کے اصحاب علم کے مطالعے میں آرہا ہے' اور وہ لوگ ان کے افکار کو بڑی اہمیت دیتے ہیں"-

یہ ۱۹۸۵ء کی بات ہے- بیٹھے بیٹھے دو مرتبہ میں نے عربی کا یہ نوٹ پڑھا اور بحمداللہ اس کا ترجمہ ذہن کی گرفت میں آگیا جو گھر آکر ایک کاپی میں لکھ لیا گیا-

اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اکیڈمک ڈائریکٹر سراج منیر مرحوم تھے- میں نے ان کو بتایا تو بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ اس پر مضمون لکھیے اور وضاحت کیجیے کہ مولانا آزاد کے دل میں علامہ اقبال کی کیا قدر و منزلت تھی' لیکن افسوس ہے میں اس وقت مضمون

نہ لکھ سکا۔

اس سے چار سال بعد ۱۹۸۹ء میں ہمارے محترم دوست ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت" شائع ہوئی۔ وہ اپنی ہر تصنیف از راہ کرم اس فقیر کو ارسال کرتے ہیں۔ یہ کتاب بھی ارسال فرمائی۔ اس کے صفحہ ۱۸۳ پر "الجامعہ" کا ذکر ہے اور "ترانہ ملی" کے عربی ترجمے اور اقبال سے متعلق تعارفی نوٹ کا تذکرہ بھی ہے۔ الفاظ کے کچھ فرق سے بالکل یہی ترجمہ ہے جو گزشتہ سطور میں درج کیا گیا ہے۔

عربی نوٹ پڑھتے وقت میں نے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ ترجمہ کس نے کیا ہے۔ اس کا علم ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب سے ہوا۔ وہ اس کے صفحہ ۱۸۴ پر لکھتے ہیں:

> "الجامعہ نے آئندہ شماروں میں علامہ مرحوم کے فارسی کلام کی اشاعت کا بھی وعدہ کیا تھا۔ "ترانہ ملی" کا منظوم عربی ترجمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں عربی کے استاد مولانا عبدالحق حقی اعظمی بغدادی نے کیا تھا۔ مولانا عبدالحق عربی کے ادیب اور شاعر تھے۔ "الجامعہ" نے ان کی متعدد منظومات شائع کی ہیں۔"

> اندازہ کیجیے اقبال کے بارے میں مولانا آزاد کے کیا خیالات ہیں اور وہ انھیں کتنا بڑا فلسفی اور شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کی کسی نظم کو پہلی مرتبہ مولانا آزاد ہی کے اخبار میں عربی میں منتقل کیا گیا۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس کا مولانا نے اقبال کو مستحق گردانا۔ کیا اقبال کے کسی دکان دار نے کبھی اتنا بڑا کام کیا؟

> لاہور میں مولانا کے اس عربی رسالے "الجامعہ" کی مکمل فائل ہمارے قابل احترام دوست جناب محمد عالم مختار حق کے کتب خانے میں موجود ہے۔ محمد عالم صاحب کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ وہ بڑے باخبر اور صاحب مطالعہ شخص ہیں۔ "الجامعہ" کا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۲۳ء میں کلکتے سے شائع ہوا تھا۔ آخری شمارہ ۱۹۲۴ء کے مئی جون کا مشترکہ شمارہ ہے۔ رسالہ چودہ مہینے جاری رہا۔

۱۶--- عربی کا پندرہ روزہ "الجامعہ" بند ہوا تو اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا نے کلکتہ سے روزنامہ "پیام" جاری کیا۔ اس کے ایڈیٹر بھی عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ صحیح تاریخ کا تعین کرنا تو مشکل ہے، لیکن اندازہ یہ ہے کہ "پیام" ۱۹۲۵ء کے پس و پیش جاری کیا گیا تھا۔ عبدالرزاق ملیح آبادی اپنی کتاب "ذکر آزاد" کے صفحہ ۳۱۲ پر ایک عنوان قائم کرتے ہیں:

"ڈاکٹر اقبال، ملک الشعرا" اس عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ مصری شاعر احمد شوقی باشا کو عرب ملکوں نے "امیر الشعرا" کا خطاب دیا تھا۔ اس پر مولانا (آزاد) کو خیال ہوا کہ ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کو "ملک الشعرا" بنا دیا جائے۔ ایک دن صبح مولانا ہاتھ میں کچھ کاغذ لیے میرے کمرے میں آئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ میں نے سختی سے مخالفت کی۔ متعجب ہو کر فرمایا:

کیا ڈاکٹر اقبال اس خطاب کے اہل نہیں ہیں؟

عرض کیا: ڈاکٹر صاحب کے شاعرانہ کمالات کے مبصر آپ ہیں۔ مجھے شاعری سے ذوق نہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب محض شاعر ہی نہیں ہیں، سیاسی لیڈر بھی ہیں اور ہم ان کی سیاست کے مخالف ہیں۔ ملک الشعرا بن کر وہ سیاسی فائدے بھی اٹھا سکتے ہیں۔

مولانا سوچ میں پڑ گئے اور میں کہتا رہا "اخبار کے مالک آپ ہیں اور جو تجویز چاہیں پیش کر سکتے ہیں، لیکن جب تک ایڈیٹر میں ہوں، اپنے ضمیر کے خلاف کسی تجویز کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میرا نام ایڈیٹری سے الگ کر دیا جائے، اس کے بعد بھی اخبار کی خدمت جاری رکھوں گا"۔

وہ آگے لکھتے ہیں:

"مولانا با اصول اخبار نویس تھے اور اپنے اخبار کے ایڈیٹر کی رائے کا احترام کرتے تھے۔"

فرمایئے ملک الشعرا کا خطاب اقبال کو کس نے دینا چاہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یا اقبال کے موجودہ مداحوں میں سے کسی مداح نے؟ جنھوں نے اقبال کو آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اس کے بعد کیا فرماتے ہیں، وہ حضرات جن کا ارشاد ہے کہ مولانا آزاد نے کہیں اقبال کا نام نہیں لیا؟ اگر اقبال کا نام لینے سے مراد اقبال کے نام کی کوئی دکان سجانا ہے یا اقبال کے شاہین یا اقبال اور عورت وغیرہ قسم کی کوئی کتاب تصنیف کرنا یا مضمون لکھنا ہے یا منبر پر کھڑے ہو کر اقبال کے اشعار پڑھنا ہے تو مولانا نے واقعی یہ کام نہیں کیا۔

۱۷--- سید سلیمان ندوی کے نام اقبال کے بہت سے خطوط دست یاب بھی ہو گئے ہیں اور

چھپ بھی گئے ہیں' مگر جو خطوط انھوں نے مولانا کو لکھے' افسوس ہے وہ شائع نہیں ہوئے اور شاید دست یاب بھی نہ ہوئے ہوں' تاہم سید صاحب اور بعض دیگر حضرات کے نام علامہ اقبال کے مرسلہ خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سے علمی معاملات میں مولانا کی خدمت میں خطوط ارسال کیے تھے' یقیناً مولانا نے بھی جواب میں خط لکھے ہوں گے' مگر وہ ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آئے' کہیں ایسا تو نہیں کہ ان میں سے کچھ خطوط دست یاب تو کہیں سے ہو گئے ہوں' مگر کچھ حضرات ان خطوط کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوں؟ اقبال کے بارے میں جس قسم کے افکار بعض لوگ مولانا کی طرف منسوب فرماتے ہیں' ان کے پیش نظر کسی کے دل میں اس شبہے کا کروٹ لینا بعید از قیاس نہیں۔

شیخ عطاء اللہ کے مرتبہ اقبال نامہ کے حصہ اول کے ایک خط میں جو علامہ نے سید سلیمان ندوی کی خدمت میں ۱۸-اگست ۱۹۲۴ء کو لکھا' تحریر فرماتے ہیں:

> "امریکہ کی مشہور یونیورسٹی (کولمبیا) نے ایک کتاب شائع کی ہے' جس کا نام "مسلمانوں کے نظریات متعلقہ مالیات" ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے' یعنی یہ کہ مثلاً مدت شیر خوارگی جو نص کی رو سے دو سال ہے' کم یا زیادہ ہو سکتی ہے' یا حصص شرعی میراث میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ بعض حنفا اور معتزلہ کے نزدیک اجماع یہ اختیار رکھتا ہے' مگر اس نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ آپ سے یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟
>
> "امر دیگر یہ ہے کہ آپ کی ذاتی راے اس بارے میں کیا ہے؟ میں نے مولانا ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی عریضہ لکھا ہے"۔

علامہ کے اس سوال اور مولانا کے جواب کو علمی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل ہے' مگر افسوس ہے دونوں حضرات کے مکتوبات دست یاب نہیں ہیں۔

۱۸--- مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے ملاپ اور دونوں کے ایک ہی مقام پر تشریف فرما ہونے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو جو مالک رام کی کتاب "کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں" کے صفحہ ۹ سے یہاں درج کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "غالباً ۱۹۲۷ء کے اواخر کی بات ہے' سائمن کمیشن کی تشکیل اور اس کی ہندوستان

میں آمد کی تاریخ کا اعلان ہو چکا تھا- بیشتر سیاسی حلقے اس پر سخت ناراض بلکہ برافروختہ تھے کہ کمیشن میں کوئی ہندوستانی نہیں لیا گیا تھا' اس لیے اکثر جماعتوں نے کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا- لاہور کے سر محمد شفیع اور ان کے ہم نوا بائیکاٹ کے حق میں نہیں تھے- لاہور میں جلسہ ہوا' جس کا مقصد حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج کرنا اور لوگوں کو کمیشن کے بائیکاٹ کی ترغیب دلانا تھا- جلسہ غالباً موچی دروازے (یا شاید بھاٹی دروازے) کے باہر کمیٹی باغ میں ہوا تھا- اسٹیج پر من جملہ اور اصحاب کے مولانا آزاد اور علامہ اقبال اور مولانا محمد علی تشریف فرما تھے- مجھے آج تک یاد ہے کہ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ ہم نے اسلام کی تعلیم ان دونوں بزرگوں ---اقبال اور آزاد--- سے پائی- آج ایک ہمیں کمیشن سے تعاون کی تلقین کر رہے ہیں اور دوسرے اس کے بائیکاٹ کی- ہم عجب گومگو میں ہیں کہ کس کا تتبع کریں- (اس میں اشارہ اقبال کی فارسی مثنویات اسرار و رموز اور مولانا آزاد کے ہفت روزہ الہلال کی طرف تھا)

یہاں یہ یاد رہے کہ اقبال کا تعلق میاں سر محمد شفیع سے تھا اور ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ نہ کیا جائے' جب کہ مولانا آزاد اور مولانا محمد علی وغیرہ بائیکاٹ کی مہم چلا رہے تھے-

۱۹--- مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک سے زائد مرتبہ بتایا کہ مولانا لاہور تشریف لاتے تو زیادہ تر میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا کی کوٹھی (بیرون یکی دروازہ) میں قیام فرماتے تھے- بے شمار لوگ ان سے ملاقات کے لیے وہاں آتے تھے- علامہ اقبال خاص طور سے آتے اور مختلف مسائل پر مولانا سے گفتگو فرماتے- ایک مرتبہ وہ اپنے چند دوستوں کے ساتھ آئے' جن میں ان کے بے تکلف دوست چوہدری شہاب الدین بھی تھے- علامہ نے مولانا سے کوئی بات پوچھی' مولانا نے تفصیل سے جواب دیا- اب علامہ مطمئن ہو گئے تھے- مزید سوال کی یا بحث کی ضرورت نہ تھی' لیکن چوہدری شہاب الدین چونکہ علامہ سے نہایت بے تکلفانہ مراسم رکھتے تھے اور بالعموم ان سے پنجابی میں بات کیا کرتے تھے' اس لیے انھوں نے علامہ سے پنجابی میں کہا:

اوئے ساڈے نال او کھا ہوندا سیں' ہن کر گل

مولانا آزاد تو ان کی بات سمجھ نہیں پائے لہذا خاموش رہے' لیکن دوسرے حاضرین مجلس چوہدری صاحب کے انداز کلام سے بہت محظوظ ہوئے۔

یہ ۱۹۳۱ء کے لگ بھگ کی بات ہے۔

۲۰---اقبال نامہ حصہ اول میں سید صاحب کے نام علامہ کا ایک خط ۷ اگست ۱۹۳۶ء کا لکھا ہوا' مندرج ہے' جس کے چند الفاظ یہ ہیں:

الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں' مگر حال کے روشن خیال علما کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔

۲۱--- علامہ اقبال کی وفات کا حادثہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو پیش آیا تھا۔ اس سے چار دن بعد ۲۵ اپریل ۱۹۳۸ء کو مولانا آزاد نے مولانا محی الدین احمد قصوری کے نام کلکتے سے خط لکھا جو "تبرکات آزاد" کے صفحہ ۴۷ پر درج ہے۔ خط کا نمبر ۱۶ ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

اقبال کی موت سے نہایت قلق ہوا۔
بہت آگے گئے باقی جو ہیں طیار بیٹھے ہیں۔

ان الفاظ کے حاشیے میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"مولانا نے اس قلق انگیز واقعے پر ایک بیان بھی دیا تھا۔ یہ چند الفاظ ہیں' لیکن دیکھیے ان میں دردِ دل کس طرح کھنچ آیا ہے۔"

مولانا تیار کو "طیار" لکھا کرتے تھے' ہم نے یہاں وہی لفظ رہنے دیا ہے جو انھوں نے استعمال فرمایا تھا۔ اور یہی درست ہے۔

۲۲--- اقبال کی وفات پر مولانا آزاد کا ایک تعزیتی بیان افضل حق قرشی نے عبداللہ انور بیگ کی کتاب دی پوئٹ آف دی ایسٹ (انگریزی) کے صفحہ ۵۶ سے "اقبال کے ممدوح علما" میں نقل کیا ہے:۔

یہ تصور کس قدر الم ناک ہے کہ اقبال ہم میں نہیں۔ جدید ہندوستان اردو کا اس سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکتا۔ ان کی فارسی شاعری کا بھی جدید فارسی ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔ یہ تنہا ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ پورے مشرق کا نقصان ہے۔ ذاتی طور پر میں ایک پرانے دوست سے محروم ہو گیا ہوں۔

۲۳---"غبار خاطر" کے مکتوب نمبر ۲۰ میں جو ۱۸ مارچ ۱۹۴۳ء کا تحریر فرمودہ ہے' مولانا نے اقبال کا ایک شعر درج کیا ہے جو یہ ہے-

تا تو بیدار شوی' نالہ کشیدم' ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

[یہ شعر زبور عجم (طبع دوم' اپریل ۱۹۴۴ء) کے صفحہ ۱۰۱ پر مرقوم ہے]

مالک رام نے اپنی مرتبہ "غبار خاطر" میں لکھا ہے کہ سید مقبول حسین وصل گرامی نے ماہانہ رسالہ "مرقع" جاری کرنے کا فیصلہ کیا تو انھوں نے اقبال سے درخواست کی کہ "مرقع" کے سرورق پر چھاپنے کے لیے کوئی شعر عنایت فرمایے- اس پر اقبال نے یہی شعر لکھ بھیجا- تین برس تک یہ "مرقع" کے سرلوح پر چھپتا رہا-

غبار خاطر مولانا کی نہایت مقبول و مشہور کتاب ہے- مالک رام صاحب نے بڑی محنت سے اس کے عربی' فارسی اور اردو اشعار کی تخریج کی ہے اور حل طلب مقامات پر حواشی لکھے ہیں-

یہ کتاب مختلف اوقات میں بہت سے ناشروں نے شائع کی ہے مگر مکتبہ رشیدیہ لاہور کا ایڈیشن کاغذ' کتابت' جلد وغیرہ میں سب سے بازی لے گیا- اس میں ایک قابل تحسین کام یہ کیا گیا ہے کہ فارسی اور عربی کے اشعار کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے- اب فارسی اور عربی سے ناواقف حضرات اس سے پورا استفادہ کر سکتے ہیں-

کتاب میں کم و بیش سات سو شعر ہیں' جن کی تخریج کی گئی ہے- دو سو اردو کے اور پانچ سو عربی و فارسی کے ------ ان کی تخریج کا نہایت اہم کام مالک رام نے کیا اور ان کا ترجمہ مکتبہ رشیدیہ کے مالک و مدیر حافظ عبدالرشید ارشد کی محنت و کوشش سے ہوا-

یہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے باہمی مراسم و علائق کی ایک جھلک--- کوئی اہم مسئلہ درپیش ہو تو علامہ خود بھی مولانا سے دریافت کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی ان کے علم و فضل سے مستفید ہونے کا مشورہ دیتے ہیں--- ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنی تصانیف ان کو بھجواتے ہیں- ان کے اخبار (الہلال) کے لیے خریدار مہیا کرتے ہیں- مولانا بھی ان کے فکر و فن' شاعرانہ کمالات اور فلسفہ و حکمت کے قدردان ہیں اور برملا اس کا اظہار فرماتے ہیں' بلکہ انھیں ملک الشعرا کا خطاب دینے کی تجویز پیش کرتے ہیں- ان کے

اردو کلام کو عربی کا جامہ پہناتے ہیں- اپنے اخبار (البلاغ) کے صفحہ اول پر ان کا کلام شائع کرتے ہیں' جب کہ ان کے علاوہ اس سے قبل یا بعد کسی بڑے سے بڑے شاعر کا کلام الہلال یا البلاغ کے پہلے صفحے پر چھپنے کا اعزاز حاصل نہیں کر پایا-

اپنی معروف کتاب غبار خاطر میں ان کا شعر درج کرتے ہیں' حالاں کہ اس کتاب میں ان کے کسی معاصر شاعر کا کوئی شعر درج نہیں ہوا-

ان کی وفات پر بیان دیتے ہیں' جس میں گہرے حزن وملال کا اظہار کیا جاتا ہے-

معلوم نہیں بعض لوگ کیوں ان کو باہم لڑانے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنے پر زور دیتے ہیں' جب کہ یہ دونوں دوست ہیں --! اور ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ کرتے ہیں-

۹- اکتوبر ۱۹۹۰ء کے ہفت روزہ ''ندا'' (لاہور) میں ڈاکٹر محمد باقر (مرحوم) کا مولانا آزاد کے متعلق ایک دل چسپ اور معلومات افزا مضمون شائع ہوا تھا جو ان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے- اس میں مولانا کے بارے میں بعض ایسی چیزیں معرض بیان میں آئی ہیں' جن کا اکثر لوگوں کو علم نہیں ---- اس مضمون سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے ابتدائی عمر میں دہلی جا کر حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی استفادہ کیا تھا-

مولانا آزاد اگست ۱۸۸۸ (ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ) کو پیدا ہوئے اور حضرت میاں صاحب نے ۱۳- اکتوبر ۱۹۰۲ (۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ) کو وفات پائی- اس طرح میاں صاحب کی وفات کے وقت مولانا عمر کے پندرھویں سال میں داخل ہو گئے تھے اور مروّجہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہو چکے تھے-

مولانا نے حضرت میاں صاحب سے تعلق شاگردی کی بنا پر عارضی حکومت کے زمانہ وزارت میں میاں صاحب کی مسجد اور کتب خانے کے لیے کچھ رقم بھی منظور کی تھی جس کا اس مضمون سے پتا چلتا ہے-

اس مضمون کے بعض حصے یہاں درج کیے جا رہے ہیں- ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں-

ہندوستان میں میری نسل کے ہر آدمی نے مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سن رکھا تھا- میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا' جب ''الہلال'' شائع ہونا شروع ہوا- قیمت زیادہ تھی کہ اس زمانے میں چھ آٹھ آنے بڑی اہمیت کے حامل تھے' مگر یہ فقیر

کسی نہ کسی طرح اسے باقاعدگی سے خریدتا ہی رہا- اسی زمانے میں قرآن مجید کی تفسیر ترجمان القرآن کی اشاعت کے بارے میں اشتہار شائع ہوا- میری گلی میں رہنے والے ایک بزرگ دوست ڈاکٹر عبدالرشید نے مولانا کو اس تفسیر کا اشتہار دیکھ کر چند روپے بھجوائے تھے' لیکن مولانا اس اثنا میں گرفتار ہو کر جیل چلے گئے اور تفسیر کی اشاعت رک گئی- ڈاکٹر عبدالرشید نے (جو انگلستان کے فارغ التحصیل طبی معالج تھے اور محلّہ شیخاں گجرات کے رہنے والے تھے) پیشگی ترسیل زر کی رسید کئی سال سے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی- انھوں نے مجھے طلب فرمایا اور میں نے رسید کا حوالہ دے کر مولانا سے تفسیر قرآن بھجوانے کی درخواست کی- مولانا نے جواب میں تفسیر کی ایک جلد بھجوادی اور ساتھ ہی ایک خط لکھا' جس میں فرمایا کہ خدا کا شکر ہے مجھے اس قرضے سے نجات ملی-

اس سے بیس اکیس سال بعد جب ہندوستان میں قومی حکومت کی تشکیل ہوئی تو میں صوبہ دہلی کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر آف ایجوکیشن منتخب ہو کر وہاں پہنچا- انتخاب انڈین پبلک سروس کمیشن نے کیا- جس کے صدر عتیق الرحمٰن کے والد کرنل عبدالرحمٰن تھے جو طب کے ڈاکٹر تھے- قومی حکومت میں میرے پہلے وزیر ہندو تھے' دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد ہوئے اور سیکریٹری سرجان سارجنٹ------ مولانا فائلوں پر بعض احکام اردو میں لکھ دیتے- چوں کہ سرجان کو معلوم تھا کہ میں فارسی کا طالب علم ہوں' اس لیے وہ فوراً مجھے ٹیلی فون کرتے "مولانا نے کچھ فارسی میں لکھا ہے' آکر پڑھ دو-" میں سیکریٹریٹ پہنچ کر تعمیل کر دیتا- مولانا سے براہ راست بھی دفتری کام کی وجہ سے واسطہ پڑتا تھا-

سب سے پہلے رابطہ اس وقت قائم ہوا جب دہلی کے تمام مدارس نے یہ کہہ کر ہڑتال کر دی کہ ہماری گرانٹ اخراجات کے اعتبار سے سو فی صد کر دی جائے ورنہ ہم سکول نہیں چلائیں گے- صورت حال عجیب تھی- دہلی میں کوئی سرکاری سکول نہیں تھا' مختلف گروہ مثلاً گجراتی' بنگالی وغیرہ نہایت عمدہ عمارات میں نہایت شان دار سکول چلا رہے تھے- مسلمانوں نے بھی چار پانچ سکول بوسیدہ عمارتوں میں کھول رکھے تھے جن کے منیجر لیاقت علی خاں تھے- سکولوں کو گرانٹ حکومت ہند کی طرف سے میں ہی منظور اور ادا کرتا تھا- ہندو گرانٹ لینے کے ماہرانہ طریقے استعمال کرتے اور مسلمان بالکل پھسڈی تھے- نتیجہ یہ تھا کہ بیشتر

روپیہ ہندوؤں کے پاس چلا جاتا۔ بہر صورت اس قضیے کے وقت تیس فی صد اخراجات کی گرانٹ میں دے رہا تھا۔ جب سکولوں میں ہڑتال ہو گئی تو مولانا نے مجھے طلب فرمایا۔ مسئلہ ان کے ہندو پیشرو راج گوپال آچاریہ کے وقت سے چل رہا تھا جس نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا" میں قومی حکومت ہند کا دیوالہ نکالنے نہیں آیا' میں اس سے زیادہ گرانٹ نہیں دوں گا۔"

مولانا نے بات سنی تو پوچھا کہ پبلک میں اس تحریک کی پشت پناہی کون کر رہا ہے؟ میں نے بتایا کہ یہ ایک لاہوری ہندو کانگرسی ہے (نام یاد نہیں رہا)۔ مولانا نے اسے فوراً بلوایا اور یہ طے ہوا کہ سکول کھول دیے جائیں۔ گرانٹ سو فی صد کر دی جائے گی یا حکومت سکول سنبھال لے گی۔ کیونکہ وائسرائے اور دوسرے وزرا اس صورت حال سے بہت پریشان ہیں' چنانچہ دوسرے دن سکول کھل گئے۔

ڈاکٹر محمد باقر لکھتے ہیں۔

مولانا اس فقیر کو کبھی دفتر اور کبھی گھر پر یاد فرماتے۔ پہلی دفعہ میں مکان پر پہنچا تو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ حکومت ہند کے وزیر کا ڈرائنگ روم اندازاً سو فٹ لمبا ہے جس کے ایک سرے پر صوفے پر مولانا بیٹھتے تھے اور ملاقاتی ان کے قریب ----- رخصت ہونے لگا تو میں نے دیکھا کہ مولانا کے صوفے پر سامنے لٹکے ہوئے کور کے نصف حصے پر بٹنوں کی گرونیں الٹی چھپی ہوئی تھیں۔ نیشنل حکومت نے آتے ہی سارا فرنگی فرنیچر اور فرش فروش بدل کر سودیسی سامان رکھ دیا تھا اور کھدر کے خوب صورت کور نہایت نفیس چھپائی کے ساتھ صوفوں پر بھی چڑھا دیے تھے۔

میں نے عرض کیا کہ میں دفتر کا درزی بھجوا دیتا ہوں جو یہ درست کر دے گا۔ (میرے پاس بھی امتحانی پرچے بند کرنے کے لیے درزی تھا) مولانا نے ایک نظر صوفے پر ڈالی اور فرمایا۔ "نہیں بھائی! میں یہ خود کروا لوں گا' لیکن ایک بات کہے دیتا ہوں کہ تم نے کیا نظر پائی ہے۔" محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں ذکر کیا ہے کہ دلی میں اپنی پالکی میں گزرتے ہوئے کوئی شاعر اگر راستے میں کوئی چارپائی پڑی ہوئی دیکھتے جس میں کان پڑی ہوتی تو پالکی رکوا کر اس وقت تک وہاں رکے رہتے' جب تک وہ کان درست نہ ہو جاتی ----- اس کی طرف اشارہ تھا۔

ایک دفعہ مولانا نے یاد فرمایا اور ایک ہندو خاتون سے تعارف کرایا۔ پھر کہا "آپ کے ہاں انسپکٹرس آف سکولز کی ایک اسامی خالی ہے' پبلک سروس کمیشن نے اشتہار دیا ہے' انھوں نے بھی عرضی دی ہے۔ بھائی! یہ چند سال پہلے بھی اس عہدے پر مامور تھیں' سروس کمیشن میں آپ محکمے کی نمائندگی کرتے ہیں' ان کے خاوند جیل میں ایک دفعہ میرے سیل (Cell) میں بھی رہ چکے ہیں' بڑے کام کے آدمی تھے' اب سرگباش ہو چکے ہیں۔" میں مدد کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

دفتر میں آکر خاتون کی فائل نکلوائی تو معلوم ہوا کہ اس پر میرے پیشرو مسٹر چیٹر جی (لاہور والے چیٹر جی' پرنسپل گورنمنٹ کالج کے بڑے بھائی) نے خاتون کے خلاف شدید الزامات لگا کر ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ ویسے تعلیمی اعتبار سے وہ اس عہدے کے لیے ہر طرح موزوں تھیں۔ میرے ہندو پی۔اے نے اطلاع بہم پہنچائی کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب الزامات غلط تھے' لیکن خاتون کے خاوند کٹر کانگرسی اور جوشیلے آدمی تھے۔ سال میں ایک دو مہینے جیل سے باہر رہتے اور پھر جیل چلے جاتے۔ وائسرائے کے کہنے پر تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ ان صاحب کی بیوی محکمہ تعلیم میں افسر ہے اور معقول مشاہرہ لے رہی ہے۔ گھر بار اسی یافت سے چلتا ہے۔ بال بچے بھی ہیں' لیکن انھوں نے کوئی غم پال نہیں رکھا۔ انگریز کے خلاف تقریریں کر کے قید ہو جاتے ہیں۔ رہا ہوتے ہیں تو سرکاری کوٹھی میں اہلیہ کے ساتھ رہتے ہیں اور پھر یہی عمل دہرا کر جیل میں پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ وائسرائے نے اپنے وسائل سے ڈائریکٹر تعلیم صوبہ دہلی سے کہلوایا کہ خاتون کو ملازمت سے فارغ کر دیا جائے۔ چیٹر جی صاحب نے اسی وقت یہ فائل تیار کی اور وائسرائے کا حکم بجالائے۔

میں نے انٹرویو کے وقت ساری کہانی سروس کمیشن میں دہرادی اور نیشنل گورنمنٹ میں خاتون کو دوبارہ ملازمت مل گئی۔ انھوں نے کام سنبھالنے والے دن مجھے عرضی دی کہ انھیں ان تین سال کی تنخواہ اور تنخواہ میں اضافے بھی دیے جائیں جو وہ ملازمت سے باہر رہی ہیں۔ میں نے دفتر سے پوچھا اور پھر A-G-C-R (اکاؤنٹنٹ سنٹرل ریونیو) سے مشورہ کیا۔ وہ ملازمت کا گھسا پٹا مدراسی بڑا تجربہ کار انسان اور انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کا آدمی تھا' کہنے لگا: "اگر وائسرائے بھی کہے تو میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یہ صحیح ہے کہ اس خاتون کو کسی قصور کے بغیر سزا دی گئی۔ لیکن جو ملازمت اس نے کی نہیں اور اس کے فرائض

بجا لا کر کوئی اور آدمی اس اسامی کی تنخواہ وصول کرتا رہا ہے' اس کی تنخواہ دوسری دفعہ میں اسے کیسے ادا کر سکتا ہوں۔"

اگلے دن میں نے سارا قصہ مولانا کو سنایا تو فرمایا: "بھائی! آپ کا شکریہ' لیکن قانون کی خلاف ورزی کیسے کی جا سکتی ہے؟"

اس زمانے میں ایسٹ بنگال' صوبہ سرحد' بلوچستان' سنٹرل انڈیا' شملہ' اجمیر اور مارواڑ کے تعلیمی مسائل بھی حکومت ہند سے وابستہ اور مجھ سے متعلق تھے۔ انجمن ترقی اردو سے مولوی عبدالحق کے ایک معاون مولوی عبدالرشید تبسم گرانٹ کے لیے تشریف لائے۔ یہ کام بھی میرے سپرد تھا۔ چند دنوں کے بعد مولوی صاحب بھی آئے اور انھوں نے میرے دفتر میں بیٹھ کر لیاقت علی خان وزیر خزانہ کو عادتاً بے نقط سنائیں۔ میں نے مولانا سے ذکر کیا۔ فرمایا: "بھائی! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں' اگر تم انجمن ترقی اردو کو گرانٹ دے دو---- لیکن یہ سوچ لو کہ اس کے ساتھ ہی سارے ہندوستان سے ہندوؤں کے اسی نوع کے سیکڑوں اداروں سے گرانٹ کا تقاضا ہو گا' پھر کیا کرو گے؟" چنانچہ انجمن کو گرانٹ نہ دی جا سکی۔

ڈاکٹر باقر رقم فرماتے ہیں۔

ایک دن میں نے جامعہ ملیہ (دہلی) کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سے کہا کہ آپ نیشنل گورنمنٹ سے گرانٹ کی درخواست کریں جو آپ کا حق ہے اور مولانا سے بھی ذکر کیا' انھوں نے فرمایا: "ہاں بھائی! میں منظور کر دوں گا۔"

چند دن بعد میں نے ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا تو آپ نے فوراً جواب دیا۔ "نیشنل گورنمنٹ ہو یا انگریز کی حکومت' جامعہ ملیہ نے آج تک کبھی کسی حکومت کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور ایک پیسے کی امداد بھی نہیں لی۔"

میں نے مایوس ہو کر پھر مولانا سے کہا۔ آپ نے فرمایا: "میں کیا کر سکتا ہوں؟ اگر درخواست ہی نہ ہو تو گرانٹ کیسے منظور کی جا سکتی ہے۔

پھر کچھ سوچ کر کہا کہ اگر تم چاہتے ہو تو خود فائل چلا دو۔

میں نے سر جان سارجنٹ سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو کبھی دیکھا ہی نہیں' جامعہ ملیہ کا نام سنا ہے۔ ان سے ملاقات تو کراؤ' پھر فائل بھیجنا۔ اگلے روز

ڈاکٹر صاحب حسب معمول ملنے آئے تو میں انھیں بتائے بغیر اپنی گاڑی میں ڈال کر سیکرٹریٹ لے گیا اور راستے میں بتایا کہ سرجان آپ کی شکل دیکھنا چاہتا ہے۔

سرجان سے آدھا گھنٹہ ملاقات رہی۔ باہر نکل کر ڈاکٹر صاحب ادکھلے چلے گئے اور میں نے دفتر پہنچ کر گرانٹ کی سفارش کر دی جو منظور ہو گئی۔ یہ پہلی گرانٹ تھی جو پچاس سال کے بعد جامعہ ملیہ کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے منظور کی۔ غالباً چار پانچ لاکھ تھی۔ صحیح رقم یاد نہیں۔

ڈاکٹر محمد باقر تحریر کرتے ہیں:

فقیر اپنے تجسس کی خاطر غالب کے قدیم مکان اور محلّہ پھاٹک حبش خاں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی دوران ایک مطبوعہ فہرست ایسی مل گئی جس سے یہ نشان دہی ہوئی کہ مولانا ابوالکلام آزاد پھاٹک حبش خان کے قریب مولانا سید نذیر حسین کی مسجد میں زیر تعلیم رہے ہیں اور مولانا نذیر حسین کے شاگرد ------! قریب ہی مولانا نذیر حسین مرحوم کا رہائشی مکان تھا جس میں یادگار چیزیں محفوظ تھیں۔ ان میں ایک جبہ اور دستار بھی تھی جو حکومت حجاز کی طرف سے بھجوائی گئی تھی۔ غالب کا رہائشی مکان اور مولانا نذیر حسین کی مسجد وغیرہ فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے نہایت پژمردہ حالت میں تھے۔ میں نے واپسی پر مولانا سے ذکر کیا ----فرمایا:

"بھائی! تم کہاں جا نکلے اور میرا ماضی ڈھونڈ نکالا۔"

میں نے درخواست کی کہ غالب کے مکان اور مولانا نذیر حسین کی مسجد' مکان اور کتب خانے کو محفوظ کرنے کے لیے خصوصی فنڈز ملنے چاہئیں۔

مولانا نے یہ درخواست منظور کر لی۔ میں نے اگلے دن دفتر سے فائل چلا دی۔ دوسرے دن چیک موصول ہو گیا جو منتظمین کے حوالے کر دیا گیا۔ معلوم نہیں اب پھاٹک حبش خاں کے قریب مولانا نذیر حسین کی مسجد اور مکان ہے یا نہیں ----- رہے نام اللہ کا۔

مولانا آزاد سے مولانا نذیر حسین کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں۔ کہنے لگے' آج کل کے معجزات کا میں قائل نہیں' لیکن معروف ہے کہ اسی مسجد کے صحن میں مولانا نذیر حسین درس دیا کرتے تھے' جسے تم دیکھ آئے ہو۔ گلی تنگ ہے' سامنے کے مکان کی سب سے اوپر کی منزل سے ایک کناسہ روز میلا پھینک دیا کرتی تھی جس کا کچھ حصہ کبھی کبھی مسجد کے صحن میں

بھی آگرتا- مولانا نذیر حسین نے اس پر ناراضی کا اظہار کیا لیکن کناسہ باز نہ آئی- ایک دن مولانا نذیر حسین درس دے رہے تھے کہ کناسہ نے یہی حرکت دہرائی- مولانا نذیر حسین نے مکان کی چھت کی طرف دیکھا اور فرمایا- "ہم نے تمھیں روکا تھا لیکن تم باز نہیں آئیں-"

لوگوں کا بیان ہے کہ اسی روز کناسہ میلا پھینکتے ہوئے اس کے ساتھ ہی گلی میں آکر گری اور وہیں ڈھیر ہو گئی- واللہ اعلم بالصواب-

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

مولانا کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خاں صاحب اکثر تشریف لایا کرتے تھے- ایک دن اس وقت آئے جب خواجہ عبدالحمید عرفانی میرے پاس تشریف رکھتے تھے- وہ اس وقت گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں انگریزی کے استاد اور وائس پرنسپل تھے- یہ ۱۹۴۶ء کے اواخر کی بات ہے- اجمل خاں صاحب سے عرفانی کا تعارف ہوا تو میں نے بتایا- "یہ چند سال سے ایران میں عارضی طور پر ایرانیوں کو انگریزی پڑھا رہے ہیں- انگریز نے عارضی طور پر ان کی خدمات مستعار لی ہوئی ہیں- اب چوں کہ انگریز ہندوستان سے جا رہا ہے' اس لیے انھیں اور دوسرے ہندی ملازمین کو ایران کی سفارتوں سے فارغ کر دیا گیا ہے-

اجمل خاں نے کہا کہ اب ایران میں ہندی سفارت قائم ہو گی تو ایسے آدمیوں کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے' چنانچہ ان کے مشورے سے میں نے مولانا آزاد سے عرفانی کا تذکرہ کیا- مولانا نے عرفانی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو میں نے اگلے دن عرفانی کو مولانا سے ملا دیا- مولانا کی غبار خاطر تازہ تازہ شائع ہوئی تھی- مولانا نے اسے میز سے اٹھا کر عرفانی سے کہا: "کہیں سے ایک آدھ باب کا فارسی ترجمہ کرا لایے----"

عرفانی کتاب لے کر گھر آ گئے- میرے پاس ہی ٹھہرے ہوئے تھے- انھوں نے اگلی صبح تک تقریباً ساری کتاب ترجمہ کر ڈالی- اجازت لے کر ہم دونوں پھر سیکریٹریٹ میں حاضر ہوئے تو ترجمہ پڑھ کر مولانا عش عش کر اٹھے- حالاں کہ عرفانی کا خط شکستہ تھا اور اسے پڑھنا بہت مشکل تھا- مولانا نے سٹینو کو بلا کر حکم لکھوایا کہ استقلال ہند کے بعد جب تہران میں سفارت ہند قائم ہو تو عرفانی کو وہاں وابستہ مطبوعاتی لگا دیا جائے- اس پر عمل بھی ہوا' لیکن اتنے میں تہران میں سفارت پاکستان بھی قائم ہو گئی اور عرفانی پاکستان OPT (انتخاب)

کر کے وہاں سے چلے گئے' پھر ساری عمر ایران میں گزار دی۔

میرے چند مسلمان احباب سیکریٹریٹ میں اونچے مناصب پر فائز تھے۔ میں سیکرٹیریٹ جاتا تو ان سے ملاقات ہوتی۔ فقیر نے اس دوران میں مولانا اور اپنے دوسرے وزیر پٹیل کو نہایت ایمان دار' نڈر اور اعلیٰ صفات کے حامل انسان پایا۔ پٹیل کے سپرد حکومت ہند نے پرائمری کی لازمی مفت تعلیم کا منصوبہ کیا تھا اور ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں:

۱۹۴۷ء کے معائنے مکمل کرنے کے لیے مجھے ایک دفعہ شملہ جانا تھا۔ مولانا نے بتایا کہ وہ بھی عنقریب چند دنوں کے لیے اپنا دفتر تابستان کے لیے حسب معمول شملہ لے جا رہے ہیں۔ میں نے بھی اپنا برنامہ انہی دنوں کے لیے تیار کر لیا اور اہلیہ اور بچے لے کر شملے پہنچ گیا۔ انگریز نے مرکزی حکومت کے عمال کے لیے شملہ کا گرینڈ ہوٹل اپنایا ہوا تھا جس میں چپراسی سے لے کر وزیر تک کی رہائش اور خوراک کا درجہ بدرجہ انتظام تھا۔ افسروں کا کھانا کھانے کا کمرہ ایک وسیع ہال تھا جس میں مولانا ایک کونے میں سب سے پہلی میز پر بیٹھتے تھے۔ دفتر لڈلو کاسل (Ludlow Castle) میں تھا۔ پہلے دن میں سلام کے لیے بھی حاضر ہوا۔

ہم شملہ میں ہی تھے کہ انگریز نے تقسیم ملک کا اعلان کر دیا۔ مولانا نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ جوں ہی اعلان ہو' مجھے اطلاع کر دینا۔ میں تمھیں پاکستان جانے کی اجازت دے دوں گا۔ اعلان شام کی خبروں میں ریڈیو پر ہوا تو اگلی صبح کھانے کے ہال میں پہنچ کر اہلیہ نے کہا۔

"مولانا تشریف رکھتے ہیں' آپ انھیں ان کا وعدہ یاد کرائیں۔"

لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے تو میں نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ میں ان کے سامنے جا کر رکا ہی تھا کہ آپ نے فرمایا۔

"ہاں بھائی! اعلان ہو گیا ہے اور پاکستان بن گیا ہے۔ آپ کو وہاں جانا چاہیے۔"

"میں شکریہ ادا کر کے اپنی میز پر آ گیا۔"

دہلی واپس آ کر میں نے اپنے انتخاب کے کاغذ مولانا کے سامنے رکھے تو آپ نے بلا تامل دستخط کر دیے۔ ہند سرکار نے اپنے تمام ملازموں کو فارم تقسیم کیے جن میں انتخاب کے تین خانے بنے ہوئے تھے۔

(۱) کیا آپ مستقل طور پر ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں؟

(۲) کیا آپ تقسیم کے بعد پہلے چھے ماہ یا پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں؟ یا

(۳) آپ مستقل طور پر پاکستان میں رہنا چاہتے ہیں؟

ظاہر ہے کہ ہم جیسے لوگوں نے تیسرے خانے میں مثبت جواب پر کر دیا تھا۔

یہ تھے مولانا آزاد کے بارے میں ڈاکٹر محمد باقر مرحوم کے چند تاثرات اور مشاہدات----!

گزشتہ چند سالوں میں جتنا کچھ مولانا آزاد پر لکھا گیا ہے' اتنا ان کے کسی معاصر کے بارے میں نہیں لکھا گیا۔ ان کے متعلق پاکستان اور ہندوستان کے اہل قلم نے بے حد معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ہر مصنف اور ہر مضمون نگار کا اپنا انداز نگارش اور اپنا اسلوب تحقیق ہے۔ کسی نے ان کی تفسیر کو موضوع فکر بنایا اور ان کے فہم قرآن کی وضاحت کی' کسی نے ان کی عام فضیلت علمی کو اجاگر کیا' کسی نے ان کی ادبی حیثیت کو نمایاں کرنے کی سعی کی' کسی نے ان کی صحافت کے مختلف پہلوؤں کو منقح کیا' کسی نے ان کی ذہانت اور معاملہ فہمی کو ہدف بحث بنایا' کسی نے ان کے عزم راسخ اور تحمل و بردباری کے واقعات بیان کیے' کسی نے ان کے سیاسی کارناموں اور برصغیر کی آزادی کے لیے ان کی بے پناہ تگ و تاز کی صراحت کی' کسی نے ان کی ان خدمات کا تذکرہ کیا جو انھوں نے آزادی کے بعد سر انجام دیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ان کی مساعی کا خاص طور سے ذکر کیا' کسی نے ان کی اس جدوجہد کا جائزہ لیا جو تقسیم برصغیر کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے مختلف تدریسی اور تصنیفی اداروں کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے کی۔ مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' جامعہ ملیہ دہلی' مدرسہ عالیہ کلکتہ' عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) رام پور کی رضا لائبریری' دار المصنفین اعظم گڑھ اور دیگر بہت سے اداروں کے تحفظ و استحکام کے لیے انھوں نے جو کوششیں کیں' وہ دوسرا کوئی شخص نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی تفصیلات ان کتابوں میں مرقوم ہیں جو ان کی وفات کے بعد ضبط تحریر میں آئیں۔

حال ہی میں "آثار و نقوش" کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جو ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے مرتب کی ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد کے ان بہت سے تاریخی و سیاسی خطوط و احکام اور ہدایات کے مجموعے کا ایک حصہ ہے جو انھوں نے ہندوستان کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے جاری کیے۔ کتاب نہایت معلومات افزا ہے اور مکتبہ شاہد علی گڑھ کالونی کراچی

نے شائع کی ہے۔

مولانا ہندوستان کے وزیر تعلیم اور وزیر امور ثقافت تھے‘ لیکن ان کی شخصیت ہمہ گیر اور جامع حیثیت کی حامل تھی۔ کتاب ”آثار و نقوش“ بتاتی ہے کہ ملک کے تمام امور پر ان کی نگاہ تھی اور وہ چاہتے تھے کہ تمام مسائل خوب صورتی سے حل کیے جائیں۔ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جو فسادات ہوئے اور دونوں ملکوں کی آبادیاں ادھر سے ادھر منتقل ہوئیں‘ اس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں اور بے شمار مسائل ابھر آئے تھے‘ مولانا نے پیچیدگیاں ختم کرنے اور مسائل حل کرنے کے لیے بے حد کوشش کی۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) مشرقی پنجاب کی مسجدوں میں سکھ اور ہندو پناہ گزیں قابض ہو کر بیٹھ گئے تھے‘ مولانا نے اس وقت کے وزیر اعلیٰ مشرقی پنجاب بھیم سین سچر کو بار بار لکھا اور ان پر زور دیا کہ مسجدیں واگزار کرائی جائیں اور پناہ گزینوں کو ان سے نکالا جائے‘ چنانچہ بہت سی مسجدیں واگزار کرائی گئیں۔

(۲) الور‘ بھرت پور اور راجستان کے علاقوں کی مسجدوں پر بھی غیر مسلم پناہ گزینوں نے قبضہ کر لیا تھا‘ وہاں کی حکومت کو بھی ان مساجد کی واگزاری کے لیے متعدد بار خطوط لکھے اور اس مقصد میں انھیں کامیابی ہوئی۔

(۳) بمبئی کے بعض علاقوں کی مسجدوں میں بھی پناہ گزیں گھس گئے تھے‘ وہ بھی مولانا کی کوشش سے مسلمانوں کے لیے واگزار ہوئیں۔

(۴) سرہند میں مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی درگاہ بالکل خستہ حال ہوگئی تھی‘ مولانا کے کہنے سے اس کی مرمت کرائی گئی اور اسے بہتر حالت میں لایا گیا۔

(۵) ہندوستان کے مسلم اوقاف میں جو بدانتظامی پیدا ہوگئی تھی اور زبوں حالی کا دور دورہ ہوگیا تھا‘ اسے مولانا نے ختم کرایا۔

(۶) ہندوستان کے مختلف علاقوں کی مساجد کے ساتھ جو جائدادیں ملحق تھیں‘ ان پر غیر مسلموں نے قبضہ کر لیا تھا‘ مولانا نے کوشش کر کے وہ جائدادیں ان کے تصرف سے آزاد کرائیں اور انھیں مسجدوں کی انجمنوں کی تحویل میں دیا گیا۔

(۷) تقسیم ہند کے بعد ایک بہت بڑا مسئلہ یہ پیدا ہوگیا تھا کہ جن خاندانوں کے کچھ افراد

ہندوستان کی سکونت ترک کر کے پاکستان آگئے تھے اور کچھ وہیں رہ گئے تھے' ان کی جائدادوں کو متروکہ املاک قرار دے کر کسٹوڈین نے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس طرح بے شمار مسلمان ہندوستان میں رہ کر بھی اپنی جائداد و املاک سے محروم ہو گئے تھے اور ان کے پاس وہاں کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مسئلے میں خاص طور سے دلچسپی لی اور اس دور کے وزیر آبادکاری اجیت پرشاد جین کو توجہ دلائی۔ پھر مولانا کی کوشش سے ایسا قانون بنایا گیا' جس کی وجہ سے پاکستان آنے والے خاندانوں کے ان مسلمانوں کے حقوق کا جو ہندوستان میں رہ گئے تھے' تحفظ ہو گیا اور ان کی جائدادیں انھی کے پاس رہیں۔ جن مسلمانوں کی جائدادوں پر کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا تھا' وہ بھی انھیں واپس کر دی گئیں۔

بعض ہندو پناہ گزینوں پر اس کا شدید رد عمل ہوا تھا۔ اس کا اندازہ صوبہ سندھ سے ہندوستان جانے والے ایک مشہور سندھی لیڈر مسٹر چوتھ رام گڈوانی کے ان تاثرات سے ہوتا ہے جو ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ الفاظ یہ تھے۔

> ۲۱۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو مسلمان مہاجرین کی جائداد کے متعلق حکومت ہند نے جو نیا آرڈی نیس جاری کیا ہے' اس کے خلاف مسٹر چوتھ رام گڈوانی نے بہ طور احتجاج حکومت کو اپنا استعفا پیش کر دیا ہے اور دھمکی دی ہے کہ سندھی پناہ گزیں اس کے خلاف ستیہ گرہ کریں گے اور تحریک چلائیں گے' اس لیے کہ حکومت ہند نے مسلمانوں کے ساتھ رعایت کر کے ملک کو نقصان پہنچایا ہے' اور یہ رعایت مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تائید کا نتیجہ ہے جو مرکز میں وزارت تعلیم کے منصب پر فائز ہیں۔ (مولانا آزاد ــــ ایک سیاسی ڈائری ص ۴۴۳' ۴۴۴)

مولانا نے اس قسم کی دھمکیوں اور احتجاجوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ اگر انھوں نے مسلمانوں کی امداد کی اور ان کے فائدے کے لیے قانون بنوایا تو بالکل صحیح کیا' اس لیے کہ مسلمان بھی اسی ملک کے باشندے ہیں' جس ملک کے باشندے غیر مسلم ہیں۔

چھوٹے اور بڑے ہر مرتبے کے لوگ مولانا کی خدمت میں جاتے اور ان سے اپنے مسائل بیان کرتے تھے۔ مولانا ہر شخص کی بات غور سے سنتے اور اس کا کام کرانے کی پوری

کوشش فرماتے' اگرچہ یہ کام کسی محکمے اور وزارت سے متعلق ہوتا۔ ۱۹۵۳ء میں ہندوستان کے ریلوے وزیر لال بہادر شاستری تھے جو ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے وزیراعظم تھے اور وزیراعظم کی حیثیت سے بعارضہ قلب اس وقت ماسکو میں فوت ہوئے' جب روس کی مداخلت سے وہاں ان کا اس وقت کے پاکستانی صدر ایوب خاں سے سلسلہ گفتگو جاری تھا-----

مولانا نے ۲۸- اپریل ۱۹۵۳ء کو لال بہادر شاستری کے نام ایک شخص عبدالرحیم کے بارے میں مندرجہ ذیل خط لکھا-

"عبدالرحیم نے آپ کو جو درخواست بھیجی ہے' اس کی کاپی آپ کو بھیجتا ہوں- یہ ریلوے میں خلاصی تھا اور پاکستان چلا گیا تھا' مگر اس شرط کے ساتھ کہ چھ مہینے کے اندر اگر چاہے گا تو پھر انڈین سروس میں واپس آجائے گا- یہ وہاں سے واپس آگیا' لیکن پانچ برس سے بھوکا مر رہا ہے- اس کی درخواستوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا- کیا آپ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ یہ کوئی ریلوے آفیسر نہیں ہے' محض انجن کا خلاصی ہے- کیا ایک غریب خلاصی کے لیے ریلوے میں کوئی جگہ نہیں نکل سکتی؟

اندازہ کیجیے' یہ خط کتنا زوردار اور ہمدردانہ ہے جو ایک غریب مسلمان خلاصی کی ملازمت کے لیے لکھا گیا ہے-

پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے مولانا نہایت محبت کے جذبات رکھتے تھے- جولائی ۱۹۵۳ء میں راجا غضنفر علی خاں پاکستان کی طرف سے ہندوستان کے سفیر مقرر ہو کر دہلی گئے تو مولانا نے نہایت خوشی کا اظہار کیا اور انھیں مبارک باد دی- پھر ۱۶- اگست ۱۹۵۳ء کو اتوار کے روز ساڑھے چار بجے شام انھیں چاے پر بلایا اور دونوں ملکوں کی باہمی دلچسپی کے مسائل پر گفتگو کی اور آپس میں صلح و صفائی کے ساتھ رہنے پر زور دیا-

راجا غضنفر خاں نے ۱۷- اپریل ۱۹۶۳ء کو وفات پائی-

۲۲- مئی ۱۹۵۳ء کو اس وقت کے پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو مولانا نے خط لکھا کہ:

"آپ جولائی میں مسٹر محمد علی کو دہلی بھیجیے- مجھے یقین ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کا مسئلہ ہم حل کر کے رہیں گے-"

اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم محمد علی بوگرا تھے---ملک غلام محمد اکتوبر ۱۹۵۱ء سے اگست ۱۹۵۵ء تک پاکستان کے گورنر جنرل رہے-۲۹-اگست ۱۹۵۶ء کو فوت ہوئے-

محمد علی بوگرا کے ایک خط کے جواب میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"مجھے یاد نہیں کہ کبھی کلکتے میں آپ سے ملاقات ہوئی ہو' لیکن آپ کے مرحوم نانا میرے دوست تھے' اس لیے آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہو سکتے- میں آپ کو تہہ دل سے مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک نازک موقعے پر پاکستان کو صحیح لیڈ دی ہے اور پاکستان اور ہندوستان دونوں کی خدمت انجام دی ہے- میں آپ کو یقین دلاؤں گا کہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے' آپ دیکھ لیں گے کہ امن' دوستی اور برادرانہ آمادگی میں اس کی طرف سے کوئی کمی نہیں ہوگی-

آپ لندن میں جواہر لال سے ملئے اور پھر جولائی میں دہلی آیے- پاکستان اور ہندوستان کا پروبلم ہمیں حل کرنا ہے اور ہم حل کر کے رہیں گے-"

محمد علی بوگرا اپریل ۱۹۵۳ء سے اگست ۱۹۵۵ء تک پاکستان کی وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز رہے-۲۳-جنوری ۱۹۶۳ء کو فوت ہوئے-

مولانا کا یہ مکتوب گرامی ۲۳-مئی ۱۹۵۳ء کا تحریر فرمودہ ہے-

ان دنوں پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم لندن گئے ہوئے تھے-وہاں جانے کی دو وجہیں تھیں-ایک دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت-دوسرے ملکہ برطانیہ الزبتھ کے جشن تاج پوشی میں شمولیت----!

۲-جون ۱۹۵۳ء کو لندن کے دی-ایم گرجا گھر میں ملکہ کی تاج پوشی کی تقریب منعقد ہوئی تھی اور اس کے سات روز بعد پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم کی باہمی گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تھا-

پنڈت جواہر لال نہرو کی غیر موجودگی میں ہندوستان کے قائم مقام وزیر اعظم مولانا آزاد تھے' اس کا اعلان یکم جون کو سرکاری پریس نوٹ کے ذریعے کر دیا گیا تھا' جس کے الفاظ یہ تھے جو ہندوستان کے اخبارات میں شائع ہوئے تھے-

۳۱-مئی ۱۹۵۳ء کو حکومت ہند نے اعلان کیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد قائم مقام وزیر اعظم مقرر کیے گئے ہیں اور انھوں نے اس حیثیت سے کام شروع کر دیا

ہے۔

مولانا کی بہت بڑی تمنا اور کوشش یہ تھی کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو جھگڑے چل رہے ہیں' وہ جلد از جلد ختم ہوں اور دونوں ملکوں کے لوگ باہم صلح و آشتی کے ساتھ رہیں۔ انہی جذبات کا اظہار انھوں اس خط میں کیا جو پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو لکھا' یہی باتیں محمد علی بوگرا کو اس وقت لکھیں جب وہ پاکستان کے وزیر اعظم بنائے گئے اور اسی قسم کی گفتگو راجا غضنفر علی سے ہوئی۔

انہی دنوں جیسا کہ پہلے بتایا گیا جواہر لال دولت مشترکہ کے وزراے اعظم کی کانفرنس اور ملکہ الزبتھ کی تاج پوشی کی تقریب میں شرکت کے لیے لندن گئے تھے' مولانا نے انھیں لندن خط لکھ کر یہ معلوم کرنا چاہا کہ۔

"محمد علی سے جو باتیں ہوئیں اس کا امپریشن آپ پر کیا ہوا؟ مہربانی کر کے لکھیے۔"

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ پاکستان اور ہندوستان کے متنازعہ مسائل حل کرنے کے لیے کس درجہ بے تاب اور دونوں رہنماؤں کی ملاقات کے نتائج معلوم کرنے کے لیے کس قدر بے چین تھے۔

قائم مقام وزیر اعظم کی حیثیت سے مولانا ۱۳۔جون کو کشمیر بھی گئے اور کشمیر کے موضوع پر سری نگر میں شیخ عبداللہ سے گفتگو ہوئی۔ اس کی اطلاع بھی جواہر لال کو لندن دی اور لکھا:

"کل شیخ عبداللہ سے دو گھنٹے باتیں ہوئیں' آج پھر ہوں گی۔"

اس سے آگے لکھتے ہیں۔

"اب باتیں اصلی پروبلم پر ہو رہی ہیں۔ کل نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے ملوں گا۔"

مولانا چاہتے تھے کہ کشمیر کا مسئلہ جو اصلی پروبلم ہے' کسی نہ کسی طرح آبرومندانہ طور سے طے ہو جائے۔ لیکن افسوس ہے ان کی زندگی میں یہ نہ ہو سکا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ کیا حالات پیدا ہوتے ہیں اور معاملات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ کوشش بہر حال جاری رہنی چاہیے۔ لعل اللّٰہ یحدث بعد ذالك امرا۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ مولانا یورپ کے پہلے سفر پر ۱۸۔ مئی ۱۹۵۱ء کو بمبئی سے

روانہ ہوئے تھے- وہ ۲۱- مئی کو لندن پہنچے اور تقریباً وسط جون تک لندن میں مقیم رہے- اس اثنا میں وہاں انڈیا آفس لائبریری سے متعلق معاملات پر بھی اس شعبے کے ذمہ دار حضرات سے تفصیلی گفتگو ہوئی- لندن سے مولانا پیرس تشریف لے گئے' جہاں انھوں نے یونسکو کی چھٹی کانفرنس میں یونسکو کے نصب العین کے بارے میں ایک نہایت معلومات افزا خطبہ ارشاد فرمایا- پھر اٹلی' ترکی اور ایران کا دورہ کرتے ہوئے جون کے آخر میں کراچی آئے- یہاں چوبیس گھنٹے مقیم رہے اور قائداعظم محمد علی جناح کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور پھولوں کی چادر چڑھائی- اس کے بعد دہلی تشریف لے گئے-

یہاں یہ ہلکا پھلکا لطیفہ بھی سنتے جایے کہ جب ان کے پھولوں کی چادر چڑھانے کی خبر اخبارات میں چھپی تو عبداللہ بٹ مرحوم اور بعض دیگر حضرات نے کافی ہاؤس میں اسے ایک موضوع قرار دے لیا کہ سیاست بھی عجیب شے ہے جس نے ایک پکے وہابی کو بھی غیر وہابی اور اپنے سخت قسم کے سیاسی حریف کی قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانے کی "بدعت" کا ارتکاب کرنے پر مجبور کر دیا- اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر کافی ہاؤس میں کئی دن لطیفانہ سی گفتگو جاری رہی' جس میں متعدد حضرات اپنے فکر و خیال کے مطابق حصہ لیتے اور محفل کو گرماتے رہے-

حقیقت یہ ہے کہ یہ مولانا کی انتہائی عالی ظرفی اور بے حد بلند اخلاقی تھی جس میں ایک فوت شدہ رہنما کی تکریم کا جذبہ کار فرما تھا- مولانا نے کبھی کسی کو کسی معاملے میں اپنا حریف نہیں سمجھا' ان کے نزدیک ہر مسئلے کی حیثیت فقط نقطۂ نظر کے اختلاف کی تھی-

مولانا نے لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے سلسلے میں اس کے کارپردازوں سے مفصل گفتگو کی تھی- اس سلسلے میں ہم نے اپنے اخبار ہفت روزہ "الاعتصام" کے ۲۲- جون ۱۹۵۱ء کے شمارے میں "مولانا آزاد کا مطالبہ" کے عنوان سے حسب ذیل ادارتی شذرہ لکھا تھا-

"مولانا ابوالکلام آزاد نے لندن کی ایک پریس کانفرنس میں برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ انڈیا آفس کے ہندوستانی آثار قدیمہ' جن کی قیمت کئی کروڑ تک پہنچتی ہے اور جو تاریخی اعتبار سے بھی ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں' اب ہندوستان کو واپس دیے جائیں-

"مولانا کا کہنا ہے کہ انھوں نے ان آثار قدیمہ میں ہزاروں سال قبل کی تہذیب'

سنسکرت‘ ہندی‘ فارسی اور عربی وغیرہ زبانوں کے باتصویر مسودات کا بھی معائنہ کیا ہے‘ جنھیں بغیر کسی حق کے برطانوی حکومت اپنے قبضے میں لیے بیٹھی ہے۔

”ہم پاکستان کے ارکان حکومت سے بجا طور پر پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ انھوں نے بھی ملک کی تقسیم کے بعد بارہا یورپ کی سیر کی‘ لندن بھی گئے اور ہر مرتبہ پرانی یادگاریں دیکھیں‘ کیا ان میں سے کسی نے کبھی اس اہم معاملے کی طرف توجہ کی؟ کیا ان کے نزدیک انڈیا آفس کے آثار قدیمہ میں پاکستان کا کوئی حصہ نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو وہ اسے کیوں مرکز التفات نہیں ٹھہراتے؟ اور کیوں برطانیہ سے اپنے ان گراں بہا ثقافتی خزائن کا مطالبہ نہیں کرتے؟

”جب یہ ملک اس بات کا مدعی ہے کہ وہ اسلامی تہذیب اور اسلامی ثقافت کا مظہر ہے تو پھر کیوں ہندوستان کے ان مسلمان سلاطین کی یادگاروں کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جو آثار قدیمہ کے طور پر انڈیا آفس میں مقفل پڑی ہیں؟ ہندوستان کے وزیر تعلیم کی طرح کیا پاکستان کے وزیر تعلیم بھی ان ذخائر کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں۔“

مولانا کے اس مطالبے کے بعد اس سلسلے میں بہت سے پاکستانی اخباروں نے لکھا تھا اور حکومت سے کہا تھا کہ وہ اور کچھ نہیں کر سکتی یا کرنا نہیں چاہتی تو کم از کم یہی کرے کہ ہندوستان کے وزیر تعلیم سے رابطہ قائم کر کے ان سے کہا جائے کہ اس مسئلے میں دونوں ملک مشترکہ قدم اٹھائیں۔ اس وقت پاکستان کے وزیر تعلیم کرنل عابد حسین تھے‘ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام سے گفتگو کرنے کے لیے انھیں دہلی بھیجا گیا۔ لیکن دونوں ملکوں کے وزرائے تعلیم کے درمیان اس نہایت اہم مسئلے سے متعلق کیا گفتگو ہوئی اور کس انداز سے ہوئی۔ ہمارے وزیر تعلیم نے مولانا سے کیا فرمایا اور انھوں نے کیا جواب دیا‘ اس کا کچھ پتا نہ چل سکا۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا جون ۱۹۵۱ء کے آخر میں مولانا یورپ کے دورے سے واپسی پر دہلی جاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے کراچی رکے تھے۔ اس کا ذکر ہم نے ۲۷- جولائی ۱۹۵۱ء کے الاعتصام میں ”تاریخ کا ایک زریں باب --- ابوالکلام“ کے عنوان سے ایک مختصر سے مضمون میں کیا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے بعض حصے یہاں درج کر دیے

جائیں-اس سے ان علمائے کرام کے اخلاق کا بھی پتا چلے گا جو اس وقت کراچی میں تشریف فرما تھے اور حکومت کا کردار بھی سامنے آجائے گا---ملاحظہ فرمایئے:

"تنگ دلی و تنگ ظرفی کسی قوم کا اچھا کردار نہیں ہو سکتا- یہ کس درجہ افسوس ناک بات ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد بائیس گھنٹے کراچی میں تشریف فرما رہیں اور پاکستان کے ارباب حکومت کو ان کے خیر مقدم کی سعادت حاصل نہ ہو-نہ کراچی کے علمی و ثقافتی اداروں کی طرف سے انھیں دعوت دی جائے اور نہ کارپوریشن کو یہ توفیق نصیب ہو کہ ان کے اعزاز میں عصرانہ یا عشائیہ ترتیب دے سکے-

"مولانا کی حیثیت ہرگز ایک مقامی اور اقلیمی قائد کی نہیں، بلکہ ان کا شمار مشرق کے ان مایہ ناز حضرات میں ہوتا ہے، جن کے علم وادب اور ثقافت واخلاق پر پوری دنیائے اسلام ناز کر سکتی ہے-یہی وہ گراں قدر شخصیت ہیں جن کے شور قلم سے متحدہ ہندوستان میں پہلے پہل بیداری پیدا ہوئی، جن کے "الہلال" اور "تذکرہ" سے اسلامی ذہن ابھرا، جن کے "ترجمان القرآن" سے لوگوں کے دلوں میں اسلامیات سے حقیقی دلچسپی پیدا ہوئی اور جن کی قربانیوں اور ایثار سے آزادی کی دولت نے ہندوستان اور پاکستان کو مالا مال کیا- مولانا کا ذہن اس وقت بیدار ہوا اور ان کے قلب سلیم نے انگریز کی غلامی سے اس وقت توحش محسوس کیا، جب متحدہ ہندوستان کی اکثریت نے انگریز کی تقلید و اطاعت شعاری کے "طوق زریں" کو زیب گلو کر رکھا تھا-

"مولانا کا تدبر، مولانا کا استقلال اور اونچا کیریکٹر ہر شخص سے خراج تحسین وصول کرے گا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا ان کے افکار نکھرتے جائیں گے اور ان کے محاسن سے لوگوں کو آگاہی حاصل ہوتی جائے گی-اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھیں پاکستان سے نظری اختلاف تھا اور سب جانتے ہیں کہ وہ اختلاف اس وقت تک تھا جب تک کہ پاکستان نے حقیقت محسوسہ کی شکل اختیار نہیں کی تھی-جوں ہی بٹوارے کا اعلان ہوا اور پاکستان معرض ظہور میں آیا، مولانا نے اپنا انداز بدل لیا، اور شاید وہ پہلے سیاست دان ہیں، جھنوں نے یہ مشورہ دیا کہ اب

پاکستان کے مسلمانوں کو کانگرس سے کوئی عملی تعلق نہیں رکھنا چاہیے اور مسلم لیگ کو اپنی سیاسی جماعت ماننا چاہیے۔ اس کے بعد ان پانچ کروڑ مسلمانوں کے عزم و حوصلے کو بلند کرنے کے لیے، جنھیں پاکستان کی وجہ سے لازماً ہدف مصائب بننا پڑا، مولانا نے جو کوششیں کیں، تاریخ ان کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔

"مولانا کی حیثیت ایک موسسہ اور عملی ادارے کی ہے، یہی وجہ ہے کہ سوا پاکستان کے وہ جہاں گئے، ان کا خیر مقدم ہوا اور ہر ملک کے اکابر اور علمی شخصیتوں نے ان کا استقبال کیا۔ نہایت افسوس ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی پاکستان کے اکابر کے ذہنوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور رسمی اخلاق تک پیدا نہیں ہوئے ---- ابوالکلام آزاد کے بارے میں یہ بخل اور تنگ ظرفی ہمارے اندر کیوں ہے؟ کیا اس لیے کہ وہ مسلمان ہیں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں اور ہم ان سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا انتقام لینا چاہتے ہیں؟ یاد رہے کوئی اونچے اخلاق کا مسلمان اس طرز عمل سے خوش نہیں ہو سکتا۔ ہمیں پہلی رنجشیں ایک بہادر اور با اصول مسلمان کی طرح یکسر بھلا دینی چاہئیں۔ اور ابوالکلام آزاد داد کے مستحق ہیں کہ ان کا ذہن ہر قسم کی رنجشوں اور کدورتوں سے پاک ہے۔

"اس کے باوجود کہ ملک تقسیم ہو گیا ہے اور بٹوارے کی زبردست لکیر نے ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، لیکن علم نہیں بٹا ہے، اسلامی اخلاق و ثقافت کی میراث تقسیم نہیں ہوئی ہے اور تاریخ کے ان اوراق کو پھاڑ ڈالنے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے، جن کا ایک زریں باب ابوالکلام ہے۔

"حکومت پاکستان کے سرکاری اداروں کی طرف سے اس بارے میں اگر افسوس ناک تغافل ہوا ہے تو ہمیں اس پر تعجب نہیں، لیکن کراچی کے علما اور بے شمار علمی و ادبی حلقوں کو کیا ہو گیا کہ یہ بھی اپنے ہاں ابوالکلام کو نہیں بلا سکے۔ کیا علم اب انتار و بہ انحطاط ہو گیا ہے اور اخلاقی گراوٹ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اس خالص ادبی و دینی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے بھی ارباب اختیار کے اشارۂ چشم و ابرو کا انتظار رہتا ہے؟ کیا یہ وہی کراچی ہے جو پاکستان کا سب سے بڑا مرکز

ہے اور عالم اسلام کا دماغ ہے ؟ اگر یہاں کی مجبوریوں اور سرد مہریوں کا یہ حال ہے تو پھر توقع کس سے رکھی جائے ؟ کیا یہ وہی کراچی ہے جہاں ادارہ اسلامیات بھی ہے ؟ جہاں بڑے بڑے علمی اداروں اور مدارس کی بنیاد رکھی جارہی ہے ؟ اور کیا یہ وہ بلدۂ طیبہ ہے جہاں تصوف کے بڑے بڑے پیشہ ور جمع ہیں ؟ کیا ان سے یہ بھی نہیں ہو سکا کہ اس دور کی اہم اسلامی شخصیت کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کر لیتے ؟

"یاد رہے' اس سے ابوالکلام کی قطعاً توہین نہیں ہوئی- اس کا کام اور اس کی علمی و ادبی خدمات اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گی' لیکن ان بدلے ہوئے حالات میں بھی ہمارے اصحاب علم اور ارباب اختیار نے جو معاملہ ان سے کیا ہے' اسے ہمیشہ تنگ دلی ہی کہا جائے گا- تعجب ہے وہ لوگ بھی مولانا آزاد کے بارے میں باتیں کرتے ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کو تقدیر کے حوالے کر کے تنہا چھوڑ آئے تھے-"

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے جن فضائل و کمالات سے نوازا تھا' وہ فضائل و کمالات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پوری تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے آرہے ہیں- ان کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے انداز کے وہ واحد شخص تھے اور جو خصوصیات بارگاہ خداوندی سے انھیں عطا فرمائی گئی تھیں' ان میں کوئی ان کا حریف نہ تھا-

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ ۱۹۲۰ء کے بعد مولانا نے اپنا راستہ بدل لیا تھا اور ان کے افکار پہلے کے سے نہیں رہے تھے ----- یہ بالکل غلط بات ہے اور حالات سے عدم واقفیت اور مولانا کے افکار سے لاعلمی کی دلیل ہے- مولانا نے جو راستہ ابتدا میں اپنے لیے منتخب کر لیا تھا' آخر تک وہ اسی پر چلتے رہے- وہ راستہ تھا' ملک کو آزاد کرانے کا' مسلمانوں کی علمی اور فکری تربیت کا' اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا' مشکل سے مشکل حالات میں لوگوں کو صحیح سمت پر قائم رہنے کی تلقین کرنے کا اور کسی کی پروا کیے بغیر صحت مندانہ نقطہ نظر کی وضاحت کا ----- اس راستے سے وہ ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوئے-

۱۹۲۰ء کے بعد انھوں نے تفسیر ترجمان القرآن لکھی' اخبار "پیام" جاری کیا' عربی کا پندرہ روزہ "الجامعہ" جاری کیا' "البلاغ" جاری کیا' تحریک خلافت میں حصہ لیا' آزادی ملک

کے فیصلہ کن مرحلے طے کیے اور قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں' کرپس مشن سے ملاقاتیں ہوئیں' برطانوی وزارتی مشن سے گفتگو کے طویل سلسلے چلے' عارضی حکومت قائم ہوئی اور پھر وزارت تعلیم و ثقافت کا زمانہ آیا' جس میں انھوں نے مسلمانوں کی بے پناہ خدمت کی۔

مولانا پر اعتراض کرنے والے تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے حوالے کر کے پاکستان آ گئے تھے' اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کا سہارا مولانا ہی تھے اور وہ ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے مولانا کے پاس آتے تھے اور جس محکمے سے کام کا تعلق ہوتا' مولانا اس محکمے کے سربراہ سے رابطہ پیدا کر کے کام کرانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پاکستان کے لیڈرز مسلمانوں کے مخدوم ہیں اور مخدوموں کی یہاں لائنیں لگی ہوئی ہیں ----- اور مولانا آزاد ہندوستانی مسلمانوں کے خادم تھے۔

مولانا آزاد برصغیر کے مسلمانوں کے بہت بڑے خادم اور بہت بڑے خیر خواہ تھے اور ان کی خدمت اور قربانیوں کا دائرہ بہت وسیع بلکہ ہمہ گیر تھا' جس کی ایک جھلک گزشتہ سطور میں قارئین کرام کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

تحریک پاکستان سے مولانا ابوالکلام آزاد کو شدید اختلاف تھا۔ ان کے نقطہ نظر کی رو سے پاکستان کا قیام ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے مسائل کا حل نہ تھا' ان کا خیال تھا کہ اس سے الجھنیں بڑھیں گی اور نئے مسائل پیدا ہوں گے جو پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کے مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث بنیں گے' لیکن جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا' پاکستان معرض قیام میں آ گیا تو انھوں نے ہر موقعے پر اس کی حمایت کی اور دونوں ملکوں کے باشندوں پر زور دیا کہ وہ پاکستان کی حمایت کریں اور اسے مضبوط بنانے کے لیے کوشاں ہوں۔ اس لیے کہ برصغیر کے عوام بالخصوص اس خطے کے مسلمانوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ پاکستان مضبوط اور مستحکم ہو اور دونوں ملک صلح و آشتی سے رہیں۔ لیکن یہ حیران کن بات ہے کہ پاکستان کے بعض بزرجمہر اس کے باوجود ابوالکلام کے مخالف ہیں۔ وہ مر گیا ہے' اور اس کی سیاست ختم ہو گئی ہے' لیکن یہ اب بھی اس کی پچاس سال قبل کی سیاست سے خوف زدہ ہیں ---- اس کے برعکس جو لوگ تحریک پاکستان کے زمانے میں بھی اس تحریک کے مخالف تھے اور قیام پاکستان کے بعد بھی اس کے مخالف رہے اور مخالف ہیں اور اس کے رہنماؤں کے خلاف انھوں نے کتابیں لکھیں اور یہ تحقیق ہنوز جاری ہے اور مسلم لیگ کے موجودہ

رہنماؤں کو یہ تحقیق جاری رکھنے کی دھمکیاں بھی دی جاتی ہیں' وہ ان کے دوست اور حلیف قرار پائے ----- افسوس ہے ان پر جن کے ذہن مخالف اور موافق کو پہچاننے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں۔

میرے دورِ ادارت میں ہفت روزہ "الاعتصام" کے ۷-اکتوبر اور ۱۴-اکتوبر ۱۹۶۰ء کے دو شماروں میں ایک بزرگ مولانا حکیم عزیزالرحمٰن اعظمی عمری (جامعہ دارالسلام عمر آباد' مدراس' ہندوستان) کا ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا' جس کا عنوان تھا "تفسیر ترجمان القرآن کا انتساب۔" یہ نہایت دلچسپ مضمون ہے اور بہت سی معلومات پر حاوی -----! اس میں بتایا گیا ہے کہ جس صاحب علم کی وساطت سے یہ انکشاف ہوا (کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جس شخص کی طرف اپنی تفسیر ترجمان القرآن کا انتساب کیا ہے' ان کا نام مولوی دین محمد قندھاری ہے) یہ انکشاف کرنے والے بزرگ علاقہ سوات (صوبہ سرحد) کے رہنے والے تھے اور ان کا نام تھا مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی ----- حکیم صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے عقیدت مند تھے اور مولانا کو مولوی دین محمد قندھاری کا نام انہی نے بتایا تھا ----- یہ بات تو اب راز نہیں رہی' اس کا بہت سے اہل علم کو پتا چل چکا ہے' لیکن اس مضمون میں اور بھی بہت سی علمی اور سیاسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو دورِ گزشتہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہذا مناسب سمجھا گیا کہ یہ مضمون جو آج سے اڑتیس (۳۸) برس قبل "الاعتصام" میں شائع ہوا تھا اور جو در حقیقت مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق ہے' یہاں بھی درج کر دیا جائے۔

حکیم فضل الرحمٰن سواتی دسمبر ۱۹۶۳ء کے پہلے ہفتے پاکستان تشریف لائے تھے اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے ملے تھے۔ مولانا اس وقت گلاب دیوی ہسپتال میں داخل اور ڈاکٹر بلیغ الرحمٰن کے زیر علاج تھے ----- اب ذیل میں یہ طویل اور پر از معلومات مضمون ملاحظہ فرمایئے۔

"مولانا ابوالکلام آزاد رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی عظیم الشان تفسیر "ترجمان القرآن" کی پہلی جلد ۱۹۳۱ء میں شائع کی تھی۔ اسے ایک ایسے شخص کی طرف منسوب کیا جو کچھ دن مولانا کی خدمت میں رہا' ان سے فیض حاصل کرتا رہا اور پھر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ مولانا کو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ انتساب کے الفاظ یہ ہیں۔

"غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ

ہو کر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کے دیکھا تو ایک شخص کمل اوڑھے کھڑا تھا۔

آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

ہاں جناب! میں بہت دور سے آیا ہوں۔

کہاں سے؟

سرحد پار سے -----!

یہاں کب پہنچے؟

آج شام کو پہنچا۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا۔ وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے' انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرے سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں۔

افسوس تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟

اس لیے کہ آپ سے قرآن مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے "الہلال" اور "البلاغ" کا ایک ایک حرف پڑھا ہے۔

یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکایک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لیے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا کہ میں اسے واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام سے منسوب کرتا۔"

ابوالکلام آزاد ۱۲- ستمبر ۱۹۳۱ء ---- کلکتہ

مولانا کے عقیدت مندوں کو تو ان کے اس بیان میں شبہ کرنے کی گنجائش نہیں تھی' مگر جب سے خاص طور پر مولانا کے خلاف بعض غلط اندیش افراد نے شورش بپا کر رکھی ہے' اس انتساب کے متعلق بھی انھوں نے چہ می گوئیاں شروع کر دی ہیں۔ بعض نے طنز کے طور پر کہا کہ مولانا کو تاریخ یاد رہ گئی مگر اس شخص کا نام یاد نہیں رہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مولانا نے محض اپنی قدر و منزلت کو اپنے قلم سے اونچا کرنے کے لیے ایک بات لکھ دی

ہے۔

بعض بڑے بڑے حضرات کی طرف سے بھی اس قسم کے طعنے ہوتے رہے، مگر کسی کو یہ توفیق نہیں ہو سکی کہ اس شخص کا نام معلوم کرنے کے لیے کچھ دوسرے ذرائع اختیار کرے۔ طویل عرصہ یوں ہی گزر گیا۔ اس حقیقت کا سراغ ملا تو ایک ایسی کتاب کی بہ دولت جو تالیفی دنیا میں بے نظیر شمار کی جا سکتی ہے۔ یعنی افضل العلما مولانا حافظ ڈاکٹر محمد یوسف کوکن صاحب عمری ایم۔ اے ریڈر اردو، فارسی، عربی مدراس یونیورسٹی (مدراس) نے "امام ابن تیمیہ" کے نام سے ایک لاجواب کتاب تصنیف کی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف رہنے والے تو مینمور کے تھے جو مشہور قلعہ جنجی جنوبی آرکاٹ سے ڈھائی میل پر خالص مسلمانوں کی بستی ہے، لیکن انھوں نے "جامعہ دارالسلام عمر آباد" میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی آٹھ سال تعلیم پائی۔

جامعہ کے قائم ہونے کے دوسرے ہی سال ۱۹۲۵ء میں جامعہ میں داخل ہوئے تھے۔ اپنی جماعت میں ہمیشہ اول آتے رہے۔ آخری سال بھی اول آئے اور ایک تمغہ بھی حاصل کیا۔ وہ پہلے "عمری" (یعنی جامعہ دارالسلام کے فارغ التحصیل) تھے، جنھوں نے ۱۹۳۴ء کے میٹریکولیشن کے انگریزی امتحان میں شان دار کامیابی حاصل کی۔ اطراف و اکناف کے انگریزی طلبا شرطیں لگایا کرتے تھے کہ وہ ہرگز ہرگز انگریزی امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ مگر اللہ نے ان کو کامیابی سے نوازا۔

حافظ محمد یوسف کوکن کا خیال طب اور ڈاکٹری تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ مگر جامعہ دارالسلام کے بانی اور سیکرٹری خان بہادر ساہوکار کاکا محمد اسماعیل صاحب مرحوم نے انھیں مجبور کر کے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی خدمت میں دارالمصنفین (اعظم گڑھ) روانہ کر دیا۔ سید صاحب موصوف نے انھیں تحقیق کے لیے امام ابن تیمیہ کا موضوع دیا، مگر اس موضوع پر مکمل ریسرچ نہ کر پائے تھے کہ انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی اور الہ آباد یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کا اور پھر مدراس یونیورسٹی سے بی، اے، پھر ایم، اے کا امتحان پاس کیا۔

دارالمصنفین کے دوران قیام میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر مدراس یونیورسٹی ہی میں شعبہ ریسرچ میں ملازمت اختیار کی۔ یونیورسٹی نے ان کے ذریعے مور لینڈ

اور چیٹر جی کی تاریخ ہند کا ترجمہ اور اس کے بعد ڈاکٹر الکسیس کیرل کی مشہور کتاب "مین دی ان نون" کا ترجمہ کرا کے شائع کیا۔ موخر الذکر کتاب "نامعلوم انسان" کی زبان و بیان کی بے حد تعریف کی گئی ہے۔ پھر جنوبی ہند کے مشہور علما مولانا باقر آگاہ' مولانا سید عبدالقادر شاہ مہربان فخری' ملک الشعرا میر اسماعیل خان ابجدی' نواب غلام اعزالدین خان بہادر مستقیم جنگ کی مختلف تصنیفات' مقدمات اور حواشی کے ساتھ شائع کرائیں۔ گورنمنٹ اورینٹل میوسکرپٹس لائبریری مدراس کے زیر اہتمام ملا جلال الدین دوانی کی کتاب "شواکل الحور" عربی مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کی۔

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی اس اثنا میں انھیں "امام ابن تیمیہ" کی اشاعت کی طرف توجہ دلاتے رہے' لیکن اس کی اشاعت اس وقت ہوئی جب سید صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ کتاب مکمل ہو جانے کے بعد حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں پیش کر کے ان سے مقدمہ یا تعارف لکھوائیں گے' مگر سید صاحب کی اس خواہش پر عمل نہ ہو سکا' کیوں کہ ڈاکٹر محمد یوسف کوکن کو مصر کا سفر درپیش آگیا اور وہ مصر ہی میں تھے کہ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا آزاد انتقال فرما گئے۔ اپریل کے آخر میں کوکن صاحب ہندوستان واپس آئے اور اپنی کتاب مکمل کر کے شائع کی۔

اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ہر طرف سے اس کے متعلق تعریفی اور تہنیتی خطوط پہنچنے لگے۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ۱۸ دسمبر ۱۹۵۹ء کو راولپنڈی ریڈیو اسٹیشن سے اس پر شان دار تبصرہ نشر کیا۔ ڈاکٹر خان عبداللطیف صاحب نے کویت سے ایک تعریفی خط لکھا اور کتاب کی دس کاپیاں خرید کر مختلف مدرسوں اور کتب خانوں کو تحفتاً بھیجیں۔ صوفی نذیر احمد کاشمیری نے تو یہاں تک تحریک کی کہ جلالۃ الملک سعود والی نجد و حجاز اس کی پانچ دس ہزار کاپیاں چھپوا کر سارے ہندوستان میں تقسیم فرمائیں ---- ہفت روزہ "الاعتصام" (لاہور) نے کئی صفحوں کا اس پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت ہی تعریف کی۔

ڈاکٹر محمد یوسف کوکن کی اس کتاب کا عالی جناب مولانا حکیم فضل الرحمن صاحب سواتی ثم آمبوری نے بھی بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا اور مصنف کو ایک پر از معلومات خط لکھا۔ یہ خط اگرچہ نجی تھا مگر چوں کہ اس کے ذریعے سے ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف ہو رہا تھا' اس لیے ڈاکٹر کوکن صاحب نے اسے ماہنامہ "برہان" دہلی میں اشاعت کے لیے بھیج دیا۔

"برہان" کے مدیر محترم نے حسب ذیل نوٹ کے ساتھ یہ خط شائع فرمایا:

"فضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن ایم۔اے نے حال ہی میں حافظ ابن تیمیہ پر ایک بڑی ضخیم کتاب شائع کی ہے۔اس کو پڑھ کر آمبور علاقہ مدراس کے ایک نامور فاضل مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی نے موصوف کو ایک طویل خط لکھا تھا' جس میں مذکورہ بالا کتاب سے متعلق رائے کے اظہار کے علاوہ حکیم صاحب نے ضمناً اس شخص کی بھی نشان دہی کر دی جس کے نام مولانا آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" کو معنون کیا ہے۔چوں کہ یہ انکشاف بہت اہم ہے اور تاریخی حیثیت رکھتا ہے' اس لیے خط کے فاضل مکتوب الیہ اور کاتب کے شکریے کے ساتھ ہم اسے شائع کرتے ہیں۔"

(برہان دہلی۔بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء)

یہ خط چوں کہ بہت اہم تھا' اس لیے سہ روزہ مدینہ (بجنور) ہفت روزہ "الکلام" (پٹنہ) اور دوسرے اخبارات میں نقل ہوتا رہا۔اس کی وجہ سے قارئین کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔تاہم اس سلسلے میں مزید وضاحت کی ضرورت تھی' اب خاک سار نے حکیم فضل الرحمٰن سواتی سے ملاقات کی اور مزید معلومات حاصل کیے جو قارئین "الاعتصام" کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

ہمیں دراصل ڈاکٹر کوکن اور حکیم صاحب دونوں کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی بہ دولت ایک اہم حقیقت منظر عام پر آگئی-----کوکن صاحب کا شکریہ اس لیے کہ انھی کی کتاب "امام ابن تیمیہ" اس حقیقت کے منکشف کرنے کا موجب بنی۔اگر یہ عظیم الشان تالیف شائع نہ ہوتی تو یہ حقیقت منظر عام پر نہیں آسکتی تھی-----حکیم صاحب کا شکریہ اس لیے کہ انھوں نے مولانا آزاد کا راز ایک نجی خط میں ظاہر کیا۔اگر انھیں معلوم ہوتا کہ یہ خط شائع ہوگا تو شاید وہ اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتے' جسے خود مولانا آزاد پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے-----اب میں حکیم صاحب کے متعلق بھی کچھ توضیح کر دینا چاہتا ہوں۔

حکیم فضل الرحمٰن علاقہ سوات ایجنسی مالاکنڈ موضع تھانہ کے باشندے تھے' وہ ۴۔شوال ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۵ء کو چہار شنبہ کے روز پیدا ہوئے۔گھر پر کچھ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف اساتذہ اور نامی گرامی علما سے جو خاص خاص فن میں کمال رکھتے

تھے' تعلیم پائی ----- افغانستان' قبائل سرحد' پشاور' مردان' کوہاٹ' بنوں اور علاقہ ہزارہ میں اس وقت علوم عربیہ کا شاید کوئی باقاعدہ مدرسہ تو نہیں تھا' البتہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی عالم رہتے تھے' جن کے درس کا سلسلہ جاری تھا اور طلباان سے تعلیم پاتے تھے۔ کوئی علم صرف کا عالم تھا' کوئی علم نحو کا۔ کوئی منطقی تھا' کوئی فلسفی۔ کوئی فقیہ تھا' کوئی اصولی۔ کسی کو علم معانی و بیان میں کمال حاصل تھا' کسی کو علم کلام میں۔ بعض ان تمام علوم میں دست گاہ رکھتے تھے۔ حکیم صاحب نے قدیم طرز تعلیم کے مطابق اساتذہ وقت اور خاص کر مولوی عبدالحنان نعمانی سے منقولات و معقولات کی تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں اکثر کتابوں کے متون حفظ کرائے جاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حکیم صاحب کو مختلف کتابوں کے متن ازبر تھے۔ اس کے علاوہ انھیں فارسی ادب سے بھی بڑی گہری دلچسپی تھی۔ سینکڑوں عمدہ اشعار ان کے نوک زبان تھے اور بات بات میں دلچسپ اور لطیف اشعار پیش کرتے تھے۔

حکیم صاحب ۱۹۰۷ء میں مولوی عبدالحنان نعمانی سے فلسفے کی مشہور کتاب "میبذی" پڑھ رہے تھے کہ وحدۃالوجود کی بحث میں امام ابن تیمیہ کے عقائد و خیالات کا ذکر آ گیا۔ مولوی عبدالحنان صاحب نے ان پر سخت تنقید کی اور کہا کہ ابن تیمیہ اصحاب ظواہر میں سے ہیں اور ان کی ظاہری آنکھ حقیقت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ مولوی عبدالحنان نعمانی فلسفہ و منطق کے اس وقت زبردست عالم مانے جاتے تھے۔ ان فنون میں اس نواح میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا' اس لیے جلیل القدر استاد کا حکیم صاحب جیسے فرماں بردار شاگرد پر اثر پڑنا ضروری تھا۔ تقلیداً حکیم صاحب بھی امام ابن تیمیہ کے سخت مخالف ہو گئے۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء کے ابتدا میں حکیم صاحب دہلی تشریف لائے۔ اس وقت مولوی دین محمد قندھاری دہلی کے مدرسہ نعمانیہ میں مولانا پرول قندھاری کے پاس آخری درجے میں پڑھ رہے تھے۔ حکیم صاحب اور ان کے درمیان طالب علمانہ دوستی تھی۔

حکیم صاحب نے دہلی کے مدرسہ طبیہ میں جو آگے چل کر طبیہ کالج بنا' داخلہ لیا۔ اس وقت اس مدرسے میں زبدۃ الحکماء حکیم کبیرالدین صاحب کا تعلیم کا آخری سال تھا' اور تمام طلبا میں وہ ممتاز درجے پر فائز تھے۔ حکیم صاحب کا زیادہ میل ملاپ حکیم کبیرالدین سے رہا۔ حکیم صاحب تقریباً ایک سال دہلی رہے۔ ۱۹۱۲ء کے آغاز میں وہ لکھنو گئے اور ۱۹۱۵ء تک (تین سال) وہاں مقیم رہے۔

۱۹۱۳ء میں مولوی دین محمد قندھاری کان پور سے لکھنو پہنچے اور حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ حکیم صاحب نے دریافت کیا کہاں سے آرہے ہو؟ جواب دیا کان پور گیا تھا۔ ایک مہینہ وہاں کے مدرسہ الٰہیات میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اب وہیں سے آرہا ہوں۔ حکیم صاحب نے کہا استغفر اللہ۔ کہاں آپ اور کہاں کان پور کا مدرسہ الٰہیات۔ اس مدرسے کے تو اساتذہ بھی آپ سے استفادے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

مولوی صاحب نے کہا: چپ رہو' بہت کچھ سیکھ چکا ہوں۔

لکھنؤ کے زمانہ قیام میں مولوی عبدالباری فرنگی محلی نے مولوی دین محمد قندھاری کو اپنے مدرسہ نظامیہ کا استاذ مقرر کر لیا۔ چند مہینے انھوں نے وہاں تدریسی خدمات سرانجام دیں' اس کے بعد وہ شاہ جہان پور چلے گئے۔

مولوی دین محمد قندھاری کو "الہلال" سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھوں نے لکھنؤ میں "الہلال" خریدا اور حکیم صاحب کے پاس آئے۔ ان سے کہا یہ مضمون پڑھو۔ حکیم صاحب نے کہا میں تو اردو پڑھ نہیں سکتا--- مولوی صاحب نے کہا یہ اردو نہیں ہے بلکہ وہی زبان ہے جسے تم سمجھ سکتے ہو۔ یہ کہہ کر انھوں نے حکیم صاحب کو پورا مضمون پڑھ کر سنایا۔ پھر پوچھا: سمجھ گئے ہو؟ حکیم صاحب نے جواب دیا سمجھ گیا ہوں۔ مولوی صاحب نے فرمایا یہ اخبار نہیں ہے بلکہ بہت بڑا معلم ہے' اس کا باقاعدہ مطالعہ جاری رکھو---- حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے بعد مجھے "الہلال" پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

جب ۱۹۱۴ء میں عالم گیر جنگ شروع ہوئی تو اس کے ایک سال بعد یہی حکیم فضل الرحمان صاحب سرحد پار کے مجاہدین کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ تین مرتبہ انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔ پھر وہ افغانستان کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں حکیم صاحب نے "سراج الاخبار" افغانیہ کابل کے دفتر میں مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفت روزہ "البلاغ" دیکھا' جس میں مولانا کا "تین اور زیتون" کی تفسیر پر معرکہ آرا مضمون شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون پڑھ کر حکیم صاحب نہایت متاثر ہوئے۔ مولانا نے اس مضمون میں رازی پر تنقید کی تھی اور امام ابن تیمیہ کی بڑی تعریف کی تھی۔ حکیم صاحب چاہتے تھے کہ اپنے استاد مولوی عبدالحنان نعمانی کو بھی اس کا قائل کرائیں' چنانچہ انھوں نے جناب محمود طرزی ایڈیٹر "سراج الاخبار" سے "البلاغ" کے تینوں شمارے جن میں مولانا آزاد کا یہ مضمون چھپا تھا' عاریتاً لیے اور کابل

سے چار دن کی مسافت پیدل طے کر کے نعمان پہنچے اور اپنے فاضل استاد کی خدمت میں یہ شمارے پیش کیے۔ مولوی صاحب نے مضمون پڑھا تو بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ مولانا آزاد بڑے جری اور حق گو معلوم ہوتے ہیں' اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

پھر مولوی عبدالحنان نے خود ہی بیان کیا کہ ابوالکلام آزاد کے متعلق مولوی دین محمد قندھاری جو کچھ کہہ رہے تھے' وہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

اس واقعہ سے دو تین مہینے پیشتر مولوی دین محمد قندھاری اپنے استاد مولوی عبدالحنان صاحب کی خدمت میں موضع نعمان پہنچے تھے اور مولانا آزاد کی ان کے پاس بڑی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ وہ کلکتے جا کر مولانا آزاد کے ''دارالارشاد'' میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اس وقت مولوی عبدالحنان صاحب نے ان سے کہا تھا کہ تم بھی عجیب آدمی ہو' اس قدر علم و فضل کے باوجود ایک معمولی اخبار نویس (یہ مولانا آزاد کی طرف اشارہ تھا) کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کرنا چاہتے ہو---- مولوی دین محمد قندھاری نے جواب دیا آپ نے ان کی تحریریں پڑھی نہیں ہیں' ورنہ آپ ان کے متعلق اس طرح کے الفاظ استعمال نہ کرتے۔

پہلی جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد حکیم فضل الرحمٰن صاحب ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت کے سلسلے میں مدراس پہنچے۔ وہ پکے کانگرسی تھے۔ آزادی کی ہر تحریک میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ عمر آباد کے متصل مشہور تاریخی مقام گڑھ آمبور کے ایک معزز گھرانے میں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ تاہم انھوں نے آزادی کی کسی تحریک میں شامل ہونے سے کبھی گریز نہیں کیا۔ جب نان کوآپریشن یعنی انگریزی حکومت سے عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو حکیم صاحب بھی ۱۹۲۲ء میں جیل گئے اور ویلور اور کڈلور کے قید خانوں میں ایک سال قید کی مدت کاٹی۔ جب وہاں سے رہا ہوئے تو وانمباڑی میں مقیم رہے۔ کبھی کبھی عمر آباد بھی تشریف لے جاتے تھے اور جامعہ دارالسلام میں زیادہ وقت گزارتے تھے۔

جامعہ سے ان کی دلچسپی اس وقت بہت بڑھ گئی تھی' جب وہاں حضرت مولانا عبدالوہاب آروی صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لائے۔ دونوں معقولی تھے اور مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ دونوں کے درمیان جاری رہتا تھا۔ ایک دفعہ کسی مسئلے پر تین دن مباحثہ ہوتا رہا اور فیصلہ حکیم صاحب کے حق میں ہوا۔ مولانا آروی کہا کرتے تھے کہ حکیم

فضل الرحمٰن واقعی بہت بڑے معقولی ہیں۔ اور حکیم صاحب کا فرمان تھا کہ میں نے اہل حدیث علما کے حلقے میں مولانا عبدالوہاب آروی جیسا متبحر عالم اور معقول و منقول پر حاوی شخص نہیں دیکھا۔ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی قابلیت اور علمی صلاحیتوں کے کھلے دل سے معترف بلکہ بے حد مداح تھے۔

حضرت مولانا عبدالوہاب آروی جامعہ سے تشریف لے گئے تو معقولات کی تعلیم کے سلسلے میں وہاں حالات موزوں نہ رہے۔ لہٰذا جامعہ کے ناظم حضرت مولانا فضل اللہ صاحب کی اس کے لیے نظرِ انتخاب حکیم فضل الرحمٰن سواتی پر پڑی اور حکیم صاحب نے از راہ کرم ناظم صاحب کی درخواست قبول فرمائی اور پھر جامعہ میں فلسفہ و منطق کی تعلیم کے ساتھ ساتھ علم طب کا شعبہ بھی قائم کر دیا گیا اور یہ دونوں شعبے حکیم صاحب کے سپرد ہوئے۔ ان فنون میں طلبا نے ان سے بہت استفادہ کیا۔

حکیم فضل الرحمٰن تھوڑا عرصہ ہی عمر آباد میں رہے۔ اس کے بعد کانگرس کی نمک تحریک شروع ہو گئی اور وہ جامعہ سے استعفا دے کر اس تحریک میں شریک ہو گئے۔ جناب سیٹھ یعقوب حسن کو ان کی سیاست سے اتفاق نہ تھا۔ انھوں نے ان سے کہا کہ وہ تدریس کے اہم کام کو چھوڑ کر کسی سیاسی تحریک میں شرکت نہ کریں۔ لیکن حکیم صاحب پر کانگرس کا ایسا نشہ چڑھا ہوا تھا کہ وہ کسی ترشی سے اتر نہیں سکتا تھا۔ وہ مدراس سے بمبئی پہنچ گئے۔ بمبئی کے قیام کے متعلق خود انہی کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔ لکھتے ہیں:

"۱۹۳۱ء میں مجھے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے کینٹ قصوری نے جو میرے محسن اور کرم فرما تھے، مجھے بمبئی میں مطب کھولنے پر مجبور کر دیا۔ ان کے پیہم اصرار پر میں نے دواخانہ بھنڈی بازار میں قائم کر دیا۔ دوا خانے کے تمام اخراجات کے کفیل مولوی محمد علی صاحب بنے۔ مولوی صاحب کا اثر و رسوخ بمبئی میں کافی تھا اور حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ انھوں نے اپنے تمام احباب سے مجھے ملا دیا۔ ان کی اس بے لوث ہمدردی سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا۔ مولوی محمد علی صاحب نے مجھے کہا تھا کہ میں سیاست سے علیحدہ رہوں۔ اس وقت کانگرس خلاف قانون تھی۔ لیکن بقول جامی۔ "عشق و مشک را نتواں نہفتن" بھلا میں اپنی کانگرسیت کو کیوں کر چھپا سکتا تھا۔ ایک عرصے تک تو میں

مولوی صاحب کے مشورے پر عمل پیرا رہا' لیکن رفتہ رفتہ راز فاش ہو گیا اور کانگرسیوں کی آمدورفت میرے یہاں شروع ہونے لگی۔

من نہ آں رندم کہ ترک شاہد و ساغر کنم
محتسب داند کہ من ایں کا رہا کم تر کنم

بمبئی کارپوریشن میں ضلع منٹگمری پنجاب کے ایک جواں سال سکھ کنٹریکٹر تھے' ان کا نام گلاب سنگھ تھا۔ ان کے ماموں پولیس کمشنر کے دفتر میں کلرک تھے۔ ان کے ذریعے سے اکثر پولیس کے ارادوں کا حال معلوم ہو جاتا تھا۔ گلاب سنگھ پکے کانگرسی تھے۔ کبھی وہ میرے یہاں آتے اور کبھی میں ان کے یہاں جاتا تھا۔ بڑے مخلص انسان تھے۔ ۴ مارچ ۱۹۳۳ء کو بوقت گیارہ بجے شب وہ میرے گھر پہنچے اور علیحدہ لے جا کر کہا کہ ابھی دس بجے ماموں میرے یہاں آئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ تمھارے دوست حکیم فضل الرحمٰن سواتی کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا ہے۔ صرف کمشنر کے دستخط نہیں ہوئے۔ میں نے دیر لگائی ہے۔ کل دستخط ہو جائیں گے تو انھیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ سی آئی ڈی کی رپورٹ ہے کہ کانگرسیوں کا ہجوم ان کے یہاں رہتا ہے اور ان کے گھر کانگرس بلیٹن لکھا جاتا ہے۔ چوں کہ آرڈیننس کی رو سے تمام اختیارات کمشنر کے ہاتھ میں ہیں' لہٰذا گرفتاری کے بعد یا تو ان سے ضمانت طلب کی جائے گی اور یا دو ایک سال کے لیے جیل بھیج دیے جائیں گے۔ اگر ضمانت دینے پر آمادہ ہیں تو کوئی اندیشہ نہیں ہے ورنہ قید کر دیے جائیں گے-----

میں نے گلاب سنگھ سے کہا کہ آپ کے ماموں کا شکریہ' انھوں نے بروقت مطلع فرمایا۔ ضمانت کے متعلق یہ شعر پڑھا۔

من و رند و عاشق آں گاہ توبہ
استغفر اللہ' استغفر اللہ

گلاب سنگھ نے کہا خوب سوچ لو' پھر فیصلہ کر لو' وقت کافی ہے۔ کل تین بجے تک کوئی فیصلہ کر سکتے ہو۔ چنانچہ میں رات بھر سوچتا رہا۔ چوں کہ جیل جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ صحت ٹھیک نہ تھی اور ضمانت بھی نہیں دینا چاہتا تھا' اس لیے علی

الصباح ناسک روانہ ہوا اور وہاں سے رات کے میل سے دہلی چلا گیا۔ ایک دو دن وہاں قیام کر کے پشاور پہنچا اور کچھ دنوں کے بعد اپنے وطن مالوف سوات چلا گیا اور ۱۵۔ اگست ۱۹۳۷ء تک وہاں رہا۔

اس اثنا میں بمبئی کے کانگرسی لیڈر مسٹر نریمان کے متعلق جو پارسی مذہب سے تعلق رکھتے تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں جب کانگرس نے وزارت لینے کا فیصلہ کیا تو مجھے دو آدمیوں کے بارے میں بڑی فکر تھی، ایک تھے جناب یعقوب حسن سیٹھ آف مدراس اور دوسرے تھے مسٹر نریمان۔ یعقوب حسن تو وزیر بن گئے، لیکن نریمان صاحب کی بجائے ایک ایسے شخص کو بمبئی کا وزیر اعظم بنا دیا گیا جو تھرڈ کلاس کانگرسی لیڈر تھا۔ اس پر میں نے ڈاکٹر گور کو خط لکھا، اور یہ میرا پہلا خط تھا جو میں نے بمبئی کے کسی شخص کو لکھا۔ چوں کہ میرا شمار مفرورین میں ہوتا تھا، اس لیے میں نے بمبئی کے کسی صاحب کے ساتھ کوئی خط و کتابت نہیں کی۔ کانگرسی وزرات وہاں قائم ہوئی تو کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ ڈاکٹر گور نے فوراً جواب دیا کہ نریمان کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔ اب انھوں نے کانگرسی ہائی کمان میں استغاثہ دائر کیا ہے ----- انھوں نے مجھ کو مخاطب کر کے لکھا کہ تم اب وہاں کیوں بیٹھے ہو، وزارت کانگرس کی ہے اور تمام قیدی رہا ہو گئے ہیں۔ چنانچہ میں ۱۹۔ اگست ۱۹۳۷ء کو بمبئی پہنچا اور ڈاکٹر گور کی معیت میں مسٹر نریمان سے ملا۔ مسٹر نریمان کو اب کی دفعہ میں نے خوش و خرم نہیں پایا، افسردہ خاطر تھے۔ ہائی کمان میں بھی ان کا استغاثہ نامنظور ہو گیا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا: مولانا آزاد نے آپ کی حمایت نہیں کی؟ جواب دیا: حمایت کی اور بہت زور دار طریقے سے کی، مگر مولانا کی وہاں کیا چل سکتی تھی۔ معاملہ مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں ہے اور مہاتما جی سردار پٹیل کی گرفت میں ہیں۔ وہ بھی گجراتی ہیں اور یہ بھی گجراتی۔ ہائی کمان میں تین آدمیوں نے میری حمایت کی ہے، مولانا آزاد، جواہر لال اور ڈاکٹر پٹابی سیتارامیہ نے۔ باقی ممبروں نے سردار پٹیل کا ساتھ دیا۔

مسٹر نریمان نے کہا مجھے اس کا رنج نہیں کہ میں وزیر اعظم نہیں بنایا گیا، اگرچہ

میرا حق تھا- رنج اس بات کا ہے کہ مینارٹیوں کا اعتماد مجارٹی پر نہیں رہا- پنجاب میں سکھ میری مثال پیش کر رہے ہیں اور تین چار دن پیشتر مسٹر جناح نے احمد آباد میں جو تقریر کی ہے' اس میں بھی میرے معاملے کی طرف اشارے کیے ہیں کہ نریمان کو اس لیے وزارت سے محروم کر دیا گیا کہ وہ پارسی تھے' اگر ہندو ہوتے تو یہ بات نہ ہوتی' بمبئی کے وزیر اعظم نریمان ہوتے نہ کہ کھیر ------ انھوں نے کہا کہ اس قسم کی غلطیوں سے مخالفوں کو تقویت پہنچتی ہے اور کانگرس کا وقار کم ہوتا ہے-

ایک صاحب نے نریمان سے کہا کہ مولانا آزاد بھی تو مسلمان ہیں اور اقلیت طبقے کے نمائندے ہیں- انھیں کیوں ہائی کمان میں رکھا گیا ہے؟

مسٹر نریمان نے جواب دیا کہ مولانا وہاں اقلیت کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں ہیں' بلکہ اس حیثیت سے ہیں کہ مولانا بہت بڑے مدبر اور صاحب فہم و عقل ہیں- ہائی کمان کی گاڑی مولانا کے تازیانے کے بغیر چل نہیں سکتی- جب کسی مسئلے میں الجھاؤ زیادہ پیدا ہو جاتا ہے اور بحث مباحثہ طوالت اختیار کر لیتا ہے اور تمام ممبر پریشانی کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں تو مولانا آزاد ہی اس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتے ہیں- یعنی ہائی کمان کے صحیح معنوں میں رہنما مولانا آزاد ہیں- مولانا کے بغیر ہائی کمان کا ٹٹو چل نہیں سکتا- یہ مولانا ہی کا دماغ ہے جو نہایت پیچیدہ مسائل کو حل کر سکتا ہے- نازک مواقع پر سب ارکان مولانا کے محتاج ہوتے ہیں-

(پیام مشرق- ۱۴ جولائی ۱۹۵۹ء)

اس اقتباس کا مطالعہ کرنے کے بعد اب پھر دور ماضی میں چلیے ---- ۱۹۲۷ء کی بات ہے کہ حکیم فضل الرحمٰن صاحب پٹیالہ جا رہے تھے- دہلی کے اسٹیشن پر چند پٹھان ان کے ڈبے میں آکر بیٹھے- ان سے بات چیت ہوئی تو پتا چلا کہ ان میں سے ایک شخص مولوی دین محمد قندھاری کے شاگرد ہیں- ۱۹۲۴ء میں مولوی صاحب نے وفات پائی تو اس کے بعد وہ دہلی آ گئے اور اب مسجد فتح پوری کے مدرسے میں داخل ہیں اور درجہ آخر میں تعلیم پا رہے ہیں- حکیم صاحب نے مولوی دین محمد قندھاری کے اس شاگرد سے پوچھا کہ ۱۹۱۶ء میں مولوی

عبدالحنان نعمانی سے معلوم ہوا تھا کہ مولوی دین محمد قندھاری نے مولانا ابوالکلام آزاد کے قائم کردہ "دارالارشاد" میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا----

شاگرد نے کہا یہ صحیح ہے کہ وہ "دارالارشاد" میں داخل ہونا چاہتے تھے' لیکن جنگ عمومی کی وجہ سے انھیں راہ داری کا پروانہ نہیں مل رہا تھا- جنگ ختم ہونے کے بعد یہ پابندی اٹھ گئی اور وہ قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچے اور پھر وہاں کے تین ہم وطن سوداگر مل گئے' جن میں سے ایک بیمار تھا اور وہ اپنے علاج کے لیے دہلی جا رہا تھا- مولوی صاحب کا مقصد معلوم کر کے ان تینوں نے کوئٹہ سے آگرہ تک کا ٹکٹ ان کے لیے بھی خرید لیا- دوران سفر میں مولوی صاحب نے بیمار سوداگر کی بڑی خدمت کی اور اس طرح انھوں نے اس احسان کا بدلہ ادا کیا- اس وقت مولانا آزاد چوں کہ کلکتہ سے خارج البلد ہو چکے تھے اور رانچی میں نظر بند کر دیے گئے تھے' اس لیے مولوی دین محمد قندھاری آگرہ سے رانچی پہنچے- چند دن وہاں مقیم رہے اور پھر وہاں سے روانہ ہو گئے---- جیسا کہ مولانا آزاد نے اپنے انتساب میں ظاہر فرمایا ہے-

جب ۱۹۳۱ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر چھپی تو ایک مدت تک حکیم فضل الرحمٰن صاحب کو اس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا- جب انھوں نے ۱۹۳۸ء میں یہ تفسیر دیکھی تو فوراً ان کے ذہن میں یہ بات آئی اور خیال کیا کہ جس شخص کی طرف اس کا انتساب کیا گیا ہے' وہ مولوی دین محمد قندھاری ہیں- مگر اس ضمن میں ان کو براہ راست مولانا ابوالکلام آزاد سے رجوع کرنے کا موقع نہیں ملا-

کانگرس نے صوبائی وزارتیں چھوڑ کر پھر سے انگریزی حکومت کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی- تمام رہنما جیلوں میں چلے گئے تھے- مولانا آزاد کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا- ان حالات میں اس مسئلے کی تحقیق کرنا مشکل امر تھا اور مولانا سے دریافت کرنا ممکن نہ رہا تھا- لیکن جب ۱۹۴۵ء میں جنگ ختم ہونے کے بعد تمام کانگرسی رہا ہوئے اور اکتوبر کے مہینے میں کانگرس کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا' جس کی صدارت حضرت مولانا آزاد کے سپرد تھی' اس وقت حکیم فضل الرحمٰن صاحب آمبور میں تھے- آمبور ہی سے کانگرس کے اجلاس میں شرکت کے لیے بمبئی گئے- اور اپنے ایک دوست میرزا خاں صاحب کے مکان پر قیام فرما ہوئے-

اجلاس سے ایک دن پہلے وہ حضرت مولانا سے ملنے کے لیے بھولا بھائی ڈیسائی کے بنگلے میں پہنچے' جہاں مولانا فروکش تھے۔ مولانا کے سیکرٹری پروفیسر اجمل خاں سے ملاقات ہوئی اور مولانا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو اجمل خان صاحب نے صاف کہہ دیا کہ مولانا اس وقت بہت مصروف ہیں' کسی سے مل نہیں سکتے۔ اجلاس ختم ہو جانے کے بعد آکر ملو۔

یہ الفاظ سن کر حکیم فضل الرحمٰن صاحب اور میرزا خاں صاحب جو حکیم صاحب کے میزبان تھے' واپس لوٹے اور موٹر میں بیٹھ گئے --- موٹر کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہا تھا۔ مشین کی دیکھ بھال میں کچھ وقت صرف ہو گیا---- اتنے میں دیکھا کہ بنگلے سے ایک کار نکلی' جس میں چند افراد کے ساتھ اجمل خاں صاحب بھی تشریف فرما ہیں۔ میرزا صاحب نے حکیم صاحب سے کہا اب بہت اچھا موقع ہے' مانع چلا گیا ہے۔ آیے ایک مرتبہ پھر قسمت آزمائی کر لیں۔

بنگلے میں گئے تو بھولا ڈیسائی کے صاحب زادے دھیرو سے ملاقات ہوئی۔

انھوں نے پوچھا: مولانا آزاد سے ملنے آئے ہیں؟

جواب دیا: جی ہاں۔

پوچھا: پہلے سے ملاقات ہے؟

بتایا: جی ہاں۔

کہا: اپنا وزیٹنگ کارڈ دیجیے۔

حکیم صاحب نے کہا: وزیٹنگ کارڈ تو نہیں ہے۔

دھیرو نے ایک سلپ دے کر کہا: اس پر اپنا نام اور پتا لکھ دیجیے۔

حکیم صاحب نے اس پر انوری کا حسب ذیل قطعہ لکھ کر اس کے نیچے اپنا نام لکھا۔

اے خداوندے کہ از ایام اگر خواہی بیابی
جز نظر خویش دیگر ہر جہت از خاطر بیاید
کمتریں بندگانت انوری بردر ستادہ
ہچوں حوادث باز گردد یا چو اقبال اندر آید

العبد المذنب حکیم فضل الرحمٰن سواتی۔ خدائی خدمت گار

والنٹیر یہ سلپ اندر لے کر گیا۔ پھر فوراً ہی پلٹ آیا اور کہا: چلیے مولانا آپ کو بلا رہے ہے

ہیں۔

دھیر وحیران رہ گئے کہ اس قدر جلد باریابی کیسے حاصل ہو گئی۔

مولانا نے حکیم صاحب کو دیکھتے ہی فرمایا: کیا آپ کے پاس انوری کا کلیات ہے؟

حکیم صاحب نے جواب دیا: انوری کا کلیات نہیں ہے مگر مجھے یہ قطعہ شیرانی کے ایک مضمون میں ملا تھا۔

مولانا نے فرمایا: کون شیرانی؟ وہی تو نہیں جنھوں نے مولانا شبلی کا تعاقب کیا ہے؟

حکیم صاحب نے کہا: ہاں وہی پروفیسر محمود شیرانی۔

مولانا نے فرمایا: بہت زیادہ تعاقب کیا ہے۔ حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

چوں کہ مولانا بہت مصروف نظر آرہے تھے' اس لیے فوراً حکیم صاحب نے گفتگو کا موضوع بدلا اور کہا: مولانا! آپ نے اپنی تفسیر کا جس شخص کی طرف انتساب کیا ہے' وہ مولوی دین محمد قندھاری ہیں ------ پھر اس کی توضیح کرتے ہوئے حکیم صاحب نے کہا کہ ۱۹۱۶ء میں مولوی عبدالحنان سے افغانستان میں معلوم ہوا تھا کہ مولوی دین محمد قندھاری آپ کے قائم کیے ہوئے "دارالارشاد" میں شریک ہونا چاہتے تھے' مگر چند روز بعد ہی معلوم ہوا کہ آپ کلکتے سے خارج البلد کر دیے گئے ہیں اور رانچی میں نظر بند ہیں۔ مولوی دین محمد قندھاری کے ایک شاگرد سے معلوم ہوا کہ مولوی صاحب قندھار سے پیدل کوئٹہ پہنچے اور پھر ان کے تین ہم وطن سوداگر انھیں کوئٹہ سے آگرہ لے آئے۔ وہاں سے وہ آپ کی خدمت میں پہنچے۔ کچھ دن آپ کے پاس رہے' پھر وہاں سے روانہ ہو گئے' جیسا کہ آپ نے انتساب میں فرمایا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں مولوی دین محمد قندھاری کا انتقال ہو گیا اور وہ آپ کی تفسیر نہ دیکھ سکے۔

یہ سن کر مولانا سوچ میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا! علامات تو بالکل ٹھیک ہیں۔

حکیم صاحب نے کہا: ان کی سب سے بڑی علامت ان کا کمبل ہے' جس کا آپ نے بھی ذکر فرمایا ہے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ کمبل کے عادی تھے۔ کبھی اپنے ساتھ بستر نہیں رکھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا اور تکیہ سب کچھ کمبل ہی تھا۔ اسی وجہ سے طلبا نے ان کو "شڑے قندھاری" کا لقب دیا تھا' کیوں کہ "شڑے" پشتو میں کمبل کو کہتے ہیں۔

اس پر مولانا آزاد نے فرمایا: واقعی بڑے سادہ مزاج بزرگ تھے- علمی استعداد بہت اچھی تھی- تمام علوم پر اچھا عبور حاصل تھا- پہلے پہل جب معلوم ہوا کہ یہ متبحر عالم ہیں تو میں سمجھا شاید معترض بن کر آئے ہیں' مگر دو ایک دن میں معلوم ہو گیا کہ معترض نہیں بلکہ استفادے کی غرض سے آئے ہیں- ان کے علمی ذوق اور اس راہ میں طلب صادق اور جستجو سے میں بہت متاثر ہوا- تاریخ میں ایسی مثالیں تو بہ کثرت ملتی ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے ایک ایک مسئلے اور حدیث کی چھان بین کے لیے بہت دور دراز تک کا سفر کیا' مگر یہ بزرگ اپنی مثال آپ تھے ----- میں نے ان سے نام پوچھا نہ تھا اور نہ انھوں نے بتایا تھا اور اس کے جاننے کی کبھی ضرورت بھی پیش نہیں آئی تھی- میں نے ان کے کھانے کا انتظام کر دیا تھا اور رہتے مسجد میں تھے- خاص وقتوں میں آتے تھے اور کچھ پوچھ کر چلے جاتے تھے- اچانک وہ غائب ہو گئے اور پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں-

حکیم صاحب نے مولانا سے کہا: اب جب کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے اور مولوی دین محمد قندھاری بھی زندہ نہیں رہے تو ان کے نام کی تصریح کر دینے میں کیا حرج ہے؟

مولانا نے فرمایا: ابہام تصریح سے اچھا ہے "الابھام افصح من التصریح" مشہور مقولہ آپ نے بھی سنا ہو گا-

حکیم صاحب کی اس سے تشفی ہو گئی اور وہ اجازت لے کر چلے آئے- چوں کہ مولانا آزاد نے تصریح نہیں چاہی اس لیے پھر اس واقعے کی طرف حکیم صاحب کا خیال بھی نہیں گیا- پھر جب ڈاکٹر محمد یوسف کوکن کی عظیم الشان تالیف "امام ابن تیمیہ" شائع ہوئی تو حکیم صاحب کے پرانے جذبات میں ایک زبردست طوفان پیدا ہو گیا اور انھوں نے بلا قصد و ارادہ اس واقعہ کا اپنے نجی خط میں تذکرہ کر دیا- اور جب ڈاکٹر کوکن صاحب کے اصرار کی وجہ سے یہ خط چھپ گیا تو اس واقعہ کے متعلق مزید وضاحت بھی کرنی پڑی-

مضمون نگار مولانا حکیم عزیز الرحمٰن عمری اعظمی فرماتے ہیں-

میں خاص طور پر حکیم صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس واقعہ سے متعلق مزید تفصیلات بیان کرنے کی اجازت دی-

آزادی کے بعد اگرچہ حکیم صاحب گوشہ نشین ہو گئے تھے' ان کا کہنا تھا کہ ہمارا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا' یعنی بدیسی حکومت کا خاتمہ اور دیسی حکومت کا قیام ---- اب مجھے

مزید جستجو کی ضرورت نہیں- مگر واقعہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کی ذات اس زمانے کے مغتنمات میں سے تھی---اگر کوئی شخص ان کی پرانی زندگی کے واقعات کے متعلق گفتگو چھیڑ کر تمام واقعات قلم بند کرتا تو برصغیر کے سرفروشوں اور جاں بازوں کی ایک حیرت انگیز اور دلچسپ تاریخ مرتب ہو سکتی تھی-----

تقسیم ملک سے پہلے حکیم صاحب کبھی کبھی اپنے وطن (صوبہ سرحد) جاتے اور سرخ پوش تحریک میں شامل رہتے' لیکن پاکستان بننے کے بعد نہیں گئے اور وہیں رہ گئے- اگرچہ ان کے تمام اقربا پاکستان میں ہیں-بیٹی جو یہاں پیدا ہوئی تھی' وہ تھانہ سوات میں ہے- ان سب کا اصرار تھا کہ پاکستان آ جاؤ مگر حکیم صاحب جانے پر آمادہ نہیں ہوئے-البتہ یہ کہتے رہے کہ پاکستان کی ترقی کا دل سے خواہاں ہوں-----"

---

مضمون کے مندرجات یہاں ختم ہوئے----- فاضل مضمون نگار مولانا حکیم عزیزالرحمٰن عمری نے یہ مضمون ۱۹۶۰ء میں تحریر فرمایا تھا' اس وقت تک حکیم فضل الرحمٰن سواتی پاکستان نہیں تشریف لائے ہوں گے' لیکن ۱۹۶۳ء کے آخر میں وہ پاکستان میں تھے اور بہت سے حضرات سے ملے تھے' جن میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی' مولانا غلام رسول مہر اور مولانا محی الدین احمد قصوری شامل ہیں----اس فقیر کو اسی زمانے میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا-وہ بڑے خوش مزاج اور شگفتہ کلام بزرگ تھے-غالبًا دوبارہ ہندوستان نہیں گئے' پاکستان ہی میں سکونت پذیر ہو گئے تھے---- مولانا داؤد غزنوی کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے مسکن تھانہ (سوات) سے "الاعتصام" میں اشاعت کے لیے میرے نام ایک مضمون ارسال فرمایا تھا' جس کا عنوان تھا "حضرت مولانا سید داؤد غزنوی" یہ مضمون بھی پہلے مضمون کی طرح بہت سی پرانی سیاسی معلومات پر مشتمل ہے اور اس میں نہایت عقیدت کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے' اس لیے یہ مضمون بھی یہاں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ اس کتاب میں بھی محفوظ ہو جائے- یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ حکیم فضل الرحمٰن صاحب کا انتقال کب ہوا-اب ان کے مضمون کا مطالعہ فرمایئے-

"مولانا داؤد غزنوی ایک جید عالم دین اور تحریک آزادی ملک کے سربرآوردہ علم بردار تھے-اس سلسلے میں انگریزی حکمرانوں نے ان کو کم و بیش دس بار جیل بھیجا-۱۹۱۹ء میں

امرتسر جلیاں والا باغ کے حادثہ فاجعہ کے نتیجے میں جو مارشل لا نافذ ہوا اس میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے ساتھ مولانا غزنوی کو بھی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے تھے۔ لیگ کے صدر مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاںؒ تھے اور کانگرس کے صدر موتی لال نہرو۔۔۔۔۔اس موقعے پر گورنمنٹ نے تمام سیاسی نظربندوں اور قیدیوں کو رہا کر دیا تھا۔ چھندواڑہ سے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی رہا ہو کر امرتسر تشریف لے گئے تھے۔ پہلے تو یہ دونوں بھائی کانگرس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور تقریریں کیں‘ پھر لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ رات کا وقت تھا۔ جناب ڈاکٹر اقبال نے ان دونوں کے خیر مقدم میں مندرجہ ذیل اشعار سنائے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک ازفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
”شہپر زاغ و زغن دربند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند“

یہ اشعار پڑھنے سے تمام مجمعے پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میرے سامنے ایک خوش شکل نوجوان بیٹھے تھے‘ وہ داد دینے میں سب سے آگے تھے اور ہر شعر پر زور سے پکار کر کہتے تھے ”مکرر کہیے۔“ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب پھر اسے دہراتے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا: یہ جوان کون ہیں؟ انھوں نے کہا کہ سید داؤد غزنوی ہیں۔ میں نے کہا وہی داؤد غزنوی جو مارشل لا کی گرفت میں آئے تھے؟ انھوں نے کہا ہاں وہی داؤد غزنوی۔ کل ہی رہا ہوئے ہیں۔ اجلاس کے اختتام پر میں ان سے ملا اور رہائی پر مبارک باد دی۔ یہ میری پہلی ملاقات تھی جو مولانا سید داؤد غزنوی سے ہوئی تھی۔

ایک مہینے کے بعد بمبئی میں خلافت کانفرنس زیر صدارت غلام محمد بھرگری منعقد ہوئی۔ حضرت مولانا آزاد بھی اس میں شریک تھے اور مولانا سید داؤد غزنوی مع چند

ہمراہیوں کے امرتسر سے آکر شریک ہوئے تھے۔ مظفر آباد ہال میں جس میں کانفرنس کی سبجکٹ کمیٹی کے جلاس ہوا کرتے تھے' تمام ڈیلی گیٹ اقامت پذیر تھے۔ مولانا غزنویؒ بھی اس میں مقیم تھے اور راقم الحروف بھی اسی ہال میں اقامت گزیں تھا۔ رات اور دن ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ دس دن تک ہم ساتھ رہے۔ ان کو حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے کمال عقیدت مندی تھی اور مولانا آزاد کا بھی زیادہ رجحان مولانا سید داؤد غزنویؒ کی طرف تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

کانفرنس کے اجلاسوں میں مولانا آزاد نے کوئی تقریر نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ماہ قبل مولانا محمد علی جوہر خلافت کے نمائندے بن کر لندن تشریف لے گئے تھے' تاکہ مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ سے درخواست کر کے ملاقات کریں اور خلافت کا مسئلہ انھیں سمجھائیں۔ لیکن مولانا آزاد کو اس قسم کی وفد بازیوں اور درخواستوں سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خدا پر اعتماد کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو کامیابی کا ذریعہ بنا دینا چاہیے۔ مولانا شوکت علی صاحبؒ اور دوسرے متعدد لیڈروں نے مولانا آزادؒ سے درخواست کی کہ آپ کوئی موثر تقریر فرمائیں' لیکن مولانا آزادؒ تقریر کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ تمام ڈیلیگیٹ اور خاص کر پنجابی نمائندے مولانا آزاد کی تقریر سننے کے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ امرتسر والے ڈیلیگیٹوں نے مولانا غزنویؒ سے کہا کہ آپ ہی مولانا آزادؒ سے کہیے کہ تقریر فرمائیں۔ چنانچہ مولانا غزنوی صاحبؒ نے میرے سامنے مولانا آزادؒ سے کہا کہ لوگ آپ کی تقریر سننے کی بہت خواہش رکھتے ہیں۔ مولانا آزادؒ نے کہا کہ جب آپ کہتے ہیں تو ضرور آج رات کو عام اجلاس میں تقریر کروں گا۔ چنانچہ رات کے ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک مولانا آزاد نے پر حقائق اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔ مسئلہ خلافت کی اہمیت اور وضاحت بڑی عمدگی کے ساتھ کی۔ مسٹر لائیڈ جارج کی وعدہ خلافی کی قلعی کھول دی اور صاف اور غیر مبہم الفاظ میں فرمایا کہ لائیڈ جارج کی یہ وعدہ خلافی آزادی ہند کا پیش خیمہ ہے۔ انگریزی حکومت سے دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ایک تو اس کے وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج کی وعدہ خلافی جو ترکی حکومت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری غلطی ہے جلیاں والا باغ کی گولہ باری ---- پہلی غلطی سے وہ مسلمانانِ ہند بھی جو انگریزی حکومت کے وفادار تھے' سخت برافروختہ ہو گئے ہیں اور دوسری سے تمام باشندگان

ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک گئے ہیں۔"

ع خدا شرے بر انگیزد کہ خیرے مادراں باشد

مولانا آزادؒ کی اس پر مغز تقریر سے تمام حاضرین بہت متاثر ہوئے۔ اختتام جلسہ پر لوگ مولانا سید داؤد غزنویؒ کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ ان کے کہنے سے مولانا آزادؒ نے تقریر فرمائی، ورنہ وہ تقریر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

تین مہینے کے بعد مدراس میں خلافت کانفرنس زیر صدارت مولانا شوکت علی منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر میں نے مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کو خط لکھا کہ کانفرنس میں آکر شریک ہو جایئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں ابھی مولانا آزادؒ سے مل کر دہلی سے آیا ہوں۔ مولانا آزاد کا ارادہ مدراس کانفرنس میں شرکت کا نہیں ہے، اس لیے میں شریک نہیں ہوں گا۔

تین ماہ کے بعد کلکتہ میں کانگرس کا اسپیشل اجلاس زیر صدارت لالہ لاجپت رائے منعقد ہوا۔ اس میں مولانا سید داؤد غزنویؒ شریک تھے۔ میں بھی شریک ہوا۔ چار دن ہم برابر ملتے رہے۔

چار مہینے کے بعد ناگپور میں کانگرس کا سالانہ اجلاس زیر صدارت وجے راگو اچاریہ منعقد ہوا۔ اس موقعے پر پھر مولانا سید داؤد غزنویؒ چند ہمراہیوں کے ساتھ شریک اجلاس تھے۔ میں بھی شریک تھا۔ کانگرس کیمپ میں ہم سب ایک ہی جگہ قیام پذیر تھے۔ مہاتما گاندھی آنجہانی کی نان کوآپریشن (ترک موالات) والی تحریک اس اجلاس میں بالاتفاق پاس ہوئی۔ صرف ہندوؤں میں سے مدن موہن مالویہ نے اور مسلمانوں میں سے مسٹر محمد علی جناح نے مخالفت کی تھی۔ یہ دونوں کانگرس سے نکل گئے۔ جناح صاحب تو اخیر عمر تک پھر کانگرس میں شریک نہیں ہوئے لیکن مالویہ جی ۱۹۲۷ء میں جو مدراس میں کانگرس کا اجلاس زیر صدارت جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا تھا، اس میں آکر شریک ہوئے۔

ناگپور کانفرنس میں مولانا سید داؤد غزنویؒ سے دس دن تک مجھے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اس وقت ایک عجیب و غریب مذہبی واقعہ بھی پیش آیا۔ کانگرس کیمپ میں چند مسلمانوں نے مغرب کی نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اقامت میں نے کہی اور امامت مولانا غزنویؒ نے کی۔ نماز میں وہ اپنے مسلک کے مطابق باقاعدہ رفع یدین کرتے رہے۔ میرے ساتھ ایک حیدر آبادی صاحب کھڑے تھے، سلام پھیرتے ہی انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہماری

یہ نماز صحیح ادا ہوئی ہے؟ میں نے کہا ہاں: صحیح ہے۔ انھوں نے کہا کہ امام تو وہابی ہیں' وہابی کے پیچھے حنفیوں کی نماز درست نہیں ہے۔

مولانا داؤدؒ نے کہا:

"میں وہابی نہیں ہوں بلکہ اہل حدیث ہوں۔ حنفی مذہب میں اور اہل حدیث میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ بھی تو اہل حدیث تھے۔"

اس شخص کو بہت غصہ آیا۔ مولانا نے فرمایا کہ سنو بھائی امام اعظم کا یہ قول ہے: "اذاصح الحدیث فھو مذھبی" اس قول کی مولانا نے اچھی طرح تشریح فرمائی۔ تمام نمازیوں نے مولانا غزنویؒ کا نظریہ قبول کیا اور وہ شخص بھی قائل ہو گیا۔ مولانا کی تشریح و توضیح سے لوگوں کے دلوں میں غیر مقلدین کے خلاف جو شکوک تھے' وہ سب رفع ہو گئے۔

گاندھی جی کی تحریک ترک موالات کے پاس ہونے کے بعد پبلک میں حکومت کے خلاف جذبات برانگیختہ ہو گئے اور سخت و تیز تقریریں ہونے لگیں۔ لوگوں میں بہت جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ گورنمنٹ بھی سختی پر اتر آئی اور گرفتاریاں شروع کر دیں۔ بالخصوص کراچی میں مولانا شوکت علی' مولانا محمد علی' مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا نثار احمد صاحب کی سزایابی سے مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک خاتون کی ایک نظم روزنامہ "زمیندار" میں شائع ہوئی جس کے ایک دو شعر جو اس وقت نوک زبان تھے سنیئے:

جو کچھ پڑے گی مجھ پہ مصیبت اٹھاؤں گی
خدمت کروں گی ملک کی اور جیل جاؤں گی
جا کر کراچی جیل میں کوٹوں گی رام باس
شوکت علی کے ساتھ میں چکی چلاؤں گی

مہاتما جی بھی برواده جیل بھیج دیے گئے۔ میں بھی جیل چلا گیا۔ میری گرفتاری سے ایک ہفتہ قبل مولانا سید داؤد غزنویؒ بھی جیل جا چکے تھے۔ رہائی کے بعد ۱۹۲۴ء میں کاکناڈا میں کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ خلافت کانفرنس کے صدر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تھے اور کانگریس کے صدر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ اس موقع پر مولانا سید داؤد غزنویؒ بھی مع چند ساتھیوں کے شریک اجلاس تھے۔ میں بھی شریک تھا اور کانگریس

کیمپ میں ان کے ساتھ مقیم تھا اور ہر وقت تبادلہ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ خلافت کانفرنس میں میرا ایک رزولیوشن عدن کے بارے میں، جس کا اعلان پہلے اخبارات میں شائع ہو چکا تھا، پیش ہونے والا تھا۔ مولانا داؤدؒ نے نجی طور پر مجھ سے کہا کہ تم میری ترمیم قبول کر لو تو پھر میں تمھارے رزولیوشن کی تائید کروں گا۔ چوں کہ ترمیم رزولیوشن کے منافی نہیں تھی، اس لیے میں نے بطیب خاطر قبول کر لی، پھر عام جلسے میں مولانا غزنویؒ نے بڑے عمدہ پیرایہ میں میری تحریک کی تائید فرمائی، جس سے میری شخصیت بہت نمایاں ہو گئی۔

اخبار "وکیل" امرتسر نے مولانا داؤد غزنویؒ پر ایک دفعہ سخت تنقید کی تھی اور کہا تھا کہ یہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں جس سے قوم کا پیسہ برباد ہو جاتا ہے۔ میں نے اس بارے میں ان سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے میں کبھی دور دراز کا سفر کرتا ہوں تو سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھتا ہوں، عیش و آرام کی خاطر نہیں بلکہ نماز کی خاطر۔۔۔۔۔۔اب آیا ہوں تو سیکنڈ کلاس میں آیا ہوں اور جاؤں گا بھی سیکنڈ کلاس میں (ان شاء اللہ تعالیٰ)۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں اطمینان سے نماز کا موقع ملتا ہے، تھرڈ کلاس میں اطمینان سے نماز کا موقع نہیں ملتا۔ میں اپنے پیسے سے سفر کرتا ہوں۔ خلافت کمیٹی کا اگرچہ میں صدر ہوں، لیکن کمیٹی کی رقم میں نے ذاتی مفاد میں کبھی خرچ نہیں کی ہے۔ اخبار "وکیل" امرتسر نے سمرنا فنڈ کی تمام رقوم خورد برد کر دی ہیں، اس لیے وہ بفحوائے "من رافی نفسه فقد رانی غیره" دوسروں پر بدگمانی کرتا ہے۔ اخیر میں حافظ کا یہ شعر سنایا ؎

بیا کہ خرقہ من گرچہ وقف میکدہ ہاست
زمال وقف نبینی بنام من درمے

کاکناڈا کانفرنس کے بعد خلافت کا مسئلہ بہت سست پڑ گیا تھا، کیونکہ مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ہندوستان میں اب صرف کانگریس کی تحریک چلتی تھی، جب کبھی کانگریس کے اجلاس ہوتے تھے اور میں بھی شریک ہوتا تو مولانا داؤد غزنویؒ سے ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ تو باقاعدہ ہر اجلاس میں شریک ہوتے تھے اور میں کبھی کبھار شریک ہوتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں جامعہ دارالسلام عمر آباد کی دستار بندی کے جلسے میں وہ عمر آباد تشریف لائے۔ اس موقعے پر بھی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بعد پھر کوئی موقع ملاقات کا نہیں ملا۔

اب حال میں جب میں مغربی پاکستان گیا تو ۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ان سے شرف ملاقات کا موقع ملا- یکم دسمبر کو میں لاہور پہنچا اور مولانا غلام رسول مہر صاحب کے خوشنما بنگلے واقع مسلم ٹاؤن میں قیام پذیر رہا- پھر حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ سے ملنے کے لیے روانہ ہوا- پہلے مولانا محی الدین احمد قصوری سے جا کر ملا' پھر ان سے کہا کہ میں مولانا سید داؤد غزنوی سے ملنا چاہتا ہوں- انھوں نے کہا وہ ہسپتال میں ہیں' میں بھی ان سے ملنے کی خواہش رکھتا ہوں- چنانچہ ہم دونوں ہسپتال گئے- میں نے نبض دیکھ کر کہا کہ خدا کے فضل سے بیماری تو نہیں ہے' البتہ نقاہت بہت ہے- مولانا نے کہا کہ ڈاکٹر کی بھی یہی رائے ہے اور کہتے ہیں کہ اب گھر چلے جاؤ- چنانچہ آج گھر جانے کا قصد ہے- میں نے کہا نقاہت کی دوا میرے پاس ہے- اس وقت تو تیار نہیں ہے لیکن وطن سوات جا کر بناؤں گا اور ایک کورس آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا- انھوں نے فرمایا ضرور بھیجے' میں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور استعمال کروں گا-

میں نے ان کو مولانا ظفر علی خان کے چند طنزیہ اشعار سنائے جن کو سن کر وہ بہت ہنسے- بات یہ ہوئی تھی کہ تحریک نمک میں جب پولیس نے مولانا کو گرفتار کر لیا' تو وہ پولیس کے ساتھ جاتے نہیں تھے- پولیس نے بہ جبر ان کو اٹھا کر موٹر میں بٹھا دیا- جب کورٹ پہنچائے گئے تو موٹر سے اترتے نہ تھے' پھر پولیس نے ان کو پکڑ کر جج کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا- جب سزا ہوئی تو جیل جاتے نہ تھے' پھر پولیس نے پکڑ کر موٹر میں بٹھا دیا- جیل پہنچے تو اترتے نہ تھے' پھر پولیس نے پکڑ کر موٹر سے اتارا- مولانا ظفر علی خان صاحب بھی جیل میں تھے- یہ کش مکش دیکھ کر چند اشعار فی البدیہہ موزوں کر دیے- ان میں سے چند اشعار یہ ہیں ؎

دی مولوی داؤد کو چڈی جو پولیس نے
احباب نے پوچھا بہ تعجب کہ یہ کیا ہے
کیوں لد کے چلے دوش حکومت پہ حضور آج
حضرت کی سواری کا طریقہ یہ نیا ہے
فرمانے لگے ہنس کے کہ میں عالم دیں ہوں
اور مرتبہ سرکار میں عالم کا بڑا ہے
اس واسطے مرکب کے عوض فرط ادب سے
پیش اپنے تئیں آپ حکومت نے کیا ہے

ہے فخر یہ مجھ کو کہ مری ران کے نیچے
خود حضرت عیسیٰ کی سواری کا گدھا ہے

پھر مولانا نے جامعہ دارالسلام عمر آباد کے متعلق دریافت کیا۔ میں نے کہا کہ اچھی حالت میں ہے، جب سے مولانا عبدالواحد صاحب ناظم جامعہ بنے ہیں، جامعہ ترقی پر ہے۔ پھر میں نے جامعہ کے اساتذہ اور دوسرے عملے کی جانب سے کہا کہ سب آپ کی خدمت میں السلام علیکم عرض کر رہے تھے اور آپ کی صحت کے لیے دست بہ دعا رہتے ہیں۔ مولانا شعیب عمری کو جب معلوم ہوا کہ میں پاکستان جا رہا ہوں تو انھوں نے مجھے لکھا کہ میرا بھی پاکستان جانے کا ارادہ تھا کیوں کہ اخبارات کے ذریعے سے مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کی وحشت ناک خبر سمع خراش ہوئی ہے۔ ان سے نیاز حاصل کرنے کا ارادہ تھا، لیکن پاسپورٹ نہیں ملا۔ آپ میری طرف سے سلام کہیے، چنانچہ میں نے مولانا شعیب کی جانب سے خاص طور پر ان کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیا۔ مولانا نے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ میں نے کہا کہ وہ بنگلور میں سی عبدالحکیم صاحب کے پوتے حاجی صدیق حسن صاحب کے ساتھ مل کر تجارت کر رہے ہیں۔ ان کے نانا مولانا فقیر اللہ صاحبؒ ہیں۔ یہ سنتے ہی مولانا غزنوی فوراً کہنے لگے کہ مولانا فقیر اللہ صاحب میرے والد کے شاگرد تھے۔ میں بچپن سے ان کو جانتا ہوں۔ میری طرف سے بھی محمد شعیب صاحب عمری کو السلام علیکم کہیے گا۔

میں جب سوات پہنچا تو شدت سردی کی وجہ سے سخت علیل ہو گیا، اس لیے دوا تیار نہ کر سکا۔ ایک روز میرا نواسہ روزنامہ جنگ کراچی مجھے سنا رہا تھا جس میں حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے انتقال پرملال کی خبر سننے میں آئی۔ سن کر بہت متاثر ہوا اور مغفرت کی دعا کی۔"

---

افسوس ہے یہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں۔ اب (کم از کم جماعت اہل حدیث میں) کوئی ایسا شخص نہیں رہا جو پرانے دور کے اہل علم کی علمی اور سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ اور ان کی تگ و تاز کی مختلف نوعیتوں سے باخبر ہو۔ نہ کسی کو اس قسم کی باتوں کا علم ہے، نہ دلچسپی، نہ سننے کا شوق اور نہ پڑھنے کی لگن۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بہت بڑے صاحب علم دوست نواب حبیب الرحمٰن خاں

صاحب شروانی تھے' جن کے نام انھوں نے قلعہ احمد نگر جیل سے وہ خطوط لکھے جو "غبار خاطر" کے نام سے شائع ہوئے۔ یہ خطوط نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور علمی وادبی اعتبار سے شاہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا ان خطوط میں نواب صاحب شروانی کو "صدیق مکرم" سے خطاب فرماتے ہیں۔ سیاسیات سے ان کا قطعاً کوئی تعلق نہ تھا اور نہ مولانا ان سے کوئی سیاسی بات کرتے تھے۔ انھوں نے اگست ۱۹۵۰ء میں وفات پائی۔ ان کی وفات پر مولانا محمد حنیف ندوی نے ۲۵ اگست ۱۹۵۰ء (۱۰ ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ) کے ہفت روزہ "الاعتصام" میں تعزیتی شذرہ لکھا تھا۔ مولانا آزاد کے تذکرے میں نواب صاحب ممدوح کا تذکرہ بھی آتا ہے' اس مناسبت سے یہ شذرہ یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ اس کا عنوان ہے "مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب سابق صدر الصدور کا انتقال" ---- اس عنوان کے تحت مولانا محمد حنیف ندوی لکھتے ہیں۔

"مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے لازوال خطوط میں جن کو "صدیق مکرم" کے نام سے یاد فرمایا ہے' افسوس ہے ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم میں بڑی خوبیاں تھیں۔ ندوۃ العلما (لکھنؤ) کے ایک اجلاس میں ان سے تعارف ہوا۔ وضعداری اور اخلاص و سنجیدگی کا پیکر تھے۔ تاریخ اسلامی پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے اور دین سے ان کا جو لگاؤ تھا وہ تو بالکل والہانہ قسم کا تھا۔ یعنی اس میں عقلیت کی کوئی آلودگی نہیں تھی۔ ان کا کتب خانہ نوادر کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ بڑے بڑے اہل علم کو تصنیفات کے سلسلے میں ان کے کتب خانے سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔

"ان کی دو باتیں اب تک کانوں میں گونج رہی ہیں -----

ایک مرتبہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسے میں تشریف لائے اور سید سلیمان ندوی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مولانا! یہ کیا بات ہے کہ ہمارے ہاں فارسی کا ادب رندی و ہوسناکی سے بھرپور ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ عجیب معاملہ ہے کہ جو لوگ اس کا ذوق رکھتے ہیں' ان میں اسلامیت کی جڑیں بڑی گہری اور بڑی مضبوط ہیں۔

"ایک مرتبہ ہمارے ایک ندوی دوست جو نئے نئے مصر سے آئے تھے' ندوے

کے سالانہ جلسے میں تقریر کر رہے تھے اور مجمعے کو یہ باور کرا رہے تھے کہ الحاد و زندقہ کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے اور ہمارے علما اس سے بالکل ناواقف ہیں---- اس پر شروانی صاحب مرحوم جلال میں آگئے اور برجستہ فرمایا کہ اسلام کو کسی طوفان کا خطرہ لاحق نہیں----اس نے گزشتہ تاریخ میں اس طرح کے ہر طوفان سے اپنے کو بچایا ہے- سب سے بڑا طوفان اور خطرہ وہ مرعوبیت ہے جو ہمارے نوجوانوں کے دل و دماغ پر چھا رہی ہے' اور اس کا واقعی کوئی علاج نہیں ہے-

"مرحوم میں رئیسانہ سج دھج کے ساتھ ساتھ' ایک طرح کا درویشانہ وقار بھی تھا' جس سے دیکھنے والے خواہ مخواہ متاثر ہوتے تھے----

ان کا وجود ہندوستان میں مغتنمات میں سے تھا---- اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے' وہ بہت سے اوصاف کے حامل تھے-"

گزشتہ سطور میں مولانا آزاد سے متعلق نہایت اختصار کے ساتھ بعض واقعات درج کیے گئے ہیں- اب چند الفاظ ان کے سفر آخرت کے بارے میں پڑھیے-

۱۵- فروری ۱۹۵۸ء کو پریڈ گراؤنڈ دہلی میں کل ہند اردو کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا' جس کا افتتاح وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا- اس اجلاس میں مولانا آزاد بھی شریک تھے اور انھوں نے تقریر بھی کی تھی- ان کی زندگی کی یہ آخری تقریب تھی' جس میں وہ شریک ہوئے اور آخری تقریر تھی جو انھوں نے فرمائی-

۱۹- فروری کو وہ معمول کے مطابق علی الصباح اٹھے اور غسل خانے میں گئے- غسل خانے ہی میں اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ گر پڑے- گرتے ہی بے ہوش ہو گئے- مسلسل تین دن یہی حالت رہی- درمیان میں ایک یا دو مرتبہ ہوش کی کچھ لہر سی آئی تو قریب بیٹھے ہوئے کسی شخص کو پہچانا- اسی اثنا میں پنڈت جواہر لال نہرو قریب آئے تو انھیں "خدا حافظ" کہا-

ایک موقعے پر ڈاکٹروں کے آکسیجن گیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"مجھے پنجرے میں کیوں بند کر رکھا ہے- بس اللہ پر چھوڑ دو"-

علاج معالجے کی تمام انسانی کوششیں کی گئیں اور ہر قسم کی تدبیریں آزمائی

گئیں، مگر وہی ہوا جو اللہ کو منظور تھا۔

حالت انتہائی خطرناک تھی اور تمام دنیا میں منٹ منٹ کی معالجاتی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ پاکستان کے اخبار تین دن کافی تاخیر سے چھپتے رہے کہ معلوم نہیں کسی وقت کسی ایسے کی خبر آ جائے۔ آخر ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء (۲ شعبان ۱۳۷۷ھ) کو جمعے اور ہفتے کی درمیانی رات ہندوستانی وقت کے مطابق دو بج کر دس منٹ پر وہ اپنی سرکاری قیام گاہ (واقع کنگ ایڈورڈ روڈ نئی دہلی) میں تقریباً ستر سال کی عمر میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

وفات کی خبر آن واحد میں پورے برصغیر میں پھیل گئی۔ ان کے آخری دیدار کے لیے پاک و ہند کے مختلف گوشوں سے لوگوں نے دہلی پہنچنے کی کوشش کی۔ قریبی مقامات اور گردونواح کے علاقوں سے جو لوگ سورج نکلنے تک ان کی جائے وفات پر پہنچ گئے تھے، ان کی تعداد ایک لاکھ سے زائد بتائی گئی تھی۔

ان کی وفات کے سوگ میں حکومت ہند نے پورے ملک میں تعطیل کا اعلان کیا اور سرکاری پرچم سرنگوں کر دیے گئے۔ تمام سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات منسوخ کر دی گئیں۔ حکومت ہند نے ملک بھر میں سات دن تک مولانا کا سوگ منانے کا اعلان کیا۔ اس دن حکومت کے ایک غیر معمولی گزٹ میں مولانا کی وفات کی خبر سیاہ حاشیے کے ساتھ شائع کی گئی، جس میں ان کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا تھا۔

غسل دینے کے بعد ہفتے کے دن صبح سات بجے ان کی میت کمرے سے باہر لا کر تخت پر لٹا دی گئی تاکہ لوگ ان کا آخری دیدار کر لیں۔ سب سے پہلے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد نے میت پر پھول ڈالے۔ میت ایک کشمیری شال اور ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپیٹی گئی تھی۔

پروگرام کے مطابق مولانا کا جنازہ گیارہ بجے اٹھایا جانا تھا، لیکن آخری دیدار کرنے والوں کے بے پناہ ہجوم کے باعث وقت بدلنا پڑا۔ چنانچہ بارہ بج کر دس منٹ پر جنازہ تخت سے اٹھا کر تابوت پر لٹایا گیا اور تابوت ایک توپ گاڑی پر رکھا گیا، جسے پھولوں اور سبز پتوں سے سجایا گیا تھا۔

سوا بارہ بجے جنازے کا جلوس مولانا کی آخری آرام گاہ سے پریڈ گراؤنڈ کی طرف

روانہ ہوا۔ جلوس کے آگے دو پائلٹ تھے اور پیچھے پولیس کی گاڑی تھی۔ اس کے پیچھے پچاس فوجیوں کا ایک دستہ تھا۔ جلوس دو بج کر دس منٹ پر پریڈ گراؤنڈ میں پہنچا۔ جلوس میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی ہر مذہب کے لوگ شامل تھے اور سب کے چہروں پر حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی۔

ہندوستانی وقت کے مطابق دو بج کر بیس منٹ پر مولانا کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نماز جنازہ حضرت مولانا احمد سعید دہلوی نے پڑھائی۔ ایک اندازے کے مطابق پانچ لاکھ افراد نے جنازے میں شرکت کی۔

۲۲۔ فروری ۱۹۵۸ء کو ہفتے کے دن سہ پہر کے وقت تین بجے سے کچھ پہلے جامع مسجد کے قریب آزاد پارک میں امام الہند کی میت قبر میں اتاری گئی۔ سب سے پہلے مولانا احمد سعید نے قبر پر مٹی ڈالی۔ قبر کے قریب ایک قالین رکھ دیا گیا تھا۔

تدفین کے بعد تقریباً ہر جگہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ لاہور میں موچی دروازے کے باہر گراؤنڈ میں تین بجے کے قریب کئی ہزار افراد نے امام الہند کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ نماز جنازہ ان کے دیرینہ رفیق حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے پڑھائی۔

اللّٰھم اغفرله وارحمه وعافه واعف عنه واکرم نزله ووسع مدخله وادخله جنت الفردوس

مولانا کی وفات کے بعد بے شمار لوگوں نے بصورت نظم و نثر ان پر لکھا۔ اخبارات و رسائل کے خاص نمبر شائع ہوئے۔ ان کے افکار و تصورات اور علم و عرفان کے بارے میں کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ابھی ان کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر لکھا جائے گا اور ان کے فضل و کمال کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے گا، اور اجاگر کرنا چاہیے۔ اب آخر میں ہندوستان کے معروف شاعر و ادیب جگن ناتھ آزاد کی ایک نظم شائع کی جا رہی ہے جس کا عنوان ہے۔ ”مولانا ابوالکلام آزاد کی رحلت“

جس کا دھڑکا تھا بالآخر وہ گھڑی بھی آ گئی
وہ خبر آئی کہ بزمِ زندگی تھرا گئی
روشنی جس کی حریمِ روح کو چمکا گئی
ظلمتِ مرگ اس ستارے کو بھی آخر کھا گئی

جس سے روشن اپنے سینے تھے، منور تھے دماغ
بجھ گیا وہ علم کا، حکمت کا، دانش کا چراغ

بجھ گیا، اے زندگی! تیرا چراغ علم و فن
غرق ظلمت ہو گئی علم و ادب کی انجمن
یوں چلا باد خزاں کا ایک جھونکا دفعتہً
رہ گیا مرجھا کے تہذیب و تمدن کا چمن

اب چمن میں اس وضع کا گل نہ کھلنے پائے گا
بو الکلام آزاد کا ثانی نہ ملنے پائے گا

اے وطن! تیرا امیر کارواں جاتا رہا
ناز تھا جس پر، وہ گنج شائگاں جاتا رہا
داستان کیسی کہ زیب داستاں جاتا رہا
اے کلام اللہ! تیرا ترجماں جاتا رہا

جس کی تحریروں سے روشن تھی شب افکار شرق
آج ٹھنڈا ہے وہ سوز سینہ احرار شرق

نطق کا، فن کا، ہنر کا، علم کا عرش عظیم
کشور ہندوستاں میں طور معنی کا کلیم
آبروئے عصر حاضر، نازش دور قدیم
فلسفے کے اور مذہب کے گلستان کی شمیم

یہ خزانہ زندگی آخر کہاں گم ہو گیا
ظلمتوں میں اک شرار جاوداں گم ہو گیا

بوالکلام اے کاروان علم و حکمت کے امیر
مرشد روشن بصر، روشن دل و روشن ضمیر
آسمان جذبہ اخلاص کے مہر منیر
تو نے دنیا کو دکھا دی عظمت و شان فقیر

فاش تھی تیری نگاہوں پر نمودِ زندگی
تیرا ہر نکتہ ضمیر اندر وجودِ زندگی

علم کی محفل میں گا ہے درفشاں' گا ہے خموش
زندگی کے معرکے میں پختہ کار و سخت کوش
اے فقیر خوش کلام دنرم خوئے و سادہ پوش
ہائے' تو کتنا ادائے فرض میں تھا گرم جوش

تیری نظروں پر عیاں تھا روزگار شرق و غرب
تیری حکمت تھی سراپا راز دار شرق و غرب

کھل اٹھی جب بھی کبھی میرے مقدر کی کلی
خوبیٔ تقدیر تیرے پاس مجھ کو لے چلی[1]
ناز ادج بخت پر اور ساتھ دل کی بے کلی
فاش تھے باریک تر نکتے بہ عنوان جلی

تازگی حاصل وہ ہوتی تھی تری گفتار سے
روح کو ملتی ہے جو اقبال کے اشعار سے

تیرے دم سے تھا سیاست کو بھی حاصل اک وقار
تیری سطوت ملک و دولت کے لیے سنگیں حصار
عصر نو میں' اے دیار فقر و دین کے تاج دار!
تیرے دل کا صدق تھا تیری نظر سے آشکار

جلوہ آرا نور قرآنی ترے سینے میں تھا
جوہر خورشید تیرے دل کے آئینے میں تھا

نالہ کش ہیں موت پر تیری ادیبان وطن
گریہ ساماں ہیں سراپا نغمہ سنجان وطن
کچھ خبر بھی ہے تجھے' او عظمت و شانِ وطن
ہم نے یوں دیکھی نہ تھی صبح پریشان وطن

---

[1] مجھے مولانا کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

زندگی جن کے لیے ہے امتحاں تیرے بغیر
اب سنائیں کس کو اپنی داستاں تیرے بغیر

کیا بتائیں ہم، ترے جانے سے کیا جاتا رہا
کشتی علم و ادب کا نا خدا جاتا رہا
ہند کے اہلِ قلم کا آسرا جاتا رہا
تیرے دم سے تھا جو باقی حوصلہ، جاتا رہا

جانے والے! اک ترے جانے سے کیا باقی نہیں
زندگی کی بزم باقی ہے مگر ساقی نہیں

گرچہ اے دہلی! ترے دل میں دفینے ہیں بہت
تیرے ہر گوشے میں پوشیدہ خزینے ہیں بہت
تیری مٹی میں نہاں بے تاب سینے ہیں بہت
تو وہ دریا ہے کہ گم تجھ میں سفینے ہیں بہت

آج لیکن تجھ میں اک فخر زمن خوابیدہ ہے
پیکر صدق و صفا و علم و فن خوابیدہ ہے

جس کی ساری داستاں تھی داستان علم و فن
جس کی موج نطق سے آباد تھا اپنا چمن
جس کو کہیے آبروئے شیخ و فخر برہمن
آج سوتا ہے تری مٹی میں وہ ناز وطن

نور سے معمور اک ہیرا ترے دامن میں ہے
جس نے ظلمت کا جگر چیرا، ترے دامن میں ہے

ناز کر بخت رسا پر، خاک دہلی! ناز کر
تیری خاک پاک میں پنہاں جو ہیں لاکھوں گہر
آج شامل ان میں ہے وہ صاحب ذوق نظر
فکر جس کی تھی تجلی بخش خورشید و قمر

کیا کہوں، دہلی ! تجھے کیا سروری حاصل ہے آج
تیری مٹی کو فلک پر برتری حاصل ہے آج

اے غلاموں کا لہو گرمانے والے، الوداع !
آگ سی الفاظ میں برسانے والے، الوداع !
خود تڑپ کر بزم کو تڑپانے والے، الوداع
اے جگا کر ہند کو، سو جانے والے، الوداع

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے"

# مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۳۵ء کی سردیوں کا موسم تھا کہ فیروز پور شہر کی انجمن اہل حدیث کے سہ روزہ تبلیغی جلسے کا اشتہار شائع ہوا۔ جلسے کے مطبوعہ پروگرام میں بتایا گیا تھا کہ دوسرے دن رات کے اجلاس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کی تقریریں ہوں گی۔ پروگرام میں مولانا ثناء اللہ صاحب کے مناظرے کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ اب یہ یاد نہیں رہا کہ کس مذہب کے کس مناظر سے مناظرے کا اعلان ہوا تھا۔

کوٹ کپورہ' فیروز پور سے تیس میل دور تھا۔ جلسہ اور مناظرہ سننے کے شائقین اچھی خاصی تعداد میں وہاں سے فیروز پور کے لیے تیار ہوئے تھے۔ میری عمر اس وقت دس گیارہ سال کی تھی۔ بس چلنے لگی تو میں بھی اس میں سوار ہو گیا۔ میرے مشفق اور قابل احترام استاد حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف اس وقت کوٹ کپورہ میں مقیم تھے' وہ بھی اس جلسے میں تشریف لائے تھے۔

ہم فیروز پور جلسہ گاہ میں پہنچے تو بہت بڑی حاضری تھی' رات کا جلسہ تھا۔ پہلے مولانا محمد جونا گڑھی نے تقریر کی' میں نے ان کو پہلی اور آخری دفعہ اسی جلسے میں دیکھا۔ بہت بڑے مقرر اور پر تاثیر واعظ تھے۔ اپنی بات نہایت جوش و جذبے سے بیان کرتے تھے' تقریر میں قرآن کی آیات اور احادیث رسول ﷺ کثرت سے پڑھتے تھے۔ قلعہ معلیٰ کی زبان بڑی روانی سے بولتے اور دھڑلے سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے تھے۔ لہجے کے نکھار اور اسلوب کی صفائی کا یہ عالم کہ ہر بات آسانی سے سمجھ میں آتی اور دل میں اپنی جگہ بناتی جاتی تھی۔ انھوں نے مارچ ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔

مولانا ثناء اللہ سٹیج پر تشریف فرما تھے اور لوگ ان کی تقریر سے زیادہ ان کا مناظرہ سننے کے لیے بے قرار تھے۔ بہت انتظار کیا' لیکن وقت و شرائط طے کرنے کے باوجود فریق مخالف مناظرے کے لیے نہیں آیا۔

انھوں نے مختصر سی تقریر کی اور یہ مناظرہ جس کے لیے وہ امرتسر سے تشریف

لائے تھے‘ نہیں ہو سکا۔ اس پر انھوں نے تقریر میں افسوس کا اظہار کیا کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا۔

مناظرے میں وہ بہت چہکتے تھے اور حریف کو آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ وعدے کے باوجود اگر حریف مقابلے میں نہ آتا تو انھیں بڑی ذہنی تکلیف ہوتی۔ جو لوگ مناظرہ سننے کی غرض سے آتے انھیں بھی بے حد قلبی اذیت پہنچتی۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مولانا ثناء اللہ صاحب کو دیکھا اور ان کی تقریر سنی۔

اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا محمد علی لکھوی کی تگ و تاز سے ضلع فیروز پور کی جماعت اہل حدیث کا جلسہ ہوا‘ جس میں بہت سے علمائے کرام تشریف لائے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا اور مولانا علی محمد صمصام کی تقریر ہو رہی تھی کہ مولانا محمد علی لکھوی جو جلسے کے منتظم اعلیٰ تھے‘ مولانا ثناء اللہ صاحب کو ساتھ لے کر سٹیج پر آئے۔ سٹیج پر کرسیوں کا انتظام تھا اور ان پر جو علمائے کرام بیٹھے تھے‘ وہ احتراماً کھڑے ہو گئے اور سب نے مولانا ثناء اللہ صاحب سے عقیدت مندانہ انداز میں مصافحہ کیا۔ مولانا حافظ عبداللہ روپڑی بھی سٹیج پر تشریف فرما تھے‘ نہ وہ کھڑے ہوئے اور نہ مصافحے کے لیے مولانا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ بات لوگوں کو عجیب سی لگی۔

اتنے میں مولانا ثناء اللہ صاحب کرسی پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے دائیں جانب دیکھا تو ایک کرسی چھوڑ کر دوسری کرسی پر حضرت حافظ صاحب بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنی نشست سے تھوڑا سا کھڑے ہو کر حافظ صاحب کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور السلام علیکم کہا۔ میں دور بیٹھا تھا‘ السلام علیکم کے الفاظ تو میں نے نہیں سنے البتہ ان کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھے۔ مصافحے کے بعد مسکراتے ہوئے کچھ اور لفظ بھی ان سے کہے۔ غالباً" خیر و عافیت پوچھی ہو گی۔ مولانا کے اس طرز عمل کا لوگوں پر نہایت اچھا اثر ہوا۔

اپریل ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا سالانہ اجلاس فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب) میں ہوا۔ اس جلسے میں میرے دو قابل احترام استاد مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد شفیع ہوشیار پوری بھی شریک ہونا چاہتے تھے‘ ان کے حکم سے میں بھی تیار ہو گیا۔

مولانا محمد شفیع نے ہر کلیس (Hercules) کی نئی سائیکل خریدی تھی۔ وہ چاہتے

تھے کہ میں ان کے ساتھ چلوں- چنانچہ ہم دونوں دن کے دو بجے کے قریب فیروز پور سے روانہ ہوئے-وہ سائیکل چلا رہے تھے اور میں ان کے پیچھے کیریئر پر بیٹھا تھا- تھوڑی دور ان کو پیچھے بٹھا کر میں نے بھی ایک دو دفعہ سائیکل چلائی-ہم شام تک امرتسر پہنچ جانا چاہتے تھے اور وہاں رات گزار کر فتح گڑھ چوڑیاں جانے کا پروگرام تھا- للیانی پہنچ کر ہم اس نہر کی پٹڑی پر چلنے لگے جو امرتسر کی طرف سے آتی ہے اور جسے ہمارے ہاں للیانی نہر کہا جاتا ہے- ہم نے چھے سات میل کی مسافت طے کی ہوگی کہ سورج غروب ہوگیا اور رات کی سیاہ چادر پوری فضا پر تن گئی- اب عجیب بلکہ مہیب صورت حال تھی- رات کا اندھیرا' نہر کا کنارہ' ہر سو اونچے اونچے اور گھنے درختوں کی لمبی لمبی قطاریں' پانی کی خاموش مگر تیز روانی میں نادیدہ خطرات کا تلاطم' جس سے کیفیت ذہن کی اندرونی سطح بری طرح لرز رہی تھی- ماجھے کا علاقہ جہاں کے لوگ بہت سی باتوں میں مشہور ہیں-دو تین میل کے بعد سامنے سے آتا ہوا یا اردگرد کے کھیتوں میں کام کرتا ہوا کوئی شخص نظر آتا تو اس سے پوچھتے-

امرتسر کتنی دور ہے؟

جواب ملتا: بس قریب ہی ہے-

اس طرح ''بس قریب ہی ہے'' میں ہم نے کتنا ہی فاصلہ طے کر لیا- کسی نے مسافت کا صحیح تعین نہیں کیا اور یہ نہیں بتایا کہ دس یا پندرہ میل ہے' جس سے پوچھا یہی جواب ملا-

''بس قریب ہی ہے''-

شب کی سیاہی میں ڈوبا ہوا ماحول ساں ساں کرتا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گردو پیش کی ہر شے حملہ کرنے کے لیے ہماری طرف دوڑی چلی آرہی ہے- خدا خدا کرکے بائیں جانب روشنیاں نظر آنے لگیں' جس سے اندازہ ہوا کہ یہ امرتسر شہر ہے- آگے بڑھے تو اسی جانب نہر کی پٹڑی سے نیچے کو جاتے ہوئے ایک کچے راستے پر فصلوں کی رکھوالی کرنے والے یا فصلوں کو پانی دینے والے چار پانچ آدمی ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے بیٹھے تھے' ان سے شہر کا راستہ پوچھا تو جواب دیا:

یہی راستہ شہر کو جاتا ہے اور سامنے تین فرلانگ کے فاصلے پر شہر کی آبادی شروع ہو جاتی ہے-

یہ الفاظ سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور ہم اس طرف کو چلنے لگے- بجلی کے کھمبے پر نصب شدہ بلب کی روشنی میں مولانا محمد شفیع نے گھڑی دیکھی تو پورے نو بج رہے تھے-

سائیکل چلاتے چلاتے وہ بھی تھک گئے تھے اور پیچھے بیٹھے بیٹھے میرا بھی برا حال ہو گیا تھا- اب ہم نے پیدل چلنا شروع کیا- ہم مدرسہ غزنویہ جانا چاہتے تھے- پوچھتے پاچھتے وہاں پہنچے تو سکھ کا سانس لیا- مولانا محمد شفیع کے ملنے والے کچھ لوگ وہاں موجود تھے' انھوں نے ہمارے لیے روٹی پانی کا انتظام کیا اور رات ہم نے وہیں بسر کی-

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے گوروؤں کی اس خوب صورت نگری کی یاترا کی-

دوسرے دن صبح سات بجے کے لگ بھگ ہم فتح گڑھ چوڑیاں کے لیے روانہ ہوئے- مجھے یاد پڑتا ہے مجیٹھہ تک پختہ سڑک تھی' اس سے آگے کچا راستہ تھا' لیکن تانگے چلتے تھے- امرتسر سے بہت سے لوگ جلسہ سننے جا رہے تھے' سائیکلوں پر بھی' تانگوں پر بھی اور پیدل بھی-

مجیٹھہ میں اس راستے پر جو فتح گڑھ چوڑیاں کو جاتا تھا' ایک مسجد تھی' جس میں چھوٹا سا کنواں تھا' جسے "کھوہی" کہا جاتا تھا' ہم نے وہاں پانی پیا------ یاد رہے یہ وہی مجیٹھہ گاؤں ہے' جہاں کے رہنے والے متحدہ پنجاب کی سیاست کے ایک مشہور کردار سندر سنگھ مجیٹھہ تھے جو پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی حکومت میں ایک وزیر تھے- ان کی وفات کے بعد دسوندھا سنگھ کو ان کی جگہ وزیر بنالیا گیا تھا جن کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں- جی تو چاہتا ہے کہ چند لمحے رک کر یہاں ان کے کچھ لطیفے بیان کیے جائیں' لیکن مجبوری یہ ہے کہ یہ اس کا محل نہیں' یوں بھی بات لمبی ہو جانے کا اندیشہ ہے- مگر یہ بھی مشکل ہے کہ سردار دسوندھا سنگھ کا نام آئے اور قارئین کرام کو ان کے لطیفوں سے آگاہ نہ کیا جائے' کم از کم تین لطیفے تو بیان ہونے ہی چاہئیں- تو سنیے!

۱--- وہ اپنے زمانہ وزارت میں کہیں جانے کے لیے کار کی پچھلی سیٹ پر بائیں جانب بیٹھے اور سو گئے- اتنے میں ایک ہچکولا لگا اور آنکھ کھل گئی- ڈرائیور سے پوچھا یہ کیا ہوا؟ اس نے کہا "ٹویا" (یعنی گڑھا) تھا' اس میں ٹائر جا پڑا---- بولے "ٹویا اگے آگیا سی تاں ہارن وجالیناسی-"

۲---ایک مرتبہ لاہور سے گوجرانوالہ کے لیے دورے پر روانہ ہوئے- شاہدرے

سے تھوڑا سا آگے نکلے تو گاڑی رک گئی-ڈرائیور نے اتر کر دیکھا تو کہا پٹرول ختم ہو گیا ہے' اب آگے نہیں جا سکتے-

فرمایا: پٹرول ختم ہو جانے کی وجہ سے آگے نہیں جا سکتے تو گاڑی پیچھے کو موڑو اور گھر چلو-

۳--- ایک دفعہ رات کے وقت وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خاں کے گھر گئے-ان سے بات چیت ختم کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ بارش ہو رہی ہے----- سکندر حیات خاں نے کہا بارش تیز ہو گئی ہے' یہیں سو جایے-کہا ٹھیک ہے' یہیں سو جائیں گے-سکندر حیات اندر کمرے میں ان کے بستر وغیرہ کا انتظام کرنے میں مصروف ہو گئے- تھوڑی دیر کے بعد برآمدے میں آئے تو دیکھا کہ سردار دسوندھا سنگھ نے پتلون گھٹنوں تک کر رکھی ہے اور بھیگتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں---- تعجب سے پوچھا یہ کیا؟

کہا: تسیں جو کہیا سی کہ ایتھے سوں جاؤ' میں گھروں رات نوں پہنن والا کچھا لین چلا گیا ساں-

تو یہ تھے سردار دسوندھا سنگھ جنھیں سردار سندر سنگھ مجیٹھیہ کے بعد وزیر بنا گیا تھا----اب آگے چلیے-!

یہ جمعے کا دن تھا-جمعہ ہم نے فتح گڑھ چوڑیاں میں پڑھا-جمعہ کس عالم نے پڑھایا'اس کا علم نہیں-

ذہن میں کچھ ایسا نقشہ ابھر رہا ہے کہ علمائے کرام کو جہاں ٹھہرایا گیا تھا' وہ اسکول کی عمارت تھی-وہاں درخت بھی تھے' گھاس بھی تھی اور لمبے لمبے برآمدے بھی تھے جو کمروں کے آگے دور تک چلے گئے تھے-شام کو مولانا ثناء اللہ صاحب اپنی قیام گاہ سے باہر نکلے-لمبا کوٹ' سفید لٹھے کی شلوار' سلک کا بہترین عمامہ' پورا قد' لبوں پر مسکراہٹ' خوب صورت اور گورے چٹے-سامنے کے اوپر کے چاروں دانتوں کے دائیں اور بائیں جانب کے دونوں دانتوں پر' جنھیں اردو میں کچلیاں کہا جاتا ہے' سونے کے خول چڑھے ہوئے-لوگ سلام کے لیے ان کی طرف بڑھے' انھوں نے مسکراتے ہوئے سب سے مصافحہ کیا-

دلی کے چند علمائے کرام بھی اس جلسے میں تشریف لائے تھے' اپنے کمرے سے نکل کر مولانا ثناء اللہ ان کے کمرے میں گئے اور ان سے ملے-

جلسے کے آخری دن نماز عصر کے بعد "مذاہب کانفرنس" ہوئی' جس کی صدارت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے کی- تقریر کا عنوان تھا- "میرا مذہب مجھے کیوں پیارا ہے؟"

مسلمانوں کی طرف سے مولانا محمد حنیف ندوی نے اور آریہ سماجیوں کی طرف سے ان کے ایک پرچارک نے تقریر کی تھی۔

اس زمانے میں بعض مسائل سے متعلق مولانا ثناء اللہ صاحب اور مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کے درمیان نزاع چل رہی تھی، جسے ثنائی روپڑی نزاع کہا جاتا تھا'اس نزاع نے شدید اختلاف کی شکل اختیار کر لی تھی۔ جن مسائل سے اس نزاع کا تعلق تھا ان کا ذکر اس مضمون میں ملاحظہ فرمایے جو مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کے بارے میں لکھا گیا ہے اور اس کتاب میں درج ہے۔

صدر جلسہ مولانا عبدالقادر قصوری مرنجاں مرنج بزرگ تھے، جن کو ہر حلقے میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی پرخلوص کوششوں سے یہ اختلاف ختم ہو جائے گا۔ اس ضمن میں جن حضرات کو فریقین کے درمیان مصالحت کے لیے منتخب کیا گیا تھا'ان میں مولانا محمد حنیف ندوی بھی شامل تھے۔ جلسے کے آخری دن کئی گھنٹے الگ کمرے میں فریقین سے گفتگو ہوتی رہی'لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ مولانا عبدالقادر قصوری نے نہایت افسوس کے ساتھ جلسہ عام میں مصالحتی کوششوں کی ناکامی کا اعلان کیا۔ جب وہ یہ اعلان کر رہے تھے'ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔

آخری موقع بھی تھا۔ نہایت افسوس ہے'اس کے بعد ان کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا' لیکن ان کا اخبار ہفت روزہ "اہل حدیث" باقاعدہ پڑھتا رہا اور ان کی تصنیفات بھی ذوق و شوق سے پڑھیں۔

وہ برصغیر کی عظیم علمی شخصیت تھے۔ ان کا شمار بیسویں صدی عیسوی اور چودھویں صدی ہجری کے ان اکابر علمائے کرام میں ہوتا ہے جو بہ یک وقت متعدد اوصاف کے حامل تھے۔ انھوں نے اس دور میں ہوش سنبھالا جب اس خطہ ارض میں کئی خلاف اسلام تحریکیں جنم لے چکی تھیں اور اسلام پر پوری شدت سے پے بہ پے حملے کر رہی تھیں۔ وہ ان سب

کے خلاف سینہ سپر ہو گئے اور اسلام کی مدافعت و محافظت میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔

وہ بہترین مقرر بھی تھے اور بلند پایہ مناظر بھی' دینی علوم کے ماہر بھی تھے اور غیر اسلامی ادیان سے باخبر بھی' مصنف بھی تھے اور محقق بھی' مفسر بھی تھے اور ماہر حدیث بھی' اصولی بھی تھے اور عالم فقہ بھی' کلامی بھی تھے اور فلسفی و منطقی بھی۔ اپنے انداز خاص سے وہ سیاست میں بھی حصہ لیتے تھے اور ملکی مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔

انھوں نے اس دور میں تعلیم و تربیت کی منزلیں طے کی تھیں' جب برصغیر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ لیکن غلامی کے اس شر میں خیر کا پہلو یہ پنہاں تھا کہ اس میں مسلمانوں میں بڑے بڑے شہرۂ آفاق لوگ پیدا ہوئے' جنھوں نے اسلام کی عظیم الشان خدمات سرانجام دیں۔ ان میں مولانا ثناء اللہ مرحوم کو اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر خاص مقام حاصل ہے۔ یہاں ہم ان کی زندگی کے مختصر حالات بیان کرنا اور ان کے علمی و عملی کارناموں کی ایک جھلک قارئین کرام کو دکھانا چاہتے ہیں۔

مولانا ثناء اللہ کے آبا و اجداد اصلاً کشمیر کے رہنے والے تھے اور کشمیریوں کے منٹو خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو وہاں کے برہمنوں کی مشہور شاخ ہے۔ اس خاندان کے بہت سے افراد ان علما و صوفیا کے اثر تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے' جنھوں نے اس علاقے کو مستقل طور سے اپنا مسکن بنالیا تھا۔

مولانا کے والد کا نام خضر جو اور تایا کا اکرم جو تھا۔ یہ لوگ علاقہ ڈور کے باشندے تھے جو تحصیل اسلام آباد ضلع سری نگر میں واقع ہے۔ کشمیر کے زیادہ تر لوگ پشمینے کا کام کرتے تھے' مولانا مرحوم کے والد اور تایا کا بھی یہی کاروبار تھا۔ کام کاج کے سلسلے میں یہ لوگ کشمیر سے امرتسر آئے اور پھر وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

جون ۱۸۶۸ء (صفر ۱۲۸۵ھ) کو مولانا ثناء اللہ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ایک ان کے بڑے بھائی تھے جن کا نام ابراہیم تھا۔ مولانا سات برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ کچھ عرصے بعد تایا بھی سفر آخرت اختیار کر گئے۔ بڑے بھائی ابراہیم رفوگری کا کام کرتے تھے' چھوٹے بھائی کو بھی انھوں نے یہ کام سکھایا۔ اب یہ گھرانا تین افراد پر مشتمل تھا' دو بھائی اور ایک والدہ۔ مولانا ثناء اللہ چودھویں سال کو پہنچے تو والدہ بھی عالم جاودانی کو

رخصت ہو گئیں۔

والدہ کی وفات کے ساتھ ہی یعنی عمر کے چودھویں سال ان کے دل میں حصول علم کے شوق نے کروٹ لی۔ اس وقت امرتسر میں حضرت مولانا احمد اللہ مرحوم کا سلسلہ درس جاری تھا، جن کا شمار امرتسر کے رؤسا میں ہوتا تھا اور وہ "مولانا احمد اللہ رئیس امرتسر" کے نام سے معروف تھے۔ مولانا ثناء اللہ ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ رفوگری کا کام بھی کرتے رہے۔ مولانا احمد اللہ سے انھوں نے کتب درسیہ میں سے علم نحو کی شرح جامی اور علم منطق کی قطبی تک کتابیں پڑھیں۔

اس عہد میں ضلع گوجرانوالہ کے شہر وزیر آباد کو صوبہ پنجاب میں علم حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، وہاں استاد پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کا ہنگامہ تدریس جاری تھا۔ حضرت حافظ صاحب بصارت سے محروم تھے، مگر ان کی قوت بصیرت انتہائی تیز تھی۔ وہ بہت بڑے عالم حدیث اور فن رجال کے ماہر تھے۔ متحدہ پنجاب میں جن علمائے کرام کی مساعی جمیلہ سے علم حدیث کی روشنی پھیلی اور قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صدائیں فضائے بسیط میں گونجیں، ان میں حضرت حافظ عبدالمنان صاحب کا اسم گرامی خاص طور سے لائق تذکرہ ہے۔

ان کا حلقہ درس بہت وسیع تھا۔ جن ممتاز و نامور علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا اور آگے چل کر درس و تدریس کی مسندیں آراستہ کیں اور علم و فضل کے مختلف میدانوں میں شہرت حاصل کی، ان خوش بخت حضرات میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کا اسم گرامی بالخصوص لائق تذکرہ ہے۔ وہ امرتسر میں مروجہ علوم و فنون کی کچھ کتابیں پڑھ چکے تو وزیر آباد جا کر حضرت حافظ عبدالمنان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے علم حدیث اور دیگر کتب درسیہ کی تحصیل کی اور ۱۸۸۹ء (۱۳۰۶ھ) میں سند فراغت سے بہرہ یاب ہوئے۔ اس وقت وہ اکیس بائیس برس کے جوان رعنا تھے۔

یہ وہ دور تھا جب دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین رحمتہ اللہ علیہ کی مشعل علم فروزاں تھی۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمت حدیث میں گزرا اور لاتعداد اصحاب کمال نے ان سے کسب فیض کیا۔ مولانا ثناء اللہ بھی ان کی خدمت اقدس میں گئے اور ان کے آستانہ فضیلت میں دوزانو ہو کر بیٹھے۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے حاصل کردہ

سند ان کی خدمت میں پیش کی اور پھر ان سے شرف اجازہ کی سعادت حاصل کی۔ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو انھیں حضرت میاں صاحب کی بارگاہ فضل سے عطا ہوا۔

میاں صاحب سے سند و اجازۂ حدیث سے سعادت اندوز ہونے کے بعد عازم سہارن پور ہوئے اور مدرسہ مظاہر العلوم میں داخلہ لیا۔ لیکن سہارن پور میں ان کا قیام بہت مختصر رہا۔ ان کے اپنے الفاظ کے مطابق وہاں ''چند روز قیام'' کیا۔

سہارن پور سے دیوبند کے لیے شد رحال فرمایا۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند کی مسند تدریس پر شیخ الہند مولانا محمود حسن فائز تھے۔ مولانا ثناء اللہ باقاعدہ ان کے حلقہ شاگردی میں شامل ہوئے اور ان سے منقولات و معقولات سے متعلق کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ کتب معقولات میں قاضی مبارک' میر زاہد' امور عامہ' صدرا اور شمس بازغہ وغیرہ پڑھیں اور منقولات میں ہدایہ' توضیح و تلویح' مسلم الثبوت وغیرہ کتابوں کا درس لیا۔ ریاضی میں شرح چغمینی اور بعض دیگر کتابوں کی تکمیل فرمائی۔ دورۂ حدیث میں بھی شرکت کی۔ یہاں انھوں نے حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور دارالعلوم دیوبند کے درس حدیث میں فرق و امتیاز کی نوعیت کو سمجھا اور درس و تدریس کے یہ دونوں مرکز جن خطوط پر چل رہے تھے' اس سے خوب استفادہ کیا۔ دیوبند کی سند فراغ کو وہ اپنے لیے باعث افتخار قرار دیتے تھے۔

دیوبند سے فراغت کے بعد کان پور کے لیے رخت سفر باندھا اور وہاں کی معروف درس گاہ مدرسہ فیض عام میں داخل ہوئے۔ ان دنوں اس مدرسے کی مسند تدریس پر مولانا احمد حسن مرحوم متمکن تھے اور حلقہ طلبا میں ان کے اسلوب درس کی بڑی شہرت تھی۔ مولانا ثناء اللہ کو چوں کہ منقول و معقول دونوں اصناف علم سے شغف تھا اور مدرسہ فیض عام میں اس کا بہت اچھا انتظام تھا' لہٰذا انھوں نے اس مدرسے میں داخل ہونا اور اس کے اساتذہ سے استفادہ کرنا ضروری سمجھا۔

مدرسہ فیض عام میں انھوں نے دوبارہ وہی کتابیں پڑھیں جو پہلے پڑھ چکے تھے۔ مولانا احمد حسن مرحوم کو اس زمانے میں بقول مولانا ثناء اللہ صاحب کے ''حدیث پڑھانے کا تازہ تازہ شوق پیدا ہوا تھا'' اور وہ ''ان کے درس حدیث میں شریک ہوئے''۔ اس مدرسے کی طرف سے شعبان ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) میں آٹھ طلبا کو دستار فضیلت اور سند تکمیل دی گئی' ان میں ایک ہمارے ممدوح مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سال مدرسہ فیض عام کان پور میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا تھا، جس میں برصغیر کے مشہور علمائے عظام شریک ہوئے تھے۔ اسی جلسے میں ندوۃ العلما کا قیام عمل میں آیا تھا اور اسی جلسہ عام میں مولانا ثناء اللہ صاحب کو دستار فضیلت اور سند فراغت عطا کی گئی تھی۔

مولانا ممدوح نے خود بھی اپنی ابتدائی زندگی کے مختصر حالات قلم بند کیے ہیں، جن میں انھوں نے حصول علم کے لیے اپنی سعی و کوشش کا بھی تذکرہ کیا ہے اور جن اساتذہ سے ان کو حصول درس حدیث کے مواقع میسر آئے، ان کا بھی ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان اساتذۂ گرامی قدر کے تدریس حدیث کے اسلوب میں نمایاں فرق تھا۔ لیکن فرق کی نوعیت کیا تھی؟ اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ اس سلسلے میں ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

> "پنجاب میں حافظ عبدالمنان صاحب مرحوم میرے شیخ الحدیث تھے، دیوبند میں مولانا محمود حسن صاحب اور کان پور میں مولانا احمد حسن صاحب رحمتہ اللہ علیہم اجمعین استاذ العلوم والفنون میرے شیخ الحدیث تھے۔ اس لیے میں نے حدیث کے تینوں استادوں سے جو طرز تعلیم سیکھا وہ بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے، جس کے ذکر کا یہ موقع نہیں"۔



۱۸۹۲ء (۱۳۱۰ھ) مولانا ثناء اللہ صاحب فارغ التحصیل ہوئے اور واپس اپنے وطن امرتسر تشریف لے آئے۔ ان کے پہلے استاد مولانا احمد اللہ صاحب (رئیس امرتسر) تھے، جن کے مدرسے کا نام تائید الاسلام تھا۔ وہ اپنے اس تلمیذ رشید کی علمی قابلیت سے آگاہ اور ان کے مطالعے کی وسعتوں سے بہت خوش تھے۔ انھوں نے ان کو اپنے مدرسہ تائید الاسلام کی مسند تدریس پر متمکن کر دیا۔ اس مدرسے میں وہ کتب درس نظامیہ کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دی، بعد ازاں اس سے دست کش ہو گئے۔

۱۸۹۸ء (۱۳۱۵ء) میں انھیں مالیر کوٹلہ کے مدرسہ اسلامیہ کی صدر مدرسی پیش کی گئی۔ کچھ مدت وہاں فرائض معلّمی سر انجام دیے، اس کے بعد اسے بھی چھوڑ دیا اور واپس امرتسر آ گئے۔

مالیر کوٹلہ مشرقی پنجاب کا ایک مشہور شہر ہے۔ اس زمانے میں اسے پنجاب کی ایک مسلم ریاست کی حیثیت حاصل تھی۔ آزادی وطن کے بعد اس کی یہ حیثیت ختم ہو گئی۔ اب

وہ ضلع لدھیانہ کا ایک شہر ہے۔ آزادی سے قبل بھی اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی' اب بھی وہاں مسلمان آباد ہیں اور اکثریت میں ہیں۔ سماجی اور سیاسی اعتبار سے مالیر کوٹلہ کے مسلمانوں کو مشرقی پنجاب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

مولانا کا زمانہ مناظروں اور مباحثوں کا زمانہ تھا۔ مختلف مذاہب کے اصحاب علم اپنے اپنے مذہب کی صداقت ثابت کرنے کے لیے ایک دوسرے کو مناظرے کا چیلنج دیتے رہتے تھے۔ مناظروں میں حریف کے علم و فضل کا بہت بڑا معیار سرکاری سند کو سمجھا جاتا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی عالم کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا اور اس سے علمی میدان میں آگے بڑھنے کی نئی راہیں کھلتی تھیں۔ علوم شرقیہ میں مولوی فاضل کا امتحان خاص اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ مولانا ثناء اللہ صاحب نے ۱۹۰۲ء (۱۳۲۰ھ) میں مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے اس کی سند حاصل کی۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا' تحصیل علم کے بعد مولانا کو منصب تدریس پر متمکن ہونے کے مواقع میسر آئے' مگر انھوں نے عملی طور پر اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مختلف اطراف سے اسلام پر شدید حملے ہو رہے تھے۔ عیسائی پادریوں اور آریہ سماجی پرچارکوں نے ایک خاص منصوبے کے تحت منظم طریقے سے اسلام اور اسلامی تہذیب و تعلیمات پر یلغار کر دی تھی۔ علاوہ ازیں فتنہ مرزائیت بھی ابھر آیا تھا اور مرزا غلام احمد قادیانی دعوائے نبوت کر کے اور بعض لوگ اس کے دعوے کو صحیح قرار دے کر مسلمانوں کے بالمقابل آ کھڑے ہوئے تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر مولانا ثناء اللہ کے نزدیک یہ وقت مسجد میں بیٹھ کر خدمت دین سرانجام دینے کا نہ تھا بلکہ میدان عمل میں اتر کر براہ راست ان غلط طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کا تھا۔ اس وقت صوبہ پنجاب میں مولانا محمد حسین بٹالوی اس محاذ کے علم بردار تھے اور تنہا مخالفین اسلام کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے تھے۔ مولانا ثناء اللہ مرحوم نے اسی مورچے میں آنے کو ترجیح دی۔ وہ خود فرماتے ہیں:

"کان پور سے فارغ ہوتے ہی میں اپنے وطن پنجاب پہنچا اور مدرسہ تائید الاسلام امرتسر میں کتب درس نظامیہ کی تعلیم پر مامور ہوا۔ طبیعت میں تجسس زیادہ تھا' اس لیے ادھر ادھر سے ماحول کی مذہبی حالت دریافت کرنے میں مشغول رہتا۔ میں نے دیکھا کہ اسلام کے سخت بلکہ سخت ترین مخالف عیسائی اور آریہ دو گروہ

ہیں-ان ہی دنوں قریب میں قادیانی تحریک پیدا ہو چکی تھی' جس کا شہرہ ملک میں پھیل چکا تھا-"

"مسلمانوں کی طرف سے اس دفاع کے علم بردار مولانا ابو سعید محمد حسین بٹالوی مرحوم تھے- میری طبیعت طالب علمی ہی کے زمانے میں مناظرات کی طرف بہت زیادہ راغب تھی' اس لیے تدریس کے علاوہ میں ان تینوں گروہوں (عیسائی' آریہ' قادیانیوں) کے علم کلام اور کتب مذہبی کی طرف متوجہ رہا- بفضلہٖ تعالیٰ میں نے اس میں کافی واقفیت حاصل کر لی- ہاں! اس میں شک نہیں کہ ان تینوں مخاطبوں سے قادیانی مخاطب کا نمبر اول رہا- شاید اس لیے کہ قدرت کو منظور تھا کہ مولانا بٹالوی مرحوم کے بعد یہ خدمت میرے سپرد ہو گی' جس کی جانب مولانا مرحوم کو علم ہوا ہو تو شاید یہ شعر پڑھتے ہوں گے ؎

آ کے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
رہی خالی نہ کوئی دشت میں جا میرے بعد

"اس شغل میں میں نے چند علمائے سلف کی تصنیفات سے خاص فوائد حاصل کیے' حدیث شریف میں قاضی شوکانی' حافظ ابن حجر اور ابن قیم وغیرہم کی تصانیف سے' علم کلام میں امام بیہقی' امام غزالی' حافظ ابن حزم' علامہ عبدالکریم شہرستانی' حافظ ابن تیمیہ' شاہ ولی اللہ اور امام رازی وغیرہم رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کی تصانیف سے فائدہ اٹھایا"-

یہ بھی عجیب بات ہے کہ آغاز عمر میں وہ انسانوں کے لباس کی رفوگری کرتے تھے' اب جوانی کو پہنچے اور حصول علم سے فارغ ہوئے تو پیرہن اسلام کی رفوگری میں مشغول ہو گئے- جوں ہی کسی نے اسلام کی خلعت پر افتخار میں سوراخ ڈالنے کی کوشش کی' اس کی طرف دوڑے اور جہاں لباس اسلام کے کسی گوشے میں چھوٹا بڑا سوراخ دیکھا' دلائل و براہین سے فوراً اس کو رفو کر دیا-

انھوں نے تصنیف و تالیف کی طرف بھی عنان توجہ مبذول فرمائی کہ تبلیغ دین کا یہ نہایت پائیدار اور موثر ترین ذریعہ ہے اور اس سے اپنی بات بہتر طریقے سے لوگوں تک پہنچائی جا سکتی ہے' چنانچہ متعدد عنوانات کے تحت انھوں نے چھوٹی بڑی ایک سو پچیس سے زائد کتابیں تصنیف کیں' جن کے ناشر وہ خود ہی تھے- اختصار کے ساتھ ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے-

سب سے پہلے تفسیر قرآن مجید۔

قرآن مجید اور اس کی تفسیر سے ان کو خاص شغف اور قلبی لگاؤ تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے اردو اور عربی میں جو خدمات سر انجام دیں وہ لائق تحسین ہیں۔

## (۱) تفسیر ثنائی:

یہ تفسیر اردو زبان میں ہے اور آٹھ جلدوں پر محیط ہے۔ اس کا اسلوب یہ ہے کہ پہلے آیت کا ترجمہ ہے اور اس کے بعد جچے تلے الفاظ میں اس کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

تفسیر ثنائی اب مکتبہ قدوسیہ غزنی سٹریٹ' اردو بازار لاہور کی طرف سے تین جلدوں میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔

مولانا مرحوم کے عہد میں ہندوؤں کے مختلف فرقے آریہ سماجی' سناتن دھرمی' ست دھرمی اور دیو سماجی وغیرہ تھے۔ علاوہ ازیں عیسائی' یہودی' پارسی' سکھ' نیچری' بہائی' مرزائی وغیرہ سب مذاہب و مسالک کے لوگ موجود تھے اور ان میں سے بعض اچھی خاصی تعداد میں تھے' ان کے تبلیغی مراکز بھی مختلف مقامات میں قائم تھے اور اکثر مسائل میں مولانا سے ان کے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ تفسیر ثنائی میں فاضل مصنف نے ان سب کے افکار و خیالات کو پیش نگاہ رکھا ہے اور قرآن مجید کے جن مقامات پر ان میں سے کسی نے اعتراضات کیے ہیں' ان کا جواب دیا اور ان کے موقف کو ہدف تنقید ٹھہرایا ہے۔ شیعہ اور بریلوی حضرات سے بھی ان کی بحثیں رہتی تھیں' فقہی مسائل میں ان کے رجحانات و تصورات کو بھی سامنے رکھا ہے۔ سر سید احمد خاں مرحوم کے افکار بھی پیش نگاہ تھے' ان پر بھی نقد و جرح کی ہے۔ لیکن اس ضمن میں ان کا انداز کلام نہایت عمدہ اور مالللہ موثر ہے۔ حریف کے مقابلے میں تحمل و بردباری ان کا وہ خاصہ تھا جو ہمیشہ ان کے قلم اور زبان کے ہم رکاب رہا اور جس کا ثبوت تفسیر ثنائی کی ہر بحث میں موجود ہے۔

اپنی نوعیت کی یہ واحد تفسیر ہے جس میں قرآن مجید کی روشنی میں اس دور کے ان تمام زاویہ ہائے فکر کا جائزہ لیا گیا ہے جن کی رو سے وہ اسلام' پیغمبر اسلام اور احکام اسلام کو نشانہ طعن اور ہدف تعریض ٹھہراتے تھے۔

یہ تفسیر میاں عبدالمجید مالواڈہ مرحوم نے ایک جلد میں اس انداز سے شائع کر دی ہے کہ اس میں قرآن مجید کا متن بھی خاص ترتیب کے ساتھ آگیا ہے اور مکمل تفسیری مواد

کا بھی اس نے احاطہ کر لیا ہے- اب یہ تفسیر مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے نہایت عمدگی سے اشاعت پذیر ہوئی ہے-

یہ بہت بڑی خدمت قرآن ہے جس کی انجام دہی کی اللہ تعالیٰ نے میاں عبدالمجید مرحوم اور مکتبہ سلفیہ کو توفیق عطا فرمائی- قرآن کا نازل کرنے والا یقیناً انھیں اس کا اجر عطا فرمائے گا- اس تفسیر کے مطالعے سے اس دور کے تمام مذاہب کی تاریخ نظر و بصر کے احاطے میں آجاتی ہے اور مخالفین اسلام جس نوعیت کے اعتراضات کرتے ہیں اس کا اندازہ ہو جاتا ہے- اس میں ان سطور کے راقم عاجز نے مولانا کے مختصر حالات تحریر کیے ہیں-

ہندوؤں کے فرقوں اور ان کے مذہبی تصورات سے پاکستان کی نئی پود میرے خیال میں واقف نہیں ہوگی اور اگر ہوگی تو بہت کم- تفسیر ثنائی کے مطالعے سے ان کے بہت سے افکار معلوم ہو جاتے ہیں اور نوعیت اعتراض اور طریق جواب کا پتا چل جاتا ہے- عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے بعض مسلمانوں نے بھی اسلام پر اسی قسم کے اعتراضات وارد کرنا اپنے لیے ضروری قرار دے رکھا ہے-

## (۲) تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن :

یہ تفسیر عربی زبان میں ہے اور اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر آیت کے ترجمہ و تشریح کے لیے دوسری آیات سے مدد لی گئی ہے' بالفاظ دیگر قرآن کی تفسیر' قرآن ہی سے کی گئی ہے- مشہور علمائے کرام کی اکثریت نے اس تفسیر کو بنظر تحسین دیکھا اور مولانا کے حسن کلام اور اسلوب بیان کو سراہا ہے-

یہ تفسیر بھی میاں عبدالمجید مرحوم چھاپنا چاہتے تھے' لیکن انھیں اللہ کی طرف سے بلاوا آگیا اور وہ یہ خدمت انجام نہ دے سکے-

## (۳) بیان الفرقان علیٰ علم البیان:

یہ تفسیر نامکمل رہی- صرف سورہ بقرہ تک محدود ہے- مولانا مرحوم فصاحت و بلاغت کے نقطہ نظر سے قرآن کی عظمت ثابت کرنا چاہتے تھے' اس لیے یہ تفسیر فن بیان و معانی کے مطابق لکھنا شروع کی تھی- افسوس ہے یہ دلآویز سلسلہ سورہ بقرہ سے آگے نہ بڑھ سکا-

## (۴) تفسیر بالرائے:

اس کتاب میں مولانا نے تفسیر بالرائے پر اصولی اور فنی نقطہ نگاہ سے بحث کی ہے اور اس کی روشنی میں بعض تفاسیر کی ان غلطیوں کی نشان دہی فرمائی ہے جو اس موضوع سے متعلق کی گئی ہیں۔ افسوس ہے یہ سلسلہ بھی تکمیل کی منزل کو نہ پہنچ سکا' سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ تک ہی کام ہو سکا۔

یہاں یہ یاد رہے کہ تفسیر ثنائی جلد اول کے بعد مولانا امرتسری نے سب سے پہلی کتاب ''اسلامی تاریخ'' لکھی تھی جسے ان کی تمام تصنیفات میں اولین حیثیت حاصل ہے۔ مندرجات و مشمولات کے اعتبار سے یہ کتاب جس قدر پسند کی گئی اور اسے جو قبولیت حاصل ہوئی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ والیہ بھوپال نے اس کے ہزاروں نسخے خرید کر ملک کے مختلف مدارس میں بھجوائے جو علما و طلبا میں تقسیم کیے گئے۔

اب حدیث کے سلسلے میں مولانا کی خدمات کی طرف آیے۔

رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ' اس کی شروح' علم رجال' درجات حدیث' اصول حدیث میں انھیں جو دسترس حاصل تھی' اس کا ثبوت ان کی تصانیف سے ملتا ہے' وہ اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ حدیث کے ہر پہلو اور ہر گوشے میں وہ مہارت رکھتے تھے۔ بات بات میں اس کے حوالے دیتے اور ہر مسئلے میں فرمان رسول ﷺ کو مقدم گردانتے تھے۔

منکرین حدیث سے ان کی بحثیں رہتی تھیں اور اخبار ''اہل حدیث'' میں اس موضوع پر ان کے مضامین بکثرت شائع ہوئے ---- ان مضامین کا طریق استدلال' زور بیان اور طرز تحریر ظاہر کرتا ہے کہ علم حدیث اور اس کے متعلقات پر وہ عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ اس زمانے کے مشہور منکر حدیث عبداللہ چکڑالوی نے حدیث پر جو اعتراضات کیے اس کے جواب میں انھوں نے دلیل الفرقان کتاب لکھی۔

فقہ میں بھی انھیں درک حاصل تھا اور مختلف فقہی مسائل کے جواب میں ان کے فتوے ''اہل حدیث'' اخبار میں شائع ہوتے رہے۔ یہ فتوے پہلی مرتبہ ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۴ء) میں ہندوستان کے معروف عالم دین مولانا محمد داؤد راز مرحوم کی سعی و کوشش سے مکتبہ اشاعت دین مومن پورہ بمبئی کی طرف سے بڑے سائز کی دو جلدوں میں ''فتاویٰ ثنائیہ'' کے نام سے چھپے تھے۔ ان کے متعدد اہم فقہی مسائل پر مولانا شرف الدین دہلوی مرحوم نے

تعلیقات و تشریحات لکھی ہیں' جن سے زیر بحث مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے- دوسری مرتبہ علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمۃ اللہ علیہ کے ادارے ادارہ ترجمان السنہ کی طرف سے شائع ہوئے ----- تیسری مرتبہ حال ہی میں "فتاویٰ ثنائیہ" مکتبہ ثنائیہ سرگودھا کی طرف سے شائع کیا گیا ہے-

فتوے کے سلسلے میں مولانا ثناء اللہ صاحب کا نقطہ نظر یہ تھا کہ سائل کے جواب میں تفصیل میں نہیں جانا چاہیے- سوال کرنے والا مفتی سے صرف ایک مسئلہ پوچھتا ہے' اس موضوع پر اس سے مضمون نہیں لکھوانا چاہتا- ہاں اگر وہ دلیل کا مطالبہ کرتا ہے تو دلیل لکھ دیجیے' ورنہ اس کی ضرورت نہیں- چنانچہ فتاویٰ ثنائیہ کا اسلوب یہی ہے-

فتوے کے بارے میں علمائے غزنویہ اس بات کے قائل ہیں کہ استفتا کے جواب میں پہلے قرآن کی آیات سے اور پھر احادیث سے استدلال کیا جائے- لیکن اس کی تائید کے لیے کسی امام فقہ کا قول ضرور پیش کرنا چاہیے تاکہ فتویٰ زیادہ موثق و مالل ہو جائے- جو لوگ ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام فقہ سے تعلق رکھتے ہیں' اس سے ان کی بھی تسلی ہو جاتی ہے- حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی مرحومؒ کا "فتاویٰ نذیریہ" تین جلدوں میں چھپ چکا ہے' ان کا انداز اسی قسم کا ہے- فتوے کی زبان' اسلوب بیان اور طرز استدلال عام مضمون سے بہت حد تک مختلف ہوتا ہے-

اس دور کے غیر مسلم اہل علم سے مولانا کے ذاتی تعلقات بھی تھے اور ان سے مناظروں اور مباحثوں کے ہنگامے بھی جاری رہتے تھے- جو کتابیں ان لوگوں نے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں لکھیں' مولانا نے ان کے جواب تصنیفات کی شکل میں دیے' لیکن نہایت متانت و تہذیب کے ساتھ -

ان تصنیفات میں سے ایک کتاب "مقدس رسول ﷺ" ہے جو مولانا نے "رنگیلا رسول" کے جواب میں لکھی- رنگیلا رسول جیسا کہ نام سے ظاہر ہے انتہائی دل آزار اور مسلمانوں کے لیے بہ درجہ غایت تکلیف دہ کتاب تھی- اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں کئی باتیں بیان کی جاتی ہیں' جن میں ایک یہ ہے کہ یہ کتاب دراصل آریہ سماجی رائٹر پنڈت چموپتی ایم- اے (پروفیسر ڈی' اے' وی کالج لاہور- اب یہ کالج "اسلامیہ کالج سول لائن" کے نام سے موسوم ہے) کی تصنیف تھی جو لاہور کے مہاشہ راجپال نے اپنی تصنیف ظاہر کر

کے شائع کی تھی۔

اسی طرح سوامی دیانند سرسوتی کی مشہور کتاب ”ستیارتھ پرکاش“ کے چودھویں باب کے جواب میں مولانا نے ”حق پرکاش“ لکھی، جو بڑی مقبول و مشہور ہوئی۔

ان کی یہ وہ کتابیں ہیں جو دلائل کی مضبوط گرفت کے ساتھ ساتھ پتا دیتی ہیں کہ ان کے مصنف اسلامی تہذیب و ثقافت کے قالب میں ڈھلے ہوئے، بلندیٔ اخلاق کے حامل، تحقیق و کاوش میں منفرد اور وسعت معلومات کا صاف ستھرا نمونہ ہیں۔ یہ کتابیں اپنے موضوع میں بے مثال اہمیت کی حامل ہیں۔ مقدس رسول مکتبہ قدوسیہ کے زیر اہتمام بہترین انداز میں شائع ہو رہی ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ ”ترک اسلام“ کے جواب میں ترک اسلام، اصول آریہ، حدوث وید، سوامی دیانند کا علم و عقل، بحث تناسخ، حضرت محمد رشی، شادی بیوگان اور نیوگ، ہندوستان کے دو ریفارمر، الہامی کتب، نکاح آریہ وغیرہ قابل ذکر ہیں، جن میں بیٹھے مگر بھرپور علمی انداز میں آریہ سماج اور ہندوؤں کے طرز فکر اور خلاف عقل و خلاف اسلام مذہبی رجحانات کو ہدف نقد و جرح ٹھہرایا گیا ہے۔

مولانا کے علمی و مذہبی حریفوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ سرفہرست کون تھا۔ اگرچہ وہ خود مرزائیت کو ”نمبر اول“ قرار دیتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور دین حق کی مخالفت کرنے والا ہر گروہ اور ہر فرد ان کا حریف تھا۔

ان کا دور برصغیر میں انگریزی حکومت کا دور تھا، انگریزی حکومت نے اپنی سیاسی اور مذہبی مصلحتوں کی بنا پر جہاں دیگر جماعتوں کو اپنے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت اور دوسروں کی مخالفت کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی، وہاں عیسائیوں کی باگیں بھی ڈھیلی چھوڑ دی تھیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ انھیں خاص مراعات حاصل تھیں تاکہ وہ دوسرے مذاہب کے حاملین کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنے دائرۂ اثر میں لانے کی جدوجہد کریں۔

ہندوستان میں اس وقت دو قسم کے عیسائی تھے، ایک وہ جو برطانیہ یا یورپ کے بعض ملکوں سے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے یہاں آئے تھے یا لائے گئے تھے، اور جنھیں اس ملک میں پادری کہا جاتا تھا۔ دوسرے وہ جو اسی ملک سے تعلق رکھتے تھے، ان میں بھی پادری موجود تھے۔ پہلی قسم کے عیسائی تو اپنے آپ کو حکمران گروہ میں شمار کرتے ہی تھے، لیکن دیسی عیسائی

بھی جو دراصل اسی ملک کے رہنے والے تھے خود کو "رائل فیملی" سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ دونوں قسم کے عیسائی بحث و مناظرے کے ساتھ ساتھ بسا اوقات کچھ لالچ دے کر بھی لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے اور دائرۂ عیسائیت میں شامل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ بعض دیسی عیسائیوں کے تو اس زمانے میں کئی لطیفے بیان کیے جاتے تھے ----- انگریزی حکومت کے خلاف نعرے لگاتا ہوا ایک جلوس جا رہا تھا' چند عیسائی جلوس دیکھ رہے تھے۔ ایک شخص نے عیسائیوں سے پوچھا۔

یہ جلوس کیوں نکالا جا رہا ہے؟

جواب ملا: ایہہ لوک ساڈے کولوں اجادی منگدے نیں۔ (یعنی یہ لوگ ہم سے آزادی مانگتے ہیں)

ایسا بھی ہوتا کہ سڑکوں پر جھاڑو دیتے ہوئے کسی عیسائی سے راستہ پوچھا جاتا تو جواب دیتا: "سدھا روڈے روڈ ٹریا جا"۔

مولانا ثناء اللہ صاحب ان کے اسلام پر مسلسل حملوں کی جسارت کب برداشت کر سکتے تھے' انھوں نے عیسائی پادریوں اور مبلغوں سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کیا اور اپنی علمی طاقت میدان عمل میں جھونک دی۔ ان سے مناظرے کیے۔ اپنے اخبار "اہل حدیث" میں ان کے خلاف مضامین لکھے اور مختلف عنوانات کے تحت اسلام کی حمایت اور عیسائیت کے رد میں کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک کتاب "اسلام اور مسیحیت" لکھی۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب "توحید۔ تثلیث اور راہ نجات" تصنیف کی۔ پھر تقابل ثلاثہ وغیرہ کئی کتابیں سپرد قلم فرمائیں۔

ان تمام کتابوں کو ان کی دوسری تصانیف کی طرح پذیرائی حاصل ہوئی اور اس موضوع سے متعلق اہل علم کے حلقوں میں ان کو بلند پایہ کتابیں قرار دیا گیا۔

مرزائیوں سے مولانا کے سب سے زیادہ مناظرے اور مباحثے ہوئے' یہاں تک کہ معاملہ اس دعا تک پہنچا جس کے نتیجے میں جھوٹا سچے کی زندگی میں مر گیا۔

احقاق حق اور ابطال باطل میں وہ نہایت جری تھے اور اس میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ مرزائیوں سے ان کی شدید علمی جنگ ہوئی۔ خود مرزا صاحب سے پنجہ آزمائی کی نوبت آئی اور چھوٹے بڑے دیگر مرزائی مناظروں

سے بھی محاذ آرائی کے بہت سے مواقع ملے۔ کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ جب براہ راست مرزا غلام احمد سے مقابلے ہو چکے ہیں تو چھوٹے درجے کے مرزائی مبلغوں اور مناظروں سے گفتگو کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان کا اصل مدعا یہ تھا کہ اپنی بات لوگوں کے کانوں تک پہنچانی چاہیے اگرچہ کسی ذریعے سے پہنچائی جائے۔

مرزائیت کی تردید میں انھوں نے جو کتابیں تحریر کیں ان میں سے چند کتابیں یہ ہیں: فیصلہ مرزا' تاریخ مرزا' الہامات مرزا' نکاح مرزا' نکات مرزا' عجائبات مرزا' علم کلام مرزا' شہادات مرزا' چیستان مرزا' محمد قادیانی' بہاء اللہ اور مرزا' فاتح قادیان' فتح ربانی اور مباحثہ قادیانی' شاہ انگلستان اور مرزائے قادیان' مکالمہ احمدیہ وغیرہ۔

حضرات احناف سے بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کی بحثیں رہتی تھیں۔ احناف کے بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے اہل علم سے تو اکثر سلسلہ بحث جاری رہتا تھا۔ احناف سے بعض مسائل میں اختلاف اور اپنے مسلک کی حمایت میں انھوں نے کئی کتابیں لکھیں' جن میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

فقہ اور فقیہ' علم الفقہ' تنقید تقلید' تقلید شخصی و سلفی' اجتہاد و تقلید' معقولات حنفیہ' حدیث نبوی اور تقلید شخصی' اہل حدیث کا مذہب' آمین' رفع یدین مع ضمیمہ فاتحہ خلف الامام' فتوحات اہل حدیث' شمع توحید' نور توحید وغیرہ۔

ایک کتاب انھوں نے "اصول الفقہ" کے نام سے تصنیف کی۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور فقہ کی اصطلاحات و تعریفات کے موضوع پر مشتمل ہے۔

سطور بالا میں تفسیر قرآن' فتاویٰ' رد عیسائیت' رد آریہ اور رد قادیانیت وغیرہ کے سلسلے میں ان کی جن تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے' ان کے علاوہ یہ کتابیں بھی ان کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں: تعلیم القرآن' قرآن اور دیگر کتب' قرآنی قاعدہ ثنائیہ' خصائل النبی ﷺ' اتباع رسول ﷺ' خلافت رسالت' خلافت محمدیہ' حیات مسنونہ' کلمہ طیبہ' السلام علیکم' ہدایت الزوجین' شریعت اور طریقت' رسوم اسلامیہ' اسلام اور برٹش لاء' الفوز العظیم' ادب المفرد' التعریفات النحویہ' ثنائی پاکٹ بک وغیرہ۔

اب یہ کتابیں یوں سمجھیے کہ نایاب ہیں۔ ان چھوٹی بڑی کم و بیش سوا سو تصنیفات میں سے تقریباً ایک سو کتابیں گوجرانوالہ میں ہمارے دوست جناب ضیاء اللہ کھوکھر کی لائبریری

میں موجود ہیں اور میرے خیال میں پاکستان میں صرف انھی کے پاس مولانا کی اتنی کتابیں موجود ہیں اور کسی کے پاس نہیں ہیں۔

اب ان کی صحافت کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں انھوں نے کیا اقدامات کیے۔

مولانا مرحوم نے مختلف اوقات میں امرتسر سے تین اخبار جاری کیے۔ سب سے پہلے ۱۳ نومبر ۱۹۰۳ء کو ہفت روزہ "اہل حدیث" جاری کیا جو ہر جمعے کو باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کو پورے ہندوستان کے مذہبی و علمی اور سیاسی و سماجی حلقوں میں اہمیت حاصل تھی۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اسے دلچسپی سے پڑھا جاتا اور بے تابی سے اس کا انتظار کیا جاتا تھا۔ عیسائی مشن' آریہ مشن' قادیانی مشن' شیعہ مشن' بریلوی مشن' اس کے وہ عنوانات تھے جن کے تحت ہر اشاعت میں ان مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کے چند مسائل پر بحث کی جاتی تھی۔ ہفتے کی اہم خبریں "ملکی مطلع" کے عنوان سے شائع کی جاتی تھیں۔ ہلکا پھلکا تبصرہ یا تجزیہ بھی کیا جاتا تھا۔

اس کا اداریہ کسی علمی یا خاص اہمیت کے سیاسی مسئلے سے متعلق ہوتا تھا۔ اداریہ مولانا خود لکھتے تھے اور زیر بحث موضوع کے بارے میں اختصار مگر جامعیت کی ساتھ اظہار رائے کرتے تھے۔

یہ اخبار متنوع مضامین کا دلچسپ مجموعہ تھا اور اس میں ان تمام مذاہب کے بارے میں جو ہندوستان میں پائے جاتے تھے' ایک خاص انداز میں لکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس شوق سے مسلمان اس کا مطالعہ کرتے تھے' اسی بے تابی سے غیر مسلم اس کے منتظر رہتے تھے۔

اخبار "اہل حدیث" پورے چوالیس برس اشاعت اسلام میں مصروف رہا' اس کا آخری شمارہ انتہائی نامساعد اور پر خطر حالات میں جمعے کے روز یکم اگست ۱۹۴۷ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد یہ اخبار ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ یہ آخری شمارہ گوجرانوالہ میں جناب ضیاء اللہ کھوکھر صاحب کی لائبریری میں موجود ہے۔

تحریر و تقریر میں مولانا ہمیشہ محتاط رہے' سخت سے سخت مواقع پر بھی وہ طیش میں نہیں آتے تھے' مگر اس کے باوجود ان کے اخبار میں بعض ایسی چیزیں چھپ گئیں' جن کی بنا

پر حکومت برطانیہ نے اخبار سے ضمانت طلب کرلی' اس وجہ سے کچھ عرصے کے لیے اخبار کی اشاعت معرض التوا میں رہی اور انھوں نے "اہل حدیث" کی بجائے "گلدستہ ثنائی" کے نام سے نیا اخبار شائع کرنا شروع کر دیا۔ بعد ازاں "اہل حدیث" کی اشاعت کا سلسلہ پہلے کی طرح پھر باقاعدہ ہو گیا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور ان کے اخبار "اہل حدیث" پر حکومت برطانیہ کے عتاب کی ایک مستقل داستان ہے جو طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ میری معلومات کے مطابق "اہل حدیث" کی اشاعت دو مرتبہ جزوی طور پر تعطل کا شکار ہوئی۔ لیکن مولانا نے قارئین کو اپنی نگارشات سے محروم نہیں ہونے دیا اور "گلدستہ ثنائی" کے ذریعے اس کی کمی پوری کر دی۔ پہلی مرتبہ فروری ۱۹۱۹ء میں "اہل حدیث" کی اشاعت متاثر ہوئی اور جلد ۱۶ کے دو شمارے (۱۴-۱۵) برطانوی حکومت نے شائع نہیں ہونے دیے۔ لیکن مولانا کمال فراست و جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے "گلدستہ ثنائی" میدان صحافت میں لے آئے۔ دوسری بار اگست ۱۹۲۳ء میں "اہل حدیث" کی اشاعت میں رکاوٹ پیدا کی گئی اور جلد ۲۰ کے دو شمارے (۴۱-۴۲) منظر عام پر نہ آسکے۔ مولانا نے اس موقعے پر بھی "گلدستہ ثنائی" شائع کرنے کا اہتمام کر لیا۔

ایڈیٹر "اہل حدیث" پر حکومت برطانیہ نے چار مرتبہ قابل اعتراض مواد کی اشاعت کا الزام عائد کیا اور ۱۹۱۲ء' ۱۹۱۳ء' ۱۹۲۶ء' اور پھر ۱۹۲۹ء میں وارننگ دی گئی۔ قبل ازیں ۱۹۱۰ء میں بھی وارننگ دی جاچکی تھی' لیکن مولانا کے عزم و استقلال میں کسی قسم کی کمزوری یا کمی نہیں محسوس کی گئی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا ظفر علی خاں نے ۱۹۱۴ء میں انگلستان جا کر انگریزی حکومت کے ان قوانین کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا جو اس نے ہندوستان کے اخبارات سے متعلق نافذ کیے تھے۔ ان قوانین کی زد میں جو اخبار آئے تھے' مولانا ظفر علی خاں نے ان کے ناموں کی ایک فہرست وہاں پیش کی تھی۔ اس فہرست میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کا اخبار "اہل حدیث" بھی شامل تھا۔ (ملاحظہ ہو' عبدالسلام خورشید کی کتاب "صحافت پاکستان وہند میں"۔ صفحہ ۳۹۹)

۱۹۳۱ء میں کشمیر ایجی ٹیشن میں سول نافرمانی کا آغاز ہوا۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی

اس کے مرکزی رہنماؤں میں سے تھے- ان کی سرگرمیوں کی بنا پر انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کر کے ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا تھا- ہتھکڑی لگا کر انھیں جیل سے پیدل عدالت میں لایا جاتا اور پھر اسی طرح واپس جیل میں لے جایا جاتا تھا- اس مقدمے میں ان کو ایک سال قید اور چار سو روپے جرمانے کی سزا دی گئی- سزا کے بعد انھیں لاہور سنٹرل جیل سے ملتان سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا- جیل کی جس کوٹھڑی میں انھیں رکھا گیا تھا' وہ بڑی تنگ و تاریک تھی اور تمام ماحول مضر صحت تھا' ملاقات پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی-

مولانا ثناء اللہ صاحب کو اپنے ذرائع سے اس اذیت ناک صورت حال کا علم ہوا تو انھوں نے "اہل حدیث" اخبار کی ۲۶ فروری ۱۹۳۲ء کی اشاعت میں مولانا غزنوی پر اس ناروا سلوک کے بارے میں صدائے احتجاج بلند کی اور لکھا کہ "ملتان سے اطلاع ملی ہے کہ مولانا داؤد غزنوی کو ایسے وارڈ میں رکھا گیا ہے جہاں تپ دق اور متعدی امراض کے قیدی ہیں- ان کو وہاں سے منتقل کر دینا چاہیے- اگر خدانخواستہ کوئی برا نتیجہ بر آمد ہوا تو حکومت ذمہ دار ہو گی"-

اس خبر کی اشاعت پر مولانا ثناء اللہ صاحب کو انگریزی حکومت کی طرف سے سخت وارننگ دی گئی اور خبر کی تردید اور معافی نامہ شائع کرنے کا حکم دیا گیا- مولانا نے دبے الفاظ میں تردید تو کر دی لیکن معافی نامہ شائع کرنے سے انکار کر دیا' حالاں کہ پریس ایکٹ کے تحت اخبار کی بندش کا خطرہ تھا-

دسمبر ۱۹۱۳ء میں پریس ایکٹ کی دفعہ ۳(۲) کے تحت مولانا کو دو ہزار روپے کی رقم بطور ضمانت جمع کرانے کا حکم دیا گیا- الزام یہ تھا کہ انھوں نے حکومت برطانیہ اور عیسائیوں کے خلاف اخبار میں قابل اعتراض مواد شائع کیا ہے- اس سے اخبار کی اشاعت بہت متاثر ہوئی- چنانچہ مولانا ۱۱ ستمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں لکھتے ہیں: "اخبار اپنی اس سابقہ حالت پر ہنوز نہیں پہنچا' جس پر ضمانت سے پہلے تھا"-

۱۹۳۵ء میں حکومت نے مسلم اخبارات کو تشدد اور انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا- روزنامہ "سیاست" سے ضمانت طلب کی گئی- "احسان" اور "زمیندار" کی ضمانتیں ضبط کر لی گئیں- مولانا نے اخبار "اہل حدیث" میں اس پر سخت احتجاج کیا اور ۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کا شمارہ بطور احتجاج شائع نہیں کیا-

دسمبر ۱۹۳۸ء میں ان کے پریس (ثنائی برقی پریس) سے ایک پنجابی نظم شائع ہوئی تھی، جس کا عنوان تھا۔ "پیغام زندگی" اس نظم کی اشاعت پر حکومت نے پریس ایکٹ کے تحت کارروائی کی اور اسے قابل اعتراض قرار دے کر دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی جو اپریل ۱۹۳۹ء میں حکومت کے خزانے میں جمع کرائی گئی۔

مولانا کا یہ اخبار نام کے اعتبار سے بے شک خالص دینی اور مذہبی و مسلکی اخبار تھا، لیکن اس دور کی سیاسیات کے متعلق بھی اس میں لکھا جاتا تھا اور اس باب میں کئی مرتبہ یہ اخبار انگریزی حکومت کے زیر عتاب آیا۔

اس اخبار کا مکمل فائل (۱۳ نومبر ۱۹۰۳ء تا یکم اگست ۱۹۴۷ء) پاکستان میں کسی کے پاس نہیں ہے۔ البتہ اس کی بہت سی جلدیں میاں عبدالعزیز مالواڈہ (بار ایٹ لا) مرحوم کے صاحب زادہ گرامی میاں عبدالمجید مرحوم کی لائبریری (اسد جان روڈ، لاہور کینٹ) میں موجود ہیں۔ اسی طرح گوجرانوالہ میں ضیاء اللہ کھوکھر اور لاہور میں شیش محل روڈ پر مولانا عطاء اللہ حنیف کی لائبریریوں میں بھی اس کے متعدد فائل موجود ہیں۔ میرا خیال ہے اس کی سب سے زیادہ فائلیں گوجرانوالہ میں ضیاء اللہ کھوکھر کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

مئی ۱۹۰۸ء کو انھوں نے ایک ماہانہ رسالہ "مسلمان" جاری کیا جو ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ مئی ۱۹۱۰ء تک یہ ماہنامہ رہا۔ ۷ جون ۱۹۱۰ء سے ہفت روزہ کر دیا گیا جو ہر منگل کو شائع کیا جاتا تھا۔ اخبار "مسلمان" مخالفین اسلام بالخصوص آریہ سماجیوں کی خلافِ اسلام تحریروں کا جواب دینے کی غرض سے جاری کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں یہ اخبار بند ہو گیا۔ ماہنامہ "مسلمان" اور ہفت روزہ "مسلمان" کے چند شمارے ضیاء اللہ کھوکھر کی لائبریری میں موجود ہیں۔

اپریل ۱۹۰۷ء میں مرزا قادیانی نے مولانا ثناء اللہ صاحب کے لیے موت کی پیش گوئی کرتے ہوئے دعا کی کہ "ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں مر جائے"۔

اسے مرزا صاحب کی پیش گوئی کہیے یا دعا اور بددعا سے تعبیر کیجیے، ان کی یہ "اکلوتی" پیش گوئی یا دعا تھی جو حرف بحرف پوری ہوئی۔

اس کے بعد مولانا نے ایک رسالہ "مرقع قادیانی" جاری کیا جو ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا تھا۔ یہ رسالہ مرزا صاحب کی موت ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کے بعد اکتوبر

۱۹۰۸ء تک جاری رہا۔ جنوری ۱۹۱۷ء میں "مرقع قادیانی" کے مضامین کا انتخاب اسی نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں "مرقع قادیانی" کا اجرا دوبارہ عمل میں لایا گیا اور دو سال (اپریل ۱۹۳۳ء تک) یہ جاری رہا۔ اس کا مکمل فائل ضیاء اللہ کھوکھر کے کتب خانے میں موجود ہے۔

تصنیفی اور صحافتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ مولانا اپنی مسجد میں نماز فجر کے بعد روزانہ درس قرآن مجید دیتے تھے۔ درس میں قرآن کے رموز و نکات دلنشیں اسلوب میں بیان کرتے اور معترضین کے اعتراضات اور غیر مذاہب کی اسلام پر نکتہ چینیوں کے مدلل جواب دیتے۔ درس کے وقت وہ اپنے پاس ایک چھڑی رکھتے تھے' کسی شخص کو اونگھتا یا سویا ہوا دیکھتے تو چھڑی ہلا دیتے اور وہ چوکنا ہو کر بیٹھ جاتا۔

درس قرآن میں پڑھے لکھے بعض غیر مسلم بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ لوگ مسجد میں ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتے اور مولانا کے افکار و خیالات نہایت غور سے سنتے۔ اگر کوئی بات ان کے نزدیک حل طلب ہوتی تو درس کے بعد انتہائی احترام سے پوچھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے۔

خطبہ جمعہ بھی مولانا ارشاد فرماتے اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق مختصر خطبہ دیتے۔ خطبے میں اختصار کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں وہی باتیں کرتے جو ان کے نزدیک مسلم معاشرے کے لیے ضروری ہوتیں۔ لمبی تقریر کرنا اور متنازعہ مذہبی یا سیاسی مسائل کو موضوع گفتگو بنانا ان کے نزدیک پسندیدہ بات نہ تھی۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ نماز جمعہ کے لیے ہر قسم کے سیاسی ذہن کے لوگ آتے ہیں' ان کے سامنے صرف دینی باتیں کرنی چاہئیں' جمعے میں سیاسی تقریر کرنے والے مولوی صاحب سے یہ لوگ کہیں زیادہ سیاست سے باخبر ہوتے ہیں۔

آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا قیام انہی کی تحریک و تجویز سے عمل میں آیا تھا۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں ہندوستان کے صوبہ بہار کے شہر آرہ میں جماعت اہل حدیث کا ایک اجلاس ہوا جس میں جماعت کے بہت سے علمائے کرام اور سرکردہ حضرات نے شرکت کی۔ اسی اجلاس میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تشکیل کی گئی۔ کانفرنس کے پہلے صدر مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری (وفات ۲۱ صفر ۱۳۳۷ھ۔ ۲۲ نومبر ۱۹۱۸ء) کو اور ناظم اعلیٰ مولانا

ثناء اللہ امرتسری کو منتخب کیا گیا تھا اور اس کا مرکزی دفتر دہلی میں قائم کیا گیا تھا۔

کانفرنس کے تعارف اور اس کو منظم کرنے کی غرض سے پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کے لیے ایک وفد بنایا گیا تھا' جس میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (وفات جمادی الاخریٰ ۱۳۳۹ھ۔اپریل ۱۹۱۹ء) مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی (وفات ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء۔۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ) اور مولانا ثناء اللہ امرتسری شامل تھے۔

آزادی کے بعد عرصے تک یہ تنظیم اسی نام سے قائم رہی' اب کئی سال سے اس کا نام بدل کر مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند رکھ دیا گیا ہے۔

آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے خازن حافظ حمید اللہ (وفات ۲۷۔دسمبر ۱۹۵۰ء) تھے جو دہلی کے بہت بڑے سیٹھ اور مخیّر بزرگ تھے۔یہ معلوم نہیں کہ ان کو کب خازن بنایا گیا تھا' البتہ وہ طویل عرصے تک (غالباً زندگی کے آخری دور تک) اس کے خازن رہے۔میں نے دہلی میں ایک مرتبہ ان کو دیکھا تھا' سادہ مزاج اور ملنسار بزرگ تھے۔آزادی سے چند سال بعد دہلی سے ان کے پوتے (شیخ محمد یحییٰ) لاہور آئے تو ان سے میری ملاقات ہوئی تھی' وہ بھی متدین اور نیک آدمی تھے۔

آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے ہندوستان کے مختلف شہروں میں بہت سے سالانہ جلسے ہوئے' لیکن "ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات" میں مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے مندرجہ ذیل بیس مقامات کے جلسوں کی نشان دہی کی ہے۔کانفرنس کے ہر جلسے میں مولانا ثناء اللہ مرحوم شرکت فرماتے تھے بلکہ ہر جلسہ ان کی کوشش سے منعقد ہوتا تھا۔

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ دہلی | ۱۳۳۰ھ | ۱۹۱۲ء |
| ۲۔امرتسر | ۱۳۳۱ھ | ۱۹۱۳ء |
| ۳۔پشاور | ۱۳۳۲ھ | ۱۹۱۴ء |
| ۴۔علی گڑھ | ۱۳۳۳ھ | ۱۹۱۵ء |
| ۵۔بنارس | ۱۳۳۴ھ | ۱۹۱۶ء |
| ۶۔کلکتہ | ۱۳۳۵ھ | ۱۹۱۷ء |
| ۷۔مدراس | ۱۳۳۶ھ | ۱۹۱۸ء |

| | | |
|---|---|---|
| ۸-کان پور | ۱۳۳۷ھ | ۱۹۱۹ء |
| ۹-ملتان | ۱۳۳۸ھ | ۱۹۲۰ء |
| ۱۰-دہلی | ۱۳۴۱ھ | ۱۹۲۳ء |
| ۱۱-گوجرانوالہ | ۱۳۴۲ھ | ۱۹۲۴ء |
| ۱۲-لہریا سرائے دربھنگہ | ۱۳۴۳ھ | ۱۹۲۵ء |
| ۱۳-چھپرہ | ۱۳۴۴ھ | ۱۹۲۶ء |
| ۱۴-مؤناتھ بھنجن (ضلع اعظم گڑھ) | ۱۳۴۵ھ | ۱۹۲۷ء |
| ۱۵-آگرہ | ۱۳۴۶ھ | ۱۹۲۸ء |
| ۱۶-ملتان | ۱۳۴۷ھ | ۱۹۲۹ء |
| ۱۷-پٹنہ | ۱۳۵۰ھ | ۱۹۳۲ء |
| ۱۸-چھپرہ | ۱۳۵۲ھ | ۱۹۳۴ء |
| ۱۹-دہلی | ۱۳۵۴ھ | ۱۹۳۶ء |
| ۲۰-شکراواں (ضلع گوڑگانواں) | ۱۳۵۶ھ | ۱۹۳۸ء |

یہ بھی مولانا سے متعلق واقعات کا ایک حصہ ہے' لہذا اسے یہاں درج کر دیا گیا ہے تاکہ ان کی تاریخ کا یہ پہلو بھی قارئین کے ملاحظہ گرامی میں آجائے-ان جلسوں کے علاوہ اور بھی متعدد جلسے ہوئے' جن کا ذکر ان شاءاللہ کسی الگ مضمون میں کیا جائے گا-

پنجاب میں مولانا نے اہل حدیث انجمنوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا-خود اپنے شہر میں انجمن اہل حدیث قائم کی اور پھر پنجاب کے بہت سے شہروں اور قصبوں میں یہ انجمنیں عالم وجود میں آئیں' جن کے زیر انتظام سالانہ تبلیغی جلسے منعقد ہونے لگے-

جب انجمنوں کے قیام کا سلسلہ وسیع ہو گیا تو ۱۹۲۰ء میں پورے پنجاب کے اہل حدیث حضرات کی ایک انجمن بنائی گئی' جس کا نام "صدر انجمن اہل حدیث صوبہ پنجاب" رکھا گیا-اس کا دفتر لاہور میں تھا- پہلے صدر مولانا عبدالقادر قصوری اور ناظم اعلیٰ مولانا ثناء اللہ امرتسری منتخب کیے گئے تھے-۱۹۲۸ء میں عہدے داروں کا پھر انتخاب ہوا تو اس کے صدر علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کو اور ناظم اعلیٰ مولانا عبدالمجید سوہدروی کو منتخب کیا گیا تھا-

مولانا مرحوم کی زندگی مصروف ترین زندگی تھی۔ ان کا وقت تحریر و تقریر' تصنیف و تالیف' درس و خطابت اور مناظرات و مدافعت اسلام میں صرف ہوتا تھا۔

ان کے مناظروں کی بڑی شہرت تھی۔ انھوں نے ہر مذہب و مسلک کے اہل علم سے مناظرے کیے۔ غیر مسلموں سے تو ان کے مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا ہی تھا' دیوبندی اور بریلوی مسلک کے علمائے کرام سے بھی ان کے چند مناظرے ہوئے۔

مرزا غلام احمد سے مناظرے کے لیے وہ ۱۹۰۳ء میں قادیان گئے' لیکن مرزا صاحب میدان میں نہیں آئے' حالاں کہ انھوں نے خود ہی مولانا کو مناظرے کی دعوت دی تھی۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی طرف سے مولانا کو فاتح قادیان کا لقب دیا گیا تھا۔

"فاتح قادیان" کے الفاظ ایک بڑے سے خوب صورت تختے پر خوب صورت انداز میں لکھوا کر ان کی خدمت میں پیش کیے گئے تھے۔ ان الفاظ کا اسلوب تحریر کچھ ایسا تھا کہ دائیں اور بائیں دونوں طرف سے پڑھے جاتے تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ان کے استاد تھے اور وہ نہایت فخر سے اس کا اظہار کیا کرتے تھے' فرماتے ہیں۔ "ممدوح میرے ساتھ اپنی اولاد کی طرح محبت کرتے تھے' اسی لیے بڑے بڑے مباحثوں میں جہاں اکابر دیوبند کا دخل ہوتا' مباحثہ خاکسار کے سپرد کیا جاتا' جیسے مباحثہ نگینہ اور رام پور وغیرہ"۔

ان کے مباحثوں سے خود عالی قدر استاد بھی نہایت خوش ہوتے اور لائق شاگرد کے لیے بھی یہ کامیابی انتہائی مسرت کا باعث ہوتی۔

مناظرے میں حریف کو مخاطب کر کے مناسب مواقع پر اردو یا فارسی کے شعر خوب مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر کو ان کے بعض مناظروں میں شامل ہونے کا موقع ملا تھا' انھوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ انھیں بہت سے اساتذہ کے اشعار یاد تھے اور جب شعر پڑھتے تو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے اسی موقعے کے لیے یہ شعر کہا تھا۔ بسا اوقات ایک شعر ہی حریف کو پریشانی میں مبتلا کر دیتا اور اس کے لیے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ مہر صاحب نے بتایا کہ وہ غالب کا شعر پڑھتے تو فرماتے' چچا غالب نے کیا خوب فرمایا ہے۔ کسی معاملے میں داغ کا شعر پڑھنا مقصود ہوتا تو کہتے' اس سلسلے میں داغ کا شعر سنیے۔ ہر شخص ان کے شعر پڑھنے کے انداز سے محظوظ ہوتا۔

حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب گوجرانوالہ کے مشہور و ممتاز دیوبندی عالم تھے۔ انکسار و تواضع کے پیکر اور بڑے متدین و متقی۔ قرآن و حدیث پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ میں نے ان کو دیکھا نہیں، مگر لوگوں سے ان کے علم و فضل اور وسعت نظر کی تعریف سنی ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ مولانا عبدالعزیز صاحب کا فاتحہ خلف الامام کے مسئلے پر گوجرانوالہ میں مولانا ثناء اللہ صاحب سے مناظرہ ہوا۔ شرط یہ طے پائی کہ مولانا ثناء اللہ صاحب مناظرے میں عربی، فارسی یا اردو کا کوئی شعر نہیں پڑھیں گے۔ یہ شرط ماننا اور اس پر قائم رہنا مولانا کے لیے بہت مشکل تھا۔ گوجرانوالہ شہر اور اس کے قرب و جوار سے بے شمار لوگ مناظرہ سننے کے لیے آئے تھے۔ مولانا عبدالعزیز جب کسی بات کے جواب میں کچھ نرم پڑتے تو مولانا ثناء اللہ صاحب فرماتے "مولانا! میری بات کا جواب دیجیے۔ ورنہ میں ابھی شعر پڑھتا ہوں----" "ورنہ میں ابھی شعر پڑھتا ہوں"۔ وہ اس انداز سے کہتے کہ لوگ بے ساختہ ہنس پڑتے اور اس کا اثر شعر پڑھنے سے بھی زیادہ ہوتا۔

مولانا کا آخری مناظرہ ۲۴ مئی ۱۹۴۴ء کو امرتسر میں دہلی کے آریہ سماجی پرچارک پنڈت رام چندر سے ہوا تھا، جس میں مولانا کامیاب رہے تھے۔

اللہ نے جہاں انھیں فضیلت علم سے نوازا تھا، وہاں حاضر جوابی کی نعمت سے بھی خوب بہرہ مند کیا تھا، اور یہی وہ چیز ہے جو مناظرے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی بہت سی مثالوں میں سے یہاں صرف ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا ایک آریہ سماجی سے مناظرہ کرنے دہلی گئے۔ اس زمانے میں ایک مذہبی جماعت کے بعض لوگوں نے ان کے خلاف بعض مسائل سے متعلق ایک اشتہار شائع کیا تھا، جس میں کچھ ایسی باتیں ان کی طرف منسوب کی گئی تھیں، جن کی بنا پر سرے سے ان کا اسلام ہی مشکوک قرار پاتا تھا۔ وہ اشتہار آریہ سماجی مناظر کے ہاتھ آ گیا۔ وہ عربی، فارسی وغیرہ زبانیں جانتا اور عقیدہ و عمل کے بارے میں علمائے دین کے باہمی اختلافی مسائل سے آگاہ تھا۔ دونوں فریق مناظرے کے میدان میں اترے تو آریہ سماجی مناظر اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ میں اشتہار لہراتے ہوئے بولا، حضرات! میں تو یہاں کسی مسلمان عالم دین سے مناظرہ کرنے آیا ہوں۔ مولانا ثناء اللہ صاحب بے شک میرے لیے قابل احترام ہیں، لیکن یہ دیکھیے اشتہار، ان کے اسلام کو تو ان کے ہم مذہب

ہم مذہب بھی تسلیم نہیں کرتے‘ میں انھیں کیسے مسلمان سمجھوں؟

مولانا ثناء اللہ صاحب پر یہ بہت بڑا مناظرانہ وار تھا‘ کوئی اور ہوتا تو گھبرا اٹھتا اور لاجواب ہو کر میدان چھوڑ جاتا یا عقیدہ و عمل کی توجیہات و توضیحات میں اس طرح الجھ جاتا کہ آریہ سماجی مناظر اپنے مقصد میں کامیاب قرار پاتا۔

لیکن وہ نہایت اطمینان سے مسکراتے ہوئے اپنی نشست سے اٹھے اور فرمایا:

حضرات! میرے دوست نے بالکل ٹھیک کہا۔ سب جانتے ہیں کہ کلمہ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہوا جاتا ہے۔ میں تمام حاضرین مجلس کے سامنے‘ آپ کو گواہ بنا کر کلمہ شہادت پڑھتا اور اسلام قبول کرتا ہوں۔ اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك له واشھد ان محمدا عبدہ ورسولہ۔ اب تو میرے اسلام میں کوئی شک نہیں رہا۔ آیئے مناظرہ کیجیے۔

مولانا مرحوم بہت پیاری زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ نہایت صفائی سے بات کرتے اور دل کش الفاظ میں اظہار مدعا کرتے تھے۔ وہ انتہائی شائستہ مزاج‘ شگفتہ کلام اور شستہ بیان عالم دین تھے۔ تحریر میں روانی‘ تقریر میں تسلسل‘ بات چیت میں نکھار اور دوسرے کی سخت سے سخت گفتگو سننے کا حوصلہ اور برداشت کرنے کا سلیقہ ان کے وہ اوصاف تھے جو انھیں سب سے ممتاز کرتے تھے۔ انھوں نے جس طریقے سے اسلام کا دفاع کیا‘ جس ڈھنگ سے دین کی تبلیغ کی اور جس نہج سے مخالفین اسلام پر حملے کیے‘ اس میں کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ مقابلے میں وہ کبھی اضطراب اور گھبراہٹ کا شکار نہیں ہوئے۔ حواس ہمیشہ قابو میں رکھے۔ نہایت اطمینان سے دوسرے کی بات سنی اور انتہائی سکون سے اپنی سنائی۔

مناظرے میں وہ خوب چہکتے تھے‘ اپنی مدافعت بھی پوری قوت سے کرتے اور حملہ بھی بھرپور طریقے سے کرتے‘ لیکن اس میں قرآن کے حکم وَجَادِلۡهُم بِالَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ (کہ اے پیغمبر! مخالفین اسلام سے بہترین طریق سے مجادلہ کرو) پر ہر صورت میں عمل پیرا رہتے تھے۔

وہ اپنی بات کرتے تھے‘ کسی کا دل نہیں دکھاتے تھے۔ ان کے پیش نظر اسلام کی تبلیغ اور دین کی ترویج تھی‘ کسی کو برا بھلا کہنا اور سب و شتم پر اتر آنا ہرگز ان کا طریقہ نہ تھا۔ وہ قرآن کے اس ارشاد کو ہر موقعے پر پیش نگاہ رکھتے تھے‘ جس میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے

فرمایا گیا ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔

"یعنی جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں، تم ان کے معبودوں کو گالیاں نہ دو، ورنہ وہ بھی حد سے متجاوز ہو کر بے سوچے سمجھے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں گے۔" (الانعام:۱۰۸)

وہ اس درجے عالی ظرف اور بلند اخلاق تھے کہ اگر ان کے شہر امرتسر میں کسی جگہ سے کوئی صاحب ان سے مناظرہ کرنے آتے تو مناظرے کے بعد مجمع عام میں انھیں دعوت دیتے کہ وہ ان کے ہاں قیام کریں اور انھیں مہمان نوازی کا موقع دیں۔

وہ اہل حدیث مسلک کے عالم تھے، لیکن غیر مسلموں اور مخالفین اسلام سے وہ صرف اہل حدیث حضرات ہی کی طرف سے مناظرہ نہیں کرتے تھے، دوسرے فقہی مسلک کے اہل علم بھی ان کی خدمات حاصل کرتے اور غیر مسلموں کے مقابلے میں ان کو لے جاتے تھے۔

میرے ایک مرحوم دوست میجر محمد حسین بابری نے بتایا کہ ایک مرتبہ لاہور کی مسجد وزیر خاں کے اصحاب انتظام نے ایک عیسائی پادری سے مناظرہ طے کر لیا، لیکن انھیں اپنے فقہی مسلک یعنی احناف کے بریلوی حضرات سے کوئی ڈھب کا مناظر نہ مل سکا تو ان کے چند آدمی فوری طور پر مولانا ثناء اللہ صاحب کے پاس امرتسر پہنچے اور مناظرے کے لیے انھیں لاہور لے کر آئے۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مناظرہ ہوا اور مولانا کامیاب رہے۔ پھر اسی وقت واپس امرتسر تشریف لے گئے۔ بقول میجر بابری کے اہل حدیث حضرات پر تو مولانا کا اثر تھا ہی غیر اہل حدیث بھی ان سے بہت متاثر ہوئے۔

ان کی ذہانت، فن مناظرہ میں مہارت اور حاضر جوابی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی نے فرمایا تھا کہ اگر رات کو دنیا میں کوئی نیا فرقہ پیدا ہو جائے تو ثناء اللہ صبح اٹھ کر اس کا جواب دے سکتا ہے۔

اسی طرح مصر کے نامور عالم رشید رضا نے ۱۳۵۱ھ ۱۹۳۳ء کے "المنار" کے ایک شمارے میں ان کو قارۃ الہند میں مسلمانوں اور اسلام کا سب سے بڑا وکیل قرار دیا تھا۔

مرزا مظہر جان جاناں مشہور عالم و مصنف گزرے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی وسیع فہرست میں حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی شامل تھے جو جلیل القدر عالم اور مفسر قرآن

تھے۔مقاماتِ مظہری کے صفحہ ۷۶ میں ان کے متعلق حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کا یہ قول لائقِ مطالعہ ہے۔

می فرمودند اگر خدائے تعالیٰ از بندہ پرسید کہ بہ درگاہ ما چہ تحفہ آوردی؟ عرض کنم ثناء اللہ پانی پتی را!۔

فرمایا کرتے 'اگر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن مجھ سے پوچھا کہ ہمارے دربار میں کیا تحفہ لائے ہو؟ تو عرض کروں گا' ثناء اللہ پانی پتی کو لے کر حاضر ہوا ہوں۔

بالکل یہی الفاظ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد رشید مولانا ثناء اللہ امرتسری کے بارے میں ارشاد فرمائے تھے۔ایک مرتبہ علما کے اجتماع میں حضرت حافظ صاحب نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے روز اگر مجھ سے پوچھا کہ تم آنکھوں سے اندھے تھے' ہم نے تم کو عزت عطا کی' تم بے علم تھے' ہم نے تم کو علم کی دولت سے نوازا اور کتنے ہی بڑے بڑے علما کو تمھارے حلقہ شاگردی میں داخل کیا۔بتاؤ اس احسان عظیم کے بدلے میں ہمارے حضور کیا تحفہ لائے ہو؟

اس مجلس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی موجود تھے' حافظ صاحب نے مولانا کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اپنے برابر کھڑا کیا اور فرمایا:

میں اس کے جواب میں بارگاہِ خداوندی میں عرض کروں گا کہ ثناء اللہ امرتسری کو لے کر حاضر ہوا ہوں' امید رکھتا ہوں کہ اس خدمت کی وجہ سے مستحقِ مغفرت سمجھا جاؤں گا۔

بلاشبہ دونوں ثناء اللہ متحدہ پنجاب کے فحول علما میں سے تھے۔ایک کا تعلق تیرھویں صدی ہجری سے تھا اور ایک کا چودھویں صدی ہجری سے!۔دونوں مفسرِ قرآن' محدث و فقیہ' کثیر التصانیف' وسیع المطالعہ' وسیع الفکر اور اشاعتِ اسلام میں سرگرم رہنے والے۔

کشمیر میں مختلف برادریوں کے لوگ آباد ہیں۔مثلاً ڈار' بٹ' وائیں' کول' میر' منٹو اور کچلو وغیرہ۔ان میں مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی۔ان برادریوں کے بہت سے حضرات وادیٔ کشمیر سے نکل کر برصغیر کے مختلف علاقوں اور شہروں میں اقامت گزیں ہو گئے اور سب کشمیری کہلائے۔کسی زمانے میں یہ تمام لوگ غیر مسلمان تھے' صوفیا اور علما کی اس نواح میں آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تو انھوں نے اپنے اپنے اسلوب کے مطابق تبلیغ اسلام کی کوششوں کا آغاز کیا' جس کے نتیجے میں دیارِ کشمیر میں اسلام کی نشر و اشاعت کی راہیں ہموار

ہوئیں اور یہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

کشمیر کی ان برادریوں کے لیے جو الفاظ مستعمل ہیں' ان کے متعلق ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ کشمیری دوست نے عجیب بات بتائی۔ معلوم نہیں اس کی حقیقت کیا ہے' تاہم اسے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے الگ الگ مفہوم اور معنے ہیں۔ مثلاً ''منٹو'' جس کشمیری برادری کو کہا جاتا ہے' وہ کشمیر کے مشہور اور معزز برہمن تھے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب اصلاً اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور اس برادری کے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ لفظ ''منٹو'' کے لفظی معنی ہیں ڈھائی سیر۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کشمیر کے ان برہمنوں کو ان کے معتقد اپنی فصلوں کی آمدنی سے ڈھائی سیر فی صد کے حساب سے نذرانہ پیش کرتے تھے۔ یعنی اگر کسی کو گندم کی فصل سو سیر (ڈھائی من) ہوئی تو اس میں سے ڈھائی سیر گندم برہمن کے گھر پہنچا دی گئی' اسے کشمیری بولی میں منٹو کہا جاتا تھا۔ پھر اس لفظ کا اطلاق ان برہمنوں پر ہونے لگا۔ بعد ازاں ''منٹو'' ایک برادری کا نام پڑ گیا۔

اسی طرح لفظ ''کچلو'' کے معنی کشمیری زبان میں ''داڑھی'' کے ہیں۔ یہ کشمیر کے وہ معزز برہمن تھے جن کے نزدیک داڑھی رکھنا اور داڑھی بڑھانا مذہبی اعتبار سے ضروری تھا۔ وہ جہاں جاتے لوگوں کو داڑھی رکھنے اور بڑھانے کی تلقین کرتے' اس بنا پر انھیں کچلو کہا جانے لگا اور پھر آہستہ آہستہ یہ لوگ کشمیر کی ایک برادری کے نام سے موسوم ہو گئے' جو کچلو برادری کہلائی۔

ہمارا مقصد کشمیری برادریوں کی وجہ تسمیہ بیان کرنا نہیں' مولانا ابوالوفا ثناء اللہ مرحوم ومغفور کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک کشمیری دوست کی بیان کردہ بات ذہن میں آئی جو یہاں لکھ دی گئی۔ اس کی صحت و عدم صحت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری نہایت خوش مزاج اور خوش طبع بزرگ تھے۔ ایک دن حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم نے بتایا کہ امرتسر میں اہل حدیث کی نماز عید کے امام خلیفہ عبدالرحمٰن تھے جو زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے' البتہ پرہیز گار اور متقی بزرگ تھے۔ عید کے موقعے پر وہ پنجابی میں تقریر کیا کرتے تھے اور عورتوں کو مخاطب کرتے تو بار بار ''او عورتو سنو ---- او عورتو سنو'' کہا کرتے تھے۔ ایک دن نماز کے بعد عید گاہ سے باہر نکلے تو چند

نوجوانوں نے خلیفہ صاحب کو روک لیا اور کہا آپ "او عور تو' او عور تو" کہتے ہیں' اس کے بجائے "ماؤں بہنو" کہا کریں۔

خلیفہ صاحب بقول حاجی محمد اسحاق حنیف کے بعض الفاظ دو دفعہ کہا کرتے تھے' نوجوانوں کی بات سن کر بولے: "سیانے دی گل سیانی ---- سیانے دی گل سیانی"۔ آئندہ میں ماؤں بہنو کہا کروں گا۔

اتنے میں مولانا ثناء اللہ صاحب تشریف لے آئے۔ انھوں نے نوجوانوں سے پوچھا: خلیفہ صاحب سے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟

جو بات ہوئی تھی انھوں نے بیان کی۔

مولانا نے بہ انداز مزاح فرمایا: تم خلیفہ صاحب کو گم راہ کر رہے ہو' عورتوں میں ان کی بیوی بھی موجود ہوتی ہیں' یہ ان کو ماؤں' بہنو کیسے کہیں' اگر اس کا کفارہ دینا پڑا تو کون دے گا؟

خلیفہ صاحب فوراً بولے: عالم دی گل عالمانہ ----- عالم دی گل عالمانہ۔ کفارہ دینا بڑا مشکل اے۔ کفارہ دینا بڑا مشکل اے۔ عالم دی گل توں میں سمجھ گیا' جتھے بیوی ہووے' اوتھے ماؤں' بہنو نہیں کہنا چاہیدا۔ عالم دی گل عالمانہ۔ عالم دی گل عالمانہ۔

مولانا مسکراتے ہوئے آگے نکل گئے۔

یوں تو تمام علمائے کرام سے مولانا کے بہت اچھے تعلقات تھے' وہ سب کی عزت کرتے اور سب ان کا احترام کرتے تھے' لیکن مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی سے بالخصوص ان کے گہرے مراسم اور دوستانہ روابط تھے۔ جلسوں میں دونوں اکٹھے جاتے اور ایک ہی جگہ قیام فرماتے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ اس کی بڑی وجہ دونوں کی "کشمیریت" تھی۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو' دونوں میں بہ درجہ غایت تعلق تھا۔

مولانا ابراہیم کی طبیعت میں جلال کا غلبہ تھا اور جلد طیش میں آجاتے تھے۔ لیکن مولانا ثناء اللہ سراپا جمال تھے اور ہر ایک سے اس کے مزاج و طبیعت کے مطابق بات کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ غصے اور طیش سے آشنا ہی نہیں ہیں۔ تحمل و بردباری کا پیکر حسین۔

کہتے ہیں' مولانا سیالکوٹی امرتسر تشریف لے جاتے تو مولانا ثناء اللہ درس قرآن کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دیتے' جتنے دن وہاں رہتے' وہی درس دیتے اور اگر اثنائے قیام میں جمعے کا دن آجاتا تو خطبہ جمعہ بھی وہی ارشاد فرماتے۔

جماعت اہل حدیث کی سیاست کے بارے میں مولانا ثناء اللہ صاحب کا نقطہ نظر یہ تھا کہ جماعتی طور سے سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔ جماعت کا جو شخص سیاست کرنا چاہے وہ اپنی صواب دید اور ذہنی رجحان کے مطابق کسی سیاسی جماعت میں شامل ہو جائے اور سیاسی کام کرے۔

مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل، مولانا عطاء اللہ حنیف اور مولانا محمد حنیف ندوی کا بھی یہی خیال تھا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ پورے ملک میں جماعت اہل حدیث کا ایک بھی حلقہ انتخاب نہیں ہے اور اس کی طرف سے بحیثیت جماعت کوئی شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ سیاسیات میں یہ حضرات جمہوریت کے حامی تھے۔

جمعیت علمائے ہند متحدہ ہندوستان کی مشہور سیاسی اور اسلامی تنظیم تھی، اس کے قیام کے محرک و مجوز مولانا ثناء اللہ صاحب تھے۔ علما کی اس تنظیم کے ذریعے وہ مختلف فقہی مسالک کے حامل اہل علم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا چاہتے تھے تاکہ مسلکی تعصب ختم ہو اور سب لوگ صلح و صفائی سے زندگی بسر کریں۔ نیز اس وقت ہندوستان میں سیاسی و علمی نوعیت کے بعض بڑے بڑے مسائل زیر بحث تھے، ان کے بارے میں مولانا ممدوح کے نزدیک علمائے ہند کا متفقہ طور سے غور کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۹ء میں ان کی سعی و کوشش سے اس مقصد کے لیے جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے قیام کو آخری شکل امرتسر میں دی گئی تھی۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد وزیر ہند منٹو مارلے ہندوستان آئے، وہ ہندوستانیوں کے لیے کوئی سکیم لے کر آئے تھے، جسے سیاسی زبان میں منٹو مارلے سکیم کہا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی تحریک سے علمائے کرام کا ایک اجتماع لکھنو میں ہوا۔ اس میں پنجاب کے جن حضرات کو دعوت شرکت دی گئی تھی، ان میں مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی شامل تھے۔ تجویز یہ پیش ہوئی کہ علما کا ایک وفد مسلمانان ہند کے مذہبی معاملات سے متعلق کچھ تجاویز پر غور کرنے کے لیے وزیر ہند سے ملاقات کرے، چنانچہ یہ وفد وزیر ہند سے ملا، اس وفد میں مولانا ثناء اللہ امرتسری بھی شامل تھے۔

لکھنؤ کی اسی مجلس علما میں مولانا ثناء اللہ صاحب نے تجویز پیش کی کہ ملکی سیاسیات کے مذہبی پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے علما کی ایک مستقل تنظیم قائم کرنی چاہیے۔ مولانا کی اس

تجویز پر دو دن بحث ہوتی رہی، مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد دہلی میں ایک تبلیغی جلسہ منعقد ہوا، جس میں ملک کے بہت سے علمائے کرام شریک تھے۔ مولانا ثناء اللہ بھی موجود تھے، انھوں نے اس جلسے میں بھی تنظیم علما کے متعلق وہی تجویز پیش کی جو لکھنو میں پیش کر چکے تھے۔ اب متعدد علما نے ان کی تائید کی۔ مولانا نے فرمایا کہ ہندوستان میں مختلف گروہوں اور قوموں کی تنظیمیں اور انجمنیں قائم ہو چکی ہیں اور قائم ہوتی رہتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ ملک و قوم کی خدمت کر رہی ہیں۔ لیکن علما کی کوئی ایسی ملک گیر تنظیم نہیں ہے جو متفقہ طور پر ملک اور قوم کی خدمت کر سکے۔ بہتر ہوگا کہ علما کی ایک ایسی تنظیم قائم کی جائے جو پیش آئند مذہبی اور سیاسی معاملات میں اسلام کی روشنی میں عوام کی رہنمائی کے فرائض انجام دے، اس سے علما کا وقار بھی بلند ہوگا اور آپس کے مذہبی اور مسلکی جھگڑوں کا سلسلہ بھی ماند پڑ جائے گا۔ نیز اس طرح علما کی وساطت سے اسلام کی آواز زیادہ موثر اور ہمہ گیر شکل اختیار کر لے گی۔ چنانچہ غور و فکر کے بعد "جمعیت علمائے ہند" کے نام سے ایک جماعت معرض وجود میں لانے کا فیصلہ کیا گیا۔

یہ اواخر نومبر ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔ اس سے اگلے مہینے یعنی دسمبر ۱۹۱۹ء کی آخری تاریخوں میں امرتسر میں مجلس خلافت اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس ہو رہے تھے جن میں دیگر مباحث کے علاوہ مسئلہ خلافت اور ترکی کے مسئلے پر بھی بحث ہونے والی تھی، اور یہ مسئلے چونکہ خالص علمی، دینی اور فقہی نوعیت کے تھے، اس لیے ان پر بحث کرنے کے لیے ہندوستان کے علمائے کرام بہت بڑی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ موقعے کی مناسبت سے مولانا ثناء اللہ مرحوم اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی مرحوم نے دہلی کی اس مجلس علما کو امرتسر تشریف لانے کی دعوت دی اور تحریک پیش کی کہ جمعیت علمائے ہند کے قیام اور توثیق کے سلسلے میں ضروری اور بنیادی مسائل پر وہیں گفتگو کی جائے اور اس کا پہلا اجلاس دسمبر میں امرتسر ہی میں منعقد کیا جائے۔

مولانا ثناء اللہ مرحوم نے اجلاس دہلی میں مولانا مفتی کفایت اللہ کا نام جمعیت علمائے ہند کے صدر اور مولانا احمد سعید دہلوی کا نام ناظم اعلیٰ کے لیے پیش کیا۔ اس تجویز کی تائید مولانا سلامت اللہ جیراج پوری اور مولانا محمد اکرم خاں (ڈھاکہ) نے کی جو باتفاق رائے منظور ہوئی۔ اس کے بعد فیصلہ ہوا کہ مولانا محمد اکرم خاں اور مولانا مفتی کفایت اللہ جمعیت علمائے

ہند کے مقاصد و ضوابط کا مسودہ تیار کریں جو جمعیت کے اجلاس امرتسر میں بغرض منظوری پیش کیا جائے گا۔

دہلی کے اس اجتماع علما میں جس میں جمعیت علمائے ہند کا ڈھانچا تیار ہوا تھا بہت سے علمائے کرام شریک تھے' جن میں مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا سلامت اللہ جیراج پوری' مولانا سید محمد فاخرالہ آبادی' مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی' مولانا مفتی کفایت اللہ' مولانا احمد سعید دہلوی' مولانا محمد اکرم خاں' مولانا سید محمد داؤد غزنوی' مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا آزاد سبحانی قابل ذکر ہیں----- شیخ الہند مولانا محمود حسن' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی اس اجتماع میں شریک نہیں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا محمود حسن اور مولانا مدنی ان دنوں نظر بند تھے' اور مولانا شبیر احمد عثمانی کسی اور وجہ سے شامل اجلاس نہیں ہو سکے تھے۔ یہ سب حضرات اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اجلاس دہلی کے فیصلے کے مطابق ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں علمائے ہند کا اجتماع شروع ہوا' جس میں باون علمائے کرام شریک ہوئے۔ان میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ مولانا ابوالقاسم بنارسی' مولانا محمد یحییٰ غزنوی' مولانا عبدالغفار غزنوی' مولانا ابوتراب عبدالحق امرتسری' مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری' مولانا احمد علی لاہوری' مولانا محمد موسیٰ غزنوی' مولانا محمد عیسیٰ غزنوی' حکیم نور الدین لائل پوری' مولانا سلطان محمود' مولانا عبدالقادر قصوری' مولانا محمد علی ایم۔اے کینٹب قصوری اور کئی دوسرے علمائے عظام شامل تھے۔

اجلاس کی مجلس استقبالیہ میں مولانا ثناء اللہ مرحوم نے خطبہ استقبالیہ پڑھا جس میں قیام جمعیت اور اجلاس دہلی کی مختصر کیفیت بیان کی۔ مختلف حضرات کی تقریروں اور بحث و تمحیص کے بعد اس بات کی توثیق کی گئی کہ اجلاس دہلی کے فیصلے کے مطابق علمائے ہند کی اس جماعت کا نام جمعیت علمائے ہند ہی رکھا جائے۔اس اجلاس میں تیئیس ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل کی گئی جس میں ملک کے تمام صوبوں کو الگ الگ نمائندگی دی گئی تھی۔ پنجاب سے تین حضرات لیے گئے تھے۔اور وہ تھے مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور مولانا سید محمد داؤد غزنوی۔ یہ اس وقت جمعیت علمائے ہند کی مجلس عاملہ تھی' جس میں تیئیس حضرات شامل تھے۔

جمعیت کے اس اجلاس میں حکیم محمد اجمل خاں مرحوم نے بھی شرکت فرمائی جو مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے امرتسر تشریف لائے تھے۔ حکیم صاحب مرحوم نے مجمع علما میں تقریر کرتے ہوئے علما کے جذبہ اتحاد کی تحسین کی اور جمعیت علماے ہند کے قیام و تاسیس پر ان کو ہدیہ تبریک پیش کیا۔ حکیم صاحب مرحوم کی موجودگی میں مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم نے جمعیت کے اغراض و مقاصد کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ حکیم صاحب نے تحریک کی کہ جمعیت کے اساسی اصول و ضوابط کا مسودہ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی جائے۔ چنانچہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کے اجلاس میں بالاتفاق مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد اکرم خاں، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا خیر الزمان صاحب پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی، جس نے جمعیت کے اصول و ضوابط کا مسودہ تیار کر کے دوسرے روز یعنی یکم جنوری ۱۹۲۰ء کے اجلاس میں پیش کیا جو منظور کر لیا گیا۔ اسی اجلاس میں حکومت برطانیہ سے مولانا محمود حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا جو ان دنوں نظر بند تھے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے اس اجلاس کے جو حکیم اجمل خاں کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا، صدر استقبالیہ مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے اور خطبہ استقبالیہ مولانا امرتسری مرحوم نے پڑھا تھا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا دہلی میں جمعیت علماے ہند کا ایک ڈھانچا تیار کیا گیا تھا جس کے صدر مفتی کفایت اللہ صاحب کو اور ناظم اعلیٰ مولانا احمد سعید کو بنایا گیا تھا۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے ان کو امرتسر تشریف لانے کی دعوت دی تاکہ وہاں مستقل طور سے جمعیت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس سے آگے خود مولانا کے الفاظ کا مطالعہ کیجیے۔ فرماتے ہیں۔

”اسی امید پر میں ان دونوں صاحبوں (مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید) کو جمعیت علما کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے امرتسر آنے کی دعوت دے آیا تاکہ امرتسر میں اعیان اسلام سے جمعیت علما میں شرکت کی تحریک کی جائے۔ اسلامیہ ہائی اسکول کی ایک کوٹھڑی میں ان دونوں صاحبوں کے قیام کا انتظام کیا گیا۔ ان کے ساتھ تیسرا امیں (داعی) تھا۔ یہ کوٹھڑی کیا تھی گویا غار ثور کا نمونہ تھی۔ ہاں ان دونوں مقاموں میں امتیاز یہ تھا کہ وہاں دو پاک ہستیاں تشریف فرما تھیں اور یہاں تین گنہگار مغفرت کے امیدوار بیٹھے تھے۔ جمعیت کی اسی شوریٰ کے اجلاس میں پہلا ریزولیشن مولانا محمود حسن مرحوم نور اللہ مرقدہ کے

متعلق پاس ہوا"۔(یعنی ان کی رہائی کے متعلق)

اس سے آگے فرماتے ہیں: "ان اصحاب ثلاثہ میں سب سے پہلے یہ تجویز پاس ہوئی کہ حضرت ممدوح کی رہائی کے لیے وائسرائے کو تار دیا جائے' تار کے خرچ کا اندازہ تین روپے کیا گیا۔ یہاں پہنچ کر میں بڑی مسرت کے ساتھ یہ بات ظاہر کرتا ہوں کیونکہ میں اس امر کو اپنے لیے باعث عزت اور موجب فخر جانتا ہوں کہ تار کا سارا خرچ میں نے ادا کیا"۔

اندازہ کیجیے تین روپے کی اس زمانے میں کتنی قیمت تھی۔ اسے ایک اچھی خاصی رقم سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ کلرک کی تنخواہ اس وقت چھ سات روپے تھی۔ اس عہد میں تین روپے خرچ کرنا بہت بڑی بات تھی۔

جمعیت علمائے ہند کا دوسرا سالانہ اجلاس آئندہ سال ۱۹'۲۰'۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں منعقد ہوا۔ اس اثنا میں مولانا محمود حسن رہا ہو چکے تھے اور انہی نے اس کی صدارت فرمائی تھی۔ اس اجلاس میں ملک کے طول و عرض سے پانچ سو سے زائد علمائے کرام شریک ہوئے' جن میں مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا محمد فاخر الہ آبادی' مولانا عبداللہ الکافی' مولانا حبیب الرحمان' مولانا ابوالقاسم بنارسی' مولانا عبدالحلیم صدیقی' مولانا عبدالباری فرنگی محلی' مولانا آزاد سبحانی' مولانا عبدالماجد بدایونی' مولانا محمد جونا گڑھی' مولانا سید محمد داؤد غزنوی' مولانا عبداللہ الباقی' حکیم حافظ محمد اجمل خاں' مولانا مفتی کفایت اللہ' مولانا احمد سعید دہلوی' مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری' مولانا محمد اکرم خاں' مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا محمد علی ایم۔ اے کینٹب قصوری شامل تھے۔ رحمہم اللہ اجمعین۔

امرتسر کے اجلاس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری' مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا آزاد سبحانی کی تحریک و تائید سے انگریزی حکومت کے خلاف نہایت زوردار قرار دادیں منظور کی گئیں' جن میں انگریز سے کلی طور پر ترک موالات اور عدم تعاون کی مشہور و معروف اور معرکہ آرا قرار دادیں شامل ہیں۔

مولانا امرتسری مرحوم کے حالات کے ضمن میں یہ سطور قدرے تفصیل سے اس لیے معرض تحریر میں لائی گئی ہیں کہ مولانا مرحوم مسلکی تعصب سے بالکل پاک اور علما کے اتفاق واتحاد کے زبردست حامی تھے۔ چنانچہ برصغیر کے علمائے کرام کی بہت بڑی جماعت "جمعیت

علمائے ہند" انہی کی تحریک و تجویز سے معرض قیام میں آئی جس کے بنیادی مقاصد میں علمائے ہند کو منظم و متحد کرنا تھا۔ اب تاریخ کو بگاڑ کر بعض دیوبندی حضرات اس کے قیام کو اپنی طرف منسوب کر رہے ہیں' حالاں کہ اس کے قیام کی تحریک و تجویز میں کہیں ان میں سے کسی بزرگ کا نام نہیں آتا۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس ملک سے انگریزوں کے نکل جانے سے متعلق پہلی آواز جمعیت علمائے ہند کے بانی علمائے دین نے اٹھائی تھی اور اس موضوع کی قرارداد انہی بوریانشینوں کے (پہلے) جلسے میں بمقام امرتسر پاس کی گئی تھی۔

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مسلم لیگ کے اس اجلاس کے جو انہی دنوں امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا' حکیم اجمل خاں صدر اور مولانا ثناء اللہ امرتسری صدر استقبالیہ تھے ------ اجلاس عام میں مولانا نے جو خطبہ استقبالیہ پڑھا تھا' وہ مطبوعہ صورت میں اب بھی موجود ہے اور قیام جمعیت علمائے ہند کے سلسلے کی ابتدائی رودادیں بھی موجود ہیں اور اس میں جو علمائے کرام شامل ہوئے تھے' ان کے اسمائے گرامی ان رودادوں میں مرقوم ہیں۔

اسی زمانے میں آل انڈیا مجلس خلافت کا جلسہ امرتسر میں ہو رہا تھا۔ آل انڈیا نیشنل کانگرس کا اجلاس بھی وہیں ہوا تھا۔ مجلس خلافت کے اجلاس کی صدارت مولانا محمد علی جوہر نے اور کانگرس کے اجلاس کی صدارت پنڈت موتی لال نہرو نے کی تھی۔

سیاسی اعتبار سے وہ بڑا پر آشوب زمانہ تھا' اس وقت تمام سیاسی جماعتوں کے اجلاس ایک ہی موقعے پر ہوئے تھے اور ایک ہی شہر امرتسر میں ہوئے تھے۔ ان اجلاسوں میں برصغیر کی تمام سیاسی جماعتوں کے بڑے بڑے قائدین نے شرکت کی تھی اور یہ اجلاس بے حد کامیاب رہے تھے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب کا امرتسر میں بہت بڑا کتب خانہ تھا' جس میں دو قسم کی کتابیں تھیں۔ ایک ان کی اپنی تصنیفات اور دوسری دیگر اہل علم کی تصنیفات۔ ان میں تفسیر' حدیث' شروح حدیث' فقہ و اصول' منطق و فلسفہ' ادبیات اور تاریخ و سیرت' ہر قسم کی کتابیں موجود تھیں۔ پھر مختلف مذاہب کے متعلق بہت بڑا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا' جس سے وہ تحریر و تقریر اور مناظرات و مباحث میں کام لیتے تھے' وہ سب اگست ۱۹۴۷ء میں ضائع ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

اس زمانے میں یہ بات سننے میں آئی تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا ثناء اللہ کے کتب خانے کی حفاظت کے لیے کچھ لوگوں کو امرتسر بھیجا تھا' مگر ان کے آنے سے پہلے ہی تمام کتب خانہ ضائع ہو چکا تھا۔

ابتدا میں ان کے اخبارات و تالیفات دوسروں کے مطبعوں میں چھپتے تھے' اس کے بعد انھوں نے "اہل حدیث پریس" کے نام سے اپنا ایک چھوٹا سا چھاپہ خانہ قائم کر لیا تھا' مگر وہ چل نہ سکا۔ پھر ۱۹۳۰ء میں "ثنائی برقی پریس" کے نام سے ایک مطبع قائم کیا جو بڑا کامیاب رہا۔ اس زمانے میں بجلی کے ذریعے پریس چلانا بہت بڑی بات تھی' جس میں اللہ نے ان کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔

ثنائی برقی پریس میں مولانا کی تصنیفات بھی شائع ہوتی تھیں اور ان کا اخبار "اہل حدیث" بھی چھپتا تھا۔ اس کے علاوہ باہر کا کام بھی بکثرت طباعت کے لیے آتا تھا۔ پریس کا اہتمام مولانا کے بیٹے مولوی عطاء اللہ مرحوم کے سپرد تھا۔ مرحوم نے اس کو خوب ترقی دی۔ یہ پریس ابتداے اگست ۱۹۴۷ء تک (سترہ سال) ان کے اہتمام میں جاری رہا۔

مولانا ثناء اللہ مرحوم اپنی بوقلموں خوبیوں کی بنا پر ہر طبقہ و خیال کے لوگوں میں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بذلہ سنجی اور ظرافت میں بے نظیر تھے۔ ان کا کمال یہ تھا کہ ہر بات میں لطیفہ پیدا کر لیتے تھے۔ اس اسلوب میں زبان و قلم کو حرکت دیتے کہ خود حریف اس پر خوش ہوتا اور ان کے طرز کلام کی داد دیتا۔ برمحل قرآن کی آیات' احادیث اور شعر پڑھنے میں ان کو ملکہ کمال حاصل تھا۔

مہمان نواز' غریبوں کے ہمدرد' مستحقین کے معاون اور یتیموں' مسکینوں اور بیواؤں کے مددگار تھے۔ غیر مسلم بیوہ عورتوں اور غریبوں کی بھی مالی اعانت کرتے تھے۔ چھوٹے پر شفقت فرماتے اور بڑے کے احترام کی تلقین کرتے۔ لوگوں کی دعوت میں شریک ہوتے اور خود بھی ان کو اپنے ہاں بلاتے۔ غیر مسلموں کی دعوت میں بھی شرکت کرتے۔ ان کے مذہبی جلسوں میں جاتے اور ان کے مقررین کی تقریریں سنتے۔

اللہ نے ان کو اطمینان و سکون کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ عبوست و یبوست سے کوسوں دور تھے۔ خشکی اور تنگ نظری قسم کی کسی شے سے ان کا ذہن آشنا نہ تھا۔ علمی اور سماجی حلقوں کے چھوٹے بڑے اکثر لوگ ان کے پاس آتے اور وہ سب سے خندہ پیشانی سے

ملتے اور ان کے فکری پیمانے اور ذہنی سطح کے مطابق ان سے گفتگو کرتے۔ نہ ان سے کسی کو شکایت تھی اور نہ وہ کسی سے شاکی تھے۔

کھانے پینے' پہننے اور رہن سہن میں اقتصاد و اعتدال کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ علمی معاملے کے اختلاف کو اس کی حد تک محدود رکھتے' آگے بالکل نہ بڑھاتے' نہ اسے کوئی ذاتی مسئلہ بناتے۔

متحدہ ہندوستان کی مشہور انجمنوں اور اداروں کی مجالس انتظامیہ کے رکن تھے اور ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ندوۃ العلماء (لکھنو) اور انجمن حمایت اسلام (لاہور) اس دور کے ممتاز علمی اور تعلیمی ادارے تھے جو اب بھی برصغیر میں موجود ہیں' ندوۃ العلما ہندوستان میں اور انجمن حمایت اسلام پاکستان میں ----- مولانا ثناء اللہ کو ان دونوں کی رکنیت کا اعزاز حاصل تھا۔

انتہا درجے کے امین تھے۔ بہت سے لوگ اپنی امانتیں (نقدی اور زیورات کی صورت میں) ان کے پاس رکھ جاتے تھے اور وہ اسی طرح پڑی رہتی تھیں اور پھر اسی طرح واپس کر دی جاتی تھیں' جس طرح ان کے پاس آئی تھیں۔

ان کا طریق تبلیغ سب سے نرالا اور خالص حکیمانہ تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ ان کے ہاں امرتسر میں کوئی اجتماع تھا' جس میں بہت سے علما و زعما تشریف لا رہے تھے۔ وہ میزبان کی حیثیت سے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی تشریف لائے تھے۔ مولانا ثناء اللہ مصافحے کے لیے ان کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ ان کا پاجامہ ٹخنوں سے ذرا نیچے ہے۔ مصافحہ کرتے ہوئے ان کے پائنچے کو ہاتھ لگا کر فرمایا:

آپ کے پاجامے کا یہ حصہ جو آپ کے جوتے کو مس کر چکا ہے' بڑا متبرک ہے۔ یہ مجھے عنایت کر دیا جائے تو میں اس سے اپنی ٹوپی بنا لوں۔

مولانا ظفر علی خاں اس فرمائش کا پس منظر سمجھ گئے اور معذرت کرتے ہوئے پاجامہ ٹخنوں سے اونچا کر لیا۔

جماعت علما میں مولانا ثناء اللہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ صاحب جود و سخا تھے اور بہت سے لوگوں کی ظاہری یا خفیہ طور سے مالی مدد کرتے تھے۔ اس ضمن کے متعدد واقعات ان سے مسلکی اختلاف رکھنے والے حضرات بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ مخالفین بلکہ

معاندین کو بھی تکلیف کے وقت مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۹۳۷ء میں ایک شخص قمر بیگ نے (جس کی تفصیل آگے آئے گی) مولانا پر قاتلانہ حملہ کیا۔ ملزم گرفتار کر لیا گیا اور اسے چار سال کی سزا ہوئی۔ اس کے بیوی بچوں کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ مولانا کو پتا چلا تو سخت افسوس کا اظہار کیا اور اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے ذریعے پچاس روپے ماہانہ خفیہ طور سے اس کے گھر پہنچاتے رہے۔ فرماتے تھے اگر کوئی غلطی کی ہے تو قمر بیگ نے کی ہے' اس کے بیوی بچوں کا تو کوئی قصور نہیں' ان کی بہر حال مدد ہونی چاہیے۔ قمر بیگ رہا ہو کر آیا تو دیکھا کہ گھر کی حالت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ بیوی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ فلاں ڈاکٹر صاحب پچاس روپے ماہانہ دیتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ پچاس روپے مولانا ثناء اللہ صاحب عنایت فرماتے تھے تاکہ اس کے اہل خانہ مالی پریشانی میں مبتلا نہ ہوں۔ انھوں نے تاکید کی تھی کہ ان کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔

یہ سن کر قمر بیگ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے فعل پر اظہار ندامت کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ امرتسر سے ملتان چلا گیا تھا۔ ملتان ہی میں اس کا انتقال ہوا۔

مولانا کے جود و سخا کا ایک واقعہ مولانا محمد بخش مسلم مرحوم نے سنایا جو احناف کے بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ سید حبیب بیمار ہو گئے اور کئی دن صاحب فراش رہے۔ وہ مسلکاً بریلوی تھے اور روزنامہ "سیاست" کے مالک اور ایڈیٹر تھے جو لاہور سے شائع ہوتا تھا اور اپنے زمانے کا مشہور اخبار تھا۔ خود سید صاحب کی ملک کے سیاسی و مذہبی حلقوں میں بڑی شہرت تھی۔

سید حبیب فقہی مسلک کے اعتبار سے مولانا ثناء اللہ کے مخالف تھے اور اخبار میں سلسلہ بحث جاری رہتا تھا۔ مولانا کو ان کی بیماری کا پتا چلا تو عیادت کے لیے لاہور تشریف لائے اور ان کے مکان پر پہنچے۔ مولانا محمد بخش مسلم نے بتایا کہ اس وقت وہ بھی سید حبیب کے پاس موجود تھے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب نے مزاج پرسی کی' چند منٹ ان کے پاس بیٹھے اور پھر بقول مولانا محمد بخش مسلم کے ان دونوں سے نظر بچا کر چپکے سے ایک لفافہ سید حبیب کے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ لیکن سید صاحب کو اس کا پتا چل گیا اور بات ظاہر ہو گئی۔ سید صاحب نے

شکریہ ادا کیا اور لفافہ واپس کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مولانا نے ان کے لیے دعا کی۔ انھیں تسلی دی اور اصرار کیا کہ وہ لفافہ رکھ لیں۔ سید صاحب نے لفافہ کھولا تو اس میں سو روپے کے نوٹ تھے۔ یہ ۱۹۳۰ء یا اس سے لگ بھگ کی بات ہے اور سو روپے کی رقم اس دور میں بہت بڑی رقم تھی۔ بلکہ سو روپے والے بعض ایسے لوگ بھی تھے جو عام آدمیوں سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔

مولانا محمد بخش مسلم کا بیان ہے کہ تھوڑی دیر بعد میں اور مولانا ثناء اللہ دونوں سید حبیب کے گھر سے نکلے۔ دونوں کو لوہاری دروازے جانا تھا۔ تانگہ آیا تو مولانا نے کوچوان سے دو آدمیوں کا لوہاری دروازے کا کرایہ پوچھا۔

اس نے جواب دیا: ایک سواری کا ایک آنہ' دو کے دو آنے۔

مسلم صاحب کہتے ہیں' میں نے عرض کیا' وہاں آپ سو روپیہ دے آئے اور یہاں غریب تانگے والے سے کرایہ پوچھ رہے ہیں' یہ ایک آنہ نہیں تو ڈیڑھ آنہ لے لیتا۔

فرمایا' وہ اللہ کا معاملہ تھا' اس میں نہ حساب کی ضرورت تھی نہ کچھ طے کرنے کی۔ یہ بندوں کا معاملہ ہے' بندوں سے جو معاملہ کیا جائے' وہ پہلے طے کر لینا چاہیے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔ وہ کہے اتنے پیسے لوں گا' میں کہوں اتنے دوں گا۔

بارہا ایسا ہوا کہ کسی جگہ کی انجمن یا کسی دینی جماعت کو' وہ ان کے مسلک کے حاملین کی ہو یا کسی دوسرے مسلک کی' اشتہارات یا تبلیغی رسائل چھپوانے کی ضرورت پڑی اور بات مولانا کے علم میں لائی گئی' انھوں نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا' اس کی کتابت کرائی۔ کاغذ خریدا' اسے اپنے پریس سے چھپوایا اور کام مکمل کر کے متعلقہ پارٹی کے حوالے کیا۔ کسی سے ایک پیسہ وصول نہیں کیا۔

ان ہونہار اور ذہین طلبا کی امداد فرماتے جو ناداری و غربت کی وجہ سے تعلیمی اخراجات کے متحمل نہ ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو وسعت مال و دولت سے بھی نوازا تھا اور وسعت قلب و جگر سے بھی۔

آزادی سے قبل ضلع لاہور میں ایک قصبے کا نام "پٹی" تھا' جو آزادی کے بعد ہندوستان میں شامل ہوا اور ضلع امرتسر میں آیا۔ وہاں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے۔ متعدد علمائے کرام بھی وہاں فروکش تھے اور لوگوں کی مالی حالت بھی اچھی تھی۔

میرے دوست مولانا عبدالعظیم انصاری نے جو اصلاً وہیں کے رہنے والے ہیں اور تقسیم ملک کے بعد سے قصور میں مقیم ہیں، بتایا کہ پٹی کی انجمن کے سالانہ جلسے میں مولانا ثناء اللہ صاحب کو دعوت دی جاتی تھی اور وہ تشریف لے جاتے تھے، لیکن کرایہ وغیرہ کے سلسلے میں انجمن سے کوئی پیسہ وصول نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنی جیب سے انجمن کو پیسے دیتے تھے۔

انصاری صاحب نے بعض مقامات کے بارے میں بتایا کہ وہاں کے لوگوں کی دعوت پر یا از خود مولانا وہاں جاتے، تقریر کرتے، منتظمین سے اس نواح کے حالات پوچھتے اور ان کی مالی مدد کرتے۔

قیام جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کے ابتدائی دور میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس شوریٰ نے مولانا ثناء اللہ صاحب کی یادگار کے طور پر جامعہ سلفیہ میں ''ثنائی ہال'' تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو تعمیر کر لیا گیا تھا اور کچھ عرصہ اس کا نام ثنائی ہال رہا۔ بعدازاں معلوم نہیں کیوں اس کا نام بدل کر اسے مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی طرف منسوب کر کے شہید ہال کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ پھر اس کی نسبت شاہ فیصل شہید کی طرف کر دی گئی اور اس کا نام فیصل ہال رکھ دیا گیا۔ اس میں کوئی راز ہی کار فرما ہو گا۔ رموز سلطنت خسرواں دانند۔ ممکن ہے یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ شاہ فیصل شہید کی طرف پورے شہر فیصل آباد کی نسبت کافی نہیں تھی، اس میں جماعت اہل حدیث کی دینی درس گاہ کے ایک کمرے کا نام فیصل ہال رکھنا بھی ضروری تھا۔

کہتے ہیں مولانا نے اپنے دفتر میں چائے کی کیتلی بھی رکھی تھی اور کوئلے کی انگیٹھی بھی۔ چائے پینے والے مہمان کو فوراً چائے بنا کر پیش کرتے اور اگر کوئی مہمان ٹھنڈے مشروب کا طالب ہوتا تو اس کے لیے شربت یا لسی منگواتے۔

اپنے محلے کی مسجد میں وہ جمعہ پڑھاتے تھے۔ موسم گرما میں جمعے کے روز مسجد میں ٹھنڈے پانی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ برف اپنی گرہ سے منگواتے تھے۔ بڑے سے برتن پر مٹی کے آب خورے رکھ دیے جاتے اور لوگ اس سے پانی پیتے۔ عورتیں بھی جمعہ پڑھنے اور خطبہ سننے آتی تھیں، ان کے لیے پانی کا انتظام الگ کیا جاتا تھا۔

خطبہ جمعہ میں دنیا کی ناپائیداری کا ذکر آتا اور موت و حیات کی بات شروع ہو جاتی تو ترنم سے یہ شعر پڑھتے۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

اسی قسم کا ایک شعر پنجابی کا ہے' جس کا ایک مصرع یہ ہے۔

ماں آکھے پت گھبرو ہویا عمر گھٹیندی جاوے

ان کی آواز گرجدار' بارعب اور خطیبانہ تھی۔ گفتگو اور سوال و جواب میں کسی کے قابو میں نہیں آتے تھے' بڑے سے بڑے اعتراض کو چٹکیوں میں اڑا دیتے اور لطیفے کے انداز میں حریف کو چند لمحوں میں خاموش کرا دیتے۔

وہ لمبی بات کو خوب صورت الفاظ میں اختصار سے بیان کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔

مولانا کے بارے میں ایک تحریر مولانا دین محمد وفائی کی بھی پڑھ لیجیے-----

مولانا دین محمد وفائی صوبہ سندھ کے معروف عالم و مصنف' ادیب' صحافی اور سیاسی لیڈر تھے۔ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ آزادی ملک کی تمام تحریکوں میں حصہ لیا اور بڑی ◻ اٹھائیں----- ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۱۱ھ (۱۳ اپریل ۱۸۹۴ء) کو گوٹھ گھٹی عرف نبی آباد تعلقہ گڑھی یاسین (ضلع سکھر' سندھ) میں پیدا ہوئے اور ۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۹ھ (۱۱ اپریل ۱۹۵۰) کو وفات پائی۔ ۱۹۴۲ء میں ۳۰ مارچ سے ۱۸ مارچ تک انھوں نے ملک کے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ اس سفر میں وہ لاہور اور امرتسر بھی تشریف لائے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ملے۔ غزنوی حضرات کے بارے میں ان کے تاثرات اس مضمون میں بیان کر دیے گئے ہیں جو "نقوش عظمت رفتہ" میں مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ ذیل میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری سے متعلق ان کی تحریر درج کی جا رہی ہے۔ یہ تحریر ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کی مرتب کردہ کتاب "مولانا دین محمد وفائی" سے لی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے ملک کے معروف مصنف' مشہور تجزیہ نگار اور صاحب تحقیق عالم ہیں-----اب مولانا وفائی کی تحریر ملاحظہ ہو۔

"امرتسر کے مختصر دورے میں ہندوستان کے مشہور مناظر و متکلم مولانا ثناء اللہ صاحب سے بھی ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ مولانا صاحب سے میری کئی برسوں سے شناسائی ہے' مولانا اخبار "اہل حدیث" کے دفتر میں موجود تھے اور آپ دو ڈیسکوں کے بیچ میں ٹیک لگائے کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ دوسرا عملہ بھی نیچے گدیلوں پر کام

میں مصروف تھا- دفتر کا کام مولانا صاحب کے پوتے مولوی ضیاء اللہ کے سپرد تھا- وہ جامعہ رحمانیہ (دہلی) سے حال ہی میں فارغ التحصیل ہو کے آئے تھے- مولانا صاحب سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی- اس کے بعد مولانا اپنی رہائش گاہ پر لے گئے جہاں کتب خانہ بھی ہے، جس میں جدا جدا علوم کی الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی ہیں- مولانا ثناء اللہ صاحب ہندوستان میں ایک منطقی، متکلم، صاحب قلم اور مناظر کی حیثیت سے مشہور ہیں- انھوں نے آریوں، قادیانیوں، شیعوں اور بدعتیوں سے مناظروں کی پورے ہندوستان میں دھاک بٹھا رکھی ہے- ان کی تحریر کا ایک خاص انداز ہے، وہ اتنے مختصر اور پر معنی ایک دو جملوں میں ایسا جامع جواب لکھتے ہیں کہ کوئی اور بیس سطروں میں بھی نہیں لکھ سکے گا- مجھے اپنے کام کرنے کے خاص کمرے میں لے گئے، جہاں ان کی ضرورت کی اور اہم کتابیں رکھی ہوئی ہیں جو اکثر زیر مطالعہ رہتی ہیں- انھوں نے مجھے اپنی کتاب تفسیر بالرای کا ایک نسخہ عنایت فرمایا اور اس پر اپنے قلم سے یہ الفاظ تحریر کیے، ہدیہ مولانا دین محمد وفائی کراچی- الہدیٰ ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری-----

"مولانا ثناء اللہ صاحب سے میری اتنی مفصل ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی- اس ملاقات میں پتا چلا کہ سراپا علم اور مجسم مناظرہ ہیں- ان کی عمر تقریباً ۷۵ برس کی ہے- مولانا صاحب ایک بہت مال دار آدمی ہیں- امرتسر میں ان کے کئی مکان ہیں، جن کا کئی سو روپے ماہوار کرایہ آتا ہے- کتابوں کی فروخت سے بھی معقول آمدنی ہوتی ہے- کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۲۵ ہزار روپے نقد جمع ہیں- یہ سب کچھ اپنی محنت اور ہمت سے کمایا ہے- وہ زندگی میں کسی کے محتاج نہیں- اولاد کی طرف سے بھی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں- ان کے فرزند مولوی عطاء اللہ نے جو ان کے واحد بیٹے ہیں پریس کا کام سنبھال لیا ہے گویا مال اور اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس محدث پر اپنی تمام نعمتیں ختم کر دی ہیں- اسلام کی مدافعت اور مخالفوں کے اعتراضات کے جوابوں کے لیے سر زمین ہند میں مولانا ثناء اللہ صاحب کا دم غنیمت ہے- اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے-"

اسلام کے اس خادم پر ۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو خود ان کے شہر امرتسر میں قاتلانہ حملہ ہوا، جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی کو تو محفوظ رکھا، لیکن زخم نہایت شدید آئے- شرح اس متن کی یہ ہے کہ امرتسر کے ایک مذہبی فرقے کی طرف سے یکم، ۲، ۳ نومبر ۱۹۳۷ء کو ایک جلسہ عام

منعقد کیا گیا تھا- اس میں بعض مقرروں نے اہل حدیث کے خلاف تقریریں کیں' بالخصوص مولانا کا نام لے کر جوش جذبات میں کئی ایسی باتیں کہہ دیں' جن سے اشتعال پھیل گیا-

جلسے کے دوسرے دن یعنی ۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو ان الزامات کا جواب دینے کی غرض سے جو ایک فرقے کے مقرروں کی طرف سے عائد کیے گئے تھے' وہاں کی مسجد مبارک میں جلسے کا اہتمام کیا گیا تھا- جلسے میں شرکت و تقریر کے لیے نماز عصر کے بعد چار بجے کے قریب مولانا ثناء اللہ مرحوم اپنے پوتے مولوی رضاء اللہ اور بعض دیگر حضرات کے ساتھ بذریعہ تانگہ مسجد کو روانہ ہوئے- جب تانگہ مسجد مبارک کے قریب پہنچا اور مولانا نے تانگے سے اتر کر ایک شخص ڈاکٹر محمد اسحاق سے مصافحہ کیا تو اچانک قمر بیگ نامی ایک نوجوان نے تیز دھار تبر (گنڈاسے) سے مولانا پر حملہ کر دیا- ضرب اتنی شدید تھی کہ عمامہ و کلاہ کٹ گئے اور سر مبارک سخت زخمی ہو گیا اور تیزی سے خون بہنے لگا- اتنے میں حملہ آور نے دوسرا وار کیا جو ان کے چہرے اور پیشانی پر پڑا-

مولانا زمین پر گر پڑے' پھر فوراً سنبھلے اور اٹھ کر بیٹھ گئے- زخموں سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے اور تمام جسم اور لباس لہو سے سرخ ہو گیا تھا- اس حالت میں جو پہلا جملہ ان کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا-

"فزت ورب الكعبة"

"رب کعبہ کی قسم میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا-"

اس کے بعد عربی کا یہ شعر پڑھا ؎

هل انت الا اصبع دميت
في سبيل الله ما لقيت

خون کی کثرت دیکھ کر بار بار یہ دعا کرتے تھے-

"اللهم احشرني في المقتولين"

"اے اللہ! قیامت کے دن میرا حشر شہیدوں کے ساتھ کیجیو-"

ایک روایت کے مطابق یہ شعر بھی پڑھا ؎

اگر آں صنم زیر ستم پئے کشتن من بے گناہ
لقد استقام بسيفه ولقد رضيت بما رضا

حملہ آور بھاگ گیا اور پولیس نے ڈاکٹری معائنے کے بعد رپورٹ درج کر لی' مگر ملزم چوں کہ روپوش تھا اور تلاش کے باوجود پولیس کو نہیں مل سکا تھا' اس لیے مقدمہ نہ چل سکا۔ آخر کچھ عرصے کے بعد وہ کلکتے سے پکڑا گیا اور ۲۷ جنوری ۱۹۳۸ء کو پولیس اسے امرتسر لائی۔ مقدمہ چلا اور ۱۶ اپریل ۱۹۳۸ء کو اسے چار سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اس اثنا میں مولانا صحت یاب ہو چکے تھے۔ مولانا کا یہ مقدمہ میاں عبدالعزیز مالواڈہ نے لڑا تھا اور اس کی فیس نہیں لی تھی۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ حملہ آور قمر بیگ کے خلاف مولانا مقدمہ دائر کرنے کے حق میں نہیں تھے' لیکن جب ملزم روپوش ہو گیا تو مختلف تنظیموں نے ہندوستان کے طول و عرض میں جلسے اور میٹنگیں کر کے اس فعل شنیع کی مذمت کی اور حکومت سے ملزم کی گرفتاری اور اسے قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کیا اور بے شمار مقامات سے متعلقہ حکام کو تاریں دی گئیں۔ اس کے نتیجے میں پولیس مزید حرکت میں آئی' ملزم گرفتار ہوا اور عدالت کی طرف سے مستوجب سزا ٹھہرا۔

صحت یاب ہونے کے بعد اپریل ۱۹۳۸ء میں مولانا نے توحید و سنت کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی غرض سے ایک رسالہ "نور توحید" لکھا اور ہزاروں کی تعداد میں چھاپ کر مفت تقسیم کیا۔ اس رسالے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"اپریل ۱۹۳۸ء میں میری عمر ستر سال کی ہو گئی۔ حدیث میں آیا ہے۔

**اعمار امتی ما بین الستین الی السبعین واقلهم من یجاوز ذالك**۔(ترمذی)

"یعنی میری امت کے لوگوں کی عمریں ساٹھ ستر سال کے درمیان ہیں' کم تر لوگ اس سے زیادہ عمر پائیں گے۔"

فرماتے ہیں:

"میرے بعض "عنایت فرماؤں" نے چاہا کہ میں اس حدیث کے ماتحت بذریعہ شہادت دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ چنانچہ ۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو ایک نوجوان سے حوروں کا وعدہ دے کر مجھ پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا' جس کی تفصیل رسالہ "شمع توحید" میں لکھ چکا ہوں' مگر قدرت کو منظور تھا کہ میں حدیث کے آخری فقرے میں رہوں۔ اس لیے احباب کی تمناؤں اور دعاؤں سے زندہ ہوں۔"

مولانا مرحوم ٹھنڈے دل کے مالک تھے۔ انتقام کا جذبہ ان کے قلب و ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس شخص نے ان پر قاتلانہ حملہ کیا اس کے ایام اسیری میں اس کے بیوی بچوں کے لیے پچاس روپے ماہانہ خفیہ طور سے اس کے گھر پہنچاتے رہے۔ کیا اس قسم کی مثال کہیں مل سکتی ہے؟ اس دنیا میں مختلف مسالک فقہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار علما موجود ہیں' سیاسی لیڈروں کی بھی کمی نہیں جو بہت سی جماعتوں سے وابستہ ہیں' رفاہ عامہ میں دلچسپی لینے والے بھی ہر جگہ بکثرت مل جاتے ہیں' لیکن مولانا ثناء اللہ جیسا صاف دل' جرات مند' سچا اور سُچا آدمی کہیں نہیں ملے گا جو قتل کے ارادے سے حملہ کرنے والے کے اہل و عیال کی باقاعدہ مدد کرتا ہے۔

آج کل کے کسی عالم یا سیاسی رہنما کے جلسے میں کوئی شخص سبزی کاٹنے والا چاقو لے کر بھی چلا جائے تو دھر لیا جاتا ہے اور شور بپا ہو جاتا ہے کہ قتل کی نیت سے آیا تھا اور فلاں پارٹی نے فلاں آدمی کو قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا' وہ تو اللہ نے مہربانی کی کہ وہ بچ گیا' ورنہ اس کا ارادہ انتہائی خطرناک تھا۔ اس قسم کے تمام لوگ مل کر بھی مولانا ثناء اللہ صاحب کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ وہ غایت درجہ جری' بہادر اور فراخ حوصلہ تھے۔

آزادیٔ وطن سے کچھ عرصہ پہلے مولانا گر پڑے تھے اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ بہت علاج کرایا گیا لیکن افاقہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق بیساکھیوں پر چلنے لگے تھے۔ جناب محمد فاروق قریشی صاحب نے بتایا کہ اس زمانے میں مولانا نے سائیکل رکشا بنالیا تھا۔ فاروق قریشی کی عمر اس وقت چودہ پندرہ سال کی تھی۔ ایک اور لڑکا تھا جس کا نام غالبا" بشیر تھا' اس وقت کا وہ لڑکا اب ستر برس کی عمر کو پہنچ کر بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ بقول فاروق صاحب کے بشیر صاحب منڈی وار برٹن میں نیاری کی دکان کرتے ہیں۔ یہ دونوں مولانا کو سیر کرانے پر مامور تھے۔ کبھی فاروق سائیکل رکشا چلاتے اور بشیر مولانا کے ساتھ پیچھے بیٹھتے تھے۔ کبھی بشیر یہ خدمت انجام دیتے اور فاروق' مولانا کے ساتھ پیچھے بیٹھتے تھے۔ بعض اوقات خود مولانا ان دونوں میں سے کسی کو حکم دیتے کہ اب تم رکشا چلاؤ۔ مسجد کے اندر یا مسجد کے صحن میں مولانا بیساکھیوں پر گھومتے تو فاروق ان کے ساتھ ساتھ چلتے۔ ہر روز کی اتنی بڑی خدمت کا اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ضرور اجر عطا فرمائے گا اور ان کی لغزشیں ان شاء اللہ بارگاہ الٰہی سے معاف فرما دی جائیں گی۔

فاروق صاحب نے بتایا کہ مولانا نے گھر میں بھینس رکھی تھی' وہ خود تو صبح کو چائے پیتے تھے لیکن ان (فاروق) کو چائے نہیں پینے دیتے تھے' انھیں لسی پلاتے اور کھانے کو مکھن عنایت فرماتے۔

فاروق قریشی کے دادا مولوی محمد امین اور والد عبدالقیوم صاحب اور دیگر افراد خانہ مولانا کے عقیدت مند تھے۔ یہ حضرات انھی کی مسجد میں نماز پڑھتے اور ان کے خطبہ جمعہ اور درس قرآن میں بالالتزام شریک ہوتے تھے۔ قرآن مجید' سلسلہ درس میں ختم ہوتا یا رمضان کی تراویح میں' مولانا اس کا خاص اہتمام کرتے۔ اس وقت کھانے پینے کا مسجد میں وسیع پیمانے پر انتظام ہوتا اور خشوع و خضوع سے دعا مانگی جاتی۔

مولانا کو بہت سے اخبارات ان کے اخبار "اہل حدیث" کے مبادلے میں آتے تھے' جو نہیں آتے تھے وہ مولانا خود خریدتے تھے اور سب اخبار فاروق صاحب سے سنتے تھے' جن میں اردو کے تمام روزانہ اخبار شامل تھے۔ ہندو اخبارات مذہبی نوعیت کے ہوں یا سیاسی قسم کے' وہ خاص طور سے خریدے اور غور سے سنے جاتے تھے' ان کے مندرجات میں سے جن باتوں کا جواب دینا ضروری سمجھتے ان پر نشان لگا لیتے۔

ان کے لکھنے اور جواب دینے کا انداز بہت پیارا تھا' چھوٹے چھوٹے جملوں اور ہلکے پھلکے اسلوب میں ایسی باتیں لکھتے تھے جو آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی تھیں۔

آزادیٔ وطن سے دو سال پہلے ۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے "مسلک اعتدال" کے بارے میں جس کا تعلق حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے' اخبار "اہل حدیث" کے کئی شماروں میں لکھا تھا۔ اس کا جواب مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف مرحوم نے دیا تھا جو اس وقت جماعت اسلامی میں نئے نئے شامل ہوئے تھے۔ جواب بھی چار پانچ قسطوں میں چھپا تھا۔ پھر مولانا عبدالرحیم اشرف کے مضمون کا جواب مولانا محمد اسماعیل مرحوم و مغفور نے تحریر فرمایا تھا' یہ بھی متعدد قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ یہ سلسلہ بڑا دلچسپ تھا اور میرے خیال میں مولانا مودودی کے بعض افکار سے متعلق یہ پہلی اخباری بحث تھی' جس کا آغاز مولانا ثناء اللہ صاحب نے کیا تھا۔ یہ سب حضرات یکے بعد دیگرے سفر آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

مولانا لطیفے اور طنز کے بادشاہ تھے' لطیفہ بیان کرنے والا دراصل دوسرے کو دعوت

دیتا ہے کہ وہ بھی اسے کسی لطیفے کی زد میں لائے اور جس طرح اس نے لطیفے کی صورت میں ایک بات کہی ہے' اسی طرح اس کا جواب دیا جائے۔

مولانا حافظ عبداللہ روپڑی کے اخبار ہفت روزہ "تنظیم اہل حدیث" میں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہتا تھا۔ وہ بھی ان کے متعلق لکھتے رہتے تھے۔ یعنی دونوں طرف سے یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولانا کی حس ظرافت پھڑکی تو انھوں نے لفظ "روپڑی" کو اس کے لغوی معنی "روپڑی" میں بدل ڈالا۔

اب تو روپڑ مشرقی پنجاب کا ایک ضلع ہے۔ اس زمانے میں یہ شہر ضلع انبالہ میں شامل تھا اور اسے تحصیل کا درجہ حاصل تھا' ریاست کی چار تحصیلیں تھیں۔

(۱) انبالہ (۲) جگادھری (۳) نرائن گڑھ اور (۴) روپڑ۔۔۔۔۔!

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری دونوں جلیل القدر عالم تھے' دونوں بہت سی کتابوں کے مصنف تھے' دونوں کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا اور دونوں کو جماعت اہل حدیث سے تعلق رکھنے والے لوگ جلسوں میں شرکت کی دعوت دیتے تھے اور یہ بزرگ ان کی دعوت پر جلسوں میں شرکت فرماتے تھے' لوگ ان سے استفادہ کرتے اور ان کے وعظ وارشاد سے متاثر ہوتے تھے۔ ان میں اگر کسی مسئلے میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں' اہل علم کے درمیان فہم مسائل میں اختلاف عالم طور سے ہو جاتا ہے۔

امرتسر کے بعض حضرات سے سنا ہے کہ آزادیٔ برصغیر سے پہلے صوبائی انتخابات ہوئے تو کچھ لوگوں نے مولانا ثناء اللہ صاحب سے اپنے شہر کے امیدواروں کے نام لے کر کہا کہ فلاں فلاں صاحبان الیکشن لڑ رہے ہیں' ان میں سے کس کو ووٹ دینا چاہیے؟

مولانا نے جواب دیا: معلوم نہیں میرا ووٹ ہے یا نہیں ہے۔ اگر میرا ووٹ ہوا تو میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو ووٹ دوں گا۔ کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کس کو ووٹ دے اور کس کو نہ دے۔ ہر شخص کی اپنی رائے اور اپنی پسند ہے' جس کا وہ مالک ہے' میں اس میں دخل نہیں دوں گا۔ میں کسی کو کیوں مجبور کروں کہ اپنی رائے کو میری رائے کے تابع کر لے اور میری پسند کو اپنی پسند قرار دے لے۔ اسی طرح کوئی مجھے کیوں مجبور کرے کہ میں اپنی رائے کو اس کے حوالے کر دوں۔

مولانا غلام رسول مہر کو ان کی کتابوں سے بہت لگاؤ تھا اور وہ ان کی تحریریں شوق اور دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کی بات ہے' ایک دن شرق پور سے ملک حسن علی جامعی مرحوم تشریف لائے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے جا کر مولانا غلام رسول مہر سے ملنا چاہتے تھے۔ ہم ان کے مکان پر مسلم ٹاؤن گئے۔ کئی قسم کی باتیں ہوئیں۔ مولانا ثناء اللہ صاحب کا ذکر آیا تو مہر صاحب نے کہا کہ مجھے ان کے رسالہ "نورِ توحید" کی ضرورت اور تلاش ہے۔

ملک حسن علی جامعی نے فرمایا' میرے پاس اس کے دو نسخے ہیں' ایک نسخہ آپ کو بھیج دوں گا' چنانچہ شرق پور جا کر انھوں نے بذریعہ ڈاک یہ رسالہ مجھے بھیج دیا اور میں نے مہر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔

زندگی میں انسان بہت سے مقامات میں جاتا اور بہت سے بلاد و قصبات کی سیر کرتا ہے۔ مجھے بھی بہت سے مقامات دیکھنے اور بہت سی جگہوں میں گھومنے پھرنے کا موقع ملا۔ میں نے آزادیٔ برصغیر سے قبل بیس اکیس سال کی عمر تک ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہر اور مشہور تاریخی مقامات دیکھ لیے تھے' چنانچہ میری یادداشتوں کا اکثر حصہ دور آزادی سے قبل کے واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۹۴۲ء کی بات ہے کہ میں صوبہ یوپی کے مشہور تاریخی شہر آگرے گیا۔ آگرہ یوپی کے وسط میں واقع ہے اور لودھی اور مغل بادشاہوں کا دارالحکومت رہا ہے۔ یہ شہر بذریعہ سڑک دہلی سے ایک سو پچیس میل کی مسافت پر ہے۔ دہلی سے پچیس میل متھرہ ہے' جسے مندروں کا شہر کہنا چاہیے۔ اس شہر کی بھی ہم نے سیر کی اور مندر دیکھے اور پھر آگرے گئے۔ شہر کے مشرقی جانب جہاں شہری آبادی تقریباً ختم ہو جاتی تھی' ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ وہاں ایک پرانے بزرگ شمس الدین کا مزار تھا۔ ان کی نسبت سے اس محلے کا نام شمس پورہ تھا۔ میری عمر اس وقت سترہ اٹھارہ برس کی تھی۔ ایک سلسلے میں شام کے بعد میں روزانہ آگرہ سے بذریعہ سڑک دھول پور سے سات آٹھ میل آگے دریائے چنبل پر جاتا تھا۔ یہ جگہ آگرے سے پینسٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اسے چنبل وادی کہا جاتا ہے' چند سال پیشتر اس نواح کے ڈاکوؤں کا وہ گروہ جس کا تعلق مشہور ڈاکو خاتون پھولن دیوی سے تھا' اسی علاقے میں رہتا تھا۔

ساموں گڑھ کا علاقہ بھی اسی نواح میں ہے' جہاں ۲۹ مئی ۱۶۵۸ء کو اورنگ زیب عالم گیر اور داراشکوہ کے درمیان تخت نشینی کے مسئلے پر جنگ ہوئی تھی۔ پھر اس سے پچاس برس

بعد ۱۸ جون ۱۷۰۷ء کو اسی میلے پر' اسی جگہ اورنگ زیب کے دو بیٹوں محمد معظم اور محمد اعظم کے درمیان معرکہ کارزار گرم ہوا تھا۔

جس زمانے میں مجھے آگرے اور اس نواح کے دوسرے مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا' وہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور بنگال کے بعض شہروں (کلکتہ اور چٹاگانگ وغیرہ) پر جاپانی جہاز بم باری کر چکے تھے اور مزید بم باری کا خطرہ تھا' ان علاقوں کی حفاظت کے لیے اتحادیوں کی طرف سے امریکی فوجی بھیجے گئے تھے۔ یہ فوجی آگرہ میں بھی اچھی خاصی تعداد میں متعین کیے گئے تھے۔ ان کے ساتھ امریکی عورتیں بھی تھیں۔ یہ امریکی جوڑے بانھوں میں بانھیں ڈال کر آگرے کی سڑکوں پر ٹہلا کرتے تھے' عورتوں کا اس قسم کا لباس ہم نے پہلی دفعہ دیکھا تھا اور اس تہذیب و ثقافت کی کچھ جھلکیاں پہلی مرتبہ ہمارے علم و مشاہدہ میں آئی تھیں۔

قیام آگرہ کے زمانے میں ہفتے میں ایک دن ہم نے تاج محل کی سیر اور شہر کی مٹر گشت کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ انہی دنوں ہم تین چار مرتبہ فتح پور سیکری گئے اور وہاں کی قدیم عمارتیں دیکھیں جو تیسرے مغل حکمران شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دور کی تعمیر شدہ تھیں۔

آگرہ میں مجھے کئی مہینے رہنے کا اتفاق ہوا تھا جو اپنی یادوں کا ایک الگ موضوع ہے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک جمعہ میں نے آگرے کی ایک مشہور مسجد میں پڑھا جس کا نام مسجد زیب النساہے۔ یہ مغل طرز تعمیر کی بہت بڑی مسجد ہے جو مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی بیٹی زیب النسا نے تعمیر کرائی تھی۔ نماز جمعہ ختم ہو چکی تو لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہوا کہ تمام نمازی مسجد میں تشریف رکھیں' پنڈت عبدالکریم تقریر کریں گے۔ عبدالکریم کے ساتھ "پنڈت" کا لفظ سن کر ہمیں تعجب ہوا۔ اب پنڈت جی تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ کلے پر طرے دار سفید پگڑی' شلوار اور کوٹ پہنے ہوئے۔ گورا رنگ اور نکلتا ہوا قد۔ فصیح و بلیغ اردو میں انھوں نے بتایا کہ وہ ہندو تھے اور آریہ مذہب کے پرچارک تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ان کی بحثوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر انہی کی تحریروں سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ آریہ مذہب اور اسلامی تعلیمات کا مقابلہ مولانا نے اپنی تصنیفات میں بھی کیا ہے اور اخبار "اہل حدیث" میں بھی اس موضوع پر انھوں نے بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ پنڈت عبدالکریم نے بتایا کہ انھوں نے ان کے اخبار میں شائع شدہ مضامین بھی نہایت توجہ سے

پڑھے اور کتابوں کا بھی انتہائی غور سے مطالعہ کیا جن سے اثر پذیر ہو کر وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔

آگرے سے اس دور میں آریوں کا ایک ہفت روزہ اخبار نکلتا تھا' جس کا نام "آریہ مسافر" تھا۔ اردو زبان کے اس اخبار میں مولانا کے ان مضامین کا جواب دیا جاتا تھا جو اخبار "اہل حدیث" میں آریہ اور ہندو مذہب کے بارے میں لکھے جاتے تھے۔ پنڈت عبدالکریم نے تقریر کرتے ہوئے اخبار "آریہ مسافر" کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ وہ اس اخبار میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے خلاف لکھتے رہے ہیں۔

یوپی کے مرکزی شہر میں مولانا ثناء اللہ صاحب کا نام سن کر پنجابی کی حیثیت سے ہمیں بے حد خوشی ہوئی اور پھر اس سے مزید مسرت ہوئی کہ ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر وہ لوگ بھی حلقہ بگوش اسلام ہوئے جو اسلام کے شدید مخالف تھے اور اب وہ اسلام کے مبلغ ہیں۔ تقریر کے بعد لوگوں نے بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ ان سے مصافحہ کیا' میں نے بھی نیاز مندی سے انھیں سلام عرض کیا۔

اس کے بعد میں ہفت روزہ "آریہ مسافر" کے دفتر گیا۔ میں نے اس کے عملے کے لوگوں کو بتایا کہ میں پنجابی ہوں اور مولانا ثناء اللہ صاحب کا عقیدت مند ہوں۔ وہ لوگ بڑی محبت سے پیش آئے اور مولانا ثناء اللہ کا نام سن کر انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور ان کے علم و فضل کی تعریف کی۔ "آریہ مسافر" کے ایڈیٹر کا نام پنڈت بھوجدت تھا۔ وہ بیمار ہوئے تو مولانا نے ایک خط لکھ کر ان کی مزاج پرسی کی تھی۔ مولانا کا یہ خط اخبار "آریہ مسافر" میں چھپا تھا اور پنڈت بھوجدت نے اس پر مولانا کا شکریہ ادا کیا تھا۔

حیات مستعار کے آخری دنوں میں مولانا ثناء اللہ صاحب کو ابتلاو آزمائش کی کئی نہایت اذیت ناک منزلوں سے گزرنا پڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب امرتسر آگ و خون کی لپیٹ میں آیا اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو امن کمیٹیاں بنائی گئی تھیں جو ہندوؤں' مسلمانوں اور سکھوں کے سرکردہ افراد پر مشتمل تھیں۔ مولانا چوں کہ صلح و آشتی کے حامی اور امن و سلامتی کے داعی تھے لہٰذا انھوں نے امن کمیٹیوں کے قیام کو لائق تحسین قرار دیا' خود امن کمیٹی کے رکن بنے اور لوگوں کو رکن بنایا۔ امن کی فضا بحال کرنے کے لیے شہر کے مختلف علاقوں میں گئے' تقریریں کیں' لوگوں کو سمجھایا اور فسادات کی روک تھام کے لیے کوشاں

ہوئے۔اس اہم کام کے سلسلے میں اپنے اکلوتے بیٹے مولوی عطاء اللہ کو بھی بھیجتے' وہ بھی شہر میں اثر ورسوخ رکھتے تھے۔

اس وقت حالات نے ایسا رخ اختیار کر لیا تھا کہ اپنے علاقوں کی موثر ترین شخصیتوں کی از حد کوشش کے باوجود فسادات کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور امن وسلامتی کا دامن لحہ بہ لحہ سکڑتا چلا گیا۔لوٹ مار' قتل وغارت' غصب ونہب اور آتش زنی کا سیلاب اس درجے تیز ہو گیا تھا کہ قیام امن کی کوششوں کے تمام بند ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔

مولوی عطاء اللہ اپنی گلی اور محلے کے مسلمانوں کی نگرانی پر متعین تھے اور ان کی حفاظت کے لیے دن رات پہرہ دیتے تھے۔رمضان کا آخری دن اور اگست کی تیرہ تاریخ تھی کہ ہندو اور سکھ بلوائیوں کا ایک جتھا اس گلی کے قریب سے گزرا۔ مولوی عطاء اللہ حسب معمول پہرہ دے رہے تھے کہ کسی نے ایک مکان کی چھت پر سے دستی بم پھینکا جو مولوی صاحب مرحوم کے بالکل قریب آکر گرا اور گرتے ہی پھٹ گیا۔ مولوی صاحب شدید زخمی ہو گئے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب کو اطلاع ملی تو وہاں پہنچے اور دو چار ساتھیوں کی مدد سے زخمی بیٹے کو چارپائی پر ڈالا اور ہسپتال کو روانہ ہوئے'لیکن زخم اتنے شدید تھے کہ مولوی عطاء اللہ تھوڑی دور جا کر بحالت روزہ جام شہادت نوش کر گئے۔بوڑھے باپ کو اس عالم میں اکلوتے بیٹے کی دائمی مفارقت کا جو صدمہ پہنچا ہو گا اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

عصر کا وقت تھا' فوراً تجہیز وتکفین کا انتظام کیا گیا' مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی' امامت کا فریضہ خود مولانا مرحوم نے انجام دیا۔ تدفین کے لیے سرکار کی طرف سے صرف دس آدمیوں کو پرمٹ مل سکا۔اس طرح فرزند دلبند کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس کے بعد ۱۴۔اگست کو اہلیہ محترمہ 'پوتے پوتیاں اور گھر کے تمام افراد کو ساتھ لے کر امرتسر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

ان کا شمار امرتسر کے رؤسا میں ہوتا تھا۔بہت بڑی جائداد کے مالک تھے۔کتب خانہ نہایت شان دار اور بہت سی نایاب اور عمدہ کتابوں پر مشتمل تھا۔اسلامیات ودینیات کے علاوہ دیگر مذاہب سے متعلق کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے پاس محفوظ تھا۔لیکن سب کچھ وہیں رہ گیا۔گھر سے نکلے تو صرف پچاس روپے جیب میں تھے اور معمولی لباس زیب تن ----!

انھیں سب سے زیادہ افسوس کتب خانے کا تھا۔ بیٹے کی موت کا افسوس کرنے والوں سے کہتے تھے کہ اسے تو مرنا ہی تھا' مجھ سے پہلے مرتا یا بعد میں' اصل المیہ تو یہ ہے کہ کتابیں ضائع ہو گئیں۔

امرتسر سے لاہور آئے اور چند روز یہاں مقیم رہے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے بتایا کہ اسی زمانے کی بات ہے' ایک دن مولانا ثناء اللہ صاحب' مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی' مولانا سید محمد داؤد غزنوی' مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی چینیاں والی مسجد میں بیٹھے تھے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب فرماتے ہیں' میں بھی وہاں موجود تھا اور جو حالات پیدا ہو گئے تھے' ان کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ مولانا ابراہیم صاحب سے باتیں کرتے ہوئے مولانا ثناء اللہ صاحب کا لہجہ بدل گیا اور ان کی سیاست کے متعلق بعض سخت باتیں کہیں ---- فرمایا: ابراہیم! یہ پاکستان ہے جس کے لیے تم بھاگے پھرتے تھے ---- لیکن مولانا ابراہیم صاحب نے کسی بات کا جواب نہیں دیا' خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ باقی حاضرین مجلس میں سے بھی کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ مولانا ثناء اللہ صاحب کی حالت دیکھ کر مولانا داؤد غزنوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' دوسرے حضرات بھی آب دیدہ ہو گئے۔

مولانا عطاء اللہ صاحب کے بقول مولانا ابراہیم صاحب نے ان سے کہا کہ آپ سیالکوٹ نہ آئیں' کشمیر کی سرحد وہاں سے قریب ہے' موجودہ حالات میں سیالکوٹ کی سکونت آپ کے لیے مناسب نہیں رہے گی۔ گوجرانوالہ' لائل پور یا سرگودھا وغیرہ کسی شہر میں اقامت اختیار کر لیجیے۔

وہ تھوڑے دن لاہور رہے' جلد ہی مولانا اسماعیل صاحب اور گوجرانوالہ کے چند معزز حضرات انھیں گوجرانوالہ لے گئے۔ وہاں سکونت کے لیے ان کی حیثیت کے مطابق اچھے خاصے مکان کا انتظام کر دیا گیا تھا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ یہ مکان جامع مسجد اہل حدیث کے قریب تھا۔ مولانا شدید صدموں کی زد میں تھے' چلنا پھرنا مشکل تھا' لیکن اس حالت میں بھی نماز کے لیے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔ مصائب و آلام کے بے پناہ ہجوم کے باوجود چہرے کی بشاشت اور زبان کی شگفتگی بحال تھی۔ دو تین دفعہ مولانا اسماعیل صاحب کے اصرار پر نماز جمعہ پڑھائی۔ مسجد میں جو شخص ان سے ملتا' نہایت اچھی طرح سے ملتے اور خیر و عافیت

پوچھتے- امرتسری حضرات سے اپنے شہر کے لوگوں کے بارے میں دریافت کرتے کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں-

مولانا حنیف ندوی نے فرمایا کہ بعض لوگ انھیں مسجد میں کچھ روپے پیسے دیتے تھے' کسی نے پانچ روپے دیے' کسی نے دس دیے یا اس سے کم یا زیادہ---! جو کچھ کوئی دیتا' لے لیتے' لیکن اسے جیب میں نہیں ڈالتے تھے' ہاتھ میں پکڑے رکھتے اور کسی امرتسری کو' جسے وہ مستحق امداد سمجھتے' آواز دیتے- مثلاً فرماتے' غلام محمد یہاں ہے؟ عبدالرحمٰن ابھی بیٹھا تھا' وہ کہاں ہے؟ اگر ان میں سے کوئی آجاتا تو اسے وہ رقم دے دیتے کہ اس سے اپنی کوئی ضرورت پوری کرلے یا فلاں شخص کو پہنچادے-

مولانا کے لیے یہ سخت ترین ابتلا کا وقت تھا' لیکن اس وقت بھی انھوں نے فی سبیل اللہ قسم کا کسی سے کوئی پیسہ نہیں لیا- ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کیا اور جو کچھ مانگا اسی سے مانگا-

گوجرانوالہ میں وہ تھوڑا عرصہ ہی رہے- اسی اثنا میں ان کے نام سرگودھا میں ایک پریس الاٹ ہوگیا تھا اور مکان بھی مل گیا تھا- چنانچہ وسط جنوری ۱۹۴۸ء میں وہ سرگودھا تشریف لے گئے- پریس کا نام وہی امرتسر والا "ثنائی برقی پریس" رکھا اور اس کا انتظام اپنے پوتے مولوی رضاء اللہ کے سپرد کیا-

سرگودھا کو وہ اپنے نقطہ نظر کے مطابق ایک علمی اور جماعتی مرکز بنانا چاہتے تھے اور اخبار "اہل حدیث" کے دوبارہ اجرا کا مسئلہ بھی زیر غور تھا' لیکن صدمے اتنے شدید اور وسائل اس درجہ محدود تھے کہ ان عزائم کو عملی شکل دینا ممکن نہ رہا تھا-

عالم پیری میں حالات کا رخ اس درجے تیزی سے بدلا کہ نیرنگی دہر نے پیہم صدمات کے یکے بعد دیگرے کئی تلخ گھونٹ ان کے لبوں سے لگائے اور وہ بغیر کوئی حرف شکایت زبان پر لائے انھیں حلق سے نیچے اتارتے رہے-

سرگودھا جانے سے تقریباً ایک مہینہ بعد ۱۳ فروری ۱۹۴۸ء کو داہنے پہلو پر فالج کا حملہ ہوا' جس کے اثر سے سماعت' بصارت' شناخت اور گویائی کی قوتیں ختم ہوگئیں- بہت علاج کرائے' جس کے نتیجے میں تھوڑا بہت پہچاننے تو لگے تھے' لیکن بولنے کی سکت باقی نہ رہی تھی- کہتے ہیں کان منہ کے قریب کرکے سننے کی کوشش کی جاتی تو بہت ہی آہستہ آواز میں فقط یا اللہ یا اللہ کے الفاظ سنائی دیتے تھے- مہینے سے کچھ دن اوپر یہی کیفیت رہی- آخر وہ بلبل

ہزار داستان جو ساٹھ سال سے زیادہ عرصے تک ہندوستان کے گلستان علم میں چہکتا رہا تھا' جس کے زور کلام سے بڑے بڑوں کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں' جس کی قوت استدلال سے میدان بحث و مناظرہ کے نامور شہسوار خاموشی اختیار کر لینے پر مجبور ہو جاتے تھے' جس نے عمر بھر ہنگامہ تبلیغ بپا کیے رکھا اور جو ہر اس طاقت سے پنجہ آزما ہوا' جس نے مذہبی رنگ میں مسلمانوں کو پریشانی سے دوچار کرنا چاہا' وہ اسی (۸۰) سال عمر پا کر دوشنبہ کے روز' بوقت صبح' ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ان کے جسد خاکی کے بار امانت کو قیامت تک کے لیے سرگودھا کی سرزمین نے اپنے پہلو میں چھپا لیا اور روح اعلیٰ علیین کو پرواز کر گئی۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

# مولانا محمد علی لکھوی

۱۹۳۶ء میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کوٹ کپورہ میں قیام فرماتے اور وہاں کی جامع مسجد میں تدریس و خطابت کی خدمات سر انجام دیتے تھے---- گرمیوں کا موسم تھا کہ ایک روز ایک بزرگ تشریف لائے- مولانا انھیں دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور انتہائی تکریم کے ساتھ ان کا استقبال کیا---- جامع مسجد سے ملحق ایک خاصا وسیع کمرہ اور اس کے ساتھ بڑا سا بر آمدہ تھا- مولانا نے وہاں چارپائی پر خود صاف ستھرا بستر بچھایا اور نہایت احترام کے ساتھ معزز مہمان کو اس پر تشریف رکھنے کی درخواست کی- پھر خود ہی انھیں پنکھا جھلانا شروع کیا- گرامی قدر مہمان وہاں کتنے دن رہے اور مولانا کے ساتھ ان کی کیا گفتگو ہوئی' اس کا مجھے علم نہیں---- یہ مہمان عالی مرتبت تھے حضرت مولانا محمد علی لکھوی-!

اب چار مہینے کی مسافت طے کر کے ۱۹۳۶ء کے دسمبر میں آجایئے- حضرت مولانا محمد علی نے پھر کوٹ کپورہ کا عزم فرمایا- اب کے وہ بڈھیمال بھی گئے جو کوٹ کپورے سے تقریباً دس کوس کے فاصلے پر ضلع فیروز پور کی تحصیل مکتسر میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا- یہ گاؤں متعدد اصحاب تدریس علمائے کرام کا مسکن رہا ہے- ماضی قریب اور زمانہ حال کے اہل علم میں سے مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی' مولانا حافظ احمد اللہ' صوفی عیش محمد اور قاضی محمد اسلم سیف کا تعلق سکونت اسی گاؤں سے تھا-

قدیم دور سے کوٹ کپورہ اور بڈھیمال کے چند خاندانوں کی باہم رشتے داریاں قائم تھیں' اس لیے مولانا محمد علی لکھوی کے ساتھ وہاں کے بعض لوگ بھی بڈھیمال کو روانہ ہو گئے- میری عمر چھوٹی تھی تاہم میں بھی ان کے ساتھ چل پڑا- کوٹ کپورہ سے براہ راست بڈھیمال نہ ٹرین جاتی تھی اور نہ بس یا تانگے کا کوئی راستہ تھا- دس کوس کا یہ کچا ریتلا راستہ تھا جو ہم نے پیدل تین چار گھنٹے میں طے کیا- کوٹ کپورہ اور بڈھیمال کے بہت سے لوگ حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے والد مکرم حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے حلقہ ارادت سے تعلق رکھتے تھے اور لکھوی علما سے انھوں نے حصول علم بھی کیا تھا' اس لیے

وہ ان کو بہ درجہ غایت اکرام کا مستحق گردانتے تھے۔

بڈھیمال کے بعض علمائے کرام کے درمیان بعض مسائل میں باہم بحث مباحثے کا ہلکا پھلکا سلسلہ جاری رہتا تھا جو بسا اوقات دلچسپ شکل اختیار کر لیتا تھا' اور سننے والے اس سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ بات عام طور سے چھوٹی ہوتی تھی' لیکن بحث کرنے والے کھینچ تان کر اسے بڑی بنا دیتے تھے۔ پھر یہ ہوتا کہ جب کوئی معروف اور بڑا عالم وہاں جاتا تو زیرِ بحث مسئلہ اس کے سامنے رکھا جاتا اور اس سے اس کے متعلق فیصلہ طلب کیا جاتا---- مولانا محمد علی لکھوی وہاں تشریف لے گئے تو ان سے بھی یہی برتاؤ کیا گیا اور جو مسائل ان کے نزدیک تصفیہ طلب تھے' وہ ان کی خدمت میں پیش کیے گئے۔

صورت حال جو ہم نے دیکھی کچھ اس قسم کی تھی کہ دو بزرگوں نے مسئلہ پوچھا۔ پھر وہ کتابیں لینے کے لیے تیزی کے ساتھ اپنے اپنے گھر گئے۔ واپس آکر انھوں نے الگ الگ حدیث کی ایک ایک کتاب اپنی اپنی بغل سے نکالی اور جو مقام ان کے نزدیک تصفیہ طلب تھا' وہ پڑھنا شروع کیا۔ کتابیں عربی کی تھیں' لیکن انھوں نے زیرِ بحث مقام کی عربی عبارت نہیں پڑھی۔ پنجابی میں اس کا ترجمہ کرنا شروع کیا' مثلاً فرمایا: روایت اے ابوہریرہ تھیں' آکھیا انھاں نے' تے فرمایا نبی ﷺ نے-----

ایک بزرگ کی بات ختم نہیں ہوئی کہ بیچ میں دوسرے صاحب بول پڑے ہیں---- اس کے ساتھ ہی نمازیوں میں سے کچھ لوگوں نے بولنا شروع کر دیا ہے۔ اب مولانا محمد علی صاحب جن سے سوال کیا گیا اور فیصلے کے لیے کہا گیا ہے' خاموش بیٹھے ہیں اور سائل اور دوسرے لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ مولانا کبھی کسی کی طرف دیکھتے ہیں' کبھی کسی کی طرف۔ وہ خاموش ہوں تو کسی بات کا جواب دیا جائے۔ انھیں تو جواب دینے کا موقع ہی نہیں دیا جا رہا۔

کسی نے مولانا سے کہا: حضرت آپ بھی ان کی کسی بات کا جواب دیجیے۔

مولانا نہایت دلچسپ عالم دین تھے اور ایسے مواقع پر بے حد متانت کے ساتھ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے دلچسپ اسلوب میں بات کرتے تھے۔ فرمایا: میرا جواب یہ ہے کہ عالم یہاں زیادہ ہو گئے ہیں۔ ان کو یہاں سے مختلف مقامات میں بلٹی کر دینا چاہیے۔ یہاں صرف ایک عالم رہنا چاہیے جو جمعہ جماعت کا فریضہ انجام دے۔

پھر فرمایا: انھیں کوئی کام کاج تو ہے نہیں' بیٹھے بٹھائے من و سلویٰ مل جاتا ہے' اسے کھاتے رہتے ہیں اور جھگڑتے رہتے ہیں- اگر زمینوں کو نہری پانی دینا پڑے یا کنویں اور رہٹ چلانا پڑیں تو مصروف رہیں اور چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر بحث و نزاع سے بچے رہیں-

بات یہ ہے کہ بڈھیمال کے لوگ اچھی خاصی زمینوں کے مالک تھے' لیکن زمینیں بارانی تھیں' لوگ گندم' جو اور چنے وغیرہ بوتے تھے یا یوں کہیے کہ اللہ کا نام لے کر بیج زمین کی تہہ میں پھینک آتے تھے- بارش ہوتی تو اللہ تعالیٰ غلہ عطا فرما دیتا تھا جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جاتی تھیں- محنت مشقت کا کوئی کام انھیں کرنا نہیں پڑتا تھا- سال بھر میں چند روز فصل بونے اور چند روز فصل کاٹنے میں صرف ہوتے تھے' باقی اللہ اللہ خیر سلا- بہ الفاظ دیگر سال کے بارہ مہینوں میں سے زیادہ سے زیادہ دو مہینے کام اور کم سے کم دس مہینے آرام-! اس طرح وہ من و سلویٰ کھاتے تھے ----- بنی اسرائیل اور ان کے من و سلویٰ میں فرق یہ تھا وہ آسمان سے اترتا تھا اور یہ زمین سے اگتا تھا-

حضرت مولانا محمد علی صاحب نے من و سلویٰ کی بات تو از راہ مزاح ارشاد فرمائی تھی' لیکن واقعہ یہ ہے وہ ان کے حالات سے آگاہ تھے' وہ نیک اور تقویٰ شعار لوگ تھے- بہ ظاہر جو باتیں ہمیں چھوٹی معلوم ہوتی ہیں' ان میں بھی وہ محتاط تھے- اسی لیے ان کے متعلق جھگڑتے تھے- وضع قطع خالص مومنانہ اور اسلوب زیست نہایت سادہ- باطن کا علم تو اللہ کو ہے' لیکن ظاہری حالت شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور اپنے طور پر الحب للہ و البغض للہ پر کاربند تھے- مسائل کی تعبیر و تشریح میں ان کا بحث و مباحثہ یا جدل و نزاع اخلاص پر مبنی تھا ----- وہاں کے اصحاب علم نے قیام پاکستان سے قبل بھی دینی خدمات کو اپنا مطمح نظر قرار دیا اور قیام پاکستان کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھا- چنانچہ حضرت مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی اس گروہ باصفا کے وہ بزرگ تھے' جن کا دائرہ درس و تدریس نہایت وسعت پذیر تھا' وہ جلیل القدر عالم اور ممتاز مدرس تھے- بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا' جنھوں نے آگے چل کر مختلف مقامات میں تدریس کی مسندیں آراستہ کیں اور جو علم انھوں نے حضرت حافظ صاحب سے حاصل کیا تھا' اس کو پھیلانے اور عام کرنے کا ذریعہ بنے- حافظ صاحب نے دیگر علما کے علاوہ لکھوی علمائے کرام سے بھی کسب فن کیا تھا' جس کا اظہار وہ فخر و مسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے- وہ چھوٹی چھوٹی عام باتوں میں جھگڑنے کے

عادی نہ تھے' خاموش بیٹھے علما کے جھگڑے سے محظوظ ہوتے رہتے تھے۔

حضرت حافظ صاحب کے صاحب زادے مولانا حافظ محمد مرحوم بھی انہی کے نقش قدم پر چلے اور منصب تدریس پر متمکن رہے' اور پھر یہی خدمت انجام دیتے ہوئے عین عالم جوانی میں عازم فردوس ہوئے۔

مولانا حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی کا حلقہ تدریس بھی دور تک پھیلا ہوا تھا اور ان کے تلامذہ کرام کی تعداد کا احاطہ کرنا ہمارے لیے مشکل ہے جو بہت سے مدارس دینیہ میں مصروف عمل و سعی ہیں۔ حافظ احمد اللہ نے ۲۸۔ نومبر ۱۹۹۸ء کو اچانک وفات پائی۔

حافظ احمد اللہ صاحب کے صاحب زادوں نے بھی طلبا کو تعلیم سے آراستہ کرنے کی راہ اپنائی جو بڑی مبارک اور قابل رشک راہ ہے۔

قاضی محمد اسلم سیف ایک ہائی سکول میں معلّمی کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی اپنے انداز میں انھوں نے کام کیا۔

صوفی عیش محمد نے ذکر و اذکار کا محاذ سنبھالا اور لوگوں کے قلب و روح کے دروازے پر دستک دی' یعنی بندگان خدا کے باطن کی اصلاح کو مرکز التفات ٹھہرایا۔ اس فضائے معصیت آلود میں ان کا یہ لائق تعریف کارنامہ ہے۔ لوگوں کے قلوب و اذہان کو امور خیر سے متعارف کرانا اور ان کی اندرونی حالت کو آشنائے صالحیت کرنے کے لیے کوشاں ہونا بہت اہم اور بنیادی کام ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ اس باب میں ان کا حامی و ناصر ہو' آمین۔

ان حضرات کے علاوہ بڈھیمال کے اور بھی متعدد حضرات علما تھے جو بڑے پاک باز اور نیک طینت تھے' ان میں مولانا عبدالرحمٰن' مولانا عبدالغنی اور مولانا عبدالحکیم کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ ان میں سے ہر بزرگ کا اپنا اسلوب عمل اور طریق دعوت و بیان تھا' رحمہم اللہ تعالیٰ۔



مولانا عبدالحکیم سادگی پسند عالم دین تھے' ہل چلاتے تھے اور کھیت میں کوئی نہ کوئی کتاب اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ بعض فقہی نوعیت کے مسائل میں وہ امام داؤد ظاہری کے نقطہ نظر کو ترجیح دیتے تھے۔ اس اعتبار سے ہم انھیں تھوڑا بہت "ظاہری" قرار دے سکتے ہیں۔ محلی ابن حزم بڑے شوق سے پڑھتے تھے' اور پہلی دفعہ میں نے اس کتاب کا نام انہی سے سنا تھا۔ وہ نسوار لیتے تھے اور سنا ہے ان کا خیال یہ تھا کہ نسوار لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

علامہ محمد اسد جرمن بھی ظاہری قسم کے تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک دفعہ بتایا کہ اسد صاحب کہا کرتے تھے کہ سگریٹ پینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، مگر حالت روزہ میں وہ سگریٹ پیتے نہیں تھے۔

یہاں ان بزرگوں کا ذکر حضرت مولانا محمد علی لکھوی سے متعلق گزارشات کے ضمن میں آگیا ہے۔ اگر اللہ نے توفیق دی اور جسم کے ساتھ زندگی کا رابطہ قائم رہا اور قلم و قرطاس سے بھی رسم و راہ رہی تو ان شاء اللہ ان حضرات کا تذکرہ اپنے محدود معلومات کی روشنی میں الگ صورت میں کیا جائے گا۔

بڈھیمال میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی کا قیام دو یا تین دن رہا ہوگا۔ اس کے بعد وہ پھر کوٹ کپورے تشریف لے آئے۔ یہ دسمبر (۱۹۳۶ء) کی آخری تاریخیں تھیں۔ وہاں وہ ہمارے ایک بزرگ حاجی محمد علی مرحوم کے مکان پر مقیم ہوئے۔ وہیں انھوں نے نماز عشا کے بعد انجمن اصلاح المسلمین کے ارکان کو بلایا اور فرمایا کہ وہ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو اب چھٹی دے دیں۔ میں انھیں اپنے ہاں مرکز الاسلام لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں وہ ان کے بیٹوں ----- محی الدین اور معین الدین ----- کو حدیث کی کتابیں پڑھائیں گے۔ ان کے علاوہ دیگر طلبا کو بھی تعلیم دیں گے۔ انجمن کے صدر اس وقت ہمارے ایک مرحوم بزرگ حاجی محمد کریم تھے۔ میری عمر اس وقت چھوٹی تھی، لیکن اس مجلس میں موجود تھا۔

یہاں یہ عرض کر دیں کہ اس وقت حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کا کوٹ کپورہ میں رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس لیے کہ ۱۹۳۵ء میں فرید کوٹ کی ایک مسجد پر (جو گھنٹہ گھر کے قریب بازار میں واقع تھی) مہاراجا فرید کوٹ نے قبضہ کر لیا تھا اور اس میں میونسپل کمیٹی کا دفتر قائم کر دیا گیا تھا۔ اس سے قبل اس قسم کا کبھی کوئی واقعہ وہاں پیش نہیں آیا تھا۔ اس نوعیت کا ریاست میں یہ پہلا واقعہ (یا سانحہ) تھا جو نہایت تکلیف دہ تھا۔ مسلمانوں کے لیے تو یہ اذیت رساں تھا ہی، غیر مسلموں کے لیے بھی باعث الم و افسوس تھا۔ مسلمانوں نے اس پر شدید احتجاج کیا اور معاملہ بہت ہی سنگین صورت اختیار کر گیا تھا، مولانا عطاء اللہ صاحب نے خطبات جمعہ اور عام تقریروں میں اس موضوع پر ریاستی حکومت کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔

ایک دن ہمارے ایک رشتے دار صوفی رفیق احمد بھٹی مرحوم نے اس مقبوضہ مسجد میں جا کر اذان کہہ دی، جس کے نتیجے میں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ اس زمانے میں فرید کوٹ کے

سیشن جج مولوی عبدالعزیز تھے۔ ان کی عدالت میں صوفی رفیق احمد بھٹی پر مقدمہ چلا تو انھوں نے اذان کہنے کے جرم میں صوفی صاحب کو سات سال قید بامشقت کی سزا دی۔ یہ جون ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ بعد ازاں مولوی عبدالعزیز کو ریاست کا چیف جسٹس بنا دیا گیا تھا۔

صوفی رفیق احمد کو سزا کے خلاف اپیل کا حق حاصل تھا، لیکن انھوں نے اپیل نہیں کی۔ اس سے ٹھیک اکتیس مہینے بعد راجا فرید کوٹ جیل کے معائنے کے لیے گیا۔ وہ مختلف بارکوں اور کوٹھڑیوں کا چکر لگاتا ہوا رفیق احمد بھٹی کی کوٹھڑی کے سامنے گیا تو پوچھا:

کس جرم میں قید ہو اور کتنے عرصے سے جیل میں بند ہو؟

انھوں نے جواب دیا: میں نے اس مسجد میں اذان کہی تھی، جسے آپ نے مسلمانوں سے چھین کر اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔ اس جرم میں مجھے سات سال کی قید ہوئی تھی، اس میں سے اکتیس مہینے یعنی دو سال سات مہینے قید بھگت چکا ہوں۔

صوفی صاحب کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی راجا فرید کوٹ نے باقی قید معاف کر دی اور اسی وقت ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ یہ ۱۹۳۸ء کے آخر کی بات ہے۔

اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں ریاست فرید کوٹ میں پرجا منڈل کی تحریک شروع ہوئی تو ریاستی حکومت نے جولائی ۱۹۴۶ء میں یہ مسجد مسلمانوں کے لیے واگزار کر دی تھی اور واگزاری کے بعد اس میں پہلا جمعہ مولوی محمد سعید شبلی نے پڑھایا تھا۔

گزارش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے مسجد پر قبضے کے بعد حالات کچھ ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ مولانا عطاء اللہ صاحب کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بات یہ تھی کہ مولانا سیاسیات میں کانگریس کے حامی تھے اور ریاست میں کانگریس یا ان جماعتوں سے ہم آہنگ ہونا اور ان کے نقطۂ فکر کی تائید کرنا جو آزادیٔ وطن کی خواہاں اور انگریزی حکومت کی مخالف تھیں، بہت بڑا جرم تھا۔

اس لیے مولانا محمد علی لکھوی نے ارکانِ انجمن سے کہا کہ وہ مولانا عطاء اللہ صاحب کو ان کے ہاں مرکز الاسلام جانے کی اجازت دے دیں۔ سوچ بچار کے بعد ارکانِ انجمن نے مولانا لکھوی کا فرمان اس شرط پر منظور کیا کہ کوٹ کپورے کے جو دو طالب علم ان سے ابتدائی کتابیں پڑھتے ہیں، وہ مولانا کے ساتھ جائیں گے، وہ تھے محمد رفیق اور ان سطور کا راقم۔ میں اور محمد رفیق (جسے ہم حاجی رفیق کہا کرتے تھے) مولانا عطاء اللہ صاحب کے ساتھ یکم

جنوری ۱۹۴۳ء کو بارہ بجے کی ٹرین سے جھوک ٹہل سنگھ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے اور ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ اسی طرف روانہ ہوگئے' جس طرف ٹرین جاتی تھی۔

"مرکز الاسلام" کا نام ہمارے نزدیک بڑا بارعب اور بھاری بھر کم تھا اور ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ کوئی اچھا خاصا شہر ہوگا' وہاں جا کر بھید کھلا کہ بالکل جنگل میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے فقط ایک گھر کا نام "مرکز الاسلام" ہے۔ اسی احاطے میں پختہ اینٹوں کی ایک چھوٹی سی مسجد اور ایک فتح محمد لوہار کا گھر ہے' جسے "پھتا" کہا جاتا تھا اور ایک قمرالدین ترکھان کا گھر ہے۔ چار دیواری کے باہر کنواں چل رہا ہے' جس کا پانی اس پینتالیس ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے جو اس مدرسے سے متعلق ہے' جس کا مولانا عطاء اللہ حنیف کو مدرس بنایا گیا ہے اور جہاں ہم تعلیم حاصل کرنے آئے ہیں۔ ہمارے جانے کے بعد محمد جمیل اور نور محمد بھی وہاں پہنچ گئے تھے اور پھر ہمارا ایک عزیز محمد زکریا بھی وہیں آ گیا تھا۔ لیکن یہ تینوں تھوڑا ہی عرصہ وہاں رہے۔

محمد جمیل کا تعلق بٹھنڈہ کی مشہور خانقاہ حاجی رتن سے تھا' اس نے عین عالم جوانی میں اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان آنے والے ایک قافلے کے ساتھ ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں "گولے والا" میں وفات پائی۔

نور محمد کا تعلق ضلع حصار کے ایک گاؤں سے تھا۔ یہ مرض دق میں مبتلا تھا' عیدالاضحیٰ تک مرکز الاسلام رہا' عید کی چھٹیوں میں گھر گیا' وہاں مرض نے شدت اختیار کی تو اللہ کو پیارا ہوگیا۔

محمد زکریا صاحب دو مہینے کے بعد واپس کوٹ کپورے آگئے تھے۔ جڑانوالہ (ضلع فیصل آباد) میں مقیم ہیں۔

میں اور حاجی رفیق پورا سال وہاں رہے۔ حاجی صاحب مولانا محی الدین اور معین الدین کے دوستوں میں سے تھے۔ ۲ نومبر ۱۹۹۶ء کو ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب ضلع فیصل آباد میں فوت ہوئے۔

مولانا محمد علی لکھوی نہایت متحرک اور مستعد شخصیت تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۸ء میں اس جگہ کو اپنا مسکن بنایا تھا اور ان کا یہ مسکن ان کے آبائی گاؤں "لکھوکے" سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔

ان چند سطور کو یہیں چھوڑ کر اب آیئے پہلے مولانا محمد علی لکھوی کے اسلاف اور آباو اجداد کے باب عالی پر حاضری دیتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کی سعی کرتے ہیں کہ وہ کون بزرگ تھے؟ ان کے تدین و تقویٰ کی حدود کتنی وسعت پذیر تھیں؟ ان کے علم و فضل کے دوائر کہاں تک ممتد تھے؟ تصنیفی میدان میں وہ کس قدر آگے بڑھے اور درس و تدریس کی وادیوں میں کیا خدمات سرانجام دیں؟

اس کے بعد مولانا محمد علی لکھوی اور ان کے واقعات و حالات سے آگاہ ہونے کی کوشش کریں گے۔

مولانا محمد علی سے سات پشتیں پہلے اس خاندان کے ایک بزرگ حافظ محمد امین تھے' ان کا اصل وطن ضلع قصور کا ایک گاؤں ''ڈھنگ شاہ'' تھا۔ ان کے دادا کا نام ابوداؤد تھا جو لوگوں میں ''ڈھنگ شاہ'' کے عرف سے معروف ہوئے۔ یہ گاؤں ان کی ملکیت تھا اور انہی کے نام سے اس کا نام ''ڈھنگ شاہ'' پڑا۔ وہ نہایت نیک اور پارسا بزرگ تھے اور لوگوں کی اصلاح اور تبلیغ دین ان کا اصل کام تھا۔ ان کی نیکی اور صالحیت کی وجہ سے عوام میں انھیں بڑی قدرو منزلت حاصل تھی۔

ابوداؤد (یا ڈھنگ شاہ) کے پوتے حافظ محمد امین تھے۔ وہ بھی انتہائی صالح اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے اور ان کے شب و روز دین کی نشرو اشاعت میں گزرتے تھے۔ وہ اپنے آبائی گاؤں سے نقل مکانی کر کے لاہور آگئے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام حافظ احمد تھا اور دوسرے کا حافظ نور محمد۔! حافظ محمد امین نے لاہور میں رہ کر دونوں بیٹوں کو دینی تعلیم دلائی۔

جب بیٹے زیور تعلیم سے آراستہ ہو گئے تو حافظ محمد امین (بیٹوں سمیت) لاہور کی سکونت ترک کر کے فیروز پور آگئے اور یہیں اقامت اختیار کر لی۔ فیروز پور کے گردونواح میں ان باپ بیٹوں نے اسلام کی خوب تبلیغ کی اور لوگوں کو اللہ کی توحید اور اتباع سنت کا درس دیا۔ حافظ محمد امین نے فیروز پور ہی میں وفات پائی اور دہلی دروازے کے اندر بڑے بازار میں ''نوگزے'' کی قبر کے قریب دفن کیے گئے۔

حافظ صاحب کی وفات کے بعد ان کے بیٹے ---- حافظ احمد اور حافظ نور محمد ---- فیروز پور سے چلے گئے تھے۔ حافظ نور محمد نے تو فیروز پور کے قریب ایک گاؤں ''بارے کے'' میں اقامت اختیار کر لی اور حافظ احمد فیروز پور سے مغرب کی جانب چودہ میل کے فاصلے پر

موضع ''لکھوکے'' میں جا آباد ہوئے اور اس نواح میں دعوت وارشاد اور تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ان کی تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں سے ہم دیکھتے ہیں کہ علم و عمل' تقویٰ و صالحیت اور درس و تدریس کے حلقوں میں اس چھوٹے سے گاؤں نے بے پناہ شہرت حاصل کی۔

موضع ''لکھوکے'' کے قریب ایک گاؤں ''طور'' تھا' وہاں کے رئیس نے اپنی بیٹی حافظ احمد کے عقد میں دے دی تھی' جس کے بطن سے ۱۲۰۱ھ (۱۷۸۶ء) میں حافظ بارک اللہ پیدا ہوئے۔وہ بڑی نیک اور صالحہ خاتون تھیں۔ان کے شوہر حافظ احمد بھی بے حد متقی بزرگ تھے اور اپنے علاقے اور عہد کے جید عالم-----!

حافظ بارک اللہ نے نیکی و پارسائی کے ماحول میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا اور تقویٰ و صالحیت کی فضا میں پرورش پائی۔والد گرامی سے قرآن مجید حفظ کیا' انھی سے عربی و فارسی کی کتابیں پڑھیں اور علوم متداولہ اور فنون مروجہ میں مہارت حاصل کی۔

بعد ازاں دہلی کا عزم فرمایا اور شاہ غلام علی دہلوی سے اکتساب فیض کیا۔اس زمانے میں دہلی شہر بہت سے مشاہیر علما و صلحا کا مرکز تھا' ان میں سے بھی بعض حضرات سے انھوں نے استفادہ کیا۔

حافظ بارک اللہ کے دو بیٹے تھے۔حافظ محمد لکھوی اور مولوی محمد صالح۔دونوں نے باپ سے علم حاصل کیا اور ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہوئے۔مولوی محمد صالح کے حالات نہیں ملتے' لیکن حافظ محمد لکھوی کے علم و ادراک اور تصنیف و تالیف کی معرکہ آرائیوں کا کسی زمانے کے پنجاب میں گھر گھر چرچا تھا' جس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

حافظ بارک اللہ لکھوی اتباع سنت اور حق گوئی میں نہایت جری تھے۔اس باب میں وہ کسی کی پروانہ کرتے تھے۔اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ان کے زمانے میں موضع ''لکھوکے'' ریاست ممدوٹ میں شامل تھا اور قصبہ ممدوٹ اس ریاست کا دارالحکومت تھا۔پنجاب پر سکھوں کا قبضہ تھا اور ممدوٹ کا حکمران مسلمان تھا جس کا نام نواب قطب الدین تھا۔ایک دن نواب قطب الدین اپنے مصاحبوں اور وزیروں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا۔کسی نے اس سے کہا کہ لکھوکے میں ایک بہت بڑے بزرگ اور عالم دین حافظ بارک اللہ فروکش ہیں' ہم ادھر آئے ہیں تو چلیے ان سے بھی ملتے جائیں۔یہ لوگ ان سے ملاقات کے لیے مسجد میں گئے تو وہ

طلبا کو قرآن و حدیث کا درس دے رہے تھے۔ نواب نے سونے کے کنگن پہن رکھے تھے۔ اس نے حافظ صاحب کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو انھوں نے ہاتھ جھٹک دیے اور فرمایا ہم درویش لوگ دنیاداروں سے منقطع ہو کر مسجد میں بیٹھے ہیں' یہاں بھی یہ لوگ غیر شرعی چیزیں پہن کر ہمارے پاس آتے اور ہمیں پریشان کرتے ہیں ---- یہ الفاظ کہہ کر جلدی سے اٹھے اور تیزی کے ساتھ مسجد کے اندر چلے گئے ---- نواب نے ان کے اس طرز عمل اور اسلوب گفتگو کو گستاخی پر محمول کیا اور اس کا پندار حکمرانی یہ برداشت نہ کر سکا کہ مسجد کا ایک درویش جو اسی کے گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس کی رعیت میں شامل ہے' اس کے حضور اس قسم کا رویہ اختیار کرے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اسے اسی وقت گاؤں سے نکال دیا جائے۔ لوگوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور علاقہ بدری کا یہ سخت حکم واپس لینے کے لیے کہا' لیکن وہ نہیں مانا۔

حافظ صاحب اپنے اہل و عیال اور چند عقیدت مندوں کے ساتھ گاؤں سے نکلے اور دریائے ستلج کے کنارے آ گئے جو وہاں سے تھوڑے فاصلے پر بہتا تھا۔ وہاں سے کشتی پر سوار ہوئے اور ریاست بہاول پور کو روانہ ہو گئے۔ ان کا ارادہ مکہ مکرمہ جانے کا تھا۔

موجودہ جغرافیائی صورت حال کے مطابق وہ ہیڈ سلیمان کی کے قریب "حاصل ساڈو" کے مقام پر اترے اور یہاں انھوں نے پہلا پڑاؤ کیا۔ لیکن لکھو کے سے ان کی روانگی کے بعد یہ حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ بلا ظاہری اسباب و آثار کے دریائے ستلج میں شدید طغیانی آ گئی' جس سے ممدوٹ میں نواب قطب الدین کے باغات و محلات اور شاہی قلعے کو شدید نقصان پہنچا اور نواب اس ناگہانی آفت سے سخت پریشان ہوا۔

اس کے مصاحبوں نے کہا کہ یہ مصیبت اس درویش بزرگ حافظ بارک اللہ کی وجہ سے پیش آئی ہے' جسے آپ نے محض کلمہ حق کہنے کے باعث اپنی ریاست سے نکال دیا ہے ---- اب نواب نے چند تیز رفتار گھڑ سواروں کو حافظ صاحب کے پیچھے دوڑایا اور معزز اہل کاروں کا ایک وفد نواب بہاول پور کے پاس بھیجا کہ وہ یہاں تشریف لائے ہوں تو نہایت اعزاز کے ساتھ انھیں ارکان وفد کے ہمراہ واپس ممدوٹ بھیج دیا جائے۔

حضرت حافظ بارک اللہ کو چند روز کے بعد واپس لایا گیا تو نواب قطب الدین ان سے بے حد تکریم کے ساتھ پیش آیا اور "لکھو کے" گاؤں انھیں بطور جاگیر دینا چاہا' مگر انھوں

نے لینے سے انکار کر دیا۔ فرمایا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس گاؤں کی ضرورت نہیں، دوسری بات یہ کہ ہم وہ زمین نہیں لینا چاہتے، جس کا لگان، اور معاملہ و آبیانہ وغیرہ ہم حکومت کو ادا کرنے پر مجبور ہوں۔

یہاں یہ یاد رہے کہ طغیانی کا یہ واقعہ پیش آنے سے پہلے ریاست کا صدر مقام ممدوٹ تھا، اس کے بعد نواب مذکور جلال آباد منتقل ہو گیا تھا اور اسی شہر کو ریاست کا صدر مقام بنا لیا گیا تھا، چنانچہ تقسیم ملک تک جلال آباد ہی صدر مقام رہا۔ نیز یہ کہ شاہی محلات کے جو حصے دریا کی طغیانی کی زد میں آکر منہدم ہو گئے تھے، تقسیم ملک تک اسی حالت میں تھے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ ۱۲۴۵ھ (۱۸۳۰ء) میں مجاہدین کا ایک قافلہ سید جعفر علی نقوی کی قیادت میں سرحد پار جاتے ہوئے "حاصل ساڈو" کے مقام پر رکا تھا اور ان کی ملاقات حضرت حافظ بارک اللہ لکھوی سے ہوئی تھی، جس کا ذکر سید جعفر علی نقوی نے اپنی کتاب "منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء" کے ورق ۶۳۴ ب پر کیا ہے۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ کتاب تیرہ سو سے زائد صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس کا صرف ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

سید جعفر علی نقوی نے حافظ بارک اللہ لکھوی کی ملاقات سے ستائیں برس بعد ۱۲۷۲ھ میں یہ کتاب لکھی تھی۔ انھوں نے حافظ صاحب اور ان کے معتقدین کا ذکر انتہائی احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"دراں ایام میاں بارک اللہ بزرگے بودند کہ از خان مذکور ناخوشنود شدہ از عمل او بیروں رفتہ بودند، از ایشاں ملاقات نمودم، تلطف بسیار نمودند و مریدان شاں محبت بسیار نمودند"

"یعنی ان دنوں ایک بزرگ میاں بارک اللہ سے ملاقات ہوئی جو خان مذکور (نواب قطب الدین) سے ناخوش تھے اور ریاست بدر کر دیے گئے تھے۔ وہ بہت ہی شفقت اور مہربانی سے پیش آئے، ان کے ارادت مند بھی نہایت محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔"

کتاب کے قلمی نسخے میں "تبارک اللہ" مرقوم ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے۔ "منظورۃ

السعداء‘‘ کئی مرتبہ نقل ہوئی اور مختلف حضرات نے اسے نقل کیا۔ اس کی ایک نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں پہنچی۔ ساڑھے چھے سو ورق اور تیرہ سو سے زائد صفحات میں پھیلی ہوئی یہ کتاب نقل در نقل کے مرحلوں سے گزرتی رہی اور اس طرح کسی نقل نویس نے ”بارک اللہ“ کو ”تبارک اللہ“ بنادیا۔ کتاب میں الفاظ کی اور بھی متعدد غلطیاں ہیں، بعض مقامات کے نام صحیح نہیں لکھے گئے۔ قلمی کتابوں میں بالعموم کتابت کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

نواب ممدوٹ سے پیش آنے والا یہ واقعہ مولا بخش کشتہ مرحوم نے بھی اپنی کتاب ”پنجابی شاعراں دا تذکرہ“ میں بیان کیا ہے، لیکن انھوں نے لکھا ہے کہ اس نواب کا نام جمال الدین تھا۔ کشتہ مرحوم کو نام لکھنے میں غلطی لگی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ اس کا نام نواب قطب الدین تھا۔ منظورۃ السعدا میں قطب الدین ہی لکھا ہے۔

”پنجابی ادب دی کہانی“ میں عبدالغفور قریشی نے بھی حافظ بارک اللہ کا ذکر کیا ہے۔

میں نے یہ واقعہ سب سے پہلے ۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا محمد علی لکھوی سے سنا تھا۔ اس کے بعض مختلف کتابوں میں پڑھا۔

۱۹۵۵ء میں مولانا غلام رسول مہر کی کتاب ”جماعت مجاہدین“ شائع ہوئی تو انھوں نے مجھے یہ کتاب الاعتصام میں تبصرے کے لیے بھیجی۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۰۲ پر انھوں نے ”منظورۃ السعدا“ کے حوالے سے ”تبارک اللہ“ لکھا ہے، میں نے تبصرے میں بھی اور خط کے ذریعے بھی مہر صاحب مرحوم کو توجہ دلائی کہ اصل نام بارک اللہ ہے، تبارک اللہ نہیں ---- اسی اثنا میں ان کی زیر تصنیف کتاب ”سرگزشت مجاہدین“ کے لیے میں نے مولانا محمد علی لکھوی کے مختصر حالات انھیں لکھ بھیجے تو انھوں نے مولانا کے تذکرے کے ضمن میں حافظ صاحب کے نام کی تصحیح کر کے اسے ”بارک اللہ“ بنادیا اور میرے حوالے سے کتاب کے صفحہ ۶۵۰ اور صفحہ ۶۵۱ پر مولانا کا ذکر کیا۔

میں نے بھی حافظ بارک اللہ کے حالات اپنی تصنیف ”فقہائے پاک و ہند“ کی تیرھویں صدی ہجری کی جلد اول میں (صفحہ ۱۱۹ تا ۱۳۹) بیس صفحات میں لکھے ہیں۔

حافظ بارک اللہ لکھوی باعمل عالم اور نہایت متقی بزرگ تھے۔ پنجابی کے شاعر تھے۔ ”انواع بارک اللہ“ کے نام سے انھوں نے پنجابی اشعار میں ایک کتاب تصنیف کی جو شرعی

مسائل پر مشتمل اور سوا چار سو صفحات پر محیط ہے---انھوں نے اور ان کے بیٹے حضرت حافظ محمد لکھوی نے اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ جاری کیا تھا' جس میں مختلف ادوار کے بہت سے علمانے تحصیل علم کی۔

حافظ بارک اللہ نے ۸۶-۸۷ سال کی عمر میں ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۱ء) کو وفات پائی اور اپنے گاؤں لکھوکے میں دفن کیے گئے۔

ان کے فرزند گرامی حافظ محمد لکھوی تھے' جنھوں نے ہندوستان کے نامور اہل علم سے استفادہ کیا۔وہ پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے۔انھوں نے سات ضخیم جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر پنجابی اشعار میں لکھی' جس کا نام "تفسیر محمدی" رکھا۔احوال قیامت میں "احوال الآخرت" لکھی' مسائل فقہ میں "زینت الاسلام" تصنیف کی جو دو جلدوں پر محتوی ہے۔ عربی میں حدیث کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد کے حواشی تحریر کیے۔مشکوۃ کا حاشیہ سپرد قلم فرمایا----"انواع محمدی" کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں پنجابی اشعار میں دینی و فقہی مسائل معرض بیان میں لائے گئے ہیں۔

دینی مدارس میں ایک کتاب "ابواب الصرف" پڑھائی جاتی ہے اور طلبا کو اس کے ابواب زبانی یاد کرائے جاتے ہیں' یہ کتاب حضرت حافظ محمد لکھوی کی تصنیف ہے---اسی طرح فارسی نظم میں "قوانین الصرف" لکھی' جس میں عربی علم صرف کے قواعد بیان کیے گئے ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں جو پنجاب میں عام طور سے پڑھی جاتی تھیں۔مرد اور عورتیں ان سے خوب استفادہ کرتے تھے۔دیہات و قصبات میں بالخصوص ان کتابوں کی بہت مانگ تھی۔اب بھی انھیں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔حقیقت یہ ہے کہ حضرت حافظ محمد لکھوی کا دائرۂ علم اور حلقۂ اثر بے حد وسیع تھا۔

حضرت حافظ صاحب نہایت ذہین اور تیز فہم عالم تھے۔۱۸۵۷ء کے جہاد حریت سے قبل وہ دہلی میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے حلقہ درس میں شامل تھے۔میاں صاحب ان کی ذہانت اور علمی استعداد و قابلیت کے بے حد معترف و مداح تھے۔فرمایا کرتے تھے کہ میرے حلقہ درس میں ایک پنجابی طالب علم حافظ محمد شامل ہے جو اس درجے ذہین اور قوت اخذ کا مالک ہے کہ میری زبان سے بات نکلنے سے پہلے ہی سمجھ لیتا ہے کہ میں کیا کہنا

چاہتا ہوں۔

ان کا حافظہ اس قدر قوی اور مضبوط تھا کہ جس کتاب پر ایک مرتبہ نظر ڈالی' اس کے حوالے اور صفحوں کے صفحے زبانی یاد ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت میاں صاحب ازراہ تفنن طبع انھیں مہتمم کتب خانہ کے لقب سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

حافظ صاحب نے فارسی' صرف و نحو' معانی' منطق' فقہ' اصول فقہ اور تجوید وغیرہ اکثر علوم عربیہ کی تحصیل اپنے والد محترم حافظ بارک اللہ لکھوی سے کی تھی' سلسلہ بیعت بھی انہی سے تھا۔ سند حدیث شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی اور مولانا احمد علی سہارن پوری سے حاصل کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد میر محبوب علی سے بھی استفادہ کیا۔

لکھو کے میں حافظ بارک اللہ اور حافظ محمد لکھوی دونوں باپ بیٹے نے مدرسہ جاری کیا۔ اس کا ذکر ایک کتاب "تاریخ پرگنہ مکتسر و ممدوٹ" میں واضح الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف سید نثار علی ہیں۔ وکٹوریہ پریس لاہور میں یہ کتاب ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے صفحہ ۸ کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمایے۔

"یہ بہت نیک اور مشہور لوگ ہیں۔ ذی علم ہونے کی وجہ سے مولوی کہلاتے ہیں۔ اکثر لوگ انھیں وہابی کہتے ہیں۔ لہٰذا (لکھو کے) میں ان کے خاندان میں عالم ہوتے رہے ہیں اور مولوی صاحب (حافظ بارک اللہ) کے باعث چرچا علم بہے (بہت) اچھا رہتا ہے' بلکہ بعض طلبا سوائے فارسی کے علم عربی بھی تحصیل کرتے ہیں۔ اور ان کو سرکار (ممدوٹ) کی طرف سے دو چاہ ملے ہوئے ہیں۔ گاؤں کچا ہے' مگر وہاں کی مسجد پختہ ہے جو حافظ محمد صاحب کے اہتمام میں فیض بخش قوم کمبوہ ارائیں ساکن فیروزپور تھانے دار ضلع نے تعمیر کرائی ہے۔"

لکھو کے کے مدرسے کا نام مدرسہ محمدیہ تھا۔ اس میں حافظ صاحب خود اور ان کے ساتھ ان کے بھتیجے حضرت مولانا عبدالقادر محدث لکھوی فرائض تدریس انجام دیتے تھے۔ مولانا عبدالقادر کے صاحب زادۂ گرامی قدر مولانا عطاء اللہ لکھوی تھے جو استاذ پنجاب کے لقب سے معروف ہیں۔ وہ حافظ محمد صاحب کے داماد تھے۔ ان کے حالات ان شاء اللہ الگ مضمون میں معرض تحریر میں لائے جائیں گے۔ انھوں نے چوالیس سال اس مدرسے میں خدمت تدریس انجام دی۔ مولانا عبدالقادر لکھوی نے ۱۹۲۴ء میں اور ان کے فرزند گرامی

مولانا عطاء اللہ لکھوی نے دسمبر ۱۹۵۲ء میں وفات پائی، رحمہم اللہ تعالیٰ

حضرت حافظ محمد لکھوی کو پتھری کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا' اپریشن کرایا مگر کامیاب نہ ہوا۔ اسی عارضے سے ۱۳- صفر ۱۳۱۱ھ (اکتوبر ۱۸۹۳) کو لکھو کے میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔

حافظ محمد لکھوی کے دو بیٹے تھے۔ بڑے مولانا محی الدین اور چھوٹے مولانا محمد حسین۔!

حافظ محمد کچھ عرصہ اولاد نرینہ سے محروم رہے۔ انھوں نے اللہ سے دعا مانگی اور عہد کیا کہ اگر ان کے بیٹا پیدا ہوا تو وہ اسے راہ خدا میں وقف کر دیں گے۔ دعا قبول ہوئی اور اللہ نے انھیں بیٹا عطا فرمایا' جس کا نام محی الدین رکھا۔ اس کے بعد ایک اور بیٹے کی ولادت ہوئی' جن کا نام محمد حسین رکھا۔ یہ بھی ممتاز عالم اور مدرس تھے۔ ۱۸۷۶ء میں پیدا اور ستمبر ۱۹۴۳ میں فوت ہوئے۔ ان سطور کے راقم کو ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔

مولانا محی الدین جید عالم اور نہایت متقی بزرگ تھے۔ ان سے بہت لوگوں نے کسب فیض کیا' بے شمار علما و طلبا ان کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور ان سے حصول علم کیا۔ انھوں نے علم حدیث دہلی جا کر حضرت سید میاں نذیر حسین دہلویؒ سے حاصل کیا تھا۔

حضرت حافظ محمد لکھوی کو جب حضرت مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے علم و عرفان اور اتقا و صالحیت کا پتا چلا تو اپنے اس صاحب زادے مولانا محی الدین کو حصول فیض کے لیے ان کی خدمت میں غزنی بھیجا۔ حضرت عبداللہ صاحب انھیں دیکھ کر اور ان سے مل کر انتہائی خوش ہوئے۔ انھوں نے ان کا نام عبدالرحمٰن رکھا' چنانچہ وہ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے نام سے معروف ہوئے۔ وہ یکے بعد دیگرے دو مرتبہ حضرت عبداللہ غزنوی کی خدمت میں غزنی گئے۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی فرمایا کرتے تھے کہ جب وہ لکھو کے سے غزنی کو روانہ ہوئے تو حافظ محمد صاحب نے ان کو سو روپے زاد راہ کے طور پر دیے تھے۔ مولانا کہا کرتے تھے کہ یہ اس دور میں بہت بڑی رقم تھی جو باپ نے بیٹے کو دی۔ وہ تعجب و حیرت کے انداز میں ارشاد فرمایا کرتے تھے:

"سو روپے وپے' سو روپے"

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں فرط جذبات سے آنسو آجاتے تھے۔

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی بہ درجہ غایت متقی اور پیکر زہد و عبادت تھے۔ نماز

انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے تھے۔

نواب وحید الزمان حیدر آبادی ان کی نماز کے سلسلے میں تسہیل القاری (اردو ترجمہ صحیح بخاری) پارہ پنجم صفحہ ۱۴۰-۱۴۱ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ہمارے شیخ اتقی زماں مولوی عبدالرحمٰنؒ صاحب ساکن لکھوکے فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص نماز کے معنی نہیں جانتا' اس کی نماز نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ جو شخص اس مسئلے میں ان کے خلاف پر اصرار کرتا تو اس سے مباہلے پر تیار ہو جاتے۔"

نواب وحید الزماں خاں صاحب کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کے شاگرد تھے اور ان سے مستفید ہوئے تھے۔

حضرت مولانا کی نماز کی طوالت' رکوع و سجود کی اطمینان و سکون سے ادائی اور خشوع و خضوع کی اس نواح میں بڑی شہرت تھی۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ بھی سننے میں آیا تھا۔ اگر بزرگوں کے تذکرے میں لطیفہ بیان کرنے کو سوءِ ادب نہ قرار دیا جائے تو عرض کروں۔

کہتے ہیں کسی شخص کا اونٹ گم ہو گیا تھا۔ وہ اونٹ تلاش کرتا کرتا لکھوکے آیا تو دیکھا کہ لوگ مسجد میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ اسے نماز پڑھنے کی عادت نہ تھی' تاہم وہ اس خیال سے نماز میں شامل ہو گیا کہ نماز کے بعد لوگوں سے اونٹ کے بارے میں دریافت کرے گا۔ جماعت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن صاحب کرا رہے تھے۔ وہ سجدے میں گئے تو سجدہ اس درجہ طویل تھا کہ اس شخص کے لیے امام کا ساتھ دینا مشکل ہو گیا' اور اٹھ کر چلا گیا ----- چھ مہینے کے بعد اس کی ایک شخص سے ملاقات ہوئی۔

پوچھا: کہاں کے رہنے والے ہو؟

جواب دیا: لکھوکے کا --!

پوچھا: تمھارے امام صاحب سجدے سے اٹھے یا نہیں؟

یہ تو ایک لطیفہ تھا' ممکن ہے واقعہ بھی ہو اور اسی طرح پیش آیا ہو۔ ویسے بھی ہم گنہگاروں کا گزارہ لطیفوں ہی پر ہے۔ ہم لطیفے سنتے اور آگے بیان کرتے رہتے ہیں ----- لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انتہائی عبادت گزار اور نہایت پرہیز گار بزرگ تھے۔ بارگاہ خداوندی سے انھیں علم کی بے پناہ دولت سے بھی نوازا گیا تھا اور خوف و خشیت اور انابت الی اللہ کی متاعِ بے بہا بھی ان کے حصے آئی تھی۔

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن حج بیت اللہ کے لیے گئے اور اپنے والد کی وفات سے دو سال بعد ۱۳۱۳ھ کو مسجد نبوی میں بحالت سجدہ فوت ہوئے اور جنت البقیع میں شرقی دیوار کے ساتھ دفن کیے گئے۔

غزنوی اور لکھوی خاندانوں کے باہمی تعلقات اسی دور سے قائم ہیں جب مولانا محی الدین عبدالرحمٰن غزنی گئے تھے۔ چونکہ تعلقات کی بنیاد خالص روحانیت اور نیکی پر مبنی تھی' اس لیے دونوں خاندانوں کے پرانے بزرگ ان تعلقات کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی لکھوی علما کا تذکرہ انتہائی احترام کے ساتھ کیا کرتے تھے' اور مولانا محمد علی لکھوی جس تکریم کے ساتھ غزنوی اہل علم کا ذکر فرمایا کرتے تھے' اس کا اندازہ ان کے اس مکتوب گرامی سے ہوگا جو انھوں نے مولانا داؤد غزنوی کی وفات پر ارسال کیا تھا۔ وہ مکتوب آئندہ صفحات میں درج کیا جارہا ہے۔

مولانا معین الدین لکھوی نے ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں حافظ محمد لکھوی کی کتاب "احوال الآخرت" شائع کی تھی۔ اس کے آخر میں انھوں نے حافظ صاحب اور اپنے خاندان کے بعض بزرگوں کے مختصر حالات بیان کیے ہیں۔ ایک مکتوب گرامی بھی درج کیا ہے جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی نے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں حافظ محمد لکھوی اور ان کے فرزند گرامی قدر مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے نام تحریر فرمایا تھا۔ یہ مکتوب حضرت میاں صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا مولانا معین الدین کے والد نام دار حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے پاس محفوظ تھا جو ہمارے نزدیک نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمی اعتبار سے حضرت میاں صاحب کی نظر میں حافظ محمد لکھوی اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن کس قدر و منزلت کے حامل تھے۔ مکتوب فارسی میں ہے۔

مولانا معین الدین نے اس مکتوب گرامی کو "ایک علمی یادگار" قرار دیا ہے اور بہ صورت عنوان لکھا ہے "مجدد العصر جناب مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی قدس اللہ روحہ کا مکتوب گرامی مصنف احوال الآخرت اور ان کے فرزند ارجمند مولانا عبدالرحمٰن کے نام-----" جی چاہتا ہے یہ مکتوب گرامی ہمارے اصحاب تکریم قارئین بھی ملاحظہ فرمالیں۔ نیچے میاں صاحب کے نام کی مہر ہے جس میں یہ الفاظ کندہ ہیں۔

سید محمد نذیر حسین ۱۲۸۱

اب ذیل میں وہ مکتوب ملاحظہ فرمایے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از جانب اضعف العباد' عائذ باللہ' طالب الحسنیین' سید محمد نذیر حسین عافاہ اللہ تعالیٰ فی الدارین۔ بخدمت بابرکت کاملین' وزاہدین صالحین مولوی حافظ محمد بن المرحوم مولوی بارک اللہ سلمہ ربہ و فرزند ارجمند ایشاں محدث و عالم باعمل مولوی عبدالرحمٰن بن مولوی محمد سلمہما اللہ ساکنین لکھوکے۔ بعد از سلام مسنون و دعاء اجابت مقرون' مبرہن رائے لطافت' پیرائے گرداد کہ برخوردار حافظ عبدالغنی را اشتیاق تحصیل علوم دینیہ شد' و در وطن خود برائے تحصیل آں فارغ البال گشتن محال مے داند' و دریافتن آں بجز سفر کردن مشکل بلکہ غیر ممکن می انگارد۔ داز اشغال دنیوی با فراغت نشستن بغایت دشوار۔

لہٰذا چونکہ تبحر شما در علوم معتد بہا شنیدہ بود' بنابریں پیش من بسیار الحاح کرد کہ مرا سفارش نوشتہ عنایت فرمائید۔ مرجوے او برآردم۔ پس از راہ عنایت بشفقت تام و رافت تمام بہ تہذیب دینی و دنیوی ایں توجہ فرمائید و بہ نصح کامل تربیت ایں فرمایند داز علومیکہ جہل آنہا بہتر باشد تخویف نمائند' و سوائے ایں ہر چہ مناسب دانند مرحمت فرما باشند' و ایں برخوردار نیک عقیدہ و خوش مشرب است' زیادہ والسلام مع الاکرام' آخر الکلام و خیر الختام' الحمدللّٰہ رب العالمین و الصلوۃ و السلام علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و صحبہ و عترتہ و اھل بیتہ اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

العبد

خادم المومنین سید محمد نذیر حسین عفا اللہ عنہ

یہ تھا مولانا محمد علی لکھوی کا خاندان' اور یہ تھی ان کے خاندان کی خدمات بوقلموں کی ایک جھلک۔

اب خود مولانا محمد علی کے بارے میں چند باتیں ملاحظہ فرمایے۔

محمد علی ۱۳۰۷ھ (۱۸۹۰ء) میں حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے گھر پیدا ہوے۔ ان کی ولادت سے پہلے حضرت مولانا کے دو یا تین بیٹے بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ محمد علی پیدا ہوئے تو گھر میں اور رشتے داروں میں انتہائی خوشی منائی گئی اور بچے کی درازی عمر اور بہتر مستقبل کے لیے بارگاہ خداوندی میں دعائیں مانگی گئیں۔

وہ انتہائی سستا زمانہ تھا- ہر چیز سستی تھی' لیکن پیسہ بہت مہنگا تھا' جس کا میسر آنا نہایت مشکل تھا' تاہم اس عہد کے مطابق قرابت داروں اور تعلق والوں نے بچے کو ازراہ مسرت اچھے خاصے پیسے اور کپڑے وغیرہ دیے--- میں نے ان کے فرزندِ گرامی مولانا معین الدین لکھوی کے پاس اس زمانے کے پرانے کاغذات دیکھے ہیں' جن میں لکھا ہے کہ فلاں شخص نے دو آنے دیے اور فلاں نے چار آنے- اس طرح مختلف لوگوں نے جو کچھ بچے کو دیا' وہ سب مرقوم ہے- ان کے ننھیال نے سب سے زیادہ اظہار مسرت کیا' انھوں نے بیس "پنیاں" بنا کر بھیجیں- شاید یہ چاولوں کی پنیاں ہوں گی اور ان میں گھی اور گرمی وغیرہ چیزیں ڈالی گئی ہوں گی- اس زمانے میں دو چار آنے یا پنیاں بڑی گراں قدر چیزیں تھیں-

مولانا محمد علی کی پیدائش سے قبل ان کے والد مکرم حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمٰن نے مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا اور مرزا صاحب نے غصے میں آ کر پیش گوئی کی تھی کہ یہ اولاد نرینہ سے محروم رہیں گے --- مرزا صاحب کے بارے میں جو حضرات تھوڑی بہت معلومات رکھتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ ان کی پیش گوئیاں اسی قسم کی ہوتی تھیں اور اسی قسم کے ان کے الہام ہوتے تھے- یعنی منفی' مثلاً ان کے الہام ہیں کم ترین کا بیڑا غرق ----- زلزلہ آئے گا----- یہی حال ان کی پیش گوئیوں کا تھا- فلاں شخص مر جائے گا ----- فلاں کو تکلیف پہنچے گی----- خیر کی بات ان کے منہ سے مشکل ہی سے نکلتی تھی' الہاموں کی صورت میں بھی اور پیش گوئیوں کی صورت میں بھی-----!

۷ ۱۹۳ء کے جون کا مہینا تھا کہ مولانا محمد علی کے بڑے صاحب زادے مولانا محی الدین لکھوی کے گھر بیٹا پیدا ہوا' جس کا نام مولانا محمد علی نے اپنے جد امجد کے نام پر حافظ محمد رکھا- جمعے کے روز مرکز الاسلام میں بچے کا عقیقہ تھا- مولانا نے خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا- میں اس وقت مرکز الاسلام میں طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھا اور حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں فرائض تدریس انجام دیتے تھے- مولانا محمد علی نے خطبہ جمعہ میں اپنی پیدائش کا واقعہ بیان کیا اور فرمایا: "میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بددعا کا نتیجہ ہوں"----- یہ الفاظ انھوں نے کچھ اس انداز سے کہے اور پورا واقعہ اس اسلوب سے ان کی زبان سے ادا ہوا کہ سامعین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے-

محمد علی کی عمر چار سال کی تھی کہ ان کے والد مولانا محی الدین عبدالرحمٰن حج کو روانہ

ہوئے-روانگی کے وقت انھوں نے فرمایا تھا کہ مجھے اللہ کی طرف سے القا ہوا ہے کہ "تیرا بیٹا امام ہوگا-"

حج کو جاتے وقت انھوں نے اہل خانہ کو تاکید کی کہ بچے کا خیال رکھیں----لیکن جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا وہ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں نماز پڑھتے ہوئے حالت سجدہ میں وفات پاگئے تھے-اور اس طرح محمد علی بچپن ہی میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے-

ان کی بڑی بہنوں کا بیان ہے کہ بچپن میں وہ پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اکٹھے کر کے انھیں ایک دوسرے سے جوڑنا شروع کر دیتے---کہا کرتے یہ کتابیں ہیں' انھیں ترتیب سے رکھ رہا ہوں-

والد صاحب کی وفات کے بعد انھیں سرکاری سکول میں داخل کرادیا گیا تھا-سکول میں صرف تین جماعتیں پڑھیں' پھر دینیات کی تعلیم حاصل کرنے لگے-گھر میں علم کی نہر بہہ رہی تھی اور آبائی مدرسے میں حضرت مولانا عبدالقادر محدث لکھوی کا سلسلہ درس جاری تھا' ان سے صرف و نحو اور دیگر علوم کی بعض کتابیں پڑھیں-اس کے بعد امرتسر کا عزم کیا اور مدرسہ غزنویہ کے بعض اساتذہ سے مستفید ہوئے-ان دنوں حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی کی مسند درس آراستہ تھی' ان سے بھی کسب علم فرمایا-وہ اپنے اس شاگرد سے بے حد محبت رکھتے تھے-یہی وہ زمانہ تھا جب وزیر آباد (ضلع گوجرانوالہ) میں حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی تدریس حدیث میں مشغول تھے اور وسیع تعداد میں علما و طلبا ان سے استفادہ کر رہے تھے-مولانا محمد علی بھی عازم وزیر آباد ہوئے اور حضرت حافظ صاحب سے درس حدیث لیا اور سند فراغ حاصل کی-

کچھ عرصہ وہ لاہور میں بھی تعلیم حاصل کرتے رہے-ایک مرتبہ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ طلبا کے ساتھ بادشاہی مسجد کے صحن میں استاد کے حضور بیٹھے پڑھ رہے تھے کہ شدید زلزلہ آیا اور مسجد کے مینار ایک دم جھک گئے' ایسے معلوم ہوا کہ زمین پر گرنے لگے ہیں-

یہ ۱۹۰۴ء کی بات ہے' جب کہ کانگڑہ میں زلزلہ آیا تھا-اس وقت مولانا مدرسہ نعمانیہ میں تعلیم حاصل کرتے تھے-مولانا عطاء اللہ لکھوی اور مولوی احمد الدین لکھوی بھی وہیں تھے اور ان کے اہم درس تھے-

کچھ ایسا ذہن میں آرہا ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ کچھ عرصہ وہ لاہور میں حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی کے حلقہ درس میں بھی شامل رہے ہیں اور ان سے کسب فیض کیا ہے۔

مروّجہ علوم کی تحصیل انھوں نے کس سال کی اور کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں پڑھیں؟ اس سوال کا مفصل جواب ہمیں کہیں سے نہیں ملتا۔

اس قسم کے مواقع پر ذہن دیوبندی اصحاب علم کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ان کے لائق تلامذہ اپنے علماے کرام اور اساتذہ عظام کی شب و روز کی تمام سرگرمیوں پر نگاہ رکھتے اور انھیں ضبط تحریر میں لانے کی سعی کرتے ہیں۔ افسوس ہے اہل حدیث حضرات اس اہم نقطے کو لائق التفات نہیں گردانتے۔ ان میں سے بعض حضرات اس قسم کے کام چھوڑ کر آج کل صوفیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے اسلام کی کوئی خدمت نہیں کی اور یہ غلط کردار لوگ ہیں۔

ممکن ہے ان کا واسطہ ایسے ہی لوگوں سے پڑا ہو جنھیں صوفی کہا جاتا ہے' اور وہ غلط کردار ہیں' حالانکہ غلط کردار علماے دین اور حفاظ قرآن بھی ہو سکتے ہیں۔ غلط کرداری کسی صوفی کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے' ہمارا واسطہ کسی غلط کردار صوفی سے نہیں پڑا۔ ہمارا تعلق ہمیشہ نیک سیرت صوفیا اور عالی مرتبت اہل علم سے رہا ہے۔

ان حضرات کی خدمت میں نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ ہر دور اور ہر علاقے میں اہل علم کے لیے کچھ الفاظ رواج پا جاتے ہیں' مثلاً کسی زمانے میں بہت پڑھے لکھے شخص کو "ملا" کہا جاتا تھا۔ یہ فارسی لفظ ہے جو ہندوستان میں آیا اور اہل علم کے لیے استعمال ہونے لگا۔ ترکی اور بخارا و سمرقند وغیرہ ملکوں کے علما پر بالخصوص اس لفظ کا اطلاق ہوتا تھا۔

"صوفی" کا لفظ بھی نیک اور متدین لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔۔۔ اہل علم کو "مولوی" بھی کہا گیا اور کہا جاتا ہے۔ اب "مولوی" کے لفظ کو حقیر سمجھا جاتا ہے۔ اور علما کو "مولانا" کہا جاتا ہے' حالانکہ قرآن کی رو سے "مولانا" اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے' جیسا کہ سورہ بقرہ کی آخری آیت کے آخری الفاظ میں فرمایا گیا ہے "انت مولانا" (اے ہمارے پروردگار تو ہی ہمارا کارساز ہے) نیز سورہ توبہ کی آیت نمبر ۵۱ میں ارشاد ہے "ھو مولانا" (وہی ہمارا کارساز ہے)۔

تعجب ہے ان کے نزدیک "صوفی" کہنا یا کہلانا تو غلط ہے لیکن مولانا کہلانا صحیح ہے' یعنی جس لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے' وہ علما کے لیے استعمال کرو۔

کچھ لوگوں کو علامہ اور علام کہا جاتا ہے' حالانکہ "علام" کا لفظ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے' ملاحظہ کیجیے سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۱۰۹ اور آیت نمبر ۱۱۶۔ نیز دیکھیے سورہ توبہ کی آیت نمبر ۷۸ اور سورہ سبا کی آیت نمبر ۴۸ -- علام الغیوب۔

بعض نوجوان سعودی عرب اور کویت وغیرہ جانے کے بعد حضرات اہل علم کو "شیخ" کہنے لگے ہیں۔ حالانکہ عربی میں "شیخ" بوڑھے آدمی کو کہا جاتا ہے اور پنجابی میں نمک مرچ اور گڑ شکر بیچنے والے دکان دار کو شیخ صاحب کہا جاتا ہے۔ "میں شیخ کی دکان سے یہ سودا لایا" اس باریکی میں کوئی نہیں جاتا کہ حرف شین پر زبر ہے یا زیر۔ اسی طرح جو شخص کالج میں پڑھانے لگے ہم اسے پروفیسر کہتے ہیں' حالانکہ وہ لیکچرار ہوتا ہے -----

برصغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش وغیرہ ملکوں میں "سید" کا اطلاق مسلمانوں کے ایک خاص طبقے اور برادری پر ہوتا ہے۔ لیکن عرب اسے "جناب" کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور غیر مسلموں کو بھی "سید" کہتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے آں جہانی وزیر اعظم جواہر لال نہرو اور وزیر خارجہ سورن سنگھ سعودی عرب کے دورے پر گئے تو وہاں کے اخباروں نے ان کو "سید جواہر لال نہرو" اور "سید سورن سنگھ" لکھا ----- اور پاکستان کے اخبارات میں "سید" کے اس اطلاق پر بہت سے لطیفے پیدا ہوئے۔

قرآن مجید میں "سید" کا لفظ شوہر کے معنوں میں آیا ہے۔ سورہ یوسف کی آیت نمبر ۲۵ میں فرمایا گیا ہے والفیا سیدھا لدا الباب ----- اب بتایے عربوں کے ساتھ ہم لڑائی کریں کہ تم نے ان کو "سید" کیوں کہا' ہم تو انھیں کافر کہتے ہیں ----- پھر اللہ تعالیٰ سے کس طرح یہ کہیں کہ آپ نے زلیخا کے کافر شوہر کو "سید" بنا دیا۔

سچی بات ہے ہم نہ تو عربوں سے اس سلسلے میں کچھ کہنے کی ہمت رکھتے ہیں اور نہ اللہ تعالیٰ کے حضور کچھ عرض کر سکتے ہیں ----- یہ سیدوں کا مسئلہ ہے۔ وہ اکٹھے ہو کر بے شک عربوں سے بھی احتجاج کریں کہ وہ کافروں کو کیوں "سید" کہتے ہیں اور شوق سے اللہ میاں کے خلاف بھی جلوس نکالیں کہ اس نے کافر کو سید کہا۔

محدثین کی اصطلاح میں "حافظ" کا لفظ ماہر حدیث پر بولا جاتا ہے' لیکن ہم اسے حافظ

کہتے ہیں جس نے قرآن مجید یاد کیا ہو' بلکہ ہمارے ہاں اندھے کو بھی حافظ کہا جاتا ہے- اس طرح ہر دور اور ہر علاقے میں بعض الفاظ کے معنے بدل جاتے ہیں اور ان کا محل استعمال کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے-

قرآن کی زبان میں "کافر" اللہ کے نافرمان کو کہا گیا ہے اور شاعری کی بولی میں پیار سے محبوب کو کافر کہتے ہیں-

بات دور چلی گئی' ہم دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پنجاب میں دو ہی خاندان ہیں جن سے اہل حدیث حضرات نے خاص طور سے استفادہ کیا' وہ ہیں غزنوی اور لکھوی خاندان---!

غزنویوں کا مدرسہ غزنویہ سلفیہ امرتسر میں اور لکھوی علما کا لکھوکے میں مدرسہ محمدیہ کے نام سے جاری تھا اور شائقین علم وہاں جا کر حصول علم کرتے تھے- اب لکھویوں کا دارالعلوم جامعہ محمدیہ کے نام سے اوکاڑا میں قائم ہے' جس کے ناظم مولانا معین الدین لکھوی ہیں اور غزنویوں کا دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے نام سے شیش محل روڈ لاہور میں جاری ہے-!

کسی زمانے میں تو اس شخص کو پورا عالم نہیں سمجھا جاتا تھا' جس نے ان دونوں یاد دنوں میں سے کسی ایک مقام کے مدرسے میں علم نہ حاصل کیا ہوتا---- تمام بڑے بڑے علما نے ان خاندانوں کے اصحاب علم کی طرف رجوع کیا اور علوم متداولہ سے بہرہ مند ہوئے ----- حضرت مولانا حافظ عبداللہ روپڑی مسلک اہل حدیث کے مایہ ناز عالم تھے' انھوں نے مدرسہ غزنویہ میں بھی تعلیم حاصل کی اور لکھوکے میں بھی ---! حضرت حافظ محمد گوندلوی نے غزنوی علما کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیا- مولانا محمد اسماعیل صاحب سلفی نے بھی اس مدرسے کا رخ فرمایا- حضرت مولانا نیک محمد مدرسہ غزنویہ کے اساتذہ سے مستفید ہوئے اور پھر فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسی مدرسے کے شیخ الحدیث مقرر کیے گئے-

پنجاب اور کشمیر کے علاوہ ہندوستان کے دیگر صوبوں کے تشنگان علوم نے بھی ان مدارس میں آ کر اپنی علمی تشنگی بجھائی- گزشتہ صفحات میں ہم نے حضرت میاں سید محمد نذیر حسین دہلوی کا حضرت حافظ محمد لکھوی اور مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کے نام مکتوب گرامی پڑھا' جس میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک طالب علم حافظ عبدالغنی کو وہ دہلی سے

ان کی خدمت میں لکھو کے بھیج رہے ہیں کہ وہ اسے اپنے مدرسے میں داخل فرمائیں اور اسے تعلیم سے آراستہ کریں۔ پھر مولانا عبدالوہاب دہلوی' مولانا عبدالواحد غزنوی' مولانا احمد علی غزنوی اور قدیم علما میں سے بہت سے علمانے ان سے استفادہ کیا۔ مشہور مدرس و عالم مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی راجستان کے علاقے جودھ پور سے تشریف لائے اور لکھو کے آکر علم حاصل کیا۔

غزنوی علمانے لکھو کے میں اور لکھوی علمانے مدرسہ غزنویہ میں داخلے لیے۔ اس طرح ان دونوں خاندانوں کے درمیان دینی رشتہ قائم ہوا اور افادہ و استفادہ کے تعلقات استوار ہوئے ----- لیکن افسوس ہے ان علمائے عالی مقام کے مفصل حالات خود ان کے اخلاف میں سے بھی کسی نے قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی' حالانکہ وہ اللہ کے فضل سے اہل علم ہیں اور انھیں جو عزت و شہرت حاصل ہے' اس کی اصل وجہ ان کے یہی اسلاف ہیں۔ جن کے حالات سے یہ ناواقف ہیں یا واقف ہیں تو انھیں تمام لوگوں کے علم میں لانا مناسب نہیں سمجھتے۔

بات حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے متعلق ہو رہی تھی ----- یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ علوم مروجہ کی تحصیل سے کب فارغ ہوئے اور کتنی عمر میں ہوئے ----- البتہ اتنا پتا چلتا ہے کہ علوم سے فراغت کے بعد انھوں نے لکھو کے آکر اپنے آبائی مدرسے میں تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا -----

ابتدائی دورِ زندگی ہی سے وہ انگریزی حکومت کے شدید مخالف تھے اور سرحد پار کی جماعت مجاہدین کے حامی تھے۔ چنانچہ انھوں نے لکھو کے میں نہر سے چند گز کے فاصلے پر اپنی زمین میں دارالاسلام کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا' جس میں وہ طلبا کو علوم دینیہ کی تعلیم بھی دیتے تھے اور ورزش وغیرہ کے ذریعے ان کی جسمانی تربیت بھی کرتے تھے۔ اس ادارے کا اصل مقصد مجاہدین تیار کرنا تھا جو چمرکنڈ کے مرکز مجاہدین میں جا کر انگریزوں کے خلاف جنگ کریں۔ وہ خود بھی خفیہ طور سے وہاں گئے تھے اور کچھ عرصہ وہاں رہ کر اس نواح کے حالات معلوم کیے تھے۔

میں ۱۹۳۷ء میں "مرکز الاسلام" گیا تو لکھو کے جا کر وہ جگہ دیکھی تھی جس کا نام مولانا نے "دارالاسلام" رکھا تھا۔ اس وقت وہ ادارہ ختم ہو گیا تھا' لیکن اس کی کچی دیواریں اور

دو تین کچے کمرے موجود تھے' جن میں ان کے مزارعوں نے ڈھور ڈنگر باندھ رکھے تھے۔ یعنی "دار" کے نشانات دکھائی دیتے تھے' لیکن "الاسلام" کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

پھر ۱۹۲۸ء کے لگ بھگ وہ لکھوکے سے دو ڈھائی میل دور آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہ جگہ پینتالیس ایکڑ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا نام انھوں نے "مرکز الاسلام" رکھا تھا۔ وہ بڑے باہمت اور جفاکش عالمِ دین تھے۔ خود ہی مٹی کی بڑی بڑی اینٹیں تیار کیں اور اپنے ہاتھوں سے پینتالیس ایکٹر میں سے دو ایکڑ زمین کے ارد گرد چار دیواری بنائی۔ درخت کاٹ کر چھتوں کا سامان تیار کیا اور دس بارہ کمرے یا کوٹھے تعمیر کیے۔ یہاں بھی اصل مقصد طلبا کو تعلیم دینا اور جنگل کی کھلی فضا میں مجاہدین تیار کر کے چمر کنڈ کے مرکز مجاہدین میں بھیجنا تھا' چنانچہ انھوں نے مختلف اوقات میں کئی مجاہدین وہاں بھیجے اور پھر وہ واپس بھی آئے۔ میں نے ان میں سے بعض کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہ مرکز مجاہدین کے واقعات سناتے اور ان کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے ----- ان دنوں مولانا کے پاس کچھ اجنبی سے لوگ آیا کرتے تھے جو ان سے علیحدگی میں باتیں کرتے' کئی کئی دن وہاں رہتے اور پھر چلے جاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔

وہاں آنے والوں میں ایک صاحب کا نام مجھے یاد پڑتا ہے' احمد تھا۔ انھیں شاہ صاحب کہا جاتا تھا۔ وہ قدرے چھوٹے قد کے گورے چٹے آدمی تھے۔ انتہائی خوش مزاج اور خوش طبع ----- خود بھی ہنستے' دوسروں کو بھی ہنساتے۔ مختلف فقہی مسالک کے لوگ جس انداز سے نماز پڑھتے ہیں' اس کی وہ خوب نقل اتارتے تھے۔ ۱۹۳۷ء سے قبل وہ مرکز الاسلام میں بطور طالب علم رہے تھے اور چمر کنڈ کے مرکز مجاہدین میں بھی گئے اور شریکِ جہاد ہوئے تھے ----- محی الدین اور معین الدین کے بے تکلف دوست تھے۔ کئی کئی دن وہ مرکز الاسلام میں رہتے تھے۔

ایک نوجوان محمد دین تھے' وہ مرکز الاسلام کے کسی قریب کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ بہت ہی کم گو تھے۔ ان کے بارے میں بھی سنا تھا کہ وہ مولانا کے کہنے پر مجاہد کی حیثیت سے مرکز مجاہدین میں گئے تھے۔

مولانا نے کوئی کمرہ بنانا ہوتا تو اکیلے ہی کام شروع کر دیتے اور پھر دوسرے لوگ انھیں کام میں مصروف دیکھ کر خود بخود ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ وہ عمارت میں اکھاڑ پچھاڑ

کرتے رہتے تھے۔ آج کوئی دروازہ یہاں بنایا ہے تو چند روز بعد اکھاڑ کر دوسری جگہ بنادیا۔

وہاں کے ریلوے اسٹیشن کا نام جھوک ٹہل سنگھ تھا جو فیروز پور سے دوسرا اسٹیشن تھا۔ مرکز الاسلام وہاں سے مغرب کی طرف دوسرے سگنل کے قریب آدھ میل کے فاصلے پر تھا۔ فیروز پور سے دن میں دو ٹرینیں وہاں آتی تھیں جو بنگلہ فاضلکا اور بہاول نگر سے ہوتی ہوئی سمہ سٹہ جاتی تھیں۔ ایک ٹرین دن کو بارہ بجے اور دوسری شام کو چھے بجے۔ دو ٹرینیں ہی سمہ سٹہ سے چل کر بہاول نگر اور فاضلکا سے گزرتی ہوئی وہاں سے فیروز پور جاتی تھیں۔ ایک صبح نو بجے اور دوسری دوپہر کے بعد تین بجے۔۔۔! ان چار ٹرینوں سے تقریباً ہر ٹرین سے مرکز الاسلام آنے والے مہمان اترتے تھے۔ بعض دفعہ مہمانوں کی گنتی بیس بائیس تک پہنچ جاتی تھی۔ ان سب کے لیے کھانا مولانا کے گھر سے آتا تھا۔۔۔ اس گھر کی قابل احترام خواتین مہمانوں کے لیے خود کھانا پکاتی تھیں۔ طلبا کا کھانا بھی وہی تیار کرتی تھیں۔ ان عالی مرتبت خواتین کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ وہ گرمی اور سردی میں تیس تیس چالیس چالیس آدمیوں کا دو وقت کا کھانا کتنی محنت سے تیار کرتی تھیں۔ مولانا محی الدین اور معین الدین گھر سے طالب علموں اور مہمانوں کے لیے کھانا لاتے تھے۔ بعض مہمان تو کئی کئی دن وہاں قیام کرتے تھے۔

بعد میں موضع برج کے ایک شخص یعقوب عرف بیلا کو باورچی مقرر کر لیا گیا تھا، لیکن پھر بھی بہت سے افراد کا کھانا گھر سے آتا تھا۔

شام کی ٹرین جو فیروز پور سے روانہ ہو کر چھے بجے جھوک ٹہل سنگھ ریلوے اسٹیشن پر پہنچتی تھی، اس کی آمد پر سردیوں میں کافی اندھیرا ہو جاتا تھا۔ ٹرین سے اتر کر مرکز الاسلام جانے والوں کے لیے مزید تاریکی پھیل جاتی تھیں۔

فیروز پور کے قریب کے ایک گاؤں کے ایک شخص منشی احمد الدین پٹواری مولانا کے بے تکلف دوست تھے۔ وہ ایک دن سردیوں کے موسم میں شام کی ٹرین سے مرکز الاسلام پہنچے۔ جس راستے سے انھیں چار دیواری کے اندر داخل ہونا تھا، وہ راستہ مولانا کی تعمیراتی اکھاڑ پچھاڑ کی وجہ سے بند ہو چکا تھا اور نیا راستہ بنا لیا گیا تھا، جس کا منشی احمد الدین کو علم نہ تھا۔ وہ پرانے دروازے پر آئے تو وہاں اینٹیں لگی ہوئی تھیں۔ بڑے پریشان ہوئے۔ یہ ۱۹۳۷ء کی بات ہے۔ ہم اندر بیٹھے تھے، مولانا بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ منشی صاحب لمبے قد اور

سانولے سے رنگ کے بھاری بھر کم آدمی تھے اور بلند آواز سے بات کرتے تھے- اندھیرے میں ادھر ادھر راستہ تلاش کیا- جب ناکام ہو گئے تو وہیں کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکارا-

اوئے محمد علی توں کی مصیبت پا رکھی اے- روز بوئے باریاں بدلدا رہناں ایں- دس میں کدھر دی آواں-

جو لوگ وہاں بیٹھے تھے' یہ الفاظ سن کر ہنس پڑے- خود مولانا بھی مسکرانے لگے- محی الدین اور معین الدین انھیں شاید تایا جی کہا کرتے تھے- مولانا نے محی الدین سے کہا' جاؤ اپنے تایا کو لے کر آؤ- انھوں نے باہر نکل کر آواز دی---"تایا جی میں آرہا ہوں' آپ یہیں کھڑے رہیں-"-----وہ مولانا محی الدین کے ساتھ اندر آئے تو ہنستے ہوئے مولانا سے ان کی عمارتی اکھاڑ پچھاڑ کے سلسلے میں بہت سی باتیں کہیں- مولانا سنتے اور مسکراتے رہے-

مولانا کو درخت لگانے کا بڑا شوق تھا- آمد و رفت کے راستوں پر نہایت ترتیب سے سیدھی قطار میں شیشم وغیرہ کے سایہ دار درخت لگائے جو بڑے خوب صورت دکھائی دیتے تھے---کچھ درخت "دھریک" کے بھی تھے- ہم موسم سرما میں وہاں گئے تھے- رات کو ہوا چلنے لگی تو تمام رات ٹن ٹن کی آواز کانوں میں پڑتی رہی- کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ آواز کس چیز کی ہے- آواز کبھی تیز ہو جاتی تھی' کبھی کم- ہم ڈر گئے کہ جنگل میں شاید کوئی جن بھوت ہے جو یہ آواز نکال رہا ہے- تیسرے چوتھے دن پتا چلا کہ "دھریک" کے درخت کی خشک "پھلیاں" ہوا سے باہم ٹکراتی ہیں تو ان سے آواز پیدا ہوتی ہے-

سیاسیات میں مولانا کا تعلق مجلس احرار سے تھا' اور احرار کے مقرر بڑے جی دار اور تیز تھے- آزادئ وطن کے لیے اس جماعت کے ارکان نے بے حد خدمات سر انجام دیں- اور پھر اسی قسم کی سیاسی جماعتوں کی کوششوں اور بے پناہ قربانیوں سے ملک آزاد ہوا' اور برصغیر کے باشندوں کو انگریزی اقتدار سے نجات حاصل ہوئی اور پاکستان معرض قیام میں آیا-

۱۹۴۳ء کی بات ہے کہ ایک دن گیارہ بجے کے قریب ایک صاحب آئے- طویل قامت اور کسرتی جسم' موٹی موٹی چمک دار آنکھوں پر نظر کی عینک' موٹے کپڑے کا لمبا کرتا' کھلے پائنچے کی شلوار' لمبی سیاہ داڑھی' تیکھی ناک' سر پر اونچی دیوار کی ٹوپی اور پاؤں میں موٹی گھاس کے قسم کی کسی شے کی بنی ہوئی چپل- چہرے پر سفر کے آثار نمایاں- خوب صورت جوان- سردیوں کا موسم تھا' لوگ دھوپ میں بیٹھے تھے کہ آواز گونجی السلام علیکم- بڑی با

رعب اور گرج دار آواز ------ ہم نے اس قسم کے لباس والا شخص پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

پوچھا: مولوی محمد علی کہاں ہیں؟

اتنے میں مولانا تشریف لے آئے۔ دونوں دھوپ میں بیٹھ گئے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھی موجود تھے اور محی الدین اور معین الدین بھی ------ نووارد مہمان سب کی نظروں کا مرکز تھے ------ انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا: ”میں کشمیر کے علاقے سے آیا ہوں۔ لاہور گیا تھا‘ چینیاں والی مسجد میں جانے کا ارادہ تھا‘ لیکن نہیں گیا‘ اس لیے کہ وہاں مولوی داؤد غزنوی بیٹھا تھا اور میں اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا‘ اس لیے کہ وہ کانگرس کا حامی ہے اور مجلس احرار سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نہ کسی احراری کو اچھا سمجھتا ہوں نہ کانگرسی کو ---!“

حضرت مولانا محمد علی غور سے ان کی باتیں سنتے رہے۔ تھوڑا تھوڑا مسکراتے بھی رہے --- عجیب بات یہ ہے کہ مولانا خود مجلس احرار کے حامی تھے اور اسی دن تین بجے کی ٹرین سے مجلس احرار کے جلسے میں شرکت کے لیے ملتان تشریف لے جا رہے تھے۔ ڈھائی بجے تو معزز مہمان سے کہا کہ آپ جب تک جی چاہے تشریف رکھیے‘ لیکن مجھے اجازت دیجیے ----- میں تین بجے کی گاڑی سے ایک ضروری سفر پر جا رہا ہوں ----- اور پھر مولانا تشریف لے گئے۔

یہ معزز مہمان تھے ’صوفی نذیر احمد کاشمیری‘ دسمبر ۱۹۶۳ء میں مولانا داؤد غزنوی کی وفات کے وقت وہ ہندوستان کے شہر بنارس میں تھے۔ وہیں سے ”سید السادات طاب ثراہ کے بعد“ کے عنوان سے مولانا کی وفات پر تعزیتی مضمون لکھ کر مجھے بھیجا جو میں نے ۱۷۔ جنوری ۱۹۶۴ کے ”الاعتصام“ میں شائع کیا۔ نہایت عمدہ اور درد بھرا مضمون تھا‘ جس میں مولانا کی بہت تعریف کی گئی تھی ----- وہ ان سطور کے راقم کے مہربان تھے اور انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان پر ان شاءاللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی مولانا محمد علی لکھوی کی ملاقات رہی۔ میں نے پہلی دفعہ ۱۹۳۷ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب ”تذکرہ“ انہی کے پاس مرکز الاسلام میں دیکھی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ یہ کتاب انھوں نے اسی وقت خرید لی تھی‘ جب یہ چھپی تھی۔

مولانا دل آویز شخصیت کے مالک تھے اور نہایت خوب صورت انداز سے مسکراتے ہوئے بڑی پتے کی باتیں کرتے تھے۔ ایک دن ہمارے دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے فرمایا کہ یہ عجیب نصاب ہے' ایک طرف طالب علم صحیح بخاری پڑھ رہا ہے اور دوسری طرف منطق کی مرقات پڑھنے کا ارادہ ہے' یعنی ایک ٹانگ آسمان پر ہے اور ایک زمین پر--- ہمیں آکر کہتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان تطبیق دے دو۔

حضرت مولانا کا دینی مدارس کے نصاب تعلیم سے متعلق یہ بالکل صحیح تجزیہ ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر تجزیہ نہیں ہو سکتا--- یہ ۱۹۴۳ء کی بات ہے' جس پر ساٹھ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے' اور اب تک اس نصاب کا یہی حال ہے اور اس کی دونوں ٹانگیں اسی حالت میں ہیں۔ اس اثنا میں تعلیمی حلقوں میں بڑے بڑے انقلاب آئے' لیکن یہ اس درجہ مستقل مزاج نصاب ہے کہ کوئی انقلاب اس پر اثر انداز نہ ہو سکا' اور اس کی ٹانگیں اپنی جگہ سے نہ ہلیں' نہ آسمان والی ٹانگ زمین پر آئی اور نہ زمین والی آسمان پر گئی۔

ایک دن مولانا عطاء اللہ بھوجیانی سے فرمایا کہ میں جس نہج سے مدرسہ چلانا چاہتا ہوں اس پر عمل میں بڑی رکاوٹ سرمایہ ہے۔ اگر کچھ سرمایہ میسر آجائے تو اس کا انداز بدل دوں۔

مولانا عطاء اللہ صاحب نے کہا: ہٹھاڑ کے علاقے (یعنی تحصیل چونیاں کی طرف) کے لوگ آپ کے مرید ہیں' ان سے کہیے کہ اس سلسلے میں آپ کی مدد کریں۔

فرمایا: مولوی عطاء اللہ! اب وہ مرید نہیں رہے' مرید ہو گئے ہیں۔ (پہلا لفظ میم کی پیش کے ساتھ ہے' جس کے معنی ارادت مند کے ہیں' دوسرا میم کی زبر کے ساتھ ہے' جس کے معنی سرکش و نافرمان کے ہیں)

مولانا نے تو یہ بات از راہ مزاح فرمائی تھی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب لوگوں کے دل (الا ماشاء اللہ) اپنے محسنوں اور کرم فرماؤں کی عزت و تکریم سے خالی ہو گئے ہیں اور جن لوگوں سے انھوں نے استفادہ کیا تھا' ان کا احترام ان میں باقی نہیں رہا۔

فرید کوٹ کی ایک مسجد پر مہاراجا فرید کوٹ نے قبضہ کر کے اسے میونسپل کمیٹی کا دفتر بنا دیا تھا اور ریاست میں اس قسم کا یہ پہلا واقعہ بلکہ حادثہ تھا۔ یہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ اس سے دو سال بعد حضرت مولانا محمد علی لکھوی نے مرکز الاسلام میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

سے کہا کہ اس مسئلے پر ریاست فرید کوٹ کے خلاف تحریک چلانی چاہیے۔اس کی صورت یہ بیان فرمائی کہ مسجد کی واگزاری کے لیے فرید کوٹ جتھے بھیجے جائیں اور گرفتاریاں دی جائیں۔ چنانچہ جمعے کے خطبے میں اعلان کر دیا گیا اور اشتہارات چھپوا کر دیہات میں بھجوا دیے گئے کہ عنقریب ہم مرکز الاسلام سے مسجد کی واگزاری کے لیے تحریک شروع کرنے والے ہیں' اس کے لیے فرید کوٹ جتھے بھیجے جائیں گے۔مرکز الاسلام انگریزی علاقے یعنی ضلع فیروز پور میں تھا اور فرید کوٹ کی حد وہاں سے صرف دو میل کے فاصلے سے شروع ہو جاتی تھی اور شہر فرید کوٹ وہاں سے چودہ میل کی مسافت پر تھا۔دیہات کے لوگ جتھوں میں شامل ہونے کے لیے مرکز الاسلام آکر اپنے نام لکھوانے لگے۔۔۔۔۔اس پر ریاست کے حکومتی حلقوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی اور حکمران سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔۔سرحد پر پولیس بٹھا دی گئی اور ضلع فیروز پور سے ریاست میں آنے جانے والوں کی نگرانی ہونے لگی۔کئی مہینے یہی صورت حال رہی۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا بڑے دبنگ عالم دین تھے اور عمل و حرکت میں مصروف رہتے تھے۔

ایک مرتبہ اس علاقے میں جماعت غرباء اہل حدیث کے رہنما حضرت امام مولانا حافظ عبدالستار دہلوی تشریف لے آئے۔ان کا قیام میاں عبدالقادر کے مکان پر چک مولوی والا میں تھا۔یہ گاؤں مرکز الاسلام سے ڈیڑھ میل دور تھا۔میاں صاحب مرحوم ہمارے دوست مولوی محمد افضل کے والد مکرم تھے جو قیام پاکستان کے بعد سے بوریوالہ (ضلع وہاڑی) میں اقامت گزیں ہیں۔

حضرت امام صاحب نے بعض مسائل کے سلسلے میں مولانا محمد علی لکھوی کو مناظرے کا چیلنج دیا۔لوگ مولانا کے پاس آئے تو انھوں نے فرمایا محی الدین کو لے جاؤ۔۔۔۔۔

یہاں یہ واقعہ بھی سنتے جایئے کہ جب مولانا حافظ عبدالستار دہلوی نے مناظرے کے لیے زیادہ اصرار کیا تو مولانا محمد علی صاحب نے مولانا عطاء اللہ حنیف سے فرمایا کہ وہ کسی مناظر سے رابطہ پیدا کریں' چنانچہ وہ مولانا احمد الدین گکھڑوی کے پاس گکھڑ پہنچے۔مولانا احمد الدین بڑے ذہین' تیز کلام اور مشہور مناظر تھے۔انھوں نے مولانا عطاء اللہ صاحب سے کہا کہ انھیں تو معلوم ہی نہیں کہ غرباء اہل حدیث کون ہیں اور کن مسائل میں ان کا کیا نقطہ

نظر ہے اور عام اہل حدیث حضرات سے ان کے اختلاف کی کیا نوعیت ہے۔

مولانا عطاء اللہ صاحب نے فرمایا: آپ میرے ساتھ چلیے' میں یہ باتیں آپ کو راستے میں بتا دوں گا۔ چنانچہ وہ آئے اور لکھو کے سے کچھ فاصلے پر نہر کے کنارے ایک گاؤں "گدڑھ ڈھنڈی" میں مناظرہ ہوا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مولانا محمد علی بھی موجود تھے۔ فاضلکا میں اوڈ راجپوت اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے اور وہ جماعت غرباء اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے سربراہ مولانا عبداللہ اوڈ تھے جو چوہدری قسم کے آدمی تھے اور صوبہ پنجاب کی جماعت غرباء اہل حدیث کے امیر تھے' وہ بھی مناظرے میں تشریف فرما تھے۔

مناظرہ شروع ہوا۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی کے مقابلے میں خود حضرت مولانا عبدالستار صاحب امام غرباء اہل حدیث مناظر تھے ---- فضا بڑی گرم تھی۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے دلائل دینا شروع کیے تو صورت حال حضرت حافظ صاحب کی عقیدت مند اوڈ برادری کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ انھوں نے ایک دم ہنگامہ بپا کر دیا اور لاٹھیاں اٹھا لیں اور مجمع منتشر ہو گیا۔

میرا مقصد یہاں محض واقعات بیان کرنا ہے۔ کسی کی مخالفت یا حمایت ہرگز مقصود نہیں۔ حضرت امام صاحب پر ان شاء اللہ الگ مضمون لکھا جائے گا' وہ بہت بڑے عالم تھے اور نہایت موثر تقریر کرتے تھے۔

وہ مناظروں کا دور تھا اور مختلف مذاہب اور مختلف فقہی مسالک کے حاملین کے درمیان مناظرات کا سلسلہ جاری رہتا تھا' اور ایسے مواقع پر بعض اوقات باہم جھگڑے بھی ہو جاتے تھے۔ تاہم اس سے مسائل نکھرتے اور حقائق واضح ہوتے تھے۔

ایک دن حضرت مولانا نے مجھے فرمایا: سائیکل چلانا جانتے ہو؟

عرض کیا: جی ہاں' جانتا ہوں۔

فرمایا: میں ہٹھاڑ کے علاقے یعنی تحصیل چونیاں جانا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ لکھو کے تک سائیکل پر چلو۔ میں آگے چلا جاؤں گا' تم لکھو کے سے سائیکل پر یہاں واپس آ جانا۔

اب پتا نہیں کیا صورت حال ہے۔ اس زمانے میں بذریعہ کشتی دریائے ستلج پار کر کے اس علاقے میں جانا پڑتا تھا۔ دریا سے ادھر کے علاقے کو (جو چونیاں کی طرف تھا) "ہٹھاڑ"

اور دوسری طرف کے علاقے کو (جو لکھوکے کی طرف تھا) ''اوتاڑ'' کہا جاتا تھا۔

ہم لکھوکے کی طرف چل پڑے۔ مولانا سائیکل چلا رہے تھے' میں پیچھے کیریئر پر بیٹھا تھا۔ مرکز الاسلام سے لکھوکے تک پیدل جانے کا راستہ اور تھا' اور سائیکل پر جانے کے لیے پہلے جھوک ٹہل سنگھ آنا پڑتا تھا' وہاں سے لکھوکے گاؤں دو میل تھا' کچا مگر صاف ستھرا کھلا راستہ تھا اور راستے کے دونوں طرف ''شرینہ'' (جسے اردو میں ''سرس'' کہا جاتا ہے) کے بڑے بڑے درخت تھے۔ ہم مرکز الاسلام سے چلے۔ جھوک ٹہل سنگھ کے قریب ایک گہری اور چوڑی خشک نہر سی آتی تھی' جسے اس علاقے کی زبان میں ''وندی'' کہا جاتا تھا' وہاں چاروں طرف سرکنڈا اگا ہوا تھا' جسے ''سر'' کہا جاتا ہے۔ اور ریتلا سا راستہ تھا' وہاں سائیکل کا پہیہ پھسل گیا اور توازن بگڑ گیا' ایک طرف مولانا گر پڑے اور ایک طرف میں گر گیا۔ انھوں نے سر پر ترکی ٹوپی لے رکھی تھی' جو اچھل کر دور جا گری' میں نے جلدی سے مولانا کے کپڑے صاف کرنا شروع کیے۔ ٹوپی اٹھا کر لایا اور صاف کر کے ان کی خدمت میں پیش کی۔ اگر گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو اس وقت شاعری کی زبان میں ''جہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے مے خانہ کہتے ہیں'' کا سا معاملہ تھا۔

مرکز الاسلام میں مدرس تو اس وقت مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب تھے' لیکن کبھی کبھی حضرت مولانا محمد علی لکھوی بھی پڑھانے کے لیے طلبا کو بلا لیتے۔ میں اس زمانے میں علم صرف کی کتاب فصول اکبری پڑھتا تھا۔ بعض دفعہ وہ مجھے آواز دیتے اور فصول اکبری پڑھاتے۔

ان کا انداز تقریر بڑا پیارا تھا' دھیمے انداز میں تقریر کرتے تھے۔ یہی انداز عام گفتگو کا تھا۔ حس مزاح بڑی تیز تھی۔

دینی مدارس میں پڑھنے والے طلبا اگرچہ گھر سے کتنے ہی آسودہ حال ہوں' لیکن کتابیں' کھانا' اور کپڑے دھونے کے لیے صابن وغیرہ سب چیزیں انھیں اس مدرسے سے دی جاتی ہیں' جس میں یہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ حضرت مولانا اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا عطاء اللہ صاحب سے فرمایا کرتے تھے کہ طلبا سے کچھ لینا بھی چاہیے۔ وہ سستا زمانہ تھا۔ فرمایا کرتے کہ کم سے کم ایک روپیہ مہینے کا ان سے ضرور وصول کرنا چاہیے۔ ہم انھیں لینے کے عادی بنا رہے ہیں' کچھ دینے کی عادت بھی ان میں ڈالنی چاہیے۔ اگر سب سے

لینا مشکل ہے تو ان طلبا سے بہر حال لینا چاہیے جو آسودہ حال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں ---پھر بعض دفعہ غریب اور امیر طلبا کی فہرست بنانا شروع کر دیتے۔

ان کے ذہن میں عام طور سے مختلف قسم کی لہریں اٹھتی رہتی تھیں' ایک لہر اٹھی' وہ پہلی لہر کو بہا کر لے گئی' پھر دوسری اٹھی' وہ اسے نگل کر آگے نکل گئی۔

ایک دن مولانا [illegible] اللہ سے فرمایا کہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ ادھر درس قرآن ہو رہا ہے اور ساتھ ہی بعض سامعین اپنے وظائف میں مصروف ہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ خاموشی اور توجہ سے درس قرآن سنا جائے۔ وظیفہ بعد میں پڑھ لیا جائے۔

ایک دن فرمایا: امام بعض اوقات ایسی سورتیں پڑھتا ہے جن کے بعض الفاظ کا جواب دیا جاتا ہے' مثلاً "سبح اسم ربك الاعلیٰ" کا جواب ہے "سبحان ربی الاعلیٰ" لیکن یہ جواب مقتدی نہ دے' امام ہی آہستہ سے جواب میں "سبحان ربی الاعلیٰ" کہے۔ یعنی جو شخص پڑھ رہا ہے' وہی جواب دے' سننے والا نہ دے۔ ہمارے ہاں سب لوگ پکار اٹھتے ہیں۔

سبحان ربی الاعلیٰ۔

یہ صحیح نہیں۔

اسی طرح ایک دن کہا کہ فجر کی سنتوں کے بعد چند لمحے دائیں جانب اسی شخص کو لیٹنا (اضطجاع کرنا) چاہیے' جس نے قیام اللہ کیا (یعنی تہجد کی نماز پڑھی) ہو۔ ہر شخص کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔

مولانا بڑے حاضر جواب تھے اور بعض اوقات سنا ہے' مناظرے کے لیے بھی تیار ہو جاتے تھے ------ ہمارے ایک بزرگ میاں قاسم دین مرحوم نے (جو میرے دادا مرحوم میاں محمد کے بہنوئی تھے) بتایا کہ مولانا کا جوانی کا زمانہ تھا' وہ کوٹ کپورے گئے۔ وہاں ایک قادیانی عالم آ گیا' اس نے اعلان کرایا کہ جو شخص جس مسئلے پر چاہے' میرے ساتھ مناظرہ کر لے۔ لوگ مولانا کے پاس گئے' وہ اس وقت مسجد میں بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے' ان سے بات کی تو اسی وقت فرمایا: چلو مناظرہ کرتے ہیں۔ قرآن ان کے ہاتھ میں تھا۔----لوگوں نے عرض کیا جناب اس کے پاس تو بہت سی کتابیں ہیں' آپ کے پاس تو کچھ بھی نہیں ---فرمایا میرے پاس قرآن مجید ہے جو سب کتابوں پر بھاری ہے۔ اس کے مقابلے میں اس کی کتابیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں' یہ اس کی سب کتابوں کو نگل لے گا۔

چنانچہ مناظرہ ہوا اور مولانا کو اللہ نے کامیابی سے نوازا۔

۱۹۴۳ء کی بات ہے' ایک دن مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف بھوجیانی سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک زندگی انسان کو دنیا میں عطا فرمائی ہے اور دوسری اور آخری زندگی آخرت میں عطا کی جائے گی۔ قرآن مجید میں دونوں زندگیوں کا ذکر فرمایا گیا ہے' لیکن دنیوی زندگی کا ذکر پہلے ہے' اس لیے کہ انسان کو سب سے پہلے اسی زندگی سے واسطہ پڑتا ہے اور آخرت کی زندگی کا ذکر بعد میں ہے' اس لیے کہ یہ بعد میں آئے گی۔ پھر دونوں زندگیوں میں بہتری اور ذہنی' فکری' عملی' علمی اور مالی آسودگی طلب کرنے کا ارشاد ہے' اور یہی وہ بہتری اور آسودگی ہے' جسے لفظ "حسنہ" سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ

"اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بہتری سے نواز اور آخرت میں بھی بہتری عطا فرما اور آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ۔"

مولانا عطاء اللہ صاحب سے ان کا ہلکی مذاق کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ ایک دن از راہ مزاح مولانا سے فرمایا کہ رمضان المبارک میں شدید گرمیوں میں روزہ رکھ کر لوگ گندم کاٹتے ہیں' میں بھی کاٹتا رہا ہوں۔ پھر حساب لگا کر بتایا کہ ایک ایکڑ گندم کاٹنے والا جتنے چکر لگاتا ہے' اس کی پیمائش کی جائے تو وہ اتنی مسافت طے کر لیتا ہے' جتنی مسافت پر اہل حدیث کے نزدیک نماز قصر کی جاسکتی ہے۔ پھر جتنی مسافت پر نماز قصر کی جاسکتی ہے' اتنی مسافت پر روزہ بھی افطار کیا جاسکتا ہے۔۔۔۔ اس کے بعد مسکراتے ہوئے مولانا عطاء اللہ صاحب سے فرمایا کیا ارشاد ہے' آپ کا اس کے متعلق؟

پھر خود ہی جواب دیا کہ گندم کاٹنے والا اتنی مسافت تو ضرور طے کر لیتا ہے' لیکن بیٹھا اسی ایک ایکڑ میں رہتا ہے۔ نہ چلتا ہے' نہ قدم اٹھاتا ہے اور نہ اس پر "مسافر" کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہل چلانے والے کا بھی یہی حال ہے' وہ ایک جگہ بیٹھا تو نہیں رہتا لیکن تیلی کے بیل کی طرح چکر وہیں لگاتا رہتا ہے۔

حضرت مولانا آسان زبان میں بات کرتے اور عام فہم الفاظ بولتے تھے' مشکل الفاظ بالکل نہیں بولتے تھے۔ ان کا مقصد لوگوں کو سمجھانا تھا' ان کو تکلیف میں ڈالنا نہ تھا۔ عربی زبان کے بعض ماہرین کو ہم نے دیکھا ہے کہ بسا اوقات اس درجہ مشکل الفاظ استعمال کرتے

ہیں کہ سننے والا پریشان ہو جاتا ہے-----

ان کی آواز بڑی موثر تھی۔ کبھی کبھی وہ فجر کی اذان کہا کرتے تھے' آواز جنگل کی کھلی فضا کو چیرتی ہوئی دور تک جاتی تھی--- مجھے قصور کے ایک شخص نے ایک مرتبہ بتایا کہ کسی زمانے میں مولانا قصور آئے فجر کی اذان اس انداز سے کہی کہ ایک غیر مسلم گھرانا اذان سن کر مسلمان ہو گیا۔

وہ تہجد گزار اور پرانے بزرگوں کی طرح وظائف واوراد کے پابند تھے۔ اللہ نے ان کو علم کی نعمت سے بھی خوب نوازا تھا اور عمل کی دولت بھی فراوانی سے عطا فرمائی تھی۔

مولانا محمد علی کی نماز تہجد سے یہاں مولانا محمد اسماعیل سلفی کا ایک فرمان یاد آیا۔ انھوں نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ کسی عالم دین کی نیکی کا اندازہ نماز تہجد سے ہوتا ہے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھنا یا پڑھانا تو اس کا پیشہ اور ذریعہ آمدنی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنے پیشے کے دائرے سے باہر نکل کر اور اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر تہجد کی نماز پڑھتا ہے؟

مولانا محمد علی جنگل میں رہتے تھے' جھوک ٹہل سنگھ سکھوں کا گاؤں اور اکالیوں کا مسکن تھا۔ لیکن کسی کو جرأت نہ تھی کہ انھیں کوئی نقصان پہنچا سکے اور ان کے مقابلے میں آئے۔

وہ مرکز الاسلام کو ریلوے اسٹیشن بنانا اور وہاں ڈاک خانہ قائم کرنا چاہتے تھے' لیکن ان کے مدینہ شریف جانے کی وجہ سے یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے ان کے گہرے مراسم تھے' سیاسی بھی' روحانی بھی اور خاندانی بھی----- ایک مرتبہ مولانا غزنوی کی گرفتاری کے بعد وہ کچھ عرصہ لاہور مسجد چینیاں والی میں قیام فرما رہے تھے۔ وہ اس مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے اور درس قرآن دیتے تھے۔ اس زمانے میں تدریس کا سلسلہ بھی اس مسجد میں جاری تھا۔ وہ یہاں طلبا کو حدیث کی کتابیں پڑھاتے رہے۔ ان کے اس دور کے شاگردوں میں مولانا عبدالعظیم انصاری (قصور) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ مرحومین میں مولانا عبدالواحد (فیصل آباد) مولوی عبدالعزیز (گوجرانوالہ) اور مولانا عبدالرحیم کوٹلوی شامل تھے----- مولانا عبدالقادر حصاری بھی ان کے شاگرد تھے جو فقہی اور دینی مسائل کی تحقیق و تدقیق میں بڑی شہرت کے مالک تھے۔ مجھے یاد پڑتا ہے مولانا عبداللہ کلسوی نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا اور وہ ۱۹۳۷ء

میں کئی دفعہ مولانا کی خدمت میں مرکز الاسلام گئے تھے۔ ان کی وضع قطع اور لباس اب بھی میرے ذہن میں ہے۔ حافظ محمد سلیمان بھوجیانی اور مولوی محمد سلیمان (نھتو والا ضلع فیروز پور) بھی ان کے شاگرد تھے۔ غربائے اہل حدیث کے مولانا عبداللہ اوڈ کا شمار بھی ان کے تلامذہ میں ہوتا ہے۔

مجھے پہلی دفعہ حضرت مولانا محمد علی کی زیارت کا شرف ۱۹۳۶ء میں حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں پورا تعلیمی سال (یعنی دس مہینے) ان کی خدمت میں رہنے اور ان کے فرمودات سننے کا موقع ملا ---- اس وقت ان کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ بہت اچھی صحت' گندمی رنگ' کتابی چہرہ' آنکھوں میں چمک' تیکھی ناک' باریک ہونٹ' میانہ قد۔ بھری ہوئی داڑھی جس میں کچھ سفید بال نمودار ہوگئے تھے۔ سفید کھدر کا صاف ستھرا لباس' کھدر ہی کا عمامہ' کبھی کبھی ترکی ٹوپی سر پر رکھ لیتے تھے۔ سردیوں میں عام طور سے سفید کھدر کی چادر اوڑھتے اور سفید کھدر ہی کا تہبند باندھتے تھے۔ متحمل مزاج' سلیم الطبع' صاف گو' نرم کلام' وضع دار' حاضر جواب' عالمانہ وقار کے حامل' مردم شناس' اپنا کام آپ کرنے کے عادی' خوددار' معاملہ فہم' اہل علم کے قدردان --! قرآن مجید بڑے درد اور سوز سے پڑھتے تھے' جس سے سامعین نہایت متاثر ہوتے تھے۔

ان سے متعلق میری زیادہ تر یادداشتوں کا تعلق ۱۹۳۷ء سے ہے۔ میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال کی تھی اور میں ان کے ارشادات بڑے غور سے سنا کرتا تھا۔ جو اللہ کے فضل سے اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔

گفتگو میں وہ مشکل اور دقیق الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے۔ آسان اور عام فہم اسلوب میں بات کرتے تھے' جسے ہر شخص آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ میل جول اور بات چیت میں تکلف کے عادی نہ تھے۔ مخاطب سے اس کی ذہنی سطح کے مطابق بات کرتے تھے۔ ان کی شخصیت اور علم و فضل کا لوگوں پر بڑا رعب تھا۔ طلبا ان سے کچھ پوچھنے اور ان سے بات کرنے کی اپنے میں جرأت نہ پاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فقیر ان سے استفادہ نہ کر سکا۔

اب زمانے کی آنکھ حیا سے خالی ہوگئی ہے' کسی سے بات کرنے میں کسی قسم کا حجاب محسوس نہیں کیا جاتا' نہ چھوٹے کو بڑے کا لحاظ ہے' نہ شاگرد کے دل میں استاد کی عزت باقی رہی ہے اور نہ ان بزرگوں کی توقیر کا جذبہ ذہن کے کسی گوشے میں پایا جاتا ہے' جن سے علمی

یاروحانی فیض حاصل کیا تھا۔ نہ ان خاندانوں کے اکابر واصاغر سے کوئی رابطہ رہا ہے، جن کی محنت اور توجہ سے کسب علم کی راہوں پر گام زن ہونے کے مواقع میسر آئے تھے۔ پرانی قدریں ختم ہو گئی ہیں۔ ہر شخص اپھرا ہوا اور ہر متنفس پھنے خاں بنا ہوا ہے۔ جسے دیکھو پھوں پھوں کرتا ہے۔ سیدھے منہ بات کرنے کو توہین قرار دیا جاتا ہے۔

مولانا لکھوی بات سے بات پیدا کرنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ خطبہ جمعہ میں پولیس پر تنقید شروع کر دی اور کہا کہ یہ تھانیدار اور حوالدار لوگوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ پھر فرمایا: جتنے بھی "دار" ہیں ایسے ہی ہیں، تحصیل دار، تھانیدار، حوالدار، ضلعے دار، ذیل دار، نمبر دار، صوبے دار-------- بر سر دار بہ---!

میرے پاس ایک بہت پرانی دستاویز ہے، جس میں لکھا ہے کہ لاہور میں ۱۰- اپریل ۱۹۰۹ء (۱۷- ربیع الاول ۱۳۲۷ھ) کو ایک میٹنگ ہوئی جس میں پنجاب کے مختلف مقامات کے بہت سے اہل حدیث علمائے کرام شامل ہوئے اور ان کے صلاح مشورے سے "انجمن اہل حدیث پنجاب" قائم کی گئی۔ اس میٹنگ میں جو علما شامل تھے، ان کے نام ان کے دستخطوں کے ساتھ درج ہیں۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل تین حضرات لکھوی ہیں----

۱- محمد حسین بقلم خود (مولانا محمد حسین بن حافظ محمد لکھوی مراد ہیں)

۲- محمد علی بن عبدالرحمٰن لکھوی (حضرت مولانا محمد علی لکھوی مراد ہیں)

۳- عطاء اللہ ولد عبدالقادر لکھوکے (استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی مراد ہیں)

حضرت مولانا محمد علی کا خط (یعنی ہینڈ رائیٹنگ) بہت عمدہ اور صاف ہے۔ جو انداز تحریر ۱۹۰۹ء میں تھا، وہی ۱۹۷۳ء میں تھا۔

حضرت مولانا نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی----- کسی زمانے میں بچوں کے لیے ایک قاعدہ لکھا تھا، جس کا نام تھا "مدنی قاعدہ" یہ قاعدہ کسی زمانے میں بڑا مقبول ہوا تھا۔

فیروز پور کا صراف خاندان مسلک اہل حدیث سے وابستہ تھا۔ دین داری اور انگریز دشمنی میں اس خاندان کو بڑی شہرت حاصل تھی، لکھوی اور غزنوی علمائے کرام سے ان کو بے حد عقیدت تھی۔ جماعت مجاہدین سے انسلاک اور اس کی مالی امداد اس نازک دور میں ان کا عظیم کارنامہ تھا۔ اس خاندان کے چھوٹے بڑے تمام ارکان (خواتین سمیت) مجلس احرار سے منسلک تھے، مولانا عبیداللہ احرار اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے جو تقسیم ملک کے بعد

فیروز پور سے فیصل آباد آگئے تھے' اور پھر پاکستان کی مجلس احرار کے صدر منتخب کر لیے گئے تھے' انھوں نے ۲۰ فروری ۱۹۷۵ء کو وفات پائی۔

اس خاندان کے ایک بزرگ حاجی عبدالرحمٰن تھے' وہ مولانا محمد علی لکھوی سے عقیدت مندانہ دوستی رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ مولانا محمد علی مالی پریشانی میں مبتلا ہیں' ان کے پاس جاؤ۔ مولانا اس وقت فی الواقع ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھے۔ وہ کچھ رقم لے کر ان کی خدمت میں مرکز الاسلام آئے اور اپنا خواب بیان کیا' اور قرض حسنہ کے طور پر یہ رقم ان کو پیش کی۔ انھوں نے رقم لے لی اور پھر تھوڑے ہی عرصے بعد واپس کر دی۔

گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا ہے کہ مولانا کا تعلق جماعت مجاہدین سے تھا' وہ مجاہدین کی مالی امداد بھی کرتے تھے اور خفیہ طور سے جہاد کی کچھ ٹریننگ دے کر مجاہدین بھی وہاں بھیجتے رہتے تھے۔ خود بھی مرکز مجاہدین میں گئے تھے۔ لیکن ان کی یہ سرگرمیاں راز میں نہ رہ سکیں۔ انگریزی حکومت کی پولیس اور سی آئی ڈی کی نظر بڑی وسیع اور تیز تھی۔ بات حکومت کے ایوانوں تک پہنچ گئی اور مولانا کی نگرانی شروع ہو گئی اور حکومتی سطح پر اندر ہی اندر معاملے کی چھان بین ہونے لگی۔ آخر گرفتاری کا فیصلہ ہوا۔ پولیس آئی تو مولانا نے فوری طور پر ایک شخص خوشی محمد ڈوگر کو بلایا' اس کے کپڑے پہنے اور پولیس سے بچ کر نکل گئے' پولیس ناکام واپس چلی گئی۔

دوبارہ پھر گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوا۔ اب پولیس نے یہ چال چلی کہ اپنے دو آدمی ان کے پاس بھیجے کہ یہ جہاد کے لیے چمرکنڈ جانا چاہتے ہیں۔ مولانا کو شبہہ گزرا کہ یہ پولیس کے آدمی ہیں اور مجھے دھوکے سے گرفتار کرنا مقصود ہے۔ فوراً روپوش ہو گئے اور کافی عرصہ باہر رہے۔

مولانا خالص مجاہدانہ فطرت کے مالک تھے۔ ایک مرتبہ ایک جلسے میں نیزہ بازی کے مقابلے کا اہتمام کیا ----- جفاکشی کا یہ عالم کہ بیساکھ کے مہینے میں روزے کی حالت میں گندم کی کٹائی کی۔

پہلی مرتبہ ۱۹۲۸ یا ۱۹۲۹ میں حج بیت اللہ کے لیے گئے اور دس مہینے کے بعد واپس آئے۔ پھر مسلسل آنا جانا رہا' کبھی دو سال کے بعد' کبھی تین سال کے۔!

مدینہ منورہ میں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی اور سعودی حکومت کی طرف سے مسجد نبوی میں طلبا کو کتب حدیث پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا- جس انداز میں انھوں نے حدیث کی تدریس کا آغاز کیا اس نواح کے طلبا کے لیے وہ بالکل نیا انداز تھا- طلبا کے حلقوں میں اس انداز کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور سعودی' مصری' سوڈانی' الجزائری' شامی' انڈونیشیائی اور افریقی طلبا نے ان سے خوب استفادہ کیا اور وہ حدیث کے نکات سمجھنے کے جدید اسلوب سے آشنا ہوئے- ان کے حلقہ درس میں برصغیر پاک و ہند کے طلبا بھی شامل تھے' ان سب طلبا کو وہ حدیث کے علاوہ قرآن مجید کا درس بھی دیتے تھے- مسجد نبوی میں قرآن و حدیث کے اس درس سے ہزاروں طلبا مستفید ہوئے اور ان کے شاگردوں کے حلقے نے بے حد وسعت اختیار کی اور بہت سے عرب اور غیر عرب ممالک میں ان کے علمی و تدریسی اثر و رسوخ کے پرچم لہرائے-

ان کے بڑے صاحب زادے مولانا محی الدین لکھوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ حضرت مولانا ایک مرتبہ مرکز الاسلام سے پیپل کے درخت کے دو پودے مدینہ منورہ لے گئے تھے- جس جگہ لوگ وہاں اونٹ بٹھاتے تھے' اسے "مناق" کہا جاتا تھا- اس زمانے میں وہاں سائے کا انتظام نہ تھا- مسافر بھی سخت دھوپ میں بیٹھتے تھے اور اونٹ بھی- مولانا نے وہاں پیپل کے دو پودے لگا دیے' پھر ان کی پرورش کرتے اور التزام سے پانی دیتے رہے' نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ دونوں پودے اچھے خاصے درخت کی شکل اختیار کر گئے اور ان کا سایہ پھیل گیا-

کئی سال کی بات ہے' مجھے یاد پڑتا ہے مولانا محی الدین نے بتایا تھا کہ جب وہ پہلی مرتبہ حج کے لیے گئے تو پیپل کے ان دو درختوں کو دیکھنے کے لیے وہ "مناق" گئے' مگر اب سلسلہ بالکل بدل چکا تھا' اس جگہ کو پولیس اسٹیشن بنا دیا گیا تھا اور پیپل کے درختوں کے گھنے اور وسیع سائے میں پولیس کے اہل کار اور دوسرے لوگ بیٹھے تھے-

اس مضمون کے آغاز میں حافظ بارک اللہ لکھوی کا واقعہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان کو والیِ ممدوٹ نواب قطب الدین نے اس جرم میں لکھو کے [illegible] دیا تھا کہ انھوں نے نواب کو سونے کے کنگن پہننے پر ٹوکا تھا---- یہ واقعہ حضرت مولانا محمد علی لکھوی نے ۱۹۳۷ء میں بیان کیا تھا اور اسی وقت سے مجھے یاد ہے- (اس کی تفصیل میں نے اپنی کتاب فقہاے پاک و

ہند کی اس جلد میں بیان کی ہے جس میں تیرھویں صدی ہجری کے فقہا و علما کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔اس میں حافظ بارک اللہ لکھوی کا تذکرہ بیس صفحات پر مشتمل ہے۔اس مضمون کے گزشتہ صفحات میں بھی اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کیا گیا ہے) نواب قطب الدین سے لے کر ممدوٹ کے آخری حکمران نواب افتخار حسین خاں تک کسی سے بھی مولانا کو کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔انھوں نے ممدوٹ کے نوابوں کا ذکر ہمیشہ مخالفانہ انداز میں کیا۔اس کی اصل وجہ وہ سلوک تھا جو اس خاندان کے ایک حکمران نواب قطب الدین نے حافظ بارک اللہ مرحوم سے کیا تھا۔

۱۹۴۵ء کے انتخابات کا اعلان ہوا تو مولانا لکھوی نے مدینہ منورہ سے مولانا محی الدین کو خط لکھا کہ نواب ممدوٹ کا مقابلہ کیا جائے' چنانچہ مولانا محی الدین انتخاب لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔میں اس وقت مرکز الاسلام میں خدمت تدریس پر مامور تھا۔میں نے اور مولانا معین الدین نے انتخابی دورہ بھی شروع کر دیا تھا'لیکن بعد ازاں جماعت مجاہدین کے رہنما مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی نے ایک شخص کے ہاتھ مولانا محی الدین کو خط لکھ بھیجا کہ نواب افتخار حسین کا مقابلہ نہ کیا جائے۔

مولانا فضل الٰہی ان دنوں روپوش تھے۔وہ خفیہ طور سے کلکتے اور دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ملتے رہتے تھے۔مولانا ابوالکلام کانگرس کے "ہندوستان خالی کرو" ریزولیوشن کے بعد ۹۔اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی سے گرفتار ہوئے تھے اور جنگ کے بعد رہا ہوئے تھے۔رہائی کے بعد ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ان کی ملاقات کا سلسلہ انگریزی حکومت کے ذمے دار ارکان سے جاری تھا۔انھی دنوں وائسرائے ہند سے بات کر کے انھوں نے مولانا فضل الٰہی کی روپوشی کا معاملہ ختم کرایا تھا اور انھیں اپنے گھر (وزیر آباد) آنے کی اجازت دلائی تھی۔

یہ تھیں حضرت مولانا محمد علی کے بارے میں میری چند وہ یادداشتیں جو ۱۹۳۷ء سے تعلق رکھتی ہیں' جب کہ میں مرکز الاسلام میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقۂ درس میں شریک تھا۔۔۔۔۔اب اس سے دس سال بعد ۱۹۴۷ء میں آیے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہم اپنا آبائی وطن چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔بعض لوگوں نے ہمیں مہاجر کہا اور بعض نے پناہ گزیں یا پناہ گیر قرار دیا۔میرے خیال میں صحیح بات یہی ہے کہ ہم پناہ گیر تھے۔ہجرت سے ہمارا کوئی تعلق نہ تھا۔

ہم ضلع لائل پور کی تحصیل جڑانوالہ کے ایک گاؤں چک نمبر ۵۴۳ گ ب منصور پور میں آ بیٹھے ----اس زمانے میں سکونت اختیار کرنے کو "بیٹھے" کہا جاتا تھا' یعنی فلاں لوگ فلاں جگہ بیٹھے ہیں اور فلاں علاقے کے رہنے والے فلاں علاقے میں جا بیٹھے ہیں ---- اس واقعے (یا سانحے) پر پچاس سال گزر چکے ہیں' لیکن پرانے لوگ اب بھی یہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں-

اس گاؤں میں اگرچہ ہم ایک ہی مقام (کوٹ کپورہ) کے لوگ "بیٹھے" تھے' کوئی دوسرا ہم میں نہیں تھا' لیکن ابتدا میں وہاں جی نہیں لگا' طبیعت پریشان اور ذہن اکھڑا اکھڑا سا- پرانے دوستوں سے ملنے کے لیے بے قرار ---- ہر وقت بے چینی چھائی ہوئی- اس اثنا میں پتا چلا کہ مولانا محی الدین اور معین الدین اوکاڑے "بیٹھے" ہیں- میں گاؤں سے چلا اور اوکاڑے آ گیا- یہ ۱۹۴۷ء کے اکتوبر کا مہینہ تھا- انہی دنوں قاضی محمد رمضان مرحوم کی وساطت سے مولانا معین الدین لکھوی کو شام کے وقت ایک ہوائی مکتوب ملا- یہ ان کے والد گرامی حضرت مولانا محمد علی لکھوی کا مکتوب تھا- اس میں مرقوم تھا کہ وہ فلاں تاریخ کو کراچی پہنچ رہے ہیں- اس سے قبل مدینہ منورہ میں انھیں اطلاع مل گئی تھی کہ ان کے اعزہ واقارب اوکاڑے آ گئے ہیں-

قاضی محمد رمضان دراصل اوکاڑا ہی کے رہنے والے تھے اور وہاں کی ایک ممتاز شخصیت تھے- مسلکاً اہل حدیث تھے- اوکاڑے میں سب سے پہلے اہل حدیث کی مسجد انہی نے تعمیر کرائی تھی- قاضی صاحب حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی سے بیعت تھے- ۸- جنوری ۱۹۵۷ء کو فوت ہوئے-

طے پایا کہ مجھے اور مولانا معین الدین کو حضرت مولانا کے استقبال کے لیے کراچی جانا چاہیے- ہم تیار ہو گئے- لیکن اس سے ایک دن پہلے ہمارے پرانے دوست میاں غلام رسول وٹو مجھے اپنے گاؤں لے جانے کا پروگرام بنا چکے تھے' ان کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ان کے گاؤں جاؤں ---- ان سے بہت کہا کہ کراچی جانا ضروری ہے' لیکن وہ نہیں مانے اور مجھے اپنے گاؤں لے جانے پر مصر رہے- چنانچہ میں ان کے ساتھ ان کے گاؤں چلا گیا اور معین الدین تنہا کراچی روانہ ہو گئے-

ایک ہفتے کے انتظار کے بعد کراچی سے مولانا معین الدین کا خط آیا کہ ہم فلاں تاریخ

کو سندھ ایکسپریس سے اوکاڑے پہنچ رہے ہیں----- عجیب معاملہ یہ ہوا کہ ادھر ان کا یہ خط آیا اور ادھر ان کی ٹرین اوکاڑے کے ریلوے اسٹیشن پر آرکی- میں اور زین العابدین دونوں اسٹیشن کو دوڑے- پلیٹ فارم پر پہنچے تو معین الدین غائب تھے اور حضرت مولانا سامان کے پاس کھڑے تھے- لمبا سفید چغہ' سر پر ململ کی ٹوپی' ہاتھ میں چھڑی' منہدی لگے ہوئے داڑھی کے بالوں سے کہیں کہیں سفیدی جھانک رہی تھی- ہم دونوں نے مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے تو انھوں نے معانقے کے لیے بازو پھیلا دیے-

وہ ہم دونوں ہی کو نہیں پہچان رہے تھے --- پہلے میں نے زین العابدین کا تعارف کرایا----- وہ ان کے داماد ہیں اور ان کی شادی ان کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد ہوئی تھی- تعارف کے بعد وہ زین العابدین سے دوبارہ ملے اور گلے لگایا-

پھر میں نے اپنے متعلق عرض کیا کہ میں ۱۹۴۳ء میں مرکز الاسلام میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے حلقہ درس میں شامل تھا اور اس وقت آپ کی خدمت میں سلام عرض کے مواقع میسر آتے تھے ---- یہ الفاظ سن کر وہ مجھ سے دوبارہ بغل گیر ہوئے اور فرمایا اس واقعے پر دس سال کا عرصہ بیت چکا ہے- اس وقت تم بچے تھے' اب جوان ہو گئے ہو- ادھر میرے بالوں کی سیاہی پر سفیدی نے قبضہ کر لیا ہے- پہچانوں تو کیسے؟

معین الدین انھیں ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ کر جامعہ محمدیہ میں ان کی آمد کی اطلاع دینے اور سامان لانے کے لیے دو چار آدمیوں کو لینے چلے گئے تھے- اتنے میں وہ بھی آ گئے-

اس سے کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا لاہور تشریف لائے ----- میں ان دنوں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے آفس سیکرٹری کی حیثیت سے لاہور میں مقیم تھا اور دار العلوم تقویۃ الاسلام کی بلڈنگ میں جمعیت کا دفتر تھا- وہیں مولانا سید محمد داؤد غزنوی کا مکان تھا-

حضرت نے تشریف لاتے ہی مجھے فرمایا: تمھارا کمرہ کون سا ہے؟ میں وہیں ٹھہروں گا- چنانچہ جتنے دن وہ لاہور رہے' از راہ کرم اس فقیر کے کمرے میں ان کا قیام رہا- کم و بیش ایک سال وہ پاکستان رہے- پھر واپس مدینہ منورہ تشریف لے گئے-

۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو اس میں بہت سے لوگ گرفتار ہوئے' جماعت اہل حدیث نے خاص طور سے اس میں حصہ لیا تھا- مرزا غلام احمد قادیانی پر سب سے پہلے کفر کا فتویٰ بھی مشہور اہل حدیث عالم حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی نے لگایا

تھا- اسی اثنا میں حضرت مولانا محی الدین عبدالرحمن لکھوی نے ان کو کافر قرار دیا تھا اور اس کے بعد مرزا صاحب نے پیش گوئی کی تھی کہ محی الدین اولاد نرینہ سے محروم رہیں گے- (اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے)

قادیانیوں کے خلاف تحریک میں مولانا معین الدین لکھوی اور ان کے رفقائے کرام کو اوکاڑا سے گرفتار کر کے ساہی وال جیل میں قید کر دیا گیا تھا- اس سے کچھ مدت بعد حضرت مولانا محمد علی لکھوی پاکستان تشریف لائے تھے- یہ ان کی پاکستان میں دوسری مرتبہ تشریف آوری تھی-

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ۱۹۵۱ کے انتخابات میں مولانا معین الدین لکھوی نے اوکاڑے کی مہاجر سیٹ سے کاغذات نامزدگی جمع کرائے تو دوسری طرف رانا غلام صابر خاں نے بھی جمع کرا دیے' رانا صاحب کے ساتھ مقامی سیٹ پر وہاں کی میاں فیملی کے ایک صاحب میاں غلام محمد امیدوار تھے ---- مولانا معین الدین کے کاغذات مسترد کر دیے گئے تھے اور رانا صاحب کامیاب ہو گئے تھے- مولانا معین الدین نے ان کے خلاف رٹ پٹیشن دائر کر دی- قانونی طور پر مولانا کی پوزیشن مضبوط تھی' جس کی رو سے رانا صاحب کی رکنیت خطرے میں پڑ گئی تھی اور ان کے ساتھی میاں غلام محمد بھی پریشانی میں مبتلا ہو گئے تھے ---- رانا غلام صابر خاں اصلاً ضلع ہوشیار پور کے رہنے والے تھے اور پیپلز پارٹی کے رہنما اور سابق صوبائی وزیر اکرام ربانی کے والد تھے- ان کے بڑے بھائی رانا جہاں داد خاں لاہور کے ایس ایس پی بھی رہے اور مغربی پاکستان کے آئی جی جیل خانہ جات بھی- اس طرح ان کے بہت سے رشتے دار ملک کے اہم مناصب پر فائز تھے اور فائز ہیں-

مولانا معین الدین ساہی وال جیل میں تھے اور رانا غلام صابر خاں کی کوشش تھی کہ وہ رٹ واپس لے لیں- میاں غلام محمد بھی یہی چاہتے تھے- رانا صاحب نے لاہور میں ہمارے ایک مرحوم دوست حاجی محمد اسحاق حنیف سے کہا کہ وہ مولانا معین الدین سے رٹ واپس لینے کے لیے کہیں ---- حاجی صاحب مرحوم کے مولانا معین الدین سے زیادہ مراسم نہیں تھے' وہ ان کو اور میاں غلام محمد کو میرے پاس دفتر "الاعتصام" میں لے آئے اور آمد کا مقصد بیان کیا- اس وقت مولانا داؤد غزنوی پنجاب اسمبلی کے رکن تھے' ان سے بھی بات کی- رانا صاحب اس سلسلے میں نہایت پریشان تھے- وہ مجھے اور مولانا غزنوی کو ساہی وال بھی

لے کر گئے‘ ہم نے مولانا معین الدین سے جیل میں ملاقات کی اور رٹ پٹیشن واپس لینے کے لیے کہا۔

ایک دفعہ یہ ہوا کہ سخت سردیوں کا موسم تھا۔ حضرت مولانا محمد علی ضلع قصور کے ایک مقام راجووال کے قریب ایک گاؤں میں مقیم تھے‘ جہاں قیام پاکستان کے قبل سے ان کی زرعی زمین تھی۔ رانا غلام صابر اور میاں غلام محمد میرے پاس آئے اور کہا کہ میں آج رات مولانا سے ملوں اور ان سے عرض کروں کہ وہ مولانا معین الدین کو رٹ واپس لینے کے لیے ارشاد فرمائیں۔ اس وقت مولانا معین الدین جیل میں تھے۔ مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا اور اس میں معین الدین کی کامیابی کے آثار نمایاں تھے۔

میں نے مولانا داؤد غزنوی سے بات کی اور رانا غلام صابر اور میاں غلام محمد کا مقصد بیان کیا۔

ان دنوں مولانا معین الدین کی درس گاہ جامعہ محمدیہ کے آدھے حصے پر پناہ گزینوں نے قبضہ کر رکھا تھا اور درمیان میں دیوار تعمیر کر لی تھی۔ رانا صاحب نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ قابضوں کا قبضہ ختم کرا دیں گے۔ رانا صاحب کے اس حتمی اور قطعی وعدے پر مولانا غزنوی بھی مطمئن تھے اور مجھے بھی یقین تھا کہ جامعہ محمدیہ کا مقبوضہ حصہ واگزار کرا لیا جائے گا۔

بہرحال رات کو آٹھ بجے کے قریب ان کی گاڑی سے میں‘ رانا غلام صابر اور میاں غلام محمد لاہور سے قصور کو روانہ ہوئے‘ ساتھ ایک طویل قامت نوجوان تھا۔ پتا چلا کہ اس کا نام زمان ہے اور یہ میاں غلام محمد صاحب کا بیٹا ہے۔ پروگرام یہ تھا کہ یہ لوگ قصور سے دیپال پور اور دیپال پور سے اوکاڑا چلے جائیں گے اور مجھے راستے میں راجووال کے قریب مولانا کے گاؤں اتار دیں گے۔

میں شب کے گیارہ بجے کے قریب گاڑی سے اترا۔ نہ راستے کا پتا‘ نہ صحیح طور سے منزل کا علم۔ ادھر ادھر چلتا اور ندیاں نالے عبور کرتا ہوا کافی آگے نکل گیا تو ایک طرف سے آواز آئی کون؟

جواب دیا: مسافر ہوں‘ راستہ بھول گیا ہوں۔

وہ شخص باہر نکلا تو اسے دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ وہ قمر الدین ترکھان تھا جو

مرکز الاسلام رہتا تھا اور اس کا ایک ہی لڑکا تھا' جس کا نام موسیٰ تھا- وہ باپ کے ساتھ تھا- دونوں باپ بیٹا مجھے چور سمجھ کر باہر نکلے تھے- اب وہ مجھے دیکھ کر حیران اور میں انھیں دیکھ کر متعجب----- کئی سال کے بعد ان سے اچانک ملاقات ہوئی تھی- پوچھا اس وقت کہاں جا رہے ہو؟ بتایا کہ حضرت مولانا محمد علی کی خدمت میں جا رہا ہوں- انھوں نے بہت اصرار کیا کہ میں رات ان کے پاس رہوں- لیکن میں نہیں رکا- مولانا وہاں سے کچھ فاصلے پر مقیم تھے- وہ مجھے ان کے ہاں لے گئے- نصف رات بیت چکی تھی کہ میں نے مولانا کے دروازے پر دستک دی- وہ باہر آئے اور مجھے دیکھ کر نہایت متحیر ہوئے-

فرمایا: آدھی رات آئے ہو' خیریت تو ہے؟

ان سے بات کی اور جامعہ محمدیہ کے سلسلے میں عرض کیا کہ رانا صاحب نے اسے خالی کرانے کا وعدہ کیا ہے----- یہ طویل قصہ ہے- مختصر یہ کہ مولانا معین الدین نے رٹ واپس لے لی' لیکن رانا صاحب جامعہ محمدیہ ناجائز قابضین سے خالی نہ کرا سکے---

حضرت مولانا محمد علی نے اس ضمن میں اس فقیر پر شدید ناراضی کا اظہار کیا' اور ان کی ناراضی بالکل صحیح تھی- مجھے اس وقت بھی اس کا سخت افسوس تھا' اب بھی افسوس ہے- اس سلسلے میں مولانا نے مجھے جو خطوط لکھے' میرے نزدیک ان کی حیثیت بہت بڑے تبرک کی ہے اور میں نے انھیں بڑی حفاظت سے رکھا ہے- ان میں سے ایک خط ملاحظہ کیجیے جو آج سے چھیالیس سال قبل ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ (مئی ۱۹۵۵ء) کا تحریر فرمودہ ہے- خط میں جہاں انھوں نے مجھے ڈانٹ پلائی اور سرزنش کی ہے' وہاں اس حقیقت کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ اس فقیر پر اعتماد بھی فرماتے ہیں- خط بڑا زوردار ہے---- جو باتیں انھوں نے مجھے فرمائی ہیں' تقریباً وہی باتیں مولانا داؤد غزنوی کے لیے فرمائی ہیں-- یعنی حقیقتاً ہم دونوں ان کے مخاطب ہیں- بلکہ غور کیا جائے تو میرا نام لے کر مولانا کو زیادہ مخاطب فرمایا ہے- پنجابی محاورے کے مطابق "دھیے کم کر' نوہیں کن کر" والا معاملہ ہے- پنجابی کے اس محاورے کا مطلب یہ ہے کہ جب ماں بیٹی کو کسی کام لیے کہے تو اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ کام اس کی بہو کرے- یعنی وہ زبان سے کہتی بیٹی کو ہے کہ یہ کام کر' اور سناتی بہو کو ہے کہ کان کھول کر سن لے' یہ کام تمھیں کرنا چاہیے-

اب خط ملاحظہ فرمایئے-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

من محمد علی بن محی الدین العلوی۔

مدرسہ بالمسجد النبوی۔

من مرکز الاسلام۔المدینہ المنورہ۔

الی عزیزی المولوی محمد اسحاق صاحب مدیر جریدہ الاعتصام لاہور' حفظہ اللہ تعالیٰ' آمین۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! و فقنا اللہ و ایاکم لما یحب و یرضاہ آمین۔

جامعہ محمدیہ کی دیوار مظالم شعار کے رفع ودفع کے مواعید و مواثیق کے بارے میں آیت شریفہ ان العهد كان مسئولا۔اور حدیث اذا وعد------ کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو توفیق بخشے' آمین۔

کیا یہ مدت طویل ناکافی ہے۔اگر آپ ایفائے عہد سے عاجز ہیں تو بالصراحت جواب دے دیں تاکہ ہم کوئی اور دوا استعمال کر سکیں۔عدم ایفاء عہد کم پر مجھے ہر دوست نے یقین دلانے کی پوری کوشش کی تھی مگر میں نے صرف مولانا سے ذاتی تعلقات پر سب دوستوں کی باتیں مسترد کر دیں اور آپ کی عزت قائم رکھی۔اب وہ دن آگئے ہیں کہ وہی بات صحیح ہوتی نظر آرہی ہے جو جماعت کے صائب الرائے احباب نے کہی تھی۔انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

آپ اس معاملے کو ہلکا خیال نہ فرمائیں' فقیر کی نظر حقیر میں یہ بہت بڑا اور اہم کام ہے۔ جس فریق نے آپ کو اس کام کے لیے فقیر کے پاس بھیجا تھا' نہ تو وہ آپ کے' نہ ہمارے قریبی رشتے میں سے تھے' نہ دینی لحاظ سے ان کی خدمت باعث اجر و ثواب تھی۔آپ کو کس امر نے ایسے کام پر مجبور کیا تھا' جس کی آپ کو طاقت نہ تھی۔کیوں آپ راتوں کے اندھیروں میں نہروں اور نالوں کو عبور کر کے پیدل چل کر تکالیف مالا یطاق برداشت کرتے تھے۔بار بار وہ آپ کو فقیر حقیر کے پاس بھیجتے تھے۔عزیزی معین الدین تک جیل میں جاکر ملتے تھے۔

اگر یہ فقیر عزیزی معین الدین کو مجبور نہ کرتا تو کبھی آپ' نہ آپ کے وہ مہربان کامیاب ہوتے۔اگر آپ نے یہ دیوار نہ اٹھائی یا آپ کے فریق نے نہ اٹھائی تو اتقوا دعوۃ المظلوم فانہ لیس بینھا و بین اللہ حجاب پر غور فرمائیے۔

یہ فقیر آپ کا پیچھا ہرگز نہ چھوڑے گا۔یہ کام آپ کا فرض ہے۔جس طرح ہو اس کو

پورا کرنا ہو گا- اقوال سے یا اموال سے' ہر ممکن اعمال سے' جس طرح ہو سکے کرو- یہ فقیر آپ کے گلے کا ہار ہے- جب تک یہ کام نہ کر لو گے' ہر گز نہیں چھوڑوں گا- آپ کو اتنی مہلت دے دی تھی کہ جس میں ملکوں میں کئی انقلاب ہو چکے اور آپ سے یہ ادنیٰ حرکت بھی نہ ہو سکی' حالانکہ بقول شما' آپ اور آپ کے یہ مہربان سب کچھ کر سکتے تھے- نہ ان کے پاس اموال کی کمی ہے' نہ بڑی بڑی ہستیوں کی کمی ہے- ظاہر ہے کہ مظلومہ جامعہ کی آپ کی نظروں میں کوئی خاص وقعت نہیں' ورنہ یہ خاموشی کیا معنیٰ رکھتی ہے-

آپ تمام مغربی پاکستان کے ارض وسما کے قلابے تو ملا سکتے ہیں اور یہ ایک ادنیٰ سی دینی خدمت آپ سے نہیں ہو سکتی- اگر خدانخواستہ آپ کی نظر عالی میں یہ جامعہ کوئی وقعت نہیں رکھتی تو یاد رکھیے کہ آئندہ فقیر کی نظر حقیر میں بھی آپ کی کوئی وقعت نہ رہے گی- کیوں کہ ہماری دوستی اور دشمنی اور محبت اور عداوت کا مدار اس جامعہ پر ہے' جس پر فقیر کے آباؤ اجداد اور اولاد و احفاد کی قیمتی زندگیاں فدا اور قربان ہیں' جو شخص اس کی طرف حقارت سے آنکھ اٹھائے گا' یہ فقیر انگشت شہادت سے باذن اللہ اس کی آنکھ نکال کر پھینک دے گا-

یہ فقیر آج کل کے سیاسی اہل حدیث میں سے نہیں- ہم فقرا و موحد اہل حدیث ہیں---ایای فاتقون--- ایای فارھبون---ولا تخشوا الناس واخشون--- والذین امنوا اشد حبا للہ--- ولا یخافون لومۃ لائم- وغیرہ آیات بینات فقیر کے لیے دثار و شعار ہیں-

فقیر نے آپ پر لوجہ اللہ اعتماد کیا اور اب تک آپ کو اپنا بھائی' ہمدرد و خیر خواہ اور اخی فی اللہ اور اخی فی الدین سمجھتا ہوں اور آپ پر پورے اعتماد سے امید رکھتا ہوں کہ آپ فقیر کے اس کام کو سر انجام فرما دیں گے' اور جہاں تک ہو سکے گا رانا فریق کو مجبور کریں گے' اور بہت جلد- عنقریب مجھے بذریعہ خط دکتابتیا بذریعہ الاعتصام یہ خوش خبری ارسال کر کے مشکور فرمائیں گے-

اگر کوئی بات عریضہ ہذا میں بمقتضائے بشریت راقم آثم سے غلط یا خارج از حد اعتدال معلوم ہو تو براہ کرم لوجہ اللہ فقیر کو معاف فرما دیں- کیوں کہ یہ فقیر بوجہ تاخیر غیر معمولی یقیناً از حد متاثر ہو چکا ہے- اللہ تعالیٰ اس نالائق کی کوتاہیاں معاف فرمائے' اور آپ بھی معاف فرمائیں-

نیز ایک اور شکایت باقی ہے۔ معاف فرمایئے کہ آج ۱۲ رمضان المبارک ۱۳۷۴ھ کو الاعتصام کا پرچہ مورخہ ۲۲ ربیع الاول نمبر ۱۶ پورے چھے ماہ کے بعد بذریعہ ہوائی ڈاک موصول ہوا۔ وللہ الحمد۔ مبلغ دس روپے فقیر نے برائے خرچہ ہوائی ڈاک اس لیے دیے تھے کہ ہر ہفتے تازہ الاعتصام مل کر باعث مسرت ہوا کرے گا۔ مگر افسوس کہ معاملہ برعکس ہوا۔ خدا تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے‘ اس کے متعلق کوئی سبیل احتیاط ہو تو عمل میں لا کر ممنون فرمایئے۔

مندرجہ بالا خط تو آپ کی خدمت میں بطور عریضہ ارسال ہے اور مندرجہ ذیل اخبار الاعتصام میں شائع فرما کر ممنون فرمائیں۔

(اخبار مدینہ منورہ)

(۱) مسجد نبوی کی توسیع کا کام بڑے زور سے شروع ہے۔ مسجد کے مغربی برآمدے بالکل تیار ہو چکے ہیں‘ جن میں نمازیں ادا ہو رہی ہیں۔ مسجد کے شمالی برآمدے بھی مکمل ہیں‘ صرف صفائی باقی ہے۔ مسجد کے مشرقی برآمدوں کی تعمیر شروع ہے۔ حج تک غالباً کام ختم ہو جائے گا۔ یہ عمارت حسن و جمال و تقویت میں پرانی عمارت سے فائق اور بہت بلند ہے۔

(۲) مسجد کے مغربی برآمدوں کے باہر بہت چوڑی سڑک چھوڑ کر جدید عمارت مسجد کے طول کے برابر دو منزلہ دکانوں کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

(۳) جنت البقیع کی طرف سور البلد (دیوار شہر پناہ) سب توڑ دی گئی ہے‘ اور بقیع کے شمال میں جو باغات اور ٹیلے تھے‘ حکومت نے بازار کی قیمت سے زیادہ قیمت پر خرید کر کے مشینیں لگا کر تمام زمین ہموار کر کے زائرین کے لیے بہت بڑا وسیع میدان بنا دیا ہے۔

(۴) باب قبا سے مسجد قبا تک سیدھی سڑک بہت چوڑی پختہ لک ڈال کر تیار کر دی ہے۔ ہر زائر بلا خوف اور بلا راہبر مسجد قبا جا سکے گا۔

(۵) اسی طرح پختہ سڑک جبل احد‘ خمسہ مساجد‘ قبلتین وغیرہ بن گئی ہیں۔

(۶) شہر میں جا بجا پانی کے نلکے لگا دیے گئے ہیں‘ جس سے حجاج کو بہت آرام ہو گا۔

(۷) عوام میں فیشن پرستی بڑھ رہی ہے۔

(۹) بے شمار محمدی سنتیں مردہ اور افرنجی سنتیں زندہ ہو رہی ہیں۔

(۱۰) فحش تصاویر اور ریڈیو کے گانے اور ٹیڑھی مانگ گھر گھر موجود ہے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ---- اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔

اخبار الاعتصام کے ذریعے پہلے اعلان کر چکا ہوں' تاہم بے شمار خطوط آتے ہیں جن میں لوگ مکہ اور مدینہ میں رہنے کا مشورہ اور قواعد دریافت کرتے ہیں- فرداً فرداً جواب دینا محال ہے' لہٰذا دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ ہر بالغ مرد یا عورت کا پانچ سالہ پختہ پاسپورٹ پاکستانی ہونا ضروری ہے- پھر ایک ضامن سعودی رعیت دینا ہوگا' پھر مکہ اور مدینہ میں رہنے کی اجازت مل سکتی ہے- حج کے پاسپورٹ پر رہنا ناممکن اور محال ہے' حج کے بعد جبراً حکومت نکال دیتی ہے' مگر وہ جو چوری سے بے عزتی کرا کے رہے---- جب تک یہ مذکورہ شرائط نہ ہوں مکہ یا مدینہ میں کوئی شخص مزدوری وغیرہ کام نہیں کر سکتا' مگر چوری سے----! خلاف قانون مذکور مکان کرایہ پر دینے والا گرفتار' قید' جرمانے کا سزاوار ہوگا-

والسلام

محمد علی از مدینہ منورہ

حضرت مولانا کا مکتوب گرامی آپ نے پڑھ لیا- واقعہ یہ ہے کہ جس سزا کا میں مستحق تھا' یہ ڈانٹ اس سے بہت ہلکی ہے- یہ تو "مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا" والی بات بھی نہ ہوئی-

یہ میری بے وقوفی تھی کہ اپنے محسن اور دوست کو نقصان پہنچایا اور ان لوگوں کے مفاد کے لیے رات کے اندھیرے میں دھکے کھائے اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالا' جن سے نہ کوئی رشتے داری تھی' نہ مسلکی یا علمی تعلق تھا' نہ کوئی دنیوی یا دینی واسطہ تھا' نہ سیاسی ہم آہنگی تھی---- حضرت مولانا نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے' بالکل صحیح فرمایا ہے-----

لیکن یہاں یہ عرض کردوں کہ مولانا معین الدین نے اس موضوع پر کبھی کوئی بات نہیں کی---- یہ ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے- آج ۱۲- اپریل ۱۹۹۸ء کو جب یہ سطور لکھ رہا ہوں' اس پر پینتالیس سال کا عرصہ بیت چکا ہے' اس اثنا میں مولانا معین الدین سے بے شمار ملاقاتیں ہوئیں' ان کے ساتھ طویل نشستیں رہیں' جن میں کئی قسم کی باتیں ہوئیں- چند سفر بھی ان کے ساتھ کیے- ان کی لاہور بھی آمد و رفت رہتی ہے- میں بھی بہت مرتبہ ان سے ملنے اوکاڑے گیا- لیکن یہ بات انھوں نے کسی انداز میں کبھی نہیں کی----- انھوں نے اپنی گرہ سے کئی لاکھ روپے دے کر قابضین سے جامعہ محمدیہ کا مقبوضہ حصہ واگزار کرایا' مگر اس کا کبھی مجھ سے اشارہ کنایہ تک نہیں کیا-----

بے شک مولانا معین الدین نہایت متحمل مزاج' انتہائی بردبار اور بڑے دل گردے

کے مالک ہیں۔

ایک اور مکتوب گرامی ملاحظہ فرمایئے' یہ بھی اسی سلسلے کا ہے' اس پر تاریخ مرقوم نہیں' لیکن اس کے سیاق اور مضمون سے پتا چلتا ہے کہ ۱۹۵۴ کے پس وپیش کا ہے۔

عزیزی مولوی محمد اسحاق صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ وفقنا اللّٰہ و ایاکم لمایحب و یرضاہ۔ خیریت۔ معلوم ہوا ہے کہ آپ اور حضرت مولانا کی موجودگی میں عزیزی معین الدین نے آپ کے حسب منشا مجسٹریٹ کے سامنے بیان دے دیا ہے۔

ہمارے ذمے جو حق تھا' وہ ہم نے محض آپ کی اور حضرت مولانا کی وجہ سے پورا ادا کر دیا۔ اب آپ کا کام ہے کہ اپنا ذمہ پورا اور وافی سر انجام فرما کر مشکور فرمائیں۔ حالات کچھ سست اور خلاف توقع نظر آتے ہیں۔ آپ پوری کوشش سے کام لیں' ایسا نہ ہو کہ ہمارے اور آپ کے تعلقات میں فرق آ جائے۔ کیوں کہ المرجفون نے ہمیں ہر طرح سے ایذا دینی شروع کی ہوئی ہے' اور دوسری طرف ہم مکان کی اور پاخانوں کی دربندی اور تنگی سے اس قدر مجبور ہیں' جس کا اندازہ تحریر سے باہر ہے۔ اب ہماری آنکھیں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ کب اور کیا خبر آتی ہے۔ آپ اس حقیر تحریر کو بہت کچھ خیال فرما کر فریق ثانی کو ہر لحظہ اور ہر وقت تنبیہ کرتے رہیں۔ کیوں کہ ان کو اور نئے نئے حالات ہماری تکالیف سے غافل کرنے والے پیش آ رہے ہیں۔ افسوس کہ تاریخ کا کوئی پتا نہیں آیا۔ اس رفتار پر سالہا سال کے صبر کی ضرورت ہے۔

والسلام

آپ کا دعاگو

محمد علی لکھوی

اس مکتوب میں مولانا لکھوی نے دو مقام پر ''حضرت مولانا'' کے الفاظ تحریر فرمائے ہیں' اس سے مراد مولانا سید داؤد غزنوی ہیں۔

جامعہ محمدیہ کے سلسلے میں حضرت مولانا لکھوی نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے' وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ جو لوگ اس وقت جامعہ کے آدھے حصے پر قابض تھے' انھوں نے اساتذہ اور طلبا کو ہر اعتبار سے مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا' رانا غلام صابر خاں نے خالی کرانے کی

کوشش تو کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سے کئی سال بعد مولانا معین الدین نے قابضین کو لاکھوں روپے دیے تو اسے بڑی مشکل سے خالی کرایا گیا۔۔۔۔ مگر ہم لوگ ان کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

ایک اور خط پڑھیے۔ یہ خط یکم مئی ۱۹۵۳ء کا مرقومہ ہے۔ اس وقت مولانا اوکاڑے میں تھے، انھوں نے یہ خط اوکاڑے ہی سے تحریر فرمایا تھا۔

بخدمت عزیزی مولوی محمد اسحاق۔!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ الداعی لکم للخیر بالخیر۔

معلوم ہوا ہے کہ آپ اور حضرت مولانا محمد داؤد صاحب میری عدم موجودگی میں عزیزی معین الدین سے ملے۔ بواپسی ڈاک معین الدین کے جواب سے مطلع فرمائیں۔ دوسری ایک تکلیف دیتا ہوں کہ مورخہ ۲۵۔ جولائی ۱۹۴۹ء کو آر۔ سی کا فیصلہ بحق جامعہ محمدیہ ہوا تھا۔ اس فیصلے کی نقل ہر ممکن طریق سے حاصل کریں، جو خرچ ہوگا، میں آکر دے دوں گا۔ فیصلہ مذکورہ آر۔ سی لاہور ملک فتح محمد کا ہے۔ اس فیصلے کی نقل بہر صورت حاصل کریں خواہ اپیل ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ اصل پہلی چٹ نہیں مل سکی، گم ہو گئی ہے، اس کی نقل اندراج رجسٹر سے حاصل کرنے کی کوشش ہے۔

معین الدین کی پٹیشن چھڑانے میں اگر مضطر فریق ثانی کا جذبہ صادق ہے تو جامعہ کی بلڈنگ کو پوری طرح سے خالی کرانے کا قدم جلد سے جلد اٹھائیں۔ ورنہ گلہ نہ دارد۔ حضرت مولانا موصوف و عزیزم عطاء اللہ صاحب کو سلام۔

راقم محمد علی لکھوی

"عزیزم عطاء اللہ صاحب" سے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی مراد ہیں۔

حضرت مولانا محمد علی لکھوی نہایت خود دار تھے اور اپنی خودداری کو کسی موقعے پر مجروح نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کی وضاحت ان کے ان مکتوبات سے بخوبی ہو جاتی ہے جو آپ کے مطالعے میں آئے ہیں۔ وہ پاکستان سے اپنی مرضی کے مطابق کسی سے جو کتابیں یا رسائل و جرائد منگواتے تھے، ان کی قیمت ادا کرتے تھے۔ میں اخبار الاعتصام کا ایڈیٹر تھا اور ان کا ادنیٰ نیاز مند۔۔۔۔ اخبار مرکزی جمعیت کا ترجمان تھا اور جمعیت کے صدر مولانا سید محمد

داؤد غزنوی تھے جو ان کے دوست تھے- اس کے ناشر مولانا عطاء اللہ حنیف تھے' جو ان کا انتہائی احترام کرتے تھے- مولانا معین الدین لکھوی مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن تھے- لیکن اس کے باوجود وہ اخبار "الاعتصام" قیمتاً منگواتے تھے' بلکہ اس سستے زمانے میں دس روپے قیمت سے زیادہ ادا فرماتے تھے' تاکہ اخبار بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جائے اور ہر ہفتے تازہ شمارہ ان کے مطالعے میں آئے-

۱۹۵۹ء کی بات ہے کہ میں ایک سلسلے میں تین ہزار روپے کا مقروض ہو گیا- اب تو تین ہزار روپے کو کوئی شخص اہمیت نہیں دے گا' لیکن اس زمانے میں تین ہزار روپے کا اطلاق بہت بڑی رقم پر ہوتا تھا- میں اخبار الاعتصام کا ایڈیٹر تھا اور تنخواہ دو سو روپے تھی جو اس وقت معقول تنخواہ تھی- کرائے کے مکان میں رہتا تھا' اور ٹھیک ٹھاک گزارا ہو رہا تھا' مگر قرض کے بارے میں نہایت پریشان تھا کہ اس سے کیوں کر چھٹکارا حاصل ہو----!

میں نے حضرت مولانا کی خدمت میں مدینے شریف خط لکھا کہ آپ دیارِ حبیب میں بیٹھے ہیں' میرے لیے دعا فرمائیے کہ اللہ قرض سے نجات دلائے- مجھے یقین ہے آپ کی دعا ضرور قبول ہو گی ---- انھوں نے فوراً جواب دیا کہ یا حی یا قیوم برحمتك استغیث کثرت سے پڑھا کرو' ان شاء اللہ قرض سے سبک دوش ہو جاؤ گے- ان کا مکتوب گرامی پڑھتے ہی میں نے اس نسخے پر عمل شروع کر دیا- نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بہت جلد ایسے حالات پیدا کر دیے کہ میں قرض سے سبک دوش ہو گیا---- اس کی صورت یہ بنی کہ بعض اخبار والوں نے مجھ سے رابطہ پیدا کیا اور معقول معاوضے پر مضامین لکھوانے لگے- تین یا چار مہینوں میں قرض اتر گیا-

حضرت مولانا عالی مرتبے کے عالم تھے- ان کی نرمی ان کی جرات کی غماز' ان کا انکسار ان کے جلال کا عکاس اور ان کی تواضع ان کی بے نیازی کی آئینہ دار تھی- کسی کے سامنے جھکنا اور خودداریٔ نفس کو عارضی مفاد کے بھینٹ چڑھا دینا ہرگز ان کا شیوا نہ تھا- وہ ایک اونچے خاندان کے اونچے رکن تھے- اپنے خاندانی وقار' علمی مرتبے اور عزتِ نفس کی انتہائی حفاظت کرتے تھے-

انھوں نے مختلف مواقع پر اس فقیر کو یاد فرمایا اور مکتوباتِ گرامی سے نوازا- ان میں سے بعض مکتوبات خواندگانِ محترم کے ملاحظے میں آ چکے ہیں' جن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس

عاجز کے لیے انھوں نے بے حد شفقت کا اظہار بھی فرمایا ہے اور انتہائی تہدید کا بھی ---! ان کی تحریر روانی، تسلسل، دلائل، پند و نصائح اور جلال و جمال کا بہترین مرقع ہے -- اور یہ مرقع بہ طور تبرک میرے پاس محفوظ ہے - اس فقیر پر ان کی شفقت بہ درجہ غایت کرم فرمائی کی دلیل ہے، اور جہاں انھوں نے تہدید فرمائی ہے، وہ ان کا حق تھا، اور اپنا حق انھوں نے بالکل صحیح طور سے استعمال فرمایا ہے - میں نالائق اسی لائق تھا، بلکہ اس میں انھوں نے نرمی فرمائی ہے، میری کوتاہیاں اس سے کہیں بڑھ کر تھیں -

ان کے حدودِ مطالعہ بڑے وسیع تھے اور مخالفت و موافقت کے ہر پہلو پر ان کی نظر تھی - وہ اپنے مسلک کی حقانیت و حفاظت کو اولیں اہمیت دیتے تھے -

جماعت اہلِ حدیث کے بارے میں ان کا فرمان تھا کہ اس کے علمائے کرام اپنے آپ کو صرف جلسوں اور تقریروں تک محدود نہ رکھیں، بلکہ ٹھوس علمی خدمات سر انجام دیں، کتب حدیث کے شروح و حواشی کی طرف بالخصوص عنانِ توجہ مبذول کریں - اس ضمن میں انھوں نے مجھے ایک خط لکھا جو میں نے ابتدائی الفاظ حذف کر کے ۵- اگست ۱۹۶۰ء کے ''الاعتصام'' میں شائع کیا - اس خط میں انھوں نے جماعت اہلِ حدیث کے اعیان و ارکان کو جن امور کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ نہایت اہم ہیں بلکہ اصل امور وہی ہیں، جنھیں جماعت کو مرکزِ التفات ٹھہرانا چاہیے ----- مکتوبِ گرامی ذیل میں درج کیا جا رہا ہے - اس مکتوب میں تڑپ بھی ہے، جذبہ بھی ہے اور جماعت سے دردمندانہ التماس بھی -----! مگر اس جماعت پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ---- یہ اثر پروف جماعت ہے - یہاں جو کوئی علمی کام ہو رہا ہے، انفرادی طور پر ہو رہا ہے، جماعتی طور پر بالکل نہیں ہو رہا اور نہ ان شاء اللہ ہو گا - جماعتی طور پر صرف جلسے ہو رہے ہیں اور جلسے ہی ہوں گے ---- یا جماعتی طور پر ایک دوسرے کی مخالفت ہو رہی ہے اور حالات بتاتے ہیں کہ ہمیشہ ہوتی رہے گی -

اب مولانا کا مکتوبِ گرامی ملاحظہ فرمایئے -

عزیزی مولوی محمد اسحاق مدیر ''الاعتصام'' لاہور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جملہ جماعت اہلِ حدیث کے ذمہ دار حضرات کا فرض ہے کہ کتاب و سنت کی اشاعت کے لیے کتب صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث کی طباعت اپنے ہاتھ میں

پس-اب حالات یہ ہیں کہ جملہ کتب حدیث کے لیے غیر اہل حدیث مطابع کھلے ہیں' وہ جو چاہیں کریں----فی الحال ایک مترجم بلوغ المرام مطبع نور محمد کراچی سے مطبوع ہو کر آئی ہے' جس کے ابتدا میں مرتب بلوغ المرام شیخ الاسلام فی الحدیث مقبول عالم ابن حجر عسقلانی کے سوانح ہیں-ایسے طریقے سے ان کی تحقیر واہانت کی گئی ہے' جس سے ان کی جملہ تصانیف پر ایسی زد پڑ سکے کہ وہ قابل اعتماد نہ رہیں-(چند مثالیں ملاحظہ ہوں)

۱- زود نویسی کے عنوان میں یہ الفاظ ہیں: "حافظ ابن حجر کی تصانیف میں جو اوہام ہیں' اس کا سبب ان کی زود خوانی ہے-"

۲- "حافظ صاحب غلطی کرتے ہیں اور پھر اس پر مصر بھی رہتے ہیں-"

۳- "حافظ صاحب جس طرح زود خواں تھے' اسی طرح زود نویس بھی تھے' مگر نہایت بد خط تھے-"

۴- "ان کا خط پہچاننا اور پڑھنا سخت دشوار تھا-"

یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے کہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حنفی مذہب کے دلائل پر جو کچھ لکھا ہے وہ قابل اعتماد نہ رہے-اس وقت اس غلط پروپیگنڈے کے جواب سے غرض نہیں- مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ جماعت اہل حدیث کے طباعت کتب حدیث سے اور ائمہ حدیث کے متون وشروح کی طباعت سے غافل ہونے سے غیر اہل حدیث غیر صحیح طریقے سے اقتصادی اور اعتقادی فائدہ اٹھا رہے ہیں' اور اہل حدیث چند رسالوں اور اخباروں کی خرید و فروخت پر قانع ہو کر سو رہے ہیں-اگر بڑا کام کیا تو ایک کانفرنس یا جلسے کے انعقاد کی سنت زندہ کر دی-

مصنف بلوغ المرام پر نزلہ گرا کر پھر ترجمے کے اندر کس طرح غلط چال چلی گئی ہے-ملاحظہ ہو-

۱- حدیث ابی ہریرہ میں فی البحر صریح ہے جو سائل کے جواب میں ارشاد ہے' جو سمندر کے حق میں تھا-مترجم صاحب نے یہ چالاکی فرمائی کہ (۱) حدیث ابی سعید خدری (۲) اور حدیث ابی امامہ باہلی (۳) اور روایت بیہقی (۴) سب میں دریا کا پانی

کا لفظ اپنی طرف سے بڑھا کر من کذب علی فلیتبوا مقعدہ فی النار کا درجہ حاصل کیا- حالانکہ نمبر ۲، ۳، ۴ مطلق پانی کے حق میں ہے ---- یہ ہے نتیجہ تقلید کا-

۲- حدیث قلتین جس کو اکثر ائمہ اہل الحدیث نے صحیح کہا ہے، اس میں مترجم صاحب فرماتے ہیں، یہ حدیث قابل عمل نہیں-

۳- حدیث خلال میں کان یخلخل کا ترجمہ ہے ---- ارشاد فرمایا کہ خلال کیا کرو-

۴- ناصیہ کا ترجمہ چوتھائی کیا ہے-

۵- مذاء کا ترجمہ جریان کا مریض کیا ہے-

۶- طاہر کا باوضو کیا ہے-

یا ترجمہ غلط ہے یا مذہب کے لیے رعایت ہے-

الغرض اہل حدیث اردو خواں کے لیے مقام خطر ہے- جماعات اہل حدیث پاک و ہند کا فرض ہے کہ اس کا تدارک فرمایا جائے- وما علینا الا البلاغ-

محمد علی العلوی لکھوی، مدینہ منورہ

۱۶ نومبر ۱۹۶۰ء کو حضرت مولانا کسی کو اطلاع دیے بغیر اچانک اوکاڑے تشریف لائے- قیام پاکستان کے بعد وہ یہاں تیسری دفعہ آئے تھے- ان کی آمد کی اطلاع پا کر مولانا داؤد غزنوی کے حکم سے میں نے ۲۶ نومبر ۱۹۶۰ء کو مولانا معین الدین کے نام مندرجہ ذیل عریضہ بھیجا-

برادر مکرم مولانا معین الدین صاحب! زید مجدکم

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ- حضرت مولانا صاحب مدظلہ العالی کی تشریف آوری سے نہایت خوشی ہوئی- تازہ "الاعتصام" میں ان کی آمد پر شذرہ ملاحظہ گرامی میں گزرا ہوگا-

حضرت مولانا غزنوی صاحب نے آج فرمایا کہ حضرت سے ملاقات کے لیے اوکاڑے حاضر ہوا جائے- چنانچہ آپ کو کال بک کرائی گئی کہ آپ سے حضرت مولانا کے پروگرام کے متعلق دریافت کیا جائے مگر بہت کوشش کے باوجود آپ

سے رابطہ نہ پیدا ہو سکا- ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ جمعے کا خطبہ حضرت مولانا نے اوکاڑے میں ارشاد فرمایا ہے اور کل اتوار کو بخشنے والے تشریف لے جا رہے ہیں' لیکن مولانا غزنوی ان سے اوکاڑا ہی میں ملنا چاہتے ہیں تاکہ دوسری جگہ کے لوگوں کو تکلیف نہ ہو- مولانا کے ساتھ یہ فقیر اور مولوی عبدالعظیم صاحب انصاری بھی حاضر ہوں گے-

آپ کی خدمت میں گزارش ہے کہ مولانا کے پروگرام سے مطلع فرمائیں- اگر مولانا صاحب پیریا منگل کو واپس اوکاڑا تشریف لا رہے ہیں تو مطلع کریں- بلکہ بہتر ہے کہ دو چار روز میں آپ ان کو خود ہی اوکاڑے بلا لیں- بواپسی ڈاک اطلاع دیں-

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مولانا صاحب چند روز تک لاہور بھی تشریف لا رہے ہیں- اگر یہ صحیح ہے تو مولانا غزنوی فرماتے ہیں کہ وہ جمعے کا خطبہ مسجد چینیاں والی میں ارشاد فرمائیں-

امید کہ مزاج بخیر ہوں گے

والسلام

نیاز کیش

محمد اسحاق

اس عریضے کا جواب حضرت مولانا نے اپنے دست مبارک سے تحریر فرمایا جو درج ذیل ہے-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزی مولوی محمد اسحاق صاحب!

وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

بروز بدھ بندہ جامعہ محمدیہ میں رہے گا- بروز خمیس بسوئے ملتان وعدہ ہے-

والسلام

الداعی لکم

محمد علی عفی عنہ

۶۰ / ۱۱ / ۲۷

حضرت مولانا کے اس گرامی نامے کے بعد' مولانا داؤد غزنوی اور مولانا عبدالعظیم انصاری بدھ کے روز ۳۰ نومبر ۱۹۶۰ء کو نو دس بجے کے قریب اوکاڑا پہنچے اور شام تک وہاں رہے۔ مختلف مسائل پر ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ مولانا غزنوی نے انھیں لاہور تشریف لانے کی دعوت دی جو ازراہ کرم انھوں نے منظور فرمائی۔

۱۳۔ جنوری ۱۹۶۱ کو حضرت مولانا لاہور تشریف لائے۔ ۱۴ جنوری کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی طرف سے جمعیت کے دفتر میں ان کے اعزاز میں دعوت عصرانہ کا اہتمام کیا گیا۔ یہ ایک پروقار تقریب تھی' جس میں لاہور کی جماعت اہل حدیث کے تقریباً پچاس ارکان نے شرکت کی' جن میں مولانا سید داؤد غزنوی' مولانا محی الدین احمد قصوری' مولانا عطاء اللہ حنیف' میاں عبدالمجید' شیخ محمد اشرف' مولانا محی الدین لکھوی' مولانا محمد حنیف ندوی' مولانا عبدالعظیم انصاری' ماسٹر محمد جمیل' میاں محمد اسماعیل' مولانا حکیم ہدایت اللہ' خواجہ محمد طفیل' مولانا محمد احمد' مولانا عبدالرشید' پروفیسر عبدالقیوم' مولانا محمد رمضان' مولانا حافظ محمد اسحاق' حافظ عبدالرشید' مولانا عبدالکریم' پروفیسر سید ابوبکر غزنوی' مولانا شریف اللہ خاں اور ان سطور کا راقم شامل تھے ----- ان میں سے زیادہ حضرات وفات پا چکے ہیں اور تھوڑے زندہ ہیں۔

اس سے دو دن بعد ۱۶ جنوری ۱۹۶۱ء (آخر رجب ۱۳۸۰ھ) کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں صحیح بخاری کا اختتام ہوا۔ اس موقعے پر حضرت مولانا لکھوی نے صحیح بخاری کی آخری حدیث کا درس دیا اور صحیح بخاری کی بعض خصوصیات نہایت عمدہ پیرائے میں بیان فرمائیں اور بعض ایسے نکات کی وضاحت کی جو ان کے استاذ محترم حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے حلقہ درس میں بیان فرمایا کرتے تھے۔

حسن اتفاق ملاحظہ ہو کہ متحدہ پنجاب کے دو خاندان ----- غزنوی اور لکھوی ----- علم و روحانیت میں خاص شہرت کے حامل ہیں اور ایک دوسرے سے منسلک و وابستہ ---- اس سال لکھوی خاندان کے ممتاز رکن حضرت مولانا محمد علی صاحب نے غزنوی خاندان کے جاری کردہ دارالعلوم میں صحیح بخاری کی آخری حدیث کا درس دیا تھا' اور اس مبارک موقعے پر غزنوی خاندان کے چشم و چراغ مولانا سید محمد داؤد غزنوی بھی تشریف فرما تھے۔

۱۷۔ جنوری کو ہفت روزہ "الاعتصام" اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کے عملے کی

طرف سے حضرت مولانا لکھوی کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا۔

۱۹-جنوری ۱۹۶۱ء کو لاہور کی جمعیت شبان اہل حدیث کی طرف سے مسجد چینیاں والی میں حضرت مولانا کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا۔اس موقعے پر چینیاں والی مسجد کے مدرسہ تجوید القرآن کے صدر مدرس قاری اظہار احمد تھانوی اور قاری محمد صدیق نے مولانا کی خواہش پر قرآن مجید کا ایک ایک رکوع تلاوت کیا۔

۲۰-جنوری کا خطبہ جمعتہ المبارک مولانا نے لاہور کی مسجد مبارک میں ارشاد فرمایا۔

۲۴-فروری ۱۹۶۱ کے الاعتصام میں مولانا محمد علی صاحب لکھوی کی طرف سے مندرجہ ذیل اعلان شائع ہوا۔

۱- مجھے مختلف حضرات خطوط روانہ کرتے ہیں اور از راہ اخلاص اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔افسوس ہے میں ہر خط کا نہ جواب دے سکتا ہوں اور نہ ہر جگہ خود حاضر ہو سکتا ہوں۔مصروفیات بہت زیادہ ہیں اور سفروں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں کہ میرے احباب مجھے یاد فرماتے ہیں،لیکن ساتھ ہی معذرت خواہ ہوں کہ ان کا مطالبہ پورا نہیں کر سکتا۔

۲- متعدد حضرات مجھ سے مشورہ طلب کرتے ہیں کہ وہ حج کے لیے جا رہے ہیں، وہاں معلم کس کو مقرر کریں۔میرا ان تمام حضرات حجاج کو یہ مشورہ ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں الشیخ عبدالرحمٰن مظہر کو اپنا معلم مقرر کریں۔وہ بڑے نیک، متدین، موحد، اہل حدیث اور متبع سنت بزرگ ہیں۔ان کو معلم مقرر کرنے سے حجاج کرام فائدے میں رہیں گے۔

۳-مجھ سے مدینہ منورہ میں رہائش کے لیے اکثر حضرات دریافت کرتے ہیں۔ان کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں ”اہل حدیث منزل“ پہنچ جائیں۔یتیم خانے کے سامنے سے گلی شروع ہو کر حدیث منزل کو سیدھی جاتی ہے۔وہاں حجاج کی رہائش و قیام کا مکمل اور آرام دہ انتظام ہے۔میں خود بھی ان شاءاللہ موسم حج تک وہاں پہنچ جاؤں گا۔

محمد علی لکھوی

جامعہ محمدیہ، اوکاڑہ

مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ (۲۹-رجب ۱۳۸۳ھ) کو ہوئی تھی۔ان کی وفات پر حضرت مولانا محمد علی لکھوی نے ایک تعزیتی مکتوب ۲ رمضان

۱۳۸۳ھ (۱۸ جنوری ۱۹۶۴ء) کو مولانا کے صاحب زادوں سید عمر فاروق غزنوی اور سید ابو بکر غزنوی کے نام ارسال فرمایا۔ اس مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ لکھوی اور غزنوی خاندانوں کے روابط کتنے گہرے تھے۔ نیز مولانا محمد علی اور مولانا داؤد غزنوی کے باہم کس درجہ مضبوط مراسم تھے۔ مکتوب مندرجہ ذیل ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت عزیزی عمر فاروق و ابو بکر خلف رشید اخی المرحوم حضرت مولانا محمد داؤد صاحب الغزنوی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔۔۔ امابعد فقد قال اللّٰه سبحانه و تعالیٰ و بشر الصابرين الذين اذا اصابتهم مصيبة قالوا انا للّٰه و انا اليه راجعون۔ اولئك عليهم صلوٰة من ربهم و رحمة و اولئك هم المهتدون۔

عزیزان من! اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کو اور جملہ اہل بیت وجملہ خاندان غزنویہ اور جملہ جماعات اہل حدیث کو صبر جمیل کی توفیق عنایت فرما کر اجر جزیل کی جلیل القدر نعمت سے سرفرازی بخشے۔ آمین ثم آمین۔

مجھے اخی المرحوم کی وفات حسرت آیات سے بلا مبالغہ و تصنع واقعی وہ صدمہ ہوا ہے جو کسی کو حقیقی نسبی بھائی کی وفات سے ہوتا ہے، جس کا اظہار سوائے اس کے مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ انما اشكوا بثي و حزني الى اللّٰه۔

حضرت امام صاحب مولانا عبدالجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن اخی المرحوم کو فرمایا تھا کہ داؤد! تم محمد علی کو اپنا بھائی سمجھا کرو۔ اس کے والد مولانا عبدالرحمٰن صاحب میرے بھائی تھے۔ حضرت امام صاحب کی اس وصیت پر میرے الاخ المرحوم نے پورا عمل کیا۔ مسجد غزنویہ میں ایام طالب علمی سے لے کر آج تک لڑکپن، جوانی، بڑھاپے تک ہم درد، ہم راز، بھائی بھائی رہے، اللہ لحمد۔

اگرچہ ہمارے خاندان الگ الگ ہیں مگر روحانی اور دینی سلوک میں ایک ہیں۔ حضرت ولی اللہ المعروف مولانا عبداللہ صاحب غزنوی راقم کے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہما کو اپنی صلبی اولاد سے مقدم رکھتے تھے۔ صوفی عبدالحق صاحب مرحوم غزنوی فرمایا کرتے تھے کہ مجھے حضرت عبداللہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ بسوے عبدالرحمٰن برو کہ آں آفتاب است

یعنی علم سلوک کے لیے عبدالرحمٰن کی طرف جاؤ کہ وہ علم سلوک کا آفتاب ہے۔

الحاصل کہ حضرت والد ماجد' حضرت عبداللہ صاحب کے روحانی لڑکے تھے۔لہٰذا اخی المرحوم حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی تغمدہ اللہ تعالیٰ برحمتہ راقم کے بھائی روحانی ہوئے جو کہ نسبی بھائیوں سے بہ درجہا افضل واعلیٰ مقام ہے۔

مجھ راقم کو کیسے غم والم نہ ہوتا کہ ایک مخلص' روحانی ہم درد' ہم راز بھائی درد جدائی دے کر خاص کر مجھے اور پاکستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی جماعت کو بلا قائد چھوڑ کر اپنے رحیم و کریم مولائے پاک کو جا ملے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔۔جس کے بعد آج پوری جماعت میں ایسا جامع اور مانع شخص جو دین اور دنیا کے نشیب و فراز کو بخوبی سمجھ سکے نظر نہیں آتا (الا ماشاءاللہ) جو اس منتشر جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکے اور اس کی کو پورا کرے جو جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان میں واقع ہوئی۔

وہ تمام خوبیاں جو اخی المرحوم میں تھیں' خاندانی اثر' ذاتی خوبیاں' سیاست' ذہانت' تقریر' تحریر' شجاعت وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کی سب اب کہاں ملیں گی۔ مگر بقول مالا یدرك كله لا يترك كله۔ جماعت و جمعیت مغربی پاکستان کی مرکزی جمعیت کے ارکان و مسئولین کی خدمت میں عرض ہے کہ اس کمی کا تدارک جلد سے جلد ہونا چاہیے۔

بخدمت جملہ ارکان و مسئولین جمعیت مغربی پاکستان اور خصوصاً محترم مولانا محمد اسماعیل صاحب ناظم جمعیت کی خدمت میں بعد از السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ عرض ہے کہ اس بنے بنائے نظام کی حفاظت بہ دستور سابق آپ ہی کے ذمے ہے اور آپ ہی مسئول ہیں عنداللہ و عندالجماعہ۔ ویداللہ علی الجماعہ'

والسلام

المرسل خادم اہل حدیث

محمد علی لکھوی عفی اللہ عنہ

از منزل اہل حدیث بالمدینۃ المنورہ۔

۲۔رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ

حضرت مولانا محمد علی لکھوی نے شمسی حساب سے مولانا داؤد غزنوی کی وفات سے دس سال تین دن بعد ۱۹۔ دسمبر ۱۹۷۳ء کو مدینہ منورہ میں وفات پائی ۔۔۔ قمری حساب سے

۲۳ ذیقعدہ ۱۳۹۳ھ کو ان کا انتقال ہوا- وہ کم و بیش چالیس سال مدینہ منورہ کی اس مسجد میں قرآن و حدیث کا درس دیتے اور مختلف ملکوں کے طلبا کو پڑھاتے رہے جو خود رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مہاجرین و انصار صحابہ کرام نے اپنے مبارک ہاتھوں سے تعمیر کی تھی' جسے مسجد نبوی کے اعلیٰ ترین نام سے موسوم کیا گیا--- یہ عظیم الشان سعادت ہے جو حضرت مولانا کے حصے میں آئی- اس مسجد میں ان سے ہزاروں طلبا نے کسب علم کیا اور پھر یہ علم انھوں نے بہت سے علاقوں اور ملکوں میں پھیلایا- یہ مولانا کا صدقہ جاریہ ہے جس کا اجر بارگاہ الٰہی سے انھیں ہمیشہ ملتا رہے گا-

وفات کے بعد وہ مدینہ منورہ کے اس قبرستان میں دفن کیے گئے جسے جنت البقیع کہا جاتا ہے' اس قبرستان میں آنحضرت ﷺ کے بے شمار صحابہ' تابعین و تبع تابعین' لا تعداد محدثین اور علما و فقہا' ان گنت صلحا و متقین اور اللہ کے برگزیدہ بندے مدفون ہیں- مرنے کے بعد ان عالی مرتبت حضرات کا قرب انتہائی عالی بختی ہے جو حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے حصے میں آئی- رحمهم الله تعالیٰ رحمته واسعة-

مجھے ان کی وفات کی اطلاع میاں فضل حق مرحوم نے دی تھی اور کہا تھا کہ مولانا معین الدین نے فرمایا ہے کہ فوری طور پر آپ کو اطلاع دی جائے اور آپ ریڈیو پاکستان سے ان کی خبر وفات نشر کرا دیں- چنانچہ مولانا معین الدین کے اس پیغام کے بعد میں نے اسی وقت ریڈیو پاکستان (لاہور) سے رابطہ قائم کیا' متعلقہ عملے کو مولانا کے ضروری حالات بتائے اور ریڈیو سے ان کی خبر وفات نشر کرائی---- پھر مولانا معین الدین لکھوی کو تعزیتی خط لکھا اور حضرت مرحوم سے متعلق کچھ واقعات تحریر کیے- انھوں نے ۱۵- جنوری ۱۹۷۴ء کو میرے خط کا جواب دیا- ان کا خط میرے پاس محفوظ ہے اور خاصا طویل ہے- چند اقتباس ملاحظہ فرمایے-

برادرم مولانا محمد اسحاق صاحب! ادام الله صحتكم و عافيتكم-

السلام علیکم ورحمتہ اللہ خیریت مطلوب

"آپ کا تعزیتی خط ملا- یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ-

"میاں فضل حق صاحب سے میں نے ہی کہا تھا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر ریڈیو پاکستان سے نشر کرانے کے لیے آپ کو تکلیف دی جائے-

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ کی کوشش سے یہ خبر ان کے ہزاروں عقیدت مندوں تک آن واحد میں پہنچ گئی۔ پورے پاکستان میں ان گنت مقامات پر نماز جنازہ غائبانہ مرحوم کے لیے ادا کی گئی اور دعائیں مانگی گئیں اور مانگی جارہی ہیں۔"

(پھر چھ سات سطروں کے بعد لکھا ہے)

"والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزاج میں جو متنوع اوصاف تھے' ان میں خوش مزاجی' مزاح اور مزاح میں تنوع نمایاں تھی۔ اور پھر کمال یہ تھا کہ عربی' اردو حتیٰ کہ پنجابی میں بھی وہ الفاظ کو مزاح و طنز میں تبدیل کرنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے'۔۔۔ اور پھر یہ کہ ہر موقع و محل اور اہل مجلس کے درجہ علم و فہم کے مطابق اپنا یہ کمال دکھاتے تھے۔"

(اس سے آگے اس کی تین مثالیں درج کی ہیں)

آخر میں لکھا ہے۔

"میرا خیال ہے کہ والد صاحب کے حالات زندگی لکھے جائیں اور یہ کام آپ کریں۔ حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب اور حضرت مولانا حافظ عبداللہ صاحب بڈھیمالوی اس کام میں بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض لوگوں سے قیمتی معلومات حاصل ہونے کی توقع ہے۔ یہ کام ضرور کرنے کا ہے۔۔۔۔۔ ان شاء اللہ العزیز اس سلسلے میں آپ سے گفتگو ہوگی۔"

یہ مولانا معین الدین لکھوی کا پچیس سال قبل کا خط ہے۔ اس فقیر نے ان کے فرمان پر کسی حد تک عمل کر دیا ہے۔ یہ مضمون اگرچہ بہت تشنہ ہے تاہم اتنا طویل مضمون حضرت کے شاگردوں اور عقیدت مندوں میں سے کسی نے نہیں لکھا ہوگا۔ یہ خاکے کی نوعیت کا تذکرہ ہے جو ان سے متعلق ان واقعات و حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے جن سے میں آگاہ تھا ۔۔۔۔۔ بلاشبہ وہ "گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان" تھے۔

اس فقیر پر اس گھرانے کے بے حد احسانات ہیں' میں ان احسانات کا ہرگز بدلہ نہیں دے سکتا۔ میں نے ان کا نمک کھایا ہے اور بہت سال کھایا ہے۔ اگر اس نمک خوانی کا سرسری سا حساب لگایا جائے تو اس کی مقدار کوہستان نمک کے اچھے خاصے حصے تک پہنچ جائے گی۔

میری یہ فطرت میں داخل ہے کہ جس سے میں نے استفادہ کیا ہے' یا جس کے گھر سے کھایا پیا ہے' یا جس کے ساتھ کھانے پینے کا موقع ملا ہے' یا جس کے ساتھ تھوڑا بہت سفر کیا ہے' اسے ہمیشہ یاد رکھتا ہوں۔ حضرت مولانا محمد علی لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھرانے سے میں نے استفادہ بھی کیا ہے اور ان کے ساتھ اکل و شرب کا سلسلہ بھی طویل عرصے تک جاری رہا ہے' اس لیے یہ حضرات مجھے ہمیشہ یاد آتے رہیں گے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ اس گھر کے 'سفر آخرت اختیار کرنے والے افراد کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور زندوں کو تادیر زندہ رکھے اور انھیں اپنے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمات سرانجام دینے کی توفیق سے نوازے' آمین ثم آمین۔

# حافظ عبداللہ روپڑی

انجمن اصلاح المسلمین (کوٹ کپورہ) کا سالانہ جلسہ عام طور سے مارچ کے مہینے میں ہوتا تھا' جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علمائے کرام شرکت فرماتے اور تقریریں کرتے تھے۔ روپڑی حضرات کو خاص طور سے دعوت شمولیت دی جاتی تھی اور لوگ شوق اور دلچسپی سے ان کی تقریریں سنتے تھے۔ ۱۹۳۴ء میں پہلی مرتبہ میں نے اس دودمان عالی قدر کے تین عالموں کو اس جلسے میں دیکھا۔ ان اصحاب ثلاثہ میں بڑے عالم حضرت حافظ عبداللہ روپڑی تھے' جنھیں عام طور سے ان کے خاندان میں "بڑے حافظ صاحب" کہا جاتا ہے۔ دو ان کے نوجوان بھتیجے تھے' حافظ محمد اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی۔

آئندہ سطور میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے بارے میں اپنی معلومات کے مطابق چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے۔ اس خاندان کے دیگر علمائے کرام کے بارے میں ان شاءاللہ کسی دوسری صحبت میں گزارشات پیش کی جائیں گی۔

۱۹۳۴ء میں حضرت حافظ صاحب اپنے ان دو نوجوان بھتیجوں کی معیت میں انجمن اصلاح المسلمین کے جلسے میں تشریف لائے تو ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ ہمارے ایک بزرگ قاضی عبدالعلی (مرحوم) ان دنوں روپڑ کے ایک ہائی سکول میں معلم تھے۔ ان تینوں حضرات کو انہی کے مکان میں ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ مکان جلسہ گاہ کے قریب تھا۔ ہمارے ہاں ان بزرگوں کو نہایت احترام کا مقام حاصل تھا۔ لوگ ان کو سلام کرنے اور ان کی زیارت کرنے کو سعادت تصور کرتے تھے۔

میانہ قد' لاغر اندام' تیز آنکھیں' کھلی پیشانی' گھنی اور بڑی داڑھی جس کے سیاہ بالوں میں سفید بالوں کی آمیزش بھی ہو گئی تھی' سرخی مائل گندمی رنگ' خاموش طبع اور نیچی نگاہ۔۔۔ یہ تھے حضرت مولانا حافظ عبداللہ روپڑی رحمتہ اللہ علیہ۔۔۔!

وہ مناظروں اور مباحثوں کا دور تھا۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد تھے اور کسی نہ کسی مسئلے میں ان کے عالم ایک دوسرے سے بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رکھتے

تھے- اس طرح میدان علم گرم رہتا تھا اور لوگوں پر علمی سرور کی کیفیت طاری رہتی تھی-

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے' جس میں حور نہیں

میری عمر اس وقت آٹھ نو برس کی تھی اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جلسہ ہو رہا تھا اور صبح کے دس بجے کے قریب سٹیج سے اعلان ہوا کہ قادیانی حضرات کا پیغام آیا ہے کہ وہ جلسہ گاہ میں مناظرہ کرنا چاہتے ہیں- قادیانیوں کا وہاں ایک ہی گھر تھا' جس کے سربراہ کا نام امام الدین تھا- امام الدین کے لوگوں سے سماجی تعلقات بہت اچھے تھے' وہ امن کا دور تھا' کسی سے لڑائی جھگڑے کا کوئی تصور نہ تھا- تقسیم ملک کے بعد امام الدین اوکاڑا کے قریب کسی گاؤں میں آباد ہو گئے تھے- نومبر ۱۹۴۷ء میں میری ان سے اوکاڑا کی غلہ منڈی میں اچانک ملاقات ہوئی تو بہت خوش ہوئے اور ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے- ہمارے خاندان اور دوسرے لوگوں کے بارے میں پوچھا جو جڑانوالہ اور اس کے قرب و جوار میں آبسے تھے- میں نے بھی ان کے اہل و عیال کی خیریت پوچھی- اب معلوم نہیں امام الدین کی آل اولاد کہاں ہے اور کس حال میں ہے-

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ امام الدین نے قادیان سے یا کسی اور جگہ سے کسی قادیانی مناظر کو بلایا اور اس نے مناظرے کا چیلنج دیا جو فوراً منظور کر لیا گیا اور قادیانی مناظر کے لیے ان کی طلب کے مطابق میز اور کرسیوں کا انتظام کر دیا گیا-

انجمن اصلاح المسلمین کی طرف سے مناظر مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی تھے- یہ ان کی بھری جوانی کا زمانہ تھا اور پہلا مناظرہ تھا- دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ ان کے مناظروں کا آغاز یا افتتاح ہمارے وطن کوٹ کپورہ سے ہوا تھا- بہت بڑا مجمع تھا' جس میں سکھ اور ہندو بھی خاصی تعداد میں شامل تھے- اس واقعے پر ساٹھ سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے' لیکن یہ منظر اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے- یہ معلوم نہیں کہ مناظرہ کس موضوع پر ہوا تھا' لیکن اس دور اور ماحول کے مطابق وہ سماں نہایت خوش کن تھا- مشہور مقرر و عالم مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم بھی سٹیج پر موجود تھے اور صدر انہی کو بنایا گیا تھا- مولانا حافظ عبداللہ صاحب بھی تشریف فرما تھے اور سٹیج پر علمائے کرام کا اچھا خاصا مجمع تھا-

مناظرہ شروع ہونے سے پہلے مولانا عبدالمجید سوہدروی نے چند صدارتی کلمات

ارشاد فرمائے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں امید رکھتا ہوں' مناظرے کے دوران فریقین تحمل سے کام لیں گے۔ دونوں طرف کے قابل احترام مناظر موضوع کے دائرے میں رہیں گے اور ایک دوسرے سے سنجیدہ انداز میں مخاطب ہوں گے۔ سامعین بھی توجہ سے دونوں حضرات کی باتیں سنیں گے --- آخر میں مولانا سوہدروی نے فرمایا اگر کسی طرف سے کوئی ہنگامہ کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ سن لیں کہ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔

اب مناظرہ شروع ہوا۔ دونوں مناظر پانچ پانچ منٹ تقریر کرتے تھے اور حضرت حافظ عبداللہ صاحب تیزی کے ساتھ کتابوں کے حوالے نکال نکال کر حافظ عبدالقادر کو دے رہے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے مناظرہ جاری رہا اور اس وقت ختم ہوا جب مخالف مناظر بالکل بے بس ہو گیا اور آخر کار بیٹھ ہی گیا۔ لمبے قد' تیکھے نقوش' مقررانہ لہجے اور پرجوش آواز کے حافظ عبدالقادر نے خوب رنگ باندھا اور حریف کے دلائل کا موثر اسلوب میں تجزیہ کیا۔

یہ پہلا مناظرہ تھا جو میں نے سنا اور اس کی اتنی ہی باتیں یاد ہیں جو عرض کر دی گئیں۔

اس سے دس گیارہ سال بعد حافظ عبدالقادر روپڑی کا دوسرا مناظرہ ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں دیپ سنگھ والا میں سنا۔ یہ ۱۹۴۵ء کی شدید گرمیوں کا واقعہ ہے۔ مناظرہ احناف کے بریلوی مسلک کے عالم مولانا محمد عمر اچھروی سے ہوا تھا۔ کس موضوع پر ہوا تھا؟ یہ معلوم نہیں۔ اس وقت وہاں معروف اہل حدیث عالم مولانا عبدالقادر حصاری مرحوم قیام فرماتھے' مناظرے کے لیے حافظ عبدالقادر روپڑی کو انھی نے دعوت دی تھی۔ حافظ صاحب فیروز پور سے ہوتے ہوئے جھوک ٹہل سنگھ کے ریلوے اسٹیشن پر ریل سے اترے تھے اور وہاں سے دیپ سنگھ والا پہنچے تھے۔ لکھوکے اور مرکز الاسلام جانے والے لوگ بھی جھوک ٹہل سنگھ کے ریلوے اسٹیشن پر اترتے تھے۔ فیروز پور سے فاضلکا' بہاول نگر اور سمہ سٹہ کو جانے والی ریلوے لائن کا یہ دوسرا اسٹیشن تھا۔

اس مناظرے کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک سوال کے سلسلے میں حافظ صاحب نے اپنے حریف سے کہا کہ اگر وہ اس سوال کا جواب دے دیں تو میں انھیں پانچ سو روپے بطور انعام پیش کروں گا............

یہ کہہ کر حافظ صاحب نے سو سو کے پانچ نوٹ لیے۔ اس وقت سو روپیہ کا نوٹ ہرے

سے رنگ کا ہوتا تھا-ایک نوٹ کا کچھ حصہ دائیں جانب پگڑی کے نیچے رکھا اور ایک کا بائیں جانب- یہ دو نوٹ ان کے کانوں کو چھو رہے تھے اور عورتوں کے آویزوں اور بندوں کی طرح لٹک رہے تھے-ایک سامنے ماتھے پر رکھ کر پگڑی کے ذرا سا نیچے کیا اور دو نوٹ دونوں ہاتھوں میں لہرائے اور تقریر جاری رکھتے ہوئے مخالف مناظر سے پنجابی میں کہا:

مولوی صاحب: ایہ چھتراں چھتراں جڑے پنج ہرے نوٹ تہانوں دسدے نیں- جے میرے سوال دا جواب دیوں گے' تاں ایہ نوٹ میں تہانوں دے دیاں گا-

اس پر حافظ صاحب کو بہت داد ملی اور حریف بالکل خاموش ہو گیا----- یہاں بھی میدان حافظ صاحب کے ہاتھ رہا-

محترم حافظ عبدالقادر صاحب کا ذکر چلا ہے تو ان کے متعلق ایک اور بات بھی سنتے جایئے' جس کی حیثیت واقعہ کی بھی ہے اور لطیفے کی بھی---!

نومبر ۱۹۶۲ء میں جمعیت اہل حدیث کی کانفرنس لاہور میں ہوئی- مختلف اخباروں کے فوٹو گرافر بھی آ گئے- رات کے اجلاس میں وہ علمائے مقررین اور حاضرین جلسہ کے فوٹو اتارنے لگے تو حافظ صاحب بطور احتجاج یہ کہتے ہوئے پنڈال سے باہر نکل گئے کہ اہل حدیث کے جلسے میں ان کو فوٹو اتارنے سے کیوں روکا نہیں جا رہا----- وہاں مولانا علی محمد صمصام بھی تھے' جو اتنے بڑے عالم تو نہیں تھے' البتہ پنجابی کے بہت اچھے واعظ اور شاعر تھے' اللہ نے آواز بھی خوب دی تھی اور پڑھنے کے ڈھنگ سے بھی نوازا تھا--- وہ مجھے از راہ شفقت پنجابی میں ''توں'' کہا کرتے تھے--- حافظ صاحب کے احتجاج کے وقت وہ بھی تشریف فرما تھے------ آواز دی:

''اوئے اسحاق: توں پڑھیا لکھیا بنیاں پھر دا ایں' ذرا میری گل سن-ایہ مسئلہ دس کہ تصویر شیشے وچ ویکھی جائے تاں--- صحیح بلکہ ضروری قرار پائے----- جے اوہی تصویر کاغذ تے آ جائے تاں حرام اور ناجائز ہو جائے' ایہدا کیہ مطلب اے''-

یقین جانیے' مولانا علی محمد صمصام کی یہ سیدھی سادی اور جنگلی سی بات دل میں بیٹھ گئی اور تصویر کا مسئلہ بہت حد تک حل کر گئی- لیکن حافظ صاحب نے یہ بات نہیں سنی' وہ طعنے الاہنے دیتے ہوئے جلسہ گاہ سے باہر نکل گئے-----

اس سے تھوڑے عرصے بعد حالات نے ایسی کروٹ لی کہ ماشاء اللہ خود حافظ صاحب

کی تصویریں اخباروں میں چھپنے لگیں۔ایک اخبار میں مسجد قدس میں نفلی روزہ افطار کرتے وقت کی تصویر چھپی اور ان گنہگار آنکھوں نے دیکھی، کئی حضرات علما ہاتھ اٹھا کر اللہ کے حضور دعا مانگ رہے ہیں۔حافظ صاحب بھی دعا کرنے والوں کے جھرمٹ میں موجود ہیں۔

اب تو اللہ کے فضل بے پایاں اور سیاست کی برکت لامتناہی سے ملکی اخبارات ان بزرگوں کی تصویروں کی اشاعت کا باقاعدہ شرف حاصل کر رہے ہیں۔ممکن ہے یہی بات فوٹو گرافروں کی نجات کا ذریعہ بن جائے کہ وہ اخباروں میں علمائے کرام کی تصویریں چھپوا کر لوگوں کو ان کی زیارت کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

جناب حافظ عبدالقادر صاحب کے متعلق ان چند باتوں کو جملہ معترضہ سمجھنا چاہیے ---"جملہ معترضہ" سے مراد خدانخواستہ اعتراض والا جملہ نہیں ہے۔بلکہ چلتے چلتے "مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات" والا معاملہ ہے۔

اصل مقصد حضرت حافظ عبداللہ صاحب روپڑی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں چند باتیں معرض کتابت میں لانا ہے اور یہ عرض کرنا ہے کہ میں نے پہلی مرتبہ حضرت حافظ صاحب کی زیارت اپنے وطن (کوٹ کپورہ، ریاست فرید کوٹ) میں کی تھی۔

یہ ۱۹۳۴ء کے مارچ کی بات تھی۔اب چار سال کا ذہنی سفر طے کر کے ۱۹۳۸ء میں آجایے اور فیروزپور کا عزم کیجیے۔یہ گرمیوں کا موسم تھا۔حضرت مولانا محمد علی لکھوی کی کوشش سے فیروزپور کی انجمن اہل حدیث کا جلسہ ہوا، جس میں مولانا حافظ عبداللہ صاحب بھی تشریف فرما تھے۔مولانا محمد علی لکھوی میزبان کی حیثیت سے علمائے مدعوین کا ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرتے اور انھیں جلسہ گاہ میں لاتے تھے۔گیارہ بجے کے قریب کا وقت تھا، مولانا علی محمد صمصام پنجابی میں تقریر کر رہے تھے۔انھوں نے حج بیت اللہ کے سلسلے میں اپنی ایک نظم پڑھی۔نظم سے پہلے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: آؤ! میں تمھیں حج کے لیے لے چلوں۔کرایہ اور خرچ سب کا اپنا اپنا ہوگا۔اب دیکھو! یہاں گورے بھی ہیں، کالے بھی ہیں، چپٹی ناک والے بھی ہیں، تیکھے نقش ونگار والے بھی ہیں، چینی بھی ہیں، جاپانی بھی ہیں، ترکی بھی ہیں، ہندی بھی ہیں، یمنی بھی ہیں، سوڈانی بھی ہیں، عربی بھی ہیں، عجمی بھی ہیں، ایرانی بھی ہیں، افغانی بھی ہیں، مصری بھی ہیں، شامی بھی ہیں، تبتی بھی ہیں، نیپالی بھی ہیں، کشمیری بھی ہیں، پنجابی بھی ہیں۔یہ کہہ کر انھوں نے اس موضوع سے متعلق اپنی پنجابی نظم پڑھی۔

تقریر اتنی اثر انگیز تھی کہ بہت سے لوگوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ ایک شخص کھڑا ہو کر نعرے لگانے لگا اور پھر اس پر ''حال'' کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ تھوڑا سا جھک کر رکوع کی حالت میں ہوا اور تیزی سے دونوں بازوؤں کو ہلانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی زبان سے اللہ' اللہ کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یہ اس شخص پر تقریر کے اثر کی انتہا تھی۔ اس قسم کی حرکات چونکہ اہل حدیث کے مجمعوں میں نہیں ہوتیں' اس لیے بعض لوگوں نے اس سے سختی کے ساتھ کہا کہ بیٹھ جاؤ' مگر وہ اپنی دھن میں لگا ہوا ہے۔ حافظ عبداللہ صاحب بھی اسے دیکھ رہے ہیں۔ پھر سٹیج ہی سے بعض علما نے روکنے والوں سے کہا کہ اسے اپنے حال میں مست رہنے دو' جو کچھ کرتا ہے کرنے دو۔ مقرر نے بھی روکنے والوں کو منع کیا اور کہا کہ تم اس کے جذبات میں کیوں حائل ہوتے ہو۔

یہ سلسلہ جاری تھا کہ مولانا محمد علی لکھوی' مولانا ثناء اللہ صاحب کے ساتھ سٹیج پر نمودار ہوئے۔ تمام علمائے کرام مولانا ثناء اللہ صاحب کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور سب نے باری باری ان سے مصافحہ کیا۔ اس اثنا میں مقرر نے چند ثانیوں کے لیے خاموشی اختیار کر لی' لیکن حافظ صاحب نہ اپنی جگہ سے اٹھے اور نہ مولانا ثناء اللہ صاحب سے مصافحہ کیا۔ حافظ صاحب کے اس رویے سے لوگوں میں کچھ عجیب سا تاثر پیدا ہوا' جس کا آہستہ کلامی سے اظہار بھی ہونے لگا۔

اب مولانا ثناء اللہ امرتسری کرسی پر بیٹھے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے ساتھ قطار میں حافظ صاحب تشریف فرما ہیں۔ مولانا نے مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو حافظ صاحب نے ان سے مصافحہ فرمایا ----- اس صورت حال کو لوگوں نے مولانا ثناء اللہ صاحب کی بڑائی پر محمول کیا۔

بعد میں ایک بزرگ کے بتانے پر پتا چلا کہ حافظ صاحب کے نزدیک مولانا ثناء اللہ صاحب جس نقطہ نظر کے حامل تھے' اس کی رو سے وہ ان کو سلام میں سبقت کرنے اور ان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے' البتہ اگر مولانا ان کو خود سلام کرتے اور ان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے تو وہ سلام کا جواب دیتے اور ان سے مصافحہ فرماتے تھے۔

یہ دوسرا موقع تھا کہ میں حافظ صاحب کے دیدار سے مشرف ہوا۔

اس واقعے سے کچھ عرصے کے بعد فتح گڑھ چوڑیاں (ضلع گورداس پور) میں حافظ صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں اپریل ۱۹۳۹ء میں مولانا عبدالقادر قصوری کی صدارت میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ منصوبہ یہ بنایا گیا تھا کہ اس اجلاس میں مولانا امرتسری اور حافظ صاحب روپڑی صاحب کے درمیان صلح کرائی جائے۔ یہ فریضہ سرانجام دینے کے لیے مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا محمد حنیف ندوی کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ لیکن افسوس ہے' منصوبہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکا۔

اس سے تین چار سال پہلے جب استاذ محترم مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کوٹ کپورہ میں اقامت گزیں تھے' انھوں نے بھی انجمن اصلاح المسلمین کے ایک جلسے میں ان حضرات کو تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کا مقصد بھی دونوں بزرگوں کے درمیان مصالحت کی فضا پیدا کرنا تھا۔ اس کے لیے ان دونوں لائق تکریم حضرات کے علاوہ حضرت حافظ محمد گوندلوی' مولانا محمد جوناگڑھی' مولانا سید سلیمان ندوی' مولانا محمد سورتی اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی سے بھی جلسے میں شرکت فرمانے کی درخواست کی گئی تھی' لیکن ان بزرگان بلند مرتبت میں سے کوئی بزرگ تشریف نہیں لا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مقصد تکمیل کی منزل کو نہ پہنچ سکا۔

تقسیم ملک سے قبل مذکورہ بالا انہی تین مواقع پر مجھے حضرت حافظ صاحب کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ البتہ تقسیم کے بعد بارہا ان کی خدمت میں حاضری دینے اور ان کو سلام کرنے کے مواقع میسر آئے۔ لیکن اس کا تذکرہ کرنے سے پہلے ان کی زندگی کے مختصر حالات ضبط کتابت میں لانا ضروری ہے۔ تو آیے ان کی ذات گرامی سے متعارف ہونے اور ان کے علم و فضل کی فراوانیوں سے آگاہ ہونے کی سعی کرتے ہیں۔

حافظ صاحب کے آباو اجداد دراصل ضلع گوجرانوالہ کے ایک قصبے "ایمن آباد" کے رہنے والے تھے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں ان بزرگوں میں ایک صاحب جن کا نام کبیر تھا' ایمن آباد سے ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ کے ایک گاؤں میں چلے گئے تھے۔ کبیر کا ایک بھائی کمیر تھا' کبیر نے اسے بھی وہیں بلا لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کسی خدمت کے صلے میں مہاراجا رنجیت سنگھ کے دور میں ان کو پانچ سو ایکڑ زمین عطا کی گئی تھی۔ وہیں انھوں نے ایک گاؤں کی بنیاد رکھی' جسے "کمیر پور" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ وہاں یہ

ایک ہی برادری کے لوگ آباد تھے- زمین برادری کے افراد میں تقسیم کے مراحل سے گزرنا شروع ہوئی تو پتا چلا کہ اپنے حصے کی زمین کی آمدنی سے گزر بسر کے مراحل طے کرنا بہت مشکل ہے-

حافظ صاحب کے والد محترم کا اسم گرامی میاں روشن دین تھا- ان کا زیادہ تر وقت علمائے دین کی مجلسوں میں گزرتا تھا' ان سے نیکی کی باتیں سننا اور مسائل دین سے آگاہ ہونے کی کوشش کرنا ان کا اصلی مشغلہ تھا- علما کی صحبت سے ان کے دل میں حصول علم کا داعیہ ابھرا اور اس میں اس درجہ شدت پیدا ہوئی کہ بجز زرعی زمین کے گھر کا تمام سامان بیچ ڈالا اور بیوی کو طلاق دے دی- اس جھمیلے سے آزاد ہو کر انھوں نے لکھوکے کا عزم کیا اور حضرت حافظ محمد لکھوی کی خدمت میں حاضر ہوئے- یہ ایک سو اٹھارہ برس قبل (۱۳۰۱ھ) کی بات ہے-

حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کو صورت حال کا علم ہوا تو انھوں نے فرمایا:

گھر واپس جاؤ' پہلے بیوی سے رجوع کرو' پھر علم حاصل کرو-

چنانچہ میاں روشن دین کمیر پور واپس آئے' بیوی سے رجوع کیا اور دوبارہ لکھوکے گئے اور حصول علم کیا-

میاں روشن دین کے دل میں تحصیل علم کی خواہش کے ساتھ ساتھ' ایک خواہش یہ بھی کروٹ لے رہی تھی کہ اللہ انھیں نیک اولاد عطا فرمائے جو علم دین حاصل کرے اور پھر اس کے دین کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے- لیکن ان کے وسائل آمدنی بہت محدود تھے اور زمین اتنی کم تھی کہ اس کی فصل سے گھر کے معاملات چلانا' اہل و عیال کے اخراجات پورے کرنا اور بچوں کو تعلیم دلانا ممکن نہ تھا- چنانچہ وہ کمیر پور کی سکونت ترک کر کے بیوی بچوں سمیت چھانگا مانگا (ضلع قصور) آگئے- ایک سال وہاں مقیم رہے- ان کے بڑے بیٹے کا نام رکن الدین تھا- ان دنوں موضع جھجہ کلاں میں ایک عالم دین مولوی عبدالرحمٰن فروکش تھے' رکن الدین کو حصول علم کے لیے ان کے پاس چھوڑا اور خود چھانگا مانگا کے قریب موضوع ڈوبہ میں سکونت پذیر ہو گئے اور محنت مزدوری کرنے لگے- ڈوبہ میں مولوی عبداللہ صاحب قیام پذیر تھے جو اس عہد میں اس نواح کے مشہور عالم دین تھے- ان سے میاں روشن دین کے تین بیٹوں نے قرآن مجید پڑھا' وہ بیٹے تھے' رحیم بخش' عبدالواحد اور ہمارے ممدوح حافظ عبداللہ صاحب- حافظ صاحب نے یہاں سورۂ بقرہ حفظ

کی-

ڈوبہ میں یہ گھرانا تین سال مقیم رہا- بعدازاں ایک اور گاؤں میں چلے گئے' جس کا نام "تیر تھ" تھا-ایک سال وہاں قیام رہا- پھر موضع "ماجرہ" کا قصد کیا- کچھ عرصہ وہاں رہے' لیکن کام کاج کا سلسلہ وہاں بھی تسلی بخش نہ تھا-اس لیے کچھ مدت کے بعد اپنے وطن کمیرپور واپس چلے گئے-

روشن دین کی آٹھ اولادیں تھیں-سات بیٹے اور ایک بیٹی- علی الترتیب ان کے نام یہ تھے-رکن الدین' رحیم بخش' حافظ عبداللہ' عبدالواحد' عبدالقادر' فاطمہ' حافظ محمد حسین اور حافظ عبدالرحمٰن----!

ان سطور میں ہم صرف حافظ عبداللہ صاحب کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں-

حضرت حافظ صاحب ممدوح ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۷ء) کو کمیرپور (تحصیل اجنالہ' ضلع امرتسر) میں پیدا ہوئے- جب یہ خاندان چھانگا مانگا گیا ہے اس وقت حافظ صاحب کی عمر اڑھائی برس کے قریب تھی- تعلیم کا آغاز انھوں نے موضع ڈوبہ میں مولوی عبداللہ سے کیا-ان سے ناظرہ قرآن مجید پڑھا اور سورہ بقرہ حفظ کی-اس سے کچھ عرصہ بعد لکھوکے چلے گئے-اس سے قبل ان کے بڑے بھائی مولوی رکن الدین لکھوکے میں تعلیم حاصل کرتے تھے' وہی چھوٹے بھائی عبداللہ کو اپنے ساتھ لے کر گئے تھے-لکھوکے میں حافظ صاحب نے حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے والد مکرم مولانا عبدالقادر لکھوی مرحوم سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں-

اس اثنا میں ان کے بڑے بھائی مولوی رکن الدین لکھوکے سے فارغ ہوئے تو مزید تعلیم کے لیے سہارن پور چلے گئے-وہاں ایک سال قیام رہا-اس کے بعد میرٹھ روانہ ہوگئے- حافظ عبداللہ بھی ان کے ساتھ تھے-میرٹھ کے مدرسہ نعمانیہ میں حافظ صاحب ایک سال رہے-وہاں صرف میر اور پنج گنج وغیرہ کتابیں پڑھیں-پھر مولوی رکن الدین دہلی چلے گئے تو حافظ صاحب واپس وطن آگئے-

اب میاں روشن دین نے کمیرپور میں مستقل طور سے سکونت اختیار کرلی تھی اور بیٹے کو امرتسر میں مدرسہ غزنویہ میں داخل کرادیا تھا-

یہاں یہ یاد رہے کہ اس زمانے کے پنجاب میں اہل حدیث کے دو ہی مشہور مدرسے تھے۔ایک ضلع فیروز پور کے موضع لکھو کے میں' اور دوسرا امرتسر میں مدرسہ غزنویہ سلفیہ ---اس وقت ان مدارس کی شہرت حدود پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی تھی اور تشنگان علوم کثرت کے ساتھ ان مدارس کا رجوع کرتے تھے۔جس شخص کو ان مدارس کے اساتذہ سے استفادے کا موقع نہیں ملتا تھا' اسے علم دین میں پختہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حافظ عبداللہ صاحب کو ان مدارس کے جید اساتذہ سے مستفید ہونے کے مواقع میسر آئے۔

مدرسہ غزنویہ میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور مولانا معصوم علی سے شرح جامی تک نحو کی اور قطبی تک منطق کی کتابیں پڑھیں۔ مولانا معصوم علی مرحوم ہزارہ کے رہنے والے تھے اور حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی کے عقیدت مند تھے۔ بہت اچھے مدرس اور نہایت متدین بزرگ تھے۔

ایک عالم دین اس وقت مولانا محی الدین تھے جو مدرسہ غزنویہ میں خدمت تدریس انجام دینے پر مامور تھے۔وہ حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔حافظ صاحب نے ان سے بھی استفادہ کیا اور مراح الارواح' زنجانی' فصول اکبری اور شافیہ وغیرہ کتابیں ان سے پڑھیں۔ علم فقہ کی مروجہ کتابوں کی تکمیل بھی مدرسہ غزنویہ میں کی۔ اصول فقہ مولانا عبدالصمد سے پڑھی۔

تفسیر سے متعلق کتابیں جو اس وقت مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں' حضرت امام عبدالجبار غزنوی سے مکمل کیں۔ حدیث کی بھی اکثر کتابیں امام صاحب سے پڑھیں' لیکن بعض کتب حدیث کے لیے مولانا عبدالاول غزنوی کے حضور زانوے شاگردی تہ کیا۔البتہ سند فراغ امام صاحب سے حاصل کی۔ یہ ۱۹۱۰ء کا واقعہ ہے۔اس وقت ان کی عمر بائیس تیئس برس کی تھی۔ امرتسر میں مدرسہ نعمانیہ کو بڑی شہرت حاصل تھی۔ حافظ صاحب نے اس مدرسے کے بعض اساتذہ سے علم فلسفہ کی چند کتابیں پڑھیں۔ میبذی بھی اسی مدرسے میں مکمل کی۔

حافظ صاحب مدرسہ غزنویہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور حضرت امام صاحب سے سند تکمیل حاصل کی تو امام صاحب نے خواہش ظاہر فرمائی کہ وہ اسی مدرسے میں رہیں اور

یہاں خدمت تدریس انجام دیں، لیکن حافظ صاحب مزید حصول علم کے متمنی تھے۔اس لیے نہایت ادب کے ساتھ امام صاحب سے معذرت کر دی اور ان سے اجازت لے کر ۱۹۱۰ء میں عازم دہلی ہوئے۔

دہلی میں منطق و فلسفہ کی تکمیل مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری اور مولانا محمد اسحاق منطقی سے کی جو علمی حلقوں میں اسحاق منطقی کے نام سے مشہور تھے۔اقلیدس اور بعض غیر درسی کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔اقلیدس کے چھ مقالے حفظ کیے۔

حافظ صاحب دہلی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ پتا چلا کہ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی وفات پا گئے ہیں۔ یہ المیہ ۲۵۔رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ (۲۷۔اگست ۱۹۱۳ء) کو پیش آیا تھا۔حافظ صاحب دس سال کی عمر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور طویل عرصے تک ان سے ظاہری و باطنی فیض حاصل کرتے رہے تھے۔علوم دین کی سند بھی انہی سے لی تھی، اس لیے ان کی وفات کا انھیں شدید صدمہ پہنچا اور وہ امرتسر آ گئے۔چوں کہ فنون کی بعض کتابیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں، لہٰذا چند روز کے بعد واپس دہلی لوٹ گئے، مگر اب وہ زیادہ عرصہ دہلی میں نہیں ٹھہرے، اس لیے کہ مختلف فنون کی جو کتابیں وہ وہاں پڑھ رہے تھے ان کی تکمیل کی جلد کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ان حالات کے پیش نظر انھوں نے رام پور کا عزم کیا۔رام پور میں وہاں کے ریاستی حکام کی طرف سے مدرسہ عالیہ کے نام سے ایک درس گاہ قائم تھی، وہ اس میں داخل ہونا چاہتے تھے، لیکن مدرسہ عالیہ کے مہتمم نے داخلہ دینے سے انکار کر دیا۔

وہ پریشانی کی حالت میں بیٹھے تھے کہ اتنے میں استاد کسی کام سے مدرسے سے باہر گئے۔ وہاں ایک مسودہ پڑا تھا جو عربی میں لکھا ہوا تھا۔حافظ صاحب کی اس پر نظر پڑی تو دیکھا کہ اس میں صرف و نحو کی بعض غلطیاں پائی جاتی ہیں۔حافظ صاحب نے ان غلطیوں کی نشان دہی کر دی۔

استاد واپس آئے تو انھوں نے نشان زدہ مقامات دیکھے اور فرمایا: مسودے میں یہ نشان کس نے لگائے ہیں؟

حافظ صاحب نے جواب دیا: ان غلطیوں کی نشان دہی اس عاجز نے کی ہے۔ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ یہ مقامات غلط کیوں ہیں۔

استاد اس سے نہایت متاثر ہوئے اور فرمایا: میں آپ کو اس مدرسے کا استاد بھی مقرر کرتا ہوں اور طالب علم کی حیثیت سے بھی آپ کو داخلہ دیتا ہوں۔

جو کتابیں آپ پڑھ چکے ہیں، وہ بحیثیت استاد کے طلبا کو پڑھائیں اور جو نہیں پڑھی ہیں اور پڑھنا چاہتے ہیں وہ بطور طالب علم اور شاگرد کے پڑھیں۔

رام پور کے مدرسہ عالیہ میں وہ ایک سال رہے۔ اس اثنا میں مولوی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا اور درس نظامیہ کی سند بھی حاصل کی۔ اس وقت مدرسہ عالیہ میں مولانا محمد امین پشاوری اور مولانا فضل حق رام پوری فرائض تدریس انجام دیتے تھے اور یہ دونوں استاد منطق و فلسفہ اور علم کلام میں بڑی شہرت کے حامل تھے۔ حافظ صاحب کو ان دونوں سے کسب علم کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں انھوں نے مدرسہ عالیہ سے فراغت پائی۔

علوم عالیہ و آلیہ سے فارغ ہوئے تو جماعت اہل حدیث روپڑ کی دعوت پر روپڑ چلے گئے اور ۱۹۳۸ء تک وہاں اقامت گزیں رہے۔ روپڑ اور اس کے نواح میں انھوں نے جماعت اہل حدیث اور مسلک اہل حدیث کی بہت خدمت کی اور ان کی تبلیغ سے اس علاقے کے بے شمار لوگ کتاب و سنت پر عامل ہوئے۔

۱۹۱۷ء میں دہلی میں مدرسہ رحمانیہ جاری ہوا۔ اس کے ارباب اہتمام نے حافظ صاحب کو دہلی آنے اور مدرسے میں خدمت تدریس انجام دینے پر اصرار کیا، مگر حافظ صاحب وہاں جانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ روپڑ اور اس کے قرب و جوار کے لوگ ان سے اتنے متاثر تھے کہ کسی قیمت پر انھیں روپڑ سے نقل مکانی نہیں کرنے دیتے تھے۔ خود حافظ صاحب بھی ان لوگوں کے مخلصانہ جذبات کی قدر کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کسی شکل میں ان کی دل شکنی ہو۔ مدرسہ رحمانیہ میں وہ مستقل طور سے جانے پر تیار نہ ہوئے تو انتظامیہ نے ان سے مدرسے کے سالانہ ممتحن مقرر ہونے کی درخواست کی۔ یہ درخواست حافظ صاحب نے منظور فرمائی اور وہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تیس سال مدرسہ رحمانیہ کے طلبا کا سالانہ امتحان لیتے رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے ہزاروں طلبا کو اپنے دست مبارک سے اسناد فراغت عطا فرمائیں۔

اس سے قبل امرتسر میں حافظ صاحب کی شادی ہوئی تو مولانا احمد اللہ (رئیس امرتسر) نے ان سے کہا تھا کہ وہ امرتسر آکر ان کے مدرسے میں طلبا کو علوم دین کی تعلیم دیں۔

مولانا احمد اللہ اور ان کے خاندان کے حضرات نے اپنی گرہ سے رقم خرچ کر کے امرتسر میں تین مسجدیں تعمیر کرائی تھیں' وہ تھیں مسجد مبارک' مسجد قدس اور مسجد باغ والی۔ان مسجدوں سے ملحق مکانات بھی تھے اور دکانیں بھی تھیں' جن کی اچھی خاصی ماہانہ آمدنی تھی۔ مولانا نے حافظ صاحب سے فرمایا کہ ان مساجد میں سے جو مسجد وہ چاہیں' سنبھال لیں اور اس کی ملحقہ جائداد کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ لیکن حافظ صاحب نے روپڑ کی سکونت ترک کرنا اور وہاں کے لوگوں کی دل شکنی کرنا گوارا نہ کیا۔

حافظ صاحب نے روپڑ تشریف لا کر ۱۹۱۶ء میں ایک دارالحدیث کی بنیاد رکھی۔اس کا افتتاح نماز عصر کے بعد بخاری شریف کے درس سے ہوا تھا۔ابتدا میں شیخ محمد عمر بن ناصر نجدی المعروف عرب صاحب' مولوی محمد بن عبدالعظیم پسروری اور مولوی دین محمد سنانوی درس بخاری میں شریک ہوئے تھے۔ مولوی نور محمد (سکنہ ڈوگری) نے نسائی شریف شروع کی تھی۔اس کے بعد بے شمار طلبا آئے اور مستفید ہوئے۔

۱۹۳۲ء میں جماعت اہل حدیث (پنجاب) کی ایک تنظیم قائم ہوئی' جس کے امیر حضرت شاہ محمد شریف گھڑیالوی رحمۃ اللہ علیہ کو بنایا گیا تھا۔ اس تنظیم کے قیام میں حافظ صاحب کی کوششوں کا کافی عمل دخل تھا۔ تنظیم جماعت کے مقاصد کی تشہیر اور جماعتی معاملات کی نشرواشاعت کے لیے ایک اخبار کی ضرورت محسوس کی گئی تو حافظ صاحب نے ۲۶/ رمضان ۱۳۵۰ھ (۵/ فروری ۱۹۳۲ء) کو روپڑ سے ہفت روزہ "تنظیم اہل حدیث" جاری کیا۔ یہ اخبار کئی سال جاری رہا۔ پھر بند ہو گیا۔ بعدازاں حالات ٹھیک ہوئے تو لاہور سے اس کا اجرا کیا گیا۔اب بھی یہ اخبار جاری ہے اور اس کے منتظم اعلیٰ مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی ہیں۔

۱۹۳۸ء تک حافظ صاحب روپڑ میں رہے۔جب روپڑ کا تبلیغی نظام ان کے بھتیجوں (حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی) نے سنبھال لیا تو حافظ صاحب امرتسر تشریف لے گئے اور مولانا احمد اللہ صاحب کی پرانی خواہش کے مطابق وہاں کی مسجد مبارک میں ڈیرے ڈال لیے۔اس مسجد میں مدرسہ بھی قائم کیا اور درس و خطابت کا سلسلہ بھی شروع فرمایا۔۱۹۴۷ء تک وہ اس مسجد میں خدمات سرانجام دیتے رہے۔

تقسیم ملک کے نتیجے میں حضرت حافظ صاحب اور ان کے خاندان کو انتہائی اذیتوں کا سامنا

کرنا پڑا- روپڑ اور امر تسر کا کتب خانہ ضائع ہوا اور کئی بچے فسادیوں کے ہاتھوں مارے گئے- نہایت تکلیف رساں مراحل سے گزر کر پاکستان پہنچے اور یہاں قیام کے لیے متعدد مقامات کے چکر لگانا پڑے- پہلے غالباً پتوکی کے قریب ایک گاؤں بھوئے آصل (ضلع قصور) گئے- کچھ دن وہاں بسر کیے- پھر تحصیل جڑانوالہ (ضلع فیصل آباد) میں ایک ریلوے اسٹیشن روڈالا روڈ میں اقامت گزیں ہوئے- کچھ دن وہاں رہے- روڈالا روڈ کے قریب ایک گاؤں میں دو بھائی حاجی محمد شفیع اور حاجی محمد شریف رہتے تھے جو کھرل برادری سے تعلق رکھتے تھے- ان کا شمار حافظ صاحب کے معتقدین میں ہوتا تھا- ان کے کہنے سے وہاں تشریف لے گئے تھے- وہاں ریلوے اسٹیشن کے قریب مسجد اہل حدیث کو مرکز تبلیغ بنانے پر غور کیا' لیکن یہ ماحول نھیں راس نہیں آیا- کچھ عرصہ جڑانوالہ شہر میں مقیم رہے- وہاں ایک صاحب کی کوٹھی میں سکونت گزیں ہوئے- چند روز وہاں قیام رہا' لیکن وہ جگہ بھی جچی نہیں------ بعد ازاں ماڈل ٹاؤن (لاہور) میں کوٹھیاں الاٹ کرائیں اور وہاں رہنے لگے- بیٹوں نے موچی دروازے کے باہر سرکلر روڈ پر "البلاغ پریس" کے نام سے کاروبار شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے مالی مشکلات رفع فرمادیں' لیکن تقسیم ملک کے زمانے میں اولاد کے سلسلے میں ذہن ودماغ پر جو چوٹ لگی تھی' اس کی کسک عمر بھر محسوس ہوتی رہی-

برانڈرتھ روڈ پر چوک دال گراں میں ایک وسیع قطعہ زمین حاصل کیا گیا' جس میں مسجد تعمیر کی جس کا نام مسجد قدس رکھا اور اس میں مدرسہ جاری کیا' جس میں بعض مشہور اساتذہ طلبا کو تعلیم دینے پر متعین کیے- خود حضرت حافظ صاحب بھی تشنگان علم کو مستفید فرماتے رہے- یہ مدرسہ اللہ کے فضل سے جاری ہے-

مسجد قدس لاہور میں اہل حدیث کی اتنی بڑی مسجد ہے کہ اس میں مہمان خانہ' طلبا کے لیے دارالاقامہ' اساتذہ کے لیے الگ الگ کمرے' تدریس کے لیے بہت عمدہ انتظام اور لائبریری وغیرہ سب کچھ موجود ہے- ہفت روزہ "تنظیم اہل حدیث" کا دفتر بھی وہیں ہے- مدرسے کے مہتمم و منتظم مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی ہیں- مسجد میں خطابت کے فرائض پہلے وہی انجام دیتے تھے' لیکن اب کچھ عرصے سے بیمار ہیں- دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں صحت وعافیت سے نوازے- آمین!

حضرت حافظ صاحب کے لاہور تشریف لانے کے بعد بعض جماعتی اور غیر جماعتی

معاملات سے متعلق مجھے بارہاان کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور وہ ہر دفعہ شفقت سے پیش آئے۔اس کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

ایک دفعہ تحصیل جڑانوالہ کے ایک گاؤں چک نمبر ۷۰ گ۔ب سے میرے ایک دوست محمد اسماعیل میرے پاس آئے۔انھوں نے بتایا کہ ان کے بڑے بیٹے محمد کو "جن" پریشان کرتا ہے اور ہم اس کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔انھوں نے بتایا کہ "جن" کو نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ خود کو حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کا شاگرد اور عقیدت مند قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ فرمائیں گے تو اس کا پیچھا چھوڑا جائے گا ورنہ نہیں۔

وہ دوست چاہتے تھے کہ میں حضرت حافظ صاحب سے یہ واقعہ عرض کروں اور ان کے بیٹے کے لیے ان سے تعویذ لے کر دوں۔

حافظ صاحب تعویذ دیتے تھے اور سنا تھا کہ ان کے تعویذ سے اللہ تعالیٰ شفا بخشتا ہے'۔ لیکن میں تعویذ لینے کے لیے کبھی حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا تھا' تاہم دوست کے اصرار پر جانا پڑا۔حافظ صاحب ماڈل ٹاؤن رہتے تھے۔گھنٹی دی تو ان کے بڑے صاحب زادے مسعود صاحب باہر آئے اور بہت اچھی طرح ملے۔انھوں نے اندر جا کر حضرت حافظ صاحب کو ہمارے آنے کی اطلاع دی تو حافظ صاحب اسی وقت باہر تشریف لے آئے۔گرمیوں کا موسم تھا۔ٹھنڈی لسی منگوائی اور ہمیں پلائی۔پھر حاضری کی وجہ دریافت فرمائی۔واقعہ عرض کیا تو اندر گئے اور تعویذ لکھ کر لائے۔تعویذ عنایت فرمایا اور اس کے استعمال کا طریقہ بتایا۔

میں نے شکریہ ادا کیا تو فرمایا: شکریے کی کوئی بات نہیں۔یہ آپ کا کام ہے اور آپ کا کام نہیں کریں گے تو اور کس کا کریں گے۔اس قسم کے الفاظ انھوں نے دو تین دفعہ استعمال فرمائے اور میں ان کا انتہائی شکر گزار ہوا۔میرے دوست جن کا یہ کام تھا' وہ حافظ صاحب کے طرز عمل سے نہایت متاثر ہوئے۔اللہ تعالیٰ نے محمد کو شفا عطا فرمائی۔اب وہ بیٹوں اور پوتوں والا ہے اور اس کا اچھا خاصا کاروبار ہے۔ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ۔ب منصور پور میں اس کی رہائش ہے۔

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے مجھے کہا کہ وہ حضرت حافظ صاحب کے مدرسے میں داخل ہونا اور ان سے تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔میں ان کے ساتھ جاؤں اور مدرسے میں

داخلے کے لیے ان کی مدد کروں۔

داخلے کا معاملہ مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی سے متعلق تھا۔ ہم مسجد قدس میں گئے تو حافظ عبدالقادر موجود نہیں تھے۔ البتہ حضرت حافظ عبداللہ صاحب روپڑی تشریف فرما تھے۔ میں طالب علم کو ان کی خدمت میں لے گیا۔ انھوں نے اس سے چند باتیں پوچھیں اور داخل کر لیا۔ مشفقانہ انداز میں مجھے فرمایا کہ آپ اسے لے کر آئے ہیں' اسے داخلہ ملنا چاہیے ---- یہ اس فقیر پر ان کی نوازش تھی۔

ایک دفعہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ میں تجویز پیش کی گئی کہ حضرت حافظ صاحب روپڑی اور ان کے بھتیجوں (حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی) سے جمعیت اہل حدیث کے نظام میں شامل ہونے کی درخواست کی جائے۔ فیصلہ ہوا کہ مولانا محمد داؤد غزنوی اور یہ فقیر ان حضرات سے ملیں اور ان سے جماعت اہل حدیث کے مرکزی نظام میں شامل ہونے کی اپیل کریں۔ میرے خیال میں یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ مولانا غزنوی نے حافظ عبدالقادر سے رابطہ پیدا کر کے ان سے ملاقات کے لیے وقت لیا اور ہم دوسرے دن مغرب کے وقت مسجد قدس پہنچ گئے۔

نماز مغرب کے بعد ہم پانچ آدمی ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ وہ تھے مولانا حافظ عبداللہ روپڑی' حافظ اسماعیل روپڑی' حافظ عبدالقادر روپڑی' مولانا محمد داؤد غزنوی اور ان سطور کا راقم عاجز۔

مولانا غزنوی نے گفتگو کا آغاز کیا اور جماعت کی تنظیمی صورت حال اور موجودہ دور میں افراد اہل حدیث کے اتحاد کی ضرورت و اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ حضرت حافظ صاحب سر جھکائے خاموش بیٹھے سنتے رہے' مولانا کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ البتہ حافظ اسماعیل مرحوم اور حافظ عبدالقادر نے مولانا کی ہر بات کی تائید کی اور جماعت کے اتحاد کو ضروری قرار دیا۔ حافظ اسماعیل صاحب بالخصوص بہت لچک دار اور ٹھنڈے ذہن کے عالم تھے۔ ان کا رویہ تمام گفتگو میں نہایت حوصلہ افزا رہا۔

کافی دیر کے بعد بات اختتام کو پہنچی تو حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر پنجابی میں فرمایا:

"مولوی اسحاق تہاڈی شکل چنگی نہیں۔"

یہ الفاظ سن کر حافظ اسماعیل مرحوم اور حافظ عبدالقادر صاحب مدظلہ کچھ پریشان سے ہوئے اور انھوں نے میرے "اوصاف" بیان کرنا شروع کر دیے کہ ماشاءاللہ یہ جماعت کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اور مسلک کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ بہت اچھا لکھتے ہیں اور زور دار طریقے سے جماعت اور اس کے مسلک پر اعتراض کرنے والوں کا جواب دیتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں اس وقت "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا اور بعض مسائل میں جماعت اسلامی نے ہمارے ساتھ کش مکش شروع کر رکھی تھی۔

ان دونوں بھائیوں کا اشارہ اسی طرف تھا ----- یہاں یہ عرض کر دوں کہ جماعت اسلامی کی طرف سے "کش" تھی اور ہماری طرف سے "مکش" تھی!۔

اس کے بعد مولانا محمد داؤد غزنوی نے فرمایا: "حافظ صاحب ان کے لیے دعا کیجیے۔"

اب ہاتھ اٹھا کر دعا ہونے لگی۔ چار پانچ منٹ دعا ہوتی رہی ----- ہاتھ اٹھا کر دعا کا آغاز بھی حضرت حافظ صاحب نے کیا تھا اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر اختتام بھی انھی نے فرمایا۔

گفتگو کے بعد میں اور مولانا غزنوی باہر نکلے تو مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

مولوی اسحاق: آپ کی شکل کو کیا ہوا ہے۔ حافظ صاحب یہی کہنا چاہتے تھے نا کہ آپ کی داڑھی چھوٹی ہے۔ ان کی اپنی داڑھی ماشاءاللہ اتنی بڑی ہے۔ آپ کی داڑھی کو انھوں نے کیا کرنا ہے۔

یہ ایک ہلکے سے مزاح کی بات تھی جو مولانا نے کی۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا۔ اور بزرگوں کی اس قسم کی بات میں کچھ کہنا مناسب بھی نہیں ہوتا۔

اس سے تقریباً دو سال بعد ۲۔اکتوبر ۱۹۵۹ء کو حضرت حافظ صاحب کے برادر صغیر حضرت مولانا حافظ محمد حسین روپڑی کا انتقال ہوا تو مولانا غزنوی نماز جنازہ کے لیے ان کے گھر ماڈل ٹاؤن گئے۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ ہم حضرت حافظ صاحب ہی کے پاس گئے اور تعزیت کی۔ اب پھر انھوں نے وہی الفاظ ارشاد فرمائے۔

"مولوی اسحاق! تہاڈی شکل چنگی نہیں۔"

مولانا غزنوی نے فرمایا: حافظ صاحب آپ نے ایک مرتبہ مسجد قدس میں ان کو یہی

لفظ کہے تھے اور میں نے کہا تھا کہ ان کے لیے دعا کیجیے' اور آپ نے دعا کی تھی۔ آپ اس پر بھی غور فرمایے کہ آپ کی دعا اب تک کیوں قبول نہیں ہوئی۔

یہ بھی حضرت حافظ صاحب سے مولانا کا ایک ہلکا سا مزاح تھا' جس پر ان کی بے پناہ سنجیدگی کے باوجود ان کے لبوں پر ذرا سی مسکراہٹ کے آثار ظاہر ہوئے۔

اب زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے اور وقت کا دھارا روز بروز تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ اس قسم کے عالی کردار اور تقویٰ شعار علمائے دین پیدا ہونے کا آئندہ بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

حضرت حافظ صاحب بہت سی کتابوں کے مصنف تھے' جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ حریف پر مضبوط گرفت کرتے۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے دلائل کا انبار لگا دیتے۔ فتوے نہایت تحقیق اور انتہائی احتیاط سے تحریر فرماتے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کہا کرتے تھے کہ دو عالموں کے فتوے بڑے مدلل اور واضح ہوتے ہیں۔ ایک مولانا محمد داؤد غزنوی کے اور دوسرے حافظ عبداللہ روپڑی کے ----! حافظ صاحب کے فتوؤں کے بارے میں انھوں نے کئی مرتبہ فرمایا کہ ان کی تحریر خالص فقیہانہ اور محققانہ ہے۔ جس مسئلے کے متعلق اظہار رائے فرماتے ہیں' اس کے تمام گوشوں کو منقح کرتے چلے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے کو کسی مقام پر تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔

مولانا ندوی ان کی تصنیفات میں سے "الکتاب المستطاب فی جواب فصل الخطاب" کا ذکر خصوصیت سے فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے متعدد مواقع پر اس رائے کا اظہار فرمایا کہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری اپنی جلالت علم کے باوجود حافظ صاحب کے دلائل کا جواب نہیں دے سکے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے اوصاف سے نوازا تھا اور اہل علم کی جماعت میں وہ عالی مرتبے کے حامل تھے۔

دیگر اہل حدیث حضرات کی طرح حافظ صاحب کا تذکرہ کرنے کے لیے ان کے خاندان کے کسی اہل علم کو توفیق نہیں ہوئی یا یوں کہیے کہ جن سیاسی معرکوں کو سر کرنے کے لیے وہ میدان میں اترے ہیں' ان سے فرصت نہیں ملی۔ البتہ ان کے شاگرد رشید مولانا محمد صدیق مرحوم (سرگودھا) نے دو تین صفحوں میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے' جس میں ایک عنوان ان

کی "عادات و خصائل" کے متعلق قائم کیا گیا ہے-اس عنوان کے تحت چند سطروں میں جامعیت کے ساتھ بعض ضروری باتیں معرض بیان میں آگئی ہیں-فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں-

"وہ کم گو اور خاموش طبع تھے' بے معنی اور لایعنی گفتگو سے پرہیز کرتے تھے-اگر ہنسنے کی کوئی بات ہوتی تو صرف مسکراتے' قہقہہ نہ لگاتے-غصے کی بات پر غصے کا اظہار کرتے مگر کسی کو برا بھلا نہ کہتے-سادہ لباس پہنتے-غذا جو ملتی کھا لیتے' مگر سرخ مرچ سے پرہیز کرتے' اس کی وجہ کوئی بیماری قرار دیتے تھے-دین کی مخالفت پر سخت غم و غصے کا اظہار کرتے-بدعتی کو برا سمجھتے' اس کو سلام نہ کہتے اور اس سے مصافحہ کرنے سے گریز کرتے-بدعتی کی اقتدا میں نماز نہ پڑھتے-اگر لاعلمی یا مجبوری سے نماز پڑھنے کا اتفاق ہو جاتا تو نماز دہراتے-وضو کے وقت ہمیشہ مسواک کرتے-کھانا ایک وقت کھاتے-داودی روزہ یعنی ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے-افطاری کے دن بھی کھانا ایک وقت کھاتے-سفر و حضر میں ہمیشہ تہجد پڑھتے اور ایک پارے کی تلاوت فرماتے-نماز باجماعت پڑھتے-ہمارے علم میں ایک نماز فرض ایسی نہیں ہے جو انھوں نے جماعت کے بغیر پڑھی ہو-حتی الوسع بیٹھ کر نماز نہ پڑھتے-بیماری کے آخری دنوں میں کافی نحیف و ضعیف ہو گئے تھے' مجبوراً چند نمازیں بیٹھ کر پڑھیں-فتوے اور تعویذ کے سلسلے میں لوگ جو خدمت کرتے وہ بہت کم اپنے مصرف میں لاتے-اس کا بیشتر حصہ نیک جگہوں پر صرف کرتے-اس دوا اور علاج سے پرہیز کرتے' جس کے ناجائز ہونے کا شبہ ہوتا-جو وعدہ کرتے' اس کا ایفا کرتے"-

یہ مولانا محمد صدیق مرحوم کے الفاظ ہیں' جو ہم نے کچھ ترمیم و تبدیلی کے ساتھ یہاں نقل کر دیے ہیں-ان سے ان کی عادات و خصائل کے بعض گوشے قارئین کے سامنے آجاتے ہیں اور روزمرہ کے معمولات واضح ہو جاتے ہیں-ان الفاظ کے اختصار میں بڑی تفصیل مضمر ہے-

یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ بعض مسائل میں (جن کا تعلق قرآن مجید کی لغوی تعبیر و تفسیر سے ہے) حضرت حافظ صاحب کو حضرت مولانا ثناءاللہ صاحب امرتسری سے

اختلاف تھا‘ جس نے ایک مستقل ”نزاع“ کی شکل اختیار کر لی تھی اور پھر اس نزاع نے ”ثنائی روپڑی نزاع“ کے نام سے شہرت پائی تھی۔ اس کی تفصیل کا اگرچہ موجودہ نسل کے لوگوں کو زیادہ علم نہیں‘ تاہم اس کے آثار اب بھی اہل حدیث کے بعض ذہنوں میں موجود ہیں۔

یہ نزاع ہماری علمی تاریخ اور تعبیری سوچ کا ایک حصہ تھا‘ اس لیے ہم نہایت اختصار کے ساتھ ذیل کی سطور میں ان اختلافی یا نزاعی امور کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں جو کم و بیش تیس برس اہل حدیث کے بعض حلقوں میں بحث و جدل کا موضوع بنے رہے اور جن کو ختم کرانے کے لیے بہت سے مشاہیر اصحاب علم کے باب لغت و تحقیق پر دستک دی گئی‘ مگر اس کے حل کی کوئی شکل سامنے نہ آئی۔

ایک مرتبہ اس نزاع کی تفصیلات ارض حجاز میں بھی پہنچیں اور سلطان عبدالعزیز ابن سعود اور وہاں کے علما کے گوش گزار کی گئیں‘ لیکن عقدہ کشائی کی کوئی صورت وہاں بھی پیدا نہ ہو سکی۔

آیے! ذرا ان معاملات کو بھی اپنے علم و مطالعے میں لانے کی کوشش کرتے ہیں---- یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا‘ صرف اشارے کروں گا‘ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے معاملے کا تھوڑا سا پس منظر سمجھ لینا ضروری ہے۔

مولانا ثناءاللہ صاحب امرتسری نے ایک سو پچیس کے قریب کتابیں تصنیف کیں جو اس عہد میں بڑی مقبول ہوئیں۔ ان کتابوں میں قرآن مجید کی تفسیریں بھی شامل ہیں‘ جن میں ایک تفسیر عربی زبان میں ہے اور اس کا نام ”تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن“ ہے‘ یعنی قرآن کی تفسیر قرآن کے الفاظ میں۔ مولانا حافظ عبداللہ روپڑی نے جو بلاشبہ اپنے عصر کے بہت بڑے عالم تھے‘ اس کے بعض تفسیری مقامات کو محل نقد و اعتراض ٹھہرایا۔ حافظ صاحب کے علاوہ بعض غزنوی علما اور مولانا ثناءاللہ صاحب کے استاد محترم مولانا احمد اللہ صاحب بھی اس پر معترض ہوئے۔ لیکن انھوں نے اسے زیادہ طول نہیں دیا۔ ”میدان نزاع“ میں صرف حافظ صاحب ہی رہے اور افہام و تفہیم یا صلح صفائی سے متعلق گفتگو کا سلسلہ انہی سے جاری رہا۔

عربی تفسیر کے علاوہ مولانا امرتسری کی چند دوسری تصانیف کے بعض مندرجات سے بھی حافظ صاحب کو اختلاف تھا اور وہ اس کا اظہار فرماتے تھے۔ تاہم بہت سے علماے عظام نے اس باب میں کبھی کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا---- میں نے حضرت مولانا

محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی' حضرت حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے حضور زانوے شاگردی تہ کیا ہے۔ ان تینوں حضرات میں سے مولانا عطاء اللہ حنیف کو میں نے دیکھا کہ وہ نزاعی مسائل میں حضرت حافظ صاحب روپڑی کو حق بجانب قرار دیتے تھے۔ باقی دونوں اساتذہ میں سے کسی بزرگ کو اس موضوع پر لب کشائی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

میں اپنے آپ کو اس سلسلے میں کسی قسم کی رائے دینے کا اہل نہیں سمجھتا۔ میرا کام چند نزاعی مقامات کی نشان دہی کرنا ہے اور بس۔ وہ مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔۔ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۶۰ میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا کہ تو مردے کو کس طرح زندہ کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟

عرض کیا: کیوں نہیں رکھتا' لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔

فرمایا: فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا۔ (البقرہ : ۲۶۰)

(تم چار اڑنے والے جانور پکڑو' پھر انھیں اپنے ساتھ ہلا لو' پھر ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو' پھر ان کو بلاؤ' تمھارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے)

مولانا ثناء اللہ صاحب نے اس کی تفسیر "واحدا واحدا" کے الفاظ میں کی ہے یعنی ایک ایک پرندے کو پہاڑ پر رکھ دو' پھر انھیں اپنی طرف بلاؤ' وہ دوڑتے اور اڑتے ہوئے تمھارے پاس آئیں گے۔

حضرت حافظ صاحب کا ارشاد ہے کہ مفسرین فرماتے ہیں کہ چاروں پرندوں کو ذبح کیا گیا تھا اور ایک کا سر دوسرے کے دھڑ کے ساتھ اور دوسرے کی ٹانگ تیسرے کے سر کے ساتھ رکھ دی گئی تھی اور پھر وہ بلانے پر اپنی اصلی پہلی شکل میں حضرت ابراہیم کے پاس پہنچ گئے تھے۔ لیکن مولانا ثناء اللہ صاحب ان کو ذبح کرنے کا ذکر نہیں کرتے۔ اس لیے ان کی تفسیر غلط اور ان کا نقطۂ نظر سلف کے خلاف ہے۔

۲۔۔ حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت ہیکل میں حضرت زکریا علیہ السلام کو سونپی گئی

تھی-حضرت زکریا نے دیکھا کہ ان کے پاس کھانے پینے کی چیزیں پڑی ہیں-

فرمایا: مریم! یہ کہاں سے آئیں؟ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران-۳۷)

(جواب دیا: اللہ کے ہاں سے---!)

مولانا ثناء اللہ صاحب اپنی عربی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ تمام نعمتیں حضرت مریم کو اللہ کی طرف سے حاصل ہوتی تھیں اور وہ خود بھی ان کی نسبت اللہ ہی کی طرف کرتی ہیں- آیت میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں کہ ان کے پاس گرمی کے میوے سردی کے موسم میں اور سردی کے گرمی کے موسم میں آتے تھے-

حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ اسے حضرت مریم کی کرامت اور معجزہ کہنا چاہیے' مگر مولانا ثناء اللہ یہ نہیں مانتے- لہٰذا یہ تفسیر سلف کے خلاف ہوئی-

۳-- وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ -(الاعراف-۸)

مولانا قرآن کے ان الفاظ کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز انسان کے اعمال کی مقدار دیکھی جائے گی کہ کتنی ہے----

حضرت حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ان الفاظ کے معنے یہ ہیں کہ اعمال تولے جائیں گے- جیسا کہ حدیث میں آتا ہے اور سلف سے منقول ہے----

ان کے نزدیک یہاں بھی مولانا نے غلط تفسیر کی- اس لیے کہ تولنے کا لفظ استعمال نہیں کیا-

۴-- وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ -(الاعراف-۱۶۰)

مولانا نے اس کی تفسیر قرآن کی ایک اور آیت سے کی ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ فرماتا ہے ہم نے بنی اسرائیل پر بارش اتاری-

حافظ کا ارشاد ہے کہ اس کے معنی ہیں "ہم نے ان پر بادلوں کا سایہ کیا"--- یہ حضرت موسیٰ کا معجزہ تھا جو اسلاف نے بیان کیا ہے-

۵-- فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ- (الاعراف-۱۶۲)

مولانا نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو استغفار کرنے اور متوکل رہنے کا جو حکم دیا تھا' اس پر وہ قائم نہیں رہے' اس کی انھوں نے مخالفت کی-

حافظ صاحب کا کہنا ہے کہ اللہ نے ان کو سجدے کی حالت میں گھسٹتے ہوئے دروازے

میں داخل ہونے اور "حنطه" کہنے کا حکم دیا تھا' جسے انھوں نے "خطه" میں بدل دیا۔لہذا مولانا کی تفسیر غلط ہے۔

۶-- وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ -(الانبیا-۷۹)

اس آیت کی تفسیر مولانا نے یہ کی ہے کہ پہاڑ اور پرندے غفلت کے وقت داؤد علیہ السلام کو یاد دلاتے تھے۔

حافظ صاحب کا فرمان ہے کہ یہ داؤد علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ اللہ نے پہاڑ اور پرندے ان کے تابع کر دیے تھے جو اللہ کی تسبیح بیان کیا کرتے تھے۔

۷-- وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ- (سبا-۱۰)

مولانا فرماتے ہیں کہ اللہ کا ارشاد ہے ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو آگ کے ساتھ لوہا نرم کرنے کا طریقہ سکھایا۔

حافظ صاحب کا فرمان ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں 'بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے حضرت داؤد کے ہاتھ میں لوہا نرم کر دیا۔جونہی انھوں نے لوہا ہاتھ میں پکڑا نرم ہو گیا۔یہ حضرت داؤد کا معجزہ تھا جو لوہا پکڑتے ہی ظہور میں آ جاتا تھا۔

۸-- عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى- (النجم-۱۴)

مولانا عربی تفسیر میں اس کا مطلب ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

عندا نتهاء مراتب الكما للانسان

یعنی کمالات انسانی کے ختم ہونے کا مقام۔

مطلب یہ کہ آنحضرت نے شب معراج میں حضرت جبریل کو دوسری مرتبہ سدرۃ المنتھیٰ کے پاس بھی دیکھا تھا۔

حضرت حافظ صاحب کا فرمان ہے کہ مولانا کی تفسیر صحیح نہیں۔سدرہ کے معنی بیری کے ہیں۔



۹-- بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ- (البروج-۲۱'۲۲)

(بلکہ وہ قرآن ہے بڑی شان والا' لوح محفوظ میں)

مولانا نے "لوح محفوظ" کے معنی "فی علمہ سبحانہ" کیے ہیں 'یعنی اللہ کا علم۔

حافظ صاحب فرماتے ہیں لوح محفوظ کے معنی اس تختی کے ہیں' جس میں خیر و شر

مرقوم ہے۔

حضرت حافظ عبداللہ صاحب روپڑی اور مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری دونوں جلیل القدر عالم تھے۔ دونوں کی خدمات کا دائرہ وسعت پذیر تھا اور دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ بات بہرحال ذہن میں رہنی چاہیے کہ جس زمانے میں ان کے نزاع کا آغاز ہوا' اس زمانے کا ہندوستان بہت سے مذاہب کا گہوارہ تھا۔ عیسائی' آریہ سماجی' سناتن دھرمی' ست دھرمی' دیو سماجی' جینی وغیرہ کتنے ہی مذہبوں کے اہل علم تھے جو مذہب اسلام اور مسلمانوں کے عقائد و افکار پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے اور مسلمان مناظرین ان کا جواب دیتے اور اسلام کا دفاع کرتے تھے۔ مولانا امرتسری اس دور میں اسلام کے بہت بڑے مناظر اور مدافع تھے' اور اس حیثیت سے انھیں بے شمار مخالفین اسلام سے واسطہ پڑتا تھا۔ اس کے برعکس حضرت حافظ صاحب کو مناظروں اور مباحثوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ درس و تدریس اور علم و تحقیق کے دلدادہ تھے۔ ان کا زیادہ تر واسطہ ان حضرات سے رہتا تھا جو بالعموم مسجدوں میں رہتے اور روزمرہ پیش آنے والے مسائل دریافت کرتے تھے۔

بہ الفاظ دیگر علمائے کرام دو قسم کے تھے' ایک غیر مسلموں کے مقابلے میں اسلام کا دفاع کرنے والے اور دوسرے مساجد و مدارس سے تعلق و رابطہ رکھنے والے --- مولانا ثناء اللہ صاحب کا تعلق دونوں قسم کے علما سے تھا جب کہ حضرت حافظ صاحب کا سلسلہ مراسم زیادہ تر دوسری قسم کے اصحاب تحقیق سے تھا' دونوں سے استفادہ ضروری تھا اور دونوں کی علمی مساعی کے دوائر دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

مناظرین و مباحثین کو غیروں کے اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض اوقات بعض مسائل کی تعبیر میں کچھ نرم رویہ بھی اختیار کرنا پڑتا تھا۔ اس سے کسی کو ملحد یا زندیق یا دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا یا سلف کی مخالف صف میں لا کھڑا کرنا' عام لوگوں کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اگر کوئی شخص دو چار فی صد مسائل کی تعبیر کر کے اسلام کے پچانوے چھیانوے فی صد مسائل کو بچا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو آپ اس پر الحاد و زندیقیت کا فتویٰ کیوں کر لگا سکتے ہیں؟ وہ تو میدان میں کھڑا ہے' اسلام کا دفاع کر رہا ہے۔ اس کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ اور آپ اسے ملحدین و زندیقین اور نیچریوں کی فہرست میں شامل فرما رہے ہیں۔

موجودہ دور میں بھی یہی حال ہے۔ بے شمار لوگ (جو خیر سے مسلمان ہیں) اسلام کے بہت سے احکام پر حملے کر رہے ہیں اور انھیں خلاف عقل و دانش قرار دے رہے ہیں' اگر کوئی ان کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ بہت بڑا مجاہد ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اسے ملاحدہ وزنادقہ کے زمرے میں نہیں شامل کرنا چاہیے۔

مولانا ثناء اللہ صاحب چونکہ تحریر و تقریر اور مناظرات کے ذریعے غیر مسلموں کے مقابلے میں اسلام کا دفاع کر رہے تھے اور اپنے آپ کو انھوں نے اس خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا' اس لیے علمائے کرام کی عظیم اکثریت نے نزاعی مسائل میں خاموشی اختیار کیے رکھی اور پورے ہندوستان کے علمی' سیاسی اور دینی و جماعتی حلقوں میں مولانا مرحوم و مغفور کو ہمیشہ نہایت عزت و احترام کا مقام حاصل رہا۔ اب بھی ان کا نام نہایت تکریم سے لیا جاتا ہے اور ان کی خدمات کا بہترین الفاظ میں ذکر کیا جاتا ہے۔

بہرحال یہ ایک دور کی بات تھی اور وہ دور اپنی تمام خوش گواریوں اور ناخوش گواریوں کے ساتھ گزر گیا۔ اب صرف اس کی یاد باقی رہ گئی ہے۔ اب نہ اس قسم کے بڑے لوگ پیدا ہوں گے اور نہ علم و کمال کی اس نوع کی محفلیں جمیں گی۔ حالات کی رفتار بتاتی ہے اور واقعات کا دھارا پتا دیتا ہے کہ آئندہ حافظ عبداللہ روپڑی کے مرتبہ علمی کا کوئی شخص عالم وجود میں نہیں آئے گا۔ نہ چشم فلک مولانا ثناء اللہ امرتسری جیسے یگانہ روز فاضل کو دیکھ سکے گی۔ اب کچھ اور ہی انداز کے لوگ سامنے آئیں گے اور آرہے ہیں۔

مولانا ثناء اللہ صاحب کی تصنیفات اور ان کی نوعیت کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے جو ان کے متعلق لکھا گیا ہے۔

حضرت حافظ عبداللہ صاحب کی تصنیفات پچیس کے قریب ہیں' مثال کے طور پر وراثت اسلامیہ' سماع موتی' درایت تفسیری' رد بدعات' زیارت قبر نبوی' رسالہ امارت' کلمہ توحید' رویت ہلال' بیمہ زندگی' حج مسنون' نکاح شغار' اہل سنت کی تعریف' اہل حدیث کے امتیازی مسائل' نبی معصوم' ٹھیٹھ اسلام' اسلام اور مرزائیت' تعلیم الصلوۃ' اہل حدیث کی تعریف' طلاق ثلاثہ' طیور ابراہیمی' تکبیرات عیدین' حکومت اور علمائے ربانی وغیرہ۔

یہاں یہ بھی سنتے جایئے کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث ۲۴۔ جولائی ۱۹۴۸ء کو قائم کی گئی تھی' جس کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی تھے۔ حافظ صاحب کو اس کی مجلس عاملہ

کے رکن نامزد کیا گیا تھا' لیکن وہ جماعت کے اس نظام میں شامل نہیں ہوئے تھے- ان کا فرمان تھا کہ یہ تنظیم غیر شرعی ہے- شرعی نظام میں سربراہ کو صدر نہیں بلکہ امیر کہا جاتا ہے- پھر جب ۱۹۵۹ء میں سربراہ کو "امیر" کہا جانے لگا تو اس میں بھی شمولیت نہیں فرمائی-

اس سے بہت سال پیشتر متحدہ ہندوستان میں جب جماعت اہل حدیث کا نظام "آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس" کے نام سے قائم تھا' اس میں بھی حضرت حافظ صاحب مرحوم باقاعدہ رکن کی حیثیت سے شامل نہیں تھے-

اللہ تعالیٰ کا ان پر یہ خاص فضل ہے کہ انھوں نے خالص علمی زندگی بسر کی اور بے شمار علماو طلبا نے ان سے علم حاصل کیا اور ہمیشہ اللہ کی دینِ حق کی خدمت کرتے رہے-

اس عالم اجل نے ۲۰- اگست ۱۹۶۴ (۱۱- ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ) کو جمعرات کے دن بارہ بجے دوپہر ۸۰ برس کی عمر میں انتقال کیا- نماز جنازہ دوسرے دن' بعد نماز جمعہ اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کی گراؤنڈ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھائی' جس میں لاہور اور دوسرے شہروں اور علاقوں کے ہزاروں افراد نے شرکت کی ------ انھیں گارڈن ٹاؤن کے قبرستان میں چھ بجے شام سپرد خاک کیا گیا- انا للہ وانا الیہ راجعون-

آخر میں ہم روپڑی علمائے کرام کی خدمت میں خاص طور سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ایک لائق احترام خاندان کے لائق احترام ارکان ہیں- اللہ نے آپ کو علم کی دولت بھی عطا فرمائی ہے اور اظہار مافی الضمیر کے سلیقے سے بھی نوازا ہے- یہ ایک نعمت ہے جو بارگاہ ایزدی سے آپ کو ودیعت کی گئی ہے- پھر آپ کے پاس وسائل بھی ہیں اور رسائل بھی ہیں- آپ اپنے بزرگوں کے حالات خود لکھیے (یا کسی سے لکھوایے) اور لوگوں کو اور اپنی آل اولاد کو ان کی علمی سرگرمیوں سے متعارف کرائیے' ان کی تصنیفات کی تفصیل سے پڑھے لکھے افراد کو آگاہ کیجیے' ان کی تدریسی تگ و تاز کو اجاگر کیجیے' ان کے اساتذہ کی فہرست قارئین کے سامنے رکھیے' ان کے تلامذہ کی تفصیل سے اصحاب فہم کو مطلع کیجیے' ان کی علمی و تصنیفی مساعی کی وضاحت فرمایے- لیکن یہ اہم اور بنیادی کام چھوڑ کر آپ سیاست کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں- سیاسی لوگ آپ کو استعمال کرتے ہیں اور آپ استعمال ہو رہے ہیں- کسی نے آپ کے کسی بیان کی تعریف کر دی' کسی تقریر کی داد دے دی' آپ نے سمجھ لیا کہ دنیا جہان کی دولت ہاتھ آگئی- یہ سب وقتی اور ہنگامی چیزیں ہیں' ان سے دامن بچایے اور کوئی پائدار

کام کیجیے‘ جو ہمیشہ رہنے والا ہو اور جس سے لوگ استفادہ کریں جیسا کہ آپ کے بزرگوں کی علمی مساعی سے استفادہ کر رہے ہیں- دیوبندی حضرات بھی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں‘ جماعت اسلامی کے لوگ بھی اپنے انداز سے سیاسی دھندہ کرتے ہیں‘ لیکن وہ اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کو نہیں بھولتے‘ وہ ہر موقعے پر انھیں یاد رکھتے اور ان کے حالات و سوانح ضبط تحریر میں لاتے ہیں-

اپنے اکابر کے کارناموں کو عام کرنے اور ان کے عمل و حرکت کو نمایاں کرنے سے دامن کشاں رہنے کے مرض میں اہل حدیث کے کسی ایک ہی خاندان کے اصحاب علم مبتلا نہیں ہیں‘ یہ متعدی بیماری تقریباً تمام اہل حدیث حضرات کو لاحق ہے- کسی نے اپنے بزرگوں کے سوانح حیات قلم بند نہیں کیے اور کسی کو یہ سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ ان کے فضل و کمال کے مختلف گوشوں کو واضح کرنے کے لیے قلم کو حرکت میں لایا جائے- ان کے نزدیک یہ کوئی اہم کام نہیں ہے- جب بھی اس موضوع پر کسی سے بات ہوئی‘ یہی جواب ملا‘ کیا کریں وقت ہی نہیں ہے--- وقت صرف بے مقصد قسم کی سیاست کے لیے ہے-

فخر و مباہات کے طور پر نہیں‘ تحدیث نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اس فقیر نے اللہ کے فضل اور اس کی نصرت سے بہت سے اصحاب فضل و کمال کے بارے میں لکھا اور بغیر کسی طمع اور لالچ کے لکھا- اس کی چند مثالیں عرض کرتا ہوں-

۱-- حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی وفات کے وقت میں ”الاعتصام“ کا ایڈیٹر تھا- میں نے اخبار میں اعلان کیا کہ جلد ہی ”الاعتصام“ کا مولانا محمد داؤد غزنوی نمبر شائع کیا جائے گا- اس کے لیے میں نے مختلف اہل قلم سے رابطہ پیدا کیا اور مولانا سے متعلق ان سے مضامین حاصل کیے--- پھر حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ نہ میں الاعتصام کا ایڈیٹر رہا اور نہ وہ نمبر شائع ہو سکا- پندرہ سولہ سال کی ادارت کے بعد میں اس سے علیحدہ ہو گیا اور میں نے اور سید ابوبکر غزنوی مرحوم نے ہفت روزہ ”توحید“ جاری کر لیا‘ جس کی ادارت میرے سپرد ہوئی- اس سے کچھ عرصہ بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہو گیا اور وہ تمام مضامین جو مولانا محمد داؤد غزنوی نمبر کے لیے حاصل کیے گئے تھے‘ میں نے سید ابوبکر غزنوی مرحوم کو دے دیے- انھوں نے ایک اپنے مضمون اور دو تین اور مضامین کا اضافہ کر کے ان مضامین کو ترتیب دے کر کتابی صورت میں شائع کر دیا- یعنی یہ وہ تحریری سرمایہ تھا جو

میں نے ان کو دیا اور انھوں نے اپنے نام سے چھاپا۔

۲۔۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے حالات میں، میں نے ''ارمغان حنیف'' کے نام سے کتاب مرتب کی جو تین سو بہتر صفحات پر محیط ہے۔اس میں مولانا ندوی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۳۔۔ ''قصوری خاندان'' کے نام سے کتاب لکھی جو دو سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا محمد علی ایم اے کینٹب قصوری، میاں محمود علی قصوری اور ان کے بزرگوں کے سوانح حیات مرقوم ہیں، اس کتاب کا کسی سے ایک پیسہ نہیں لیا۔اپنے شوق سے لکھی اور ناشر کے طلب کرنے پر اسے بغیر کوئی معاوضہ لیے دے دی، کسی سے کوئی سودا بازی نہیں کی اور نہ یہ میری عادت ہے۔

یہ کتاب از راہ کرم قارئین نے پسند کی۔اس پر بہت اچھے تبصرے بھی ہوئے اور تحسین کے خطوط بھی موصول ہوئے۔ایک خط ہمارے دیرینہ دوست مولانا خالد گھرجاکھی کا موصول ہوا، انھوں نے تحریر فرمایا کہ اسی قسم کی کتاب لکھوی خاندان پر بھی لکھی جائے۔

۴۔۔ حضرت علامہ قاضی محمد سلیمان منصوری پوری برصغیر کی ممتاز ترین علمی شخصیت تھے۔اللہ نے ان کو بہت سی خصوصیات سے بہرہ مند فرمایا تھا۔ان کی کتاب رحمۃ اللعالمین کو اصحاب علم میں جو پذیرائی حاصل ہوئی، وہ سیرت رسول (ﷺ) کی اور کسی کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ان کے حالات و سوانح پردۂ اخفا میں تھے۔اس فقیر کو اللہ نے توفیق عطا فرمائی اور ان کے اور ان کے خاندان کے تفصیلی حالات معرض کتابت میں آ گئے۔ان شاءاللہ جلد ہی چھپ جائے گی۔یہ حالات میں نے بہت سے حضرات سے مل کر یا خط و کتابت کے ذریعے حاصل کیے ہیں۔جو بات جہاں سے ملی، اس کے حوالے سے لکھ دی۔

۵۔۔۔ حال ہی میں ''نقوش عظمت رفتہ'' کے نام سے ساڑھے چھ سو صفحات کی کتاب شائع ہوئی، جس میں انیس حضرات کے تفصیلی حالات مرقوم ہیں۔یہ کتاب مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور نے شائع کی ہے۔

۶۔۔۔ تقریباً ڈھائی سو صفحات کی کتاب میاں فضل حق کے حالات میں تصنیف کی۔اس کتاب میں میاں صاحب کے حالات اس انداز سے معرضِ وجود میں لائے گئے ہیں کہ

اختصار مگر جامعیت کے ساتھ برصغیر کی پوری جماعت کی سیاسی اور علمی سرگرمیاں معرضِ اشاعت میں آگئی ہیں۔

یہ اس فقیر کی وہ تصنیفات ہیں جو ان کتابوں کے علاوہ ہیں جو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے لکھی گئی ہیں۔

میں "در مدح خود" کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علمائے کرام کے واقعات و حالات قلم بند کرنا اور لوگوں کے علم میں لانا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔ ان کے ورثا و اخلاف کو بالخصوص اس طرف عنان توجہ مبذول کرنی چاہیے اور ان کے کوائف زندگی سے لوگوں کو متعارف کرانا چاہیے۔ لیکن افسوس ہے' اس ضروری کام کو زیادہ مرکز توجہ نہیں بنایا جاتا' حالانکہ ہم نے سب کچھ انہی سے حاصل کیا ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ

# مُفتی محمد حسن اَمرتسری

۱۹۵۱ء میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا اور میں اس سے منسلک تھا۔ گوجرانوالہ میں اس وقت ایک صاحب صوفی نذیر حسین اقامت پذیر تھے جو قیام پاکستان کے زمانے میں امرتسر کی سکونت ترک کر کے گوجرانوالے آئے تھے۔ وہ کشمیری برادری کے ان حضرات سے تعلق رکھتے تھے' جنھیں ''صوفی'' کہا جاتا ہے۔ بڑے وجیہ' خوش مزاج' خوش گفتار اور ملنسار آدمی تھے۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نائب صدر تھے' جب کہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی اس کے صدر تھے۔ صوفی صاحب' مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی کے دوستوں میں سے تھے اور ان کا بہت احترام کرتے تھے' مجھ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ قیام گوجرانوالہ کے زمانے میں وہ ہفتے میں ایک یا دو دفعہ مجھے اور مولانا محمد حنیف ندوی کو اپنے یہاں ضرور بلاتے تھے۔

مہینہ یاد نہیں کون سا تھا' لیکن سن ۱۹۵۱ء تھا۔ ایک روز صوفی صاحب کا پیغام آیا کہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد اسماعیل صاحب' مولانا محمد حنیف ندوی اور ان سطور کا راقم مفتی صاحب کی زیارت کے لیے ان کے مکان پر پہنچے۔ وہاں امرتسر کے متعدد حضرات موجود تھے۔ مفتی صاحب چارپائی پر تشریف فرما تھے' بستر بچھا ہوا تھا اور دو یا تین گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ایک گاؤ تکیے پر انھوں نے اپنی ایک ٹانگ پھیلا رکھی تھی۔

ہم نے سلام عرض کیا تو نہایت خندہ پیشانی سے سلام کا جواب دیا۔ دونوں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے فرمایا: معذرت چاہتا ہوں' کھڑا نہیں ہو سکتا۔

وہ دراصل سیالکوٹ مصنوعی ٹانگ لگانے گئے تھے' واپسی پر صوفی نذیر حسین مرحوم کے مکان پر تشریف لائے تو انھوں نے از راہ کرم بہت سے لوگوں کو دعوت دے کر ان کی ملاقات اور زیارت کا موقع فراہم کر دیا۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی نے دور طالب علمی میں امرتسر میں ان سے استفادہ کیا تھا اور کچھ درسی کتابیں ان سے پڑھی تھیں' اس لیے ان سے ان

کا سلسلہ کلام کچھ زیادہ دیر جاری رہا اور مولانا نہایت احترام سے نظر نیچی کر کے ان کے ارشادات سماعت فرماتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ بھرا ہوا چہرہ' سرخی مائل گندمی رنگ' سر پر ململ کا عمامہ' چمک دار آنکھیں' نہایت ہشاش بشاش' لبوں پر مسکراہٹ' بڑے مشفقانہ لہجے میں بات کرتے تھے۔اسلوب کلام انتہائی ناصحانہ اور پند و موعظت سے بھرپور---!

بزرگانِ دین کے واقعات دلنشین انداز میں مسلسل بیان کرتے جاتے تھے اور حاضرین مجلس نہایت شوق اور توجہ سے ان کے فرامین سن رہے تھے۔ کافی دیر ہم ان کے فرمودات سنتے رہے-----پھر وہ لاہور روانہ ہو گئے۔

حضرت مفتی محمد حسن صاحب دیوبند کے حلقہ اہل علم کے جلیل القدر عالم' اپنے عہد کے ممتاز معلم' صاحب دل اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے۔۱۸۷۸ء کے پس و پیش موضع ''مل پور'' میں پیدا ہوئے جو قصبہ ''واہ'' کے قریب اور حسن ابدال سے سات میل کی مسافت پر واقع ہے'اس وادی کو جس میں مفتی صاحب نے جنم لیا''وادی دریائے برو'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تاریخی اور تہذیبی اعتبار سے یہ وادی انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اس وادی کو شمالی ہند میں بدھ تہذیب اور بدھ مذہب کے عظیم و مشہور مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور حضرت مسیح سے قبل کے دور میں روحانیت سے دلچسپی رکھنے والے بہت سے لوگ اس وادی پر فضا میں اپنے اپنے مذہب کے مطابق مصروف عبادت رہتے تھے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سکندر اور پورس کا مقابلہ اسی وادی میں ہوا تھا۔اس وادی کی گود میں قدیم تہذیب اور پرانی ثقافت کی بہت سی اقدار نے کروٹ لی اور نشوو ارتقا کی منزلیں طے کیں'اس کے قدیم آثار کا بہت بڑا ذخیرہ ٹیکسلا کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

مفتی صاحب کے والد محترم کا اسم گرامی مولانا اللہ داد تھا جو اپنے علاقے اور عہد کے معروف عالم اور معزز بزرگ تھے۔ خاندان کے دیگر افراد کو بھی نیکی اور تدین کی بنا پر علاقے میں لائق احترام گردانا جاتا تھا۔

مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے ہی کے اساتذہ سے حاصل کی' جس کی مختصر سی روداد کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ قاضی نور محمد سے موضع سنگ جانی (ضلع راولپنڈی) میں قرآن مجید پڑھا اور فارسی کی

ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

۲۔ قاضی گوہر دین موضع کھوڑی (ضلع اٹک) سے عربی صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔

۳۔ مکھڈ (ضلع اٹک) کے ایک دینی مدرسے میں بھی صرف و نحو وغیرہ علوم کی بعض کتابوں کی تکمیل کی۔

۴۔ مولانا محمد معصوم سکنہ ڈھینڈہ (بزورہ) سے فلسفہ و منطق کی تعلیم پائی۔

مولانا محمد معصوم اپنے دور کے نامور مدرس اور معروف عالم دین تھے۔ وہ علمائے غزنویہ کے قائم کردہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام (امرتسر) میں معلم کی حیثیت سے تشریف لے گئے تو انھوں نے مفتی صاحب کو بھی وہیں بلا لیا۔ یہاں انھوں نے منطق و فلسفہ کے علوم کی تکمیل بھی کی اور تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابیں بھی پڑھیں۔ امرتسر میں انھوں نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے استفادہ کیا۔

۱۔ حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی سے تفسیر اور حدیث کی تکمیل کی اور سند حاصل کی۔

۲۔ مولانا نور احمد سے امرتسر کی مسجد نور میں تحصیل علم کی۔

۳۔ مولانا مفتی غلام مصطفیٰ قاسمی سے بھی استفادہ کیا۔

علوم مروجہ کی اصل تحصیل و تکمیل انھوں نے مدرسہ غزنویہ ہی میں کی، باقی مقامات سے بہت کم استفادہ کیا۔

پھر امرتسر ہی کو اپنا مسکن قرار دے لیا اور اسی شہر میں سکونت اختیار کر لی یہاں تک کہ نسبت بھی اسی شہر کی طرف ہو گئی اور انھیں مفتی محمد حسن امرتسری کہا جانے لگا اور پھر تمام عمر "امرتسری" رہے۔ وفات کے بعد بھی یہ نسبت ان سے وابستہ رہی۔

مفتی صاحب درس نظامی سے فارغ ہوئے تو مولانا نور احمد نے اپنی مسجد کی خطابت و امامت ان کے سپرد کر دی تھی۔ اس مسجد کا نام "مسجد نور" تھا جو انہی مولانا نور احمد کی طرف منسوب تھی۔ علاوہ ازیں امرتسر کے مدرسہ نعمانیہ کو اس وقت بڑی شہرت حاصل تھی، اس مدرسے میں مفتی صاحب کو فرائض تدریس سرانجام دینے پر مامور کر دیا گیا تھا۔ اس طرح عالم جوانی ہی میں فراغت تعلیم سے فوراً بعد امرتسر میں وہ طلبا کو تعلیم بھی دینے لگے تھے اور خطابت و امامت کے منصب پر بھی فائز کر دیے گئے تھے۔

مفتی صاحب بہت اچھے واعظ‘ خوش بیان خطیب‘ اونچے پایہ کے مبلغ اور منجھے ہوئے مدرس تھے۔ عوام ان کی خطابت سے متاثر اور طلبا ان کے طرز تدریس پر فریفتہ ----انداز تفہیم اور طریق درس نہایت پر تاثیر----- دور دور سے طلبا ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے تحصیل علم کرتے تھے۔

تقویٰ و تدین اور خشیت الٰہی سے ان کا دل ابتداے عمر ہی سے معمور تھا۔ رواداری‘ متانت‘ خلوص‘ نرم کلامی اور حلم و بردباری کے اوصاف ان کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے فراوانی سے جمع فرما دیے تھے۔ چھوٹے پر شفقت اور بڑے کی تکریم کو انھوں نے اپنے لیے عملاً و قولاً فرض ٹھہرا لیا تھا۔ جس سے ملتے خوش روئی اور خندہ پیشانی سے ملتے اور نرم زبان میں اس سے گفتگو کرتے۔ لہجہ نہایت شیریں اور نہج کلام بے حد میٹھا۔

خطابت و درس کی ذمے داری سنبھالنے کے بعد مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں پہنچے اور ان کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر کی----- مولانا تھانوی نے تین شرطیں پیش کیں۔ فرمایا بیعت سے پہلے ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔

اول: کسی قاری سے فن قرات حاصل کیا جائے۔

دوم: کسی حنفی مسلک کے استاذ حدیث سے احناف کے انداز کے مطابق دورہ حدیث کیا جائے۔

سوم: حکیم غلام مصطفیٰ بجنوری سے تعلق اصلاح قائم کر کے پورے پچیس دفعہ ان سے خط و کتابت کی جائے اور پھر وہ پچیس خطوط مجھے دکھائے جائیں۔

مفتی صاحب امرتسر میں حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے کتب حدیث پڑھ چکے تھے اور حضرت امام صاحب نے انھیں سند حدیث عطا فرمادی تھی‘ لیکن تحصیل حدیث کا یہ طریقہ اہل حدیث کے طریقے کے مطابق تھا‘ اس لیے مولانا تھانوی اس سے مطمئن نہیں تھے‘ وہ حنفی علما کی وساطت سے سند و اجازہ حدیث کے خواہاں تھے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے دو سال میں مولانا تھانوی کی یہ تینوں شرائط پوری کر دیں۔

- ---- دیوبند میں مولانا محمد انور شاہ کاشمیری سے دورہ حدیث کیا۔
- ---- قاری کریم بخش سے فن قرات سیکھا۔
- ---- حکیم غلام مصطفیٰ بجنوریؒ سے خط و کتابت کے ذریعے پچیس خطوط وصول کر کے

مولانا تھانوی کو دکھا دیے۔

اب مولانا تھانوی نے ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ (جولائی ۱۹۲۵ء) کو انھیں اپنے حلقہ بیعت میں شامل فرما لیا۔ پھر تین سال کی محنت و ریاضت کے بعد انھیں خلعت خلافت سے نوازا تو ارشاد فرمایا۔

"میرے قلب میں بار بار اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ میں آپ کو توکلا" علی اللہ تعالیٰ بیعت و تلقین کی اجازت دوں۔ اگر کوئی طالب حق درخواست کرے' انکار نہ کریں اور اپنے دوستوں کو اس کی اطلاع کر دیں اور مجھ کو اپنا پتا جس سے ڈاک پہنچ سکے' لکھ کر بھیجیں۔ میں اپنی یادداشت میں درج کر لوں گا۔"

اس کے بعد مفتی صاحب نے تین امور کو بالخصوص نظر التفات ٹھہرایا۔

۱۔ درس و تدریس

۲۔ وعظ و تبلیغ

۳۔ بیعت وارشاد

یہ تینوں بڑے اہم امور تھے۔ درس و تدریس کے ذریعے بے شمار علما و طلبا ان سے مستفید ہوئے اور انھوں نے علوم دین کی بہت سی کتابیں ان کے حلقہ درس میں مکمل کیں ---- تدریس ان کا دل پسند مشغلہ تھا' زندگی کے آخری چند سال مستثنیٰ کر کے وہ ہمیشہ اور ہر حال میں طلبا کو درس دیتے رہے۔ وعظ و تبلیغ سے بھی انھیں بے حد دلچسپی تھی۔ وہ امرتسر میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے' جس میں کثیر تعداد میں لوگ شامل ہوتے تھے۔ جمعے کے علاوہ بھی لوگ ان کی خدمت میں آتے اور ان کے مواعظ حسنہ سنتے تھے۔ نماز عصر کے بعد لاہور میں کئی دفعہ یہ فقیر مولانا سید داؤد غزنوی کے ساتھ بھی ان کے ہاں گیا' تنہا بھی متعدد مرتبہ حاضر ہوا۔ لوگ ان کے ارد گرد بیٹھے ہوتے اور وہ انھیں قرآن و حدیث کے مسائل بتانے اور بزرگان دین کے واقعات سنانے میں مصروف ہوتے ---- یہ ان دنوں کی بات ہے جب جامعہ اشرفیہ' نیلہ گنبد میں سائیکل مارکیٹ سے متصل مول چند بلڈنگ میں قائم تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں مولانا غزنوی کے ساتھ ان کی خدمت میں گیا اور پھر ہم شام تک ان کے پاس رہے اور مغرب کی نماز مسجد نیلہ گنبد میں پڑھی۔ مولانا کے مفتی صاحب سے بے پناہ تعلقات تھے اور وہ ان کے ہاں جانے کے لیے بے تاب رہتے تھے۔ خود

مفتی صاحب کا بھی یہی حال تھا کیفیت کچھ ایسی تھی کہ۔

ہم بھی ہیں بے قرار تو وہ بھی ہیں مضطرب
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

تصوف کی بولی میں مفتی صاحب' مولانا تھانوی کے مرید اور خلیفہ تھے اور مرشد کی طرف سے انھیں بیعت و تلقین کی اجازت حاصل تھی' اس لیے ان کا بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری تھا۔ بے شمار لوگوں نے ان سے استفاضہ کیا اور اس طریقے سے وہ خیرات وحسنات کے پھیلانے اور عام کرنے کا باعث بنے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۵ء سے جاری تھا' جب سے وہ مولانا تھانوی کے حلقہ بیعت میں شامل ہوئے تھے۔ اس سلسلے کی روحانی کیفیتوں اور قلبی مسرتوں کا اصل اندازہ انھی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو اس پر بہار وادی کے نشیب و فراز سے آگاہ اور اس کی مختلف منزلوں سے باخبر ہیں۔ ہر ایک کی ذہنی اور فکری رسائی اس منزل تک نہیں ہو سکتی۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے ان تینوں جہتوں سے کام کیا اور یہی جہتیں ان کا مرکز توجہ رہیں' اور ان کے نزدیک تبلیغ دین اور معاشرے کی اصلاح کا اصل طریقہ یہی تھا۔

پہلی دفعہ (جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا) انھوں نے ۱۱ ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ (جولائی ۱۹۲۵ء) کو مولانا تھانوی کی بیعت کی تھی اور پھر اس سے تین سال بعد انھیں خلیفہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۷ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ (۲۷- مئی ۱۹۲۹ء) کو مولانا تھانوی نے حوض والی مسجد تھانہ بھون میں ان کو دوبارہ شرف بیعت سے نوازا۔

مفتی صاحب کا امرتسر میں یہ معمول رہا کہ وہ نماز فجر کے بعد درس قرآن مجید دیا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد لاہور آگئے تو یہاں بھی یہ بنیادی کام جاری رکھا' لیکن جب مرض نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ صحت جسمانی جواب دے گئی تو مجبوراً اسے چھوڑنا پڑا۔

وہ ۱۹۴۷ء میں امرتسر سے لاہور آئے تو مدرسہ نعمانیہ کے بدلے نیلا گنبد میں مول چند بلڈنگ الاٹ کرالی اور "جامعہ اشرفیہ" کے نام سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسے فیروز پور روڈ پر ایک وسیع اور کھلی جگہ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس وقت

پاکستان میں اسلامی و دینی علوم کی یہ ایک بڑی درس گاہ ہے' جسے حضرت مفتی صاحب کے لائق احترام صاحب زادے جاری رکھے ہوئے ہیں- اس میں طلبا کی اچھی خاصی تعداد حصول علم میں مصروف ہے اور متعدد قابل اساتذہ انھیں تعلیم دینے پر مامور ہیں-

یہ فقیر جب بھی حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' انھوں نے بے حد شفقت کا اظہار فرمایا- اخبار "الاعتصام" ہر ہفتے بذریعہ ڈاک ان کی خدمت عالیہ میں پہنچتا تھا- انھوں نے کئی دفعہ اس میں شائع شدہ مضامین اور اداریوں کے حوالے دیے اور ان کی تحسین فرمائی جو اس فقیر کی حوصلہ افزائی کا باعث بنی- مولانا سید محمد داؤد غزنوی سے بھی انھوں نے بارہا "الاعتصام" کا ذکر کیا اور اس کے مندرجات سے متعلق ایسے کلمات ارشاد فرمائے جنھیں سن کر مجھے بے حد مسرت ہوئی- ظاہر ہے لکھنے والے کی کسی بات کی تحسین کی جائے تو وہ خوش ہوتا ہے' مجھے بھی خوشی ہوئی اور میرا حوصلہ بڑھا-

مولانا محمد اسماعیل صاحب' حضرت مفتی صاحب کے شاگرد تھے' انھوں نے امرتسر میں ان سے استفادہ کیا تھا- مولانا نے مولانا محمد اشرف سندھو کی ایک تصنیف پر تقریظ لکھی تھی' جس کے بعض حصوں کا حضرت مفتی صاحب نے مولانا غزنوی سے ذکر کیا اور بزرگانہ شکوہ فرمایا- مولانا غزنوی نے اس کا ذکر مجھ سے کیا اور ارشاد ہوا کہ آپ کی مولانا اسماعیل صاحب سے جلد ملاقات ہو تو مفتی صاحب کے جذبات ان تک پہنچا دیں اور میرا یہ نقطہ نظر بھی انھیں بتا دیں کہ لکھتے وقت تعلقات و مراسم کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے- اتفاق سے میں انھی دنوں کسی کام سے گوجرانوالے گیا تو مولانا کی خدمت میں بھی حاضر ہوا اور اپنی دانست میں نہایت احترام کے الفاظ میں انھیں مولانا غزنوی کا پیغام پہنچایا-

مولانا اسماعیل صاحب نے مولانا غزنوی کو ایک مکتوب گرامی میں اس کا جواب دیا جو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا تھا- اس پر تاریخ کتابت مرقوم نہیں- میرا خیال ہے یہ ۱۹۵۶ء کا خط ہے- معلوم نہیں یہ گرامی نامہ میرے پاس کیسے پہنچ گیا- ممکن ہے مولانا غزنوی نے مجھے یہ پڑھنے کو دیا ہو اور پھر میرے ہی پاس رہ گیا ہو- یہ مکتوب ان مکتوبات سے ملا ہے جو مولانا محمد اسماعیل صاحب نے میرے نام تحریر فرمائے تھے اور میرے پاس محفوظ ہیں- اس مکتوب گرامی سے پتا چلتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کا مولانا اسماعیل صاحب بے پناہ احترام کرتے تھے ------ مکتوب کے ایک حصے پر مولانا غزنوی نے سرخ

نشان لگایا ہے۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جس کا تعلق حضرت مفتی محمد حسن صاحب‘ مولانا محمد اسماعیل صاحب اور مولانا داؤد غزنوی سے ہے‘ اس لیے اسے یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ کتاب کے مصنف مولانا محمد اشرف سندھو‘ حضرت مفتی محمد حسن‘ مولانا داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب اپنی اپنی باری سے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں‘ رحمہم اللہ تعالیٰ

----- اب ذیل میں خط ملاحظہ کیجیے۔

سیدی حضرت صدر محترم مرکزی جمعیت اہل حدیث۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولانا محمد اسحاق مدیر ”الاعتصام“ آئے تھے‘ جناب کا نصیحت آمیز پیغام پہنچایا۔ حضرت الاستاذ مفتی محمد حسن صاحب کی ناراضی سے بے حد تکلیف ہوئی۔ آج کے حضرات دیوبند میں میرے علم کے مطابق حضرت ہی کی شخصیت ہے‘ جن کے علم‘ خلوص‘ زہد اور تقوے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ میرے تو وہ بے حد محسن ہیں۔ وہ ناراض بھی ہوں تو میرے دل میں ان کے لیے بحمد اللہ ہمیشہ احترام ہی رہے گا۔ میں حضرت مفتی صاحب کو براہ راست خط لکھنا چاہتا تھا لیکن اس تقریظ کی موجودگی میں یہ کوشش بے سود تھی۔

یہ تقریظ آج سے قریباً پندرہ سولہ سال پہلے کی ہے اور اس میں مولوی محمد اشرف نے کافی تبدیلی کر دی ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا‘ لیکن پھر خاموش ہو گیا۔

مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا خواب میاں صاحب کے متعلق بعض رسائل میں شائع ہوا تھا‘ واقعی اس وقت طبیعت کو بہت کوفت ہوئی تھی۔ میاں صاحب مرحوم کے متعلق ہمارے جذبات اس سے کہیں نازک ہیں‘ جس قدر حضرت مفتی صاحب کے مولانا تھانویؒ کے متعلق ہیں----- تقریظ کی روح بھی یہی تھی۔ اب میں اگر حضرت مفتی صاحب کو کوئی معذرتی عریضہ لکھوں تو اس کے معنے میاں صاحب کے ساتھ تعلقات کا سودا ہو گا۔ اس کے لیے طبیعت تیار نہیں‘ لہٰذا حضرت مفتی صاحب کو براہ راست لکھنے سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔

الفاظ کے متعلق معذرت بے سود ہے۔ میرے خیال میں حضرت مولانا تھانویؒ نے اس خواب اور تعبیر میں حضرت میاں صاحب مرحوم اور جماعت اہل حدیث

سے انصاف نہیں فرمایا' عفا اللہ عنہ-

مسلک کے متعلق بحمد اللہ آج تک سودا نہیں کیا- اکابر دیوبند کے ساتھ عقیدت اور ان کے علمی احترام کے باوجود مسلک میں لچک کا کبھی دل میں خیال نہیں گزرا- اگر حضرت مفتی صاحب قبلہ کبھی اچھے موڈ میں ہوں تو میری طرف سے معذرت فرمادیں-

یہاں کے دیوبندی حضرات چوں کہ حضرت مفتی صاحب کے پاس آتے جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے' وہ گلہ گزاری کرتے رہتے ہیں- ان کے ذاتی حالات اور دیانت داری کا مجھے پورا علم ہے' لیکن نہ میں اسے حضرت مفتی صاحب تک پہنچانا چاہتا ہوں اور نہ اس کا کوئی امکان ہے ----- میری زندگی نمائشی تکلفات سے پاک ہے' نہ دوستوں کے متعلق کوئی تکلف ہے اور نہ کسی اور سے ----- آپ حضرات بھی جانتے ہیں کہ میری زندگی کیسی ہے اور مقامی طور سے احباب پر اس کا جو اثر ہے' وہ جناب سے مخفی نہیں-

میں نے مولانا اسحاق صاحب سے بھی اس سلسلے میں کچھ باتیں کی تھیں' مجھے یقین ہے' انھوں نے بالکل صحیح طریقے سے جناب کی خدمت میں پیش کردی ہوں گی-

والسلام

محمد اسماعیل کان اللہ لہ

حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد میں نے ۹- جون ۱۹۶۱ (۲۴ ذوالحجہ ۱۳۸۰ھ) کے ''الاعتصام'' میں ان پر طویل اداریہ لکھا تھا' جس میں ان کے حالات بیان کیے گئے تھے' ان کے تعلقات کی وسعت کی تصریح کی گئی تھی اور ان کے علم کی ہمہ گیری اور اہل حدیث حضرات سے ان کے مراسم کی تفصیل کا ذکر کیا گیا تھا----- مجھے نہیں معلوم کہ حضرت کے کسی سوانح نگار نے اسے پڑھا یا نہیں پڑھا- اگر کسی بزرگ کو اس کے پڑھنے کا موقع ملا تو انھوں نے اس سے کیا اثر لیا- میں نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا' اپنی معلومات کی روشنی میں لکھا- دوسرے حضرت نے اپنے علم کے مطابق لکھا-

میں وہ پورا اداریہ یہاں نقل کر رہا ہوں تاکہ حضرت مفتی صاحب کے وہ کوائف

حیات بھی خوانندگان محترم کے علم میں آجائیں جن کا اظہار یا تو سرے سے ہوا ہی نہیں یا ہوا ہے تو بہت کم------!

ادارے کا عنوان تھا: "حضرت مولانا مفتی محمد حسن کا انتقال"

ذیل میں اس فقیر کا تحریر کردہ اداریہ ملاحظہ فرمایئے۔

یہ خبر ہم نے نہایت حزن و ملال کے ساتھ سنی کہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب یکم جون ۱۹۶۱ء (۱۶ ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ) کو دن کے ساڑھے بارہ بجے ۸۶ سال کی عمر پا کر حرکت قلب بند ہو جانے سے کراچی میں انتقال کر گئے۔ رحمه الله تعالىٰ و غفرله و جعل الجنة ماواه۔

حضرت مفتی صاحب------ جنھیں آئندہ مرحوم لکھنا پڑے گا------ نہایت صالح، بہ درجہ غایت مخلص، انتہائی بلند کردار، بہت بڑے عالم اور عظیم المرتبت انسان تھے۔ وہ اگرچہ عرصے سے بیمار تھے لیکن ان کا دل اتنا مضبوط تھا اور قوت ارادی اس درجہ مستحکم تھی کہ بیماری کا غلبہ انھیں کبھی اتنا متاثر و مرعوب نہ کر سکا کہ بے بس ہو کر چارپائی پر لیٹ جائیں اور اپنے خیرات و حسنات کے شب و روز کے معمولات کو خیر باد کہہ دیں۔ وہ بیماری کے باوجود بہت سے لوگوں سے ملتے اور تمام ضروری فرائض بحسن و خوبی انجام دیتے تھے۔

مفتی صاحب کے حالات زندگی بڑے قابل رشک اور لائق مطالعہ ہیں۔ وہ آج سے ۸۶ سال قبل علاقہ ہزارہ کے ایک گاؤں میں ایک نیک اطوار علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ کچھ بڑے ہوئے تو امرتسر آ گئے اور وہاں کی مشہور دینی درس گاہ مدرسہ غزنویہ یعنی دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں داخل ہو گئے۔ وہ زمانہ واقعہ یہ ہے کہ صلحا و اتقیا کا زمانہ تھا اور بڑے بڑے متقی اور پرہیز گار لوگ اس دور کے امرتسر میں مقیم تھے، اور انہی کی وجہ سے اہل اسلام اور طلباے علم امرتسر کا رخ کرتے تھے۔ جن حضرات نے وہاں علم و عمل کی شمع جلا رکھی تھی اور زہد و تصوف کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے، ان میں غزنوی خاندان خاص طور سے مشہور تھا، اور ان میں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک امتیازی مقام اور منفرد مرتبہ حاصل تھا، اور ان کی حقیقیانہ رفعتوں اور عالمانہ تاثر انگیزیوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا، اور اس کی متعدد وجوہ تھیں۔

○---- وہ بہت بڑے روحانی بزرگ اور حد درجہ متصف بہ صالحیت اور تقویٰ شعار تھے۔

○---- مجسمہ اتباع سنت اور پیکر عمل بالقرآن والسنہ تھے اور اسی کی پاداش میں اپنے والد مکرم حضرت عبداللہ غزنوی کے ساتھ غزنی سے نکالے گئے اور اب امرتسر میں قیام فرما تھے۔

○----ان کے میل جول کا انداز اور عام اخلاق و کردار کا معیار انتہائی بلند اور ممتاز تھا۔

○----انھوں نے نہایت اونچے پیمانے پر مسند تدریس بچھائی' جو ایسا سرچشمہ فیض تھا کہ لوگ دور دراز سے آکر اس سے اپنی علمی تشنگی بجھاتے اور مختلف علوم و فنون میں درک حاصل کرتے تھے۔

مفتی محمد حسن صاحب کو بھی یہی چیز کشاں کشاں امرتسر لائی اور وہ حضرت امام کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ انھوں نے تفسیر' حدیث' فقہ' صرف' نحو' منطق و فلسفہ وغیرہ کی تمام کتابیں مدرسہ غزنویہ میں پڑھیں۔

یہاں یہ حقیقت یاد رہے کہ مدرسہ غزنویہ خالص اہل حدیث کا مدرسہ تھا اور مفتی صاحب حنفی مسلک کے پابند تھے' لیکن جانبین کے اعتدال و احتیاط اور توازن فکر و عمل کا یہ عالم تھا کہ کبھی مغائرت اور دوئی کا ادنیٰ تصور بھی دلوں میں پیدا نہیں ہوا' بلکہ حضرت مفتی صاحب مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دو عظیم المرتبت بزرگوں کی صحبت و مجلس میں شریک رہنے اور ان سے کسب فیض کا موقع ملا ہے' ایک مولانا الامام عبدالجبار غزنوی سے اور دوسرے مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے۔ رحمہما اللہ تعالیٰ۔

مدرسہ غزنویہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مفتی صاحب دارالعلوم دیوبند چلے گئے' وہاں سے بھی سند حاصل کی۔

امرتسر میں اس زمانے میں شیخ بڈھے کی ایک مشہور مسجد تھی' جس میں مولانا نور احمد صاحب تشریف فرما تھے جو نہایت پرہیز گار اور مخلص بزرگ تھے' حنفی المسلک تھے اور احناف کی طرف سے عیدین کے امام تھے۔ مدرسہ غزنویہ میں تحصیل علم کے دور میں مفتی صاحب اکثر مولانا نور احمد صاحب کے ہاں جاتے اور ان کی بابرکت صحبتوں سے مستفیض ہوتے تھے۔ دیوبند سے تشریف آوری کے بعد مستقل طور پر مولانا نور احمد کے مدرسہ نعمانیہ میں چلے گئے اور وہیں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ طالب علمی کے زمانے میں مفتی صاحب جہاں عمل صالح کے لیے بے چین اور مائل بہ تصوف تھے' وہاں بڑے ذہین اور محنتی

بھی تھے- منطق پر عبور حاصل تھا' اسی بنا پر امرتسر کے تدریسی حلقوں میں "ملا حسن" کے نام سے مشہور تھے-

(یہاں یہ یاد رہے کہ ملا محمد حسن فرنگی محلی لکھنوی بارھویں صدی ہجری اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے بہت بڑے عالم تھے' جو منطق و فلسفہ میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے' اس موضوع سے متعلق ان کی بعض کتابیں درس نظامی میں شامل ہیں- حسن اتفاق سے مفتی صاحب کا اسم گرامی بھی محمد حسن تھا' منطق پر عبور کی وجہ سے علما و طلبا کے حلقوں میں انھیں "ملا حسن" کہا جانے لگا)

مفتی صاحب نے منطق مولانا محمد معصوم مرحوم سے پڑھی تھی جو ان کے زمانہ طالب علمی میں مدرسہ غزنویہ میں پڑھاتے تھے' مولانا محمد معصوم حنفی المسلک تھے' مختلف علوم پر عمیق نگاہ رکھتے تھے اور مفتی صاحب کے ہم وطن تھے-

مفتی صاحب اپنی مجلسوں میں اس زمانے کے مدرسہ غزنویہ کے کوائف نہایت موثر اور رقت آمیز لہجے کے ساتھ بیان فرمایا کرتے تھے- ایک مجلس میں فرمایا:

> "مدرسہ غزنویہ کی تعلیمی حالت اس وقت بڑے عروج پر تھی اور اساتذہ کا حلقہ نہایت مخلص علما اور متقی حضرات پر مشتمل تھا- کہیں مولانا عبدالاول صاحب غزنوی کا حلقہ درس جما ہوا ہے' کسی گوشے میں مولانا عبدالغفور صاحب غزنوی علمی گتھیاں سلجھا رہے ہیں اور کسی طرف مولانا عبدالرحیم صاحب غزنوی کی مسند تدریس بچھی ہوئی ہے- وہ بہترین اور پاکیزہ زمانہ تھا- مسجد غزنویہ میں تہجد کے وقت طلبا اس کثرت سے نماز تہجد پڑھتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا یہ تہجد کی نماز نہیں' مغرب یا عشا کی نماز ہے-"

"جس زمانے میں مفتی صاحب مرحوم مدرسہ غزنویہ میں طالب علم کی حیثیت سے مقیم تھے' اس زمانے میں حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی مرحوم بھی وہاں بطور طالب علم اقامت گزیں تھے اور ان کے ہم سبق تھے- مولانا عطاء اللہ صاحب لکھوی کو دیگر علوم مروجہ کے علاوہ صرف و نحو سے خاص طور سے دلچسپی تھی اور اس کے باریک سے باریک اور مشکل سے مشکل مسائل حل کرنے میں انھیں درجہ کمال حاصل تھا- وہ اپنے فن پر عبور اور شاگردوں کی کثرت تعداد کی بنا پر "استاذ پنجاب" کے لقب سے مشہور تھے- نہایت سادہ

مزاج‘ بے حد شفیق و مہربان استاذ اور صاحب تقویٰ عالم دین تھے-۲۶ نومبر ۱۹۵۲ کو جامعہ محمدیہ اوکاڑا میں ان کا انتقال ہوا-

مفتی صاحب مرحوم اپنے دور طالب علمی کی بہت سی باتیں ناصحانہ انداز میں سنایا کرتے تھے-وہ چوں کہ مدرسہ غزنویہ کے فارغ التحصیل اور حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے والد مکرم حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور فیض یافتہ تھے‘ اس لیے مولانا داؤد غزنوی سے گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ہر معاملے میں ان سے مشورہ لیتے تھے-بیماری کے باوجود مہینے میں ایک مرتبہ مولانا غزنوی کے ہاں ضرور تشریف لے جاتے اور مولانا کی رائے اور بات کو بہت وقیع قرار دیتے تھے-ان دونوں بزرگوں کی گفتگو کا اصل موضوع تصوف اور اس کے نکات و معارف ہوتا تھا- مفتی صاحب اس ضمن میں اکثر حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیا کرتے تھے اور ان کی جامعیت علوم سے اس درجہ متاثر تھے کہ اپنے عقیدت کیشوں اور ارادت مندوں کو بھی ان کے واقعات سنایا کرتے اور ان کے معارف علمی کی کسی نہ کسی جھلک سے روشناس کراتے رہتے تھے-

وہ اپنے استاذ زادہ مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں اپنے حلقہ ارادت میں کہا کرتے تھے کہ

”نہ تم میں سے کوئی میری بات سمجھتا ہے اور نہ میں کسی کی بات سمجھتا ہوں‘ صرف مولانا داؤد غزنوی ہیں جو میری بات سمجھتے ہیں اور جن کی بات میں سمجھتا ہوں“

ان کا مطلب یہ تھا کہ تصوف کے نکات اور اس کے علمی و عملی مباحث پر مولانا غزنوی کی نظر اتنی وسیع ہے کہ اس پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے-

مفتی صاحب مرحوم اپنی مجلسوں میں بعض دفعہ حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی مرحوم کے علمی نکات بھی بیان فرمایا کرتے تھے-کراچی جانے سے چند روز پہلے ایک ملاقات میں مولانا داؤد غزنوی سے حسب عادت امام صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا-

ولو تقول علینا بعض الا قاویل لا خذنا منه بالیمین‘ ثم لقطعنا منه الوتین
(اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنا لاتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے‘ پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے)

کی تفسیر میں جو معنے حضرت امام صاحب نے بیان فرمائے وہ کسی تفسیر میں میری نظر سے نہیں

گزرے' امام صاحب نے فرمایا: یہ وعید اس شخص کے لیے ہے جو حقیقی نبی ہو اور نبوت و رسالت کی نعمت اللہ نے اسے عطا کی ہو' پھر وہ اللہ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرے تو ہم اسے یہ سزا دیں- یہ ہر مدعی نبوت کے لیے نہیں ہے-

یہ بیان کرنے کے بعد مفتی صاحب نے فرمایا کہ اکثر مفسرین نے اس کی مختلف توجیہات کی ہیں- حضرت تھانوی نے بھی اس کی تشریح میں توجیہات بیان کی ہیں' لیکن حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح کے مطابق کسی تاویل کی گنجائش نہیں رہتی-

مفتی صاحب اگرچہ اصلاً امرتسر کے باشندے نہیں تھے' تحصیل علم کی غرض سے مدرسہ غزنویہ میں آئے تھے اور اسی مدرسے میں انھوں نے مروجہ تعلیم مکمل کی تھی' لیکن اس کے بعد مستقل طور سے امرتسر ہی میں قیام پذیر ہو گئے اور قیام پاکستان تک مدرسہ نعمانیہ میں تدریس و اہتمام کے فرائض سرانجام دیتے رہے-

امرتسر کے علمائے کرام اور عوام و خواص سے ان کے تعلقات بڑے مستحکم تھے' بالخصوص اہل حدیث علما و زعما سے بہت موانست تھی' اس لیے کہ اسی حلقے کے علما سے انھوں نے تحصیل علم کی تھی-

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ خلیفہ مجاز تھے اور جب تک صحت نے اجازت دی باقاعدگی سے مولانا تھانوی کے ہاں تھانہ بھون تشریف لے جاتے رہے- تیس رمضان انھوں نے پورے التزام کے ساتھ وہاں گزارے' یعنی مسلسل تیس سال رمضان کے مہینے میں اپنے مرشد کے ہاں فیوض و برکات حاصل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا-

مولانا سید محمد داؤد غزنوی روایت فرماتے ہیں کہ مفتی صاحب مولانا تھانوی کے بعض دلچسپ اور پر لطف واقعات بیان فرمایا کرتے تھے- مثلاً:

۱- مولانا محمد جمال صاحب مرحوم امرتسر کے مشہور عالم اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے اور حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ----! جب تک امام صاحب زندہ رہے وہ ان سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے- امام صاحب کی وفات کے بعد قدرتی طور پر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا- اب وہ کسی صاحب دل کے متلاشی ہوئے- اسی اثنا میں انھیں مولانا تھانوی کے بارے میں معلوم ہوا تو ان سے خط و کتابت کی اور حاضری کی اجازت چاہی- لیکن ساتھ ہی یہ بات واضح کر دی کہ

میں اہل حدیث ہوں اور روحانی اعتبار سے حضرت امام مولانا عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے فیض یافتہ ہوں ----ان کی وفات کے بعد آپ کے ہاں حاضری کا متمنی ہوں۔

مولانا تھانوی نے جواب میں لکھا کہ ضرور تشریف لایے' مگر اختلافی مسائل پر گفتگو نہ فرمایے' اس سے طبیعت میں انقباض پیدا ہوتا ہے' چنانچہ یہ وہاں گئے اور نماز باقاعدہ مسلک اہل حدیث کے مطابق ادا کرتے رہے۔

مولانا محمد جمال صاحب کی مولانا تھانوی انتہائی عزت کرتے تھے۔ان کا کھانا مولانا تھانوی کے گھر سے آتا تھا' جب کہ باقی تمام مہمانوں کے کھانے کا انتظام لنگر میں تھا۔کسی شخص کو مسجد میں چارپائی بچھانے کی اجازت نہ تھی' لیکن ان کے لیے خاص طور سے مسجد میں چارپائی بچھانے کا انتظام فرمایا۔

۲۔ مولانا محمد حسین صاحب ہزاروی مرحوم بھی امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کے فارغ التحصیل تھے اور بعد میں اسی مدرسے کے مدرس مقرر کر لیے گئے تھے۔نہایت صالح اور پرہیزگار عالم دین تھے۔پہلے حنفی المسلک تھے' لیکن بعد میں حضرت امام صاحب کے فیضان صحبت سے اہل حدیث مسلک اختیار کر لیا تھا۔مفتی صاحب کے ہم وطن اور ہم جماعت تھے۔

یہ بھی ایک دفعہ مفتی صاحب کے ساتھ تھانہ بھون تشریف لے گئے تھے۔مفتی صاحب نے مولانا تھانوی سے ان کا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ مسلک اہل حدیث' سے تعلق رکھتے ہیں۔مولانا تھانوی بڑے خوش ہوئے اور ان سے باقاعدہ ملتے رہے۔ایک دن مفتی صاحب سے پوچھا:

کیا بات ہے نماز میں مولانا محمد حسین صاحب کی آمین کی آواز نہیں آتی؟

مفتی صاحب نے جواب دیا: شاید آپ کے احترام اور مسلک کی رعایت میں آمین نہ پکارتے ہوں۔

مولانا تھانوی نے فرمایا: آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اس سنت کے ترک کا بوجھ میری گردن پر نہ ڈالیں۔سمندر پار (یعنی حجاز میں) جو عمل سنت سمجھا جاتا ہے' وہ سمندر کے اس طرف بدعت کیوں کر ہو سکتا ہے؟ مولوی صاحب سے کہیے وہ آمین بالجہر کہیں' یہاں کوئی

انھیں روکنے والا نہیں۔

مفتی صاحب بڑے خوش مزاج بھی تھے۔ مولوی سلطان محمود صاحب ہیڈ ماسٹر نے جو مسلکاً اہل حدیث تھے' بتایا کہ ایک دفعہ امرتسر میں مفتی صاحب کے مدرسہ نعمانیہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہونے والا تھا۔ اس کے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے مفتی صاحب نے مجھے حکم دیا۔ میں نے کہا یہ علما کا مجمع ہے اور میری داڑھی چھوٹی ہے' میں اپنے آپ کو ایسے اہم اجلاس کی صدارت کے قابل نہیں سمجھتا۔ مفتی صاحب نے ازراہ مزاح فرمایا آپ کی داڑھی چھوٹی ہے تو کیا ہوا' میری داڑھی جو لمبی ہے۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھوں گا۔ جو لوگ صدر کو دیکھنا چاہیں گے وہ آپ کو دیکھ لیں گے اور جو داڑھی دیکھنا چاہیں گے وہ مجھے دیکھ لیں گے۔

قیام پاکستان کے بعد ان کا مدرسہ نعمانیہ لاہور میں منتقل ہو گیا اور اس کا نام "جامعہ اشرفیہ" رکھا گیا۔ پہلے یہ مول چند بلڈنگ میں تھا جو نیلہ گنبد کے علاقے میں ہے۔ پھر مفتی صاحب کی کوششوں سے اچھرے میں فیروز پور روڈ پر منتقل ہو گیا۔ وہاں اس کے لیے بڑی اچھی عمارت اور وسیع مسجد تعمیر کی گئی ہے۔

یہاں یہ تذکرہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو گا کہ جامعہ اشرفیہ کا سنگ بنیاد رکھتے وقت پہلی اینٹ خود مفتی صاحب نے اپنے ہاتھ سے رکھی اور پھر ان کے فرمان سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے بنیادی اینٹ رکھی تھی۔

ان سطور کے راقم کو مفتی صاحب کی زیارت کی سعادت پہلی دفعہ ۱۹۵۱ء میں گوجرانوالہ میں صوفی نذیر حسین صاحب امرتسری مرحوم کے مکان پر حاصل ہوئی تھی۔ وہ سیالکوٹ سے لکڑی کی نئی ٹانگ بنوا کر اور فٹ کرا کے واپس لاہور آ رہے تھے کہ صوفی صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے۔ الاعتصام اس زمانے میں گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس موقعے پر صوفی صاحب مرحوم نے (جو مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کے نائب صدر تھے) مفتی صاحب کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا تھا' جس میں متعدد حضرات کو بلایا گیا تھا۔ مدعوین میں مولانا محمد اسماعیل صاحب' مولانا محمد حنیف ندوی اور ان سطور کا راقم بھی شامل تھے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب چوں کہ ان کے شاگرد ہیں' اس لیے دوسروں کی نسبت حضرت مفتی صاحب ان سے زیادہ مخاطب رہے۔

مفتی صاحب "الاعتصام" باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور مولانا غزنوی کی وساطت

سے "الاعتصام" کے بعض مضامین کی تحسین کا پتا چلتا رہتا تھا- مولانا کے پاس از راہ شفقت وہ اس فقیر کی بھی تعریف فرماتے تھے- خود یہ عاجز بھی مولانا غزنوی کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو بے حد مہربانی کا برتاؤ فرماتے اور "الاعتصام" اور اس کے مضامین پر پسندیدگی کا اظہار فرماتے-

بے شک حضرت مرحوم بہت سی خوبیوں کے مالک اور بے شمار اوصاف حمیدہ کے حامل تھے- امرتسر میں ان کی ٹانگ پر فالج کا حملہ ہو گیا تھا اور اس کے بعد زہریلا پھوڑا نکل آیا تھا- ڈاکٹروں نے امرتسر ہی میں مشورہ دیا تھا کہ ٹانگ کٹوا دی جائے' لیکن مفتی صاحب اس پر آمادہ نہ ہوئے- قیام پاکستان کے بعد لاہور تشریف لائے تو بیماری کے اثرات مزید بڑھ گئے اور پھر مجبوراً ۱۹۵۱ میں ٹانگ کٹوانا پڑی- ٹانگ کا کٹا ہوا حصہ اچھرہ (لاہور) کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا-

وہ خون کے دباؤ (بلڈ پریشر) کے عارضے میں مبتلا تھے اور کمزوری روز بروز بڑھ رہی تھی- لاہور میں ان کو آخری شدید دورہ پڑا' جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے کسی سے ملاقات کا سلسلہ بند کر دیا تھا' جوں ہی کچھ افاقہ ہوا اور ملاقات کی اجازت ملی تو موٹر سے اپنے صاحب زادوں کے ساتھ اچانک شیش محل روڈ پر تشریف لے آئے- ان کے ایک صاحب زادے نے مولانا غزنوی صاحب کو اطلاع دی کہ حضرت والد صاحب باہر آپ سے ملاقات کے لیے آئے ہیں- مولانا گئے اور فرمایا آپ کیوں تشریف لائے- مجھے اطلاع دیتے' میں خود حاضر ہو جاتا-

فرمایا: آپ سے ملاقات کو میرا دل چاہتا تھا تو مجھے ہی آنا چاہیے تھا-

مولانا غزنوی کو اب ان کی یہ باتیں یاد آتی ہیں تو بے اختیار آب دیدہ ہو جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آئندہ اس قسم کے مخلص لوگ کہاں ملیں گے- کتنے ہی لوگ حضرت امام صاحب کے فیض یافتہ یہاں موجود ہیں مگر کسی میں وہ بات نہیں جو مفتی صاحب میں تھی-

کراچی کے بعض عقیدت مندوں کا اصرار تھا کہ حضرت مفتی صاحب ایک دفعہ ضرور وہاں تشریف لے جائیں- ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو انھوں نے اجازت دے دی اور کہا کہ وہاں جانا صحت کے لیے مفید ثابت ہو گا' آب و ہوا بدل جائے گی اور عام اثرات اچھے رہیں گے-

مولانا غزنوی کو ان کے سفر کراچی کا پتا چلا تو ملاقات کے لیے گئے اور کراچی تشریف نہ لے جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ آپ کی صحت کے پیش نظر وہاں جانا مناسب نہیں۔

مفتی صاحب نے فرمایا: میں خود بھی کراچی جانے پر رضامند نہیں ہوں، مگر کیا کروں، یہ میرے دوست اور ڈاکٹر صاحبان سبھی مجھے کراچی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ ہوائی اڈے پر انھوں نے فرمایا کہ جو بات مولانا داؤد غزنوی کہتے ہیں، وہی صحیح ہے۔ وہ مجھے صائب مشورہ دیا کرتے ہیں۔

مولانا نے فرمایا: جب میں مفتی صاحب سے ملاقات کر رہا تھا تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ اب یہ زندہ واپس نہیں آئیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ لاہور سے تشریف لے جانے سے دو تین روز بعد ہی یکم جون ۱۹۶۱ کی دوپہر کو یہ آفتاب علم و عمل کراچی کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

انتقال کے وقت انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی نعش لاہور نہ پہنچائی جائے، نہ تدفین میں تاخیر کی جائے اور نہ ان کے بیٹوں کا انتظار کیا جائے کہ وہ لاہور سے آئیں گے تو تدفین عمل میں لائی جائے گی، یہ سب باتیں خلاف سنت ہیں۔ چنانچہ وصیت پر پورا عمل کیا گیا۔ وہ دن کے ساڑھے بارہ بجے فوت ہوئے اور شام کو پونے سات بجے دفن کر دیے گئے۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

حضرت مفتی صاحب کی وفات ایک عظیم سانحہ ہے۔ ان کے انتقال سے صرف ایک خاندان اور کسی خاص طبقے ہی کے لوگوں کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ پورے ملک اور تمام اہل علم پر اس سے حزن و ملال کی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ حضرت مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اور ان کے صاحب زادوں، تمام اہل خانہ، اصحاب عقیدت اور دوست احباب کا حامی و ناصر اور مربی ہو، اور اپنے فضل خاص سے انھیں صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

یہ ہے وہ اداریہ جو اس فقیر نے "الاعتصام" کے ۹ جون ۱۹۶۱ء کے شمارے میں حضرت مفتی محمد حسن امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا تھا۔ میں نے ان سے متعلق جو واقعات تحریر کیے ہیں، وہ یا تو خود ان کے بیان فرمودہ ہیں یا وہ ہیں جو ان کے مخلص ترین دوست اور ان

کے استاذ زادہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے مجھے بتائے۔ رحمهم الله تعالیٰ

گزشتہ سطور میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ مفتی صاحب نے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ بیعت میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے تین شرطیں پیش کیں، جن کا بیعت سے پہلے پورا ہونا ضروری ہے اور وہ شرطیں یہ ہیں۔

اول: کسی قاری سے فن قرأت حاصل کیا جائے۔

دوم: کسی حنفی مسلک کے استاذِ حدیث سے احناف کے انداز کے مطابق دورۂ حدیث کیا جائے۔

سوم: حکیم غلام مصطفیٰ بجنوری سے تعلق اصلاح قائم کر کے پورے پچیس دفعہ ان سے خط و کتابت کی جائے اور پھر وہ پچیس خطوط مولانا تھانوی کو دکھائے جائیں۔

ان شرائط ثلاثہ میں سے شرط اول تو اپنے اندر ایک وزن رکھتی ہے، لیکن شرط دوم اور سوم کا کیا مطلب ہے، اسے مولانا تھانوی کے عقیدت مند ہی سمجھتے ہوں گے۔ ان میں سے بھی کسی عالم اور بزرگ سے تعلق اصلاح قائم کرنا صحیح ہے، مگر پچیس دفعہ خط و کتابت کی شرط عائد کرنا خدا جانے کس تصوف کا مسئلہ اور کس اسلام کی شرط ہے۔

پھر حدیث کا علم بھی اسی شخص کا قابل قبول ہے جس نے کسی حنفی استاذ سے پڑھا ہو، مفتی صاحب نے چوں کہ اہل حدیث عالم حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی سے کتب حدیث پڑھی تھیں، اس لیے مولانا تھانوی کے نزدیک اسے لائق التفات نہیں ٹھہرایا گیا۔ جب تک ارشاداتِ پیغمبر کو حنفیت کا جامہ نہ پہنا دیا جائے، اس وقت تک اسے مبنی بر صحت نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ حضرت تھانوی کی ادائے تصوف ہے۔

# ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

۱۹۵۰ء کے ماہ فروری میں ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم ہوا۔ اس کے بانی اور پہلے ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے۔ اس زمانے میں مولانا محمد حنیف ندوی گوجرانوالہ میں اقامت گزیں تھے اور ہفت روزہ اخبار "الاعتصام" کے ایڈیٹر تھے جو ان دنوں گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا۔ میں اس اخبار کا معاون ایڈیٹر تھا۔

مئی ۱۹۵۱ء کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی کہ طویل قامت اور متناسب ڈیل ڈول کے ایک صاحب جو کھلے پائنچے کا پاجامہ پہنے اور ٹھنڈی شیروانی زیب تن کیے ہوئے تھے، دفتر "الاعتصام" تشریف لائے اور مولانا حنیف ندوی سے ملے، وہ نرم زبان میں ٹھہر ٹھہر کر بولتے اور رک رک کر بات کرتے تھے۔ یہ تھے رشید اختر ندوی جو اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا کو بتایا کہ لاہور میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے حکومت کی اعانت سے ایک تصنیفی مرکز قائم کیا ہے، جس کا نام "ادارہ ثقافت اسلامیہ" رکھا گیا ہے۔ میں اس میں کام کرتا ہوں۔ خلیفہ صاحب کی مجلس میں آپ کا ذکر ہوا تو ملاقات کے متمنی ہوئے۔ انھوں نے آپ کو ادارے میں تشریف لانے کی دعوت دی ہے۔

میں نے پہلی مرتبہ رشید اختر ندوی صاحب سے خلیفہ صاحب کا اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کا نام سنا تھا۔

مولانا لاہور آئے اور خلیفہ صاحب سے ملے۔ انھوں نے مولانا سے ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور اس سے وابستگی اختیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مولانا نے ان کی پیش کش پر غور کیا، مجھ سے بھی مشورہ کیا اور ۱۵۔ مئی ۱۹۵۱ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے۔ ڈاکٹر رفیع الدین اور مظہر الدین صدیقی اس سے پیشتر ادارے سے وابستہ ہو چکے تھے۔

مولانا حنیف ندوی کے ادارے میں آنے سے ایک مہینے بعد یعنی ۱۵- جون ۱۹۵۱ء کو شاہ محمد جعفر صاحب پھلواروی کو رفیق ادارہ مقرر کیا گیا اور پھر نومبر ۱۹۵۴ء میں بشیر احمد ڈار' شاہد حسین رزاقی اور رئیس احمد جعفری کو اس کے حلقہ تصنیف و تالیف میں شامل کیا گیا-

مولانا حنیف ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہونے سے کچھ عرصے بعد گوجرانوالہ کی سکونت ترک کر کے مستقل طور سے لاہور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور اخبار "الاعتصام" بھی جس کے وہ ایڈیٹر تھے گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہو گیا تھا اور اس کی ادارت میرے سپرد کر دی گئی تھی-

ان تمام حضرات سے جو ادارے سے منسلک تھے' میرے مراسم قائم ہو گئے تھے' اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کا دفتر میرے لیے "علاقہ غیر" نہیں رہا تھا- میں دس پندرہ دن کے بعد ادارے میں جاتا اور ان حضرات سے ملتا تھا- مولانا حنیف ندوی سے البتہ روزانہ شام کے بعد کسی ہوٹل میں ڈیڑھ دو گھنٹے کی نشست رہتی اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی جس میں لطائف کا عنصر بالخصوص شامل ہوتا-

رئیس احمد جعفری بھی "ہوٹل باز" تھے- وہ میکلوڈ روڈ پر وکٹوریہ ہوٹل کے عقب میں ٹیگور پارک میں رہتے تھے- شام کے بعد چلتے پھرتے اس ہوٹل میں آ جاتے' جس میں ہم ڈیرہ جمائے ہوتے- وہ لطیفہ سنانے کے عادی تو نہ تھے' (میرا خیال ہے انھیں کوئی لطیفہ آتا بھی نہ تھا) البتہ لطیفہ سننے کا انھیں بہت چسکا تھا- لطیفہ سن کر خوب داد دیتے اور خوب ہنستے- میں کبھی کبھی ان کے گھر بھی جاتا' وہ بھی مہربانی فرماتے اور بعض اوقات ہمارے اخبار "الاعتصام" کے دفتر تشریف لے آتے-

ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے مجھے عام طور پر لکھنے پڑھنے کا کوئی کام مل جاتا تھا جو ادارے کے ملازم برکت اللہ کے ہاتھ بھیجا جاتا تھا- کام کی نوعیت کے مطابق اس کا معقول معاوضہ دیا جاتا تھا- ادارے میں آنے جانے کے باوجود میں نے ابھی تک خلیفہ صاحب کو نہیں دیکھا تھا' البتہ رفقائے ادارہ سے ان کی بعض دلچسپ باتیں کئی دفعہ سنی تھیں-

اس زمانے میں تمام رفقائے ادارہ دس بجے کے لگ بھگ خلیفہ صاحب کے کمرے میں چلے جاتے تھے اور باجماعت چائے پی جاتی تھی- چائے کے ساتھ سب کو ایک ایک بسکٹ پیش کیا جاتا تھا- یہ مجلس تقریباً گیارہ بجے تک جاری رہتی- بعض دفعہ ادارے سے باہر کے

اہل علم بھی تشریف لے آتے اور شریک مجلس ہوتے- اسے "خلیفہ صاحب کا دربار" کہا جاتا تھا' جس میں علمی اور فلسفیانہ بحثیں بھی ہوتی تھیں' ادبی موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی تھی' سیاسیات پر بھی ہلکا پھلکا تبصرہ ہو جاتا تھا' شعروشاعری بھی ہوتی تھی' تنقید و تبصرے بھی ہوتے تھے- نکات تصوف و سلوک بھی بیان کیے جاتے تھے اور لطائف وظرائف کا سلسلہ بھی چلتا تھا-

لطیفے کے معاملے میں خلیفہ صاحب کی بڑی شہرت تھی- کسی قسم کے لوگ بیٹھے ہوتے' ہر چند مشاہدۂ حق کی گفتگو جاری ہوتی' اثنائے گفتگو میں خلیفہ صاحب کو لطیفہ یاد آجاتا تو وہ بیان کیے بغیر نہ رہ سکتے- وہ اکبر بادشاہ کا دربار تھا- "رتن" بیٹھ جاتے تھے اور ہر "رتن" اپنے انداز سے بلا جھجک ہر موضوع پر بات کرتا تھا اور ایک ایک مضمون کو سو سو رنگ سے باندھا جاتا تھا-

جوں ہی خلیفہ صاحب کا دربار سجتا' سب حاضرین بے تکلفانہ انداز میں گفتگو شروع کر دیتے اور لطیفے پر لطیفہ اور شعر پر شعر چڑھا آتا اور قہقہوں کا مینہ برسنے لگتا-

مولانا حنیف ندوی اور شاہ جعفر پھلواروی سے وہ کہا کرتے تھے کہ آپ حضرات کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے' آپ کی زندگی کا بہت بڑا حصہ مسجدوں کے درس و خطابت کے ماحول میں گزرا' لیکن آپ کے ذہن کی تازگی اور فکر کی شگفتگی بحال رہی اور اس کا کوئی گوشہ بھی نہیں مرجھایا- بلکہ بعض اوقات آپ ہم سے آگے کی بات کرتے ہیں-

رفقائے ادارہ کا خلیفہ صاحب انتہائی احترام کرتے تھے- ٹھیک ایک بجے دفتر سے اٹھتے- بارہا ایسا ہوا کہ سب کو گاڑی میں بٹھایا اور ہر ایک کو اس کے گھر چھوڑ کر آئے- بالخصوص مولانا حنیف ندوی اور شاہ صاحب سے بدرجہ غایت تکریم سے پیش آتے اور عام طور پر انھیں خود گھر چھوڑ کر آتے- رفقائے ادارہ کی موجودگی میں کوئی ان سے علمی سوال کرتا تو مولانا ندوی اور شاہ صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ عالم یہ ہیں' ان سے پوچھیے' میں تو ان میں جاہل بیٹھا ہوں- یہ ان کے اظہار انکسار اور اکرام رفقا کی ایک ادائے دل نواز تھی' ورنہ اپنی ذات سے وہ گلستان علم و کمال اور گلشن شعر و ادب تھے- ان کے بعض افکار اور بیان مدعا کے بعض پہلوؤں سے اختلاف تو ہو سکتا ہے' اور اختلاف کس سے نہیں ہوتا' مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ تحقیق و کاوش کے کسی موضوع میں بند نہ تھے' ہر مسئلے سے متعلق واضح اور

مدلل بات کرتے تھے۔

ان میں بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ ادارے کے کسی چھوٹے بڑے ملازم اور رفیق کو پریشان نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔اگر کبھی کسی وجہ سے تنخواہوں کی ادائیگی میں دو چار دن یا اس سے زیادہ عرصہ تاخیر کا اندیشہ ہوتا تو اپنی گرہ سے سب کو بروقت تنخواہ دے دیتے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ کسی مالی پریشانی کا شکار ہو گئے اور کئی دن چپ چپ سے رہے۔ خلیفہ صاحب نے علیحدگی میں پوچھا کیا معاملہ ہے؟ کئی روز سے آپ کے چہرے پر پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں؟ پہلے تو بتانے سے گریز کیا' پھر اصرار بڑھا تو معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ خلیفہ صاحب نے کہا یہ بات پہلے دن ہی آپ کو بتا دینا چاہیے تھی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم سب لوگ جو یہاں کام کرتے ہیں' ایک ہی کنبے کے افراد ہیں----- پھر جتنی رقم کی انھیں ضرورت تھی' دے دی۔ فرمایا ضرورت ہر شخص کو پڑتی ہے۔اپنے ساتھیوں کی ضرورتوں کا ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔ کام یہاں کریں اور ضرورت کے وقت مانگیں کسی اور سے' یہ نامناسب بات ہے۔

جعفر شاہ صاحب پھلواروی جس زمانے میں سمن آباد میں اپنا مکان بنا رہے تھے' ایک دن دفتر آئے تو ان کے کپڑے کچھ میلے سے تھے۔اس دور کے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے سیکرٹری نے انھیں دیکھا تو قدرے سختی سے کہا یہ آپ نے دفتر کا لباس پہن رکھا ہے؟ دفتر کے کچھ آداب ہوتے ہیں' ان کی پابندی کرنی چاہیے۔

شاہ صاحب مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔اب سیکرٹری صاحب خلیفہ صاحب کے پاس گئے اور کہا کہ اپنے سکالروں کو دفتر کے آداب اور لباس پہننے کا طریقہ سکھایے۔ خلیفہ صاحب نے جواب میں کہا وہ مکان تعمیر کرا رہے ہیں' کپڑے کچھ میلے ہو گئے تو کیا ہوا؟ آپ کو اس سے کیا تعلق؟ جایے اپنا کام کیجیے۔لوگوں کے کپڑے دیکھنا اور ان کی شکایت کرنا آپ کے فرائض میں شامل نہیں۔

اس سے چند روز بعد شاہ صاحب نے ایک ہزار روپے قرض مانگا۔ خلیفہ صاحب نے سیکرٹری کے نام چٹ بھیجی کہ دفتر کی رقم سے انھیں ایک ہزار روپیہ دے دیا جائے۔ جو شخص چٹ لے کر گیا' سیکرٹری نے اس سے کہا: خلیفہ صاحب نے ان لوگوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ جاؤ ان سے کہہ دو' میں اتنی رقم دفتر کے خزانے سے نہیں دے سکتا۔

اس نے اسی طرح آ کر خلیفہ صاحب سے کہہ دیا۔ اب خلیفہ صاحب اپنی نشست سے اٹھے اور سیکرٹری کے کمرے میں گئے۔ بولے آپ نے ہزار روپے کی رقم شاہ صاحب کو کیوں نہیں دی؟

جواب دیا: میرے پاس ان کے لیے کوئی رقم وقم نہیں ہے۔

یہ الفاظ سنتے ہی خلیفہ صاحب طیش میں آ گئے۔ بولے: "جاؤ' دفتر سے نکل جاؤ"۔

سیکرٹری صاحب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ خلیفہ صاحب پھر گرجے تم نے میری بات نہیں سنی۔ میں کہتا ہوں نکل جاؤ' یہاں سے۔ یہ سکالر ہی دفتر کا اصلی سرمایہ ہیں۔ ان کے بغیر دفتر بے معنی ہے۔ دفتر کو تمھاری ضرورت نہیں' ان کی ضرورت ہے۔

پھر دو تین چپراسیوں کو بلایا اور حکم دیا کہ میرے سامنے کاغذات پر قبضہ کر لو۔ دفتر کا کوئی کاغذ یہ کمرے سے باہر نہ لے جا سکیں۔

مولانا حنیف ندوی نے بتایا' اس سے کچھ عرصہ بعد میں ٹمپل روڈ پر جا رہا تھا کہ اتفاقاً وہی سیکرٹری صاحب سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ میں چاہتا تھا' ان سے علیک سلیک کروں اور خیر و عافیت پوچھوں' لیکن وہ مجھے دیکھ کر لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھتے ہوئے دوسری طرف ہو گئے۔

کوئی شخص بلا اطلاع و اجازت دو چار روز دفتر نہ آتا تو خلیفہ صاحب یہ نہیں کہتے تھے کہ کیوں نہیں آیا' یہ کام چور ہے یا دفتر کا خیال نہیں رکھتا اور غیر حاضر رہتا ہے۔ بلکہ اس کی غیر حاضری کا معذرتی پہلو تلاش کرتے اور کسی سے کہتے کہ "فلاں آدمی اتنے دنوں سے نہیں آیا' اس کے گھر جا کر پتا کرو' بیمار نہ ہو' یا کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہو۔ بیمار ہے تو اس کا علاج کراؤ' کوئی اور مجبوری ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ پرائمری سکول کے ماسٹر کی طرح رجسٹر حاضری دیکھنے اور غیر حاضری لگانے کی انھیں عادت نہ تھی۔

لطیفے کے بارے میں خلیفہ صاحب بہت مشہور تھے' بلکہ یوں کہیے کہ مملکت لطائف و ظرائف پر ان کی حکمرانی تھی۔ اگر لطیفے کی کوئی بات آ گئی تو ناممکن تھا کہ وہ خاموش رہیں اور زبان کو صبر و ضبط کے زاویوں میں رکھ سکیں۔

ایک مرتبہ کسی موضوع پر تحقیق کے سلسلے میں ایک امریکن خاتون لاہور تشریف لائیں' ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بھی آئیں۔ دفتر کا ماحول اور ادارے کا محل وقوع دیکھ کر

بہت خوش ہوئیں- خلیفہ صاحب سے کہا:

"آپ کا دفتر کیا ہے 'جنت ہے"-

خلیفہ صاحب فوراً بولے: "اس جنت میں حور کی کمی تھی' وہ آپ نے پوری کر دی"-

ایک دن خلیفہ صاحب سے ملاقات کو ایک عالم دین تشریف لائے' اسم گرامی پوچھا تو بتایا پیر سید عبدالحکیم شاہ قادری چشتی سہروردی سند یافتہ دارالعلوم فلاں --- اور ساتھ ہی فرمایا "آپ کا نام نامی بھی تو عبدالحکیم ہے-"

خلیفہ صاحب نے جواب دیا: "جی ہاں! نام تو میرا بھی یہی ہے' لیکن اگاڑی پچھاڑی نہیں ہے-"

انھوں نے بتایا کہ آزادی وطن سے کئی سال پہلے کی بات ہے' میں لندن میں تھا- ایک مرتبہ ہندوستانیوں کا ایک جلسہ وہاں کے کسی ہال میں ہوا' مجھے بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی- ان دنوں خلیفہ قادیان مرزا محمود بھی لندن میں تھے' انھیں بھی شریک جلسہ کیا گیا تھا- حسن اتفاق یا سوے اتفاق سے میری سیٹ ان کے ساتھ تھی- اب تک نہ انھوں نے مجھے دیکھا تھا' نہ مجھے ان کو دیکھنے کا موقع ملا تھا- لیکن غائبانہ طور پر ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے- میں گیا تو وہ پہلے سے اپنی سیٹ پر تشریف فرما تھے- انھوں نے اپنا تعارف کرایا' میں نے بھی کرایا' خیر و عافیت کے مبادلے کے بعد انھوں نے مجھ سے سوال کیا: "خلیفہ صاحب آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں اور قدیم و جدید علوم و حالات پر آپ کی نظر ہے' آپ بھی نہیں مانتے کہ نبوت جاری ہے؟"

میں نے جواب دیا: "میں تو کہتا ہوں کہ نبوت جاری رہنی چاہیے- جو حالات اور علوم چودہ سو سال پہلے تھے اب اس سے بہت مختلف ہیں اور بے شمار گوشوں میں بے شمار تبدیلیاں اور ترقیاں ہوئی ہیں اور آئندہ ہوں گی- دنیا تیز رفتاری سے' کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے' اور یہ رفتار آئندہ اور تیز ہو گی- اب کوئی ایسا نبی آنا چاہیے جو موجودہ مسائل کو سمجھتا اور ان کے حل و کشود کی استعداد رکھتا ہو ----- لیکن نبی ہو' ------ نہ ہو' خلیفہ صاحب نے بات کو "لیکن" کی پٹڑی پر چڑھا کر جو کچھ کہا' افسوس ہے' وہ نوشتنی نہیں ہے- اس مجبوری کی بنا پر اس کے بجائے نقطے ڈال دیے گئے ہیں-

دراصل "لیکن" اردو زبان میں ایک جھاڑو کا نام ہے' جس سے پہلی بات کا صفایا ہو

جاتا ہے اور "مگر" کے معنی مگرمچھ کے ہیں، جو پہلی بات کو نگل جاتا ہے۔ خلیفہ صاحب نے یہاں لیکن، یا مگر انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ اس کے بعد دو گھنٹے جلسہ جاری رہا۔ اس اثنا میں نہ انھوں نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے ان سے مخاطب ہونے کی ضرورت محسوس کی۔ جلسے کے اختتام کے بعد بھی میں نے ان کو مصافحے کی زحمت نہیں دی۔ دوسرے دوستوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا۔

رفقائے ادارہ کا (جیسا کہ پہلے بتایا گیا) وہ بہت خیال رکھتے اور احترام کرتے تھے۔ جون کے آغاز سے اگست کے آخر تک انھیں اجازت تھی کہ وہ کسی ٹھنڈے پہاڑی مقام پر چلے جائیں اور وہاں جاکر تصنیفی خدمات سرانجام دیں۔ ان تین مہینوں کا دفتر کی طرف سے "ہل الاؤنس" دیا جاتا تھا، چنانچہ کوئی صاحب مری چلے جاتے، کوئی ایبٹ آباد جا قیام کرتے اور کوئی کوئٹہ کو روانہ ہو جاتے۔ رئیس احمد جعفری صاحب کو کوئٹہ کی آب و ہوا پسند تھی۔ وہ ہر سال وہاں جا ٹھکانا بناتے تھے۔ مولانا حنیف ندوی چل پھر کر میلہ دیکھنے کے عادی تھے۔ کسی سال کوئٹہ کا، کسی سال مری کا اور کسی سال ایبٹ آباد کا قصد فرماتے۔

اگر کوئی غیر مسلم مستشرق خلیفہ صاحب کے سامنے اسلام کے کسی پہلو کو محل اعتراض ٹھہراتا تو وہ جوش میں آجاتے اور اس کی بات ان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی۔ ایک مرتبہ دو برطانوی مستشرق لاہور آئے اور ادارے میں ٹیلی فون کر کے خلیفہ صاحب سے ملاقات کا وقت طے کیا۔ خلیفہ صاحب نے ان سے وقت مقرر کر کے ادارے کے ایک اہل کار سے کہا کہ مہمان آئیں تو پہلے انھیں ٹھنڈا مشروب پیش کیا جائے، اس سے تھوڑی دیر بعد گرم گرم کافی پلائی جائے۔ لیکن یہ چیزیں اس وقت لائی جائیں جب میں کہوں۔

مہمانوں کی آمد پر دونوں مشروب تیار کر لیے گئے۔ ٹھنڈا بھی اور گرم بھی---!

گفتگو شروع ہوئی تو ایک مستشرق نے اسلام کے کسی حکم پر اعتراض کر دیا۔ اب خلیفہ صاحب نے جواب دینا شروع کیا اور پورا ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کرتے رہے۔ وہ اس قدر روانی اور تیزی سے اسلام کا دفاع کر رہے تھے اور عیسائیت کے بعض پہلوؤں کو ہدف تنقید ٹھہرا رہے تھے کہ دونوں مستشرق ان کے سامنے عاجز آگئے تھے۔

اب ٹھنڈا مشروب گرم ہو گیا تھا اور گرم نے ٹھنڈک پکڑ لی تھی۔ لیکن خلیفہ صاحب

سب کچھ بھول چکے تھے اور ان کا سلسلہ تقریر ختم ہونے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔ اتنے میں دفتر کے ایک صاحب آئے اور ان کے کان میں کہا' مہمانوں کو کچھ کھلانا پلانا بھی ہے یا تقریر ہی میں الجھائے رکھنا ہے؟

یہ سن کر خلیفہ صاحب چونکے اور مہمانوں سے کہا: معاف کیجیے گا' آپ نے آتے ہی میری توجہ دوسری طرف مبذول کرا دی اور میں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔

اس کے بعد بات چیت کا رخ پلٹا اور مہمانوں کے لیے نیا سامان اکل و شرب تیار کیا گیا۔

۱۹۵۴ء میں مولانا سید محمد داؤد غزنوی پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ ان کا تعلق جناح عوامی لیگ سے تھا اور وہ حزب اختلاف میں تھے۔ اپنے نقطہ نظر سے حکومت کے جن اقدامات کو غلط سمجھتے' ان کی پورے زور سے ڈٹ کر مخالفت کرتے تھے۔ حرف اعتذار سے وہ آشنا نہ تھے۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ ان دنوں پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔ پنجاب اسمبلی میں سالانہ بجٹ پیش ہوا اور اس پر بحث ہونے لگی تو مولانا نے اس میں حصہ لیا اور تقریر میں اس کی بہت سی شقوں کو نشانہ تنقید بنایا۔ اس زمانے میں بزم اقبال کی طرف سے خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی چھوٹی سی کتاب "اقبال اور ملا" شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کی وجہ سے خلیفہ صاحب مولانا کی تنقید کی زد میں آ گئے۔ اخبارات میں اسمبلی کی کارروائی اور مولانا کی تقریر شائع ہوئی جو خلیفہ صاحب نے بھی پڑھی۔ دفتر آئے تو مولانا حنیف ندوی سے بہ اسلوب شکوہ مولانا غزنوی کی ناقدانہ تقریر کا ذکر کیا اور فرمایا' میں مولانا داؤد غزنوی کو بہت بڑا عالم سمجھتا تھا' لیکن یہ تو محض سیاسی آدمی نکلے۔

روزانہ کے معمول کے مطابق شام کے بعد ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ مولانا ندوی نے خلیفہ صاحب کی اس گفتگو کا ذکر کیا اور فرمایا' مولانا کو خلیفہ صاحب کے بارے میں وہ الفاظ نہیں کہنا چاہئیں تھے' جو انھوں نے کہے۔

مولانا حنیف ندوی ان دنوں غزالی کے فلسفیانہ پہلوؤں پر کام کر رہے تھے اور عام طور سے اس موضوع کی کتابیں مولانا داؤد غزنوی کے کتب خانے سے لیتے تھے۔ انھیں بھی غزالی سے دلچسپی تھی اور غزالی کے سلسلے کی بہت سی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں اور ان کے اکثر مقامات پر انھوں نے نشان بھی لگائے تھے اور بعض چیزیں لکھی بھی تھیں۔۔۔ مولانا ندوی نے یہ سب باتیں خلیفہ صاحب کو بتائیں اور مولانا کے علم و فضل کی فراوانیوں کا

ذکر کیا، مگر وہ نہیں مانے۔ جو بات ان کے متعلق دل میں بیٹھ گئی تھی، اس نے مضبوط جگہ بنالی تھی اور نکلنے کا نام نہ لیتی تھی۔

اس وقت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے چیئرمین مولوی محمد شفیع مرحوم تھے، تحقیق و کاوش کے حلقوں میں ان کی بڑی شہرت تھی اور بعض مسائل میں ان کی اپروچ کے ڈانڈے مستشرقین سے ملتے تھے۔ انھوں نے چند موضوعات پر گفتگو کے لیے لاہور کے بعض اہل علم حضرات کی میٹنگ بلائی۔ خلیفہ صاحب کو بھی بذریعہ ٹیلی فون دعوت شرکت دی۔ مولانا حنیف ندوی کی روایت کے مطابق خلیفہ صاحب نے مولوی محمد شفیع سے پوچھا، آپ نے اس میٹنگ میں کن کن لوگوں کو بلایا ہے؟ انھوں نے جن مدعوین کے نام لیے، ان میں مولانا داؤد غزنوی کا نام بھی تھا۔ خلیفہ صاحب نے ان کا نام سن کر کہا، آپ اپنے دفتر میں سیاسی مسائل پر بحث کرنا چاہتے ہیں؟ داؤد غزنوی سیاسی آدمی ہیں، ان کو علمی مسائل سے کیا واسطہ؟ انھوں نے جواب میں بتایا کہ وہ صاحب مطالعہ اور پڑھے لکھے بزرگ ہیں، میں انھیں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ آپ انھیں ملیں گے اور ان کی باتیں سنیں گے تو خوش ہوں گے۔

۱۹۵۵ء کے اپریل کی کوئی تاریخ تھی کہ مولوی محمد شفیع صاحب کی یہ میٹنگ ہوئی، جس میں مولانا داؤد غزنوی اور خلیفہ صاحب شامل تھے۔ اب فضل و کمال کے یہ دونوں پہلوان علمی اکھاڑے میں اترے اور پنجہ آزمائی ہوئی تو اس نتیجے پر پہنچے کہ جوڑ برابر کا ہے۔ تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا کہ میں شیش محل روڈ پر اپنے اخبار "الاعتصام" کے بڑے دروازے میں کھڑا تھا، جس کی اوپر کی منزل میں مولانا داؤد غزنوی کا مسکن اور نیچے بڑے ہال کے ایک طرف ان کا دفتر تھا۔ میں نے دیکھا کہ سیاہ رنگ کی کار دروازے کے سامنے آکر رکی، جس کی فرنٹ سیٹ پر مولانا داؤد غزنوی بیٹھے تھے۔ میں انھیں دیکھتے ہی احتراماً دروازے کی دو سیڑھیاں نیچے اترا اور سڑک کے برابر کی سطح پر کھڑا ہو گیا۔ جو صاحب کار چلا رہے تھے، وہ جلدی سے باہر نکلے، کار کے آگے سے ہوتے ہوئے دوسری طرف گئے۔ گاڑی کے بائیں جانب کا دروازہ کھولا اور نہایت تکریم کے ساتھ مولانا کو گاڑی سے اتارا۔ ان کے چہرے کی سفید رنگت پر سرخی کا غلبہ اور گٹھا ہوا معتدل جسم اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ انگریزی سوٹ پہنے ہوئے، پورا قد اور ڈاڑھی مونچھ صاف ------! دو تین منٹ کھڑے مولانا سے باتیں کرتے رہے اور پھر مصافحہ کر کے گاڑی میں بیٹھے اور سلام کر کے چلے گئے۔ میں وہیں

اپنی جگہ کھڑا رہا' ان کی باتیں نہیں سن سکا۔

مولانا دروازے کی طرف آئے تو میں نے سلام کیا۔ انھوں نے سلام کا جواب دے کر میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرے میں لے گئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ازراہ شفقت فرمایا' تشریف رکھیے---! میں بیٹھ گیا تو بولے 'معلوم ہے' یہ کون صاحب تھے؟ پھر خود ہی جواب دیا' یہ خلیفہ عبدالحکیم صاحب تھے' ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ اتنے پڑھے لکھے' اتنے باخبر اور صاحب مطالعہ شخص ہیں۔ آج مولوی محمد شفیع صاحب نے بعض مسائل سے متعلق گفتگو کے لیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے دفتر میں جو میٹنگ بلائی تھی' اس میں یہ بھی شامل تھے' انھوں نے سلجھے ہوئے اور مدلل انداز میں بہت عمدہ باتیں کیں۔ گفتگو میں یا انھوں نے حصہ لیا یا میں نے۔ دوسرے حضرات تو زیادہ تر سامعین یا مویدین ہی تھے۔

شام کو معمول کے مطابق مولانا حنیف ندوی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ مولانا کو گھر چھوڑ کر خلیفہ صاحب سیدھے دفتر آئے اور تمام رفقا کو اپنے کمرے میں بلایا۔ میٹنگ کی کارروائی سنائی اور مولانا داؤد غزنوی کی تعریف کی اور مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "آپ کی بات صحیح ہے۔ مولانا غزنوی واقعی صاحب نظر عالم ہیں اور ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے"۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے خلیفہ صاحب کو دیکھا---- اس کے بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ میں کئی مرتبہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کی باتیں سننے اور اپنی سنانے کا اتفاق ہوا۔

اس سے چند روز بعد مولانا حنیف ندوی سے ایک مضمون لینے کے لیے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ گیا۔ وہ چائے کا وقت تھا اور فیلو حضرات خلیفہ صاحب کے کمرے میں جا رہے تھے۔ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ مولانا نے میرا ان سے تعارف کرایا' پھر شاہ صاحب پھلواروی نے میرے بارے میں کچھ الفاظ کہے۔ میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔

اس کے بعد خلیفہ صاحب نے الاعتصام کا ذکر کیا اور اس دور میں جن خطوط پر وہ چل رہا تھا' اس کی تعریف کی۔ یہ ان کی مہربانی تھی کہ اس عاجز کی حوصلہ افزائی کی۔

مولانا عبدالواحد غزنوی کا ذکر بھی کیا اور فرمایا جس زمانے میں وہ چینیاں والی مسجد میں

درس و خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے' اس زمانے میں ہم اسی علاقے میں رہتے تھے اور مولانا کی اقتدا میں نمازیں پڑھتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ اپنے دور کے ولی اللہ تھے۔ بارگاہِ الٰہی میں ان کی دعاؤں کو شرف قبول حاصل ہوتا تھا۔

مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں فرمایا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ایک میٹنگ میں پتا چلا کہ وہ وسیع المطالعہ اور عالی ظرف عالم ہیں۔ حدیث و فقہ کے بارے میں بعض چیزیں ان سے سمجھنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ گھنٹہ پون گھنٹہ نشست رہی اور پھر سب حضرات اپنے اپنے کمروں میں جاکر کام میں مصروف ہو گئے۔ میں نے مولانا حنیف ندوی سے مضمون لیا اور واپس آ گیا۔

اس سے کچھ دن بعد پھر ادارہ ثقافت اسلامیہ گیا۔ یہ سردیوں کا موسم تھا۔ دفتر کے لان میں مجلس جمی ہوئی تھی اور ایک چھتر تنا ہوا تھا۔ خلیفہ صاحب نہایت شفقت سے ملے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ مجھے بھی چائے کی پیالی اور ایک بسکٹ دیا گیا۔ معلوم نہیں پہلے کیا باتیں ہو رہی تھیں' میرے جانے پر علمائے اہلِ حدیث کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا: مولانا ابراہیم سیالکوٹی اور مولانا ثناء اللہ امرتسری دونوں جلیل القدر عالم تھے' لیکن مولانا ثناء اللہ صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ بہت بڑے مناظر اور حاضر جواب تھے اور عربی' فارسی اور اردو کے بے شمار شعر انھیں یاد تھے' جو وہ تقریر و مناظرہ میں برمحل پڑھتے تھے۔

اب خلیفہ صاحب سے مولانا حنیف ندوی نے بات پکڑی اور انھوں نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے چند مناظرانہ لطائف بیان کیے' جنھیں سن کر خلیفہ صاحب محظوظ ہوئے اور کہا مناظرہ ایک ایسا فن ہے جس کا تعلق محض علم سے نہیں' حاضر جوابی سے بھی ہے۔ مناظر کے لیے حاضر جواب ہونا اور حریف کا ہر وار خوش دلی سے سہہ جانا اور پھر اس پر جوابی حملہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ بعض دفعہ کم علم شخص محض حاضر جوابی اور حاضر دماغی سے بہت بڑے عالم کو شکست دے دیتا ہے۔

مناظرانہ لطائف بیانی کی اس گفتگو میں میرا بھی حصہ لینے کو جی چاہا اور میں نے دو لطیفے سنائے۔

ایک مرتبہ مشرقی پنجاب کے شہر لدھیانہ میں حیات مسیح اور ممات مسیح پر مسلمانوں

اور مرزائیوں کے درمیان مناظرہ ہوا- ثالث ایک پڑھے لکھے سکھ کو بنایا گیا- مسلمان مناظر نے دلائل دینا شروع کیے کہ حضرت مسیح زندہ ہیں اور چوتھے آسمان پر ہیں- مرزائی مناظر اس کے خلاف یہ ثابت کرنے لگا کہ حضرت مسیح وفات پاگئے ہیں اور کشمیر میں مدفون ہیں- تین گھنٹے مناظرہ ہوتا رہا اور دونوں فریق اپنے اپنے موقف کے ثبوت میں دلائل دیتے رہے- آخر میں دونوں طرف کے مناظروں نے سکھ سے جو ثالث کے فرائض انجام دے رہا تھا' کہا سردار جی! ہماری باتیں ختم ہوئیں- اب آپ فیصلہ فرمایئے کہ ہمارے پیش کردہ دلائل کی روشنی میں آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں- سردار جی کھڑے ہوئے- حاضرین مجلس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا-

بھائیو! میں نے دونوں صاحبوں کی باتیں اچھی طرح کان لگا کر سنیں- مجھے ان کی باتوں سے پتا چلا کہ حضرت مسیح انسان تھے' اور انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے- ایک صاحب نے بہت سی کتابوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت مسیح زندہ ہیں اور چوتھے آسمان پر چلے گئے ہیں- دوسرے صاحب نے کئی کتابیں پڑھ کر بتایا ہے کہ وہ چوتھے آسمان پر نہیں ہیں' بلکہ فوت ہوگئے ہیں اور کشمیر کے ایک پہاڑی مقام میں دفن کر دیے گئے ہیں اور وہاں ان کی قبر موجود ہے- دونوں صاحبان "دین سلام" کی کتابیں پڑھ پڑھ کر یہی کچھ کہتے رہے ہیں- ایک نے حضرت مسیح کو چوتھے آسمان سے پکڑا اور قبر میں لے آیا- دوسرے نے قبر کی گہرائی سے نکالا اور چوتھے آسمان کی بلندی پر لے گیا- یہ کام بار بار کیا گیا ہے- میں ان کی باتیں سن کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر وہ زندہ بھی تھے' تو ان تین گھنٹوں میں ضرور مر گئے ہیں- کوئی انسان اگرچہ کتنا ہی تگڑا ہو' اتنی کھینچا تانی برداشت نہیں کر سکتا-

دوسرا لطیفہ پادری عبدالحق کے بارے میں ہے-

پادری عبدالحق بہت بڑے عیسائی مناظر تھے- منطق اور فلسفے میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور مناظرے میں اتنی منطقیانہ اور فلسفیانہ اصطلاحیں استعمال کرتے تھے کہ ان علوم کے بڑے بڑے عالم ان کے مقابلے میں بعض اوقات پریشان ہو جاتے تھے- ساتھ ہی بڑے چرب زبان اور لسان تھے- آزادی سے کئی سال بعد یوپی کے شہر آگرہ میں فوت ہوئے- گوجرانوالہ میں مولانا حافظ محمد گوندلوی' مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور بعض دیگر اہل علم سے ان کے مناظروں کا سلسلہ جاری رہا-

گوجرانوالہ کو ہمیشہ ایک مذہبی شہر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس میں مختلف مذہبی فرقوں اور جماعتوں کے اصحاب علم کے مناظرے ہوتے رہے ہیں۔ پادری عبدالحق سے بھی متعدد حضرات نے مناظرے کیے۔ ایک مناظرہ مولانا ابراہیم سیالکوٹی اور پادری عبدالحق کے درمیان ہوا۔ مولانا سیالکوٹی بلاشبہ جلیل القدر عالم تھے' لیکن ان کی طبیعت میں جلال کا غلبہ تھا اور حریف پر جلد ہی خفگی کا اظہار کرنے لگتے تھے۔ یہ بات مناظرانہ اصول کے خلاف ہے۔ اس سے پادری صاحب نے فائدہ اٹھایا اور مولانا پر چڑھتے چلے گئے۔ مناظرہ توحید اور تثلیث کے موضوع پر ہو رہا تھا۔ پادری صاحب نے کہنا شروع کیا کہ منطق کی رو سے توحید کلی ہے یا جزی۔ اگر کلی ہے تو کون سی کلی ہے اور اس کلی میں کہیں جزی بھی آتی ہے یا نہیں؟ اگر آتی ہے تو کس صورت میں؟

گوجرانوالہ کے ایک عالم و مقرر مولانا نور حسین گرجاکھی سٹیج پر موجود تھے۔ وہ بہت اچھے مناظر تھے اور طبیعت کے ٹھنڈے تھے۔ انھوں نے مولانا ابراہیم صاحب سے کہا کہ حضرت آپ تشریف رکھیں' چند منٹ کے لیے مجھے پادری صاحب سے بات کرنے دیں۔ پہلے تو مولانا سیالکوٹی نے ان کو اپنے خاص لہجے میں ڈانٹ پلائی' لیکن جب اصرار بڑھا تو انھیں تقریر کا موقع دیا گیا۔ مولانا نور حسین گرجاکھی نے اٹھتے ہی فرمایا:

پادری صاحب! میرے ساتھ بات کریں۔ میں ابھی آپ کی کلیاں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنادوں گا۔۔۔"

یہ الفاظ سنتے ہی جو عیسائی وہاں موجود تھے' گھبرا اٹھے اور پادری صاحب سے کہنے لگے۔ "خدا کے لیے مناظرہ بند کرو۔ آپ چلے جائیں گے' ہمیں تو یہیں رہنا ہے۔ مسلمان ہم غریب عیسائیوں کی کلیاں جلادیں گے' تو ہم کہاں جائیں گے۔ ہم بال بچوں والے ہیں اور چھوٹی چھوٹی کلیوں میں گزارا کرتے ہیں۔ یہ جل گئیں تو ہم کہیں سر نہیں چھپا سکیں گے"۔

پادری صاحب نے ہر چند عیسائیوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ منطق کی کلی اور ہوتی ہے' رہائش کی کلی اور ہوتی ہے۔ منطق کی کلی کا رہائش کی کلی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن مولانا نور حسین کا تیر چل چکا تھا اور اثر دکھا رہا تھا۔ اللہ اکبر کے نعرے بلند ہونے لگے۔ پادری عبدالحق اپنے تمام منطقی علم و فن کے باوجود ہار گئے اور مولانا نور حسین نے محض حاضر جوابی سے پانچ منٹ میں میدان مار لیا۔

مناظروں کا ایک دور تھا اور عجیب دور تھا۔ یہ سلسلہ ہمارے ہاں دراصل اس وقت شروع ہوا تھا جب انگریز ہندوستان میں آئے اور اپنے ساتھ مشنری پادریوں کو بھی لائے جن کا کام برصغیر کے مختلف مذاہب کے بعض پہلوؤں کی تردید کرنا اور اس کے مقابلے میں عیسائیت کی اچھائیاں بیان کرنا تھا۔ اسلام کو وہ بالخصوص نشانہ تنقید بناتے تھے' کیوں کہ اس ملک کی حکومت مسلمانوں ہی سے چھینی گئی تھی اور انھیں مذہبی اور سیاسی اعتبار سے بدنام کرنا مقصود تھا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو کئی قسم کے لالچ دے کر انھوں نے عیسائی بنانے کی مہم شروع کر رکھی تھی' چنانچہ مختلف اوقات میں بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے عیسائیت قبول کی اور اس کی تبلیغ کے لیے کوشاں ہوئے اور پادری کہلائے۔ مثلاً پادری برکت علی' پادری عبدالحق' پادری رام چند اور پادری ہردیال وغیرہ۔ سکھوں کا کردار اس ضمن میں کچھ بہتر رہا۔ ان میں سے بجز چند ایک کے کوئی سکھ پادری یا عیسائیت کا مبلغ نہیں ہوا' چنانچہ آپ کو پادری رام سنگھ یا پادری دیال سنگھ وغیرہ نام بہت کم دکھائی دیں گے۔

مشنری پادریوں سے باقاعدہ مناظرے اور مباحثے کرنے والے اہل علم میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی' مولانا محمد قاسم نانوتوی' سید آل حسن موہانی' مولانا رحمت اللہ کیرانوی' سید امیر حسن سہسوانی' مولانا محمد بشیر سہسوانی وغیرہ بے شمار بزرگوں کے اسمائے گرامی کتب تاریخ میں مرقوم ہیں۔ بعد ازاں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور بعض دیگر علمائے کرام نے اس میدان میں بہت شہرت پائی۔ رحمهم الله تعالیٰ۔

عیسائی پادریوں کے بعد آریہ سماجیوں' دیو سماجیوں' سناتن دھرمیوں اور مرزائیوں سے مناظرات کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ پھر مختلف فقہی مسالک کے حاملین کے آپس میں مناظرے ہوتے رہے۔

مجھے چند مناظرے سننے اور دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ دونوں فریق اپنے اپنے صدر مقرر کر کے ایک دوسرے کے بالمقابل میز کرسیاں رکھ کر بیٹھ جاتے' حوالے کی کتابوں کے ڈھیر لگا لیے جاتے اور کچھ لوگ مناظر کو تیزی سے حوالے نکال کر دیتے جاتے۔ مدعی مناظر تقریر کا آغاز کرتا اور دعوے کی تفصیل بیان کرنے کے لیے اسے عام طور پر دس منٹ وقت دیا جاتا۔ بعد میں جواب دعویٰ پیش کرنے والے کو بھی دس منٹ دیے جاتے۔ اس کے بعد دونوں مناظر پانچ پانچ منٹ میں سوال و جواب کا سلسلہ آگے بڑھاتے۔ ثالث کسی ایسے پڑھے

لکھے شخص کو بنایا جاتا جس کا فریقین کے مذہب سے تعلق نہ ہوتا اور وہ غیر جانب دار ثالث کہلاتا۔ بعض دفعہ مناظرہ دو تین گھنٹوں یا اس سے بھی کم وقت میں ختم ہو جاتا اور بعض اوقات کئی کئی دن چلتا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری غالباً تنہا مناظر تھے جو شرائط مناظرہ طے کرنے کے عادی نہ تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے ' اصل چیز کلمہ حق دوسروں تک پہنچانا ہے۔ اس میں کوئی پیشگی شرط عائد کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو شخص، جب چاہے ' جہاں چاہے اور جس موضوع پر چاہے ' مناظرہ کر لے۔

یہ ایک دلچسپ موضوع ہے۔ کسی صاحب کو تھوڑی بہت محنت کر کے مناظرین کی فہرست تیار کرنی چاہیے اور مناظروں کے لطیفے اور ان کی حاضر جوابی و حاضر دماغی کے واقعات معرض تحریر میں لانے چاہئیں میرے خیال میں یہ بھی اسلام کی خدمت کا ایک پہلو ہے۔ آج کل بھی بعض دانش ور حضرات جو خیر سے مسلم معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں اسلامی احکام و اوامر پر قریب قریب اسی قسم کے اعتراضات کرتے ہیں ' جس قسم کے غیر مسلم کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ مناظرانہ لطائف کے ہلکے پھلکے انداز میں اسلام کے خلاف کیے جانے والے بہت سے اعتراضات کے مسکت جواب آ جاتے ہیں۔

بات خلیفہ صاحب اور ان کی مجلس کے بارے میں ہو رہی تھی۔ معذرت خواہ ہوں قلم نے جبر کا مظاہرہ کیا اور موضوع سے باہر قدم بڑھا دیا --- اب پھر اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

خلیفہ صاحب جہاں متعدد اصناف علم کا خزینہ تھے ' وہاں لطیفہ بازی کا بھی گنجینہ تھے۔ لطیفے باز کو جب لطیفہ یاد آ جائے تو اگرچہ کیسی مجلس ہو اور کسی قسم کے لوگ بیٹھے ہوں ' لطیفہ سنائے بغیر چین نہیں آتا۔ کسی کا مسلک لطیفے کی زد میں آتا ہو ' کسی کی ذات اس کی لپیٹ میں آتی ہو ' کسی کے علم پر چوٹ پڑتی ہو ' کسی کی شرافت اس کا نشانہ بنتی ہو ' لطیفے باز کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ لطیفہ سنانا اس کا معمول ہو جاتا ہے اور روا روی میں سناتا چلا جاتا ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) میں خلیفہ صاحب شعبہ فلسفہ کے صدر تھے۔ سنا ہے ایک صاحب اس زمانے میں وہاں ڈاکٹر عبدالحق تھے جو شعبہ عربی کے صدر تھے۔ ایک پرانے حیدر آبادی نے ایک مرتبہ بتایا کہ لطیفہ بازی میں وہ بھی بہت مشہور اور تیز تھے۔

دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور دونوں اپنے اپنے موضوع میں یگانہ روزگار تھے اور دونوں میں خوب مبادلہ لطائف ہوتا تھا۔ جوڑ برابر کا تھا۔

خلیفہ صاحب کا چہرہ سرخ و سفید تھا اور ڈاکٹر عبدالحق کا رنگ اس کے برعکس سیاہ کالا۔ جب دونوں یونیورسٹی کلب میں اکٹھے ہو جاتے تو ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر بات کرتے اور لطیفوں کے ڈھیر لگا دیتے۔ دونوں کی رنگت کی بنا پر کلب کے لوگ اس مجموعے کو ''بلیک اینڈ وائٹ'' کہا کرتے تھے۔

ایک دن خلیفہ صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ جامعہ عثمانیہ کے بعض اساتذہ کو نظام حیدر آباد عثمان علی خاں نے ملاقات کے لیے بلایا' میں بھی ان میں شامل تھا۔ ملاقات کے وقت نظام کی خدمت میں نذرانہ پیش کرنا ضروری تھا جو کم سے کم ایک اشرفی تھا۔ والیان ریاست کو اپنی اپنی ریاست کے مالک کی حیثیت تھی۔ مجھے نظام سے ملاقات کے باقاعدہ آداب سکھائے اور سمجھائے گئے۔ نظام تک پہنچنے کے لیے کئی دروازوں سے گزرنا پڑتا تھا اور ہر دروازے پر جھکنا ضروری تھا' لیکن اس انداز میں کہ پہلے دروازے پر کم' دوسرے پر اس سے زیادہ' تیسرے پر اس سے زیادہ' اور آخری دروازے پر جس سے آگے نظام تشریف فرما تھے' گردن رکوع کے قریب جھکانا پڑتی تھی۔ پھر اسی طرح جھکی ہوئی گردن کے ساتھ نذرانہ پیش کیا جاتا اور اسی انداز میں پیچھے کو ہٹتے ہوئے ایک طرف ہوا جاتا تھا۔ میں اسی طرح گیا اور ایک اشرفی نذر کرتے ہوئے دل میں کہا: (یہاں انھوں نے ایک بڑی سی گالی دی) کہ لے' یہ پہلی اور آخری اشرفی ہے جو اپنی فطرت اور ضمیر کے خلاف تمھیں دے رہا ہوں۔

خلیفہ صاحب کسی سے مرعوب ہونے اور دب کر بات کرنے کے عادی نہ تھے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو برابر کی سطح پر لا کر بات کرتے تھے۔ اگر کسی چھوٹے سے کچھ کہنا ہوتا تو نہایت شفقت آمیز لہجہ اختیار کرتے۔ رفقائے ادارہ کی موجودگی میں کوئی باہر سے آنے والا اہل علم ان سے گفتگو شروع کرتا تو سب رفقائے ادارہ کو اس میں شریک فرماتے اور ہر ایک کو بات چیت کا موقع دیتے۔

ادارے کے ہر ملازم سے مشفقانہ برتاؤ کرتے' کسی سے کوئی غلطی ہو جاتی تو نظر انداز کر دیتے۔ ایک مرتبہ دفتر کے ایک چھوٹے ملازم نے گھر میں جلانے کے لیے دفتر کے ایک درخت سے کچھ ایندھن کاٹ لیا۔ ایک شخص نے خلیفہ صاحب سے اس کی شکایت کی تو

بولے:

بھائی! اس غریب نے ایندھن کاٹ لیا تو کیا ہوا- دفتر کے لوگوں نے اپنی ضروریات دفتر ہی سے پوری کرنی ہیں- شکایت کی بات توجب ہوتی کہ یہ کسی کی چوری کرتا- اس نے اپنے گھر کی چیز گھر ہی میں رکھی ہے- سوچنا چاہیے کہ تھوڑی سی تنخواہ سے ایک ملازم کیا کچھ خرید سکتا ہے- اگر کوئی چیز آسانی سے دفتر سے میسر آسکتی ہے تو اسے حاصل کر لینا اچھی بات ہے-

وہ بہت اچھے مقرر اور بہت بڑے مصنف تھے- جس روانی سے پنجابی اور اردو میں بات کرتے' اسی روانی سے فارسی' انگریزی' فرنچ اور جرمن زبانوں میں گفتگو کرتے تھے- عربی انھوں نے قیام حیدر آباد کے زمانے میں یونیورسٹی کے ایک پروفیسر مولانا مامون سے پڑھی تھی اور اس میں کافی استعداد پیدا کر لی تھی- عربی ماخذ پر ان کی نظر تھی- عربی پڑھتے اور اس کا مطلب سمجھتے تھے-

جس موضوع سے متعلق کچھ لکھنا ہوتا' پہلے اس موضوع کی کتابیں پڑھتے اور مطالب ذہن نشین کر لیتے- پھر لکھتے چلے جاتے- جگہ جگہ کتاب کا حوالہ دینے کے عادی نہ تھے- جہاں ضروری سمجھتے اثنائے تحریر میں کتاب یا مصنف کا حوالہ دے دیتے- کتاب کا صفحہ' جلد' مقام طباعت اور سال اشاعت وغیرہ لکھنے کی انھیں عادت نہ تھی- ان کی تحریر میں کانٹ چھانٹ بھی نہیں ہوتی تھی-

حیدر آباد کے حلقہ اہل علم میں ان کو عزت واحترام کا مقام حاصل تھا- جامعہ عثمانیہ کے ہر شعبے کے اساتذہ ان کی تکریم کرتے تھے-

ان کی ذات میں اللہ نے بہت سی خوبیاں جمع کر دی تھیں- وہ ذہین وفطین اہل علم تھے- شعر وشاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے اور فارسی اور اردو شعرا کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے- دوران گفتگو میں برمحل اور برموقع شعر پڑھتے تھے- مختلف زبانوں کے محاوروں پر انھیں عبور حاصل تھا- اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے-

ایک مرتبہ ڈھاکہ میں فلسفہ کانگرس کا اجلاس منعقد ہو رہا تھا- اس میں مولانا محمد حنیف ندوی کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی- کسی وجہ سے خلیفہ صاحب اس میں شریک نہیں ہو رہے تھے حالاں کہ وہ بھی اس میں مدعو تھے- مولانا ندوی کو کانگرس کی طرف سے جب ہوائی

جہاز کا ٹکٹ ملا' اس وقت خلیفہ صاحب کا دربار لگا ہوا تھا- خلیفہ صاحب نے ٹکٹ دیکھ کر کہا: "ہرچہ برباد است' برباد است"----- خلیفہ صاحب کی زبان سے فارسی کا یہ محاورہ سنتے ہی مولانا حنیف ندوی کا رنگ بدل گیا اور جس جہاز میں انھیں سفر کرنا تھا' وہ ان کے عالم تصور میں فضا میں ہچکولے کھانے لگا-

شام کو حسب معمول ان سے ایک ہوٹل میں ملاقات ہوئی تو چہرے پر پریشانی کے آثار جھلک رہے تھے-

عرض کیا: "خیر تو ہے آج آپ افسردہ سے ہیں؟"

فرمایا: "کیا بتاؤں صبح سے بہت پریشان ہوں"-

پوچھا: "ایسی کون سی بات ہے' جس نے آپ کو صبح سے پریشان کر رکھا ہے اور چہرے سے شگفتگی اور لبوں سے مسکراہٹ چھین لی ہے؟"

سچی بات ہے' انھیں افسردہ دیکھ کر میں خود افسردہ ہو گیا- افسردہ دل' افسردہ کند انجمنے را--- میں نے فکر میں ڈوبے ہوئے' ہمدردانہ لہجے میں پوچھا: "اتنی پریشانی کی آخر کیا وجہ ہے؟"

نہایت سنجیدہ اور معصوم سی شکل بنا کر نرم آواز میں بتایا کہ آج ڈھاکے کے لیے میرا ہوائی جہاز کا ٹکٹ آیا تو اسے دیکھ کر خلیفہ صاحب نے کہا: "ہرچہ برباد است' برباد است"- اس وقت سے سخت پریشان ہوں' سوچتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہوائی جہاز میں بیٹھوں اور وہ گر کر پاش پاش ہو جائے-

پریشانی کی یہ وجہ سن کر میں نے کہا: آپ نے جو اتنا بڑا پہاڑ کھودا ہے' اس سے تو چھوٹی سے چھوٹی چوہیا بھی نہیں نکلی- لے دے کر چند لفظوں کا ایک محاورہ نکلا ہے جس کو آپ کے فہم نے اتنا بڑا بوجھ قرار دے لیا ہے کہ اس کے نیچے پڑا کراہ رہا ہے- یہ فرمایے کہ خلیفہ صاحب کے بولے ہوئے فارسی محاورے میں اتنی طاقت ہے کہ وہ فضا میں اڑتے ہوئے ہوائی جہاز کو زمین پر پھینک دے اور اسے تباہ کر دے؟ خدا کے لیے اسے ذہن سے نکال لیے' اطمینان سے جہاز پر بیٹھیے اور ڈھاکے جا کر فلسفہ کانگرس میں شرکت فرمایئے اور مقالہ پڑھیے-

بولے: "خلیفہ صاحب نے کچھ ایسے انداز میں یہ الفاظ کہے تھے کہ ہزار کوشش کے باوجود ذہن سے نہیں نکلتے- جی چاہتا ہے ٹکٹ واپس کر دوں اور ڈھاکے نہ جاؤں' لیکن پھر

خیال آتا ہے' خلیفہ صاحب اور دوسرے حضرات مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے چند لفظوں سے ڈر کر گھر میں بیٹھ گیا ہوں"۔

تیسرے دن ہوائی اڈے پر پہنچے تو پھر وہی حال ہے اور وہی محاورہ ذہن میں گھوم رہا ہے۔ عرض کیا: آپ تسلی رکھیں۔ اتنے لوگ جو یہاں آئے ہیں اور ہوائی جہازوں سے مختلف مقامات کا سفر کرنا چاہتے ہیں' ان میں سے کسی کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ دور دور تک دکھائی نہیں دیتی' کسی کو تو اس محاورے کا علم ہوگا ہی۔

یہ مولانا حنیف ندوی کا وہ فضائی سفر تھا جو خلیفہ صاحب کے محاورے سے ان کے لیے انتہائی پریشانی کا باعث بنا۔

مولانا کے ساتھ گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے ایک پروفیسر بھی فلسفہ کانگریس میں شرکت کے لیے اسی جہاز سے ڈھاکے جا رہے تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ ان کو الوداع کہنے لاہور آئی تھیں اور ہوائی اڈے پر موجود تھیں۔ وہ رخصت ہونے لگے تو بیوی نے کہا' ڈھاکے پہنچ کر خیریت کا تار دے دینا تاکہ ہمیں اطمینان ہو جائے۔

پروفیسر صاحب نے کہا: مجھے تار دینے اور آپ کو اس کا انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کو جہاز اڑنے والا ہے۔ گھر جا کر ریڈیو سے خبریں سننا شروع کر دو۔ اگر اس جہاز کی کوئی خبر ریڈیو سے نشر نہ ہوئی تو سمجھ لینا خیریت سے ڈھاکے پہنچ گئے ہیں۔

ایک دن خلیفہ صاحب رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور ان کتابوں کے متعلق بتا رہے تھے جو اس دلاویز اور روح پرور موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ سلسلہ کلام میں سر سید احمد خاں مرحوم اور ان کی کتاب "خطبات احمدیہ" کا ذکر آ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۸۶۹ء میں سر سید لندن میں تھے' وہاں "لائف آف محمد" ان کے مطالعے میں آئی جو یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر سر ولیم میور نے لکھی تھی۔ اسلام اور آنحضرت ﷺ کے متعلق اس کتاب کے بعض مقامات میں نہایت گستاخانہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ سر سید اس کتاب کو پڑھ کر بدرجہ غایت کبیدہ خاطر ہوئے اور سرور کائنات کے بارے میں ان کے جذبات محبت کو بے حد ٹھیس پہنچی۔ اس کے جواب میں انھوں نے قیام لندن ہی کے دور میں "خطبات احمدیہ" لکھنا شروع کی۔ کتاب کی تکمیل کے بعد اس کو چھاپنے کا مسئلہ بڑا اہم تھا

اور سر سید کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ آسانی سے کتابت و طباعت کے مراحل سے گزار سکتے۔ انھوں نے لندن سے نواب محسن الملک کو خط لکھا کہ ولیم میور کی لائف آف محمد کا جواب ضرور دیا جائے گا اور میں یہ کتاب ہر حال میں شائع کروں گا' اگرچہ مجھے اپنے گھر کی ہر چیز فروخت کر دینی پڑے' اور میں دنیا میں اس کے نتیجے میں فقیر ہو کر بھیک مانگنے لگوں۔ قیامت میں تو اللہ کے حضور میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو حاضر کرو جو اپنے نانا حضرت محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا۔

خلیفہ صاحب یہ واقعہ سنا کر رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔ کہا رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کے متعلق جس کے دل میں یہ جذبات پیدا ہو جائیں' امید رکھنی چاہیے کہ قیامت کے دن رسول اکرم ﷺ اس کی سفارش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ضرور اس کی مغفرت فرمائے گا۔

خلیفہ صاحب صاف ذہن اور صاف دل کے آدمی تھے۔ ان کے خیالات و افکار واضح تھے۔ ان میں کوئی الجھاؤ' کوئی پیچیدگی اور کوئی گنجلک نہ تھی۔ ان کی زبان ان کے دل کی ترجمان تھی' ان کا کلام ان کے فکر کا آئینہ دار تھا' ان کی تحریر ان کے تصورات کی عکاس تھی۔ وہ خود بھی صاف اور واضح بات کرتے تھے' دوسرے سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ اینچ پینچ کے لغت سے وہ آشنا نہ تھے۔ جس سے جو بات کی' دوٹوک کی۔ اس سے کون کیا اثر لیتا ہے' اس کی انھیں پروانہ تھی۔ کوئی اپنی جگہ چھوٹا ہو یا بڑا' ان کے نزدیک سب برابر تھے اور سب سے کھل کر بات کرتے تھے۔ اپنے آپ کو چھپانا اور دوسرے کے حلق سے اپنے مطلب کی بات اگلوانے کی کوشش کرنا ان کا شیوا نہ تھا۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک مرتبہ بتایا کہ خلیفہ صاحب اچھی سے اچھی چیز دوسروں کو بلا تامل دے دیتے تھے' لیکن کسی کو سگریٹ پیش نہیں کرتے تھے' نہ کسی سے سگریٹ لیتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ قینچی کا سگریٹ پیتے تھے اور ذہن میں یہ بات رہتی کہ شاید دوسرا شخص ان کا برانڈ پسند نہ کرے' اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو پیتا ہے' وہ اپنی پسند اور برانڈ کا پیے۔ اپنے آپ کو اور دوسرے کو تکلف میں مبتلا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ کبھی آزردہ خاطر اور مایوس یا پریشان نہیں ہوتے تھے۔ ان کا اصل موضوع فلسفہ تھا اور وہ اپنے عہد کے بہت بڑے فلسفی تھے۔ ان کے بارے میں فلسفیانہ اصطلاح میں بات کی

جائے تو کہنا چاہیے کہ وہ رجائی (OPTIMISTIC) تھے۔ قنوطی (PESSIMISTIC) نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں ذہن سے رجاو امید کا رشتہ قائم رکھتے تھے۔ قنوط اور ناامیدی کے لیے ان کے حریم قلب اور احاطہ فکر کے دروازے بند تھے۔ ذہن کو مایوسی کے حوالے کر دینا' دل پر قنوطیت قفل چڑھا لینا ان کے نزدیک تقاضائے ہوش مندی نہ تھا۔ اسی بنا پر وہ ہر شخص سے بہتری اور خیر کا برتاؤ کرتے تھے اور دوسرے سے بھی یہی امید رکھتے تھے۔ جب تک اپنے عمل و کردار سے انھیں کوئی مایوس نہ کر دے وہ اس کے بارے میں اظہار یاس نہ کرتے تھے۔

مولانا محمد حنیف ندوی نے جو خود بھی فلسفی تھے اور فلسفے میں خلیفہ صاحب کے مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے تھے' ایک مرتبہ خلیفہ صاحب کے بارے میں ایک بڑی گہری بات بتائی۔ انھوں نے کہا کہ خلیفہ صاحب عام طور سے فلسفے کے رجائی اور قنوطی دونوں نقطہ ہائے نظر کا موازنہ کرتے اور فرماتے کہ جہاں تک کسی سے دھوکا کھانے اور نقصان اٹھانے کا تعلق ہے' اس میں کوئی امتیاز نہیں۔ نہ رجائی کی رجاپسندی اس کو دھوکے اور فریب سے بچا سکتی ہے' نہ قنوطی کی قنوط پسندی اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتی ہے' لیکن مایوسی سے پہلے مایوس ہو جانا قرین خرد مندی نہیں۔ کوشش کرنی چاہیے کہ ذہن و فکر کی سرحدوں سے رجاو امید کا تعلق قائم رہے۔ نہ اسے توڑا جائے اور نہ قبل از وقت اس سے پریشانی میں مبتلا ہوا جائے۔

مولانا حنیف ندوی نے یہ بات سنا کر کہا کہ در حقیقت خلیفہ صاحب کی رجائیت پسندی کسی فلسفیانہ نقطہ نظر کی آئینہ دار نہیں تھی' بلکہ ان کی فطرت و طینت ہی رجائیت پسندی کے سانچے میں ڈھلی تھی اور ان کا مزاج ہی ایسا تھا کہ اگر کسی سے مایوس ہونا بھی چاہیں تو آسانی سے نہیں ہو سکتے تھے۔

خلیفہ صاحب لاہور کے ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا کشمیر کی سکونت ترک کر کے لاہور آئے تھے اور مسجد چینیاں والی کے قریب اقامت گزیں ہو گئے تھے جو لاہور میں اہل حدیث کی مشہور اور قدیم مسجد ہے۔ خلیفہ صاحب کے دادا اور والد اس مسجد کے نمازیوں میں سے تھے۔

اسی علاقے میں جولائی ۱۸۹۴ء کو خلیفہ صاحب پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خلیفہ عبدالرحمٰن تھا اور وہ پشمینے کا کاروبار کرتے تھے۔

خلیفہ عبدالحکیم ابتدا ہی سے ذہین اور مطالعہ کتب کے شائق تھے۔ تعلیم کا آغاز شیرانوالہ دروازے کے اسلامیہ ہائی سکول سے کیا۔ عمر کے بارھویں برس میں داخل ہوئے تھے کہ والد انتقال کر گئے۔ ۱۹۱۱ء میں اسی سکول میں میٹرک پاس کیا۔ اسی سال علی گڑھ گئے اور ایف اے میں داخل ہوئے۔ طالب علمی کے دور آغاز ہی میں انھوں نے تقریر کے میدان میں شہرت حاصل کر لی تھی۔ ایف اے کے پہلے سال میں تھے کہ علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ او کالج کے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لیا جس میں بی۔ اے کے طالب علم بھی شامل تھے۔ اس مقابلے میں پہلا انعام خلیفہ صاحب کو ملا۔

ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۱۳ء میں دلی گئے اور وہاں کے سینٹ سٹیفن کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۵ء میں اس کالج میں بی۔ اے اور ۱۹۱۷ء میں یہیں فلسفے میں ایم۔ اے کا امتحان دیا اور اول درجے میں رہے۔ امتحان میں انھوں نے رومی کے فلسفے سے متعلق مقالہ لکھا تھا جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ دلی کے سینٹ سٹیفن کالج میں ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد لاہور آ گئے اور لا کالج میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۹ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی، مگر وکالت کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔ اس زمانے میں لاہور سے ایک انگریزی اخبار "پنجاب آبزرور" شائع ہوتا تھا، اس کے عملہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ چند مہینے اس اخبار میں کام کیا۔

اگست ۱۹۱۹ء میں حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ وہ فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے اس یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور پھر زندگی کا بہت بڑا حصہ یہیں گزارا۔

قیام حیدر آباد کے زمانے میں ۱۹۲۲ء میں یورپ گئے۔ یہ ان کا پہلا سفر یورپ تھا۔ وہاں جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ اس یونیورسٹی میں "میٹافزکس آف رومی" کے عنوان سے تحقیقی مقالہ پیش کیا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ مولانا روم کے فلسفے پر یہ ایک بہترین کتاب ہے جو ۱۹۳۳ء میں پہلی دفعہ لاہور سے شائع ہوئی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے سلسلے میں وہ تین سال ہائیڈل برگ میں رہے۔ ۱۹۲۵ء میں پھر حیدر آباد آ گئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ فلسفہ مقرر ہوئے۔ اٹھارہ برس (۱۹۴۳ء) تک وہ اس منصب پر فائز رہے۔

اسی سال (۱۹۴۳ء میں) انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے اس طرح عارضی رخصت لی کہ وہ کشمیر جانا چاہتے ہیں' لیکن اگر وہاں مستقل قیام کی صورت پیدا نہ ہوئی تو واپس آ جائیں گے- کشمیر گئے تو پہلے انھیں امر سنگھ کالج (سری نگر) کا پرنسپل بنایا گیا- اس کے بعد ریاست کشمیر کا ڈائریکٹر تعلیمات مقرر کر دیا گیا- ان کا ارادہ وہاں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو جانے کا تھا' اسی لیے سری نگر میں نسیم باغ کے قریب بہت اچھا بنگلہ تعمیر کرا لیا تھا' لیکن ۱۹۴۷ء میں جب کشمیر کے سیاسی حالات نے خطرناک شکل اختیار کر لی تو لاہور آ گئے اور پھر چند روز بعد دوبارہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کا عزم کیا- کشمیر میں انھیں اپنے بنگلے اور گھریلو سامان کے نقصان کا تو غم نہ تھا' البتہ اس کتب خانے کے ضائع ہو جانے کا بہت افسوس تھا' جسے وہ زندگی بھر کا اپنا علمی سرمایہ قرار دیتے تھے-

۱۹۴۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی پہنچے تو انھیں میر شعبہ فنون (ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس) مقرر کر دیا گیا- دو سال اس منصب پر مامور رہے- ستمبر ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد پر حکومت ہند نے فوجی اقدام کیا تو وہاں کی علمی اور تہذیبی و ثقافتی صورت حال بہت حد تک بدل گئی تھی- اس سے متاثر ہو کر ۱۹۴۹ء میں اپنے وطن لاہور آ گئے-

فروری ۱۹۵۰ء میں انھوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم کیا- ۲۸- فروری کو اس کی رجسٹریشن ہوئی- یہاں یہ بات قابل بیان ہے کہ جس زمانے میں خلیفہ صاحب حیدر آباد (دکن) سے پاکستان آئے اور لاہور میں قیام پذیر ہوئے' اس زمانے میں پاکستان کے وزیر خزانہ ملک غلام محمد اور وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان تھے- آزادی سے قبل ملک غلام محمد کئی سال ریاست حیدر آباد کے وزیر خزانہ رہے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی کلب میں خلیفہ صاحب سے ان کی دوستانہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا- لیاقت علی خاں سے بھی خلیفہ صاحب کے بہت اچھے مراسم تھے- پاکستان آ کر وہ ان دونوں سے ملے تو انھوں نے وہ جگہ جہاں ادارہ ثقافت اسلامیہ کا دفتر ہے' خلیفہ صاحب کے نام الاٹ کرنا چاہی- خلیفہ صاحب نے کہا میں تو پہلے سے لاہور کا رہنے والا ہوں اور ایک درمیانے درجے کے مکان کا مالک ہوں' مجھے ذاتی طور پر زیادہ لمبے چوڑے مکان کی ضرورت نہیں- اس بلڈنگ میں جو آپ مجھے دینا چاہتے ہیں' ایک تصنیفی ادارہ قائم کر دیجیے- چنانچہ خلیفہ صاحب نے اس کے اغراض و مقاصد لکھے' ضروری امور کی وضاحت کی اور ادارہ ثقافت اسلامیہ معرض قیام میں آ گیا-

خلیفہ عبدالحکیم کا دل گردہ دیکھیے کہ کلب روڈ پر اتنی بہترین جگہ انھوں نے اپنی ذات کے لیے حکومت سے نہیں لی، بلکہ حکومت سے ایک علمی و تصنیفی ادارہ قائم کرنے کی درخواست کی اور اسی کے لیے وہ جگہ حاصل کی جہاں اب ادارہ ثقافت اسلامیہ کا دفتر ہے۔ یعنی نرسنگ درس گارڈن۔۲۔کلب روڈ۔لاہور

کسی کو ایسا شخص کہیں نظر آتا ہے، جسے اتنی بڑی جگہ پیش کی جائے جو کئی ایکڑ میں پھیلی ہوئی ہو اور وہ اسے لینے سے انکار کر دے۔

خلیفہ صاحب نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ممتاز اہل علم اور نامور اصحاب قلم کو جمع کر لیا تھا، مثلاً ان کی نگاہِ انتخاب ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا محمد حنیف ندوی، شاہ محمد جعفر پھلواروی، بشیر احمد ڈار، شاہد حسین رزاقی، سید رئیس احمد جعفری اور مظہر الدین صدیقی پر پڑی اور ان حضرات نے ادارے کی بے حد علمی خدمت کی اور اونچے درجے کی تحقیقی کتابیں لکھیں۔ خود خلیفہ صاحب نے جو تصنیفی کام کیا، تحقیق میں ڈوب کر کیا۔

وہ کئی مرتبہ امریکہ، کینیڈا، اندلس، لبنان، یورپ اور آسٹریلیا کی یونیورسٹیوں اور انجمنوں کی دعوت پر گئے۔ وہاں انھوں نے اس نواح کے لوگوں میں اسلام کی حقانیت کا پیغام پہنچایا۔ اس کے اوامر واحکام کی تشریح کی اور اس کے نظریہ امن و آشتی کو اجاگر کیا۔

مولانا حنیف ندوی نے ایک مرتبہ خلیفہ صاحب کی باتیں کرتے ہوئے کہا کہ وہ اعلیٰ درجے کے جدید تعلیم یافتہ تھے اور خیالات و افکار کے بعض گوشوں میں الٹرا ماڈرن تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تصوف اور روحانیت کے بے حد قائل تھے اور بعض ایسی چیزوں کو بھی مانتے اور ان پر یقین رکھتے تھے، جن کی توقع ان سے قطعی طور پر نہیں کی جا سکتی تھی۔

وہ مسائل تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے بقول مولانا حنیف ندوی کے پورے وثوق سے کہا کرتے تھے کہ یہ عالم ہست و بود صرف مادیت ہی پر مبنی نہیں ہے اور یہاں جو کچھ بھی ہے وہ مادہ ہی کے اظہار و نمود کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اس دنیا میں ایک روحانی عالم بھی آباد ہے، جس کا اس عالم اسباب سے گہرا تعلق ہے۔

۱۹۶۹ء میں مرحوم پروفیسر حمید احمد خان کچھ مہینے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں بطور ایڈیشنل ڈائریکٹر خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ وہ خلیفہ صاحب کے ایک انگریزی مسودے پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ ایک دن انھوں نے بتایا کہ عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد

دکن) میں جب خلیفہ صاحب فلسفے کے استاد اور صدر شعبہ تھے' وہ وہاں بی-اے کے طالب علم تھے اور خلیفہ صاحب سے فلسفہ پڑھتے تھے- انہی دنوں خلیفہ صاحب نے ڈیبر کی کتاب "ہسٹری آف فلاسفی" کا "تاریخ فلسفہ" کے نام سے اردو ترجمہ کیا تھا- عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو تھا' اس لیے خلیفہ صاحب طلبا کو اردو میں لیکچر دیتے تھے- ان کا پڑھانے کا انداز نہایت عمدہ تھا اور مسائل فلسفہ کی اردو میں تشریح بڑے دل نشین اسلوب میں کرتے تھے-

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ خلیفہ صاحب کو پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کے لیے دو تین مرتبہ پیش کش ہوئی' مگر انھوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے علیحدہ ہونا گوارا نہیں کیا- یہ ادارہ انھوں نے بہت محنت سے قائم کیا تھا اور اسے ہر صورت میں قائم رکھنا چاہتے تھے ----- لیکن افسوس ہے اب یہ ادارہ اجڑ گیا ہے اور اس میں تصنیف و تالیف کا ایک بھی شخص نہیں ہے-

۱۹۵۷ء کے جلسہ تقسیم اسناد میں پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی' جس کی وجہ سے خود یونیورسٹی نے اپنے مقام و مرتبے میں اضافہ کیا-

ایک دن ایک کتاب کے مصنف نے خلیفہ صاحب سے کہا کہ میری کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ایک پبلشر نے مجھ سے بات کی اور میں نے اسے کتاب چھاپنے کی اجازت دے دی- اب وہ پریشان کر رہا ہے' نہ کتاب چھاپتا ہے نہ انکار کرتا ہے- خلیفہ صاحب نے کہا' کتاب چھاپنے والے کو آپ انگریزی میں پبلشر کہیں یا عربی میں ناشر ----- دونوں میں لفظ "شر" مشترک ہے' جس کا اظہار اس کے عمل و کردار سے ہوتا رہتا ہے-

علم تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دن خلیفہ صاحب نے کہا کہ اس کو قطعی اور یقینی صداقت نہیں قرار دیا جا سکتا- بعض افراد کی زندگی کے شب و روز کچھ اور ڈھب سے گزرے ہوتے ہیں' لیکن ان کی موت کے بعد جب ان کے متعلق لوگ لکھنا شروع کرتے ہیں تو کچھ اور قسم کے واقعات ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں- انھوں نے چند افراد کا نام لے کر کہا' میں انھیں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ ان کے نجی اور ذاتی معاملات کس نوعیت کے تھے' لیکن مرنے کے بعد انھیں رحمتہ اللہ علیہ کہا جانے لگا- مجھے شبہ ہے کہ پہلے رحمتہ اللہ علیہ بھی اسی قسم کے ہوں گے- انھوں نے کہا عام طور پر تاریخ میں عقیدت کے جذبات'

صداقت اور سچائی پر غالب آ جاتے ہیں۔

ابتدا میں خلیفہ صاحب نے دفتر کی طرف سے ایک ایک بڑی میز اور تین تین کرسیاں خرید کر ہر رفیق ادارہ کے گھر پہنچادی تھیں تاکہ وہ گھر میں میز کرسی پر آرام سے لکھنے پڑھنے کا کام کر سکیں۔

خلیفہ صاحب نے انگریزی اور اردو میں متعدد کتابیں تصنیف کیں اور کئی انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے کیے۔ان کتابوں میں سے بعض ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے اور بعض دوسرے اداروں کی طرف سے شائع کی گئیں اور اہل علم میں مقبول و متداول ہوئیں۔

یہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں۔

### ۱۔ تشبیہات رومی:

مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ ہیں۔ہر باریک نکتے کی وضاحت کے لیے ایسی دل نشین تشبیہ دیتے ہیں جو یقین آفریں بھی ہوتی ہے اور وجد آور بھی۔ خلیفہ صاحب نے جو رومیات کے ممتاز عالم و مفکر تھے' ان تشبیہات کو اس کتاب میں دلکش اور پر کیف انداز میں بیان کیا ہے۔

### ۲۔ حکمت رومی:

اس کتاب میں خلیفہ صاحب نے مولانا جلال الدین رومیؒ کے افکار و نظریات کی حکیمانہ تشریح کی ہے' جو ماہیت نفس انسانی' عشق و عقل' وحی و الہام' وحدت وجود' احترام آدمیت' صورت و معنیٰ' عالم اسباب اور جبر و قدر جیسے اہم ابواب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

### ۳۔ الہیات رومی (انگریزی):

اس میں رومی کے ان افکار و تصورات کی تشریح کی گئی ہے جو الٰہیات اسلامی کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب عالم مادی' عالم روحانی' تخلیق' ارتقا' عشق' مشیت' انسان کامل' فنا و بقا' وجودِ باری تعالیٰ' وحدت وجود اور وحدت شہود جیسے اونچے درجے کے فلسفیانہ مسائل پر محیط ہے۔

### ۴۔ افکار غالب:

اس میں مرزا غالب کے بلند پایہ فلسفیانہ کلام کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ کتاب اردو

ادب میں قابل قدر تحقیق کی حیثیت رکھتی ہے۔

### ۵۔ فکر اقبال:

اس کتاب کو اقبالیات کے سلسلے میں گراں قدر اضافے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اس میں علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفے کے ہر پہلو کی عمدہ اسلوب میں وضاحت کی گئی ہے۔

### ۶۔ اسلام اینڈ کمونزم (انگریزی):

یہ اسلامی اور اشتراکی نظریات کا تقابلی مطالعہ ہے جس میں اسلامی تصورات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں اور اس کے مقابلے میں اشتراکی نقطہ نظر کے نقائص اجاگر کیے گئے ہیں۔

### ۷۔ اسلام کا نظریہ حیات:

یہ خلیفہ صاحب کی انگریزی کتاب ''اسلامک آئیڈیالوجی'' کا اردو ترجمہ ہے۔

### ۸۔ مقالات حکیم:

یہ خلیفہ صاحب کے مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے' جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ مقالات جناب شاہد حسین رزاقی صاحب نے مرتب کیے ہیں۔ پہلی جلد اسلامیات اور دوسری اقبالیات سے متعلق مقالات پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد متفرق اور مختلف عنوانات کے مقالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

### ۹۔ کلام حکیم:

یہ ان کا مجموعہ کلام ہے' جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کتنے اچھے شاعر تھے۔ کلام حکیم کے مرتب ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ہیں۔

یہ خلیفہ صاحب کی وہ کتابیں ہیں جو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے معرض اشاعت میں آئیں۔ اب ذیل میں ان کی مزید خدمات ترجمہ و تصنیف کا ذکر کیا جاتا ہے:

### ۱۰۔ تاریخ فلسفہ:

ڈیبر کی ''ہسٹری آف فلاسفی'' کا ترجمہ' جو قیام حیدر آباد کے زمانے میں کیا۔

### ۱۱۔ تاریخ فلسفہ جدید:

ہیرالڈ ہوفڈنگ کی ''ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی'' کا ترجمہ۔

### ۱۲- تاریخ فلسفہ یونان:

ایڈورڈز ملز کی ''آوٹ لائن آف گریک فلاسفی'' کا ترجمہ۔

### ۱۳- نفسیات و واردات روحانی:

ولیم جیمز کی کتاب کا ترجمہ جو ۱۹۵۸ء میں مجلس ترقی ادب نے شائع کیا۔

### ۱۴- بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ:

### ۱۵- داستان دانش:

یہ فلسفے کی سرگزشت ہے جو خلیفہ صاحب نے دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔

ان پندرہ تصانیف و تراجم کے علاوہ ان کے بہت سے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے ہوئے ہیں۔

متحدہ ہندوستان میں خلیفہ صاحب آل انڈیا فلسفہ کانگرس کے مابعد الطبیعات کے سیکشن اور نفسیات کے سیکشن کے صدر تھے۔ آزادی کے بعد پاکستان فلسفہ کانگرس کی بنیاد ڈالی گئی تو اس کے پہلے اجلاس کی صدارت خلیفہ صاحب نے کی تھی۔

وہ عام طور سے ہر بات اور ہر سوال کا جواب لطیفے کے انداز میں شروع کرتے تھے اور لطیفے لطیفے میں مشکل سے مشکل مسئلہ آسانی سے حل کر دیتے تھے۔

وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور علمی و فکری اعتبار سے ان میں بڑی جامعیت پائی جاتی تھی۔ وہ حکومت کی قائم کردہ کئی مجلسوں کے رکن تھے۔ ۲۶۔ جنوری ۱۹۵۹ء کو وہ اسلامی مجلس مذاکرہ میں شرکت کے لیے کراچی گئے۔ اس کے چار جلسوں میں شریک ہوئے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق پانچویں جلسے کی صدارت جو ۳۰۔ جنوری کو ہو رہا تھا' خود انھیں کرنا تھی۔ ۳۰۔ جنوری کی صبح کو وہ اس وقت کے مرکزی وزیر تعلیم حبیب الرحمٰن سے ملے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کو مزید ترقی دینے کی تجاویز پر مبادلہ خیال کیا۔ اس کے بعد اس سلسلے میں وزارت مالیات میں عبدالمجید صاحب سے ملاقات کی اور پھر ممتاز حسن صاحب سے ملنے گئے۔ ان کے کمرے میں بیٹھے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے متعلق ان سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ راہی ملک بقا ہو گئے۔

یہ سوا دو بجے دوپہر کا عمل تھا۔ اسی وقت لاہور میں ٹیلی فون کے ذریعے ان کے اہل

خانہ کو اطلاع دی گئی اور ریڈیو پاکستان سے اس سانحے کی خبر نشر ہوئی۔ کراچی سے بذریعہ طیارہ ان کی میت لاہور لائی گئی۔ دوسرے دن گیارہ بجے ان کا جنازہ اس عالم خاکی میں ان کی عارضی قیام گاہ ۴۱۔ وارث روڈ سے اٹھا اور میانی صاحب کے قبرستان میں ان کے والد خلیفہ عبدالرحمٰن کے پہلو میں جو ان کی ابدی قیام گاہ ہے' انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

# مولانا عبدالکریم گرنتھی

۱۹۳۸ء کے آغاز سے ۱۹۴۰ء کے اختتام تک تین سال یہ فقیر فیروزپور میں حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقہ درس میں شامل رہا۔ مولانا مرحوم وہاں مسجد گنبداں والی میں درس و تدریس اور خطابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ یہ اہل حدیث کی مسجد تھی اور شہر کے وسط میں واقع تھی۔ تین سال کے اس عرصے میں فیروزپور اور اس کے قرب و جوار کے بے شمار حضرات سے میل جول کے مواقع میسر آئے۔ بہت سے واعظین و مقررین سے ملاقاتیں ہوئیں اور ان کی باتیں سنیں جن میں مولانا عبدالکریم گرنتھی کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ "خاص طور سے" اس لیے کہ ان کی سکونت مسجد گنبداں والی سے بالکل متصل تھی اور ان کا زیادہ تر وقت مسجد میں گزرتا تھا۔ موسم گرما میں رات وہ بالعموم مسجد میں گزارتے تھے۔ عشا کی نماز پڑھی، گھر گئے، تکیہ بغل میں دبایا اور مسجد میں آگئے۔ تہجد کے وقت اٹھ کر تہجد کی نماز ادا کی اور پھر فجر کی نماز باجماعت پڑھی۔ مسجد میں وہ بڑی راحت محسوس کرتے تھے۔ حدیث پاک کے الفاظ ہیں۔

المومن في المسجد كالسمك في الماء --- المنافق في المسجد كالطير في القفس

پنجابی زبان کے ایک شاعر نے اس کا ترجمہ اس شعر میں کیا ہے۔

مومن بندہ مسجد دے وچ جیوں مچھلی وچ پانی
منافق بندہ بدھا ردھا مسجد دے وچ جانی

کتابی چہرہ، نکلتا ہوا قد، اونچی ناک، متوسط بدن، کشادہ پیشانی، آنکھوں پر سفید شیشے کا نظر کا چشمہ، میانہ رو، گندمی رنگ، نرم گفتار، شیریں کلام، خوش کردار، بلند اخلاق، بہت اچھے واعظ، پنجابی کے شاعر، سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب کے عالم، گھنی داڑھی اور سر پر پٹے، بال مہندی سے رنگین۔ یہ تھے مولانا عبدالکریم گرنتھی۔ اس وقت وہ پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔

مولانا عبدالکریم کا اصل وطن ضلع شیخوپورہ کا ایک گاؤں "علی آباد" تھا- علی آباد میں جاٹوں کی "واہلہ" برادری کے لوگ اچھی خاصی تعداد میں آباد تھے اور وہ امرتسر کے علمائے غزنویہ کے مرید تھے- تعلق ارادت و عقیدت کی بنا پر غزنویوں کے ہاں ان کی آمد و رفت رہتی تھی اور علمائے غزنویہ میں سے بھی کوئی نہ کوئی بزرگ وہاں تشریف لے جاتے اور وعظ فرماتے تھے- اس طرح مولانا عبدالکریم بھی اپنے عہد طفولیت میں ایک مرتبہ امرتسر گئے اور پھر وہیں رہ پڑے اور تحصیل علم میں مشغول ہو گئے-

یہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے والد محترم حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی اور ان کے لائق احترام بھائیوں کا دور تھا اور امرتسر میں ان کا مدرسہ جاری تھا جس میں اس عہد کے مروجہ نصاب کے مطابق دینی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی- دیگر مدرسین کے علاوہ مدرسے میں خود مولانا عبدالجبار غزنوی بھی پڑھاتے تھے- ظاہری تعلیم کے ساتھ روحانی تعلیم کا سلسلہ بھی وہاں جاری تھا- کثیر تعداد میں لوگ حصول فیض کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے باطن کی دنیا کو منور کرنے کی کوشش کرتے-

وہ نیکی، سادگی، دین داری اور تقویٰ شعاری کا زمانہ تھا- لوگوں کے دل صاف تھے اور نیتیں پاک ---- علما میں بھی تبلیغ دین و اشاعت اسلام کا مخلصانہ جذبہ پایا جاتا تھا اور عوام بھی خلوص کے ساتھ ان کی باتیں سنتے اور اثر پذیر ہوتے تھے- اسی طرح دینی مدارس کا نظام بھی صلاح و خیر کے اصول پر قائم تھا اور اس کی تہہ میں اللہ کا خوف اور اطاعت پیغمبر کی مبنی بر صدق کشش کار فرما تھی- مولانا عبدالکریم اسی عہد صفا کی پیداوار تھے- انھوں نے اپنے دور کے پر خلوص علما کی دہلیز پر حاضری دی تھی اور ان سے تعلق عقیدت استوار کیا تھا، جس کے نتیجے میں اللہ نے ان کو علم سے بھی نوازا اور تقوے کی دولت بے پایاں بھی عطا فرمائی- وہ مولانا عبدالجبار غزنوی کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی- بہت اچھے واعظ بھی تھے اور عبادت گزار بھی- یعنی وہ صحیح معنوں میں عالم باعمل تھے-

یہی وجہ تھی کہ علمائے غزنویہ ان پر کامل اعتماد کرتے تھے- پھر ان کی دیانت و امانت، زہد و عبادت اور پر تاثیر وعظ و تبلیغ کی بنا پر اپنے مدرسہ غزنویہ کا حساب کتاب بھی ان کے سپرد کر دیا تھا اور اس کا سفیر بھی بنالیا تھا، اور اس اعتبار سے وہ "امین خاندان غزنویہ" کہلائے- یہ ایک اعزاز تھا جس کے وہ علمائے غزنویہ کی طرف سے مستحق قرار دیے گئے-

ان دنوں ایک بزرگ مولانا عبداللہ صاحب حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کے حلقہ ارادت میں شامل تھے جو ان کی خدمت میں امرتسر جایا کرتے تھے۔ وہ ضلع فیروز پور کی تحصیل زیرہ کے ایک گاؤں "گھدووالہ" کے رہنے والے تھے۔ سنا ہے نہایت پاکیزہ سیرت اور عالی کردار عالم تھے۔ انھوں نے نوجوان عبدالکریم کو امرتسر میں دیکھا اور ان کی تقریر سنی تو وہ انھیں اپنے ساتھ گھدووالہ لے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد اپنی لڑکی ان کے عقد میں دے دی۔ اب وہ اسی گاؤں میں رہنے لگے۔ ان کے اصلی وطن کا کسی کو پتا نہیں تھا' انھیں اسی گاؤں کا باشندہ سمجھا جانے لگا۔

وہ تبلیغ دین کا بے پناہ شوق رکھتے تھے۔ آواز سریلی پائی تھی اور پنجابی کے شاعر تھے۔ انھوں نے ان سب چیزوں کو اللہ کے دین کی اشاعت کے لیے کام میں لانا شروع کیا اور دیہات میں تبلیغی دورے کرنے لگے۔ جہاں جاتے لوگ ان کے گرد جمع ہو جاتے اور ان کی گفتگو سے متاثر ہوتے۔

پھر ایک وقت آیا کہ ان کے وعظ و تقریر کی شہرت سن کر فیروز پور کی جماعت اہل حدیث نے مسجد گنبداں والی کے لیے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور وہاں کی خطابت و امامت کی ذمے داری ان کے سپرد کر دی گئی۔ کئی سال وہ اس منصب پر فائز رہے۔

۱۹۳۸ء میں ان کی جگہ حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف کو مسجد گنبداں والی کا خطیب مقرر کر لیا گیا تھا اور وہاں انھوں نے دارالحدیث نذیریہ کے نام سے سلسلہ تدریس کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ اس دوران میں ضلع فیروز پور اور دوسرے علاقوں کے بہت سے طلبا نے دارالحدیث نذیریہ کا رخ کیا اور اس میں تعلیم حاصل کی۔ میں بھی ۱۹۳۸ء کے ابتدا سے ۱۹۴۰ء کے آخر تک وہاں رہا اور اس اثنا میں اپنی استعداد ذہنی کے مطابق مولانا عطاء اللہ صاحب سے استفادہ کیا۔ مولانا محمد شفیع ہوشیار پوری اور ان کے بھتیجے مولانا ثناء اللہ ہوشیار پوری (سابق مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد) بھی اس وقت مسجد گنبداں والی کے دارالحدیث نذیریہ میں خدمت تدریس پر مامور تھے' ان دونوں بزرگوں سے بھی میں نے بعض درسی کتابیں پڑھیں۔ رحمھم اللہ تعالیٰ

مولانا عبدالکریم گرنتھی کی زیارت کا شرف انھی دنوں حاصل ہوا۔ وہ ایک ہندو کے مکان میں کرائے پر رہتے تھے اور مکان کے مسقّف حصے کی دیوار مسجد کے صحن سے متصل

تھی- اس مکان کے ایک حصے میں خود ہندو مالک مکان کی رہائش تھی- مولانا کے شب و روز کا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا تھا- اساتذہ اور طلبا سے وہ انتہائی محبت کا برتاؤ کرتے تھے اور نہایت شفقت کے ساتھ ان سے ہم کلام ہوتے تھے-

وہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور جنگ کے ابتدائی دور میں ہٹلر کی فوجوں نے برطانیہ اور فرانس وغیرہ کی اتحادی فوجوں کا مار مار کر بھرکس نکال دیا تھا اور یورپ کے کئی ملکوں پر قبضہ کر کے ان پر فتح کے جھنڈے لہرا دیے تھے- مولانا عبدالکریم گرنتھی ان خبروں سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے-

مولانا عطاء اللہ صاحب مرحوم کے پاس بذریعہ ڈاک اس وقت دو اخبار آتے تھے اور دونوں سہ روزہ تھے- اور دونوں انگریزی حکومت کے مخالف اور کانگرس کے حامی تھے- ایک اخبار کا نام ''زمزم'' تھا- اس کا دفتر اردو بازار (لاہور) میں تھا' جسے اس زمانے میں موہن لال روڈ کہا جاتا تھا- سرکلر روڈ کی طرف سے اردو بازار میں داخل ہوں تو دائیں طرف کی دو عمارتیں چھوڑ کر تیسری عمارت کے اوپر کے تین کمروں میں ''زمزم'' کا دفتر تھا- لال سے رنگ کی پرانے طرز کی یہ عمارت چند سال پیشتر تک قائم تھی- اب اس کا حلیہ کچھ اور ہو گیا ہے' لیکن میرا خیال ہے اوپر جانے والا وہ تنگ سازینہ ابھی تک موجود ہے- سہ روزہ اخبار ''زمزم'' کے مینجر (غالباً مالک بھی) منشی عبدالرحیم تھے اور اس کے ایڈیٹر مشہور عالم و صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط تھے جو اگست ۱۹۴۷ء کے پس و پیش دہلی چلے گئے تھے اور وہاں جمعیت علماے ہند کے ترجمان روزنامہ ''الجمعیت'' کے ایڈیٹر ہو گئے تھے- ان کا اصلی وطن غازی آباد تھا' جو دہلی سے کچھ فاصلے پر صوبہ یوپی میں ایک مشہور قصبہ ہے- انھوں نے وہیں وفات پائی-

میں نے ۱۹۴۴ء میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کو دیکھا تھا- میں اور مولانا عبیداللہ احرار کسی سلسلے میں ان سے کوئی بات کرنے لاہور آئے اور ان سے ملاقات کی- وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملے- ان کا حلیہ اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے-

دوسرا اخبار سہ روزہ ''مدینہ'' تھا جو یوپی کے شہر بجنور سے شائع ہوتا تھا- اس کے ایڈیٹر اس وقت ابوسعید بزمی مرحوم تھے-

مولانا عبدالکریم گرنتھی ان دونوں اخباروں کی خبریں' مضامین' اداریے اور ادارتی

شذرات بڑے شوق اور غور سے سنتے- سنانے کا حکم عام طور سے مجھے دیا جاتا- مجھے خود بھی ان چیزوں سے ابتدائے عمر سے دلچسپی تھی اور اس ضمن میں تھوڑی بہت معلومات بھی رکھتا تھا- پھر روزانہ اخبار بھی بالالتزام پڑھتا تھا اور مولانا کو اس کا علم تھا' لہٰذا وہ مجھے ارشاد فرماتے اور میں نہایت مسرت کے ساتھ ان کے ارشاد کی تعمیل کرتا- ساتھ ساتھ خبروں پر تبصرہ بھی ہوتا جاتا-

کسی زمانے میں حج بیت اللہ کا عزم کرنا بہت مشکل تھا اور اس کے لیے لوگوں کو وعظ و تبلیغ کے ذریعے باقاعدہ تیار کیا جاتا تھا- سعودی عرب کے موجودہ حکمران شاہ فہد کے والد مکرم سلطان عبدالعزیز بن سعود کی طرف سے ہندوستان میں اس کے سربراہ مولانا اسماعیل غزنوی تھے- پنجاب میں مولانا اسماعیل غزنوی نے چند علمائے کرام کے ذمے یہ فریضہ عائد کر رکھا تھا کہ وہ وعظ و تبلیغ کر کے لوگوں کو حج پر جانے کے لیے آمادہ کریں- ان علما میں مولانا عبدالکریم گرنتھی بھی شامل تھے- وہ دیہات و قصبات میں جاتے اور لوگوں کو حج کی فرضیت اور فضیلت سے آگاہ کرتے- اس وقت سعودی حکومت کی آمدنی کا بہت حد تک دارومدار حاجیوں پر تھا- مختلف ٹیکسوں کی صورت میں اتنی آمدنی ہو جاتی تھی جس سے کاروبار حکومت چلانے میں خاصی مدد ملتی تھی-

مبلغین حج کو مفت میں حج کرایا جاتا تھا اور ان کی کچھ مالی خدمت بھی کی جاتی تھی- مولانا عبدالکریم نے بھی اسی طرح حج کیا تھا- حکومت سعودی عرب کی طرف سے انھیں تین چار لمبے سے چغے اور جبے ملے تھے- ایک سفید رنگ کے باریک کپڑے کا تھا اور باقی مختلف رنگوں کے گرم چغے تھے- مولانا جمعے کے روز یا وعظ و تقریر کے موقعے پر یا کہیں آنے جانے کے وقت موسم کے مطابق انھیں زیب تن فرماتے تھے-

وہ متحدہ ہندوستان کا دور تھا اور مختلف مذاہب کے لوگ ملک میں آباد تھے- بعض مذاہب کے مبلغ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو نشانہ تنقید بھی بناتے تھے اور ہدف تنقیص بھی---- رد عمل کے طور پر معاملہ بحث مباحثے تک جا پہنچتا تھا- دونوں طرف سٹیج آراستہ ہو جاتے تھے اور مناظرہ شروع کر دیا جاتا تھا- کہیں آریہ سماجیوں اور مسلمانوں کا مقابلہ ہو رہا ہے' کہیں عیسائی اور مسلمان ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں' کہیں عیسائی اور آریہ گتھم گتھا ہیں- اس طرح مختلف فرقوں اور مذہبوں کے اہل علم کا دنگل جاری رہتا تھا اور لوگ دیکھتے

تھے کہ علم کی ورزش اور معلومات کی زور آزمائی کا اکھاڑا کہیں نہ کہیں جما ہوا ہے۔

پنجاب اس وقت بہت بڑا صوبہ تھا جو بڑے بڑے ۲۹ ضلعوں پر مشتمل تھا اور اٹک کی لہروں سے لے کر دلی کی دیواروں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں سکھ صاحبان کی آبادی دور تک چلی گئی تھی۔ ان کا بول چال کا طریقہ کچھ دوسری نوعیت کا تھا۔ رہن سہن کا ڈھنگ بھی بہت حد تک دوسروں سے نرالا تھا۔ لباس کے معاملے میں بھی ان کے کچھ خاص اصول تھے۔ ظاہری وضع قطع بھی سب سے مختلف تھی۔ جلسوں اور عام مجلسوں میں ان کے مقرروں کا لہجہ دوسروں کی نسبت کچھ اور ڈھب کی نشان دہی کرتا تھا۔ ان کی بعض خاص اصطلاحیں تھیں۔ مثلاً ایک سکھ کہیں سے آ رہا ہو تو اس کے لیے یہ "سوالکھ" کا لفظ بولتے تھے۔ کہا جاتا تھا "سوالکھ خالصہ آ رہیا اے" پیشاب کی حاجت ہو تو اس کے لیے "میں چیتا بھجا آواں" کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔

اس قسم کی اصطلاحوں کا ایک تاریخی اور نفسیاتی پس منظر تھا جو ان سکھ گوروؤں کے زمانے کی یاد دلاتا تھا' جن کا مختلف اوقات میں مغل حکمرانوں سے مقابلہ رہا تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سننے والے یہ سمجھیں کہ ایک شخص نہیں آ رہا بلکہ بہت بڑی فوج آ رہی ہے جو سوا لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔

اسی طرح "چیتا بھجا آواں" (چیتا بھگا آؤں) سے سننے والے کا ذہن اس طرف منتقل کرنا مقصود تھا کہ ان سے بچ کر رہو' ان میں کا ایک ایک آدمی چیتے جیسے زبردست اور طاقت ور درندے کو بھگا دیتا ہے۔

ایک سکھ گلی سے گزر رہا ہو تو سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ دو چار سکھ بازار میں جا رہے ہوں تو بازار بھرا بھرا سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر دس پندرہ سکھ جمع ہوں تو گمان ہوتا ہے کہ پورا گاؤں اٹھ کر یہاں آ گیا ہے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ سکھ بھی ایک خاص رنگ ڈھنگ کے ساتھ یہاں آباد تھے۔ سکھوں کی مذہبی کتاب کا نام "گرنتھ صاحب" ہے۔ یہ کتاب سکھوں کے پہلے گورو جناب بابا نانک صاحب کے اقوال و فرمودات کا مجموعہ ہے' جس میں ان کی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔

ان کی عبادت گاہوں یعنی گورودواروں کے ناموں کی نسبت بھی انوکھے ڈھب کی ہے۔

اس کی چند مثالیں یہاں بیان کی جاتی ہیں۔

○---گوردوارہ منجی صاحب: اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ گورو گوبند سنگھ کا جس زمانے میں اورنگ زیب عالم گیر سے جھگڑا چل رہا تھا اور وہ مختلف مقامات میں گھومتے پھرتے تھے' ان دنوں ایک مرتبہ وہ ایک درخت کے نیچے چھوٹی سی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ جتنے دن وہاں مقیم رہے' وہ چارپائی ان کے استعمال میں رہی' بعد ازاں وہاں گوردوارہ بنا دیا گیا' چارپائی کی مناسبت سے اس کا نام "گوردوارہ منجی صاحب" رکھا گیا---- پنجابی میں چھوٹی چارپائی کو "منجی" کہا جاتا ہے۔

○---گوردوارہ ٹاہلی صاحب: باباتانک صاحب بچپن میں مال مویشی چراتے ہوئے آرام کے لیے شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتے تھے' جسے پنجابی میں "ٹاہلی" کہا جاتا ہے۔ سکھوں کے نزدیک یہ متبرک جگہ قرار پا گئی' اس لیے یہاں گوردوارہ تعمیر کرا دیا گیا تھا' جو "گوردوارہ ٹاہلی صاحب" کے نام سے موسوم ہوا۔

○---گوردوارہ کیاری صاحب: بیان کیا جاتا ہے کہ ایک جگہ باباجی نے کیاریاں سی بنا کر سبزی بوئی تھی اور وہ اسے پانی دیتے اور اس کی رکھوالی کرتے رہتے تھے' لہٰذا اسے "گوردوارہ کیاری صاحب" کہا جانے لگا۔

○---گوردوارہ تنبو صاحب: کہتے ہیں باباجی کی عمر جب گیارہ بارہ سال کی تھی' والد نے ایک دن ان کو دکان سے سودا لانے کے لیے کچھ پیسے دیے۔ وہ باہر آئے تو دیکھا کہ دس پندرہ مسافر دھوپ میں بیٹھے ہیں اور کھانے پینے کی کوئی شے ان کے پاس نہیں ہے۔ باباجی نے ان پیسوں سے جو والد نے دیے تھے' مسافروں کے لیے خورد و نوش کا سامان خریدا اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے تنبو لگا دیا (یعنی سائبان نصب کرا دیا) مسافروں نے اس تنبو کے نیچے بیٹھ کر کھایا پیا اور آرام کیا۔ بعد میں وہاں گوردوارہ بنا دیا گیا جو "گوردوارہ تنبو صاحب" کہلایا۔

یہ کھلے ڈلھے سے لوگ ہیں' ان کا اسلوب زیست بھی اسی انداز کا ہے' بولی بھی اسی قسم کی ہے' اصطلاحیں بھی اسی نہج کی ہیں' کسی معاملے میں کوئی تکلف نہیں۔ ہر بات صاف سیدھی۔ اوکھے پن سے خالی۔

مولانا عبدالکریم ان کی نفسیات سے آگاہ تھے' ان کی تعلیمات' ان کے گوروؤں کی تاریخ اور ان کے حالات کا انھیں علم تھا اور وہ جس اسلوب سے بات کرنے اور سمجھنے کے

عادی تھے' اس سے وہ باخبر تھے۔

سکھوں اور ان کی زبان گورمکھی کی بات چلی ہے تو یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ انھوں نے ان کی زبان "گورمکھی" پڑھی تھی' گرنتھ صاحب کا مطالعہ کیا تھا اور سکھوں کے مذہبی معاملات اور ان کے بنیادی احکام سے واقفیت بہم پہنچائی تھی' اس لیے "گرنتھی" کی حیثیت سے شہرت پائی۔ سکھوں کے مجمعے میں وہ تقریر کرتے اور بابا نانک جی کے اقوال انھیں سناتے تو سکھ ان کے گرویدہ ہو جاتے اور نہایت ذوق و شوق سے ان کی باتیں سنتے۔ سکھ اللہ کی توحید کے قائل ہیں۔ بابا نانک نے ان کو خاص طور سے یہ تعلیم دی ہے۔ مولانا عبدالکریم سکھوں کے مجمعے میں مسئلہ توحید بیان کرتے اور پھر قرآنی آیات کے ساتھ اس موضوع سے متعلق بابا نانک کی بانیاں پڑھتے تو سماں بندھ جاتا اور سکھ جھوم جھوم جاتے۔ وہ قدرت کی طرف سے غضب کی آواز لے کر آئے تھے اور معلومات کی بھی ان کے ہاں فراوانی تھی۔ آواز اور معلومات کی یک جائی مجمعے کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیتی۔

سکھوں کی تاریخ کو دراصل مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے اور اس میں اس قسم کی باتیں بیان کی گئی ہیں کہ یہ مظلوم ہیں اور مغل حکمران ظالم تھے' جنھوں نے مختلف مواقع پر ان کو انتہائی اذیتوں میں مبتلا کیا اور ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ مولانا عبدالکریم گرنتھی سکھ تاریخ کے بہت سے پہلوؤں پر نگاہ رکھتے تھے اور انھیں معلوم تھا کہ فلاں فلاں مسلمان حکمرانوں نے فلاں فلاں مواقع پر سکھوں کی امداد کی یا ان کے مذہبی مقامات کے لیے جگہ دی اور بڑی بڑی جاگیروں سے انھیں نوازا۔ اس قسم کے واقعات کو انھوں نے پنجابی اشعار کی صورت میں بیان کیا ہے۔ سکھ اس موضوع کے اشعار ان سے سنتے تو بہت متاثر ہوتے۔ افسوس ہے' میرے پاس نہ اس سلسلے کا ان کا کوئی شعری مجموعہ ہے اور نہ اس وقت شعر یاد ہیں۔ میں نے شعر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ البتہ ایک شعر جو یادوں کی طویل ڈوری میں اٹکا ہوا ہے' پیش خدمت ہے ۔

دھرم نال بولنا پیارے سنگھ جی
دسو ساڈے وچ جیہڑا ول ونگ جی

ہندوؤں پر مسلمان حکمرانوں نے جو احسانات کیے' ان کو بھی انھوں نے اشعار کا جامہ پہنایا تھا۔ ان اشعار میں سے مجھے چند اشعار یاد تھے لیکن یہ چھپن ستاون برس پہلے کی بات

ہے- اب صرف ایک مصرع یاد ہے اور وہ مصرع یہ ہے۔

ٹوڈر مل دا پڑھ افسانہ

اس سے آگے پیچھے کا کچھ پتا نہیں- وہ ہندوؤں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر مسلمان حکمرانوں کے احسانات سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو راجا ٹوڈر مل کے واقعات پڑھو-

مولانا آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے تھے اور سریلی آواز میں پڑھتے تھے- آخری مصرعے پر ایک انداز خاص سے تھوڑا سا اچھلتے تھے تو سامعین پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی-

پنجابی اشعار میں ان کی کئی کتابیں ہیں- مثلاً پیروی صحابیات' معجزات محمدی' نیک بی بی' سکھوں کے متعلق دس دس بارہ بارہ صفحات کے دو یا تین رسالے (ان میں ایک رسالے کا نام گورونانک اور اسلام ہے) اپنے مرشد و استاذ حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی ؒ کے حالات میں اشعار کا مجموعہ' جس کا نام ہے: "جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی"

ان کی ایک صاحب زادی کا نام حنیفہ بی بی تھا اور وہ سکول میں پڑھتی تھیں- ایک دن بیٹی نے ابا جی سے کہا کہ ہمارے سکول میں تقریروں کا مقابلہ ہو رہا ہے' آپ کسی موضوع پر میرے لیے تقریر لکھ دیں----

فرمایا: اچھا لکھ دیتا ہوں---- تھوڑی دیر بعد دو تین صفحات کی ایک پنجابی نظم لکھ کر اس کے حوالے کی- فرمایا یہ نظم سنا دینا' تمھیں انعام ملے گا- اس نظم کا ایک شعر مجھے یاد ہے-

رکھیں نیکی دے نال پیار بیبیے

پاویں جنت دی عیش بہار بیبیے

یہ نظم اس نے سنائی اور مستحق انعام قرار پائی-

پہلے بتا چکا ہوں کہ مولانا ممدوح ہندو کے مکان میں رہتے تھے' جس کے ایک حصے میں خود مالک مکان کی رہائش تھی- بیٹھک مولانا کے قبضے میں تھی- اس کے ساتھ پانی کا نل تھا جو مالک مکان کے صحن میں تھا- مولانا کا اس نل سے کوئی تعلق نہ تھا' لیکن بیٹھک کی کھڑکی سے مالک مکان کی خواتین نظر آتی تھیں' وہ نل سے پانی لیتیں یا کپڑے دھوتیں تو ان کی بے پردگی ہوتی تھی- مولانا نے کئی دفعہ مالک مکان سے کہا کہ کھڑکی بند کر دو' لیکن اس نے توجہ نہیں کی- ایک دن ایک ہندو عورت ان کے گھر آئی اور نل کے نیچے بیٹھ کر مالک مکان کی لڑکیوں سے کہا کہ تم نل سے پانی نکال کر مجھ پر ڈالو' میں نہالوں- وہ نہا بھی رہی تھی اور ساتھ ساتھ

اونچی آواز سے یہ شبد بھی پڑھ رہی تھی۔

چرن گوراں دے نال نی چِت میرا لگا رہے

مولانا بیٹھک میں تشریف فرما تھے اور اس کا شبد سن رہے تھے۔ انھوں نے فی البدیہہ گرہ لگائی۔

ذرا نہ کراں خیال نی لیڑا بھاویں لتھا رہے

عورت پڑھتے پڑھتے خاموش ہو گئی---- اور دوسرے دن کھڑکی بند کر دی گئی۔

ایک دفعہ بہاول نگر جانے کے لیے فیروز پور سے ریل پر سوار ہوئے۔ فاضلکا بنگلہ کے ریلوے سٹیشن پر گاڑی رکی تو دیکھا کہ ایک ہندو ہاتھ میں کاسہ گدائی پکڑے لوگوں سے بھیک مانگ رہا ہے۔

اب معلوم نہیں ہندوستان میں کیا صورت حال ہے۔ آزادیٔ برصغیر سے قبل ہندو یا سکھ بہت ہی کم ہوں گے جو بھیک مانگتے ہوں گے۔ یہ فریضہ زیادہ تر مسلمان ہی انجام دیتے تھے۔ اب بھی پاکستان میں ہمیں جگہ جگہ مسلمان بھیک مانگنے والوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ نادار اور غریب ہندو ریوڑی اور مونگ پھلی بیچنا شروع کر دیتا تھا اور سکھ محنت مزدوری کرتا تھا۔ حتی الامکان کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا تھا۔ مانگنے کا کام مسلمان کے سپرد تھا۔ وہ کشکول ہاتھ میں پکڑ لیتا اور گھر گھر مانگتا پھرتا۔

مولانا عبدالکریم گرنتھی نے دیکھا کہ ایک ہندو پلیٹ فارم پر مانگ رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

رحم دی گلی دے وچوں کوئی لنگھدا اے

مولانا نے اس کو آواز دی اور کہا:

ہندوواں دی قوم دے وچوں کوئی منگدا اے

اس نے یہ الفاظ سنتے ہی کاسہ گدائی زور سے پلیٹ فارم پر پھینک دیا جو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور کہا باباجی آئندہ میں کسی سے نہیں مانگوں گا' ہاتھ سے کما کر کھاؤں گا۔

وہ دلچسپ بزرگ تھے اور دلچسپ باتیں سنایا کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ کہیں جا رہے تھے کہ ایک گاؤں میں رات پڑ گئی۔ وہ سکھوں کا گاؤں تھا۔ رات گزارنے کے لیے کسی مسلمان کا گھر پوچھا تو ایک شخص انھیں مسلمانوں کے گھر لے گیا۔ دیکھا تو ان کی بود و باش اور رہن سہن کا طریقہ سکھوں جیسا تھا' اس لیے ان کے ہاں رہنے سے انکار کر دیا۔ گھر والوں نے کہا: جناب ہم مسلمان ہیں۔ وہ تیلی برادری سے تعلق رکھتے تھے اور اندر

سے ''پنجن تاڑا'' نکال لائے اور کہا یہ ہے ہمارے مسلمان ہونے کی نشانی!

''پنجن تاڑا'' اردو میں ''دھنکی'' کو کہتے ہیں جس سے روئی دھنی جاتی ہے اور پھر اسے رضائیوں میں ڈالا جاتا ہے۔اس وقت یہ کام تیلی (یعنی زیانت) کرتے تھے۔

پنجابی زبان کی کہاوتوں' ضرب الامثال اور محاورات پر انھیں عبور حاصل تھا اور ان کی مجلس میں بیٹھنے والے چند لمحوں میں پنجاب کی تہذیب و ثقافت کے بہت سے گوشوں سے باخبر ہو جاتے تھے۔وہ خالص فنی مسائل کو بھی شعر کے سانچے میں ڈھالنے پر قدرت رکھتے تھے۔علم نحو کی مشہور کتاب ''نحو میر'' کا جو درس نظامی میں پڑھائی جاتی ہے' انھوں نے پنجابی اشعار میں ترجمہ کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' وہ حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کے شاگرد اور مرید تھے' جنھوں نے ۲۷ اگست ۱۹۱۳ء (۲۵۔ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ) کو جمعۃ المبارک کے دن وفات پائی۔وفات کے بعد سعادت مند شاگرد اور اخلاص پیشہ مرید نے پنجابی میں ایک رسالہ لکھا' جو ان کے مرشد اور استاد کی سوانح عمری بھی ہے' خاندان غزنویہ کی تاریخ بھی ہے' نوحہ بھی ہے' مرثیہ بھی ہے اور پنجابی ادب کا بہت بڑا شاہ کار بھی-----اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اس پیکر خلوص شاگرد اور سراپا نیاز معتقد نے اپنے دلی جذبات' ذہنی اضطراب اور قلبی تاثرات کو صفحہ قرطاس پر ادب و احترام کے تمام لوازم کے ساتھ منقش کر دیا ہے۔اس کتاب کا ایک بند یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالجبار غزنوی کی وفات کے بعد ان کے فرزند گرامی قدر مولانا محمد داؤد غزنوی مرحوم ان کے جانشین ہوئے تھے' چنانچہ مولانا داؤد غزنوی کے دور کے متعلق مولانا عبدالکریم گرنتھی فرماتے ہیں۔

دور داؤدی کجھ قابل تسلی اے
سارے گھرانے دی ایہ پونی تے چھلی اے
اہندی بدولت نہر علم دی چلی اے
عمر دراز قومی خدمت گزار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی

ایک اور بند ملاحظہ فرمایے' جس میں عالی قدر شاعر نے اپنے عظیم استاذ کے انتقال پر حزن وملال کی تمام کیفیتوں اور غم دواندوہ کے تمام پہلوؤں کو مجتمع کر دیا ہے۔

جادیاں راہیاں کولوں پچھاں میں رو کے
ماہی دے گل ہنجو ہار پرو کے
دس تے جاناں ذرا کول کھلو کے
ٹھیک تیاری ہو گئی ساڈے سرکار دی
جھوک ہادی میرے عبدالجبار دی
رو رو لوائی چھٹی آ گئی سرکار دی

پوری کتاب اسی قسم کے المیہ و حزنیہ اشعار کا دردناک مجموعہ ہے۔ کتاب میں شاعر کی شاعرانہ ہنرمندی اور ماہرانہ فن کاری ہر مصرعے میں کامل آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ کہیں تکلف یا آورد نہیں، آمد ہی آمد ہے۔۔۔۔افسوس ہے مجھے اشعار یاد نہیں رہے۔

وہ نہایت خوددار، شب زندہ دار اور متقی و پرہیزگار عالم دین تھے۔ نماز انتہائی خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے۔ زبان کی مٹھاس اور لہجے کی نرمی سے اللہ نے ان کو خوب نوازا تھا۔ دوسروں سے ہمدردی کا یہ عالم کہ اپنی تکلیف بھول جاتے اور دوسروں کی تکلیف پر پریشانی اور بے چینی کا اظہار فرماتے۔ اپنا کام خود کرتے، اپنی ذات کے لیے کسی کو قطعاً کوئی زحمت نہ دیتے۔ عام طور سے اپنے کپڑے بھی خود ہی دھوتے۔

قیام پاکستان کے بعد بہاول نگر سکونت اختیار فرمالی تھی۔ اس اثنا میں غالباً وہ دو دفعہ لاہور تشریف لائے اور اپنے نیازمندوں کو ملاقات و زیارت سے نوازا، جن میں ان سطور کا راقم بھی شامل ہے۔ ۲۴۔اپریل ۱۹۶۱ء (۸ ذیقعدہ ۱۳۸۰ھ) کو پیر کے روز صبح چھ بجے بہاول نگر میں وفات پائی۔ اس وقت تقریباً ستر برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے مولوی نصر اللہ نصر ہیں جنھوں نے ضلع قصور کے ایک قصبے "کھڈیاں خاص" کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ وہ وہاں کے ہائی سکول میں خدمت تدریس انجام دینے لگے تھے۔ پنجابی کے بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کے چھوٹے صاحب زادے مولوی محمد یحییٰ تھے جو قصور میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ وہیں فوت ہوئے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مرنے والوں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور زندوں کو اعمال نیک کی توفیق سے نوازے۔ آمین یارب العالمین

# شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی

۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۰ء تک سرزمین ہند میں چار سلیمان وہ تھے، جن کی گوناگوں خدمات علمی کے شور سے پورا ملک گونج رہا تھا اور جن کی شہرت فضیلت، پر پرواز لگا کر برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گئی تھی۔ وہ تھے:

۱-- قاضی سلیمان منصور پوری۔

۲-- شاہ سلیمان پھلواروی۔

۳-- سلیمان اشرف ---اور

۴-- سید سلیمان ندوی۔

ان حضرات نے علی الترتیب ۳۰- مئی ۱۹۳۰ء، ۵- جون ۱۹۳۵ء، ۲۱- اپریل ۱۹۳۹ء اور ۲۲- نومبر ۱۹۵۳ء کو اس دنیائے دوں سے منہ موڑا اور جنت کی راہ لی۔

جہاں یہ چار سلیمان جمع ہو جاتے تھے، کہا جاتا تھا ہندوستان کا علم جمع ہو گیا ہے۔ ندوۃ العلما کے ایک جلسے میں جو ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، یہ چاروں موجود تھے۔ اس موقعے پر شاہ سلیمان پھلواروی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ آج کئی سلیمان جمع ہو گئے ہیں، لیکن ان میں اصلی سلیمان میں ہوں جو سلیمان بن داؤد ہوں ---ع

پریاں نئی نئی ہیں، سلیماں نئے نئے

پھر فرمایا: پہلے سلیمان فرد تھا، اب رباعی ہے۔ چار چار سلیمان یک جا ہیں۔

شاہ سلیمان کے والد ماجد کا نام داؤد تھا، اسی لیے وہ اپنے آپ کو اصلی سلیمان قرار دیتے تھے اور ان کی مہر پر قرآن مجید کے یہ الفاظ کندہ تھے۔ وورث سلیمان داود۔

شاہ سلیمان پھلواروی، تصوف و سلوک کے قادری اور چشتی سلسلوں سے تعلق رکھتے تھے، خود بھی شیخ طریقت تھے۔ ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع پٹنہ کا ایک مشہور قصبہ ”پھلواری شریف“ ہے جو ساتویں صدی ہجری سے ارباب علم اور اصحاب طریقت کا مسکن چلا آرہا ہے، وہ وہاں کے سجادۂ مشیخت پر فائز تھے۔ اپنے عہد کے جید عالم، خوش بیان واعظ اور

نامور خطیب تھے۔ اللہ نے ان کو گوناگوں اوصاف سے نوازا تھا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے علم و فیض کے تین پر افتخار سرچشموں سے سیراب ہونے کا شرف حاصل کیا تھا۔ فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی (متوفی ۲۹۔ ربیع الاول ۱۳۰۴ھ) سے ' سہارن پور میں مولانا احمد علی سہارن پوری (متوفی ۶۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ) سے اور دہلی میں مولانا سید نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۰۔ رجب ۱۳۲۰ھ) سے---! اس طرح وہ اپنے دورِ جوانی میں تین باکمال اصحاب فضل سے فیض یاب ہونے کی سعادت سے بہرہ اندوز ہوئے۔

وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ٹرسٹی اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے بانیوں میں سے تھے۔ بلکہ دارالعلوم ندوۃ العلما انھی کی تحریک و تجویز سے کان پور سے لکھنؤ منتقل ہوا تھا' ورنہ بعض حضرات اسے دہلی لے جانا چاہتے تھے۔

مولانا سید داؤد غزنوی نے ایک دفعہ بتایا کہ شاہ سلیمان پھلواروی بہت خوب صورت تھے۔ عہد قدیم کے صوفیا کی طرح سبز عمامہ باندھتے تھے اور سر کے لمبے لمبے بال ان کے کندھوں پر لٹکتے رہتے تھے۔ سٹیج پر تھوڑا سا چل پھر کر نہایت پر تاثیر تقریر کرتے تھے۔ مثنوی مولانا روم اس درد اور سوز میں ڈوبے ہوئے انداز سے پڑھتے تھے کہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے' پورا مجمع تڑپ اٹھتا تھا اور آنکھیں اشک بار ہو جاتی تھیں۔

اس عالم اجل کا سال ولادت ۱۲۷۶ھ اور تاریخ وفات ۲۷۔ صفر ۱۳۵۴ھ (۵۔ جون ۱۹۳۵ء) ہے۔ ان کے سانحہ ارتحال پر برصغیر کے علمی حلقوں میں کہرام بپا ہو گیا تھا اور خیبر سے کلکتے تک پورے ملک میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔

شاہ سلیمان کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے حسن تھے جو باپ کی زندگی میں وفات پا گئے تھے۔ ان کے بیٹے شاہ حسن تھے جو تقسیم ملک کے بعد کراچی آ گئے تھے۔

دوسرے شاہ حسین تھے جو باپ کی وفات کے بعد پھلواری کی مسند مشیخت پر متمکن ہوئے۔ شاہ حسین کے دو بیٹے تھے۔ شاہ زید اور شاہ علی اکبر۔ شاہ زید کراچی میں اقامت گزین ہیں۔ شاہ علی اکبر بھی کراچی میں تھے اور شاہ محمد جعفر پھلواروی کے داماد تھے۔ متانت و قابلیت کی بنا پر شاہ علی اکبر کا شمار کراچی کے ممتاز لوگوں میں ہوتا تھا۔ وہ وہاں کی مشہور آبادی "شرف آباد" میں سکونت پذیر تھے' "علی اکبر سکوائر" ان کے نام سے موسوم ہے۔ وہ عالم جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔

تیسرے شاہ غلام حسنین ندوی تھے جو شاہ محمد جعفر سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔

چوتھے شاہ محمد جعفر تھے۔ یہ باپ کی زندگی میں ۱۹۳۴ء میں مشرقی پنجاب کے شہر کپور تھلہ کی شاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوگئے تھے' ان کے بڑے بھائی شاہ حسین فوت ہوئے تو پھلواری کی مسند مشیخت بھی انہی کے سپرد ہوئی۔ اگست ۱۹۴۷ء تک پھلواری کی مسند مشیخت اور کپور تھلے کی شاہی مسجد کے منصب خطابت پر فائز رہے۔ اس کے بعد پاکستان آگئے اور ان کے بڑے بھائی شاہ غلام حسنین ندوی پھلواری کے گدی نشین ہوئے۔

شاہ غلام حسنین کا انتقال ہوا تو ان کے نوعمر بیٹے شاہ ریحان نے باپ کی جگہ سنبھالی۔ اس کے بعد وہ ترک وطن کر کے پھلواری سے کراچی آگئے تھے اور تعلیم مکمل کرنے کی غرض سے کالج میں داخل ہوگئے تھے۔ اب پھلواری شریف میں اس خاندان عالی مرتبت کا سلسلہ مشیخت جو کئی پشتوں سے جاری تھا' ختم ہوگیا ہے اور شاہ سلیمان کی اولاد میں سے سب لوگ کراچی آگئے ہیں۔ البتہ شاہ غلام حسین کی دو بیٹیوں اور ایک بیوہ نے وہاں اقامت اختیار کیے رکھی۔

شرافت و نجابت اور فضل و کمال میں اس خانوادے کے بزرگوں کو ہمیشہ بلند مرتبہ حاصل رہا ہے اور یہ نجیب الطرفین سادات ہیں' لیکن ان میں سے کوئی صاحب بھی اپنے نام کے ساتھ "سید" کا لفظ نہیں لکھتے۔ سب کے نام سے پہلے "شاہ" کا لفظ لکھا اور بولا جاتا ہے۔

شاہ محمد جعفر پھلواروی جن کے متعلق ان سطور میں چند باتیں عرض کرنا مقصود ہے' اسی دودمان سادات کے فرد فرید تھے۔ ہم انھیں "شاہ صاحب" کہا کرتے تھے۔ وہ ہفتے کے روز ۲۹۔ نومبر ۱۹۰۲ء کو پھلواری شریف (ضلع پٹنہ صوبہ بہار' ہندوستان) میں پیدا ہوئے' تصوف و سلوک کی گود میں شعور کی آنکھیں کھولیں اور علم و عرفان کے ماحول میں پرورش پائی۔ قرآن مجید اور اردو' عربی اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گھر میں پڑھیں۔ ان کے والد شاہ سلیمان پھلواروی بہت بڑے عالم اور قاری تھے' جعفر شاہ صاحب نے بھی قرات و تجوید پر عبور حاصل کیا۔ ساتھ ہی سرکاری سکول میں داخلہ لیا اور میٹرک تک تعلیم پائی۔

برصغیر میں وہ سیاسی ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ پورا ملک انگریزی حکومت کے خلاف میدان عمل میں اتر آیا تھا اور عدم تعاون (نان کواپریشن) کی تحریک زوروں پر تھی۔ خود شاہ محمد جعفر کے والد مکرم حضرت شاہ سلیمان پھلواروی اس تحریک کے اہم رکن تھے۔ اس کے نتیجے میں

شاہ صاحب نے میٹرک کے بعد کالج میں داخلہ نہیں لیا' بلکہ لکھنؤ کا رخ کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخل ہو گئے' جس کے بانیوں میں خود ان کے والد محترم بھی تھے۔

ندوۃ العلما میں شاہ صاحب نے اس دور کے جلیل القدر اساتذہ کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا' جن میں شمس العلما مولانا حفیظ اللہ' مولانا عبدالرحمٰن نگرامی' مولانا حیدر حسن ٹونکی' مولانا شبلی فقیہ اور مولانا عبدالودود کے اسماے گرامی شامل ہیں۔ ان سے تفسیر' حدیث' فقہ' عربی ادبیات اور معقولات کی تکمیل کی۔

۱۹۲۴ء میں ندوے سے فارغ ہوئے۔ اس کے بعد مضمون نگاری' فتاویٰ نویسی' وعظ و ارشاد' تصنیف و تالیف' تبلیغ و اشاعت دین اور روحانی فیض رسانی میں مشغول ہو گئے۔ یہ وہ بنیادی خدمات تھیں' جو اس خانوادۂ ذی احترام کے اصحاب علم طویل عرصے سے سرانجام دے رہے تھے۔

۱۹۳۳ء میں وہ کپور تھلہ کی شاہی مسجد کے منصب خطابت پر فائز ہوئے۔ یہ ایک عظیم منصب تھا جو انھیں پنجاب کی ایک سکھ ریاست میں سرکاری طور پر تفویض ہوا۔ کپور تھلے میں ان کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ہر حلقے کے لوگ نہایت احترام سے پیش آتے تھے' ہندو اور سکھ بھی ان کی انتہائی تکریم کرتے تھے۔

کپور تھلہ میں شاہ صاحب کے دور قیام کا یہ واقعہ بھی سنتے جائیے کہ وہاں کے ایک مقام سلطان پور لودھی میں ایک بزرگ مستری محمد صدیق فروکش تھے' جو کسی زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ رہے تھے اور مولانا ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اپنے بعض مکتوبات میں مولانا نے ان کا بہترین الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ مستری صاحب جماعت اسلامی کے تاسیسی اجلاس (منعقدہ ۲۵' ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء) میں بھی شامل تھے اور میں نے پہلی مرتبہ ان کو وہیں دیکھا تھا۔ نہایت مخلص اور پابند احکام اسلام تھے۔ انھوں نے ریاست کپور تھلہ میں یہ تحریک جاری کر رکھی تھی کہ مسلمانوں کو اپنے مقدمات انگریز کی عدالت میں نہیں لے جانے چاہییں۔ وہ قرآن و حدیث کے مطابق فیصلے کرائیں اور اس کے لیے اسلامی عدالتیں قائم کریں۔ اس کا آغاز انھوں نے خود ہی کیا۔ وہ اس طرح کہ سلطان پور لودھی سے نقل مکانی کر کے وہ ''آدھی کھوئی'' کے مقام پر جا بسے تھے' جو سلطان پور لودھی اور کپور تھلہ کے درمیان پڑتا تھا' وہاں انھوں نے عدالت قائم کی' جس کا نام اسلامی عدالت تھا اور شاہ

صاحب کو اس کا "قاضی" مقرر کیا گیا تھا۔ جس دن یہ عدالت لگتی' اس دن شاہ صاحب' یعنی قاضی صاحب وہاں تشریف لے جاتے اور کرسیٔ عدالت پر بیٹھ جاتے۔ کرسی عدالت نام تھا نماز پڑھنے والی صف کا یا کسی پھٹی پرانی بوری کا---!

مستری صاحب ہاتھ میں لاٹھی رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کو گھیر گھار کر لاتے اور قاضی کی عدالت میں پیش کرتے۔ فریقین قاضی صاحب کے سامنے صف پر بیٹھ جاتے۔ قاضی صاحب آلتی پالتی مار کر تشریف فرما ہوتے اور مقدمات کی سماعت کرتے' ساتھ ہی پان کا بٹوا رکھتے اور تھوڑی دیر بعد پان کی گلوری منہ میں ڈالتے جاتے۔ زیادہ تر مقدمات میاں بیوی کے گھریلو جھگڑوں کے متعلق ہوتے تھے۔

اب قاضی صاحب فریقین کے بیانات لے رہے ہیں اور مستری صاحب خاموش بیٹھے ہیں۔ اندر سے مستری صاحب کی اہلیہ محترمہ فریقین کو ذرا بلند آواز سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں۔ ان سے تو اپنے گھریلو جھگڑے ختم نہیں ہوتے' تمھارے جھگڑے کیسے ختم کرائیں گے؟ اس پر مستری صاحب تو چپ رہتے لیکن قاضی صاحب ہنس پڑتے اور محترمہ سے کچھ نہ کہہ پاتے۔ ان پر توہین عدالت کا مقدمہ بھی قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید اسلام میں "توہین عدالت" کا تصور بھی نہیں ہے۔

اس کی تفصیلات مستری محمد صدیق صاحب کے حالات میں بیان ہونی چاہئیں۔ یہاں عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کپور تھلہ میں شاہ صاحب "منصب قضا" پر بھی فائز رہے اور فرائض عدل و انصاف سرانجام دیتے رہے۔

آزادی کے بعد وہ کپور تھلے سے پاکستان آئے اور کچھ عرصہ اوکاڑہ میں مقیم رہے۔

قیام پاکستان سے چند مہینے بعد مغربی پنجاب کی حکومت نے لاہور میں ایک تحقیقی ادارہ قائم کیا تھا' جس کا نام تھا "ری کنسٹرکشن آف اسلام" اس کا ڈائریکٹر مشہور نو مسلم عالم علامہ محمد اسد کو مقرر کیا گیا تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر سید نذیر نیازی مرحوم تھے۔ ارکان تھے شاہ محمد جعفر پھلواروی' مولانا محمد حنیف ندوی' سید شبیر احمد' مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی' مولانا شفیق الرحمٰن۔ اور رشید اختر ندوی----!

مولانا شفیق الرحمٰن کا کام مختلف کتابوں سے زیر بحث موضوعات کے حوالے تلاش کرنا تھا' اس لیے از راہ مزاح انھیں "حوالدار" کہا جاتا تھا۔ شاہ صاحب کو اوکاڑے سے لاہور

بلایا گیا تھا اور وہ تنہا لاہور آئے تھے۔ اہل و عیال اوکاڑے ہی میں مقیم رہے۔ یہ ادارہ کم و بیش ڈیڑھ سال قائم رہا۔

مغربی پنجاب کے آخری انگریز گورنر فرانسس موڈی نے اسے ختم کر دیا تھا۔ اس کے بعد شاہ صاحب پھر اوکاڑے چلے گئے تھے۔

شاہ صاحب کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۳۹ء میں فیروز پور (مشرقی پنجاب) میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ کپور تھلے کی شاہی مسجد کے خطیب تھے اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے افکار سے متاثر تھے۔ اسی سلسلے میں دعوت و تبلیغ کے لیے وہ فیروز پور چھاؤنی تشریف لائے تھے۔ مولانا عطاء اللہ حنیف ان دنوں فیروز پور شہر میں مقیم تھے اور وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث (گنبداں والی) میں خطابت و تدریس کی ذمے داریاں ان کے سپرد تھیں۔ انھیں شاہ صاحب کی آمد کا پتا چلا تو ملاقات کو گئے اور ان کو اپنے ہاں لے آئے۔ مولانا عطاء اللہ صاحب کے دوستوں میں ایک شخص مستری محمد علی تھے، وہ بھی مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر تھے۔ انھیں شاہ صاحب کی تشریف آوری کا علم ہوا تو ان کی خدمت میں آئے اور ان سے منظوری لے کر نماز عشا کے بعد جلسہ عام کا اہتمام کیا، اس میں بہت محدود تعداد میں لوگ شامل ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے جلسے میں تقریر کی۔ اسے چھوٹی سی "جلسی" کہنا چاہیے جو قصوری دروازے کے اندر ایک مسجد کے سامنے سڑک پر ہوئی تھی اور اس وقت کی جماعت اسلامی کے قد کے عین مطابق تھی۔

میری عمر اس وقت چودہ سال کی تھی اور میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقہ تلامذہ میں شامل تھا۔ شاہ صاحب کا قیام مولانا کے ہاں تھا اور یہ دونوں بزرگ دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ مولانا مودودی کے افکار بھی زیر بحث آئے، لیکن مولانا عطاء اللہ صاحب کو اس معاملے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ شاہ صاحب البتہ ان دنوں مولانا مودودی کے بہت مداح تھے۔ ان کی بعض کتابیں ان کے پاس تھیں، جن کے اقتباسات پڑھ کر وہ سناتے رہے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد (اگست ۱۹۴۱ء) لاہور میں جماعت اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے تاسیسی اجلاس میں برصغیر کے بعض مشہور علما و زعما شریک ہوئے تھے۔ مولانا حکیم عبداللہ (روڑی والے) مرحوم اور مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم نے بھی اس میں شرکت کی

تھی- میں بھی ان کے ساتھ شامل اجلاس تھا اور مجھے اس کی بہت سی باتیں یاد ہیں-اس میں شاہ محمد جعفر پھلواروی بھی موجود تھے- مجھے بعض دیگر شرکاے اجلاس کا تو پتا ہے اور اس میں جو کارروائی ہوئی اور جس طریقے سے ہوئی' وہ بھی ذہن میں محفوظ ہے' لیکن شاہ صاحب کے بارے میں اس اجلاس کی کوئی بات یاد نہیں-(اس اجلاس کی تفصیل ان شاء اللہ اس مضمون میں آپ کے مطالعے میں آئے گی جو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں لکھا گیا ہے اور شخصیات کے اس مجموعے میں شامل ہے جو عنقریب چھپنے والا ہے)

شاہ صاحب جماعت اسلامی کے باقاعدہ رکن تھے' لیکن کچھ عرصہ بعد اس سے الگ ہو گئے تھے- تاہم جماعت کے پرانے لوگوں سے ان کے ذاتی تعلقات ہمیشہ قائم رہے- بالخصوص ملک نصر اللہ خاں عزیز سے ان کے گہرے مراسم تھے-

۱۹۴۹ء کے آخری دنوں کی بات ہے کہ اوکاڑہ میں جامعہ محمدیہ کی طرف سے ایک جلسہ منعقد ہوا- اس زمانے میں ہفت روزہ "الاعتصام" گوجرانوالہ سے نیا نیا جاری ہوا تھا-(بعد کو یہ اخبار لاہور منتقل ہو گیا تھا) مولانا محمد حنیف ندوی اس کے ایڈیٹر تھے' اور میں ان کا معاون تھا- جامعہ محمدیہ اوکاڑہ کے مہتمم مولانا معین الدین لکھوی نے ہمیں بھی اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی- شاہ صاحب ان دنوں اوکاڑے میں مقیم تھے- ہم وہاں پہنچے تو انھوں نے ہم دونوں کو چاے پر بلایا- مولانا محمد حنیف ندوی کے تو وہ پرانے اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے' مجھ سے متعارف نہ تھے' لیکن اس طرح پیش آئے جیسے کبھی کوئی فاصلہ ہی نہ تھا- نہایت تپاک سے ملے' انتہائی محبت کا برتاؤ کیا اور شان دار چاے پلائی- فرمایا: "میں وہابی چاے نہیں پلاؤں گا' خالص چاے پلاؤں گا- وہابیت کی اس میں قطعاً آمیزش نہ ہو گی-----" یہ میری ان سے پہلی باقاعدہ ملاقات اور دوسری رویت تھی-

اس موقعے پر شاہ صاحب نے ایک اور صاحب کو بھی دعوت دی تھی جو اگرچہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے تھے مگر نہایت معقول اور دلچسپ آدمی تھے-ان میں عجیب تربات یہ دیکھی کہ نہ انھوں نے مولانا مودودی کا نام لیا' نہ ان کے لٹریچر کا ذکر کیا' نہ ان کی دعوت کا تذکرہ چھیڑا اور نہ ان کے افکار و خیالات کو موضوع گفتگو ٹھہرایا- حالاں کہ جماعت اسلامی والوں کو اس وقت تک سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا جب تک وہ مولانا مودودی' ان کے لٹریچر یا جماعت اسلامی کا کسی نہ کسی صورت میں نام نہ لیں' بالکل اسی طرح جس طرح کہ

میری اس وقت تک تسلی نہیں ہوتی جب تک کہ کسی انداز میں اہل حدیث کا ذکر نہ کرلوں۔ لیکن وہ بڑے دل گردے کے آدمی تھے۔ جماعت اسلامی سے منسلک ہونے کے باوصف اسی قسم کی باتیں کرتے رہے جو اس مجلس کے آداب کے مطابق تھیں۔ شاہ صاحب نے ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ میرے چاے کے ساتھی ہیں۔ یہ بھی چاے کے شوقین ہیں' میں بھی چاے کا شوقین ہوں۔ بس ہمارا یہی تعلق ہے اور یہ تعلق دوسرے تمام تعلقات پر بھاری ہے۔ انھوں نے بھی شاہ صاحب کے اس فرمان کی تائید کی۔

میں نے ہر چند اس مجلس میں خاموش رہنے کی کوشش کی اور چاہا کہ اپنے آپ کو صرف سماعت تک محدود رکھوں' لیکن شاہ صاحب بار بار اس انداز سے مخاطب ہوئے کہ مجبوراً مجھے خاموشی کا قفل توڑ دینا پڑا۔ مولانا حنیف ندوی نے جن الفاظ میں شاہ صاحب سے میرا تعارف کرایا تھا' وہ الفاظ بھی اس کے متقاضی تھے کہ شاہ صاحب مجھے خاموش نہ رہنے دیتے۔ چنانچہ ہم نے تکلف کا گھونگھٹ اتارا اور تفاوت سن و سال کی پروا کیے بغیر مبادلہ لطائف و ظرائف میں شامل ہو گئے۔ خیال کیا کہ جب مولانا حنیف ندوی اور شاہ صاحب اور جماعت اسلامی کے یہ بزرگ کسی نوع کا تکلف نہیں کر رہے ہیں تو ہمیں خاموش رہنے اور منہ بسور کر بیٹھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔ پھر کیفیت یہ ہوئی کہ:

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

یہ شاہ صاحب سے میری اولین ہم کلامی اور ہم مجلسی تھی جو آگے چل کر ہمیشہ کے لیے گہرے مراسم اور بے تکلفی میں بدل گئی۔

شاہ صاحب اس زمانے میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے' اس سلسلے کے چند واقعات بھی بیان کیے' لیکن اس حالت میں بھی نہایت خوش و خرم تھے۔ کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا۔ ہر تکلیف لطیفے کے سانچے میں ڈھال دی اور ہر عسرت کو ظرافت کا خلعت پہنا دیا۔ اسے ان کی فطری بلندی اور طبعی کمال سے تعبیر کرنا چاہیے۔

۱۹۵۰ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ قائم ہوا۔ اس کے بانی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم تھے' جو اس کے پہلے اکیڈمک ڈائریکٹر بھی تھے۔ انھوں نے ادارے میں تصنیف و تالیف کے لیے جن ارکان کا انتخاب کیا' ان میں شاہ محمد جعفر پھلواروی کا اسم گرامی بھی تھا شامل۔ وہ

۱۵- جون ۱۹۵۱ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آئے- اس سے ایک مہینہ پہلے ۱۵- مئی کو مولانا محمد حنیف ندوی کو رفیق ادارہ مقرر کیا گیا تھا- میں اس زمانے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) کی ادارت کے فرائض انجام دیتا تھا- ادارہ ثقافت اسلامیہ میں میری آمدورفت تھی' وہاں شاہ صاحب سے بھی ملاقات ہوتی اور گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا-

جنوری ۱۹۵۸ء کو میں نے سہ روزہ ''منہاج'' جاری کیا- اب شاہ صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ اور وسیع ہو گیا- اس لیے کہ وہ اس کے لیے کبھی کبھی کوئی مضمون عنایت فرمادیتے تھے ---- یہ اخبار صرف چودہ مہینے جاری رہ سکا اور میں نے پھر ''الاعتصام'' کی ادارت سنبھال لی-

۳۰- مئی ۱۹۶۵ء کو میں ''الاعتصام'' کی ادارت سے علیحدہ ہو گیا اور ۲۱- اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آگیا- اب شاہ صاحب کی مجلسوں میں بالالتزام شامل ہونے اور ان کو بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا- ان کی وسعت تحقیق و کاوش کا تو مجھے پہلے سے علم تھا' لیکن اب قریب آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ تفسیر' حدیث' فقہ' ادبیات اور معقولات و منقولات پر وہ عمیق نگاہ رکھتے ہیں- فقہ کے تمام مکاتب فکر یعنی فقہ مالکی' فقہ شافعی' فقہ حنفی اور فقہ شیعہ اور اس کے مختلف گوشوں سے باخبر ہیں- مختلف مسائل میں ائمہ فقہ کے نقطہ فکر اور فروعی اختلاف کی نوعیت سے انھیں آگاہی حاصل ہے اور اس کی وضاحت و صراحت اور دلائل کی روشنی میں خاص نتیجے تک پہنچنے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آتی-

ان میں اللہ نے یہ خوبی ودیعت فرمائی تھی کہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے علمی کام میں ان کی مدد کرتے اور اس سے خوش ہوتے تھے-

وہ خشک عالم دین نہ تھے- نہایت خوش مزاج' خوش طبع' خوش لباس' خوش خوراک' بلند اخلاق' فراخ حوصلہ اور بذلہ سنج تھے- لطافت اور ظرافت میں مشہور تھے- کسی مجلس میں ہوں' لطیفہ گوئی ان کے ساتھ رہتی تھی اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے- شعر و شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے- قدیم اور جدید شعرا کے بے شمار اشعار انھیں یاد تھے- خود بھی اردو میں اچھے شعر کہتے تھے- فارسی میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے- عربی کے بہت سے شعر ان کے نوک زبان تھے- ذہین و فطین اور قوی حافظہ تھے- ایسے ایسے لطائف اور چٹکلے بیان کرتے کہ مجلس کشت زعفران بن جاتی- لیکن اس کے ساتھ ہی

بہت نیک اور پرہیز گار تھے۔ نماز کا وقت ہوتا تو چپکے سے اٹھتے' اندر جا کر نماز پڑھتے اور واپس آجاتے۔ نیکی اور پرہیز گاری کا ڈھنڈورہ پیٹنے کے عادی نہ تھے۔ مسائل پر عبور حاصل تھا۔ مختلف اوقات اور مواقع کے لیے جو دعائیں رسول اللہ ﷺ سے مروی اور احادیث میں منقول ہیں' انھیں خوب یاد تھیں اور ان کے فوائد دل نشین اسلوب میں بیان کرتے تھے۔

تجوید و قرات کے قواعد سے اچھی طرح واقف تھے اور قرآن مجید کی تلاوت ایسی دل سوزی اور لحن سے کرتے کہ سماں بندھ جاتا اور سامعین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ ریا و سمعہ اور غرور و نخوت سے انھیں شدید نفرت تھی۔ خلوص و محبت کا پیکر حسین تھے۔ دوسرے کی ہمدردی اور دل جوئی ان کی فطرت میں داخل تھی۔

مثنوی مولانا روم سے کہنا چاہیے کہ انھیں عشق تھا۔ کبھی کبھی اس ترنم سے مثنوی کے اشعار پڑھتے کہ جی چاہتا' وہ پڑھتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔

الفاظ کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ صحابہ کرام اور محدثین و فقہا کے اسماو اعلام کے اعراب کا مسئلہ بڑا نازک ہے' اس سلسلے میں ان کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ صحیح نام کیا ہے اور اس کا تلفظ کس طرح کرنا چاہیے۔ اگر ان کے سامنے کوئی شخص غلط لفظ بولتا یا کسی معاملے میں لغزش کر جاتا تو اس کے استہزا کو معیوب قرار دیتے اور نہایت نرمی سے تصحیح کر دیتے۔ البتہ نک چڑھے اور مغرور لوگوں سے انھیں شدید نفرت تھی۔

وہ اپنے علم و مطالعہ اور فہم و تحقیق کی بنا پر خاص نقطہ نظر کے حامل تھے' جس کے اظہار میں کسی نوع کی ہچکچاہٹ یا تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص دیانت داری سے ان سے اختلاف کرتا اور اس کی بات ان کی سمجھ میں آجاتی تو بغیر کسی ذہنی تحفظ کے مان لیتے اور اپنے فکر و خیال سے دست بردار ہو جاتے۔ خواہ مخواہ جھگڑتے رہنا اور نزاع کی سی صورت پیدا کیے رکھنا' ان کے مزاج کے منافی تھا۔ وہ صلح جو اہل علم تھے۔

۱۹۵۴ء کے نومبر میں سید رئیس احمد جعفری کراچی سے لاہور آگئے تھے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہو گئے تھے' وہ اپنی وفات (۲۷-اکتوبر ۱۹۶۸ء) تک ادارے سے وابستہ رہے۔ بعض مسائل کی تعبیر و تشریح میں وہ شاہ صاحب سے ہم آہنگ نہ تھے۔ کسی معاملے میں بات آگے بڑھ جاتی اور وہ شاہ صاحب کو ٹوکتے تو شاہ صاحب خاموشی اختیار کر لیتے اور رئیس صاحب کو اختلاف رائے کا پورا حق دیتے' یعنی دوسرے کے افکار و آرا کو کھلے

دل سے سننا اور اس کی قدر کرنا ان کے نزدیک ضروری تھا۔

شاہ صاحب نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں یکے بعد دیگرے چار ڈائریکٹروں کا زمانہ پایا۔ پہلے ڈائریکٹر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے، جنھوں نے ۳۰- جنوری ۱۹۵۹ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے کراچی میں وفات پائی اور لاہور میں مدفون ہوئے۔ دوسرے میاں محمد شریف تھے، جو اسی عارضے سے ۱۱- دسمبر ۱۹۶۵ء کو فوت ہوئے، تیسرے ڈاکٹر شیخ محمد اکرام تھے، وہ بھی اسی مرض سے ۱۶- جنوری ۱۹۷۳ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ چوتھے ڈائریکٹر اپریل ۱۹۷۳ء میں پروفیسر محمد سعید شیخ مقرر ہوئے، جو مئی ۱۹۸۴ء تک اس منصب پر فائز رہے۔ ان چاروں حضرات کے نزدیک شاہ صاحب کو قدر و منزلت حاصل رہی۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب بڑے دلچسپ آدمی تھے۔ وہ مولانا حنیف ندوی اور شاہ صاحب سے کہا کرتے تھے کہ مجھے آپ دونوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آپ مسجدوں میں سالہا سال تک خطیب رہے اور اس حیثیت سے ایک خاص مزاج و فطرت کے لوگوں سے آپ کا تعلق رہا، لیکن اس کے باوصف آپ نے زندہ دلی اور ظرافت کو محفوظ رکھا۔ یبوست اور عبوست نام کی کوئی شے آپ کے ذہن و فکر میں راہ نہ پا سکی۔

شاہ صاحب نہایت صابر و شاکر عالم دین تھے۔ کوئی مصیبت پہنچتی تو صبر و ضبط سے کام لیتے۔ ان کی وفات سے تقریباً پچیس سال قبل ان کی اہلیہ فوت ہوئیں، جو بڑی سلیقہ شعار اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا، مگر انھوں نے اسے بے حد صبر سے برداشت کیا۔ پھر اس سے چار پانچ برس بعد جوان سال داماد شاہ علی اکبر نے وفات پائی اور جوان بیٹی بیوہ ہو گئیں۔ اس پر بھی ضبط و شکیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔

ان کا گھرانا بنیادی طور پر صوفیا کا گھرانا تھا اور صوفیا کے سب اوصاف شاہ صاحب میں موجود تھے۔ ہم انھیں ازراہ مزاح ”ہشت پہلو“ کہا کرتے تھے، اس لیے کہ ان کے والد حضرت شاہ سلیمان پھلواروی قادری مسلک فقہی کے اعتبار سے متشدد قسم کے حنفی تھے۔ اساتذہ دارالعلوم ندوۃ العلما کے معتدل مزاج بزرگ تھے۔ شاہ صاحب کی بیوی رشتے میں سید نواب صدیق حسن خان کی نواسی کی بیٹی یا پوتی تھیں، یعنی اس لحاظ سے ان کا تعلق اہل حدیث سے بھی تھا۔ خود شاہ صاحب بڑے وسیع القلب تھے۔

سید نواب صدیق حسن خاں سے انھیں بالخصوص دلی لگاؤ تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے

پانچ یا چھ چینی کی طشتریاں دکھائیں جو نہایت خوب صورت اور خاصی وزنی تھیں اور نواب صاحب ممدوح کے استعمال میں رہی تھیں۔ان پر نواب صاحب کا نام خوب صورت الفاظ میں مرقوم تھا۔فرمایا یہ طشتریاں ان کی بیوی کو جہیز میں ملی تھیں۔نواب صاحب کے چند اور برتن بھی انھیں ملے تھے جو ٹوٹ گئے ہیں یا گم ہو گئے ہیں۔ان پر بھی نواب صاحب کا اسم گرامی کندہ تھا۔

شاہ صاحب کا خاص اسلوب تحریر تھا۔وہ تحریر اور گفتگو میں امالے کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔مثلاً اس معاملہ میں 'اس مسئلہ میں 'اس سلسلہ میں وغیرہ الفاظ کو اس معاملے میں' اس مسئلے میں 'اس سلسلے میں لکھتے اور بولتے تھے۔اگر انھیں "اس واقعہ کے بارے میں" یا "اس موقع پر" لکھنا یا بولنا ہوتا تو "اس واقعے کے بارے میں" اور "اس موقعے پر" لکھتے اور بولتے تھے۔

بعض دفعہ امالے میں وہ دور تک چلے جاتے۔ایک مرتبہ سفر حج کے واقعات بیان کرتے ہوئے کہا: "جب میں مدینے منورے پہنچا۔" یہ لفظ سن کر میں چونکا۔عرض کیا: "مدینے پہنچا" تو ہم نے سنا ہے لیکن یہ منورے کیا ہے؟ "منورہ" کا امالہ "منورے" نہیں ہو سکتا۔مدینہ منورہ کہنا چاہیے۔مکے معظمے' مدینے منورے' مدینے طیبے تو کوئی امالہ نہیں۔ہر لفظ کا امالہ نہیں کیا جا سکتا۔"میرے اللہ نے مجھ پر مہربانی فرمائی" کو کیا آپ "میرے اللے نے مجھ پر مہربانی فرمائی" کہیں گے؟ اس پر پہلے تو وہ ہنسے 'پھر فرمایا آپ ٹھیک کہتے ہیں' مدینہ منورہ کہنا چاہیے۔

ایک بار کہا کہ عربی کے مشہور ادیب اور ممتاز عالم دین مولانا تمنا عمادی مرحوم کا امالے کے سلسلے میں عجیب نقطہ نظر تھا۔وہ "میری توبہ" کو میری توبے" کہتے تھے۔بڑی مشکل سے انھیں سمجھایا گیا کہ لفظ "توبہ" کا امالہ نہیں ہو سکتا۔

شاہ صاحب نے ایک دن بتایا کہ ایک مرتبہ وہ جوش ملیح آبادی کے ہاں بیٹھے تھے کہ ایک صاحب آئے۔جوش نے ان سے پوچھا: بہت دنوں کے بعد آئے ہو'کہاں گئے تھے؟ بولے: "کلکتہ گیا تھا۔" یہ سن کر جوش' جوش میں آگئے۔بولے: یا تو تم یہاں سے چلے جاؤ یا میں اٹھ جاتا ہوں۔میں اس مجلس میں نہیں بیٹھ سکتا' جہاں "کلکتے گیا" کو "کلکتہ گیا" کہا جاتا ہو۔

بعض حضرات لکھنے میں امالہ نہیں کرتے۔مثلاً اس بارہ میں 'اس مسئلہ میں 'اس معاملہ میں 'اس سلسلہ میں لکھتے ہیں' لیکن پڑھنے میں امالہ کرتے ہیں۔یعنی اس بارے میں 'اس مسئلے

میں 'اس سلسلے میں پڑھتے ہیں۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کو املے کے لکھنے اور پڑھنے کے فرق کا کچھ پتا نہیں' وہ تقریر اور گفتگو میں بھی اس بارہ میں 'اس سلسلہ میں' بولتے ہیں۔ ان میں اچھے خاصے پڑھے لکھے اور مجلسی لوگ بھی ہیں۔

شاہ صاحب چھوٹوں پر شفقت فرماتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ جن دنوں میں "الفہرست" کا ترجمہ کر رہا تھا' ہم دونوں ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے۔ ایک دن کتاب کے ایک مقام کے چند الفاظ سمجھنے میں کچھ دقت پیش آئی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ان الفاظ کا ترجمہ یہ ہے اور وہی میں نے لکھ لیا۔ شاہ صاحب سے رجوع کیا تو انھوں نے مجھ سے اختلاف کیا اور فرمایا جو آپ نے ترجمہ کیا ہے وہ صحیح نہیں' صحیح ترجمہ یہ ہے۔

میں نے عرض کیا: میں یہ تو نہیں کہتا کہ آپ کا ترجمہ صحیح نہیں' البتہ اس پر مجھے اصرار ہے کہ میرا ترجمہ صحیح ہے۔ فرمایا کسی سے فیصلہ کرا لو۔

عرض کیا: میرا آپ کے ساتھ برابر کی سطح پر کھڑا ہو کے کسی سے انصاف طلب کرنا' قرین انصاف تو نہیں' لیکن چونکہ "مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات" اس لیے فرمایے کس سے فیصلہ کرایا جائے؟

فرمایا: ایک ہی شخص ہے جس سے یہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے اور وہ ہیں مولانا حنیف ندوی! اگر آپ کا ترجمہ صحیح ہوا تو پانچ روپے انعام دوں گا۔ اگر میرا صحیح ہوا تو آپ سے کچھ نہیں لوں گا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتفاق سے مولانا ندوی ہمارے کمرے میں تشریف لے آئے۔ پوچھا: کس مسئلے پر بحث ہو رہی ہے؟ شاہ صاحب نے الفہرست کے وہ الفاظ انھیں دکھائے اور فیصلہ طلب کیا۔ انھوں نے چند ثانیے غور کرنے کے بعد میرے حق میں فیصلہ دے دیا۔ شاہ صاحب نے کوئی بحث نہیں کی اور پانچ روپے جیب سے نکال کر مجھے دینے لگے۔ میں نے شکریے کے ساتھ انکار کیا تو مولانا ندوی نے کہا: سید کا تبرک ہے' لے لو اور پھر انھی کی نذر کر دو۔ شاہ صاحب مسکرائے۔ ہم نے اسی وقت پانچ روپے کی کوئی چیز منگوائی اور باجماعت کھائی۔

وہ اپنے کام اور فرائض کی انجام دہی میں بہت تیز اور محتاط تھے۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے ان کی جو تقریریں نشر ہوئیں ان کے بارے میں اس وقت کے ریڈیو پاکستان لاہور کے سینئر

پروڈیوسر عبدالحی قریشی صاحب نے ایک دن بتایا کہ ۱۹۵۶ء سے ان کی تقریروں کے مسودات محفوظ ہیں' لیکن تقریروں کا سلسلہ ۱۹۵۶ء سے قبل سے جاری تھا- اس زمانے میں پیشگی ریکارڈنگ کی سہولت میسر نہ تھی- شاہ صاحب سمن آباد رہتے تھے- رمضان کے مہینے میں سحری پروگرام کرنے کے لیے وہ رات کو ڈھائی بجے ریڈیو سٹیشن پہنچتے' کھانا گھر سے لے کر آتے اور ارکان عملہ کے ساتھ مل کر کھاتے' وہیں تہجد کی نماز پڑھتے' فجر کی نماز بھی وہیں ادا کرتے' اس کے بعد گھر جاتے- گرمی کا موسم ہو یا سردی کا' ہمیشہ ان کا یہی معمول رہا----احساس ذمہ داری کا یہ بہت بڑا ثبوت ہے-

خود کھانے اور دوسروں کو کھلانے کا انھیں بہت شوق تھا- ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ارکان کو کبھی کبھی گھر پر بلاتے اور پر تکلف کھانا کھلاتے- بعض دفعہ کسی ہوٹل میں لے جاتے اور ہر شخص کے ذوق اور پسند کے مطابق کھانے کا آرڈر دیتے- مولانا حنیف ندوی ان کو کھانا کھاتے دیکھ کر از راہ مذاق کہا کرتے تھے: "شاہ صاحب نہایت خشوع و خضوع سے کھانا کھا رہے ہیں-"

انھیں خوب معلوم تھا کہ کس ہوٹل میں کس طرح کا کھانا تیار ہوتا ہے اور کہاں کیا خاص چیز ملتی ہے- اس زمانے میں بیڈن روڈ اور کوپر روڈ کے نکڑ پر ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کھیر بڑی عمدہ پکائی جاتی تھی- شاہ صاحب کو اس کا علم تھا- بارہا ہم دونوں نے وہاں جا کر کھیر کھائی- کبھی کبھی مولانا حنیف ندوی کی شرکت کا اعزاز بھی حاصل ہو جاتا-

شاہ صاحب پلاؤ بڑی رغبت سے کھاتے تھے- ان سے اگر پوچھا جاتا:

"پہلے کیا کھانا چاہیے؟"



فرماتے: "پلاؤ!"

"پھر کیا کھانا چاہیے؟"

جواب دیتے: "پلاؤ-"

"پھر کیا؟"

"پھر بھی پلاؤ- بس مسلسل پلاؤ کھاتے جاؤ-"

وہ جھاڑ پھونک اور تعویذ وغیرہ بھی خاص خاص لوگوں کے لیے کرتے تھے' لیکن اس کے بدلے میں کسی سے روپیہ پیسہ نہیں لیتے تھے- ایک دفعہ میرے ایک دوست محمد انور

زاہدی (مرحوم) کی بیوی اور بیٹی بیمار پڑ گئیں- علاج معالجہ کرایا مگر آرام نہیں آیا- انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں شاہ صاحب سے کہوں' ان کے گھر جا کر ماں بیٹی کو دم کر دیں-

میں نے شاہ صاحب عرض کیا تو فرمایا: انور صاحب میرے مکان پر آ جائیں اور مجھے اپنے گھر لے چلیں- انور صاحب گئے تو شاہ صاحب تیار ہو گئے- رکشہ لیا' انور صاحب کو ساتھ بٹھایا اور ان کے گھر کرشن نگر پہنچ گئے- انور صاحب کرایہ دینے لگے تو شاہ صاحب نے فرمایا' رکشہ میں نے لیا تھا' میں ہی کرایہ دوں گا- ماں بیٹی کو دم کیا' تعویذ لکھ کر دیا اور کچھ روپے بھی عنایت کیے- انھوں نے لینے سے انکار کیا تو فرمایا مریض کو کچھ دینا چاہیے' اس سے لینا نہیں چاہیے' شرعی مسئلہ یہی ہے-



نہ ان سے چائے پی' نہ پانی پیا کہ بیمار سے کھانا پینا مناسب نہیں- یہ تو خود تکلیف میں ہیں دوسروں کو کیا کھلائیں پلائیں گے- پھر باہر آ کر واپسی کے لیے رکشہ لیا- وہ کرایہ دینے لگے تو فرمایا: آپ کو کیوں تکلیف دوں' مجھے اپنے گھر اپنے ذریعے سے پہنچنا چاہیے-

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں جعفر شاہ صاحب بھی تھے اور رئیس احمد جعفری بھی- دونوں خوش طبع تھے- جعفر صاحب یا جعفری صاحب سے کوئی صاحب ملاقات کو آتے تو ہم ان سے کہتے کہ ہم نے کبوتر اور کبوتری کی طرح جوڑا رکھا ہے' جعفر بھی اور جعفری بھی- آپ کو کس کی ضرورت ہے- اس سے وہ محظوظ ہوتے- ملاقات کو آنے والے بھی خوش ہوتے-

وہ عام طور پر کرتہ' پاجامہ' شیروانی اور جناح کیپ پہنتے تھے- کبھی لباس مشیخت بھی زیب تن فرما لیتے- یعنی پاجامہ' کرتہ' جبہ اور سبز عمامہ---! مگر یہ عجیب بات ان میں دیکھی کہ کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرتے تو انگریزی سوٹ اور ہیٹ پہن کر آتے اور بہترین ٹائی لگاتے- (میں نے تین چار مواقع پر انھیں اسی لباس میں دیکھا) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی صاحب زادی ڈاکٹر رفیعہ حسن کی شادی میں بھی وہ اسی لباس میں آئے تھے--- خلیفہ صاحب نے مولانا حنیف ندوی سے کہا: "کسی نکاح خواں کو لائیے-"

مولانا نے شاہ صاحب کو پکڑا اور خلیفہ صاحب کے پاس لے گئے- کہا: "جلدی سے کوئی مولوی تو ملا نہیں' پادری کو لے آیا ہوں"----- شاہ صاحب کی داڑھی کی تراش خراش اور شکل وصورت انگریز پادریوں کی سی تھی---- مجلس میں ایک قہقہہ بلند ہوا اور شاہ صاحب نے نکاح خوانی کے فرائض انجام دیے-

اسی طرح (لاہور کے ایک سابق ایس ایس پی' اور پنجاب کے سابق آئی جی جیل خانہ جات) رانا جہاں داد خان کی بیٹی کی تقریب شادی میں مجھے دعوت شرکت دینے کے لیے رانا صاحب کے چھوٹے بھائی رانا غلام صابر خاں مرحوم ہمارے دفتر آئے۔ وہ اس زمانے میں پاکستان کی پارلیمنٹ کے رکن تھے اور میرے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے کہا کہ شاہ صاحب کو بھی دعوتی کارڈ پیش کرنا ہے اور ان سے عرض کرنا ہے کہ نکاح وہی پڑھائیں گے۔ میں نے شاہ صاحب سے ان کا تعارف کرایا اور انھوں نے شرکت کی دعوت دی۔ شاہ صاحب انگریزی لباس پہن کر آئے اور خطبہ نکاح کے بعد میاں بیوی کے حقوق پر انگریزی میں تقریر کی۔ کسی نے کہا اس کا ترجمہ بھی کر دیجیے۔

فرمایا: مترجم کوئی اور ہوتا ہے' مقرر اپنی تقریر کا ترجمہ نہیں کرتا۔

ان کی نواسی کی شادی ہوئی تو اس میں بھی "نانا ابا" پورے ٹھاٹھ باٹھ سے انگریزی لباس میں ملبوس تھے۔

وہ خوش مزاج بھی تھے اور حاضر جواب بھی۔ ایک دفعہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ہالینڈ کے ایک مستشرق آئے۔ وہ ادارے کے سیکرٹری محمد اشرف ڈار کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مولانا حنیف ندوی اور شاہ صاحب بھی موجود تھے' میں بھی حاضر تھا۔ مستشرق انگریزی میں بات کرتے تھے اور مولانا حنیف ندوی اردو میں جواب دیتے تھے' ڈار صاحب اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتے تھے' لیکن مولانا کو ان کی بات سمجھانے کے لیے ترجمے کی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ مولانا انگریزی سمجھتے اور جانتے تھے' لیکن بولتے نہیں تھے۔ شاہ صاحب ان کے ساتھ انگریزی میں بات کرتے تھے۔ مہمان نے مولانا سے کہا: آپ انگریزی سمجھتے ہیں' بولتے کیوں نہیں۔ شاہ صاحب نے فوراً انگریزی میں جواب دیا: "یہ انگریزی سمجھتے ہیں اور بولتے نہیں' میں انگریزی بولتا ہوں اور سمجھتا نہیں۔" مہمان اس فقرے پر خوب ہنسے اور شاہ صاحب کو داد دی۔

ایک دن میں نے ان سے کہا آپ بہت بڑے پیر اور گدی نشین تھے اور خاندانی طور سے پیری مریدی کا سلسلہ جاری تھا' وہی کام کرتے رہتے۔ بہت اچھا اور فائدے مند کام تھا۔ دوسرے جھمیلوں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ کہنے لگے' جب میرے والد پیر تھے' میں کہا کرتا تھا کہ یہ آمدنی ناجائز ہے۔ مرید پیسے دیتے ہیں اور ہم کھاتے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد

میرے بڑے بھائی شاہ حسین گدی نشین ہوئے تو میں ان کی آمدنی کو اور زیادہ زور سے محل تنقید ٹھہرانے لگا۔ ان کے بعد میں خود پیر بن گیا۔ اب لوگ آتے ہیں اور مجھے جبراً اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ کہیں پیر صاحب مریدوں کے ساتھ پیدل چل رہے ہیں، کہیں بیل گاڑی میں سوار ہیں، کہیں سائیکل پر جارہے ہیں، کبھی سائیکل خود چلارہے ہیں، کبھی کسی کے آگے یا پیچھے بیٹھے ہیں۔ کہیں پگڈنڈی ہے، کہیں کانٹے ہیں اور برا حال ہو رہا ہے۔

کسی منزل پر پہنچتے ہیں تو چائے پینے کو جی للچاتا ہے، لیکن مرید دودھ کا پیالہ بھر کرلے آتے ہیں اور ساتھ ہی نصیحت فرماتے ہیں کہ حضرت دودھ نوش فرمایا کریں، چائے گرمی پیدا کرتی ہے، اسے چھوڑ دیجیے۔ حقے یا بیڑی کی طلب ہے تو پی نہیں سکتے کہ مریدوں پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے۔ لیٹنے کو جی چاہتا ہے تو تعویذ لکھوانے اور دم کرانے والے آگئے ہیں۔ سونے کو جی چاہتا ہے تو مرید درس و وعظ کے لیے مجبور کرنے لگے ہیں۔ لطیفے بازی کا موڈ بنتا ہے مریدوں کی وجہ سے خاموشی اختیار کرنا پڑتی ہے، پاؤں پھیلانے کو جی چاہتا ہے تو آداب مجلس کے خلاف ہے۔ بس دوزانو ہو کر بیٹھے ہیں۔ واپس گھر جانے کا ارادہ کرتے ہیں تو مرید جانے نہیں دیتے اور دوسرے گاؤں لے جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ مسلسل مصیبت میں مبتلا ہیں۔

اس سخت اذیت ناک صورت حال سے جب میں خود دوچار ہوا تو آنکھیں کھلیں، اپنا نقطہ نظر بدلنے اور سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ عین حلال کی کمائی یہی ہے جو اتنی مشقت اور محنت سے حاصل ہوتی ہے اور جس میں دل اور جسم کو اس قدر تکلیف میں ڈالا جاتا ہے۔ یہ بات انھوں نے کچھ ایسے اسلوب سے بیان کی کہ لطائف کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ”مسلسل محنت و مشقت والی کئی کمائیوں“ پر اظہار خیال ہونے لگا۔

اللہ نے ان میں یہ خوبی ودیعت فرمائی تھی کہ اپنے ملنے والوں اور تعلق داروں سے بے حد ہمدردی اور خیر خواہی کا برتاؤ کرتے اور ان کی مدد کو ضروری قرار دیتے۔ میں نے ۱۹۶۷ء میں لاہور کی آبادی سانده میں چھوٹا سا مکان بنایا تو بہت خوشی کا اظہار کیا۔ ایک دن کہا، آپ نے مکان تو بنالیا لیکن جسے پنجابی میں ”چٹھ“ کہتے ہیں، وہ نہیں کی اور ہمیں دعوت نہیں کھلائی۔ عرض کیا، ایک اور کمرہ تعمیر ہو جائے تو آپ کو تکلیف دوں گا اور گھر لے جا کر دعا کراؤں گا۔ فرمایا اس کمرے پر کتنے روپے خرچ ہوں گے؟ عرض کیا: معمار نے تین ہزار

روپے کا اندازہ لگایا ہے- چند روز تک مجھے پیسے ملنے والے ہیں' پھر کام شروع کراؤں گا- فوراً چیک بک نکالی اور میرے نام کا اٹھارہ سو روپے کا چیک کاٹ کر مجھے دے دیا- میں نے شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ اس تکلیف کی ضرورت نہیں' بس چند روز کی بات ہے- روپے مل جائیں گے- فرمایا یہ روپے خرچ کرو' مجھے تین مہینے کو دے دینا' چھ مہینے کو دے دینا- پھر کہا دس مہینے کو دے دینا- ساتھ ہی فرمایا' میں کہنا تو نو مہینے چاہتا تھا' لیکن اس خیال سے کہ تم اس مدت کو مذاق پر محمول کرو گے' دس مہینے کہہ دیا ہے' مگر شرط یہ ہے کہ کسی کو بتانا نہیں' میرا ثواب ضائع ہو جائے گا-

میں نے ان کے مجبور کرنے پر چیک لے لیا' لیکن کئی دن بینک سے رقم وصول نہیں کی- اس اثنا میں چیک واپس لینے پر اصرار کرتا رہا' ---- انھوں نے نہیں لیا تو میں نے دفتر میں سب کو بتادیا اور بات پھیل گئی- ایک دن مجھ سے کہا' آپ نے دفتر کے لوگوں کو کیوں بتایا کہ میں نے اتنے روپے کا چیک دیا ہے؟ عرض کیا' قرآن کا حکم ہے' کسی سے لین دین کرو تو لکھ لیا کرو- ہم نے چوں کہ نہیں لکھا اس لیے میں نے بتا کر ان لوگوں کو گواہ بنالیا ہے- اگر میں یہ رقم واپس کرنے سے انکار کردوں تو یہ لوگ گواہی دیں گے کہ اتنی رقم آپ نے مجھے بطور قرض دی ہے- اس توجیہ سے مسکرا کر خاموش ہو گئے-

اس میں عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نے کمرے کی تعمیر کا کام شروع کیا تو آٹھ ہزار روپے خرچ ہو گئے اور سب قرض ---! ایک دن مولانا حنیف ندوی اور بعض دیگر حضرات کی موجودگی میں شاہ صاحب سے میں نے کہا' آپ نے اٹھارہ سو روپے دیے اور آٹھ ہزار خرچ ہوئے- یا تو آپ کے روپے بہت منحوس تھے کہ مجھے چھ ہزار کا اور مقروض بنادیا' یا بہت بابرکت تھے کہ چھ ہزار کا ان کی وجہ سے مزید اضافہ ہو گیا- فرمائیے دونوں میں کون سی بات صحیح ہے؟

جواب دیا: "پہلی"!

چند روز کے بعد میں نے انتہائی شکریے کے ساتھ روپے واپس کر دیے- ان کو گھر پر بلایا- کھانا کھایا' دعا کی اور بے حد خوش ہوئے-

ان کی کن کن باتوں کا ذکر کیا جائے- لکھنے بیٹھا ہوں تو بہت سی باتیں سطح ذہن پر ابھر آئی ہیں اور حافظہ خوابیدہ واقعات اگلنے لگا ہے- وہ شگفتہ کلام اور شائستہ فطرت عالم دین تھے-

اس ڈھنگ سے بات کرتے کہ سننے والا حیران رہ جاتا۔ بعض اوقات کوئی ایسا معما سا بیان فرماتے اور ایسے پیچ دار طریقے سے اظہار مدعا کرتے کہ اس کی تہہ تک وہی لوگ پہنچ سکتے جو ان کے اسلوب گفتگو سے آشنا تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

وہ لاہور کی آبادی سمن آباد میں رہتے تھے۔ پہلے کرائے کا مکان تھا' بعد میں این بلاک میں اپنا مکان بنالیا تھا۔ مکان کا نمبر تھا ۵۰۰ ہمارے ایک دوست عبدالحی قریشی صاحب جو اس وقت ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ تھے' سمن آباد میں مقیم تھے۔ ایک دن شاہ صاحب نے ان سے پوچھا:

"آپ کہاں رہتے ہیں؟"

کہا: "۸۰۔ مین روڈ سمن آباد میں۔"

سوال کیا: "آپ؟"

فرمایا: "میں بھی وہیں رہتا ہوں' این بلاک میں۔"

پوچھا: "مکان کا نمبر؟"

جواب دیا: "بہت آسان ہے۔ بس اپنے مکان کے نمبر میں' میرا ذاتی نمبر جمع کر دیجیے' میرے مکان کا نمبر ہو جائے گا۔"

یہ ایک معما بھی ہے' اسلوب بے تکلفی بھی ہے اور اپنے ظاہری تقدس کی نفی بھی ہے۔

اس متن کی تشریح یہ ہے کہ ۸۰ نمبر میں ان کا ذاتی نمبر یعنی ۴۲۰ جمع کر دیا جائے تو ان کے مکان کا نمبر یعنی ۵۰۰ ہو جائے گا۔

ان کی زوجہ مرحومہ کو علم و ادب سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ طویل عرصہ لکھنؤ میں رہی تھیں' اس لیے اردو زبان سے بالخصوص تعلق تھا۔ جب شاہ صاحب سے اردو کے محاورے وغیرہ کے بارے میں کوئی بات پوچھی جاتی اور وہ صحیح طور سے نہ بتا سکتے تو فرماتے "زوج اللغات" سے رجوع کروں گا اور کل بتاؤں گا۔

کسی زمانے میں وہ حقہ نوشی کرتے تھے۔ سگریٹ اور بیڑی بھی پیتے رہے' لیکن ۱۹۶۲ء میں اسے ترک کر دیا تھا۔ ایک دن حقے اور سگریٹ کے "فوائد" کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا۔ فرمایا: قیام پاکستان کے چند روز بعد جب کہ سکھ اور ہندو ابھی کیمپوں میں بیٹھے تھے'

میں لاہور میں تھا اور چھاؤنی کی طرف سے پیدل شہر کو آ رہا تھا۔ سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ میں نے دیکھا کہ چار پانچ مسلمان نوجوان مجھ سے کچھ فاصلے پر دوسری طرف جا رہے تھے، مجھے دیکھ کر رک گئے اور میری طرف اشارہ کر کے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ میں نے سوچا کہ انھوں نے مجھے سکھ سمجھا ہے اور وقت شہادت آ پہنچا ہے۔ ان کا ارادہ بھانپ کر میں کھڑا ہو گیا، جیب سے سگریٹ نکالا، اسے سلگایا، کش لگایا، دھواں فضا میں چھوڑا اور چل پڑا۔ اب ان نوجوانوں کو دیکھا تو آگے نکل چکے تھے۔ یہ گویا میرے اسلام کا ''ثبوت'' تھا۔

میں نے ان سے پوچھا: آپ حقہ پیتے رہے ہیں، حقہ کس وقت پینا چاہیے۔ بولے چار وقت ایسے ہیں، جب حقہ نوش کو بالخصوص حقے کی طلب ہوتی ہے، سو کر اٹھنے کے بعد، نہانے کے بعد، کھانے کے بعد اور گھر میں آنے کے بعد---!

وہ اصلاً ''پھلواری'' کے رہنے والے تھے اور اپنے آپ کو ''پھلواروی'' لکھتے تھے۔ اس طرح وہ وطناً تو ''پھلواری'' تھے ہی، واقعہ یہ ہے کہ طبعاً اور مزاجاً بھی ''پھلواری'' تھے۔ چلتا پھرتا باغیچہ اور رواں دواں گلستاں---!

اوراد و وظائف کے وہ پابند تھے اور اس سلسلے میں ان کے کچھ تجربات تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بٹوا گم ہو گیا، جس میں اچھی خاصی رقم بھی تھی اور بعض ضروری کاغذات بھی تھے۔ بہت تلاش کیا اور بار بار خلیفہ صاحب نے اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر بٹوا نہ ملا۔ وہ بڑے پریشان ہوئے۔ شاہ صاحب کو بتایا گیا تو انھوں نے کچھ وظیفہ پڑھا اور دو تین دفعہ اوپر کو منہ کر کے تالی بجائی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو بٹوا خلیفہ صاحب کی جیب میں تھا اور اسی جیب میں تھا جسے خلیفہ صاحب سب کے سامنے بار بار دیکھ چکے تھے۔

وہ لطائف سے بہت خوش ہوتے تھے۔ خود بھی لطیفے کی زد میں آ جاتے تو محظوظ ہوتے۔ بتایا بھی کرتے کہ فلاں آدمی نے مجھے نشانہ بنایا اور میں اس سے خوش ہوا۔ ایک مرتبہ فریضہ حج ادا کرنے گئے۔ واپس آئے تو ہم نے سوال کیا، سفر حج کی کوئی خاص بات بتایئے۔ فرمایا: خاص بات یہ ہے کہ میرے ایک ہندوستانی دوست جو جدے میں رہتے ہیں، مجھ سے ملے۔ انھیں شعر و شاعری اور اردو ادبیات سے لگاؤ ہے۔ کہنے لگے، میں نے ایک مجلس مشاعرہ کا اہتمام کیا ہے، جس میں پاکستانی اور ہندوستانی شعرا شرکت کر رہے ہیں، اس میں آپ کا شریک ہونا ضروری ہے۔ آپ اپنا کلام پیش کریں گے۔ میں مان گیا۔ بزم مشاعرہ

جبھی تو انھوں نے میرے نام کا اعلان کیا اور کہا کہ یہ حج کے لیے آئے تھے اور ان کی آمد سے ہم نے فائدہ اٹھایا ہے۔ ایک طرف سے آواز آئی: ”نو سو کا کورس پورا کر کے آئے ہیں۔“ اتفاق سے میں نے نظم بھی وہی پڑھی جو قیام اوکاڑا کے زمانے میں لکھی تھی اور اوکاڑے میں چوہوں کی کثرت سے متعلق تھی اور ہر وقت بلی کی ضرورت رہتی تھی---- سامعین نے خوب داد دی اور میں نے ثابت کر دیا کہ نو سو کی منزل محاورہ سے بفضل خدا بہت آگے نکل چکا ہوں۔

ان کے حج بیت اللہ کا ذکر آیا ہے تو یہ بھی بتا دوں کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے دوران قیام میں وہاں کے ریڈیو پر ان کی متعدد تقریریں نشر ہوئیں۔ سعودی عرب ریڈیو کا عملہ ان کی گفتگو اور انداز کلام سے بہت متاثر تھا۔

بعض مسائل کی تعبیریں ان کا اپنا ایک نقطہ نظر تھا، جس کے اظہار و بیان میں انھیں کوئی باک نہ تھا، لیکن اختلاف تعبیر ورائے کی بنا پر کسی سے تعلقات بگاڑنے کے عادی نہ تھے۔ کہا کرتے تھے زخم لگانا آسان ہے، اس کا اندمال مشکل ہے۔ علم و تحقیق کے میدان میں ایک دوسرے سے بہرحال اختلافات ہوتے ہیں، اسے وجہ انقطاع نہیں بنانا چاہیے اور اہل علم کو آپس میں لڑنا نہیں چاہیے، اتفاق سے رہنا چاہیے۔ ہر شخص کی اس کے مقام و مرتبے کے مطابق قدر کرنی چاہیے۔ جو علم لڑائی سکھاتا ہے وہ علم نہیں جہالت ہے۔ جس علم سے رواداری اور محبت کا جذبہ نہیں ابھرتا، اس کو علم کہنا، علم کی توہین ہے۔ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے اکثر اہل علم کسی مسئلے میں باہم اتفاق نہیں کرتے، ان کا اتفاق اور اتحاد صرف ایک جگہ پر ہوتا ہے اور وہ ہے دستر خوان---! یہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا۔ سب کامل اتفاق اور پورے اتحاد سے اکل و شرب کا فریضہ سر انجام دیتے نظر آئیں گے۔ سیاست دان بھی یہاں متفق ہوں گے اور علمائے کرام بھی کلیتاً ہم آہنگی کا ثبوت بہم پہنچائیں گے۔ یوں سمجھیے کہ ع

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

وہ جماعت اسلامی کے بانی ارکان میں سے تھے۔ بعض امور کی وجہ سے جماعت سے نکلے اور خاموشی اختیار کر لی۔ اس کے کسی معاملے سے متعلق نہ کبھی کوئی بیان دیا، نہ مضمون لکھا اور نہ تقریر کی۔ سب سے ملتے رہے اور سب سے تعلقات قائم رکھے۔

ایک دن میں نے عرض کیا: جماعت اسلامی سے "خروج" کی وجہ کیا تھی؟

فرمایا وہ ایک ٹریننگ اسکول تھا اور ٹریننگ اسکول میں ہمیشہ نہیں رہا جاتا' ایک خاص مدت کے لیے ہی رہا جاتا ہے۔ پھر فرمایا' اب یہ ٹریننگ اسکول بھی نہیں ہے۔

ان الفاظ کا آپ جو مرضی مطلب لے لیں' جماعت کی مخالفت سے تعبیر کر لیں یا ان کا مزاج سمجھ لیں یا اسے مزاح قرار دے لیں۔ اس کے علاوہ ان سے کبھی کوئی لفظ اس ضمن میں کم از کم میں نے نہیں سنا۔

ان کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ ایک خوبی ان میں یہ تھی کہ خواب کی تعبیر دینے میں ماہر تھے۔ مولانا حنیف ندوی بھی علم تعبیر رؤیا سے بہرہ ور تھے۔ انھوں نے خواب کی جو تعبیر دی صحیح ثابت ہوئی۔

معتدل اور متوازن جسم کے آدمی تھے۔ گورا چٹا رنگ' ستواں ناک' موٹی موٹی آنکھیں جن پر نظر کی عینک چڑھی رہتی اور قدرے لمبا قد۔ ابتدا میں سائیکل پر دفتر آتے تھے۔ پھر سائیکل سوزوکی لے لی تھی۔ بعد میں سکوٹر خرید لیا تھا۔ صحت اتنی اچھی تھی کہ جب ستر کی عمر کو پہنچے تو پچاس پچپن کے معلوم ہوتے تھے۔ سکوٹر چلاتے ہوئے جوان دکھائی دیتے تھے۔ اس حالت میں دیکھ کر میں انھیں کہا کرتا تھا۔

گھوڑے تے بیٹھا اڑیو لگ دا تھانے دار نی

وہ خوش ہوتے اور بصورت سوال فرماتے: سچ مچ ایسا ہی لگتا ہوں؟

اپنے ساتھی بالخصوص چھوٹے پر شفقت فرماتے۔ ایک ساتھ چلتے ہوئے تھوڑے بہت پیسے خرچ کرنے کی ضرورت پیش آتی تو (میرا تجربہ یہ ہے کہ) خود خرچ کرتے۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ۱۹۶۵ء میں مرکزی وزارت قانون نے ایک لیگل کمیٹی قائم کی تھی' جس کے ذمے یہ کام تھا کہ اسلام میں جو قانونی نوعیت کے مسائل ہیں ان پر غور کیا جائے اور انھیں قانونی زبان میں ڈھال کر متعلقہ وزارت کو بھیجا جائے۔ اس کمیٹی کے پانچ ارکان تھے' جن میں دو پاکستان کے مشہور قانون دان اور بیرسٹر یٹ لا تھے۔ ایک جناب عبدالشکور سلام جو اب وفاقی محتسب ہیں' دوسرے چوہدری محمد عارف جو اس وقت سپریم کورٹ کے جج ہیں۔ تیسرے جعفر شاہ صاحب' جن کی رہنمائی میں یہ کمیٹی کام کرتی تھی۔ چوتھے ڈاکٹر سخاء اللہ اور پانچواں یہ بندۂ عاجز---! بلکہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں میرا تقرر اس

کمیٹی کے رکن کی حیثیت ہی سے ہوا تھا- کمیٹی کا اجلاس ہفتے میں تین دن پیر' منگل اور بدھ کو نماز مغرب کے بعد ادارے کے دفتر میں ہوتا تھا اور ڈھائی تین گھنٹے جاری رہتا تھا-

میں اور شاہ صاحب ادارے کے مستقل ارکان میں سے تھے- اجلاس کے دنوں میں دفتر سے چھٹی کے بعد گھر جانا اور پھر واپس آنا مشکل ہوتا تھا' لہٰذا ہم دونوں عام طور پر شام تک دفتر ہی میں رہتے تھے- شاہ صاحب صبح کو اپنے اور میرے لیے گھر سے دوپہر کا کھانا لے آتے اور ہم اکٹھے کھانا کھاتے- جس دن وہ کھانا نہ لاتے' ہم کسی ہوٹل میں چلے جاتے- عام طور پر کھانے کا بل شاہ صاحب ادا کرنے کی کوشش کرتے' لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا کہ میں "بازی" لے جاتا- "کہنی مار کر" آگے نکل جاتا اور شاہ صاحب کو ان کے مقصد میں "ناکام" بنا دیتا- اور یہ بہت ہی کم ہوتا- ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ----!

اس زمانے میں انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل (جسے بعد میں پرل کانٹی نینٹل کہا جانے لگا ہے) زیر تعمیر تھا' اس میں مزدور' معمار' کلرک وغیرہ بہت سے لوگ کام کرتے تھے- اس کی کینٹین کا ٹھیکہ میرے ایک مرحوم دوست محمد محمود میمن نے لیا تھا- کینٹین میں سبزی' دال' بڑا گوشت' چھوٹا گوشت اور چائے وغیرہ سب کچھ ملتا تھا' بسکٹ اور ڈبل روٹی وغیرہ کا بھی انتظام تھا- یہ ہوٹل ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بالکل قریب ہے' درمیان میں صرف ایک دیوار حائل ہے- اس زمانے میں دیوار نہیں تھی اور محمود صاحب کی کینٹین چند قدم کے فاصلے پر تھی- جس دن ہمارے پاس کھانے کو کوئی چیز نہ ہوتی' ہم اس کینٹین میں چلے جاتے- ہم نے محمود ٹھیکے دار سے یہ "ٹھیکہ" کر رکھا تھا کہ ہم "رضاکارانہ" طور پر اللہ سے دعا کیا کریں گے کہ ہوٹل مدت مدید تک زیر تعمیر رہے تاکہ محمود صاحب کی کینٹین قائم رہے' محمود صاحب اس دعا کے بدلے میں "رضاکارانہ" طور پر ہمیں کھانا کھلایا کریں گے- ہم نے ان سے یہ عہد بھی کر رکھا تھا کہ ہم "ایمان داری" سے یہ بتا دیا کریں گے کہ آج کس انداز سے دعا کی تھی- اگر خشوع و خضوع سے کی تھی تو چھوٹے گوشت کے حق دار ہوں گے' اگر دعا کے الفاظ ڈھیلے تھے تو بڑا گوشت ملے گا- اگر دعا بالکل ہی عدم توجہی سے کی تھی تو سبزی یا دال ملے گی' چائے بہر حال پلائی جائے گی' اگرچہ دعا کسی طرح کی ہو-

ہماری دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہوٹل کی تعمیر کا سلسلہ کافی عرصے تک جاری رہا اور محمود صاحب نے ماشاءاللہ خوب کمائی کی' اور اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالا- یہ ہماری دعا ہی کا اثر تھا کہ

اس کے بعد وہ لاہور کے اخبار روزنامہ "وفاق" میں ملازم ہو گئے اور بہت سال "وفاق" اخبار کی طرف سے کراچی میں مقیم رہے۔ ان کے بال بچے بھی وہیں چلے گئے تھے۔

محمود صاحب دراصل دہلی کے رہنے والے تھے اور میرے بے تکلف دوست تھے۔ حضرت مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی کے فرزند اور مولانا معین الدین لکھوی کے سالے تھے ---ان کی اچانک وفات پر مجھے نہایت افسوس ہوا۔ وہ میرے "الاعتصام" کے زمانہ ادارت میں کئی سال اس اخبار کے مینجر رہے۔ ان شاء اللہ ان پر مستقل مضمون لکھا جائے گا۔

رمضان کا مہینہ آیا تو لیگل کمیٹی کا ایک اجلاس ڈاکٹر سخاء اللہ کے مکان پر ہوا۔ انھوں نے ارکان کمیٹی کی بہت تواضع کی۔ باقی اجلاس شاہ صاحب کے مکان پر ہوئے۔ وہ شان دار افطاری کراتے اور عمدہ کھانا کھلاتے۔ مغرب کی نماز کے لیے امامت کا بار مجھ غریب کے کندھوں پر ڈالنے کی کوشش کرتے، لیکن میں انہیں "کامیاب" نہ ہونے دیتا اور "پیشوائی" پر مجبور کر دیتا۔ میں سید بادشاہ کی موجودگی میں یہ گستاخی ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔

کمیٹی کے اجلاس میں بعض مسائل کی تعبیر و تشریح میں اختلاف رائے بھی ہو جاتا اور اس میں شدت بھی آجاتی، لیکن شاہ صاحب کو میں نے دیکھا کہ ان میں بہت لچک اور رواداری تھی۔ وہ دوسرے کی رائے کا احترام کرتے اور اختلاف کی صورت میں اس کی رائے مان لینے میں انھیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بعض دفعہ اجلاس کے بعد تنہائی میں مجھے کہہ بھی دیتے کہ آپ کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں تھا، لیکن اختلاف بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہذا آپ کی بات تسلیم کر لی۔ میں اس فراخ حوصلگی پر ان کا شکریہ ادا کرتا۔

ہم پانچ ارکان کا یہ دلچسپ گروپ تھا۔ عبدالشکور سلام صاحب اصلاً ضلع حصار (ہریانہ، بھارت) کے ایک مشہور روحانی اور صاحب طریقت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور شرافت و نجابت کی وہ تمام خوبیاں ان میں موجود ہیں، جن کا سلوک و طریقت سے تعلق رکھنے والے کسی خاندان کے معزز فرد میں پایا جانا ضروری ہے۔ وہ میٹنگ میں آہستہ آہستہ میٹھی میٹھی باتیں کرتے اور اس قسم کا اسلوب کلام اختیار کرتے، جیسے کچھ سمجھنا چاہتے ہوں حالاں کہ متعلقہ مباحث کے مختلف گوشوں سے وہ اچھی طرح آگاہ ہوتے تھے۔ ہم انھیں "پیر صاحب" بھی کہتے تھے اور "سلام صاحب" بھی---! وہ نہایت متانت کے ساتھ بعض اوقات ہلکے پھلکے مزاح کو بھی شامل کلام کر لیتے۔

چودھری محمد عارف کا بھی ایسا ہی انداز گفتگو تھا۔اردو اور فارسی کے مختلف شعرا کے بہت سے اشعار انھیں یاد ہیں۔موقع و محل کے اعتبار سے عمدہ شعر سناتے اور مجلس کی دلچسپی قائم رکھتے۔اگر انھیں کسی معاملے میں اظہار اختلاف یا کسی پر طنز کرنا مقصود ہوتا تو عام طور پر کسی عمدہ سے شعر کا سہارا لیتے۔اسے ان کی خوش ذوقی کہنا چاہیے۔اب ان دونوں حضرات سے کہیں ملاقات ہوتی ہے تو اس دور کی باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سخاء اللہ امرتسر کی مشہور شخصیت خواجہ احمد الدین کے بیٹے تھے۔انھیں حدیث سے لگاؤ نہ تھا،لیکن قرآن مجید کی آیات بکثرت پڑھتے تھے۔حجیت حدیث کے بارے میں ان سے اکثر سلسلۂ گفتگو جاری رہتا تھا۔چند ہی روز کے بعد کہنا شروع کر دیا تھا کہ جس حدیث کا حوالہ اسحاق بھٹی دیں گے،میں اسے بلا تامل مان لوں گا۔یہ ان کے خلوص قلب کی دلیل تھی۔عربی زبان سے انھیں محبت تھی اور کبھی کبھی عربی میں شعر بھی کہتے تھے۔

میٹنگ میں بحث و تمحیص کے بعد جو بات طے ہو جاتی،اسے قانونی زبان میں دو بیرسٹر جناب عبدالشکور سلام صاحب اور چوہدری محمد عارف صاحب،مشتاق احمد ٹائپسٹ کو ڈکٹیٹ کراتے۔ٹائپ کرنے کے بعد وہ دوسرے دن کی میٹنگ میں دکھا دیتا۔کبھی کبھی شاہ صاحب بھی ڈکٹیٹ کراتے۔ایک دن کسی عبارت کا ترجمہ شاہ صاحب ڈکٹیٹ کرانے لگے تو میں نے عرض کیا،اگر آپ چند روز اسی طرح ڈکٹیٹ کراتے رہے تو اچھے خاصے ڈکٹیٹر بن جائیں گے۔اس پر وہ خوش ہوئے،پھر کبھی ان کو کوئی بات ڈکٹیٹ کرانا ہوتی تو کہتے: آج میں ڈکٹیٹر بنوں گا۔

میٹنگ کے بعد شاہ صاحب تو اپنی سواری سے گھر جاتے اور ہم لوگ عبدالشکور سلام صاحب کی گاڑی میں بیٹھ جاتے اور وہ ہمیں ہمارے گھروں میں چھوڑ آتے۔سلام صاحب اور عارف صاحب کے دفاتر ان دنوں مال روڈ کی اس بلڈنگ کی دوسری منزل میں تھے جو ہال روڈ کے نکڑ پر بائیں جانب واقع ہے۔اب یہ ایک پلازہ بن گیا ہے،جس کا نام ہے زمان پلازہ---!

بعض مسائل کی تبیین و تشریح میں بعض اوقات وہ بہت آگے نکل جاتے تھے۔ایک دن میں نے اس سلسلے میں ان سے کچھ کہنا چاہا تو مولانا حنیف ندوی نے کہا،سید کے گھر کا دین ہے۔اس کے کسی پہلو کی وہ جو چاہے تعبیر کریں،ہم کون ہوتے ہیں اس میں دخل دینے والے۔

وہ کھلے دل کے آدمی تھے‘ دوستوں کی کسی بات پر خفا نہیں ہوتے تھے- ایک مرتبہ فرمایا‘ اب میں ادارے سے علیحدگی اختیار کر لینا اور ریٹائر ہو جانا چاہتا ہوں- مولانا ندوی نے کہا: ابھی علیحدہ ہونے کی ضرورت نہیں- ابھی تو بہت سی چیزیں حلال اور بہت سی حرام ٹھہرانی باقی ہیں- اس پر وہ خوب ہنسے اور مولانا کو کوئی جواب نہیں دیا-

کسی زمانے میں وہ کمرشل انٹرسٹ کو سود نہیں سمجھتے تھے- اس پر انھوں نے لکھا بھی ہے‘ لیکن بعد میں اس سے زبانی رجوع کر لیا تھا- وہ کہا کرتے تھے کہ سود اگرچہ کسی شکل میں ہو‘ بہر حال سود ہے- اس سلسلے میں میرا پہلا نقطہ نظر صحیح نہ تھا-

ایک دن رئیس احمد جعفری صاحب انھیں بازار لے گئے اور ایک جوتے کی دکان پر پہنچ گئے- بولے: آپ کا جوتا بہت خراب ہو گیا ہے‘ لہذا یہاں سے کوئی جوتا پسند کر لیجیے اور یہ خدمت میری طرف سے قبول فرمائیے- شاہ صاحب انکار اور رئیس صاحب اصرار کرتے رہے- رئیس صاحب نے کہا یہ بہت حقیر سی چیز ہے‘ آپ اپنے اس احسان کو یاد کیجیے جو آپ نے فلاں موقعے پر مجھ پر کیا تھا-

شاہ صاحب بولے: بھائی! میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا‘ ایک بہت معمولی سا فرض تھا جو میں نے پورا کر دیا- اگر نہ کرتا تو قابل ملامت ہوتا- فرض کیجیے‘ میں نے آپ کی کوئی خدمت کبھی کی ہے تو اس کے صلے میں آپ جوتوں سے میری تواضع کرنا چاہتے ہیں؟

اس پر پہلے تو رئیس صاحب زور سے ہنسے‘ پھر ان کا پاؤں پکڑ کر آب دیدہ ہو گئے اور کہا: بس اب بحث نہ کیجیے اور نیا جوتا میرے سامنے پہن لیجیے- چنانچہ شاہ صاحب نے ان کے پر خلوص اصرار کی قدر کرتے ہوئے ایک جوتا پسند کیا اور پہن لیا-

شاہ صاحب کے والد محترم حضرت شاہ سلیمان پھلواروی بھی بہت خوش طبع اور حاضر جواب عالم دین تھے- جعفر شاہ صاحب کے ماموں شاہ عین الحق پھلواروی ہندوستان کے ممتاز علما میں سے تھے اور انھوں نے مسلک اہل حدیث اختیار کر لیا تھا- کسی نے شاہ سلیمان صاحب سے کہا کہ سید تو ”اية من آيات الله“ ہوتا ہے‘ شاہ عین الحق وہابی کیوں ہو گئے ہیں‘ کیا یہ اية من آيات الله نہیں ہیں؟

فرمایا: ”عین الحق ہیں تو اية من آيات الله ہی‘ لیکن آیت منسوخہ ہیں-“

اسی طرح کسی نے شاہ سلیمان مرحوم سے کہا کہ فلاں آدمی نے نماز میں رفع الیدین کیا

اور لوگوں نے اسے مارا پیٹا۔
فرمایا: ہم نے رفع الیدین تو سنا ہے' لیکن رفع الیدین پر رفع الیدین نہیں سنا۔

شاہ سلیمان پھلواروی مرحوم کے بارے میں منقول ہے کہ وہ فضیلت اہل بیت کے اس قدر قائل تھے کہ ان کے مقابلے میں بڑے بڑوں پر ہاتھ صاف کر جاتے تھے' لیکن ان کے بیٹے شاہ محمد جعفر پھلواروی کا معاملہ ان سے مختلف تھا۔ وہ اس طرح کے فضیلت کے قائل نہیں تھے۔ اہل بیت میں جو حضرات ابو بکرؓ' عمرؓ' عثمانؓ وغیرہ ناموں سے موسوم تھے' وہ سب انھیں یاد تھے اور اکثر ان کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا چراغ حسن حسرت مرحوم کے زیر صدارت ریڈیو پاکستان لاہور سے ایک مذاکرہ نشر ہوا' اس میں جعفر شاہ صاحب پھلواروی اور رئیس احمد جعفری بھی تھے اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم بھی---! اثنائے مذاکرہ میں بعض اوقات دو آدمی ایک ساتھ بولنے لگتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ جعفر صاحب اور جعفری صاحب ایک ساتھ بولنے لگے۔ حسرت صاحب نے فوراً کہا: ایک ساتھ بولنے کی بجائے باری باری سے گفتگو کیجیے تاکہ معلوم ہو کہ یہ جعفر ہے اور یہ جعفری---یہ الفاظ ریڈیو میں نشر بھی ہو گئے' جس پر بہت سے سامعین نے بتایا کہ وہ اس لطیفے پر بے ساختہ ہنس پڑے۔

دونوں کا یہ التباس اسمی اکثر ٹیلی فون پر بھی ہو جاتا۔ کسی نے ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں ٹیلی فون پر جعفر شاہ صاحب سے بات کرنا چاہی اور ملازم جعفری صاحب کو بلا کر لے گیا۔ یا بلایا جعفری صاحب کو گیا اور آواز پڑ گئی جعفر شاہ صاحب کو---!

شاہ صاحب نہایت متوکل علی اللہ تھے۔ میں ان کے توکل کے واقعات سن کر بعض دفعہ انھیں "متوکل باللہ" کہا کرتا تھا۔ فرمایا کرتے 'اللہ پر توکل کرنے والوں کو اللہ کبھی مایوس نہیں کرتا اور ان کا کوئی کام ادھورا نہیں رہتا۔ اس پر بھروسا کر کے کوئی کام شروع کر دو' پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ یہ بات وہ بالخصوص کہا کرتے تھے کہ اگر آپ بیاہ شادی اور مکان کی تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیں' بے شک جیب میں کوئی پیسہ نہ ہو' بغیر کسی مالی رکاوٹ کے دونوں کام بخیر و خوبی انجام پا جائیں گے۔

ایک مرتبہ خود اپنی بیٹی کی شادی کا واقعہ بیان کیا کہ تاریخ مقرر ہو گئی۔ بارات کراچی سے آنا تھی۔ کوئی پیسہ پاس نہیں' جیب بالکل خالی' لیکن وہ ہر معاملے سے بے فکر "مولا کے

مطابق دوستوں سے مصروف گفتگو ---- دن گزرتے گئے' یہاں تک کہ ایک دن باقی رہ گیا- بیوی نے کہا: اب کیا ہو گا؟ کل بارات آنے والی ہے- فرمایا: اللہ پر توکل کرو سب کچھ ہو جائے گا---- نہ کسی سے قرض لیا' نہ کسی سے کہا' نہ کسی دکان دار سے کوئی چیز ادھار لی- نہ وہاں کوئی رشتے دار' نہ کسی جماعت سے انسلاک کہ اس کے ارکان مدد کو آئیں- چند مقامی دوستوں اور روز کے میل جول والوں کے دل میں اللہ نے ایسا جذبہ پیدا کیا کہ سب کام تکمیل کو پہنچ گیا اور بیٹی عزت و آبرو کے ساتھ اپنے گھر چلی گئی-

بعض مسائل کی تعبیر میں' میں ان سے اتفاق نہیں کرتا تھا اور ان کے مقام و مرتبے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس کا اظہار بھی ہوتا رہتا تھا' لیکن اس کے باوصف وہ مجھ عاجز پر بہت اعتماد کرتے تھے- میں اسے ان کی انتہا درجے کی شفقت اور اپنے بارے میں حسن ظن ہی کہہ سکتا ہوں- ایک دن انھوں نے اپنے والد گرامی قدر حضرت شاہ سلیمان پھلواروی مرحوم کے مکتوبات کا ایک مجموعہ دکھایا جو بہت عرصہ پہلے کا چھپا ہوا تھا- یہ مکتوبات انھوں نے مختلف حضرات کو بعض سوالات کے جواب میں تحریر فرمائے تھے- ان میں متعدد مقامات پر عربی اور فارسی عبارتیں تھیں' جن کا ترجمہ نہیں کیا گیا تھا- جعفر شاہ صاحب ان مکتوبات کو حواشی کے ساتھ اور غیر ترجمہ شدہ عبارتوں کا ترجمہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے- کچھ عبارتوں کے ترجمے کے لیے انھوں نے مجھے حکم دیا- پہلے تو میں معذرت کرتا رہا' لیکن ان کے اصرار سے مجبور ہو کر میں نے ان مکتوبات کو پڑھنا شروع کیا- اگرچہ ان کے بعض مقامات سے مجھے اتفاق نہ تھا' مگر وہ مکتوبات اتنے علمی تھے اور ان میں اس درجے خلوص بھرا ہوا تھا کہ انھیں پڑھتے ہوئے کسی مسئلے میں اتفاق یا اختلاف کی طرف ذہن منتقل ہی نہیں ہوا- حقیقت یہ ہے کہ اہل علم کا ہمیشہ یہی وتیرہ رہا ہے کہ وہ اختلاف بھی کرتے تھے تو اس کا اظہار احسن اور عمدہ طریقے سے کرتے تھے اور اسلوب و انداز محققانہ ہوتا تھا معاندانہ نہیں ہوتا تھا-

وہ اپنا کام چھوڑ کر دوسرے کا کام کرتے اور اس میں خوشی محسوس فرماتے' لیکن بعض دفعہ انھیں یہ بھی "احساس" ہو جاتا کہ اپنے وقت کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے- ایک مرتبہ ان کے پاس مسلم لیگ کے ایک ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر صاحب تشریف لائے- اپنا تعارف کرایا اور کہا: ہم اپنے اخبار کا خاص نمبر شائع کر رہے ہیں' آپ سے مضمون کی درخواست ہے- ان کے استفسار پر انھوں نے مضمون کا موضوع بھی بتا دیا- پوچھا:

"اخبار میں کتنے آدمی کام کرتے ہیں؟"
بولے: "سات۔"
فرمایا: "سب لوگ تنخواہ لیتے ہیں؟"
کہا: "جی ہاں"!
سوال کیا: "عملے کو اچھی خاصی تنخواہیں ملتی ہوں گی؟"
جواب دیا: "اخبار کی اشاعت کافی ہے اور کارکنوں کو معقول تنخواہیں دی جاتی ہیں۔"
پوچھا: "آپ بھی تنخواہ لیتے ہیں؟"
کہا: "جی ہاں! میں بھی تنخواہ لیتا ہوں۔"
فرمایا: اشتہارات کے بھی پیسے لیتے ہوں گے؟"
بولے: "اشتہارات کے پیسے لیتے ہیں۔ چوں کہ اخبار کی تعداد اشاعت کافی ہے اس لیے اشتہاروں کے اچھے خاصے پیسے وصول کیے جاتے ہیں۔"
سوال کیا: "سرکاری اشتہار بھی چھپتے ہیں؟"
کہا: "بالکل چھپتے ہیں۔"
پوچھا: "اخبار قیمتاً بیچتے ہیں' مفت تو تقسیم نہیں کرتے؟"
کہا: "قیمتاً بیچتے ہیں' مفت میں کیسے دیا جا سکتا ہے۔"
فرمایا: "مضمون نگاروں کو پیسے دیتے ہیں؟"
بولے: "نہیں۔ یہ قومی اور اسلامی کام ہے' پڑھے لکھے لوگوں کو اس کارِ خیر میں تعاون کرنا چاہیے۔"
کہا: "آپ سب لوگ پیسے لیتے ہیں اور جن لوگوں کے مضامین کی وجہ سے اخبار بکتا ہے' ان کو پیسے نہیں دیتے۔ قومی اور اسلامی کام دوسرے کریں اور پیسے آپ لیں۔ یہ کیوں؟ مضمون نگار محنت کرتا ہے' دماغ سوزی کرتا ہے' اپنا وقت خرچ کرتا ہے' اس کو کیوں پیسے نہ دیے جائیں؟ اگر آپ لوگ بلا معاوضہ کام کرتے ہیں تو ہم بھی بلا معاوضہ مضمون دیں گے۔ اگر آپ پیسے لیتے ہیں تو ہمیں بھی پیسے دیجیے۔"
ایڈیٹر صاحب "بہت اچھا" کہہ کر چلے گئے اور دوبارہ تشریف نہیں لائے۔
شاہ صاحب ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے تھے جن کے دو معنے نکل سکتے ہوں۔ ذو

معینین الفاظ کی وہ مثالیں بھی دیا کرتے تھے' اس سلسلے میں وہ بہت محتاط تھے۔

عالم جوانی میں وہ ملکی سیاست میں بھی حصہ لیتے رہے۔ ان کی سیاسی سرگرمیوں کا دائرہ تحریک خلافت تک محدود رہا۔ پھر وہ اس میدان سے بھی نکل گئے۔ وہ کسی سیاسی جماعت کی نہ تعریف کرتے تھے اور نہ اس کو ہدف تنقید ٹھہراتے تھے۔

وہ اچھے مقرر اور واعظ تھے' جس مجلس میں جاتے' اپنے اسلوب خاص سے اس طرح لطائف و ظرائف بیان کرتے کہ سب کا مرکز توجہ قرار پاتے۔

ایک دن فرمایا: ''وہابی وہ ہوتا ہے جو بدذوق ہو۔''

چند روز بعد پھر ''وہابی'' کی یہی تعریف کی۔ ایک دن میں اور مولانا حنیف ندوی بیٹھے تھے کہ یہی الفاظ ارشاد فرمائے۔

میں نے عرض کیا: حضور! وہابی کی تو یہ تعریف ہوئی کہ جو بدذوق ہو' لیکن ''بدذوق'' کی کیا تعریف ہے؟

فرمایا: بدذوق وہ ہے جو شعر صحیح نہ پڑھ سکتا ہو اور برمحل نہ پڑھ سکتا ہو۔ یعنی ذوق شعری سے محروم ہو۔۔۔۔ اور وہابی ذوق شعری سے محروم ہوتا ہے۔

میں نے عرض کیا: اگر آپ کے نزدیک وہابی کی تعریف یہی ہے جو آپ نے فرمائی ہے تو ہر وہ شخص جو ذوق شعری سے محروم ہے' وہابی ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہابی ذوق شعری سے محروم ہوتا ہے۔ اگر آپ کا اشارہ ایک خاص مسلک کے حامل لوگوں کی طرف ہے تو یہ قرین صحت نہیں۔ نواب صدیق حسن خان جو آپ کے سید بھائی ہیں اور جن کے خاندان مین آپ کی شادی ہوئی' اپنی تصنیفات میں بکثرت شعر درج کرتے ہیں جو نہایت برمحل اور برموقع ہوتے ہیں۔ ادبیات اور شعر و شاعری سے تعلق رکھنے والے حضرات کا کہنا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تحریروں میں شعر درج کرنے کا ذوق انہی سے لیا ہے۔ پھر شعرائے کرام سے متعلق نواب صاحب کی ایک مستقل کتاب ہے' جس کا نام ''شمع انجمن'' ہے۔

آپ کا قصبہ پھلواری ضلع پٹنہ میں ہے' اور پٹنہ کے محلہ صادق پور کے ان علمائے عظام میں جو جماعت مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے' اکثر حضرات فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ ان میں بعض کی فارسی مثنویاں بہت مشہور ہیں۔ یہ سب لوگ وہابی تھے اور تحریک وہابیت سے

وابستہ تھے۔ خود آپ کے شہر پھلواری کے کبیر احمد پھلواروی مشہور وہابی تھے اور اونچے درجے کے شاعر تھے۔

چار سلیمان بزرگوں کی رباعی میں قاضی سلیمان منصورپوری فارسی اور اردو کے نامور شاعر تھے اور وہابی تھے۔ ان کے بیٹے قاضی عبدالعزیز منصورپوری وہابیت کے باوجود صاحب دیوان شاعر تھے۔

مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والے) وہابی ہونے کے ساتھ فارسی کے مانے ہوئے شاعر تھے۔

مولانا ثناءاللہ امرتسری تحریر و تقریر میں ایسے برمحل شعر لاتے تھے، جیسے شاعر نے اسی موقعے کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

ہم نے "عالمانہ" لہجے میں عرض کیا: ہلم جرا آگے چلیے۔ مولانا سید داؤد غزنوی آپ کی طرح خاندان سادات کے فرد تھے اور ذوق شعری ان کی گھٹی میں رچا ہوا تھا۔ ان کے بیٹے سید ابوبکر غزنوی (اس زمانے میں زندہ تھے) شعر و شاعری کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں دینے کے بعد میں نے عرض کیا: آپ کے سامنے مولانا حنیف ندوی تشریف فرما ہیں جو آپ کے پرانے ساتھی اور ندوی بھائی ہیں۔ یہ وہابی بھی ہیں اور شعر فہمی کے ذوق سے بہرہ ور بھی ہیں۔

مولانا ابویحییٰ امام خاں نوشہروی مشہور اہل حدیث عالم تھے اور بے شمار شعر انھیں زبانی یاد تھے۔ وہ شاہ صاحب کے بہت اچھے دوست تھے۔ میں نے ان کا ذکر بھی کیا کہ کئی شعرا کے دیوان ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور زیادہ تر ان کا سلسلۂ تحریر شعروں کے بل بوتے پر چلتا ہے۔

اب ہم نے "در مدح خود" کہنا شروع کیا کہ اس بندۂ عاجز کو لیجیے۔ میں بے شک عربی، فارسی، اردو کے زیادہ شعر نہیں جانتا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ آپ اردو کے دو شعر پڑھیں گے تو میں پنجابی کے چار لوک گیت آپ کو سنادوں گا۔ اگر آپ فارسی کا ایک شعر پڑھیں گے تو میں ہیر وارث شاہ کے دو شعر پڑھ دوں گا۔ اگر عربی کا کوئی شعر سنائیں گے تو میں پنجابی کی ضرب الامثال کے ڈھیر لگادوں گا۔ یا کان پر ہاتھ رکھ کر ایسی ایسی پنجابی بولیاں سناؤں گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ بتائیے وہابی بدذوق اور شعر فہمی سے محروم کیسے ہوئے؟ یہ آپ

سے کس بات میں پیچھے ہیں؟ اور آپ ان سے کس کس معاملے میں کتنے قدم آگے ہیں؟

شاہ صاحب نے ہماری یہ "تقریر دلپذیر" جو ہم نے پوری روانی سے کی' غور سے سنی' مولانا حنیف ندوی بھی خاموشی سے سنتے اور مسکراتے رہے۔ ان کے خاموشی سے سننے اور مسکرانے کے معنے ہمیں "داد" دینے کے تھے۔ اس کے بعد شاہ صاحب خاموش ہو گئے' جس کا مطلب ہماری کامیابی کا اعتراف تھا۔

مولانا حنیف ندوی نے ہنستے ہوئے کہا: پادری کے سامنے اعتراف گناہ کر لیا؟

فرمایا: پادری نے اعتراف گناہ پر مجبور کر دیا۔

میں نے عرض کیا: اب مان گئے کہ وہابی بدذوق نہیں ہیں۔

فرمایا: بالکل مان گیا۔ وہابیوں کے علاوہ بھی ہر مسلک فقہی اور مسلک سیاسی کے لوگ بدذوق ہو سکتے ہیں اور ہیں بھی۔

عرض کیا: اب وہابیوں کے بارے میں آپ کے دو قول ہوئے۔ فقہ کی زبان میں بتائیے مفتیٰ بہ قول اول ہے یا قول ثانی؟

بولے: قول ثانی۔

میں نے اٹھ کر ازراہ تکریم ان کے دائیں گھٹنے کو دایاں ہاتھ لگایا تو مجھے پیار اور شفقت سے تھپکی دے کر اپنے برابر کی کرسی پر بٹھایا۔

عرض کیا: ہمارے دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ سے آپ مطمئن ہو گئے؟

فرمایا: بالکل مطمئن ہو گیا۔

ان کا اردو' عربی اور انگریزی کا خط بہت اچھا تھا۔ مسودہ صاف ہوتا تھا۔ کانٹ چھانٹ زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ سپاٹ لکھتے تھے اور واضح الفاظ میں اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتے تھے۔ سطریں سیدھی ہوتی تھیں۔ ادبیت کی چاشنی بھی پائی جاتی تھی۔

بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ کسی نے مجلس میں کوئی ایسی بات کی' جس کے کسی پہلو نے ان کے دل پر کوئی اثر ڈالا اور فوراً مضمون ہو گیا۔ ہم اسے "کاتا اور لے دوڑی" کہا کرتے تھے۔ مولانا حنیف ندوی مزاحاً فرمایا کرتے کہ سید کا علم "لدنی" ہے۔ انھیں کتابیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

لکھتے وقت وہ بازوؤں والی کرسی پر نہیں بیٹھتے تھے۔ بغیر بازو والی کرسی لیتے اور اس پر

آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ میز کی دائیں جانب کی دراز میں یا میز پر سیدھے ہاتھ پان کا چھوٹا سا بٹوا رکھ لیتے اور گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد پان کی گلوری منہ میں ڈال لیتے۔ کوئی ملاقات کو آتا تو کام چھوڑ کر اس سے مصروف گفتگو ہو جاتے۔

وہ فل سکیپ کاغذ پر نہیں لکھتے تھے۔ یا تو اسے چوڑائی سے پھاڑ کر کاپی سائز بنا لیتے یا لمبائی میں برابر تقسیم کر کے درمیان سے کاٹ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیتے اور پھر بائیں سمت میں تھوڑا سا حاشیہ چھوڑ کر لکھنا شروع کر دیتے۔ اگر انھیں کوئی خاص چیز سوجھ جاتی' جس کو فوری طور پر ضبط تحریر میں لانا ضروری سمجھتے اور اچھا کاغذ میسر نہ آتا تو ردی کی ٹوکری یا ادھر ادھر سے کاغذ لے کر اسے لکھ لیتے۔

حوالے کی کتابیں وہ سامنے رکھتے تھے۔ عربی لغت کے لیے زیادہ تر بستان' اقرب الموارد اور المنجد سے رجوع کرتے۔ وہ ذرا سا ناک میں بولتے تھے اور قدرے تیزی سے بات کرتے تھے' لیکن ٹیلی فون کی گفتگو اور ریڈیائی تقریر میں اس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ان کے دانت مصنوعی تھے۔ بچوں سے انھیں بہت پیار تھا۔ کسی بچے کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اچانک زبان کو حرکت دے کر دانت باہر نکال لیتے۔ اس وقت وہ "گوراجن" معلوم ہوتے اور بچہ سہم جاتا' پھر فوراً دانتوں کو اپنی جگہ پر لے جاتے۔ ایک مرتبہ میں اپنی بیٹی سمیہ زیرک کو جو اس وقت چار سال کی تھی' دفتر لے گیا۔ شاہ صاحب نے اس سے باتیں کرتے ہوئے اچانک دانت باہر نکالے تو وہ خوف زدہ ہو گئی۔ پھر دانتوں کو اصلی حالت پر لے آئے۔ اس سے پیار کیا' دانت نکال کر دکھائے اور پانچ روپے عنایت فرمائے۔

ان کا حلقہ تعلقات بہت وسیع تھا اور ہر مکتب فکر کے لوگ ان کے پاس آتے تھے۔ وہ عرصے تک کپورتھلے کی شاہی مسجد کے منصب خطابت پر فائز رہے تھے' اس لیے کپورتھلہ شہر اور اس کے گردونواح کے جو لوگ قیام پاکستان کے بعد لاہور اور اس کے قرب وجوار میں مقیم ہو گئے تھے' ان کی خدمت میں نہایت عقیدت واحترام سے حاضری دیتے تھے۔ بعض حضرات اپنے بچوں اور عزیزوں کو بھی ساتھ لاتے اور شاہ صاحب سے ان کا تعارف کراتے اور دعا کی درخواست کرتے۔ یہ لوگ دفتر بھی آتے اور ان کے مکان پر بھی حاضر ہوتے۔

بعض اوقات دور دراز کے علاقوں میں رہنے والے حضرات بھی جو کپورتھلہ میں ان سے متاثر تھے' سلام کے لیے آ جاتے۔ کبھی خود شاہ صاحب ان کی دعوت پر ان کے ہاں

تشریف لے جاتے۔ میرے علاقے جڑانوالہ (ضلع فیصل آباد) میں بھی ان کے کپور تھلے کے چند عقیدت مند قیام پذیر تھے۔ ان میں ایک صاحب تحصیل دار تھے۔ وہ اپنے رفقاسمیت کئی دفعہ ان کی خدمت میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے دفتر آئے۔ شاہ صاحب بھی ایک مرتبہ ان کی دعوت پر جڑانوالہ گئے تھے، میں بھی ساتھ تھا، جمعے کا دن تھا اور انھوں نے چمڑہ منڈی کی مسجد میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا تھا۔

وہ ریڈیو میں تو اکثر تقریریں کرتے ہی تھے، چار پانچ دفعہ ٹیلی ویژن پر بھی انھیں تقریر کے لیے بلایا گیا۔ ایک دن دفتر آئے تو خلاف معمول سبز سے رنگ کی قمیص پہنے ہوئے تھے۔ پوچھا۔ یہ کیا؟ فرمایا: یہ رنگ دار قمیص اس لیے بنائی ہے کہ ٹیلی ویژن پر کبھی تقریر کے لیے جانا ہوتا ہے تو وہاں سفید قمیص سے کام نہیں چلتا، رنگ دار قمیص مناسب رہتی ہے۔ اس کے بعد اتفاقاً انھیں کوئی ٹیلی ویژن پروگرام نہ ملا۔ میں نے عرض کیا، آپ کے ساتھ اس پٹھان کا سا معاملہ ہوا ہے، جس کو جاٹ نے کہا تھا کہ خان! تم روزانہ آکر ہمارے گھر سے لسی لے جایا کرو۔ پٹھان ہر روز لسی لاتا اور مزے سے پیتا۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں جو لسی پیتے وقت چھنے میں ڈوب جاتی تھیں اور بار بار صاف کرنا پڑتی تھیں۔ پٹھان نے مونچھیں منڈوا دیں۔ دوسرے دن لسی لینے گیا تو جاٹ نے کہا، ہم نے بھینس بیچ ڈالی ہے۔ اب آپ نے رنگ دار قمیص بنوائی ہے تو پروگرام بند کر دیا گیا ہے۔

وہ ایسی باتوں سے خوش رہتے تھے اور لطیفہ سننا سنانا ان کی ذہنی غذا تھی۔

وہ ۱۵۔ جون ۱۹۵۱ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوئے تھے۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں ادارے کی طرف سے ماہانہ رسالہ "ثقافت" جاری کیا گیا تھا۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے اس کا نام بدل کر "المعارف" رکھ دیا تھا۔ شاہ صاحب نے ان دونوں رسالوں میں بہت سے مضامین لکھے اور ادارے کے لیے انیس کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں تین عربی کتابیں بھی شامل ہیں، جن کو انھوں نے اردو زبان میں منتقل کیا۔

اگست ۱۹۷۳ء میں ان کی بینائی کچھ کمزور ہو گئی تو ادارے سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ بہت کوشش کی گئی کہ اپنا فیصلہ واپس لے لیں اور آنکھوں کا علاج کرائیں، لیکن وہ نہیں مانے اور فرمایا، جب میں ادارے کا پورا کام نہیں کر سکتا تو اس میں رہنے اور اس سے تنخواہ وصول کرنے کا مجھے حق نہیں پہنچتا۔ چنانچہ یکم ستمبر ۱۹۷۳ء کو انھوں نے علیحدگی کی درخواست دی،

جس میں لکھا تھا کہ میری بینائی کمزور ہو گئی ہے' لہٰذا یکم اکتوبر سے مجھے ادارے کی خدمت سے سبکدوش سمجھا جائے-۲۹- ستمبر ۱۹۷۳ء کو ادارے کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور بادل نخواستہ ان کی درخواست منظور کر لی گئی- بائیس برس ڈھائی مہینے انھوں نے ادارے میں جو علمی و تصنیفی خدمات انجام دیں' ان کو خراج تحسین پیش کیا گیا اور ان کی صحت و عافیت کے لیے دعا کی گئی-

ان کی تصنیفات و تراجم کی تفصیل درج ذیل ہے-

## گلستان حدیث:

یہ رسول اللہ کی چالیس منتخب احادیث کی تشریح ہے-اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر حدیث کے مضمون کی تائید کسی دوسری حدیث اور قرآن کی آیات سے کی گئی ہے-

## انتخاب حدیث:

یہ ان احادیث کا دل آویز مجموعہ ہے جو زندگی کی اعلیٰ قدروں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن سے فقہ جدید کی تشکیل میں مدد مل سکتی ہے-ہر حدیث کی الگ سرخی قائم کی گئی ہے- زبان سلیس اور رواں ہے-

## مقام سنت :

اس میں وحی' اقسام وحی' اتباع حدیث اور اتباع رسول ﷺ وغیرہ اہم امور بیان کیے گئے ہیں-

## معارف حدیث :

یہ امام ابو عبداللہ الحاکم نیساپوری (متوفی ۴۰۵ھ) کی کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' کا اردو ترجمہ ہے- فن حدیث کی یہ گراں قدر کتاب ہے- حدیث کی اقسام' راویان احادیث کے مراتب' ان کے حالات اور اس قسم کی تمام معلومات اس میں درج ہیں- فن حدیث کو سمجھنے کے لیے یہ بنیادی کتاب ہے-

## پیغمبر انسانیت :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے متعلق قابل قدر کتاب ہے-

## اجتہادی مسائل :

اس میں بتایا گیا ہے کہ دین اور اس کی روح میں کبھی تغیر اور تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہر دور میں جو نئے نئے مسائل پیش آتے رہتے ہیں' ان میں دین کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اجتہاد کی ضرورت ہے۔

## مجمع البحرین:

اس میں وہ احادیث جمع کی گئی ہیں جو شیعہ اور اہل سنت کے درمیان متفق علیہ حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کتاب کو وحدت امت کے لیے ایک اہم قدم سے تعبیر کرنا چاہیے۔

## ازدواجی زندگی کے لیے اہم قانونی تجاویز :

اس میں نکاح' خلع' تعدد ازدواج' مہر' جہیز' ترکہ جیسے بنیادی اور ضروری مسائل کے بارے میں قانونی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

## مسئلہ تعدد ازدواج:

اس میں مسئلہ تعدد ازدواج کے تمام پہلوؤں کو کتاب و سنت کی روشنی میں زیر بحث لایا گیا ہے۔

## اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی:

اس کتاب مین دینی اور عقلی شواہد سے اس مسئلے پر گفتگو کی گئی ہے۔

## مقالات:

یہ ان کے ان مقالات کا مجموعہ ہے' جن سے پتا چلتا ہے کہ غور و فکر کا دروازہ بند نہیں ہوا اور نہ ہو گا۔ فکری ارتقا جاری ہے اور جاری رہے گا۔ جس طرح اساس دین کے خلاف کوئی فکر جائز نہیں' اسی طرح دین پر جمود کا قفل لگا دینا بھی درست نہیں' اصول دین میں استحکام ضروری ہے' لیکن فروع میں غور و فکر کی گنجائش موجود ہے۔

## رویت ہلال:

اس رسالے میں قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں مسئلہ رویت ہلال کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

## کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت:

اس کتاب کا موضوع یہ ہے کہ کیا تجارتی منافع "ربو" کی تعریف میں آتا ہے، جسے کتاب و سنت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شاہ صاحب کمرشل انٹرسٹ کے جواز کے قائل تھے اور اس کو "ربو" نہیں سمجھتے تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے اسی نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے، لیکن کتاب کی اشاعت سے کچھ عرصے بعد انھوں نے فرمایا کہ پہلے میں اس کو جائز سمجھتا تھا، اب اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا تو میرا نقطہ نظر بدل گیا ہے۔ سود بہر حال سود ہے اور حرام ہے، اگرچہ اس کی کوئی شکل ہو۔

## چند ازدواجی مسائل:

اس کتاب میں بعض ازدواجی مسائل کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔ مثلاً کم سنی کی شادی اور فسخ نکاح کا اختیار، یک بارگی تین طلاق دینے کے متعلق شرعی حکم، خلع، نشے کی حالت میں طلاق، رسم جہیز اور مسائل حضانت۔

## اسلام اور فطرت:

اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کس طرح فطرت انسانی کے مطابق ہے۔

## اسلام، دین آسان:

اس کتاب میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام کے احکام دشوار اور ناممکن العمل نہیں ہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق دین آسان ہے۔

## زیردستوں کی آقائی:

یہ کتاب مصر کے نامور ادیب ڈاکٹر طہٰ حسین کی تصنیف "الوعد الحق" کا نہایت شگفتہ اور سلیس ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر طہٰ حسین کی سوانح حیات بھی درج کتاب ہیں۔

## الفخری:

یہ ساتویں صدی ہجری کے شہرہ آفاق مورخ ابن طقطقی کی تاریخ کا اردو ترجمہ ہے۔ کتاب بہت سی معلومات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

## اسلام اور موسیقی:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اس میں بتایا گیا ہے کہ اسلام میں موسیقی کی کیا اہمیت ہے اور مسلمان علما و صوفیا اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ حوالے میں کتر بیونت نہیں کرتے تھے اور عبارت کو سیاق و سباق سے الگ کر کے فقط اپنے مطلب کی بات تلاش نہیں کرتے تھے۔ بعض حضرات حوالہ دیتے وقت "لیکن" سے پہلے یا بعد کے الفاظ لے لیتے ہیں' باقی چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ "لیکن" ایک جھاڑو ہوتی ہے جو پہلی ساری بات کا صفایا کر دیتی ہے۔ اسی طرح "مگر" کو "مگر مچھ" سے تعبیر کرنا چاہیے جو پہلی بات کو نگل جاتا ہے۔ شاہ صاحب میں یہ بات نہ تھی۔ وہ حوالے کے سلسلے میں نہایت دیانت دار مصنف تھے۔ ان کے افکار و تصورات سے اختلاف ہو سکتا ہے اور ہمیں ان سے اختلاف تھا' اور اختلاف کس اہل علم سے نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی مصنفانہ دیانت پر قطعاً شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے قاری کو دھوکا نہیں دیتے تھے۔

جب سے پاکستان معرض قیام میں آیا ہے' اسلامی نظام کے تنفیذ کی کوشش جاری ہے اور یہ معاملہ پچاس سال سے ابھی تک "کوشش" کی منزل میں ہے۔ قیام پاکستان سے تھوڑا عرصہ بعد پنجاب پولیس میں ایک عہدہ "مولوی تھانیدار" قائم کیا گیا تھا۔ مختلف اضلاع میں علمائے کرام بھرتی کیے گئے تھے' جن کا درجہ تھانے دار کے برابر تھا اور انھیں "مولوی تھانیدار" کہا جاتا تھا------ان کا کام اپنے اپنے حلقے میں پولیس کو نماز سکھانا' نماز پڑھانا' تھانے کی مسجدوں میں جمعے کا خطبہ دینا' قرآن مجید پڑھانا اور وعظ و نصیحت کرنا تھا۔ یہ حضرات اپنے حلقے کے مختلف تھانوں میں دورے کرتے' پولیس کو نیکی کی تلقین فرماتے اور برائی سے روکتے تھے۔ کرشمہ انقلاب دوراں ملاحظہ ہو کہ شاہ صاحب بھی پولیس میں "مولوی تھانیدار" بھرتی ہو گئے۔ یہ ان کی معاشی مجبوری تھی اور معاش کے لیے انسان کو کئی دھندے کرنے پڑتے ہیں۔ غالباً یہ ضلع ساہیوال میں "تعینات" تھے' جسے اس زمانے میں منٹگمری کہا جاتا تھا۔ یہ منصب ان کے ذوق سے ہم آہنگ نہ تھا' اس لیے جلد ہی مستعفی ہو گئے تھے۔

شاہ صاحب چائے کے بہت شائق تھے اور عمدہ چائے پیتے تھے۔ صاف ستھرے برتن

میں چائے بناتے اور اچھی جگہ بیٹھ کر پیتے۔ کہا کرتے تھے، ہمیں صرف چائے پینی ہے اور تو کچھ پینا نہیں، یہ تو سلیقے سے پینی چاہیے۔ ایلومنیم کے برتن میں چائے بنانے کے وہ سخت خلاف تھے۔ مٹی کے تیل کے چولھے پر بھی چائے نہیں بناتے تھے، اس لیے کہ اس میں تیل کی بو آتی ہے۔ اگر لکڑی کی آگ پر چائے بناتے تو جب تک اس کا دھواں ختم نہ ہو جاتا دیگچی چولھے پر نہ رکھتے۔ جب سوئی گیس نہیں آئی تھی تو عام طور سے بجلی کے ہیٹر پر یا کوئلے کی انگیٹھی پر نہایت احتیاط سے چائے تیار کرتے، چائے میں چینی زیادہ ڈالتے تھے۔ بعض دفعہ مسکرا کر فرماتے: ''میں چینی کھانے کے لیے چائے پیتا ہوں۔''

وہ کسی پر خفگی کا اظہار نہیں کرتے تھے، ٹھنڈے دل سے بات سنتے تھے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا کہ معمولی بات سے طیش میں آجاتے۔ ایک دن ڈاکٹر شیخ محمد اکرام نے (جو اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر تھے) مجھ سے کہا کہ یوں تو ادارے کے سب رفقا قابل احترام ہیں، لیکن مولانا حنیف ندوی اور شاہ صاحب ہمارے لیے بالخصوص لائق تکریم ہیں۔ ادارے سے ان کی اس دور سے وابستگی ہے، جب ادارہ قائم ہوا تھا۔ یہ بہت بڑے عالم ہیں اور ان کا وجود ادارے کے لیے باعث برکت ہے۔

میں یہ سن کر خوش ہوا، لیکن یہ بات شاہ صاحب کو بتائی تو طیش میں آگئے۔ فرمایا: ''اچھا! یہ بات ہے، ہم کام نہیں کرتے، کام یہ کرتے ہیں یا کوئی اور کرتا ہے، ہمیں صرف برکت کے لیے رکھا ہے اور حصول برکت کے لیے ہمیں تنخواہ دی جاتی ہے۔ ہم نے اتنی کتابیں لکھیں، اتنا کام کیا، ہماری تصنیفات کی وجہ سے ادارے کی خدمات آگے بڑھیں۔ یہ چیزیں کسی کھاتے میں نہیں جاتیں، صرف ہماری برکت ہی کسی کھاتے میں جاتی ہے۔''

عرض کیا: حضور۔۔۔! انھوں نے تو آپ دونوں حضرات کی تعریف کی ہے، آپ کی تصنیفات اور آپ کے وجود کو برکت کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ خفا ہونے کی نہیں خوش ہونے کی بات ہے۔ آپ کے کام کے علاوہ آپ کے وجود کی برکت ان کے نزدیک شے زائد ہے جو قابل اعزاز و اکرام ہے۔

پھر فوراً موڈ بدل گیا۔ مسکرا کر بولے: ذی الجلال والاکرام۔

غالباً ۱۹۷۳ء میں شاہ صاحب کو ادارۂ تحقیقات اسلامی (اسلام آباد) کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا رکن نامزد کیا گیا تھا۔ یہ ان کے لیے ایک اعزاز بھی تھا اور ان کے علم و فضل کا

اعتراف بھی---!

ادارہ ثقافت اسلامیہ سے علیحدگی کے بعد ۱۹۷۳ء کے اکتوبر میں وہ کراچی تشریف لے گئے تھے اور وہاں انھیں پاکستان سنی کونسل کا صدر منتخب کر لیا گیا تھا- ان کا ایک خاص حلقہ تھا جو قدیم و جدید تعلیم یافتہ لوگوں پر مشتمل تھا- وہ لوگ ان کے قدر دان اور عقیدت مند تھے- کراچی میں انھوں نے درس قرآن مجید کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا تھا- پاکستان سنی کونسل کے زیر اہتمام تبلیغی جلسے بھی ہوتے تھے' جن میں مختلف مقررین حضرات کو مدعو کیا جاتا تھا- کراچی جا کر انھوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں-

کراچی میں وہ ۲۰۴ شرف آباد میں اقامت گزیں ہو گئے تھے' اور یہی ان کا ڈاک کا پتا تھا- وہاں تشریف لے جانے کے بعد ان کا لاہور کے علاقے سمن آباد کا مکان جو این بلاک میں تھا اور جس کا نمبر ۵۰۰ ہے' عرصے تک خالی اور بے آباد رہا- وہ کبھی کبھی لاہور آتے اور دوستوں سے ملتے- وہی ہنسی مذاق' وہی چہل پہل اور وہی بے تکلفی جو ابتدا سے ان کا خاصہ تھی' اب بھی پورے جوبن پر تھی-

میرا ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا- یوں تو ان کے تمام مکتوبات پر خلوص اور محبت بھرے ہیں' لیکن وفات سے تیرہ چودہ مہینے قبل ۱۹۸۰ء کے آخر اور ۱۹۸۱ء میں انھوں نے میرے نام جو خطوط تحریر فرمائے' وہ انتہائی دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں- ایک ایک لفظ سے ان کی زندہ دلی اچھلتی اور ان کی بے پناہ شفقتوں اور کرم فرمائیوں کا اظہار ہوتا ہے- دسمبر ۱۹۸۰ء کے آخری دنوں کا ایک مکتوب ملاحظہ ہو:

مخلص محبّ محترم! سلام و دعا ہائے وافرہ

لفافہ شرف صدور لایا- پڑھا اور سینے سے لگایا- ادارے کی پرانی یادوں نے رلایا- آرزوئے ملاقات نے تڑپایا- ماضی کے گہرے تصور نے کراچی سے لاہور پہنچایا- جیتا جاگتا منظر سامنے آیا- زندہ دلی کا بادل چھایا- خوشیوں کا مینہ برسایا- تصور ہی تصور میں چائے پی' بسکٹ کھایا- پھر کوئی لطیفہ سنایا- خود ہنسے دوسروں کو ہنسایا- محفل برخاست ہوئی تو اپنی نشست پر آیا- کچھ پڑھا پڑھایا- کچھ لکھا لکھایا- کچھ یاد کیا کچھ بھلایا- کسی کو روکا کسی کو بھگایا- احباب نے فرمائش کی تو گانا گایا- یا گیت سنایا- صواب پر خوش ہوا خطا پر شرمایا- گھر آیا سبھوں کو بخیریت پایا' تو سجدہ شکر بجا لایا- رات نے سلایا- اذان نے جگایا- وقت پر پھر دفتر آیا- وہاں

پھر وہی زخموں کا پھایا- وہی رحمت و مسرت کا سایہ- آب و دانہ بدلا تو قسمت نے لاہور چھڑایا- شہر کراچی دکھایا- لاہور کا خواب کس نے دکھایا؟ کراچی میں کون لایا؟ یہ گردش ایام ہے- زمانہ اسی کا نام ہے- صبر و شکر ہمارا کام ہے- مولا کے قبضے میں سب کا انجام ہے- لاہور بھی اس کی نعمت تھی' کراچی بھی اسی کا انعام ہے- وہاں سرسوں کا تیل تھا' یہاں روغن بادام ہے- وہاں کام تھا' یہاں آرام ہے- وہ صبح زندگی تھی' یہ زندگی کی شام ہے- وہاں تیز بخار تھا' تو یہاں سرسام ہے- وہاں مالٹا اور کینو تھا' یہاں کیلا اور آم ہے- ع دلربا پہلو میں ہے محفل میں دور جام ہے- جس طرف دیکھو یہاں اسلام ہی اسلام ہے- اب نہ کہیں جناح ہے نہ ابوالکلام ہے- ہر متنفس کلیم بے کلام ہے- مگر بکنے میں بے لگام ہے- کوئی مدہوش مئے گلفام ہے- کوئی مست خرام ہے- کسی کا لقمہ ہی حرام ہے- کسی کا مطلوب شاہد نازک اندام ہے- ہر سوال کے جواب میں ایک ہی شاعرانہ کلام ہے۔

مے کو تو کہہ دیا زاہد حرام ہے

مے خانے کو بھی کہہ دے کہ بیت الحرام ہے

یہ خط بحفاظت رکھ لیجیے- یہ وعظ ہے نہ پیغام ہے- بس ایک انوکھا انداز نامہ و پیام ہے- ہر پرسان حال کے لیے میری طرف سے یہی دعا سلام ہے- بندۂ عاجز محمد جعفر جو زمانے میں بدنام ہے- رسوا ہے ناکام ہے- زبان پر اللہ اللہ دل میں سیتا رام ہے- اس کے سامنے نہ بحث مولود ہے نہ مسئلۂ قیام ہے- یہ نہ مقتدی ہے نہ امام ہے- سراپا معصیت ہے مگر فدائے خیر الانام ہے جو حق دار صلوٰۃ و سلام ہے-

اب ایک اور مکتوب ملاحظہ فرمائیے- اس میں ایک تو اپنی بیماری کے بارے میں تحریر فرمایا ہے' دوسرے میں نے لکھا تھا کہ ان کے فرزند گرامی شاہ موسیٰ آج کل کیا کر رہے ہیں' اس کا جواب دیا ہے- یہ مکتوب ۲۶- جنوری ۱۹۸۱ء کا تحریر فرمودہ ہے-

"۲۰۴- شرف آباد کراچی نمبر-۵

باسمہ تعالیٰ

کل لفافہ کھولا تو معلوم ہوا کہ یہ تو جناب محمد اسحاق ہیں- جو دوستی میں مخلص اور خالی از نفاق ہیں- نہ خود ساختہ لیڈروں کی طرح صاحب طمطراق ہیں- نہ کھرے وہابیوں کی طرح بدمذاق ہیں- اپنے کاموں کے ماہر و مشاق ہیں- ادائے فرض میں چوبند و چاق ہیں- خود ہی

انفس اور خود ہی آفاق ہیں - نہ باتونی نہ لپاق ہیں' بلکہ پابند مواعید و میثاق ہیں - مسلکا وہابی اور مزاجاً درویشوں کی طرح صاحب انفاق ہیں - نہ حریص زر ہیں نہ نشانہ املاق ہیں - حساب کتاب میں بھی بیباق ہیں - ہر زہر کے تریاق ہیں - مگر بے نیاز از عراق ہیں - متوجہ الی الخلاق ہیں - متوکل علی الرزاق ہیں - نیکوں پر جیسے رحیم ہیں' بدوں پر ویسے ہی شاق ہیں - حق نوازوں کے لیے صاحب اخلاق ہیں اور باطل پرستوں کے لیے مکمل قزاق ہیں - تحصیل حق کے مشتاق ہیں - اور حق کے حق میں صاحب احقاق ہیں - مختصر یہ کہ مخلص علی الاطلاق ہیں -

اب کچھ میری سنیے - ایک دن بلڈ پریشر صاحب تشریف لائے - جن کی برکت سے سر میں کئی بار چکر آئے - لوگ شعبہ دل (جناح ہسپتال) میں داخل کرا آئے - فوری طبی امداد سے جان بچی لاکھوں پائے - پرہیزی ناشتہ چائے' وہابی قسم کا کھانا' نہ سری نہ پائے - بے بس مریض جائے تو کدھر جائے - گیارہ دن جب پڑے پڑے گھبرائے تو ڈاکٹر کی اجازت سے گھر آئے - شرط یہ کہ کئی ہفتے مکمل آرام کیا جائے - بس ذرا لکھنے پڑھنے کی اجازت ملی ہے تاکہ محبت ناموں کا جواب دیا جائے - اور اپنا مشغلہ کیا عرض کیا جائے -

جتنی زیادہ بے کاری ہے اتنی ہی زیادہ خوشحالی - یہ ہے قدرت کا کرشمہ اور شان ذی الجلالی - بدن اوپر سے آراستہ اور روح اندر سے خالی - کردار یہ کہ زبان پر دعا اور دل میں گالی - اندر سے کڑھن اور ہاتھوں سے تالی - بظاہر غنی' بباطن سوالی - نیتوں میں فتور' صورت بھولی بھالی - عمل خلاف سنت اور زبان پر من سلك طريقي فهو آلي - اندر مکھیوں کی بھرمار اور اوپر دکھاوے کی جالی - بالوں میں سفیدی اور من کی دنیا سیاہ کالی - ہم سے اچھے باغ کے مالی - ادھر پانی دیا' ادھر پودوں کی دعا لی -

آپ نے وہ شعر تو سنا ہی ہو گا ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لانے کو جائیں پیمبری مل جائے

ہمارے موسیٰ صاحب تھے تو بڑے ہی پاجی' اب ہو گئے ہیں حاجی - ریاض میں پرنس ناصر کا محل بن رہا ہے جس کے سینٹری ڈیپارٹمنٹ کی نگرانی موسیٰ کے سپرد ہے - دس بارہ پلمبر ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں - چنانچہ میں نے انھیں یہ شعر لکھ کر بھیجا ہے ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ اینٹ ڈھونے کو جائیں پلمبری مل جائے

اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس شعر کو ترجیح دے کر اپنی "وہابیت یا چشتیت" کا ثبوت دیتے ہیں۔

بہتیرے اخباروں اور رسالوں میں بعض مطبوعہ مضامین بہ شکریہ ---- بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر "المعارف" کی پالیسی کے خلاف نہ ہو تو ایک مطبوعہ مضمون ارسال کر دوں، اس میں اپنی مسجع اردو کے آغاز کی داستان ہے اور ایک مسجع خط بھی ہے جو اردو زبان میں ایک نئے انداز کا اضافہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ آپ کی مجلس ادارت میں ایک فرد بھی اسے ناپسند کرے تو اسے فوراً رجسٹری سے مجھے واپس کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کا کوئی ثنیٰ میرے پاس نہیں۔

دو کتابچے بھی ارسال ہیں، لیکن یہ عام اشاعت کے لیے یا تبصرے کے لیے نہیں، بس علم سینہ بسینہ کی طرح سنیوں اور پڑھے لکھے صوفیوں میں ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں پہنچ جائیں۔ "درود تاج پر ایک نظر" پر ایک اور صاحب نے لمبا اعتراض کیا ہے، اس کا جواب بھی آنے والا ہے۔ وہ سب یک جا کر کے پھر اسے عام کیا جائے گا۔ ابھی اس میں بعض قانونی سقم ہیں، اس لیے عام نہیں کرنا ہے۔ سب احباب اور پرسان حال کو سلام۔

والسلام

محمد جعفر پھلواروی

۸۱-۱-۲۶

ان کے متعدد مکتوبات میں سے ایک اور خط بھی پڑھ لیجیے۔ انھوں نے فروری ۱۹۸۱ء میں یعنی وفات سے ایک سال قبل مجھے اپنا تازہ فوٹو صرف دیکھنے کے لیے کراچی سے بھجوایا تھا جو میں نے واپس کر دیا تھا۔ اس خط میں فوٹو کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں۔ خط کے ساتھ "المعارف" کے لیے ایک مضمون ارسال فرمایا تھا، اس کا بھی ذکر ہے۔ یہ دلچسپ خط لائق ملاحظہ ہے:

باسمہ تعالیٰ

محبّ مخلص و محترم! سلام و دعا

اخلاص نامہ مکتوبہ ۸۱-۲-۲۱ ملا، جس میں آپ نے میرے سابق مکتوب کو "مقامات

حریری" سے تشبیہ دی ہے تو سنیے:

میرا مکتوب نہ معلقات سبع ہے نہ مقامات حریری ہے- نہ یہاں علم وادب ہے نہ کسی کاروان سخن کی میری ہے- نہ غالب کا شاگرد ہوں نہ میرا استاد نظیری ہے- بس کچھ اپنا ذوق ہے اور کچھ غیبی دست گیری ہے- نہ رندی ہے نہ پارسائی' نہ درویشی ہے نہ فقیری ہے- تحریر صرف بیان تحریری ہے- نہ اس میں دلربائی ہے نہ دلگیری ہے- جسم میں ضعف ہے کیونکہ یہ زمانہ پیری ہے- اور روح میں بے یقینی ہے' بے ضمیری ہے' افکار میں بے ربطی اور عمل میں بے تدبیری ہے- زبان پر چاہے ادعائے ہمہ دانی ہو' لیکن اندر جہالت کی فراوانی وہمہ گیری ہے- معاشی زندگی میں غریبی نہ امیری ہے- مگر شیطانی ہوس کا جال دام اسیری ہے- روزی کا سارا معاملہ ہی تقدیری ہے- کوئی مرغ پلاؤ کھاتا ہے اور کسی کی قسمت میں نان خمیری ہے- مگر تقدیر کا شکوہ بے شمار نعمتوں کی بے توقیری ہے- نہ یہ اسوۂ معاویہؓ ہے نہ داب شبیریؓ ہے- یہ انداز فکر تعظیمی نہیں' تحقیری ہے- اس سے زیادہ بولنا چرب تقریری ہے-

لیجیے مضمون حاضر ہے- بندۂ ناچیز اس کی مدح اور ذم دونوں سے قاصر ہے- بس اللہ مددگار وناصر ہے- اور ہر شے پر قادر ہے- دیکھنے میں مضمون خالی لفافہ ہے' مگر ایک لحاظ سے اردو ادب میں نیا اضافہ ہے- اس میں میرے دینی' اخلاقی' سیاسی اور معاشی افکار جھلکتے ہیں- یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ اس سے بدکتے ہیں' اور کچھ خوشی سے پھڑکتے ہیں- بعض سن کر چپکے سے سرکتے ہیں اور بعض غصے سے بھڑکتے ہیں' اور پھر برستے ہیں' کڑکتے ہیں-

۱۴- فروری کو مولانا کوثر نیازی عیادت کے لیے آئے تھے اور ڈیڑھ گھنٹے تک بیٹھے رہے- ۱۹- فروری کے جنگ (کراچی) صفحہ ۳ کے کالم پر میرا اور مولانا حنیف ندوی وغیرہ کا ذکر کیا ہے- یہ فوٹو اس شرط پر ارسال کر رہا ہوں کہ دیکھ کر فوراً واپس کر دیجیے' کیونکہ اس کی کوئی کاپی میرے پاس نہیں- والسلام

ارسال کردہ مضمون کا بھی کوئی ثنیٰ میرے پاس نہیں- ذرا حفاظت سے رکھ کر واپس کیجیے گا-

محمد جعفر پھلواروی

۸۱-۲-۲۳

اس کے بعد بھی کئی خط آئے- ہر خط کو ایک "غزل" سمجھنا چاہیے- جس طرح غزل کا

ہر شعر اپنے مفہوم میں مکمل ہوتا ہے' اسی طرح شاہ صاحب کے ہر خط کا ہر فقرہ اپنی جگہ مکمل ہے اور مفہوم کو واضح کرتا ہے- صرف ایک خط اور درج کر رہا ہوں- اگرچہ یہ اس نوعیت کا نہیں ہے' تاہم اس کا ایک حصہ جو رمضان کے روزوں اور ہلال عید سے تعلق رکھتا ہے' دلچسپ ہے- اس خط میں انھوں نے میری بیٹی سمیہ زیرک کے لیے ایک عید کارڈ بھیجا تھا' آخر میں اس کا تذکرہ ہے- یہ خط ۱۲- اگست ۱۹۸۱ء کا مرقومہ ہے-

مخلص محترم---! سلام ودعاہائے وافرہ-

اللہ کرے آپ بالکل خیریت سے ہوں' آمین- تشویش اس لیے ہوئی کہ عرصہ دراز سے کوئی خیریت نامہ نہیں آیا ہے- ڈیڑھ ماہ ہوا ایک لفافہ بھیجا تھا جس میں "المعارف" کے لیے ایک مثنوی در منقبت سیدنا معاویہؓ تھی- پھر ایک کارڈ بھی ارسال کیا تھا- یہ بھی لکھا تھا کہ اگر المعارف کی پالیسی یا معیار کے مطابق نہ ہو تو واپس کر دیجیے گا- لیکن نفی یا اثبات میں کوئی جواب نہ آنے سے یہی گمان ہوا کہ اسے شائع کر دیا جائے گا- مگر اس کے بعد سے المعارف کا کوئی پرچہ نہیں ملا- ایسی صورت میں اگر تشویش ہو تو بجا ہے- یہ تشویش آپ کے جواب سے دور ہو سکتی ہے-

ایک اور تکلیف دے رہا ہوں- میاں امیر الدین صاحب کا جو پتا آپ نے لکھ بھیجا تھا' اس پتے پر خط نہیں پہنچا- اس لیے آپ بذریعہ فون ان سے رابطہ قائم کر کے انھیں میرا پتا دے دیجیے اور کہیے کہ The Holy Quran Ataglance کی جتنی جلدیں مجھے ارسال کر سکتے ہوں' فوراً کر دیں- معلوم نہیں اس کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا یا کاغذ سستا ہونے کے انتظار میں ہنوز تشنۂ طبع ہے- بہرحال یہ کام آپ کے ذمے کر رہا ہوں اور یقین ہے کہ انك لا تالو-

میرے ساتھ یہ عجیب معجزہ ہوا کہ پورے رمضان کے روزے اللہ کریم نے رکھوا دیے- ہلال رمضان سے پہلے تک روزہ رکھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا' کیونکہ سخت گرمی پڑ رہی تھی- تجربے کے طور پر ایک روزہ رکھا تو رکھتا ہی چلا گیا- ع

آئی جو ان کی یاد تو آتی چلی گئی

یہاں تک کہ ۲۹ ویں روزے میں نے پیش گوئی کر دی کہ آج ضرور چاند ہو گا' کیونکہ رمضان کا چاند تو نکلتا ہے اور عید کا نکالا جاتا ہے- چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب ہوتے ہی عید کا

سائرن بجنے لگا- یعنی چاند نکال لیا گیا-

لیجیے ساری کتھا ختم ہو گئی اور عید مبارک کہنا یاد نہ رہا- آپ سب حضرات میری طرف سے باسی سہی' مگر عید مبارک قبول کیجیے-

حرم شریف کے روز و شب کے دونوں مناظر اس عید کارڈ میں ہیں- یہ میری طرف سے گھر جا کر میری بیٹی کو دے دیجیے گا- اللہ کرے آپ سبھوں کو برائی العین دیکھنے کی سعادت حاصل ہو-

والسلام

محمد جعفر پھلواروی

۱۲ - ۸ - ۸۱

شاہ صاحب نے اردو' عربی اور انگریزی تینوں زبانوں میں لکھا- اردو میں بہت زیادہ لکھا- انگریزی میں ایک کتاب The Holy Quran Ataglance تصنیف کی- عربی میں ان کے مضامین اسلام آباد کے "الدراسات الاسلامیہ" اور کراچی کے "الیقین" میں عرصے تک بالالتزام چھپتے رہے- اردو میں ان کے مقالات و مضامین مختلف موضوعات پر دہلی کے ماہنامہ "پیشوا" اور "مولوی" میں اور لاہور کے ثقافت' المعارف' اردو ڈائجسٹ' کوثر' ایشیا' الاعتصام' چٹان' لیل و نہار' منہاج' امروز وغیرہ میں بکثرت شائع ہوئے- کراچی کے فاران اور حریت میں ---- اور راولپنڈی کے فیض الاسلام وغیرہ رسائل و جرائد میں کثیر تعداد میں معرض اشاعت میں آئے- ریڈیو پاکستان لاہور اور کراچی میں بے شمار تقریریں نشر ہوئیں- ٹیلی ویژن پر بھی تقریریں کیں-

وہ ۲۹- نومبر ۱۹۰۲ء کو پھلواری شریف (ضلع پٹنہ' صوبہ بہار' ہندوستان) میں پیدا ہوئے اور ۷۹ برس چار مہینے عمر پا کر ۳۱- مارچ اور یکم اپریل ۱۹۸۲ء کی درمیانی شب کو ۲۰۴ شرف آباد کراچی ۵ میں ان کا انتقال ہوا- وہ زندگی کے آخری مرحلے میں عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئے تھے- انھیں ہسپتال میں داخل کرایا گیا لیکن صحت یاب نہ ہو سکے اور اس عالم فانی سے منہ موڑ کر سفر آخرت پر روانہ ہو گئے- اس زندہ دل کی زندگی آخر دل ہی سے ختم ہوئی- انا للہ و انا الیہ راجعون

پھلواری میں ان کے خالہ زاد بھائی شاہ نظام الدین پھلواروی تھے- وہ ان سے عمر میں

تین سال بڑے تھے- ان دونوں کا آپس میں گہرا دوستانہ اور پیار تھا- یہ عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے بھی اسی وقت اور اسی تاریخ کو اپنے وطن پھلواری میں وفات پائی --- یعنی دونوں دوست اور عزیز ایک ہی وقت اور تاریخ میں جنت کو سدھارے- اللّٰھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم وادخلھم جنة الفردوس-

شاہ محمد جعفر بہت سی صفات سے موصوف تھے- ان کا ہنستا کھیلتا باوقار چہرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے- بار بار خیال آتا ہے کہ شاہ صاحب ایسا خوش مزاج' بذلہ سنج اور مجلسی آدمی بھلا کیونکر موت کے سناٹے میں جا سکتا ہے- لیکن یہ محض واہمہ ہے- حقیقت یہ ہے کہ وقعت الواقعہ یہ حادثہ رونما ہو چکا اور شاہ صاحب ہم سے بچھڑ کر موت کی آغوش میں چلے گئے-

ان کو مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ لرزتا اور قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے' لیکن اس کا کیا کیجیے کہ زمانے کا دستور ہمیشہ سے یہی چلا آ رہا ہے- موت و حیات اس کے لازمی اجزا ہیں- آج ان کی باری ہے تو کل ہماری آنے والی ہے' اس سے کسی کو مفر نہیں- انسان کہیں چلا جائے' موت اس کے تعاقب میں رہتی ہے اور اس وقت تک چین نہیں لیتی جب تک اس کی شہ رگ میں اپنے بے رحم پنجے نہیں گاڑ دیتی- قرآن کریم نے کتنی سچ بات کہی ہے:

اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (النساء:۷۸)

تم کہیں بھی ہو' موت تمھارا ٹھکانا پا کر رہے گی- اگر تم اونچے اور مضبوط قلعوں میں چھپ جاؤ' جب بھی اس کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے-

ان سطور کے راقم کا پچیس چھبیس سال مرحوم سے قریبی تعلق رہا ہے-- جس قدر ان سے قرب و ربط رہا ہے' ظاہر ہے اسی قدر ان کی موت سے صدمہ پہنچا ہے اور یہ صدمہ دل کی ایسی کیفیت سے عبارت ہے جس کا قلم کی زبان سے اظہار ممکن نہیں- عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

رحلت وخلفت القلوب جریحه
تذوب وجیش الصبر قد قل جنده

(تم تو رحلت کر چکے مگر ہمارے دلوں کو زخمی کر گئے- تمھارے بعد دل پگھل رہے ہیں اور جیش صبر میں کمی واقع ہو گئی ہے)

ان کے جنازے کے دن یکم اپریل ۱۹۸۲ء کو (نو بجے شب) ریڈیو پاکستان لاہور نے ‘ان کے بارے میں ایک پروگرام نشر کیا جو ان کے معتقد خاص اور ریڈیو پاکستان لاہور کے اس زمانے کے سینئر پروڈیوسر عبدالحی قریشی نے ترتیب دیا تھا۔ اس پروگرام میں مولانا محمد حنیف ندوی‘ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور خود عبدالحی قریشی صاحب نے حصہ لیا۔ اس روز قریشی صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ میں مجھے بھی پروگرام میں شرکت کی دعوت دینے آئے تھے‘ لیکن مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پروگرام کے آغاز میں شاہ صاحب کی دو تقریریں نشر کی گئیں‘ ایک بچوں کے بارے میں اور ایک بڑوں کے بارے میں۔ دونوں میں انداز و الفاظ کا واضح فرق تھا۔ بچوں کے لیے انداز و اسلوب اور تھا‘ بڑوں کے لیے اور---! تقریروں کے بعد شاہ صاحب کے حالات بیان کیے گئے اور ان کی علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔

شاہ صاحب کے ایک ہی بیٹے ہیں اور ان کا نام ہے شاہ موسیٰ----- سب بہنوں سے چھوٹے----- والد گرامی کے ساتھ ہی ۲۰۴ شرف آباد کراچی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب کی وفات سے چند روز بعد پتا چلا کہ موسیٰ لاہور آئے ہیں اور اپنے مکان میں مقیم ہیں۔ میں پروفیسر محمد یحییٰ (انجینئرنگ یونیورسٹی) کے ساتھ مکان پر حاضر ہوا تو ”محمد جعفر پھلواروی“ کے بجائے ”موسیٰ جعفر“ کے نام کی تختی نصب تھی۔ گھنٹی بجانے کی کوشش کی تو خاموش تھی۔ آہنی پھاٹک پر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اتنے میں ایک اور شخص آ گئے۔ انھوں نے اندر جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ صاحب تو چلے گئے‘ لیکن میں کچھ دیر دروازے پر کھڑا رہا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے‘ مرحوم کی روح کو آنسوؤں کے چند قطروں کا نذرانہ پیش کیا اور حزن و ملال کا بوجھ اٹھائے واپس آ گیا۔

وہ مکان تو شاہ صاحب کی وفات کے بعد فروخت ہو گیا تھا‘ مگر میرا اس کے سامنے سے کبھی گزر ہوتا ہے تو قدم رک جاتے ہیں اور پرانی یادیں ذہن میں گردش کرنے لگتی ہیں۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں اس کے بندے شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی کے درجات بلند ہوں اور وہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

آمین یا ارحم الراحمین!

شاہ صاحب کو مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ سے بہت تعلق تھا اور وہ اسے خوش الحانی سے جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے ۱۹۷۳ء کے ابتدا

میں ان کی خواہش پر مثنوی مولانا روم ہی کے سلسلے کا کام ان کے سپرد کیا گیا تھا جو انھوں نے مکمل بھی کر لیا تھا، لیکن اکتوبر ۱۹۷۳ء میں انھوں نے ادارے سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مسودہ کہاں گیا۔ میں شاہ صاحب کے متعلق ان گزارشات کو مثنوی مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ہی کے دو اشعار پر ختم کرتا ہوں ؎

کاشکے ہستی زبانے داشتے
تاز مستاں پردہ ہا برداشتے

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام
کاندراں بے حرف می روید کلام

# مولانا عبدالمجید سوہدروی

۱۹۳۵ء میں میری عمر آٹھ نو سال کی تھی۔ اس سال ہمارے ہاں انجمن اصلاح المسلمین کا جو سالانہ جلسہ منعقد ہوا تھا' اس میں مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی موجود تھے۔ یہ جلسے میری ہوش سے بہت پہلے سے منعقد ہوتے آ رہے تھے اور مولانا سوہدروی کو ہر جلسے میں شمولیت کی دعوت دی جاتی تھی اور وہ جلسے میں شامل ہوتے اور تقریر فرماتے تھے' لیکن میں نے اپنی ہوش میں پہلی مرتبہ اسی جلسے میں انھیں دیکھا تھا۔ اس جلسے کی مجھے دو باتیں یاد ہیں' جن کا تعلق مولانا ممدوح کی ذات گرامی سے ہے۔

پہلی بات یہ کہ ہمارے ہاں ایک گھر قادیانیوں کا تھا۔ انھوں نے بھی قادیان سے یا کسی اور جگہ سے انجمن اصلاح المسلمین کے جلسے کے دنوں میں اپنا کوئی مبلغ بلا لیا اور اس نے مناظرے کا چیلنج دے دیا۔ حسن اتفاق سے جلسے میں حضرت مولانا حافظ عبداللہ روپڑی اور ان کے دونوں بھتیجے (حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی) جلسے میں موجود تھے۔ انھوں نے چیلنج قبول کیا اور قادیانی مبلغ مناظرے کے لیے آ گئے۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی نے نہایت سلجھے ہوئے الفاظ میں مناظرے کی شرائط بیان کیں اور فرمایا کہ ہمیں امید ہے مناظرے میں کوئی گڑ بڑ نہیں کی جائے گی اور ذمے داری سے شرائط مناظرہ کی پابندی کی جائے گی۔ اگر دوسرے فریق کی طرف سے ہنگامے کی کوشش کی گئی تو ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔

قادیانی مناظر سے مناظرہ حافظ عبدالقادر صاحب روپڑی نے کیا تھا اور یہ ان کا پہلا مناظرہ تھا۔

دوسری بات جو مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ مناظرہ دن کے دس گیارہ بجے ہوا تھا' رات کو عشا کے بعد مولانا کی تقریر تھی۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی کثیر تعداد میں آئے تھے۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ مولانا نے کس موضوع پر تقریر کی تھی' البتہ اتنی بات ذہن میں محفوظ ہے کہ انھوں نے لوگوں کو فضول خرچی اور ضرورت سے زیادہ

چیزیں خریدنے سے منع فرمایا تھا- اس ضمن میں تمباکو اور سگریٹ کا بھی ذکر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ تمباکو نوشی بہت بڑی برائی اور فضول خرچی ہے- پھر حساب لگا کر بتایا تھا کہ اگر کوئی شخص اتنا تمباکو روزانہ پیتا ہے تو اتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں اور صحت پر بھی برا اثر پڑتا ہے-

اس سے وہ مسلمان بھی متاثر ہوئے جو تمباکو نوشی کے عادی تھے' لیکن سکھ خاص طور سے متاثر ہوئے- وہ چونکہ مذہبی اعتبار سے تمباکو نوشی کے مخالف ہیں' انھوں نے تقریر کے بعد مسلمانوں سے کہنا شروع کیا کہ اب تو تمھارے مولوی صاحب نے بھی اس کی مخالفت کر دی ہے' اب تو تمھیں اس حرکت سے باز آجانا چاہیے-

اس سے اگلے سال ۱۹۳۶ء میں بھی وہ انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں تشریف لے گئے تھے- اس مرتبہ مولانا محمد اسماعیل' مولانا نور حسین گرجاکھی اور مولانا عبدالمجید تینوں اکٹھے گئے تھے اور ہمارے ایک مرحوم بزرگ حاجی محی الدین کے مکان پر ٹھہرے تھے- لوگوں پر ان کی تقریروں اور گفتگو کا بڑا رعب اور اثر تھا- گوجرانوالہ ہمارے ہاں سے ایک سو تیس میل کے فاصلے پر تھا اور بعد مسافت کی وجہ سے اسے بہت بڑا شہر سمجھا جاتا تھا' اور بلاشبہ علم و کمال کی وجہ سے بھی وہ بہت بڑا شہر تھا-

اس کے بعد بھی مولانا کو کئی دفعہ دیکھا اور ان کی تقریریں سنیں-

۱۹۴۱ء میں یہ فقیر حضرت مولانا حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کے حلقہ درس میں شامل تھا- ایک دن مولانا عبدالمجید سوہدروی' مولانا اسماعیل صاحب کے پاس تشریف لائے- سترہ اٹھارہ سال کی اٹھتی جوانی کے ایک نوجوان ان کے ساتھ تھے- پتا چلا کہ یہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کے صاحب زادے ہیں اور عبیداللہ انور ان کا نام ہے- انھیں مولانا محمد اسماعیل صاحب کے حلقہ شاگردی میں شامل کرنا مقصود ہے' اور شامل کر دیے گئے' لیکن وہ زیادہ عرصہ وہاں رہے نہیں' جلد ہی آگئے تھے- شاید وہ ماحول انھیں اچھا نہیں-

یہاں یہ یاد رہے کہ مولانا عبدالمجید سوہدروی کی دوسری شادی حضرت مولانا احمد علی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی' اور مولانا عبیداللہ انور ان کی اہلیہ کے بھائی تھے ----- اب یہ سب لوگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں' رحمہم اللہ تعالیٰ-

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جمعیت علمائے ہند نے اپنے مرکزی دفتر دہلی میں مسلم لیگ سے

سیاسی اختلاف رکھنے والی جماعتوں اور ملک کے بعض سرکردہ حضرات کی ایک میٹنگ بلائی۔ اس میٹنگ میں مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی بھی شامل تھے۔ میں بھی اس میں شریک تھا۔ گوجرانوالہ سے مجھے یاد پڑتا ہے' اس میٹنگ میں دو علمائے کرام ہی شریک ہوئے تھے۔ شہر سے مولانا عبدالواحد جو دیو بندی مسلک کے حامل تھے اور ضلعے سے مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی جو مسلک اہل حدیث کے معروف عالم اور مقرر تھے۔ اس میٹنگ میں ان کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوا اور انھوں نے چند تجاویز پیش کی تھیں' وہ بھی سنیں۔ مولانا داؤد غزنوی نے جمعیت علمائے ہند کے جنرل سیکرٹری مولانا حفظ الرحمٰن کو خاص طور سے مولانا سوہدروی کی تجاویز نوٹ کرائیں۔ کسی تجویز کا کوئی حصہ اب ذہن میں محفوظ نہیں

یہاں یہ یاد رہے کہ اس میٹنگ سے دو مہینے بعد دسمبر ۱۹۴۵ء میں ملک میں انتخابات شروع ہو گئے جو دسمبر ۱۹۴۶ء تک جاری رہے تھے۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی اس وقت مسلم لیگ کی سیاست سے متفق نہیں تھے۔

دہلی میں مہمانوں کے قیام کا انتظام پنجاب ہوٹل میں تھا اور ہم اسی ہوٹل میں رہے تھے۔

۱۹۴۸ء میں مرکزی جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان قائم ہوئی تو میں اس کا ناظم دفتر مقرر ہو کر آیا۔ اس وقت جن علمائے کرام اور جماعت کے زعمائے عظام سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا' ان کی وسیع فہرست میں مولانا عبدالمجید سوہدروی کا اسم گرامی بھی شامل تھا۔ وہ جمعیت کے سلسلے میں کئی دفعہ لاہور تشریف لائے اور جماعتی نظم و نسق کے بارے میں ان کی تجاویز سننے کا موقع ملا۔

مئی ۱۹۴۹ء میں جمعیت اہل حدیث مغربی پاکستان کی پہلی کانفرنس لاہور میں ہوئی تو اس میں بھی مولانا مرحوم شریک تھے اور انھوں نے تقریر ارشاد فرمائی تھی۔۔۔ ان تمام مواقع پر ان کو سلام تو کیا' لیکن ان سے زیادہ گفتگو نہ ہو سکی۔

اگست ۱۹۴۹ء میں گوجرانوالہ سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' جاری ہوا اور میں اس سے منسلک ہوا تو مولانا سوہدروی سے واقفیت کا سلسلہ آگے بڑھا۔

اس سے دو ڈھائی مہینے بعد ۱۹۴۹ء کے آخر میں جامعہ محمدیہ (اوکاڑا) میں مولانا معین الدین لکھوی نے ایک جلسہ عام کے انعقاد کا اہتمام کیا' اس میں مجھے اور مولانا محمد حنیف

ندوی کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور مولانا عبدالمجید سوہدروی بھی موجود تھے۔ دو دن ہم وہاں رہے ' ایک ہی کمرے میں قیام تھا۔ اب ان کی مجلس میں بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے اور ان سے ہم کلام ہونے کا اچھا خاصہ موقع ملا۔

پہلے دن نماز عصر کے بعد چار بجے کے قریب ہمیں ایک کمرے میں چاے کے لیے بلایا گیا تو دستر خوان پر بیٹھتے ہوئے مولانا عبدالمجید صاحب نے کہا: کافر چاے ہے یا مسلمان؟ چاے کے لیے کفر و اسلام کی اصطلاح ہم نے پہلی دفعہ سنی تھی --- مولانا حنیف ندوی نے فرمایا وہابی چاے ہو گی۔

حافظ احمد پٹوی مرحوم بھی تشریف فرما تھے۔ انھوں نے کہا آپ کی شان کے مطابق عالم فاضل چاے کا اہتمام کیا گیا ہو گا۔

بہر حال چاے کئی قسم کے بسکٹوں کے جھرمٹ میں آئی تو مولانا عبدالمجید سوہدروی نے خوش ہو کر فرمایا چاے نہ صرف مسلمان ہے بلکہ عالم فاضل بھی ہے اور اچھی خاصی واعظ و مقرر بھی ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی سے تو ان کے بے تکلفانہ مراسم تھے اور دونوں ایک ہی ضلعے کے رہنے والے تھے۔ مولانا کا آبائی مسکن شہر گوجرانوالہ تھا اور ان کا ضلع گوجرانوالہ کی تحصیل وزیر آباد کا ایک قصبہ سوہدرہ تھا جو وزیر آباد سے چار میل کے فاصلے پر بجانب مشرق سیالکوٹ روڈ پر واقع ہے۔

میں نے اس سے پہلے اگرچہ کئی مرتبہ انھیں دیکھا تھا' ان کی تقریریں سنی تھیں اور ہر سال ہمارے ہاں انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں انھیں بلایا جاتا تھا' لیکن بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی مجلسی گفتگو سننے کا اب موقع ملا تھا۔

پورا قد' چوڑا سینہ' متناسب جسم' کھلتا ہوا سرخی مائل گندمی رنگ' کتابی چہرہ' سر پر ترکی ٹوپی' شلوار قمیص اور شیروانی میں ملبوس' خوش مزاج' خوش کلام' مقررانہ آواز---!

سوہدرہ اگرچہ بہت پرانا تاریخی قصبہ ہے' لیکن اس کی شہرت کا اصل باعث مولانا عبدالمجید سوہدروی ہیں۔ سوہدروی کی نسبت ان کے نام کا جزو لاینفک ہو گئی تھی۔ وہ جہاں گئے' اس نسبت کی رفاقت میں گئے۔ اس طرح متحدہ ہندوستان کے بے شمار بلاد و قصبات میں اس قصبے کا نام پہنچا اور اسؔ نے بے حد شہرت پائی۔

اپریل ۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ میں اور میرے محترم دوست مولانا محمد صادق خلیل (فیصل آباد) ایک سلسلے میں راولپنڈی گئے- وہاں سے مری کا عزم کیا- مری سے واپس راولپنڈی آئے تو وہاں سے سیالکوٹ جانے کا پروگرام بنا- سیالکوٹ سے براستہ سوہدرہ لاہور کو روانہ ہوئے- اور بس میں بیٹھے ہوئے یہ قصبہ دیکھا- اس کے بعد اس طرف جانے کا موقع نہیں ملا- بعض کرم فرماؤں نے دعوت بھی دی بالخصوص حکیم عنایت اللہ نسیم مرحوم نے کئی دفعہ زبانی بھی کہا اور خطوط بھی لکھے، لیکن افسوس ہے، قدیم اہل علم کا یہ مسکن اس کے اندر جا کر دیکھنے کا اب تک اتفاق نہیں ہوا-

مولانا عبدالمجید سوہدروی کے آباؤ اجداد، علمی وجاہت، مکارم اخلاق، حسن کردار اور تقویٰ شعاری میں پورے علاقے میں مشہور تھے- ان کے جد امجد کا اسم گرامی مولانا غلام نبی تھا- جو ۴ ستمبر ۱۸۴۸ء (۲۳- رمضان المبارک ۱۲۶۴ھ) کو سوہدرہ (ضلع گوجرانوالہ) میں پیدا ہوئے- وہ دودمان علوی سے تعلق رکھتے تھے، سلسلہ نسب اٹھائیس واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے-

مولانا غلام نبی نے حصول علم کا آغاز اپنے والد مکرم مولوی محبوب عالم سے کیا تھا- اس زمانے میں وزیر آباد میں ایک عالم دین مولوی قادر بخش فروکش تھے، مروجہ علوم کی بعض کتابیں ان سے پڑھیں- پھر درسیات کی انتہائی کتابوں کے لیے مولانا عبدالباقی جلال پوری اور مولانا غلام مرتضیٰ سیالکوٹی کے در علم پر دستک دی اور ان سے خوب استفادہ کیا- علوم حدیث کی تحصیل کے لیے حضرت حافظ محمد لکھوی کی خدمت میں موضع لکھوکے (ضلع فیروز پور) گئے اور پھر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے آستانہ فیض پر حاضری دی- حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے باب فضیلت کا رخ بھی کیا اور ان کے حلقہ بیعت میں شامل ہو کر روحانی فیوض و برکات سے بہرہ ور ہوئے-

فارغ التحصیل ہونے کے بعد سوہدرہ میں مسند رشد و ہدایت بچھائی اور اس علاقے میں بے حد خدمت دین سر انجام دی- ان کی مساعی جمیلہ سے سوہدرہ اور اس کے قرب و جوار میں مسلک توحید کی خوب نشر و اشاعت ہوئی- وعظ و خطابت، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں احکام اسلام راسخ کرنے کا عزم کیا اور اس میں اللہ نے ان کو کامیابی سے نوازا-----

اس رفیع المنزلت عالم دین اور اسلام کے مخلص ترین مبلغ کا ۳- مئی ۱۹۳۰ء (۴ ذی الحجہ ۱۳۴۸ھ) کو سوہدرہ میں انتقال ہوا- ۸۳ سال کے پس و پیش عمر پائی-

مولانا غلام نبی کے دو بیٹے تھے- عبدالحکیم اور عبدالحمید-!

عبدالحکیم کی ولادت ۱۸۷۳ء (۱۲۹۰ھ) کو ہوئی- درس نظامی کی مروجہ کتابیں اپنے والد گرامی مولانا غلام نبی کے حلقہ درس میں مکمل کیں اور علم حدیث کی تکمیل حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی سے کی- اپنے عہد اور علاقے کے اچھے مبلغ اور واعظ تھے- حافظ قرآن تھے' اس لیے حافظ عبدالحکیم کے نام سے شہرت پائی- عین عالم جوانی میں ۱۹۰۲ء (۱۳۲۰ھ) کو وفات پائی- اور جوان بیٹے کی میت باپ نے اپنے ہاتھوں قبر میں اتاری-

مولانا عبدالحمید کا سن پیدائش ۱۸۸۲ء (۱۳۰۰ھ) ہے- ابتدائی کتابیں گھر میں پڑھنے کے بعد حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دی- صحاح ستہ کی تکمیل ان سے کی' حدیث کی بعض اور کتابیں بھی انہی سے پڑھیں اور حصول سند سے مفتخر ہوئے- لائق شاگرد کے تدین اور علم سے محبت کی بنا پر حضرت حافظ صاحب نے اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی تھی-

حضرت حافظ صاحب سے حصول سند حدیث کے بعد حضرت سید میاں نذیر حسین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ فضیلت میں حاضر ہوئے اور ان کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیا-

حضرت میاں صاحب کے ایک عالی قدر شاگرد مولانا شمس الحق ڈیانوی شارح ابوداؤد تھے' ان سے بھی استفادہ کیا-

پھر عازم بھوپال ہوئے' وہاں شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی کا حلقہ درس قائم تھا' ان سے فیض یاب ہوئے اور سند حاصل کی-

اس طرح انھوں نے اس دور کے جید علمائے کرام اور جلیل القدر اصحاب حدیث سے مستفید ہونے کا شرف حاصل کیا---- سوہدرے واپس آئے تو ایک مدرسہ قائم کیا جس کا نام مدرسہ حمیدیہ رکھا اور تدریس و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کو شب و روز کا مشغلہ قرار دے لیا- اس اثنا میں متعدد حضرات نے ان سے استفادہ کیا- ترجمہ و تصنیف سے بھی دلچسپی تھی-

اس عالم اجل نے صرف تیس سال عمر پائی- ۲۴ مئی ۱۹۱۲ء (۷ جمادی الاخری

۱۳۳۰ھ) کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا غلام نبی نے خود ہی جوان بیٹے کی نماز جنازہ پڑھائی اور خود ہی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔

بیٹے کی وفات کے بعد ان کے جاری کردہ مدرسہ حمیدیہ کی زمام تدریس و انتظام ہاتھ میں لی اور اس ضمن میں جو خدمت سر انجام دے سکتے تھے دی۔۔۔اس حادثے سے اٹھارہ سال بعد سفر آخرت اختیار کیا۔

مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی' جن کے بارے میں آئندہ سطور میں چند گزارشات پیش کرنا مقصود ہے' انہی مولانا عبدالحمید سوہدروی کے فرزند دلبند تھے۔

مولانا عبدالمجید سوہدروی جنوری ۱۹۰۱ء (۱۳۱۸ھ) کو سوہدرہ میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں سایہ پدری سے محروم ہو گئے تھے۔ دودھیال اور ننھیال کی طرف سے نسبت عالی رکھتے تھے۔ مولانا غلام نبی سوہدروی کے پوتے اور حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے نواسے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت جدامجد مولانا غلام نبی کی آغوش علم میں ہوئی۔ اس وقت سیالکوٹ میں مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا سلسلہ درس جاری تھا' عمر کی کچھ منزلیں طے کیں تو ان کی خدمت اقدس میں بھیج دیے گئے' وہاں مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ ان کے نانا (حافظ عبدالمنان وزیر آبادی) مولانا سیالکوٹی کے مشفق استاذ تھے' اس لیے انھوں نے خالص طور سے ان کا خیال رکھا اور تعلیم کے ساتھ تقریر و تحریر کی تربیت بھی دی۔ علاوہ ازیں علم طب بھی حاصل کیا' چنانچہ تعلیم سے فارغ ہوئے تو تگ و دو کے لیے چار میدان منتخب کیے۔

۱۔ تدریس

۲۔ تقریر

۳۔ تحریر۔۔۔اور

۴۔ طبابت

ان چاروں میدانوں میں خوب ترقی کی اور جس میدان میں قدم رکھا' اس میں آگے بڑھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔

سوہدرہ میں ایک عرصے سے ککے زئی برادری کا اثر تھا۔ مولانا عبدالمجید کے لائق اکرام

دادا مولانا غلام نبی نے اپنے علم و کردار اور حسن اخلاق و عمل سے ان کو اپنے قریب کیا اور ان میں نیکی و تدین کا جذبہ پیدا کیا جو بہت جلد ان کے قلوب واذہان میں راسخ ہو گیا۔ ان کے والد محترم مولانا عبدالحمید نے بھی ان سے قریبی تعلقات قائم رکھے اور جب تک زندہ رہے ان میں توحید خالص کی روح پھونکنے کے لیے ساعی رہے۔ اس طرح علوی اور ککے زئی دونوں برادریوں میں رشتہ اخوت ہمیشہ مستحکم رہا۔

اسلام کا صحیح ترین مبلغ وہی ہو سکتا ہے جو علم کے ساتھ عمل کی دولت بھی رکھتا ہو' جو زبان کا میٹھا اور دل کا صاف ہو' لوگوں کے مزاج اور نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو' حالات کے مطابق طریق تبلیغ اور اسلوب تفہیم سے آگاہ ہو۔ سب کو ایک ہی دوا ایک ہی مقدار میں نہ دے' بلکہ طبائع کا جائزہ لے کر اور آب و ہوا کو پیش نگاہ رکھ کر علاج کرے۔ اگر کوئی سختی سے پیش آئے تو اس کو نرمی سے جواب دے۔ سختی کا سختی سے جواب دینا اور تشدد کے مقابلے میں تشدد پر اتر آنا مخاطب پر برا اثر ڈالتا ہے اور اس علاج بالمثل سے سامعین کے دلوں میں نفرت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ پھر نہ صرف مبلغ بدنام ہوتا ہے' بلکہ لوگ اسلامی احکام کی تضحیک کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

قرآن و سنت میں مبلغ کو موعظہ حسنہ کا حکم دیا گیا ہے' تلخ رویہ اختیار کرنے اور کڑوی زبان استعمال کرنے سے روکا گیا ہے۔ جو لوگ کسی کے ساتھ میٹھا بول نہیں بول سکتے اور جن کا ذہن عذوبت لسان کی خوبیوں سے آشنا نہیں اور جو موقع و محل کی روشنی میں نہج تبلیغ میں تبدیلی کے فوائد کا اندازہ نہیں کر سکتے' وہ اور کچھ ہوں یا نہ ہوں واعظ و مبلغ دین ہرگز نہیں ہو سکتے۔

اپنی رائے کو اصل دین قرار دینا اور اس سے اختلاف کو کفر ٹھہرا دینا قطعاً مستحسن نہیں ہے۔ اس سے تشدد کی لہر تو اٹھ سکتی ہے اور اٹھتی ہے' لیکن دین کی راہ قطعاً ہموار نہیں ہو سکتی۔ سخت مزاج اور تلخ کلام مبلغوں کو اپنی روش پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ لیکن یہ نظر ثانی کریں گے نہیں۔ انھوں نے اسلام کو سلامتی اور امن کا مذہب نہیں سمجھا' ڈنڈے سوٹے بلکہ کلاشنکوف اور موزر کا مذہب سمجھ رکھا ہے۔ ہم ان کے لیے دعا ہی کر سکتے ہیں۔

بات مولانا عبدالمجید سوہدروی اور ان کے اسلاف کی ہو رہی تھی کہ انھوں نے سوہدرے اور اس کے گرد و نواح میں اس میٹھے اور پیارے طریقے سے اسلام کی تبلیغ کی کہ

سب لوگ ان سے متاثر ہوئے۔ ان کا اسلوب زندگی بدل گیا اور وہ توحید خداوندی کے گرویدہ ہو گئے۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی کی صدائے حق بہت دور تک پہنچی اور برصغیر کے کونے کونے میں گونجی۔

متحدہ ہندوستان کا زمانہ تبلیغی جلسوں کا زمانہ تھا۔ کہیں نہ کہیں جلسے منعقد ہوتے رہتے تھے۔ خیبر سے لے کر راس کماری تک جماعت اہل حدیث پھیلی ہوئی تھی اور اس کے چھوٹے بڑے بے شمار مراکز قائم تھے۔ مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی کو تقریباً ہر جلسے اور ہر مرکز میں دعوت شرکت دی جاتی تھی اور وہ شریک ہونے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ ان کا انداز وعظ و تبلیغ کچھ ایسا تھا کہ غیر اہل حدیث کے بھی اکثر تبلیغی جلسوں میں انھیں مدعو کیا جاتا تھا اور لوگ ان کی بات توجہ سے سنتے اور اثر پذیر ہوتے تھے۔ بالخصوص اہل حدیث کے جس جلسے میں مولانا مرحوم شرکت نہ فرما سکتے، منتظمین و حاضرین کے نزدیک وہ جلسہ پھیکا رہتا تھا۔ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کا جلسہ کسی سال دہلی میں، کسی سال مدراس میں، کسی سال مؤ بھنجن (ضلع اعظم گڑھ) میں، کسی سال بنارس میں اور کسی سال پنجاب کے کسی شہر میں منعقد کیا جاتا تھا اور مولانا سوہدروی کو ہر جلسے میں بلایا جاتا تھا۔ وہ پنجاب میں پنجابی زبان میں تقریر کرتے تھے لیکن پنجابی نہایت صاف ستھری اور عام فہم ہوتی تھی۔

میں نے ان کی کئی تقریریں سنی ہیں۔ وہ دھواں دھار اور پر جوش تقریر کرنے کے عادی نہ تھے۔ مشکل اور پیچ دار بات بھی نہیں کرتے تھے۔ دھیمے انداز میں تسلسل کے ساتھ بولتے جاتے تھے، مگر انداز بڑا مدلل اور موثر ہوتا تھا۔ تاریخ سے انھیں خاص طور سے دلچسپی تھی اور بزرگان دین کے چھوٹے چھوٹے واقعات اس ڈھب سے بیان فرماتے کہ ہر واقعہ دل میں بیٹھتا جاتا۔ تقسیم ملک کے بعد عام طور سے یہ معمول رہا کہ ہندوستان سے جو پرانے اہل حدیث کسی سلسلے میں پاکستان آتے وہ یہاں کے علمائے کرام سے ملنے کی کوشش کرتے، مولانا سوہدروی سے ملاقات کرنا بھی ان کے پروگرام میں شامل ہوتا۔۔۔ ۱۹۵۶ء کی بات ہے کہ ایک صاحب میرے پاس دفتر "الاعتصام" تشریف لائے۔ پچاس کے قریب ان کی عمر ہو گی۔ پوچھنے پر بتایا کہ وہ مدراس سے آئے ہیں۔

میں نے ان سے کہا: مدراس میں ایک صاحب عزیز اللہ گھڑی ساز رہتے ہیں جو الاعتصام کے خریدار ہیں۔

انھوں نے بتایا: وہی عزیز اللہ گھڑی ساز ہیں۔

عرض کیا: آپ اتنی دور سے یہاں کیسے تشریف لائے؟

جواب دیا: آزادی کے بعد ان کے بعض عزیز کراچی آگئے تھے۔ وہ ان سے ملنے وہاں آئے تو پنجاب کے ان علمائے کرام سے ملنا بھی ضروری تھا جو آزادی سے پہلے سالانہ جلسوں میں ہندوستان کے مختلف مقامات میں تشریف لے جاتے اور تقریریں کرتے تھے۔ ان کی تقریریں ہم نہایت شوق اور غور سے سنتے تھے۔

پوچھا: وہ کون کون علمائے کرام ہیں؟

جواب دیا: مولانا داؤد غزنوی' مولانا محمد حنیف ندوی' مولانا محمد اسماعیل اور مولانا عبدالمجید سوہدروی------ پھر کہا: مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی بھی وہاں جاتے تھے' لیکن یہ دونوں بزرگ وفات پاچکے ہیں۔

عرض کیا: مولانا داؤد غزنوی اور مولانا حنیف ندوی تو آپ کو لاہور مل جائیں گے لیکن مولانا اسماعیل صاحب یہاں سے بیالیس میل آگے گوجرانوالے اور مولانا عبدالمجید سوہدروی اس سے بھی سولہ سترہ میل آگے سوہدرے تشریف رکھتے ہیں۔

بولے: لاہور کے حضرات سے مل کر گوجرانوالے اور سوہدرے جاؤں گا اور ان کی خدمت میں حاضری دوں گا۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مولانا عبدالمجید سوہدروی کی تمام ہندوستان میں شہرت تھی اور لوگ ان کی تقریروں سے بہت متاثر تھے۔

مولانا عبدالمجید سوہدروی بڑے متحرک اور تیز ذہن کے بزرگ تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں سوہدرہ سے ماہنامہ رسالہ "مسلمان" جاری کیا۔ یہ رسالہ ایک قصبے سے جاری کیا گیا تھا' لیکن تمام ہندوستان کے اہل علم میں مشہور ہوا۔ ۱۹۳۸ء تک یہ ماہانہ چھپتا رہا۔ پھر ہفت روزہ کر دیا گیا تھا۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بھی چند روز اس رسالے میں ان کے ساتھ کام کیا تھا۔

میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کرتا تو ۱۹۴۰ء کے پس و پیش ہفت روزہ "مسلمان" میں ملک نصر اللہ خاں عزیز کا اشتراک بھی کسی معاہدے کے مطابق مولانا سوہدروی سے ہوا تھا---- اس سے کچھ عرصہ پیشتر اچھرہ میں حضرت مولانا احمد علی لاہوری نے ایک مسجد تعمیر کرائی

تھی۔اس کی خطابت مولانا سوہدروی کے سپرد تھی۔"مسلمان" اخبار بھی سوہدرہ سے لاہور منتقل ہوگیا تھا۔

بعد ازاں اخبار کی پالیسی کے مسئلے پر مولانا عبدالمجید سوہدروی اور ملک نصراللہ خان عزیز میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔اس ضمن میں مولانا سید داؤد غزنوی سے ان دونوں کی گفتگو ہوئی تھی۔

اخبار "مسلمان" اس عہد کا بہت اچھا اخبار تھا اور مولانا سوہدروی کا انداز تحریر بڑا موثر تھا۔اس کا ایک چھوٹا سا مضمون مجھے یاد ہے۔مولانا طبیب بھی تھے۔انھوں نے ایک شمارے میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ چھینک انسان کو بھی آتی ہے اور حیوان کو بھی۔یہ کیوں آتی ہے۔اس کی انھوں نے طبی نقطہ نظر سے چند الفاظ میں وضاحت کی تھی۔چھینک کے بعد نبی ﷺ نے الحمدللہ کہنے کا' پھر سننے والے کے لیے یرحمك اللّٰہ کہنے کا اور اس کے جواب میں یھدیکم اللّٰہ و یصلح بالکم کہنے کا جو حکم دیا ہے' اس کا خوب صورت انداز میں فلسفہ بیان کیا تھا۔

جون ۱۹۴۹ء کو انھوں نے سوہدرہ سے "جریدہ اہل حدیث" جاری کیا' جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ ہفت روزہ "مسلمان" بھی کئی سال چھپتا رہا۔وہ چونکہ طبیب تھے' اس لیے طویل عرصے تک طبی نوعیت کا ایک ماہانہ رسالہ بھی نکالتے رہے۔

انھوں نے بعض مصنفوں کی کتابیں بھی شائع کیں اور خود بھی بہت سی کتابیں تصنیف کیں جو مسلمان کمپنی' سوہدرہ کی طرف سے چھپیں--- قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری کی "رحمۃ للعالمین" نبی ﷺ کی سیرت کے موضوع پر نہایت مشہور اور مستند کتاب ہے' اس کی تیسری جلد پہلی دفعہ مولانا سوہدروی نے شائع کی تھی۔پھر قاضی صاحب کی تاریخ المشاہیر اور مکتوبات سلمان وغیرہ کتابوں کی اشاعت کا اہتمام بھی انھی نے کیا۔خود ان کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ان کا اصلی مشغلہ لکھنا پڑھنا تھا اور وہ ہر وقت اس میں مصروف رہتے تھے۔جناب عبدالرشید عراقی صاحب نے سوہدرہ گزٹ کی ایک خاص اشاعت میں ان کی تصانیف کا تذکرہ کیا اور تعارف کرایا ہے۔

انھوں نے ان کی تصانیف دو حصوں میں تقسیم کی ہیں۔ایک حصے کا تعلق خالص اسلامی اور تاریخی موضوع سے ہے اور ایک کا طبی موضوع سے-----ان کے بیان کے

مطابق طبی نوعیت کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ایک سو تک پہنچتی ہے اور اسلامی یا تاریخی کتابیں بائیس ہیں۔ یہ کل تعداد ایک سو بائیس بنتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی تصنیفی خدمت ہے جو مولانا مرحوم نے سرانجام دی۔ ان کی صحافتی خدمات اس سے الگ ہیں۔

ان کی تاریخی اور اسلامی کتابیں جو مختلف عظیم شخصیتوں کے واقعات و حالات پر مشتمل ہیں یا جن میں بعض اہم قسم کے دینی و اسلامی احکام بیان کیے گئے ہیں' مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تفسیر سورۂ فاتحہ: سورۂ فاتحہ کی تفسیر بڑے عمدہ انداز میں کی ہے۔

۲۔ رہبر کامل: نبی ﷺ کی سیرت طیبہ۔

۳۔ دولت مند صحابہ: ان صحابہ کرام کا تذکرہ جن کو اللہ نے دنیوی مال و جاہ سے بھی نوازا تھا۔

۴۔ سیرت عائشہ: یہ کتاب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حالات پر مشتمل ہے۔

۵۔ سیرت فاطمہ: اس میں نبی ﷺ کی دختر بلند اختر حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔

۶۔ سیرت الائمہ: یہ کتاب امام ابو حنیفہ' امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل' امام محمد بن حسین شیبانی' امام ابو یوسف' امام سفیان ثوری' امام بویطی' امام ابن تیمیہ' امام جبائی' امام غزالی' امام رازی رحمہم اللہ کے حالات پر محتوی ہے۔

۷۔ حضرت امام ابو حنیفہ: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اس میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات حیات قلم بند کیے گئے ہیں۔

۸۔ استاد پنجاب: حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بے شمار حضرات علما نے اکتساب علم کیا اور ان کی بے پناہ خدمت تدریس کی بنا پر بجا طور پر انھیں "استاذ پنجاب" کہا گیا۔ یہ کتاب انہی کے سوانح حیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ کتاب لکھ کر مولانا سوہدروی نے علما و طلبا پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔

۹۔ سیرت ثنائی: حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے حالات میں یہ پہلی کتاب ہے اور اپنے موضوع میں مکمل و مستند۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب مولانا عبدالمجید سوہدروی کا بہت بڑا

کارنامہ ہے۔

۱۰۔ سیرت مولانا ابوالکلام آزاد: اکابر علمائے اہل حدیث کی طرح سیاسیات میں مولانا عبدالمجید سوہدروی کا نقطہ نظر وہی تھا جو مولانا ابوالکلام آزاد کا تھا۔ مولانا آزاد سے وہ بہت متاثر تھے۔ اس مختصر کتاب میں مولانا کی زندگی کے بہت سے واقعات محبت اور عقیدت سے ضبط کتابت میں لائے گئے ہیں۔

مولانا آزاد پر متعدد علمائے کرام نے مضامین تو بے شک لکھے ہیں، لیکن جماعت علما میں مولانا سوہدروی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے مولانا آزاد پر مفصل کتاب تصنیف کی۔

۱۱۔ انتخاب صحیحین: صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث کا نہایت عمدہ انتخاب۔

۱۲۔ حدیث کی کتاب: مولانا عبدالمجید سوہدروی نے چار کتابیں لکھی تھیں، یعنی حدیث کی پہلی کتاب، حدیث کی دوسری کتاب، حدیث کی تیسری کتاب اور حدیث کی چوتھی کتاب ---یہ کتابیں متعدد احادیث کے ترجمہ و تشریح پر محتوی ہیں۔

۱۳۔ شرح اربعین نووی: امام نووی نے ایک اربعین مرتب کی تھی، یعنی چالیس احادیث کا مجموعہ۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی نے ان احادیث کا ترجمہ بھی کیا ہے اور شرح بھی---!

۱۴۔ شرح اربعین ابراہیمی: مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے بھی چالیس احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جسے "اربعین ابراہیمی" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، مولانا عبدالمجید سوہدروی نے اس کی شرح سپرد قلم کی تھی۔

۱۵۔ تحریک وہابیت: اس میں وہابی تحریک کی تفصیل اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

۱۶۔ انگریز اور وہابی: ہندوستان کی انگریزی حکومت نے وہابیوں کے متعلق جو غلط باتیں اڑائی ہیں اس کتاب میں ان کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے اور ان غلط باتوں کو رفع کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

۱۷۔ ہندو شعرا کا نعتیہ کلام: رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہندو شعرا نے جو نعتیں کہی ہیں، اس کتاب میں وہ نعتیں درج کی گئی ہیں، ان شعرا میں سرکشن پرشاد شاد، دتو رام کوثری، ہری چند اختر اور پردیسی برہم چاری وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۔ مباحثہ گوشت خوری: کسی زمانے میں مولانا عبدالحق اور آریہ سماج کے پرچارک پنڈت رام چندر کے درمیان گوشت خوری کے مسئلے پر مناظرہ ہوا تھا، مولانا

عبدالمجید سوہدروی نے اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا تھا۔۔۔۔ متحدہ ہندوستان میں اس قسم کے مناظرات ومباحث کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

۲۰۔ سفر نامہ حجاز: اس میں مولانا سوہدروی نے اپنے سفر حج کے واقعات بیان فرمائے ہیں۔

۲۱۔ خطبات ثنائی: یہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے ان خطبات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف جلسوں اور کانفرنسوں میں ارشاد فرمائے۔

۲۲۔ حیات النبی ﷺ: یہ کتاب نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ اور مسئلہ حیات النبی سے متعلق ہے۔

۲۳۔ داستان مرزا: یہ کتاب مرزا غلام احمد قادیانی سے متعلق چند دلچسپ واقعات پر مشتمل ہے۔

طب کے موضوع سے متعلق انھوں نے جو کتابیں تصنیف فرمائیں، وہ ہیں دیہاتی حکیم، انمول حکیم، عورتوں کا حکیم، دانتوں کا حکیم، فوری حکیم، بچوں کا حکیم، جیبی حکیم، اسراری نسخے، مخلوط نسخے، گھریلو نسخے، شاہی نسخے، آسان نسخے وغیرہ۔

کسی زمانے میں مولانا سوہدروی پنجاب کی انجمن اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ بھی رہے، جب کہ اس کے صدر مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری تھے۔

مولانا ممدوح نے ۶۔نومبر ۱۹۵۹ء (۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ) کو لاہور میں وفات پائی اور ان کی میت ان کے وطن سوہدرے لے جائی گئی، اور وہ وہیں مدفون ہیں۔ یہ آج سے چالیس سال پیشتر کی بات ہے۔ میں اس وقت ہفت روزہ "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا اور میں نے ان کی وفات پر حسب ذیل اداریہ لکھا تھا جو ۱۳ نومبر ۱۹۵۹ء (۱۲۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۹ھ) کے "الاعتصام" میں چھپا تھا۔ اداریہ ملاحظہ فرمایئے!

"آج ہم آپ کو یہ نہایت غم ناک اور محزون کن خبر سنانے حاضر ہوئے ہیں کہ ۶ نومبر ۱۹۵۹ء کو شب کے ساڑھے نو بجے مولانا عبدالمجید سوہدروی محلہ سنت نگر لاہور میں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

"ہمیں اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع اس وقت ملی جب ان کی زندہ روح اپنے اللہ کے پاس اور ان کی مردہ لاش ان کے وطن سوہدرہ کو منتقل ہو چکی تھی۔

''مولانا تین روز قبل اپنے کسی کام کے سلسلے میں لاہور تشریف لائے تھے- وہ اگرچہ ایک عرصے سے ذیابیطس کے مریض تھے اور مرض کے مسلسل و شدید حملوں نے ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا' لیکن ان دنوں بظاہر ان کی صحت اچھی تھی اور یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ موت ان کے تعاقب میں لگی ہوئی ہے اور فرشتہ اجل ساعت مقررہ کا منتظر ہے-

''مرحوم ۵ نومبر کو لاہور آئے اور حسب معمول اپنے دوستوں سے ملے اور کام کاج میں مصروف رہے- ۶ نومبر کا دن بھی انھوں نے اسی طرح گزارا اور سرِشام سنت نگر میں اپنے عزیزوں کے ہاں چلے گئے- نو بجے شب تک باتیں کرتے رہے اور یہ خیال بھی نہیں تھا کہ لاہور میں ان کی یہ آخری آمد ہے اور ان کی باتیں زندگی کی آخری باتیں ہیں- سوا نو بجے ان کی طبیعت یکایک بگڑی اور آناً فاناً خطرناک موڑ میں داخل ہو گئی' اور یہ وہی موڑ تھا جو زندگی کے آخری لمحوں میں موت کی وادی کی طرف مڑتا ہے- ڈاکٹر کو بلایا گیا- ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا تو ان کی روح قفسِ خاکی سے آزاد ہو کر جنت کو پرواز کر چکی تھی------- دوسرے دن صبح نو بجے لاہور میں ان کا جنازہ پڑھا گیا مگر جنازے میں زیادہ آدمی شریک نہ ہو سکے کیونکہ شہر میں خاص اہتمام سے لوگوں کو اطلاع نہیں دی گئی تھی- جنازے کے بعد ان کی میت کو ان کے آبائی وطن' سوہدرہ لے جایا گیا اور وہیں سپردِ خاک کیے گئے-

''مولانا عبدالمجید سوہدروی' مولانا غلام نبی کے پوتے' مولانا عبدالحمید کے بیٹے اور مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے نواسے تھے- رحمہم اللہ تعالیٰ و غفرلھم- یہ تینوں حضرات بغایت نیک' مخلص اور اہل اللہ تھے- مولانا غلام نبی' عارف باللہ حضرت عبداللہ غزنوی'' کے خاص ملنے والوں اور عقیدت مندوں میں سے تھے اور بڑے متقی اور متورع عالم دین تھے- اسی طرح مولانا عبدالحمید حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی'' سے گہرے مراسم رکھتے تھے اور نہایت نیک سیرت اور بلند مرتبہ بزرگ تھے- رہے مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی تو ان کی ذات ستودہ صفات سے برصغیر پاک و ہند کا ہر ذی علم واقف ہے- وہ ایک مہرِ درخشاں تھے جس کی روشنی سے ایک عالم منور ہوا- وہ اگرچہ استاذ پنجاب کے لقب سے مشہور تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے حلقہ درس کا فیضان بہت وسیع تھا اور اس کی حدیں سرزمین پنجاب سے بہت آگے نکل گئی تھیں- ان کے علم و فضل کے چشمہ فیض سے ایک دنیا سیراب ہوئی اور بے شمار تشنگانِ علم نے علم کے اس بحرِ ذخار سے اپنی علمی پیاس

بھائی۔ جو شخص ان کے حلقہ درس میں شامل ہوا اس نے علم و اخلاق کے تمام ضروری اجزا سے اپنا دامن طلب بھر لیا۔

"مولانا عبدالمجید سوہدروی اسی اونچے گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور صحیح معنوں میں نجیب الطرفین تھے۔ ان کے ننھیال و ددھیال دونوں سلسلے پاک دامنی و پاک بازی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھے۔

"مولانا مرحوم کو زمانہ طالب علمی ہی سے لکھنے کا ذوق اور تقریر کا شوق تھا' جو ان کی زندگی کے آخری دم تک قائم رہا۔ بہت عرصہ ہوا' انہوں نے "مسلمان" نام کا ایک اخبار جاری کیا تھا' جو کئی سال متواتر شائع ہوتا رہا۔ قیام پاکستان کے بعد "جریدہ اہل حدیث" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا جو اپنے حلقے میں بہت مقبول ہے اور تبلیغی و اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے۔

مرحوم کی تحریری خدمات کے علاوہ ان کی تقریری خدمات بڑی موثر اور ہمہ گیر تھیں۔ متحدہ ہندوستان کے ہر گوشے میں ان کی تقریریں ہوئیں اور ہر جلسے میں ان کو خصوصیت سے دعوت شرکت دی گئی۔ پنجاب کا تو ہر شہر' ہر قصبہ' اور ہر قریہ ان کی تقریروں سے مستفید ہوا۔ تقریر میں بھی ان کا خاص اسلوب تھا جو موثر اور دل نشین تھا اور لوگ ان کی تقریر بڑے شوق سے سنتے تھے۔ ان کی زبان میں اثر' آواز میں خلوص اور دل میں درد تھا' جس نے ان کے دائرہ شہرت کو بہت وسیع کر دیا تھا۔

بدعتی اور قادیانی وغیرہ فرقوں کے بارے میں ان کو خاص معلومات حاصل تھیں اور یہ معلومات ان کو تبلیغ کتاب و سنت کے ہر میدان میں کشاں کشاں لے جاتی تھیں۔

"مرحوم' مرکزی جمعت اہل حدیث مغربی پاکستان کی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور جماعت کی تعمیر و ترقی کے ہر پہلو میں ان کی خدمات نمایاں تھیں۔

"ان کی وفات سے کسی ایک خاندان یا ایک ہی گھر کو تکلیف نہیں ہوئی بلکہ پوری جماعت اور پورا حلقہ اس سانحہ سے متاثر و متالم ہے اور ہر شخص اس کو اپنا ذاتی نقصان اور ضیاع سمجھتا ہے۔

"مرحوم اگرچہ سوہدرہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے لیکن ان کی تحریری و تقریری خدمات سے پورا پاکستان مستفید ہو رہا تھا اور ہر شخص تبلیغ و اشاعت کے میدان میں

نہایت آسانی سے ان کی خدمات حاصل کر لیتا تھا۔

''دعا ہے اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کی موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے' اس کے پر کرنے کی کوئی بہتر صورت پیدا کرے۔ آمین۔

''موت سے کسی کو مفر نہیں اور اس کے دام سے کوئی بچ کر نہیں نکل سکتا۔ شب و روز کا یہ سلسلہ موت و حیات کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ سپیدہ سحر جب نمودار ہوتا ہے بے شمار انسانوں کے لیئے موت کا پیغام لے کر آتا ہے اور جب پردہ شب میں غائب ہونے لگتا ہے تو لاتعداد لوگوں کی دل دوز آہیں اور جگر فگار چیخیں اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

''لیکن ایک عالم کی موت انسانیت کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ خصوصاً اس دور میں جب کہ علم تیزی سے اٹھ رہا ہے' جہالت و بے دینی کی تاریکیاں چاروں طرف پھیل رہی ہیں۔ افسوس ہے' مولانا عبدالمجید کا انتقال اسی دور میں ہوا۔''

مرحوم بہت سی کتابوں کے مصنف اور اخبار ''جریدہ اہل حدیث'' کے ایڈیٹر تھے۔ ان کی کتابوں کی خرید و فروخت اور اشاعت کا کام تو امید ہے ان شاء اللہ ہوتا ہی رہے گا' ضرورت ہے کہ ان کا اخبار بھی جاری رہے۔ تبلیغ اور اصلاح کا جو پودا انھوں نے کئی برس پیشتر لگایا تھا' اب وہ پھل دینے لگا تھا اور اس کے اثرات کا حلقہ روز بروز وسیع ہو رہا تھا کہ اس کا مالی اس دنیا کو چھوڑ گیا۔

ہمیں ذاتی طور پر علم نہیں کہ مرحوم کی اولاد کس قابلیت کی حامل ہے۔ مگر ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ جو پودا وہ لگا گئے ہیں' وہ سدا بہار رہے اور اس پر کبھی خزاں نہ آئے۔

مولانا مرحوم نے اپنے مسلک کی بہت خدمت کی اور پوری زندگی اس کار خیر میں وقف کیے رکھی۔ ان کے معتقدین اور جماعت کے تمام افراد کا فرض ہے کہ وفات کے بعد ان کی اولاد سے رابطہ رکھیں اور ان کی جو امداد بھی ہو سکے کریں۔

''علما کی وفات کے بعد ان کی اولاد اور ان کے متعلقین سے روابط نہ رکھنا انتہائی بے وفائی کی علامت ہے۔''

اداریہ یہاں ختم ہوا جو ۱۳۔ نومبر ۱۹۵۹ء کے ''الاعتصام'' میں شائع ہوا تھا۔

مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم دفتر اس وقت ہمارے دوست مولانا عبدالعظیم انصاری تھے۔ انھوں نے مولانا عبدالمجید سوہدروی کے انتقال پر درج تحت تاثرات کا اظہار

کیا تھا-انصاری صاحب کی تحریر سے پتا چلتا ہے کہ انھیں حلقہ اہل حدیث کے علاوہ دوسرے مسالک فقہی کے حلقوں میں بھی نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا-انصاری صاحب کی یہ تحریر ۱۳ نومبر ۱۹۵۹ء کے الاعتصام میں شائع ہوئی تھی-

"یہ وحشت ناک اور جان کاہ خبر اب لوگ سن چکے ہیں کہ مولانا عبدالمجید سوہدروی ۶-نومبر ۱۹۵۹ کو جمعے اور ہفتے کی درمیانی رات بوقت ۹ بجے انتقال فرما گئے- انا اللہ وانا الیہ راجعون-

"مولانا اسلام و مسلک اہل حدیث کے مخلص مبلغ' معروف عالم دین' پرانے صحافی اور مصنف تھے-مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کے رکن' جامعہ سلفیہ کمیٹی کے ممبر اور جمعیت اہل حدیث گوجرانوالہ کے صدر تھے-

"ان کے انتقال کی خبر مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دفتر ۷ نومبر کو ڈیڑھ بجے کے قریب پہنچی---حضرت مولانا سید محمد داؤد صاحب غزنوی ۵ نومبر سے میاں چنوں جلسے پر تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے ان کو ملتان تشریف لے جانا تھا- جب دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے اساتذہ نے یہ خبر سنی اس وقت مدرسہ بند کر دیا گیا- طلبا اور اساتذہ جنازے میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ اطلاع ملی کہ مولانا کی نعش ان کے آبائی وطن سوہدرہ روانہ ہو چکی ہے-سب حضرات کو جنازے میں شامل نہ ہونے کا سخت ملال ہوا-

"چونکہ صدر محترم مرکزی جمعیت یہاں تشریف فرما نہ تھے اس لیے مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف اور راقم الحروف ۸-نومبر کی صبح کو بغرض تعزیت سوہدرہ کے لئے روانہ ہوئے- سوہدرہ پہنچنے کے لیے وزیر آباد سے تانگے پر سوار ہوئے- تانگے میں سوہدرے کے اور آدمی بھی سوار تھے-انھوں نے آپس میں گفتگو شروع کر دی کہ ہمارے سوہدرے کا تو اب نام ہی لٹ گیا اور سوہدرہ ختم ہو گیا- ہمارے دریافت کرنے پر تانگے والے نے کہا کہ ہمارے گاؤں کے مولانا عبدالمجید صاحب فوت ہو گئے ہیں جو بہت بڑے عالم تھے اور ان کی وجہ سے ہمارا گاؤں تمام پاکستان میں مشہور تھا اور سوہدرے والوں کو ان کی ذات پر بڑا فخر تھا-ان کی موت پر سوہدرے کا بچہ بچہ نوحہ خواں ہے-

"یہ تھے مولانا عبدالمجید سوہدروی جو کلمہ حق کہنے میں انتہائی جری تھے اور جن کی وفات پر ہر حلقے میں اظہار حزن و ملال کیا گیا تھا-

"اس نے یہ بھی بتایا کہ سوہدرے میں ایک پیر جناب بشیر احمد شاہ صاحب ہیں جو مسلکاً مولانا کے مخالف تھے' لیکن جب انھوں نے مولانا کے انتقال کی خبر سنی' تو زار زار رونے لگے ----- جب کسی نے ان سے دریافت کیا کہ پیر جی' کہاں آپ اور کہاں مولانا عبدالمجید----! آپ میں اور ان میں سخت اختلاف تھا' تو پیر صاحب کہنے لگے کہ:

"بے شک ہم میں اختلافات تھے لیکن جو کچھ مولانا عبدالمجید تھے' میں وہ کبھی نہیں ہو سکتا- ان کی وجہ سے سوہدرے کا نام زندہ تھا-"

"اسی وقت پیر صاحب مولانا کے گھر گئے اور گھر والوں کو تسلی و تشفی دیتے رہے- شام کو سات بجے کے بعد جب جنازہ قبرستان لے جایا گیا تو دفن کرنے تک ساتھ رہے----

"میں نے اس سے مولانا کی ہر دلعزیزی کا اندازہ لگایا- جب ہم سوہدرے پہنچے تو گھر میں مولانا مرحوم کے بڑے صاحب زادے مولوی حافظ محمد یوسف صاحب موجود تھے- کچھ دیر ان سے اظہار تعزیت کے بعد ہم دونوں قبرستان چلے گئے جو گاؤں سے تقریباً پون میل ہے- وہاں جا کر دعاے مغفرت کی دل- میں خیال آیا کہ:

"یہ اس شخص کی قبر ہے جو پاکستان و ہندوستان کا مقبول و معروف آدمی تھا اور آج پوری جماعت جس کی نوحہ خواں ہے- راستے میں جو بھی ملا' اس نے وہی بات کہی جو ہم تانگے والا سے سن چکے تھے کہ:

"مولانا عبدالمجید کی موت کے ساتھ سوہدرہ مر گیا اور اس کا نام لٹ گیا-

شام کو غم و اندوہ کا بوجھ اٹھائے ہم لاہور واپس ہوئے-"

"حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی مدظلہ العالی ۹ نومبر کو ۱۲ بجے ملتان سے واپس تشریف لائے- انھیں گھر پہنچ کر یہ اطلاع ملی- یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی ان پر سکتہ ساطاری ہو گیا اور طبیعت پر اس کا بہت اثر ہوا اور دیر تک اظہار افسوس کرتے رہے کہ سفر میں ہونے کی وجہ سے تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ میں شامل نہ ہو سکے- انھوں نے فرمایا کہ:

علمی حلقے اور خاص کر جماعت اہل حدیث کے علما کی صف میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پر ہونا مشکل نظر آتا ہے-

"مولانا غزنوی ۱۰- نومبر کو سوہدرہ تشریف لے گئے تا کہ مولانا مرحوم کے خاندان کے ساتھ اظہار ہمدردی اور تعزیت کر سکیں--- گوجرانوالہ سے مولانا

محمد اسماعیل صاحب ناظم اعلیٰ مولانا غزنوی کے ساتھ شامل ہوئے۔

"قارئین "الاعتصام" سے التماس ہے کہ مولانا مرحوم کے لئے دعاے مغفرت کریں اور نماز جنازہ غائبانہ ادا کریں----

اللّٰھم اغفرله وارحمه و عافه واعف عنه و اکرم نزله و وسع مدخله و ارحمه یا ارحم الراحمین۔ اٰمین"

"الاعتصام" کا اداریہ اور مولانا عبدالعظیم انصاری کا بیان آج سے چالیس برس قبل کی تحریریں ہیں جو یہاں درج کی گئی ہیں۔

# رئیس احمد جعفری ندوی

۱۹۴۹ء کے نومبر کا مہینا تھا کہ ایک دن سہ پہر کے چار بجے کے لگ بھگ میں اور مولانا محمد حنیف ندوی گوجرانوالہ میں ان کے مکان پر چائے پی رہے تھے۔ وہاں میں نے ایک کتاب دیکھی، جس کا نام تھا "دید و شنید" مصنف کا نام لکھا تھا، رئیس احمد جعفری۔ کتاب میں ہند اور بیرون ہند کی ان بہت سی مشہور و ممتاز شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا گیا تھا، جن کی مجلسوں میں مصنف کو بیٹھنے، انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کے مواقع میسر آئے تھے۔ ان حضرات کی وسیع فہرست میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ترکی کی خالدہ ادیب خانم کے نام بھی شامل تھے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے بعض حضرات کا تذکرہ پڑھ ڈالا۔ یہ تذکار و تاثرات اگرچہ مختصر تھے، تاہم بڑے جامع، نہایت دل کش و دلچسپ اور پر از معلومات تھے۔ اسلوب تحریر بڑا عمدہ، بڑا پیارا اور اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتا تھا۔ مصنف نے یہ کتاب مولانا محمد حنیف ندوی کو پیش کی تھی، اس پر ان کے دستخط بھی تھے اور تاریخ بھی مرقوم تھی۔ میں پہلی دفعہ اس کتاب کے ذریعے رئیس احمد جعفری کے نام سے متعارف ہوا اور پہلی اور آخری دفعہ یہ کتاب دیکھی اور اس کے بعض حصے پڑھے۔ اس واقعے پر تقریباً پچاس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے بعد آج تک اس کتاب کو دیکھنے اور پڑھنے کا موقع نہیں ملا، لیکن تاثر پذیری کا جو نقش اس نے لوح ذہن پر مرتسم کیا وہ اتنا گہرا تھا کہ اب تک جوں کا توں قائم ہے۔ لیل و نہار کی کوئی کروٹ اور شب و روز کی کوئی گردش اس میں کمی نہیں کر پائی۔

میں نے مولانا حنیف ندوی سے پوچھا: یہ رئیس احمد جعفری کون صاحب ہیں؟

فرمایا: ہمارے دوست ہیں، ندوۃ العلماء میں ہمارے ساتھ پڑھتے رہے ہیں، لیکن ہم سے جونیئر تھے۔ اردو کے بہت اچھے ادیب، مصنف، مترجم، صحافی، ناول نویس اور افسانہ نگار۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہفت روزہ "الاعتصام" گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا، مولانا محمد حنیف ندوی اس کے ایڈیٹر تھے اور میں معاون ایڈیٹر ------ اس سے کچھ عرصہ

بعد مولانا ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوگئے اور گوجرانوالہ سے لاہور تشریف لے آئے۔ اخبار الاعتصام بھی گوجرانوالہ سے لاہور منتقل ہوگیا اور اس کی ادارتی ذمے داریاں میرے سپرد کردی گئیں۔

اس زمانے میں سید رئیس احمد جعفری کراچی میں مقیم تھے اور ایک ماہانہ رسالہ "ریاض" نکالتے تھے۔ یہ رسالہ انھوں نے سید ریاض احمد خیر آبادی کے نام سے جاری کیا تھا جو اردو کے معروف شاعر تھے اور رئیس احمد جعفری کے نانا سید نیاز احمد کے بڑے بھائی تھے۔ رئیس صاحب نے "رند پارسا" کے نام سے ان کے حالات قلم بند کیے ہیں۔

ریاض ہمارے ہاں "الاعتصام" کے مبادلے میں آتا تھا۔ مشمولات و مضامین کے اعتبار سے بہت اچھا رسالہ تھا۔ ۱۹۵۲ء میں مولانا حنیف ندوی کی ایک کتاب "مرزائیت نئے زاویوں سے" شائع ہوئی تھی۔ وہ کتاب رئیس صاحب کو تبصرے کے لیے بھجوائی گئی تھی، انھوں نے "ریاض" میں اس پر بہت اچھا تبصرہ کیا تھا۔

اب رئیس صاحب سے خط و کتابت کے ذریعے میرے ذاتی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ "ریاض" میں انھوں نے الاعتصام پر تبصرہ کیا اور ازراہ کرم اس کے مندرجات کو لائق اعتنا قرار دیا ---- میں نے بھی الاعتصام میں ریاض پر تبصرہ کیا۔ ریاض میں انھوں نے الاعتصام کے بعض مضامین بھی شائع کیے۔ میں نے بھی الاعتصام کے بعض شماروں میں ریاض کے چند مقالات چھاپے۔

اس زمانے میں دہلی سے ایک سہ روزہ اخبار "دعوت" نکلتا تھا جو یہ جماعت اسلامی کا ترجمان تھا۔ اس کی یکم فروری ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ دارالعلوم دیوبند سے بائیس طالب علموں کو اس بنا پر خارج کردیا گیا ہے کہ وہ اہل حدیث مسلک کے حامل ہیں۔ میں اس وقت اخبار الاعتصام کا ایڈیٹر تھا جو جماعت اہل حدیث کا ترجمان تھا۔ میرا جماعتی اور صحافتی فرض تھا کہ اس موقعے پر اپنی جماعت کے جذبات کی ترجمانی کرتا اور اس خبر سے اہل حدیث حضرات کے قلوب و اذہان میں جن تاثرات و عواطف نے کروٹ لی تھی، اس کی وضاحت کرتا۔ چنانچہ میں نے ۱۹۔ فروری ۱۹۵۴ء کے الاعتصام میں "دارالعلوم دیوبند سے اہل حدیث طلبا کا اخراج" کے عنوان سے لکھا کہ "دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام سے نہ تو ہم کوئی احتجاج کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہمارا یہ مطالبہ ہے کہ ان بائیس خارج شدہ اہل حدیث

طلبا کو دوبارہ داخل کیا جائے' بلکہ ہمیں اس پر تعجب ہے کہ دارالعلوم میں اہل حدیث اساتذہ کا تقرر کیوں عمل میں نہیں لایا گیا- جب دنیوی کالجوں اور سکولوں میں ہندو اور مسلمان اساتذہ اکٹھے تعلیم دیتے ہیں تو خالص دینی درس گاہوں میں اہل حدیث اور حنفی کا امتیاز کیوں کیا جائے؟ اور یہ بھی ہندوستان میں؟ جہاں مسلمانوں کے باہمی اتحاد کی اشد ضرورت ہے اور اس اتحاد پر دیوبندی علمائے کرام بڑا زور دیا کرتے ہیں-

"تعجب ہے یہ حضرات سٹیج پر آتے ہیں تو اتحاد کے نعرے لگاتے ہیں اور مساجد و مدارس میں جاتے ہیں تو معمولی فقہی اور مسلکی اختلاف بھی برداشت نہیں کر سکتے-"

میں نے یہ بھی لکھا کہ "کہا جاتا ہے دارالعلوم دیوبند کی تاسیس اس وقت عمل میں آئی تھی جب سر سید احمد خاں کی مساعی سے علی گڑھ میں بالکل دنیوی بنیادوں پر تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تھا- مسلمانوں کے ایک سرکردہ گروہ نے علی گڑھ کی اس تعلیم کو ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی حمیت کے خلاف ایک چیلنج تصور کیا تھا اور اپنی بے سروسامانی کے باوجود سر سید کے اس چیلنج کا مناسب جواب دینے کی ٹھان لی تھی' یعنی دارالعلوم دیوبند کی تاسیس مسلمانوں کی دینی حمیت کو زندہ رکھنے کے لیے ہوئی تھی اور علی گڑھ میں تعلیم کا سلسلہ مسلمانوں کی دنیوی حیثیت کو بلند کرنے کے لیے شروع کیا گیا تھا' مگر آپ حیران ہوں گے کہ علی گڑھ کی خالص دنیوی درس گاہ سے جو پہلا طالب علم کامیاب ہو کر نکلا وہ ہندو تھا اور دارالعلوم دیوبند میں اہل حدیث تک کا داخلہ بحیثیت اہل حدیث کے ممنوع ہے- کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ دارالعلوم دیوبند صرف ہندوستان کے احناف کے دینی تحفظ کے لیے قائم کیا گیا تھا؟

"دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں اہل حدیث' حنفی اور شیعہ طالب علم بغیر کسی فقہی امتیاز کے تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں- شیعہ فقہ باقاعدہ وہاں داخل نصاب ہے- اہل حدیث اساتذہ کی تدریسی خدمات بھی اسے حاصل رہی ہیں- جامعہ ملیہ (دہلی) میں اہل حدیث اساتذہ اور تلامذہ کی ایک معقول تعداد ہمیشہ رہی ہے' مگر دارالعلوم دیوبند جس کا اساسی مقصد ہی مسلمانوں کا دینی اور مذہبی تحفظ ہے' اہل حدیث اساتذہ تو کیا' تلامذہ تک کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں-

"اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں احناف کے دینی مدارس اچھی خاصی تعداد میں

قائم ہیں اور بحمد اللہ بہترین خدمات سرانجام دے رہے ہیں' لیکن ان میں سے کسی مدرسے میں نہ کوئی اہل حدیث استاد ہو گا اور نہ طالب علم---! اس کے برعکس متعدد اہل حدیث مدارس میں حنفی مدرس اور استاد پڑھاتے رہے اور پڑھا رہے ہیں- حنفی طلبا بھی مدارس اہل حدیث میں کسب علم کر رہے ہیں- مدرسہ رحمانیہ (دہلی) میں عام طور سے حنفی العقیدہ مدرسین کی خدمات لازماً حاصل کی جاتی ہیں- یہی حال دارالعلوم تقویۃ الاسلام کا رہا- پاکستان کے بہت بڑے حنفی عالم مولانا مفتی محمد حسن صاحب (مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور) نے امرتسر میں اسی دارالعلوم سے فیض علم پایا- وہ مشہور اہل حدیث عالم حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی کے تلمیذ خاص ہیں- یہی دارالعلوم تقسیم ملک کے بعد امرتسر سے لاہور منتقل ہوا تو اس میں سب سے پہلے جس مدرس کا تقرر عمل میں آیا' وہ مدرسہ فتح پوری (دہلی) کے سابق صدر مدرس اور ممتاز حنفی عالم مولانا شریف اللہ خان تھے- اب بھی وہ دارالعلوم تقویۃ الاسلام کی مسند تدریس پر فائز ہیں-

"دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے مہتمم مرکزی جمعیت اہل حدیث کے صدر مولانا سید داؤد غزنوی ہیں' اسی بلڈنگ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث اور اخبار الاعتصام کے دفاتر ہیں- قارئین کو یہ معلوم کر کے یقیناً تعجب ہو گا کہ اس دارالعلوم کے اساتذہ میں چار استاد حنفی مسلک کے حامل ہیں اور ابتدا ہی سے حنفی طلبا اچھی خاصی تعداد میں زیر تعلیم ہیں' یہاں تک کہ دارالعلوم کی جمعیت طلبائے اہل حدیث کے صدر ایک حنفی طالب علم ہیں- وہ نماز میں نہ رفع الیدین کرتے ہیں اور نہ آمین پکارتے ہیں- اپنے مسلک حنفیت پر پوری طرح عامل ہیں' مگر کبھی امتیاز من و تو کا سوال پیدا نہیں ہوا- اس لیے کہ اہل حدیث کے قلب و ذہن کے کسی گوشے میں اللہ کے فضل سے تعصب یا تنفر کا کوئی شائبہ نہیں ہے-"

اس سے آگے بھی میں نے اسی قسم کی بعض باتیں تحریر کی تھیں- میرا یہ اداریہ رئیس احمد جعفری صاحب نے اپنے ماہنامے "ریاض" میں شائع کیا' جو انھوں نے بمبئی سے کراچی منتقل ہونے کے کچھ عرصہ بعد جاری کیا تھا- اداریے پر انھوں نے جو نوٹ لکھا' اس میں "الاعتصام" کے مندرجات کو لائق تعریف ٹھہرایا- ظاہر ہے میں اس سے خوش ہوا اور اسے اپنے نقطہ نظر کی زبردست تائید قرار دیا- رئیس صاحب کا اپنا انداز بیان تھا اور زوردار تھا' جو میرے لیے مسرت انگیز تھا- کسی لکھنے والے کے کسی حصہ تحریر کی تعریف کی جائے تو

اپنے لیے وہ اسے بہت بڑا سرمایہ سمجھتا ہے اور واقعی وہ سرمایہ ہی ہوتا ہے۔ پھر تعریف اگر کوئی ایسا بڑا آدمی کرے جس سے نہ کوئی تعلق ہو' نہ میل جول' تو وہ اور بھی باعث فرحت و انبساط قرار پاتی ہے۔

اس سے چند روز بعد دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے ایک بیان جاری فرمایا جس میں دارالعلوم سے اہل حدیث طلبا کے اخراج کی وضاحت کی گئی تھی۔ میں نے ۲۶۔ مارچ ۱۹۵۴ء کے الاعتصام میں یہ بیان بھی شائع کیا اور اس پر اداریہ بھی لکھا۔ انداز و اسلوب کے اعتبار سے حضرت قاری صاحب مرحوم کا بیان ان کے مقام و مرتبے سے ہم آہنگ نہ تھا۔ میں نے قاری صاحب کی شان و منزلت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ادب و تکریم سے ان کے بیان کا تجزیہ کیا۔

رئیس صاحب نے اسے بھی "ریاض" کے صفحات میں جگہ دی اور خود بھی اس موضوع سے متعلق اداریہ لکھا' جس کا دہرا عنوان تھا۔

"دیوبند کس طرف ----- ؟"

"ایں راہ کہ تو می روی بہ ترکستانست"

میں نے یہ اداریہ ۳۰۔ اپریل ۱۹۵۴ء کے "الاعتصام" میں ایک طویل نوٹ کے ساتھ چھاپا۔ نہایت مالہور زوردار اداریہ تھا۔ اس کا ایک ایک لفظ لائق مطالعہ ہے۔ یہاں اس کی آخری چند سطریں نقل کی جاتی ہیں۔ رئیس صاحب لکھتے ہیں:

"ہمیں یاد ہے' کچھ عرصہ ہوا' مولانا ابوالکلام آزاد دیوبند تشریف لے گئے تھے' ان کا وہاں شاہانہ استقبال طلبا اور اساتذہ نے یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کیا تھا کہ وہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں' اور مولانا اس استقبال کی بڑی خوش گوار یاد لے کر وہاں سے تشریف لائے تھے۔

"یہ کیسی عجیب بات ہے' اہل حدیث اگر وزیر تعلیم ہو تو دیدہ و دل فرش راہ کیے جاتے ہیں' اور اگر طالب علم ہو تو بہ یک بینی و دو گوش نکال دیا جاتا ہے۔

"یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں؟"

رئیس احمد جعفری صاحب سے اب اچھا خاصا غائبانہ تعارف ہو گیا تھا اور آپس میں ہماری خط و کتاب بھی شروع ہو گئی تھی۔ میں نے بعض معاملات میں ان کو تین چار خط لکھے

اور انھوں نے جواب سے نوازا۔

۱۹۵۴ء کے نومبر کی کوئی تاریخ تھی کہ میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر مولانا محمد حنیف ندوی سے "الاعتصام" کے لیے کوئی مضمون لینے کی غرض سے حاضر ہوا۔ مولانا اپنے کمرے سے باہر بیٹھے کام کر رہے تھے۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ اتنے میں ہمارے قریب ایک تانگہ آکر رکا' اس کی پچھلی سیٹ سے ایک صاحب اترے اور کہا السلام علیکم ---- مولانا جلدی سے اپنی سیٹ سے اٹھے اور "ارے ---- آپ" کہہ کر ان کی طرف بڑھے اور بغل گیر ہو گئے۔ وہ لمبے قد کے آدمی تھے' جھک کر مولانا سے ملے' پھر بھی مولانا کا سر ان کی بغل تک پہنچ سکا۔ مولانا ان سے مل چکے تو مجھ سے کہا: "آپ ہیں رئیس احمد جعفری" ---- اور پھر ان سے کہا: "یہ ہیں اسحاق صاحب ----"

لمبا قد' متناسب جسم' نہ فربہی کا غلبہ نہ دبلے پتلے' خوب صورت و باوقار' بھرا ہوا چہرہ' داڑھی مونچھ صاف' بڑی بڑی آنکھوں پر نظر کی عینک چڑھی ہوئی ٹخنے کا تنگ سی موری کا پاجامہ اور لکھنوی انداز کی شان دار شیروانی پہنے ہوئے' سر پر خاکستری رنگ کی قراقلی ٹوپی ---- یہ تھے مشہور مصنف' معروف مترجم اور نامور صحافی سید رئیس احمد جعفری۔

مولانا حنیف ندوی کے تعارف کرانے پر وہ تیزی سے میری طرف بڑھے اور مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ بولے: "اچھا آپ ہیں ----" خیر و عافیت پوچھی اور فرمایا: "آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔"

میں سمجھا یہ رسمی سے الفاظ ہیں جو ہر مہذب آدمی اس شخص کے لیے استعمال کرتا ہے' جس سے غائبانہ تعارف تو ہو لیکن ملاقات کا موقع پہلی دفعہ ملا ہو ---- مگر بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ وہ فی الواقع میرے مہربان تھے اور مجھ سے ملنے کا انھیں ہمیشہ "اشتیاق" رہتا تھا۔

اس زمانے میں عام طور پر میں اور مولانا حنیف ندوی شام کو کیفے ڈی لائٹ میں بیٹھتے تھے' جو کمرشل بلڈنگ میں تھا اور اس کے مالک ہمارے ایک دوست تھے جو آزادی کے بعد دہلی سے لاہور آئے تھے۔ کبھی کبھی ہم انارکلی میں دہلی مسلم ہوٹل میں چلے جاتے تھے۔ رئیس صاحب کو ہم نے اپنے تمام ٹھکانے بتا دیے تھے۔ وہ بھی شام کو کیفے ڈی لائٹ میں آجاتے یا ہمیں تلاش کرتے ہوئے دہلی مسلم ہوٹل میں چلے جاتے۔ بعض اور دوست بھی

وہاں آجاتے تھے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ خوب محفل جمتی تھی۔

رئیس صاحب ان دنوں ریلوے اسٹیشن کے سامنے برگنزا ہوٹل میں مقیم تھے اور یہ اس دور کا اچھا ہوٹل تھا' مگر خاصا مہنگا تھا۔ ایک دن انھوں نے مجھے اور مولانا حنیف ندوی سے کہا آپ دونوں سے ایک ضروری بات کرنی ہے' کل اتنے بجے برگنزا آیے ---- مجھے یاد ہے وہ کمرہ نمبر ۱۰ میں مقیم تھے۔ ہم وقت مقررہ پر گئے اور کافی دیر ان کے ہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

اسی دن شام کو دہلی مسلم ہوٹل میں ہماری ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا: "آپ ہوٹل کے کمرے کا کرایہ روزانہ کیا دیتے ہیں"؟

کہا: "دس روپے۔"

سچی بات ہے' مجھے اس وقت تک معلوم نہ تھا کہ ہوٹل کے روزانہ کے کرائے میں ناشتہ اور کھانا بھی شامل ہوتا ہے یا نہیں' اس لیے میں نے پوچھا: ناشتہ اور کھانا اس میں شامل ہے ---؟

جواب دیا: صرف کمرے کا کرایہ دس روپے ہے' ناشتے اور کھانے کے پیسے الگ ہیں۔

اس زمانے کے حساب سے دس روپے مجھے بہت زیادہ معلوم ہوئے۔ دہلی مسلم ہوٹل کے اتنے ہی بڑے کمرے کا کرایہ دو یا ڈھائی روپے تھا۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید رئیس صاحب کو لاہور کے کسی سستے ہوٹل کا پتا نہیں' اسی لیے وہ اتنے مہنگے ہوٹل میں رہ رہے ہیں۔ میں نے ازراہ ہمدردی ان سے کہا: آپ دہلی مسلم ہوٹل میں آجایئے' اس کے کمرے کا کرایہ صرف دو ڈھائی روپے روزانہ ہے ---!

میں نے ان سے دہلی مسلم ہوٹل میں قیام کے "فوائد" بیان کرتے ہوئے کہا: آپ کے بعض پبلشر اس کے قریب ہیں' جن کے پاس آپ دوسرے یا تیسرے دن آتے ہیں۔ پھر یہ انار کلی میں ہے' جو بہت اچھی سیرگاہ اور انسانوں کا گلشن رواں ہے۔ اس موقعے پر ہم نے ان کو "تبلیغ" کرنا اور اللہ کے گھر کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری سمجھا اور عرض کیا: اس میں مسجد بھی ہے' جہاں پانچ وقت اذان کی آواز گونجتی اور اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے۔

ان سے اس قسم کی کوئی "ہمدردانہ" بات کی جاتی تو ماننے سے انکار نہیں کرتے

تھے' نہ اس نوع کے الفاظ استعمال کرتے تھے' جن سے یہ سمجھا جا سکتا کہ اس پر وہ عمل نہیں کریں گے۔ اس سے ان کے نزدیک ہمدردی کرنے والے کی دل شکنی کا پہلو نکلتا تھا' بلکہ وہ جواب میں کہا کرتے تھے' بالکل ٹھیک ہے' آپ کا مشورہ صحیح ہے' مجھے اسی طرح کرنا چاہیے' جس طرح آپ کہہ رہے ہیں۔ میری اس بات کے جواب میں بھی انھوں نے یہی کہا اور میں سمجھا میری بات اثر کر گئی ---- لیکن مولانا حنیف ندوی جواب تک خاموش بیٹھے تھے' مسکرائے اور بولے: برگنزا جیسے مہنگے ہوٹل میں رہنا رئیس صاحب کے کاروبار کا حصہ ہے۔ جب یہ برگنزا سے سالم تانگے پر سوار ہوتے اور پبلشر کی دکان کے سامنے آکر تانگے سے اترتے ہیں تو وہ سمجھتا ہے' مصنف معمولی آدمی نہیں ہے' بڑا آدمی ہے اور رئیسانہ زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر معاملہ پبلشر کی مرضی کے مطابق طے نہیں ہوتا' رئیس صاحب کی مرضی کے مطابق طے ہوتا ہے۔ اس لیے رئیس صاحب برگنزا ہوٹل سے دہلی مسلم ہوٹل میں آکر پبلشر کے نزدیک اپنا معیار زندگی نہیں گھٹائیں گے' اور اپنے کاروبار کو ڈاؤن نہیں ہونے دیں گے۔

مولانا کی یہ بات سن کر رئیس صاحب اس انداز سے مسکرائے جیسے ان کے دل کی بات کہی گئی ہو ---- اور میں معاملے کی صحیح نوعیت کو سمجھ کر خاموش ہو گیا اور پھر میں نے کبھی ان سے اس قسم کی ''ہمدردی'' کی بات نہیں کی۔

انہی دنوں یعنی نومبر ۱۹۵۴ء میں رئیس صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوئے اور تین سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس سے قبل مولانا حنیف ندوی اور سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ادارے میں کام کر رہے تھے۔ ان کی تنخواہ بھی تین تین سو روپے ماہانہ تھی' اور اس زمانے میں یہ تنخواہ بہت معقول تھی۔ خلیفہ عبدالحکیم اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر تھے جو اس کے بانی بھی تھے۔ نومبر ۱۹۵۴ء ہی میں بشیر احمد ڈار اور شاہد حسین رزاقی ادارے سے منسلک ہوئے تھے۔

یہاں چلتے چلتے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے رئیس صاحب کے انسلاک کا پس منظر بھی معلوم کرتے جائیے ---- خلیفہ عبدالحکیم نے جو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے بانی ڈائریکٹر تھے' رئیس صاحب کی دو کتابیں پڑھی تھیں' ایک تاریخ تصوف اسلام' دوسری اغانی کے بعض نصوص کا اردو ترجمہ۔ اس سے وہ بہت متاثر ہوئے تھے اور رئیس صاحب کو کراچی میں خط لکھا

تھا کہ وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستگی اختیار کر لیں- اس سے کچھ عرصے بعد خلیفہ صاحب خود کراچی گئے تو رئیس صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے دفتر پہنچے- رئیس صاحب ان کے شکل آشنا نہیں تھے' اس لیے پہچان نہ سکے- انھوں نے خود ہی اپنا تعارف کرایا- رئیس صاحب نہایت احترام سے پیش آئے اور انھیں مل کر انتہائی مسرت کا اظہار کیا- خلیفہ صاحب کچھ دیر ان کے پاس بیٹھے اور باتیں کیں' پھر فرمایا: میں فلاں مقام پر اپنے بھائی عبدالغنی کے پاس ٹھہرا ہوں- صبح ناشتہ میرے ساتھ کیجیے' وہاں اطمینان سے باتیں ہوں گی-

دوسرے روز وہ خلیفہ صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے- خلیفہ صاحب ان کا انتظار کر رہے تھے- گرم جوشی سے ملے' اثنائے گفتگو میں فرمایا' ہمیں آپ کی ضرورت ہے- لاہور آجائیے' ادارہ ثقافت اسلامیہ میں مل کر کام کریں گے-

رئیس صاحب اگرچہ مالی اعتبار سے ان دنوں کراچی میں پریشان تھے' تاہم ان کا جی کراچی چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا' لیکن ادھر خلیفہ صاحب کا اصرار بڑھ رہا تھا- آخر رئیس صاحب نے ان کی پیش کش پر غور کرنے کے لیے کچھ مہلت مانگی- دوسرے دن وہ لاہور تشریف لے آئے اور چند روز بعد رئیس صاحب کو خط لکھا: ''غور کر لیا آپ نے یا ابھی جاری ہے---''؟

خلیفہ صاحب کے کراچی جانے اور رئیس صاحب کو ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دینے سے کچھ عرصہ بعد مولانا ظفر علی خان کے فرزند گرامی اختر علی خاں کراچی گئے تھے- انھیں اپنے اخبار ''زمیندار'' کے لیے چیف ایڈیٹر کی ضرورت تھی- وہ رئیس صاحب سے ملے اور انھیں ''زمیندار'' کی زمام ادارت ہاتھ میں لینے کی درخواست کی' جسے انھوں نے منظور کر لیا اور اس کے لیے جلد ہی لاہور آنے کا وعدہ کیا- طے یہ پایا تھا کہ وہ صرف اداریہ لکھیں گے' اخبار کے باقی معاملات سے انھیں کوئی تعلق نہیں ہوگا-

اختر علی خان سے بات چیت کے کچھ عرصے بعد وہ لاہور آئے اور خلیفہ صاحب سے ملے تو انھوں نے پھر ادارے سے منسلک ہونے کی دعوت دی- رئیس صاحب نے کہا: وہ اختر علی خان صاحب کی دعوت پر یہاں آئے ہیں اور معاہدہ یہ ہوا ہے کہ وہ ''زمیندار'' کا فقط اداریہ لکھیں گے-

خلیفہ صاحب نے کہا: بالکل ٹھیک ہے' بہ یک کرشمہ دو کار- زمیندار کے لیے

اداریہ لکھیے' ہمارے لیے کتابیں تصنیف کیجیے۔

مجھے یاد پڑتا ہے' ہوا یہ تھا کہ اختر علی خان کراچی گئے اور رئیس صاحب کو زمیندار کی چیف ایڈیٹری قبول کرنے کی دعوت دے آئے۔ کچھ عرصے بعد رئیس صاحب اس دعوت کی بنا پر لاہور آئے تو زمیندار کی مالی حیثیت اس دعوت کو عملی شکل میں لانے کے قابل نہ رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رئیس صاحب کے لاہور آنے اور اختر علی خان کو اس کا علم ہونے کے باوجود معاملہ آگے نہ بڑھا اور کئی دن ان کی آپس میں ملاقات نہ ہو سکی۔ ممکن ہے اختر علی خان چاہتے ہوں کہ رئیس صاحب ان سے ملے اور کوئی بات کیے بغیر واپس کراچی چلے جائیں۔ رئیس صاحب اپنے ذاتی کام کے لیے بار بار کسی کے پاس جانے کے عادی نہ تھے۔

اس اثنا میں رئیس صاحب نے ایک دو مرتبہ مجھ سے کہا کہ میں کسی ایسے آدمی کے ذریعے اختر علی خان سے ان کا رابطہ قائم کرادوں جو انھیں بھی اچھی طرح جانتا ہو اور اختر علی خاں سے بھی رسم و راہ رکھتا ہو۔ اس کے لیے میں نے ملک نصر اللہ خان عزیز کا نام لیا تو کہا: بالکل صحیح ہے' انہی سے بات کرو۔

میں ملک صاحب سے ملا اور رئیس صاحب کے بارے میں بات کی تو انھوں نے تعجب سے پوچھا: رئیس صاحب آج کل لاہور میں ہیں؟

میں نے اثبات میں جواب دیا تو بولے ان کا قیام کہاں ہے---؟

عرض کیا: برگنزا ہوٹل میں---!

اس کے بعد شکریہ ادا کیا کہ رئیس صاحب نے انھیں یاد فرمایا اور اس قابل سمجھا کہ وہ یہ خدمت انجام دے سکیں گے۔ پھر مجھ سے کہا کہ کل چار بجے کی چائے' رئیس احمد جعفری' مولانا حنیف ندوی اور یہ بندۂ عاجز ان کے ساتھ پییں۔

صحیح طور سے تاریخ کا تعین کرنا تو مشکل ہے۔ البتہ یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں سزائے زنداں سے ملک صاحب کی رہائی پر تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا اور ان کا اخبار "کوثر" بند ہو چکا تھا' اس لیے کہ اس سے حکومت نے پانچ ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی تھی' جس کا جمع کرانا ممکن نہ تھا' اس کی جگہ ہفت روزہ "ایشیا" جاری کر لیا گیا تھا جو انھوں نے ظہور الحسن ڈار سے خریدا تھا۔ ان دنوں ملک صاحب اپنے سسر ملک لال خاں کے مکان میں ٹمپل روڈ پر مارک لین میں رہتے تھے۔ اس سلسلے کی تفصیلات ان شاء اللہ

ملک نصر اللہ خاں عزیز سے متعلق مضمون میں بیان کی جائیں گی‘ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ ہم دوسرے دن ملک صاحب کے گھر چاے پینے گئے اور کافی دیر ان سے باتیں ہوتی رہیں-

تیسرے یا چوتھے دن میری ملاقات مولانا محی الدین احمد قصوری سے ہوئی- میں نے ان کو رئیس صاحب کے بارے میں بتایا تو پوچھا: وہی رئیس صاحب جو بمبئی کے اخبار ”خلافت“ کے ایڈیٹر تھے؟ عرض کیا جی ہاں وہی رئیس صاحب---! انھوں نے رئیس صاحب کو رات کے کھانے پر بلایا- مجھے اور مولانا حنیف ندوی کو بھی ان کے ساتھ مدعو کیا گیا تھا-

چند روز بعد رئیس صاحب زمیندار سے وابستہ ہوگئے- چار سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی- ان کے ذمے صرف اداریہ لکھنا تھا- دفتر میں حاضری دینا یا اخبار سے متعلق کسی کام میں دلچسپی لینا ان کے فرائض میں شامل نہ تھا- ادارہ ثقافت اسلامیہ سے بھی بطور رفیق ادارہ ان کا تعلق قائم ہوگیا تھا- ادارے میں ان کا ماہانہ معاوضہ تین سو روپے مقرر ہوا تھا اور طے پایا تھا کہ دس بجے سے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک وہ روزانہ دفتر تشریف لایا کریں گے تاکہ تمام رفقاے ادارہ کا باہم رابطہ قائم رہے اور تحریر و کتابت کے سلسلے میں ضروری باتیں باقاعدہ ہوتی رہیں-

رئیس صاحب جتنے دن لاہور میں رہے‘ ان سے ہر روز بلاناغہ شام کو ملاقات ہوتی رہی- ان کی مہربانی تھی کہ بعض معاملات میں مجھ پر بہت اعتماد کرنے لگے تھے- اس کی وجہ یہ تھی کہ جتنے کام انھوں نے میرے ذمے لگائے‘ حسن اتفاق سے وہ سب پایہ تکمیل کو پہنچ گئے- دوسری وجہ یہ تھی کہ مولانا حنیف ندوی میرے انتہائی کرم فرما اور بے حد مشفق تھے- انھوں نے کئی قسم کی باتیں کرکے مجھے رئیس صاحب کے نزدیک ”معتبر“ بنا دیا تھا- رئیس صاحب نئے نئے لاہور آئے تھے‘ انھیں کسی ”معتبر“ کی ضرورت بھی تھی اور معتبر بھی خادم قسم کا ہونا چاہیے تھا- میرے پاس اس زمانے میں سائیکل تھا اور مجھے سائیکل چلانے کا شوق بھی تھا‘ اس لیے کہیں آنے جانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی- پھر سائیکل کی سواری اس دور میں بڑی اہمیت رکھتی تھی اور ہم اس ”بڑی اہمیت“ رکھنے والی سواری پر لاہور میں خوب گھومتے تھے اور گھومنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتے تھے-

کئی سال ہم سائیکل کی سواری کرتے رہے' یہاں تک کہ بعض دوست ہمیں سائیکلسٹ سمجھنے اور کہنے لگے- اس کے بعد سائیکل بھی ہمارے پاس نہ رہا- کوئی اور سواری بھی خرید نہ سکے- آٹا دانا ہی مشکل سے پورا ہوتا ہے- گھر کی ایک چیز آتی ہے تو دوسری ختم ہو جاتی ہے- کسی نہ کسی چیز کا مطالبہ جاری رہتا ہے- اس صورت حال کے پیشِ نظر کبھی کبھی ہم گھر والوں کو پنجابی کا یہ لوک گیت سنا کر دل کی بات کہہ دیتے ہیں-

اسیں مر گئے کمائیاں کر دے

پچھی تیرے بند نہ بنے

بات رئیس صاحب کی ہو رہی تھی جو مجھ غریب کے آٹے دانے اور پچھی کے "بند" تک پہنچ گئی- اب پھر اسی طرف آتے ہیں-

انھی دنوں کی بات ہے' ایک دن رئیس صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ مولانا داؤد غزنوی سے ملنا چاہتے ہیں- صرف سلام عرض کرنا مقصود ہے- میں نے مولانا سے کہا' انھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور فرمایا: کل چار بجے وہ میرے ساتھ چائے پئیں- چھے سات اور آدمیوں کو مولانا نے بلا لیا اور کافی دیر رئیس صاحب سے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا- رئیس صاحب کم گو تھے اور عام مجلسوں میں وہ گفتگو پر خاموشی کو ترجیح دیتے تھے' جن حضرات سے بے تکلفی نہ ہوتی ان کے سامنے سخت ضرورت کے وقت ہی زبان کو حرکت دیتے تھے- مولانا داؤد غزنوی کی اس مجلس میں بھی انھوں نے اپنی اسی عادت پر عمل کیا یعنی کہا کم اور سنا زیادہ----!

اس سے سات آٹھ مہینے قبل ۱۴- اپریل ۱۹۵۴ء کو جب اس وقت کے فرماں روائے سعودی عرب شاہ سعود پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تھے تو مولانا سید داؤد غزنوی اپنے متعدد رفقا سمیت ان کے استقبال کے لیے کراچی کے ہوائی مستقر پر موجود تھے- پھر کراچی کے شہریوں کی طرف سے ان کے اعزاز میں جو عصرانہ دیا گیا تھا اس میں بھی مولانا شریک تھے' رئیس احمد جعفری بھی اس میں شامل تھے اور اپنے ماہنامے "ریاض" میں انھوں نے اس کے متعلق جو مضمون تحریر کیا تھا' اس میں مولانا غزنوی کا ذکر نہایت اکرام و تکریم کے ساتھ کیا تھا-

لاہور میں کئی روز کے قیام کے بعد وہ کراچی چلے گئے' وہاں کے کام کاج کے بارے

میں ضروری انتظام کیا اور پھر مستقل طور سے لاہور میں سکونت پذیر ہو گئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد میکلوڈ روڈ پر ٹیگور پارک میں وکٹوریہ ہوٹل کے عقب میں مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ اس مکان میں ان کے ساتھ ایک یا دو ملازم رہتے تھے' بیوی بچے اور والدہ کراچی میں اقامت گزیں تھے اور وہ بھی کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔

رئیس صاحب کو اس سستے زمانے میں ڈھائی ہزار سے تین ہزار روپے تک ماہانہ آمدنی کی ضرورت تھی۔ بیوی بچوں کو کراچی میں الگ روپے بھیجتے تھے۔ والدہ کو الگ بھیجتے تھے اور لاہور میں ان کا اپنا خرچ الگ تھا۔ پھر کراچی اور لاہور کے دو بڑے شہروں میں کرائے کے مکان تھے۔ علاوہ ازیں لاہور میں جہاں ان کا مکان تھا' ارد گرد کے کئی غریب و یتیم بچوں اور کئی بیوہ اور نادار عورتوں کی وہ مالی مدد کرتے تھے۔ کتنے ہی بچے ان کے گھر سے کھانا کھاتے اور چائے وغیرہ پیتے تھے۔ موسم کے مطابق کپڑے لیتے بھی وہ ان کو بنا کر دیتے تھے۔ پھر خود بھی ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔

تین ہزار روپے کے لگ بھگ وہ کما لیتے تھے۔ تین سو روپے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے اور چار سو روپے اس زمانے میں اخبار ''زمیندار'' سے تنخواہ ملتی تھی' جو ان کے لاہور کے اخراجات کے لیے کافی تھی۔ پانچ پانچ سو روپے ماہانہ بعض پبلشروں سے لیتے تھے۔ یہ رقم وہ کراچی بھیجتے تھے۔

وہ ہوٹل باز بھی تھے۔ دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا ہوٹل تلاش کر لیتے اور مجھے اور مولانا حنیف ندوی کو خوش کن لہجے میں بتاتے کہ فلاں ہوٹل بہت اچھا ہے۔ کھانا بھی اچھا ہے' چائے بھی اچھی ہے اور فرنیچر بھی اچھا ہے۔

مولانا حنیف ندوی کو کثرت پیشاب کا عارضہ تھا۔ وہ خاص طور سے پوچھتے: ہوٹل میں پیشاب خانہ بھی ہے؟

رئیس صاحب جواب دیتے: حنیف صاحب! میں نے آپ کے لیے پیشاب خانہ خاص طور سے دیکھا' بہت اچھا ہے اور نشست کے قریب----

پھر بتاتے: عجیب بات یہ ہے کہ عام ہوٹلوں کی نسبت یہ ہوٹل سستا بھی ہے۔

دوسرے دن ہم اس ہوٹل میں جاتے۔ مولانا دو تین دفعہ کھل کر پیشاب کرتے' پھر ہم چائے پیتے۔ چند روز کے بعد رئیس صاحب کسی اور ہوٹل کا سراغ لگا لیتے تو اس کی

خوش خبری آسناتے۔

رئیس صاحب کو مولانا حنیف ندوی سے کوئی تکلف نہ تھا۔ وہ انھیں مولانا وغیرہ الفاظ سے مخاطب نہیں کرتے تھے' بلکہ حنیف صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ مولانا بھی انھیں فقط رئیس صاحب کہتے تھے۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ ندوی حضرات آپس کی گفتگو میں کسی قسم کا تکلف نہیں کرتے' خطاب میں رئیس صاحب' حنیف صاحب' علی میاں صاحب' شاہ صاحب وغیرہ الفاظ سے آگے نہیں بڑھتے۔

حضرت صاحب' علامہ صاحب' حضور اور قبلہ وغیرہ الفاظ کسی ندوی کو میں نے کسی ندوی کے لیے استعمال کرتے نہیں سنا۔ یہاں تک کہ چھوٹے بڑے سب ندوی' سید سلیمان ندوی مرحوم کو بھی فقط سید صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔

یہ تیس چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ اب تو سنا ہے وہاں بھی حضرت صاحب اور قبلہ و کعبہ جیسے پر تکلف الفاظ پہنچ گئے ہیں۔

رئیس صاحب کو لاہور آئے تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ ایک دن مولانا عطاء اللہ حنیف مرحوم نے جو مکتبہ سلفیہ (شیش محل روڈ لاہور) کے مالک و منتظم تھے' مجھ سے پوچھا' رئیس صاحب سے تمھارے اچھے تعلقات ہیں؟

جواب دیا: میں ان کا احترام کرتا ہوں اور وہ مجھ پر شفقت فرماتے ہیں---

فرمایا: ان سے ہمارا ایک کام کرا دو--- پھر کام کی نوعیت بتائی۔

ان دنوں مشہور مصری مصنف اور جامعہ ازہر کے ممتاز عالم ابو زہرہ کی کتابیں امام ابو حنیفہ' امام مالک' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے حالات میں شائع ہوئی تھیں۔ تحقیق اعتبار سے وہ اچھی کتابیں تھیں۔ مولانا چاہتے تھے کہ رئیس صاحب ان کے لیے امام احمد بن حنبل سے متعلق کتاب کا اردو ترجمہ کر دیں۔ انھوں نے فرمایا وہ یہ ترجمہ مکتبہ سلفیہ کی طرف سے شائع کریں گے اور رئیس صاحب جتنا معاوضہ کہیں گے' دیا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس کا کسی کو پتا نہ چلے۔ میں تمھارے ساتھ رئیس صاحب کے گھر جاؤں گا۔ اصل کتاب ان کو پیش کر دی جائے گی اور معاوضہ جس طرح وہ کہیں گے' ادا کر دیا جائے گا۔

میں نے رئیس صاحب سے بات کی اور مولانا عطاء اللہ حنیف کا ان سے غائبانہ

تعارف کرایا- انھوں نے کہا: ٹھیک ہے: میں خود ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور کتاب لے لوں گا- رہا معاوضے کا مسئلہ تو اس کا دہ فکر نہ کریں- لوگوں سے بہت کچھ لیتے ہیں' ان سے نہ لیں گے تو کیا فرق پڑتا ہے- اگر کچھ عنایت فرمادیں گے تو وہ میرے لیے کافی ہوگا اور میں اسے باعث برکت سمجھوں گا-

ابھی تک مولانا عطاء اللہ حنیف اور رئیس احمد جعفری صاحب کی ملاقات نہیں ہوئی تھی- ایک دن رات کے آٹھ بجے کے قریب میں' مولانا حنیف ندوی اور رئیس صاحب لوہاری دروازے کی طرف سے انارکلی میں داخل ہوئے- تھوڑا سا آگے بڑھے تو دیکھا کہ سامنے مولانا عطاء اللہ حنیف تشریف لا رہے ہیں- سردیوں کا موسم تھا اور مولانا عطاء اللہ سردی بہت محسوس کرتے تھے' اوپر کمبل' اس کے نیچے لمبا کوٹ' اس کے نیچے گرم واسکٹ' نیچے کھدر کی قمیص' سر پر عمامہ' ٹخنوں سے اوپر آدھی پنڈلیوں تک تہبند' گرم جرابیں اور سیاہ رنگ کی چپل پہنے ہوئے ----- میں نے ان سے رئیس صاحب کا تعارف کرایا- انھوں نے آج پہلی دفعہ ایک دوسرے کو دیکھا تھا- مولانا حنیف ندوی نے مولانا عطاءاللہ صاحب کے بارے میں رئیس صاحب سے مسکراتے ہوئے کہا: اس کمبل میں علم لپٹا ہوا ہے-

دونوں بہت اچھی طرح ملے- دو چار منٹ کھڑے کھڑے چند باتیں کیں' مولانا عطاء اللہ صاحب نے رئیس صاحب سے کہا آپ سے ملنے اور چند باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا- رئیس صاحب نے کہا: اسحاق صاحب نے آپ کے متعلق بتایا تھا- مجھے بھی آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا--- پھر خیر وعافیت اور "وعدہ فردا" کے بعد بات ختم ہوگئی-

تھوڑی دیر بعد جب مولانا حنیف ندوی اپنے گھر چلے گئے' مجھ سے رئیس صاحب نے کہا' مولانا عطاء اللہ حنیف بڑی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں' میرے ذہن میں ان کا کچھ اور نقشہ تھا- میری جان----! (مجھے وہ عام طور پر میری جان کہا کرتے تھے' کبھی اسحاق صاحب کہہ کر بھی پکارتے تھے) میں حیات احمد بن حنبل کا ترجمہ ان کے لیے ضرور کردوں گا' لیکن ان سے کوئی پیسہ نہیں لوں گا- بس دعا کی درخواست کروں گا اور یہی معاوضہ میرے لیے بہت ہے-

چند روز بعد رئیس صاحب شیش محل روڈ پر مولانا کے گھر تشریف لائے' کتاب لے گئے اور ترجمہ کردیا' لیکن مجھے معاوضے کے بارے میں کوئی علم نہیں- کتاب خوب صورت

طریقے سے چھپی اور بڑی مقبول ہوئی- مولانا عطاء اللہ صاحب نے اس کے متعدد مقامات پر حواشی لکھے-

۱۹۵۵ء کے آخری دنوں کی بات ہے-ایک دن حسب معمول میں دہلی مسلم ہوٹل پہنچا تو چند منٹ بعد رئیس صاحب بھی آگئے-ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا' وہ میز پر رکھا اور اسے کھولتے ہوئے کہا: اسحاق صاحب! جلدی سے ایک ضروری بات کر لیں' پھر حنیف صاحب آجائیں گے-انھیں اس کا پتا نہیں چلنا چاہیے- یہ میرا اور آپ کا معاملہ ہے ---- بیگ سے عربی کی ایک کتاب نکالی جو درمیانے سائز کے کم و بیش ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہوگی- حکم ہوا'اس کتاب کا ترجمہ کر دو-

میں نے کتاب دیکھی'اس کا نام ''امام زید'' تھا اور ابوزہرہ کی تصنیف تھی-

عرض کیا: میں نے تو کبھی ترجمہ نہیں کیا-

بولے: ''الاعتصام'' میں آپ کے کئی مضمون میں نے پڑھے ہیں جو عربی یا فارسی سے ترجمہ کیے گئے ہیں-

میں نے کہا: وہ دو دو چار چار صفحوں کے مختصر سے مضمون ہیں جو عربی یا فارسی سے اردو میں منتقل کیے گئے ہیں-کسی پوری کتاب کا ترجمہ کرنا میرے لیے مشکل ہوگا' مجھے اس کا تجربہ نہیں ہے-



انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا: میری جان مجھے یقین ہے آپ ضرور ترجمہ کر لیں گے-حنیف صاحب کے آنے سے پہلے یہ کتاب اپنے قبضے میں کر لو اور اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دو-

میں نے دیکھا وہ کتاب دو اہم حصوں پر محیط تھی- پہلا حصہ سوانحی اور دوسرا خالص فقہی نوعیت کا تھا جو فقہ زیدی کی کتاب ''المجموع'' سے متعلق تھا- میں نے کہا: کتاب دو حصوں میں کر لیجیے' سوانحی حصہ مجھے دے دیجیے اور فقہی حصے کا ترجمہ آپ خود کر لیجیے-

پہلے تو کہا: ساری کتاب کا ترجمہ آپ ہی کریں' میں بہت مصروف ہوں'---- میری جان میری مدد کیجیے-

میں نے اتنے بڑے کام پر ہاتھ ڈالنے سے معذرت کی تو کچھ سوچ کر بولے: اچھا آپ کی بات مان لیتا ہوں' لیکن اس صورت میں کہ فقہی حصے کا ترجمہ آپ کر دیں اور سوانحی

کا میں خود کرلوں گا- پھر کتاب پھاڑ کر دو حصوں میں کی اور فقہی حصہ میرے حوالے کر دیا-

میں سخت پریشان ہوا اور پوچھا: یہ ترجمہ کب تک کر دوں؟

جواب دیا: "بیس دن میں کر دیجیے"--- یہ الفاظ کچھ اس انداز سے کہے' جیسے یہ کوئی مشکل اور بڑا کام نہیں ہے' چھوٹا سا کام ہے جو بیس دن میں آسانی سے ہو جائے گا-

میں نے مسکراتے ہوئے عرض کیا' بیس دن میں تو میں سوچوں گا کہ کام کیسے شروع کروں-

پھر کہا: اچھا دو مہینے میں کر دیجیے' اس سے زیادہ تاخیر نہیں ہونی چاہیے-

اس کے بعد کہا: ایک بات سنیے- مجھے اس کا پیشگی معاوضہ دیا گیا تھا اور جو کچھ ملا تھا' وہ میں خرچ کر چکا- اب آپ کو اس کا کچھ نہیں ملے گا' صرف میری طرف سے "شکریے" کے الفاظ ملیں گے- البتہ میں کوشش کروں گا کہ کسی وقت' کسی صورت میں آپ کو اس کا بدلہ دے دوں-

معاوضے کا معاملہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں نہ تھا- میں نے عرض کیا: رئیس صاحب! (اور ہم انھیں رئیس صاحب ہی کہا کرتے تھے) آپ نے یہ کیا بات کی' میں آپ کا خادم ہوں- لینے دینے کا مجھے کوئی خیال نہیں ہے' آپ بھی یہ خیال دل سے نکال دیجیے-

مجھے یاد پڑتا ہے' انھوں نے بتایا تھا کہ عربی کے مطبوعہ صفحے کے انھیں پانچ روپے کے حساب سے معاوضہ ملا تھا- اگر میری یہ بات صحیح ہے تو میرے خیال میں آج سے چالیس بیالیس برس قبل کے سستے زمانے میں ترجمہ و تصنیف کے میدان میں رئیس صاحب کی بہت قدر و قیمت تھی اور انھیں معقول معاوضہ دیا جاتا تھا-

میں نے گھر جا کر کتاب دیکھی' بے شمار فقہی مسائل پر مشتمل تھی- اس میں متعدد مسائل و معاملات میں خاص طور پر فقہ زیدی اور فقہ حنفی کا تقابل کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کن کن امور میں دونوں فقہیں ہم آہنگ ہیں--- دلچسپ اور معلومات افزا کتاب ہے-

میرا اس سلسلے کا یہ پہلا کام تھا اور ایک بڑے آدمی نے مجھ پر اعتماد کر کے یہ کام میرے سپرد کیا تھا- میں دن کو یہ کام نہیں کرتا تھا' اس لیے کہ اخبار "الاعتصام" کی ادارت میرے ذمے تھی اور اسی میں تمام دن الجھا رہتا تھا- رات نو بجے کے بعد ترجمہ شروع کرتا تھا اور بارہ ساڑھے بارہ بجے تک کتاب کے ڈھائی تین صفحے کا ترجمہ ہو جاتا تھا-

مولانا حنیف ندوی کو میں نے سب کچھ بتا دیا تھا اور روزانہ شام کے بعد رات کا کام انھیں دکھا لیتا تھا۔ وہ عربی اور اردو غور سے پڑھتے اور از راہ کرم خوشی کا اظہار فرماتے۔ دو ڈھائی مہینے کے بعد کام ختم کر کے رئیس صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا اور انھیں بتا بھی دیا کہ مولانا حنیف ندوی نے تمام مسودہ دیکھ لیا ہے' آپ بھی اچھی طرح دیکھ لیں۔ انھوں نے کہا: میں نہیں دیکھوں گا' آپ نے صحیح کام کیا ہے۔ اسی طرح مسودہ پبلشر کے حوالے کر دیا جائے گا۔

اس واقعے پر بیالیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے' اب رئیس صاحب کے بارے میں اپنی یادداشتیں لکھنے بیٹھا تو لوحِ ذہن پر یہ واقعہ بھی ابھر آیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا یہ کتاب (امام زید) کس نے چھاپی' کب چھاپی اور اس وقت کہیں سے ملتی بھی ہے یا نہیں---- اس کا ذکر ایک دن اپنے عزیز دوست علی ارشد صاحب سے کیا' جو فیصل آباد کے رہنے والے ہیں اور علم دوست نوجوان ہیں۔ ان کی ذاتی لائبریری مختلف موضوعات کی بہت سی کتابوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے مہربانی کی اور یہ کتاب مہیا کر دی جو اردو اکادمی بہاول پور کی طرف سے چھپی ہے اور سال طباعت ۱۹۷۱ء ہے۔ سائز ۱۶-۳۶-۲۳ ہے۔ کل صفحات ۴۳۰ ہیں' سوانحی حصہ جس کا ترجمہ رئیس صاحب نے کیا صفحہ ۱۷ سے ۱۶۸ تک ۱۵۱ صفحات پر مشتمل ہے اور فقہی حصہ جس کا ترجمہ میں نے کیا' "المجموع" کے عنوان سے صفحہ ۱۶۹ سے آخر کتاب (صفحہ ۴۳۰) تک ۲۶۲ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ سرورق پر مصنف کی حیثیت سے ابو زہرہ کا اور مترجم کی حیثیت سے رئیس احمد جعفری کا نام لکھا ہے۔ میرا نام کہیں نہیں ہے۔ اور میرا نام لکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

ترجمے کے سلسلے میں رئیس صاحب کا اپنا ایک طریقہ تھا۔ ان کا قلم اصل کتاب کے الفاظ و حروف کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چلتا تھا اور نہ چل سکتا تھا۔ وہ ترجمہ کرتے وقت کتاب کا ایک صفحہ پڑھ لیتے اور اس کا جو مفہوم ذہن میں آتا اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے۔ ان کے خزانہ ذہن میں الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ موجود تھا اور اسے مناسب مواقع پر استعمال کرنے کا سلیقہ اللہ تعالیٰ نے ان کو خوب ودیعت فرمایا تھا۔ قاری ان کے الفاظ کی چاشنی اور جملوں کے دروبست میں اس قدر کھو جاتا کہ تقابل کی طرف عام طور سے ذہن منتقل ہی نہ ہو پاتا۔ البتہ وہ یہ احتیاط کرتے تھے کہ عربی اشعار اگر کتاب میں درج کرنا ہوتے تو ان کا ترجمہ

خود نہیں کرتے تھے- اس کے لیے یا تو مولانا حنیف ندوی کو تکلیف دیتے یا شاہ محمد جعفری پھلواروی سے رجوع کرتے- وہ صاف لفظوں میں کہہ دیتے تھے' یہ کام میرے بس کا نہیں-

الفاظ کے وہ بادشاہ تھے' جس موضوع پر لکھتے' لفظوں کا انبار لگا دیتے' نئے سے نئے جملوں اور نئی سے نئی ترکیبوں سے قارئین کو متعارف کراتے- نقد و جرح کے میدان میں ان کا قلم بڑی تیزی سے چلتا اور خوب جولانیاں دکھاتا تھا' وہ اپنا دفاع بھی کرتے جاتے اور ساتھ ساتھ حریف پر حملوں کا سلسلہ بھی جاری رکھتے-

۱۹۵۶ء کی بات ہے دہلی کے روزنامہ "الجمعیت" نے مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کو ہدف تنقید ٹھہرایا' اور ہندوستانی مسلمان جن حالات سے دوچار ہیں' اس کا تذکرہ کیا اور اس کا ذمے دار مسلم لیگ کو قرار دیا- رئیس صاحب اس زمانے میں "زمیندار" کا اداریہ لکھتے تھے- "الجمعیت" کے ایڈیٹر محمد عثمان فارقلیط تھے جو بڑے منجھے ہوئے صحافی تھے' الفاظ اور دلائل کی ان کے ہاں فراوانی تھی اور تحریر میں زور تھا- "الاعتصام" کے مبادلے میں "الجمعیت" آتا تھا- میں نے اس کے اداریے پڑھے تو رئیس صاحب سے اس کا ذکر کیا- انھوں نے بتایا کہ "زمیندار" کے مبادلے میں "الجمعیت" نہیں آتا' آپ اس کے وہ شمارے مجھے دے دیں تو میں جواب لکھوں---- میں نے دوسرے دن "الجمعیت" کے متعلقہ شمارے انھیں دے دیے اور عرض کیا "زمیندار" کے جن شماروں میں "الجمعیت" کے اداریوں کا جواب دیا جائے وہ "الجمعیت" کو ضرور بھیجے جائیں-

رئیس صاحب نے "الجمعیت" کے اداریوں کا خوب تجزیہ کیا- الفاظ' زبان' انداز' دلائل ہر اعتبار سے قابل ستائش- "الجمعیت" کے فاضل ایڈیٹر نے اس کو لائق اعتنا سمجھا' رئیس صاحب کے شکوہ الفاظ کا اعتراف کیا اور ان کے دلائل کے استحکام کو مانا- اپنے اداریوں میں متعدد مقامات پر انھوں نے رئیس صاحب کے الفاظ درج کیے اور ان کے زور بیان کی تحسین کی- کئی دن یہ بحث جاری رہی اور متعلقہ موضوع کی بہت سی نئی باتیں قارئین کے علم و مطالعہ میں آئیں- واقعہ یہ ہے کہ الجمعیت کے اداریے بھی نہایت زوردار اور مدلل تھے-

زمیندار کے اداریوں کے سلسلے میں ایک واقعہ سنتے جائیے- اس وقت کے مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے ایک دن پریس کانفرنس کی' جس کی تفصیل ابھی ریڈیو سے نشر نہیں ہوئی تھی' رات کو آٹھ بجے کی خبروں میں نشر ہونا تھی- کوئی سات بجے

کے قریب رئیس صاحب نے اپنے ایک دوست سے جو وہاں موجود تھے کہا: مجھے اب اجازت دیجیے' میں اداریہ لکھ لوں' انھوں نے کہا کچھ دیر ٹھہر جایے' آٹھ بجے کی خبریں سن لیجیے' پتا چل جائے گا' وزیر اعلیٰ نے کیا کہا:

رئیس صاحب ان کی پریس کانفرنس کے متعلق ہی اداریہ لکھنا چاہتے تھے' بولے!

"مجھے معلوم ہے وہ کیا کہے گا۔"

چنانچہ چند منٹ میں وزیر اعلیٰ کی اس پریس کانفرنس پر اداریہ لکھ دیا گیا جو نہ انھوں نے سنی تھی اور نہ کسی ذریعے سے پتا چل سکا تھا کہ اس میں کیا باتیں کہی گئیں۔ اداریہ البتہ صحیح ثابت ہوا اور پریس کانفرنس کے مسائل پر بہترین تجزیہ۔

ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا بادی پاکستان تشریف لائے اور ڈھائی ہفتے یہاں رہے۔ وہ انگریزی اور اردو کے ممتاز مصنف اور مشہور مفسر قرآن تھے۔ ان کا قیام کراچی میں گورنر جنرل ہاؤس میں تھا اور وہ گورنر جنرل ملک غلام محمد کے مہمان تھے' جن سے ان کے دیرینہ مراسم تھے۔ ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ آئی تھیں۔ چند روز کے لیے وہ لاہور تشریف لائے۔ رئیس صاحب کے وہ بے حد مشفق تھے اور اچھے پیرائے میں ان کا ذکر کرتے تھے۔ رئیس صاحب بھی نہایت تکریم کے ساتھ ان سے پیش آتے تھے۔ رئیس صاحب ان سے ملاقات کو گئے تو از راہ کرم مجھے بھی ان کی خدمت میں لے گئے' میں نے ان کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ رئیس صاحب نے میرا ان سے تعارف کرایا---"الاعتصام" ان کی خدمت میں "صدق جدید" کے مبادلے میں بھیجا جاتا تھا اور وہ بعض دفعہ "صدق جدید" کے اداراتی شذرات میں جو "سچی باتیں" کے مستقل عنوان سے شائع ہوتے تھے "الاعتصام" کا کوئی نہ کوئی اداراتی نوٹ درج کر دیتے تھے' یا نوٹ کا کوئی ٹکڑا شائع فرما دیتے تھے۔

چند روز وہ لاہور میں رہے' یہاں سے رات کی ٹرین سے کراچی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ رئیس صاحب انھیں ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہنے کے لیے گئے تو میں ان کے ساتھ تھا۔ اپنے وطن (ہندوستان) جا کر انھوں نے "صدق جدید" میں پاکستان کے سفر سے متعلق جو تفصیلات لکھنا شروع کیں' اس کا عنوان تھا "ڈھائی ہفتے پاکستان میں۔" اس میں میرا بھی ذکر کیا اور جن الفاظ میں کیا' وہ میرے لیے باعث افتخار ہیں۔ انھوں نے میرے متعلق تحریر کیا تھا کہ رئیس صاحب کی وساطت سے اس سے ملاقات ہوئی۔ بعد میں یہ سلسلہ کتابی شکل

میں شائع ہوا' کتاب کا نام بھی وہی تھا' یعنی "ڈھائی ہفتے پاکستان میں-" مولانا دریا بادی سے ملاقات کا شرف مجھے رئیس صاحب کی وساطت سے حاصل ہوا تھا-

جنوری ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے کلوکیم کا انعقاد عمل میں آیا تھا' جس میں مختلف ملکوں کے بہت سے اہل علم نے شرکت کی تھی اور مقالے پڑھے تھے- ہندوستان سے جو اصحاب فضل تشریف لائے تھے' ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی بھی شامل تھے- رئیس صاحب نے ان کی قیام گاہ پر جانے کا ارادہ کیا تو مجھے اطلاع دی اور اپنے ساتھ لے گئے- ان سے میری دوسری ملاقات تھی- اس کا تذکرہ بھی انھوں نے "صدق جدید" میں کیا' اور یہ سعادت بھی مجھے رئیس صاحب کی وجہ سے حاصل ہوئی-

رئیس صاحب بعض علمی معاملات میں میری حوصلہ افزائی کرتے تھے' میں نے "الاعتصام" کے زمانہ ادارت میں کئی خاص نمبر شائع کیے- مضامین کے لیے رئیس صاحب سے بھی گزارش کی- انھوں نے ہمیشہ مہربانی کی اور جس موضوع سے متعلق عرض کیا' مضمون لکھ کر دیا- خاص نمبروں کے علاوہ بھی انھوں نے ازخود یا میرے کہنے پر مضمون عطا کیے- وہ بہت مصروف رہتے تھے' مگر میرے دامن طلب کو انھوں نے کبھی خالی نہیں لوٹایا-

میں ۲۱- اکتوبر ۱۹۶۵ء کو ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوا تھا- اس میں رئیس صاحب کی کوشش کا بہت بڑا دخل ہے- انھوں نے مجھ سے کہا: "میں تو ایک عرصے سے کوشاں تھا کہ آپ کو ادارے میں لایا جائے' مگر آپ کے دوست انیشیٹو نہیں لے رہے تھے-" ان کے یہ الفاظ مجھے اچھی طرح یاد ہیں- دوست سے مراد مولانا محمد حنیف ندوی ہیں----- بات یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات میرے مہربان تھے' دونوں کی کوشش سے میں ادارے میں آیا اور دونوں نے میرے گھر جا کر اس کی اطلاع دی- اللہ ان کے درجات بلند فرمائے' آمین-

ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستگی کے بعد رئیس صاحب سے بہت قرب پیدا ہو گیا تھا- وہ نام کے بھی رئیس تھے اور دل کے بھی رئیس تھے- کہنا چاہیے کہ اسم بامسمّٰی تھے- وہ میکلوڈ روڈ پر ٹیگور پارک میں رہتے تھے- مکان کا نمبر ۸۹- تھا- اس سستے زمانے میں اسّی روپے اس کا کرایہ تھا جو بعد میں ایک سو بیس روپے تک چلا گیا تھا' جب کہ میں لوہاری دروازے کے اندر پینتیس روپے کرائے کے مکان میں رہتا تھا اور مولانا حنیف ندوی ٹمپل روڈ پر بھونڈ پورہ چوک میں مقیم تھے اور مکان کا کرایہ چالیس روپے تھا-

رئیس صاحب ایک خاص دائرے میں رہتے ہوئے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے' بڑے وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے- وہ بنیادی طور پر اپنے علاقے کے امیر اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے' اگرچہ حالات کی گردش نے امارت سے ان کو محروم کر دیا تھا' تاہم ان میں خاندانی اثرات بہت حد تک موجود اور نمایاں تھے-

وہ پورا ہفتہ ڈٹ کر کام کرتے تھے' لیکن منگل کے دن مکمل چھٹی کرتے تھے- اس دن نہ پڑھتے تھے' نہ لکھتے تھے- دفتر چلے جاتے تھے' اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے گھر آ جاتے تھے-

وہ ہر روز صبح کپڑے تبدیل کرتے' اور ہر ہفتے بستر کی چادر بدل دیتے تھے- جوتے بھی بدل بدل کر پہنتے تھے- سردیوں کے موسم میں نہانے سے گریز کرتے تھے- البتہ گرمی کے دنوں میں روزانہ غسل کرتے تھے-

وہ دفتر یا تو ٹہلنے کے انداز میں پیدل چلتے ہوئے آتے اور پھر دوپہر کو ٹیکسی سے واپس گھر جاتے' یا پھر سالم تانگے پر آتے اور جاتے تھے' تانگے والا دفتر آ کر تانگہ کھڑا کر دیتا تھا اور وہ اسی تانگے سے گھر جاتے تھے-

وہ دل کے سخی اور ہاتھ کے کھلے تھے- آنکھوں میں شرم تھی اور کسی سے ایسی بات کہنا ان کے لیے نہایت مشکل تھا جو اس کی ندامت یا ذہنی پریشانی کا باعث بنتی ہو- وہ اپنا نقصان برداشت کر لیتے تھے' لیکن دوسرے کی غلطی کے باوجود اسے مبتلائے اذیت نہیں کرتے تھے اور کر سکتے بھی نہ تھے' ایسا کرنا ان کے مزاج اور فطرت کے خلاف تھا- یہاں اس قسم کے چند واقعات بیان کیے جاتے ہیں' جن کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے-

ایک مرتبہ ایک شخص نے مہینے کے وسط میں ان سے کچھ روپے بطور قرض لیے اور پہلی تاریخ کو واپس کرنے کا وعدہ کیا' لیکن کئی مہینے گزر گئے' نہ اس نے روپے دیے نہ انھوں نے مانگے- ایک دن مجھ سے کہا' فلاں شخص نے اتنے روپے' اتنے دنوں کے وعدے پر لیے تھے' لیکن کئی مہینے گزر گئے ہیں' وہ روزانہ ملتا ہے' روپے دینے کا نام تک نہیں لیتا' مجھے مانگتے ہوئے شرم آتی ہے' کیا کروں؟ میں نے کہا' مانگ لیجیے' شاید بھول گیا ہو- کہا بھولا تو نہیں ہو گا'----- چھوڑیے کیا مانگنے ہیں' مانگنے سے وہ شرمندہ ہو گا' ممکن ہے اس کے پاس نہ ہوں' اگر ہوتے تو خود ہی دے دیتا-

خلیفہ عبدالحکیم اور ایم۔ایم شریف یکے بعد دیگرے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے تھے' ان کے زمانے میں رفقاے ادارہ کو گرمیوں میں کسی ٹھنڈے مقام پر جانے کی اجازت تھی' دفتر کی طرف سے اس کا الاؤنس دیا جاتا تھا' جسے "ہل الاؤنس" کہا جاتا تھا۔ رئیس صاحب گرمیوں میں عام طور سے کوئٹے جاتے اور خیرپور ہاؤس میں ٹھہرتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا حنیف ندوی بھی ان کے ساتھ کوئٹے چلے گئے۔ مولانا نے بتایا کہ ایک دن ہم چار بجے کے قریب رئیس صاحب کے کمرے میں چاے پی رہے تھے کہ ایک شخص ان سے ملاقات کے لیے آئے' انھیں بھی چاے میں شامل کیا گیا۔ میز پر رئیس صاحب کا پارکر کا قلم پڑا تھا' گفتگو کے دوران اس شخص نے قلم اٹھایا اور اس سے کچھ لکھا' اس کے بعد وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ دو تین منٹ بعد قلم دیکھا تو غائب تھا۔ ہم دونوں نے میز پر پڑے ہوئے کاغذات میں تلاش کیا' لیکن نہیں ملا۔ مولانا ندوی فرماتے ہیں' میں نے رئیس صاحب سے کہا' معلوم ہوتا ہے وہی شخص جو ملنے کے لیے آیا تھا' عمداً یا غلطی سے قلم لے گیا ہے اور وہ ابھی مکان کے دروازے سے باہر نہیں نکلا ہوگا' یہیں کہیں ہوگا' ان سے جا کر پوچھیے کہ آپ غلطی سے قلم تو نہیں لے آئے؟

لیکن رئیس صاحب نہیں گئے' کہا: حنیف صاحب! اگر وہ غلطی سے لے گیا ہے تو شرمندہ ہوگا' عمداً لے گیا ہے تو مانے گا نہیں' اور اگر نہیں لے گیا ہے تو کہے گا' ہم اسے چور سمجھ رہے ہیں۔ چھوڑیے پوچھ کر کیا کریں گے۔

ایک مرتبہ انھوں نے اپنے گھریلو ملازم کو سو روپے دیے اور منی آرڈر فارم پر کر دیا کہ یہ روپے بڑے ڈاک خانے سے کراچی میں والدہ کو بھیج دیے جائیں۔ کئی روز گزر گئے' منی آرڈر کی وصولی کی رسید نہ آئی تو رئیس صاحب نے ملازم سے پوچھا' تم نے سو روپے منی آرڈر کر دیے تھے؟ اس نے جواب دیا' کر دیے تھے۔ دو ہفتے بعد رئیس صاحب کو والدہ کا خط آیا کہ تم نے خط لکھا تھا کہ سو روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیے گئے ہیں' منی آرڈر ابھی تک نہیں آیا۔ خط پڑھ کر رئیس صاحب نے ملازم سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا' منی آرڈر کر دیا تھا پہنچ جائے گا۔ سات آٹھ دن کے بعد والدہ کا کراچی سے پھر خط آگیا کہ سو روپے کا منی آرڈر نہیں ملا۔ اب ملازم سے پوچھا تو اس نے پھر وہی جواب دیا کہ منی آرڈر کر دیا تھا۔

ان دنوں رئیس صاحب کی بیوی لاہور میں تھیں' انھوں نے رئیس صاحب سے کہا'

ملازم سے منی آرڈر کی رسید مانگیے- جواب دیا: رسید مانگتے ہوئے شرم آتی ہے------ بیوی نے خود ملازم سے رسید طلب کی تو جواب ملا کہ کہیں گم ہو گئی ہے- اس طرح ایک مہینے سے کچھ دن اوپر گزر گئے اور والدہ کا تیسرا خط آ گیا- اب رئیس صاحب نے خود ڈاک خانے جا کر والدہ کو سو روپے منی آرڈر کیے-

ایک دن رئیس صاحب کی بیوی ڈاک خانے گئیں اور متعلقہ برانچ سے اس تاریخ کا ریکارڈ نکلوایا' جس تاریخ کو سو روپے کا منی آرڈر بھیجا گیا تھا- دیکھا تو ملازم نے وہ منی آرڈر اپنے گاؤں اپنے والد کو بھیج دیا تھا-

بیوی نے رئیس صاحب کو قصہ سنایا اور خفگی سے کہا کہ اس ملازم کو ملازمت سے الگ کر دو اور سو روپے وضع کر کے باقی پیسے اس کو دے دو' لیکن رئیس صاحب نے نہ ملازم سے پوچھا' نہ اسے ملازمت سے الگ کیا' بیوی کو بھی اسے کچھ کہنے سے روک دیا- کہا یہ بے چارہ غریب آدمی ہے' اگر اس نے سو روپیہ اپنے والد کو بھیج دیا ہے تو اس میں کیا برائی ہے- میری والدہ کو نہ بھیجا اپنے والد کو بھیج دیا' اس کو جتلانا یا سو روپیہ اس سے لینا یا ملازمت سے الگ کرنا یا اسے ڈانٹنا بری بات ہے- یہ مستحق ہے' اس نے ہم سے غلط یا صحیح طور سے کچھ لے لیا تو کیا ہوا-

ایسا بھی ہوا کہ کسی نے رئیس صاحب کے کوٹ یا شیروانی کی تعریف کی اور پوچھا یہ کپڑا کہاں سے لیا تھا اور کس بھاؤ لیا تھا- رئیس صاحب نے وہ کوٹ یا شیروانی اس کو دے دی اور کہا میں اور لے لوں گا-

کم زور اور غریب کے ساتھ وہ انتہائی ہم دردی کا برتاؤ کرتے تھے- ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے اکاؤنٹنٹ ان کے زمانے میں ایک بزرگ غلام محی الدین تھے- وہ تنخواہ کی ادائگی کے موقعے پر ہر رفیق ادارہ کو لفافے میں بند کر کے اور اوپر اس کا نام لکھ کر اس کے کمرے میں تنخواہ پہنچاتے تھے- دو مرتبہ ایسا ہوا کہ تنخواہوں میں سو روپیہ کسی کو زیادہ دے دیا گیا اور اس کے ذمے دار اکاؤنٹنٹ صاحب قرار پائے- رئیس صاحب نے دونوں دفعہ سو روپے اپنی جیب سے دیے- دفتر کا یہ بوجھ اکاؤنٹنٹ پر نہیں پڑنے دیا-

رئیس صاحب ہمیشہ تھری کیسل یا اس کے برابر کا سگریٹ پیتے تھے' جو اس دور کا مہنگا سگریٹ تھا- لیکن پورا سگریٹ نہیں پیتے تھے- آدھ پون گھنٹے کے بعد سگریٹ سلگاتے

اور دو کش لگاتے۔ باقی سگریٹ پھینک دیتے یا ان کا یہ "تبرک" آگے بڑھ کر حسین الزماں لے لیتے جو عام طور پر ان کے ساتھ رہتے تھے۔

جب وہ سگریٹ ڈبیا سے نکالتے تو اپنے پاس بیٹھے ہوئے تمام سگریٹ نوشوں کو پیش کرتے۔ وہ دل کے مریض تھے' اور کہا کرتے تھے 'سگریٹ چھوڑا نہیں جا سکتا' بس گھنٹے پون گھنٹے کے بعد دو کش لگا کر پھینک دینا چاہیے۔

حسین الزماں کا نام آیا ہے تو ان کے بارے میں بھی سنتے جائیے۔ یہ رئیس صاحب کے بہت پرانے تعلق دار تھے۔ رئیس صاحب طویل قامت تھے' اور حسین الزماں کا قد چھوٹا تھا' رنگ روپ بھی ایسا ہی تھا۔ یوپی کے کسی علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم انھیں رئیس صاحب کا "ضمیمہ" کہا کرتے تھے۔ زبان بہت اچھی اور صاف تھی۔ ان کی شکل و شباہت سے ان کے طرز کلام و اسلوب تخاطب کا مقابلہ کیا جاتا تو "حسین الزماں" کے بجائے "حسین الزباں" معلوم ہوتے تھے۔ رئیس صاحب ان پر بے حد اعتماد کرتے تھے اور اگر کوئی شخص ان کے بارے میں کسی قسم کے شبہے کا اظہار کرتا تو ان کا زور دار الفاظ میں دفاع کرتے ---- ایک مرتبہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے انھیں کوئی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کو صحیح طور پر نباہنے اور بعض دیگر معاملات میں دفتر کی انتظامیہ کو شکایت پیدا ہوئی تو اس کا ذکر رئیس صاحب سے کیا گیا' اس لیے کہ انھی کے کہنے سے یہ ذمے داری انھیں سونپی گئی تھی۔ رئیس صاحب بھڑ گئے اور ان کا پورا دفاع کیا۔

رئیس صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ دوستوں کے دوست تھے' جس کے ساتھ چل پڑتے اور جسے اپنی ہمدردی کا مستحق قرار دے لیتے' اس کی پوری مدد کرتے۔ بعض دفعہ انھیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص صحیح نہیں' لیکن اس کے باوجود اس کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ البتہ علیحدگی میں اسے ڈانٹتے اور اس کی غلطی کی نشان دہی کرتے -----

ان کا معمول تھا کہ دس بجے کے قریب دفتر آتے' چائے پیتے اور رفقا سے چند منٹ باتیں کرنے کے بعد دوسری منزل میں اپنے کمرے میں چلے جاتے اور لکھنا پڑھنا شروع کر دیتے۔ عموماً بغیر بازو کی کرسی پر یوں بیٹھتے کہ بائیں ٹانگ کرسی کے اوپر گھٹنوں تک نیچے کو موڑ لیتے اور دائیں ٹانگ اس کے اوپر رکھ لیتے۔ فل سکیپ کاغذ کو لمبی طرف سے دو حصوں میں تقسیم کر کے لکھتے۔ لکھنے کی رفتار بڑی تیز تھی۔

دفتر سے گھر جاتے اور کھانے کے بعد دو ڈھائی گھنٹے قیلولہ کرتے۔ قیلولے کے بعد چائے پیتے اور تھوڑی دیر کام کر کے سیر کے لیے نکل جاتے۔ سیر کے وقت وہ پشت پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ چلتے تھے۔

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر تقریباً نو بجے پھر تحریر و کتابت میں مصروف ہو جاتے۔ گھر میں وہ پلنگ یا صوفے پر بیٹھ کر لکھتے اور رات کے تقریباً دو بجے تک یہ سلسلہ چلتا۔ اس کے بعد سو جاتے اور صبح دیر سے اٹھتے۔

سردی ان کے لیے سخت گھبراہٹ کا باعث ہوتی تھی۔ موسم سرما میں رات کے وقت ان کے کمرے میں ایک یا دو انگیٹھیاں جلتی رہتی تھیں اور قلم تیزی سے کاغذ پر گھومتا رہتا تھا۔

سردیوں میں ان کے لباس کا معاملہ عجیب و غریب تھا۔ سب سے نیچے سوتی بنیان' اس کے اوپر گرم بنیان ---- اس کے اوپر سوتی کپڑے کی قمیص اور پھر اس کے اوپر گرم کپڑے کی ---- پھر سوئیٹر اور اوپر جرسی۔ اس پر گرم شیروانی اور اس پر اوور کوٹ۔ علاوہ ازیں گرم ٹوپی' بڑا سا مفلر' گرم جرابیں اور بوٹ ---- یہ ان کا لباس سرما تھا۔ اس تہہ بہ تہہ لباس کو دیکھ کر ہم کہا کرتے تھے کہ آپ لحاف کیوں گھر میں چھوڑ آئے ہیں' وہ بھی ساتھ ہی اوڑھ کر آیا کیجیے۔ اس سے وہ خوش ہوتے اور کہتے کیا کروں' سردی بہت لگ رہی ہے۔ پھر کہتے لاہور میں سردی زیادہ ہے۔

کثرت ضروریات نے ان کو کثرت کار کا عادی بنا دیا تھا اور مختلف موضوع کی کئی کئی کتابیں وہ ایک ساتھ لکھتے تھے۔ صبح کے وقت گھر میں کسی کتاب کا ترجمہ ہو رہا ہے تو ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں آ کر ادارے کے کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ شام کو ناول نویسی ہو رہی ہے تو رات کو کسی اور کتاب کی تصنیف کا سلسلہ جاری ہے۔

وہ بہت کماتے تھے اور بہت خرچ کرتے تھے۔ بڑے مہمان نواز تھے۔ دوستوں کا خیال رکھتے تھے اور کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی اور اس کا اظہار ان سے کیا جاتا تو مدد کی پوری کوشش کرتے۔

ہوائی جہاز کی سواری سے بہت ڈرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہوائی جہاز کسی وقت بھی کہیں گر سکتا ہے اور اس پر سوار ہونا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ لمبا سفر ٹرین سے

کرتے تھے۔

رکشے کی سواری انھیں بالکل پسند نہ تھی- کہا کرتے تھے رکشے والے غیر محتاط ہیں اور خطرناک سے خطرناک مواقع پر بھی احتیاط سے نہیں چلتے' ٹیکسی پر سوار ہو جاتے تھے' لیکن ان کے نزدیک سب سے پسندیدہ سواری تانگہ تھی اور دفتر عام طور پر تانگے سے آتے تھے-

اسلامی احکام واوامر کے بارے میں انتہائی حساس تھے- کوئی اسلامی حکم بظاہر کتنا بھی چھوٹا معلوم ہوتا ہو' اس پر کسی نوع کی تنقید یا اعتراض برداشت نہیں کر سکتے تھے- اس ضمن میں شاہ محمد جعفر پھلواروی سے کبھی کبھی جھڑپ بھی ہو جاتی تھی- شاہ صاحب اگر کوئی ایسی بات کہہ دیتے تو بھڑک اٹھتے' لیکن شاہ صاحب ان کی یہ کیفیت دیکھ کر خاموش ہو جاتے- ویسے وہ شاہ صاحب کی انتہائی تکریم کرتے تھے-

کبوتر اور کبوتری کی طرح جعفر اور جعفری کا یہ جوڑا بھی عجیب تھا- جب مسائل دینیہ پر یہ جوڑا بحث کرتا تو لطف آجاتا' اس میں جیت عام طور سے جعفری کی ہوتی' جعفر کو مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑتا-

رئیس صاحب صاف دل اور عمدہ خصائل کے اہل قلم تھے- کسی کے خلاف کوئی بغض یا کینہ ان کے قلب وذہن میں نہ تھا- اگر کوئی بات ہوتی تو فوراً کہہ دیتے اور معاملہ ختم ہو جاتا- ہر شخص کی بھلائی ان کے پیش نظر رہتی اور کسی کے لیے اذیت رسانی کا باعث نہ بنتے-

میں جس زمانے میں "الفہرست" کا ترجمہ کر رہا تھا' مجھے کئی دفعہ کہا کہ یہ کتاب چھپ گئی تو تمھیں آدم جی ایوارڈ دلایا جائے گا- لیکن اس کے چھپنے سے قبل ہی وہ اللہ کو پیارے ہو گئے-

وہ بڑے خوددار تھے اور اپنی عزت و آبرو کو کسی موقعے پر مجروح نہیں ہونے دیتے تھے- ۱۹۶۷ء میں ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام تھے- ادارے کے ترجمان ماہانہ رسالے کا نام ان دنوں "ثقافت" تھا' جو جنوری ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے دور ڈائریکٹری میں جاری کیا گیا تھا-

۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ادارے کے ڈائریکٹر مقرر ہو کر آئے تو انھوں نے

فیصلہ کیا کہ رسالے کا نام بدل کر ''المعارف'' رکھا جائے اور اس کا آغاز ۱۹۶۸ء سے کیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ۱۹۶۸ء کے جنوری اور فروری کا مشترکہ شمارہ بیس سالہ نمبر شائع کیا جائے' جس میں یہ وضاحت کی جائے کہ گزشتہ بیس سال میں پاکستان میں' علمی' ادبی' اشاعتی اور ثقافتی و تہذیبی اعتبار سے کیا ارتقا ہوا' اور اسلامی ممالک سے اس کے تعلقات و مراسم کی کیا رفتار اور کیا نوعیت رہی۔

مضمون نگار حضرات کی فہرست بنانا' ان کو الگ الگ عنوان دینا' ان سے خط و کتابت کرنا اور رابطہ قائم کر کے ان سے مضامین لینا میرے سپرد ہوا۔ رئیس صاحب سے اکرام صاحب نے سٹاف میٹنگ میں کہا کہ وہ اس موضوع پر مضمون لکھیں کہ دسمبر ۱۹۶۷ء تک بیس برس میں اسلامی ممالک سے پاکستان کے تعلقات کس قسم کے رہے۔

یہ عنوان تاریخی نوعیت کا تھا اور نہایت اہم تھا۔ اس کے لیے اگست ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۶۷ء تک کے اخبارات دیکھنا ضروری تھا۔ رئیس صاحب نے اس نزاکت کا ذکر کیا تو اکرام صاحب نے کہا: آپ کسی اخبار کے دفتر میں جا کر گزشتہ بیس سال کے اخبارات دیکھیے اور مضمون مکمل کیجیے' لیکن مضمون معلوماتی اور جان دار ہونا چاہیے۔

رئیس صاحب نے جواب دیا: لاہور کے اخبارات والوں سے میرا تعلق نہیں ہے' نہ کوئی مجھے جانتا ہے' نہ میں کسی کو جانتا ہوں۔

اکرام صاحب نے کہا: جس اخبار کے دفتر میں جا کر آپ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں' اسحاق صاحب آپ کے ساتھ جائیں گے اور اخبار کے عملے سے آپ کا تعارف کرائیں گے۔

میں نے عرض کیا: رئیس صاحب کو سب پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ میں اتنے بڑے آدمی کا کسی سے کیا تعارف کراؤں گا۔ تاہم فیصلہ یہی ہوا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔ رئیس صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔ ان کے ذہن میں غالباً یہ بات تھی کہ ہر شخص تو ان کا شکل شناس نہیں ہے' جو شخص نام اور کام کی وجہ سے غائبانہ طور پر انھیں جانتا ہے' اسے اپنا نام تو بتانا ہی پڑے گا' یہ کام ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس لیے وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔

رئیس صاحب نے ''امروز'' کی پرانی فائلیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہم دفتر سے

ٹیکسی میں سوار ہوئے اور ''امروز'' کے دفتر میں حمید جہلمی صاحب کے کمرے میں گئے- وہاں عملے کے کئی آدمی بیٹھے تھے اور سب رئیس صاحب کو جانتے تھے- وہ حضرات کھڑے ہو کر گرم جوشی سے ملے' ان میں حمید اختر بھی تھے' سب سے پہلے انہی نے پوچھا: رئیس صاحب آج کس طرح تشریف لائے؟ میں نے ان میں سے ہر شخص کا رئیس صاحب سے تعارف کرایا- حمید جہلمی صاحب بہت پیارے آدمی ہیں' انھوں نے چائے پلائی اور آمد کا مقصد پوچھا- رئیس صاحب خاموش بیٹھے رہے' اگر کوئی بات کی تو بہت مختصر----- عام طور سے مجلس میں وہ کم ہی بات کرتے تھے- میں نے مقصد بتایا تو انھوں نے متعلقہ آدمی (اشرف صاحب) کو بلایا اور وہ رئیس صاحب کو سٹور میں لے گئے- وہ بھی رئیس صاحب کو جانتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے- کام شروع کر دیا گیا اور چار پانچ روز میں مضمون لکھ لیا گیا-

ایک دن دس بجے کی چائے کے بعد رفقائے ادارہ تو اکرام صاحب کے کمرے سے باہر آ گئے' مگر رئیس صاحب بیٹھے رہے- میں نے دوسری منزل میں اپنے کمرے میں جا کر ابھی کام شروع کیا ہی تھا کہ کانوں میں رئیس صاحب کی آواز پڑی جو نیچے بیٹھے ہوئے غصے سے زور زور سے بول رہے تھے- دو تین منٹ وہ اسی رفتار سے بولتے رہے' پھر خاموش ہو گئے- میں اوپر دوسری منزل میں بیٹھا حیران کہ یہ کیا معاملہ ہوا' نیچے اترا تو رئیس صاحب لائبریری میں صوفے پر بیٹھے تھے اور چہرے پر غصے کے آثار نمایاں تھے- میں نے کھڑے کھڑے آہستہ سے پوچھا: کیا بات ہوئی؟

حالت خفگی میں اونچی آواز سے بولے: میں سمجھوں گا ان سے' کیا بنے بیٹھے ہیں' آپ میرے ساتھ ''امروز'' کے دفتر گئے' اس کے عملے سے میرا تعارف کرایا' وہ لوگ شرافت سے پیش آئے' مجھے معلومات جمع کرنے کا موقع دیا- میں نے آج مضمون مکمل کر کے دکھایا تو کہتے ہیں' مضمون نامکمل ہے' تحقیقی نہیں ہے---- محقق بنے پھرتے ہیں' میں جانتا ہوں ان کی تحقیق کو-

یہ سن کر میں پیچھے ہٹ گیا' وہ بات کو اور آگے بڑھانا چاہتے تھے' لیکن میں نے وہاں رکنا اور ان کی بات سننا مناسب نہیں سمجھا- لائبریری ہال سے باہر نکلا تو دیکھا کہ اکرام صاحب غسل خانے سے باہر آ رہے ہیں اور منہ میں سگریٹ ہے- وہ کبھی کبھی سگریٹ پیتے تھے- میں نے ان کو سلام کیا' انھوں نے سلام کا جواب تو دیا' لیکن چہرے کے آثار صاف بتا

رہے تھے کہ وہ پریشانی اور غصے میں ہیں۔

ہوا یہ کہ جب ہم چاے سے فارغ ہو کر اکرام صاحب کے کمرے سے چلے گئے تو رئیس صاحب نے ان کو وہ مضمون دکھایا جو انھوں نے تیار کیا تھا' اکرام صاحب نے ادھر ادھر سے دو چار منٹ میں مضمون دیکھا اور اسی وقت ان سے کہہ دیا' یہ مضمون تو قابل اشاعت نہیں ہے' اس میں واقعات کی صحیح تصویر پیش نہیں کی گئی ہے۔

رئیس صاحب اپنے مضمون کے متعلق اس قسم کے الفاظ سننے کے لیے تیار نہ تھے' وہ غصے میں آگئے اور بلند آواز سے بولنے لگے۔ اکرام صاحب نے ان کی طرف دیکھا تو کہا: میری طرف کیا دیکھتے ہو۔ اگر مضمون قابل اشاعت نہیں ہے تو پھینک دو اس کو ردی کی ٹوکری میں ۔۔۔۔۔ اور بھی کئی باتیں کیں۔

اکرام صاحب کسی اہل علم اور صاحب قلم کے بارے میں اس قسم کی بات کہنے کے عادی نہیں تھے' خدا جانے یہ الفاظ ان کے منہ سے کیوں نکل گئے۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ رئیس صاحب بولتے رہے' مگر اکرام صاحب نے بالکل خاموشی اختیار کیے رکھی' ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ کمرے سے باہر نکلتے وقت رئیس صاحب نے مضمون اکرام صاحب کی میز سے اٹھایا اور بیگ میں ڈال لیا۔ چند روز بعد "المعارف" کا بیس سالہ نمبر (جو جنوری' فروری ۱۹۶۸ء کا مشترکہ شمارہ تھا) شائع ہوا تو اس میں رئیس صاحب کا مضمون نہیں تھا۔

دوسرے دن رئیس صاحب دس بجے کے قریب دفتر آئے۔ اس وقت ہم لوگ اکرام صاحب کے کمرے میں بیٹھے چاے پی رہے تھے۔ وہ کمرے میں آئے اور السلام علیکم کہہ کر بیٹھ گئے۔ آج بھی کل کی طرح چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔ اکرام صاحب نے گھنٹی بجائی' برکت اللہ جو چاے پلا رہا تھا' فوراً دروازہ کھول کر اندر آیا۔ اکرام صاحب نے کہا: صاحب کے لیے چاے لاؤ ۔۔۔۔ اسی وقت چاے آگئی اور رئیس صاحب نے ہمارے ساتھ چاے پینا شروع کر دی ۔۔۔۔ ان کی آمد سے پہلے اکرام صاحب کوئی بات کر رہے تھے' رئیس صاحب کے آنے پر انھوں نے کہا: رئیس صاحب نے یہ بات نہیں سنی۔ میں پوری بات انھیں بھی سنانا چاہتا ہوں' چنانچہ شروع سے دوبارہ بات سنائی۔

ہم باہر نکلے تو رئیس صاحب کا غصہ ختم ہو چکا تھا اور وہ خوش خوش دکھائی دیتے تھے۔ میں نے ہنس کر کہا آج ،صاحب کی بڑی قدر ہوئی ہے اور بڑے احترام سے چاے پلائی

گئی ہے- رئیس صاحب مسکرائے اور کہا: ان کے دل میں اگر کوئی بات نہیں ہے تو ہمارے دل میں بھی نہیں ہے-

سنا تھا کہ آزادی سے قبل جب رئیس صاحب بمبئی میں روزنامہ "خلافت" کے ایڈیٹر تھے اور اکرام صاحب صوبہ بمبئی کے کسی شہر میں اونچے سرکاری منصب پر فائز تھے' رئیس صاحب نے ان کی کسی کتاب پر تبصرہ کیا تھا' جس میں سخت تنقید کی گئی تھی- اکرام صاحب نے کبھی اس کا ذکر تو نہیں کیا' رئیس صاحب نے بھی نہیں کیا' لیکن شنید ہے کہ یہ بات ان کے دل میں رہی' شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی رئیس صاحب کو صاحب تحقیق مصنف نہیں مانا- عام طور پر وہ کہا کرتے تھے' رئیس صاحب کی کتابوں میں وہ گہرائی اور عمق نہیں ہے جو دوسرے رفقا کی کتابوں میں ہے-

اس واقعہ کے سلسلے میں جو سطور بالا میں بیان کیا گیا' یہ بھی عرض کر دوں کہ جب میں نے اور رئیس صاحب نے "امروز" کے دفتر جانے کا پروگرام بنایا تو ٹیکسی منگوائی گئی' اس وقت ایک بجنے والا تھا- ہم ٹیکسی میں سوار ہو کر اپنے دفتر سے باہر نکلے اور مال روڈ پر آئے تو رئیس صاحب نے کہا: نماز کا وقت ہو گیا ہے' میں نماز پڑھ لوں- ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے' میں ان کی دائیں جانب بیٹھا تھا- انھوں نے سیٹ پر ہاتھ مارا اور تیمم کر لیا- بولے: فقہا کے نزدیک کپڑے پر تیمّم جائز ہے--- پھر نماز پڑھنا شروع کر دی- ہم ریگل چوک میں پہنچے اور ٹیکسی ہال روڈ کی طرف مڑی تو رئیس صاحب نماز سے فارغ ہو کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہے تھے--- ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے دفتر سے ریگل چوک ایک میل ہو گا اور ہم زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں وہاں پہنچ گئے ہوں گے' اتنی دیر میں رئیس صاحب ظہر کی نماز پڑھ چکے تھے-

ٹیکسی ہال روڈ سے نکل کر میکلوڈ روڈ کا چوراہا عبور کرنے لگی تو سامنے دیوار پر موٹے حروف میں ایک فلم کا نام لکھا تھا: "مندری" رئیس صاحب نے یہ لفظ پڑھا تو مجھ سے پوچھا: میری جان' مندری کا کیا مطلب ہے---؟

عرض کیا: مندری ہندی کا لفظ بھی ہے اور پنجابی کا بھی- ہندی میں بالی کو مندری کہتے ہیں' جو عورتیں کان میں ڈالتی ہیں' لیکن پنجابی میں انگوٹھی کو مندری کہا جاتا ہے-

بولے: سندری کے وزن پر مندری بہت اچھا لفظ ہے' اسے اردو میں استعمال کرنا

چاہیے-

میں نے عرض کیا: لفظ واقعی اچھا ہے، لیکن یہ علمی لفظ نہیں ہے ناول، افسانے اور ڈرامے کی اردو میں استعمال ہو سکتا ہے-

کہا: میں اسے استعمال کروں گا اور کسی ناول میں کروں گا، مجھے یہ لفظ پسند آیا-

رئیس صاحب کا اسلوب کلام اور انداز بیان بہت عمدہ تھا- زبان ان کی اپنی تھی اور صفائی سے بات کرتے تھے، کبھی (بقول ان کے) پنجاب میں رہنے کی وجہ سے اردو میں پنجابی رنگ آجاتا تھا- ایک دن مجھ سے پوچھا:

کیا بجا ہے؟

جواب دیا: پون بجا ہے-

بہت خوش ہوئے، کہا: تم نے صحیح لفظ بولا 'پون بجا ہے ------ پنجاب میں آکر میری زبان خراب ہو گئی ہے- میں نے کئی مرتبہ "پونا ایک بجا ہے-" کہا ہے، جو غلط ہے 'پون بجا ہے کہنا چاہیے-

ان کے ایک دوست تھے جو اصلاً یوپی کے کسی علاقے سے تعلق رکھتے تھے، مجھ سے بھی اچھی طرح ملتے تھے اور اتنا تیز بولتے تھے کہ کوئی بات سمجھ میں آتی تھی، کوئی نہیں آتی تھی- شاعر تھے اور صدیقی کہلاتے تھے- ان کا نام تو ذہن میں نہیں آرہا، البتہ تخلص "حیرت" کرتے تھے، یعنی حیرت صدیقی- وہ دفتر تشریف لاتے تو ہم اپنے اپنے کمروں میں جا کر کام میں مشغول ہو جاتے، لیکن رئیس صاحب وضعدار آدمی تھے، آسانی سے ان کے قابو میں آجاتے- ایک دن مولانا حنیف ندوی کی موجودگی میں میں نے رئیس صاحب سے پوچھا:

آپ ان کی ساری باتیں سمجھ لیتے ہیں؟ ہماری سمجھ میں تو کم ہی آتی ہیں-

بولے: ان کی باتوں کا ابتدائی حصہ تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے- اس کے بعد سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا، البتہ ہاں ہوں کرتا رہتا ہوں- کسی وقت یہ اندازہ کر کے کہ یہ فلاں مسئلے سے متعلق کچھ کہہ رہے ہیں، ان کی بات کا کوئی جواب بھی دے دیتا ہوں- یہ جواب صحیح ہوتا ہے یا نہیں، اس کا ہم دونوں میں سے کسی کو علم نہیں ہوتا-

اس پر مولانا حنیف ندوی نے یہ لطیفہ سنایا کہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے حلقہ درس میں ایک طالب علم تیزی سے عبارت پڑھتا تھا، کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ صحیح پڑھ رہا

ہے یا غلط ---- کسی نے میاں صاحب سے پوچھا: جو کچھ یہ پڑھ رہا ہے آپ اسے سمجھ رہے ہیں ----؟

فرمایا اس کے تین حصے ہیں' پہلا حصہ تو وہ ہے' جسے میں بھی سمجھتا ہوں' یہ بھی سمجھتا ہے - دوسرا حصہ وہ ہے جسے میں سمجھتا ہوں' یہ نہیں سمجھتا - تیسرا حصہ وہ ہے' جسے نہ یہ سمجھتا ہے' نہ میں سمجھتا ہوں -

یہ لطیفہ سنا کر مولانا نے فرمایا: حیرت صدیقی صاحب اور رئیس صاحب کا یہی معاملہ ہے - رئیس صاحب سے حیرت صاحب کی گفتگو کی آخری منزل وہ ہے' جسے دونوں میں سے کوئی نہیں سمجھتا -

رئیس صاحب اس طرح لکھتے اور اس انداز میں پیرے بناتے تھے کہ دس صفحے کا مواد پندرہ صفحات میں پھیلا دیتے تھے - ان کی کوشش ہوتی تھی کہ کتاب کا حجم بڑھے اور صفحات میں جتنا اضافہ کیا جا سکتا ہے کر دیا جائے - یہ ان کا "کاروباری" مسئلہ تھا اور معاوضہ کتاب کے صفحات کے مطابق لیا جاتا تھا - اس سلسلے میں ہم اگر ان سے کچھ کہتے تو اس طرح مسکراتے' جیسے ان کے دل کی بات بوجھ لی گئی ہے -

جس زمانے میں میاں شریف صاحب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر تھے' اس زمانے میں ان کے پرانے دوست محبوب عالم صاحب علیگ نے (جو دراصل علی گڑھ کے رہنے والے اور وہیں کے تعلیم یافتہ تھے اور آزادی کے بعد لاہور میں سکونت پذیر ہو گئے تھے) لاہور سے پچیس چھبیس میل دور مانگا منڈی میں ملتان روڈ پر "نیا علی گڑھ سکول" کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا - بڑی اچھی بلڈنگ بنائی گئی تھی - اس ادارے کا دفتر میاں شریف صاحب کے کہنے سے محبوب عالم صاحب نے ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ایک کمرے میں قائم کر رکھا تھا - یہ سارا کام "تہذیب الاخلاق ٹرسٹ" کے ماتحت ہو رہا تھا - "تہذیب الاخلاق" ایک ماہانہ رسالہ تھا' جو کسی زمانے میں سر سید احمد خان نے علی گڑھ سے جاری کیا تھا - لاہور سے محبوب عالم صاحب نے یہ رسالہ جاری کر لیا تھا - رئیس صاحب کو اس رسالے کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا تھا اور اس کا معاوضہ انھیں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ دیا جاتا تھا' جو اس دور میں معقول معاوضہ تھا -

رئیس صاحب دوپہر کے کھانے کے بعد سونے (یعنی قیلولہ کرنے) کے عادی تھے -

۹-دسمبر ۱۹۶۵ء کو مانگا منڈی میں نیا علی گڑھ سکول کا افتتاح ہوا تو اس موقعے پر محبوب عالم صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے رفقا کو بھی وہاں لے گئے- دوپہر کے کھانے کے بعد رئیس صاحب سونا چاہتے تھے اور محبوب عالم صاحب عمارت دکھانے پر مصر تھے- آخر رئیس صاحب کو سونے کی اجازت دے دی گئی' لیکن وہاں نہ چارپائی تھی' نہ اوڑھنے کے لیے کپڑا- رئیس صاحب نے مجھ سے کہا: میری جان میں قیلولے کا عادی ہوں' کہیں سے چارپائی اور کمبل یا رضائی مہیا کر دو- میں سڑک سے دوسری طرف ایک گھر میں گیا اور دروازے پر دستک دی- باہر ایک خاتون آئی' اس سے کہا' سامنے سکول میں ایک سید آیا ہے- کرنی والا بزرگ ہے' اللہ اس کی دعا قبول کرتا ہے' وہ تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہے' اس کے لیے چارپائی اور نیا بستر چاہیے' ایک گھنٹے کے بعد واپس کر دیں گے' بزرگ آپ کو دعائیں دے گا' اور یہ بستر ہمیشہ کے لیے بابرکت ہو جائے گا- چارپائی میں بھی برکت منتقل ہو جائے گی- جو شخص اسے استعمال کرے گا' موج میں رہے گا- اس قسم کی باتیں کر کے میں اس خاتون سے نیا بستر اور چارپائی رئیس صاحب کے لیے لایا- تقریباً ایک گھنٹے تک انھوں نے قیلولہ کیا-

شام کو پانچ بجے ریڈیو پاکستان لاہور کے پروگرام "صراط مستقیم" میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق رئیس صاحب کی تقریر تھی- تقریر کا مسودہ ان کے پاس تھا- واپس آتے ہوئے دیکھا تو معلوم ہوا مسودہ کہیں گم ہو گیا ہے- وقت مقررہ پر ریڈیو اسٹیشن پہنچے اور زبانی تقریر کی- بہت اچھی تقریر تھی-

ایک دن انھوں نے ایک لطیفہ سنایا جو بقول ان کے واقعہ بھی ہے- انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ علامہ اقبال حیدر آباد (دکن) گئے- ان سے ملاقات کے لیے علامہ طباطبائی ان کی قیام گاہ پر پہنچے- واپس آئے تو طباطبائی صاحب سے ان کے دوستوں نے پوچھا: علامہ اقبال سے کیا باتیں ہوئیں؟ جواب دیا: باتیں یہ ہوئیں کہ "وہ ہاں جی' ہاں جی کہتے رہے' ہم جی ہاں' جی ہاں کہتے رہے-"

معلوم نہیں اس میں کتنی صداقت ہے- رئیس صاحب نے بھی کسی سے یہ واقعہ سنا ہی ہو گا- بعض "اہل زبان" پنجابیوں سے متعلق اس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں- کبھی لہجے کی بات' کبھی زیر زبر کی بات- کبھی قاف کاف کی بات حالانکہ اردو کی خدمت سب سے زیادہ پنجابیوں نے کی ہے- پنجابی کبھی تکلف میں نہیں پڑتا' صاف اور سیدھی بات کرتا ہے- وہ کسی

کے سوال کا جواب فوری طور پر ہاں یا نہ میں دینا چاہتا ہے اور یہی اس کا اصل مقصد ہوتا ہے- اس سلسلے میں وہ ادب آداب کی الجھنوں میں نہیں پڑتا- جواب اثبات میں ہے تو کہے گا "ہاں جی" نفی میں ہے تو کہے گا "نہیں جی-" لیکن اہل زبان یا اردو بولنے والوں کے نزدیک سوال کے اصل جواب کو تقدم حاصل نہیں' ان کے نزدیک مخاطب کے لیے اظہار ادب ضروری ہے' اور اسی کو تقدم حاصل ہے' لہذا وہ کہیں گے "جی ہاں" ----یا "جی نہیں" --- یہ محض تکلف ہے- اولیت اسی کو حاصل ہے' جس کے بارے میں سوال کیا گیا ہے' یعنی ہاں یا نہ کو----! نہ "ہاں جی" کہنے والے گردن زدنی ہیں' نہ "جی ہاں" کہنے والے عرش معلیٰ پر جا بیٹھتے ہیں-

رئیس صاحب اونچے خاندان کے فرد تھے- زندگی میں انھوں نے بہت سے اونچے لوگوں کو دیکھا تھا اور ان کے ساتھ رہے تھے' ان کی معاشرتی زندگی اور ذاتی عادات و اطوار سے واقف ہوئے تھے- ان کے پڑھنے پڑھانے کے اوقات' لکھنے لکھانے کا طریقہ' کھانے پینے کا انداز' بات چیت کا اسلوب' بحث مباحثے کا ڈھنگ دیکھا تھا- چلنے پھرنے' رہنے سہنے اور پہننے کے آداب سے آگاہی حاصل کی تھی- جن لوگوں سے انھیں میل جول کا موقع ملا' ان میں قائداعظم محمد علی جناح' نواب زادہ لیاقت علی خاں' نواب سر محمد اسماعیل' آغا خان' مولانا ابوالکلام آزاد' گاندھی جی' موتی لال نہرو' جواہر لال نہرو' حکیم اجمل خان' ڈاکٹر مختار احمد انصاری' مولانا محمد علی جوہر' شوکت علی' ڈاکٹر ذاکر حسین' سید سلیمان ندوی' راجہ صاحب محمود آباد جیسی بلند پایہ شخصیتیں شامل ہیں- ان کے علاوہ انھیں بہت سے بیرونی ملکوں کے سرکردہ حضرات سے ملنے' ان کی مجلسوں میں شریک ہونے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کے مواقع میسر آئے تھے-

پھر وہ ناول نویس بھی تھے اور ناول نویس جس شخص سے متعلق کچھ لکھتا ہے' اس کی تمام حرکات و سکنات کو واضح اور اس کی زندگی کے تمام گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے-

بمبئی کے زمانہ قیام میں سنا ہے' وہ فلمی کہانیاں بھی لکھتے رہے تھے' فلمی کہانیاں لکھنے والا ہیرو اور ہیروئن وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور ان کے عمل و حرکت کے ہر پہلو کو سامعین و ناظرین کے علم میں لانے کا ذمہ دار ہوتا ہے- اس ضمن میں اس کی نظر بڑی تیز اور اس کا مشاہدہ "خطرناک" حد تک عمیق ہوتا ہے- غالباً یہی وجہ ہے

کہ رئیس صاحب ہر بڑے اور معروف آدمی کو غور سے دیکھتے' کامل توجہ سے اس کی باتیں سنتے اور مختلف معاملات کے بارے میں اس کی عادتوں کا قریب سے جائزہ لیتے۔

ایک دن بعض مشہور لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق کہا کہ وہ بڑے مہذب آدمی ہیں۔ بات چیت میں' رہن سہن میں اور عام معاشرتی امور میں مشرقی تہذیب اور صاف ستھری ثقافت کا عمدہ نمونہ ہیں' لیکن ان کی ایک عادت مجھے اچھی نہیں لگی۔ وہ عادت یہ ہے کہ وہ چائے سڑپ سڑپ کر کے پیتے ہیں۔

اردو میں "سڑپا" انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے' جن میں پنجابی کا لفظ "سڑکا" استعمال ہوتا ہے' یعنی کوئی سیال چیز پیتے وقت منہ سے اتنی اونچی آواز نکلنا جو قریب بیٹھے ہوئے کو سنائی دے اور ذوق سلیم پر گراں گزرے۔

مولانا مودودی کی چائے نوشی کے متعلق یہ رئیس صاحب کی روایت تھی جو یہاں نقل کر دی گئی ہے ----- مولانا کے ساتھ مجھے بھی پانچ چھے مرتبہ چائے پینے کا اتفاق ہوا ہے' لیکن مجھے بالکل یاد نہیں کہ وہ سڑپ کر چائے پیتے تھے' حالاں کہ خود مجھے بھی کسی بڑے آدمی کی مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملے تو اس کے مجلسی طور طریقوں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ میں کسی بڑے خاندان کا فرد ہوں' نہ ناول نویس ہوں اور نہ فلم دیکھنے کا عادی ہوں اور نہ فلمی کہانیاں لکھتا ہوں ----- میں کوئی اچھی عادت سیکھنے کے لیے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔

مولانا مودودی کے ساتھ مجھے پہلی مرتبہ جولائی ۱۹۵۵ء میں مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب کے مکان (۲۱- ٹمپل روڈ) پر چائے پینے کا موقع ملا۔ چائے کی اس مجلس میں مولانا احمد علی لاہوری' مولانا سید داؤد غزنوی' مولانا محی الدین احمد قصوری' مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش' ملک نصر اللہ خاں عزیز' اس وقت کی جماعت اسلامی کے قیم میاں طفیل محمد اور انجمن خدام الدین کے رکن چوہدری عبدالرحمٰن شامل تھے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی' لیکن انھیں بروقت اطلاع نہ ہو سکی اور وہ شریک مجلس نہ ہو سکے' جس کا انھیں افسوس ہوا۔ یہ سب حضرات ایک خاص مقصد کے لیے مولانا محمد علی قصوری کی دعوت پر تشریف لے گئے تھے۔ وہ مقصد کیا تھا؟ اس کی وضاحت کا یہ محل نہیں۔ وضاحت اس مضمون میں کی گئی ہے جو مولانا مودودی صاحب کے متعلق تحریر کیا گیا ہے۔

اس مجلس کے شرکا میں سب سے کم عمر میں تھا' اس لیے پانی بھی سب کو میں نے ہی پیش کیا' پیالیوں میں چائے بھی میں نے ڈالی اور کھانے کی چیزیں بھی میں نے ہی پیش کیں۔ مجھے نہیں یاد کہ مولانا مودودی نے چائے سڑپ سڑپ کر کے پی تھی۔

دوسری مرتبہ مئی ۱۹۶۰ء کو جامعہ اشرفیہ میں مولانا مودودی کے ساتھ چائے پینے کا موقع ملا۔ وہ اس طرح کہ بنیادی جمہوریتوں کے اسی (۸۰) ہزار ارکان نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کو ۱۷۔ فروری ۱۹۶۰ء کو پاکستان کا صدر منتخب کیا تو کچھ عرصے بعد انھوں نے صدر کی حیثیت سے ایک آئینی کمیشن قائم کیا تھا جو ملک کے گیارہ ماہرین قانون پر مشتمل تھا۔ کمیشن نے چالیس سوالات کا ایک سوال نامہ جاری کیا تھا' جو اخبارات اور ملک کے ارباب فکر اور اصحاب دانش کو بھیجا گیا تھا۔ کمیشن کے دفتر میں جواب پہنچنے کی آخری تاریخ ۳۰۔ مئی مقرر ہوئی تھی۔ اس سوال نامے پر غور کرنے اور اس کا جواب دینے کے لیے مختلف مکاتب فکر کے انیس علمائے کرام کا ایک اجلاس ۵'۶۔ مئی ۱۹۶۰ء کو جامعہ اشرفیہ (نیلا گنبد لاہور) میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں دیگر علمائے کرام کے علاوہ مولانا مودودی بھی شامل تھے۔ مجھے بھی "علما" سمجھ کر اس میں دعوت شرکت دی گئی تھی اور ہم نے انتہائی شوق سے یہ "علمائی مرتبہ" قبول کیا تھا اور اس کی تمام کارروائی میں شریک رہے تھے۔ دو دن کے اس اجلاس میں چار مرتبہ چائے پی گئی۔ میں دونوں دن مولانا داؤد غزنوی اور مولانا مودودی کے قریب ہی بیٹھا تھا' مگر مجھے بالکل یاد نہیں کہ مولانا مودودی "سڑپا" مار کے چائے پیتے تھے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے' جب میں اخبار "الاعتصام" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۶۵ء کو) جب میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوا تو مولانا کے دفتر (اچھرہ) میں تین چار مرتبہ ان کے ساتھ چائے پینے کا شرف حاصل ہوا۔ ان مواقع پر مولانا حنیف ندوی اور ملک نصر اللہ خان عزیز بھی موجود تھے۔ مگر وہ جو رئیس صاحب نے سڑپے کا ذکر کیا تھا' وہ بالکل ذہن میں نہیں۔ میرے خیال میں رئیس صاحب سے بھول ہوئی ہے۔ انھوں نے کسی اور بڑے آدمی کو سڑپے مارتے دیکھا ہو گا' اس مجلس میں مودودی صاحب بھی موجود ہوں گے' اس کا نام ان کے ذہن سے نکل گیا اور مودودی صاحب کا یاد رہ گیا۔

رئیس صاحب نہایت مہذب' انتہائی ملنسار اور بلند اخلاق تھے۔ اچھا لباس زیب تن

کرتے اور شان سے زندگی بسر کرتے تھے۔ گرمیوں میں ٹھنڈی اور سردیوں میں گرم شیروانی پہنتے تھے، جس کے اوپر کے تین چار بٹن کھلے رہتے تھے۔ سر پر قراقلی ٹوپی رکھتے تھے، ننگے سر باہر نہیں نکلتے تھے۔

ان کی اہلیہ محترمہ کا نام آفتاب بیگم ہے، وہ کہا کرتے تھے کہ ان کی بیگم بڑی سلیقہ شعار ہیں، وہ ان کی بہت تعریف کرتے اور پیار سے ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کئی مرتبہ یہ بات کی کہ وہ صرف اپنی ٹوپی اور جوتے بازار سے خریدتے ہیں کہ ان کا تعلق ماپ سے ہے۔ ان کے باقی تمام کپڑے اپنی پسند کے مطابق ان کی بیگم خریدتی ہیں۔ کپڑوں کے بارے میں وہ بیگم کی پسند کو ترجیح دیتے تھے۔

ہماری گھریلو قسم کی مشرقی روایات کی رو سے کسی مرد کے لیے اگر پرائی عورت کے حسن و جمال کا ذکر کرنا معیوب نہ قرار پاتا تو میں عرض کرتا کہ رئیس صاحب اپنی اہلیہ کے بارے میں تعریفی اسلوب اختیار کرنے اور ان سے متعلق پیار کے لہجے میں بات کرنے میں بالکل حق بجانب تھے۔ وہ عمر میں رئیس صاحب سے کافی چھوٹی تھیں، لیکن بڑے شوہر کی بیوی تھیں، اس لیے شوہر پر فخر کرتی تھیں اور ٹھاٹھ سے رہتی تھیں۔۔۔ شوہر کے نزدیک بھی مرکز محبت تھیں۔ اللہ نے ان کو نسوانی حسن سے خوب نوازا تھا۔

ایک مرتبہ انھوں نے سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی۔ یقین جانیے سونے کا رنگ اور ان کا اپنا رنگ بالکل ایک جیسے تھے۔

شوہر کی وفات کے بعد مجھے صرف دو دفعہ ان کو سلام عرض کرنے کا موقع ملا، ایک مرتبہ اس وقت جب وہ ان کے پراویڈنٹ فنڈ کے حساب اور وصولی کے لیے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آئی تھیں۔ وہ چند روز لاہور میں رہیں، پھر واپس کراچی چلی گئیں۔ اس وقت وہ بے حد مغموم تھیں۔ شوہر کی وفات کا شدید صدمہ تھا جو انھیں برداشت کرنا پڑا۔ وہ اچانک کئی قسم کی الجھنوں میں پھنس گئی تھیں اور ان کا حسن مرجھا گیا تھا۔۔۔

دوسری مرتبہ ۱۹۹۲ء میں۔۔۔۔ گرمیوں کا موسم تھا، وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آئیں اور السلام علیکم کہہ کر میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔ میں اپنے کام میں مصروف تھا، اس لیے ان کی طرف دیکھ نہ سکا۔ اپنے بیگ سے چند رسالے نکال کر وہ مجھے عنایت کرنے لگیں۔ (جو رئیس صاحب کے متعلق تھے) تو میں ان کے احترام میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور

انھیں سلام عرض کیا۔ کچھ دیر وہ بیٹھیں اور رئیس صاحب کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ پھر چلی گئیں ----انھیں دیکھ کر بہت سی باتیں ذہن میں گھوم آئی تھیں۔

رئیس صاحب کا ایک بیٹا ہے اور تین بیٹیاں ---- معلوم نہیں یہ لوگ کس حال میں ہیں اور کس طرح کی زندگی بسر کر رہے ہیں؟

ان کی بیگم بمبئی کے قطب میاں کی صاحب زادی ہیں جن کا پورا نام قطب الدین تھا اور وہ خلافت کمیٹی کے رہنماؤں میں سے تھے۔ رئیس صاحب بمبئی میں مولانا شوکت علی کے ایما سے روزنامہ "خلافت" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے گئے تھے اور قطب میاں اس اخبار کے منیجر تھے۔ یہیں سے معاملہ آگے بڑھا اور ان کی بیٹی آفتاب بیگم اخبار "خلافت" کے ایڈیٹر سید رئیس احمد جعفری کے عقد میں آگئیں۔

رئیس صاحب کا حلقہ مراسم بہت وسیع تھا۔ ان کے لاہور آنے سے دو سال بعد وحدت مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آگیا تھا۔ مرکز اور دونوں صوبوں (مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان) کے متعدد وزیروں سے ان کے دوستانہ علائق تھے۔ بعض وزیروں کی تقریریں بھی وہ لکھتے تھے۔ تقسیم اسناد کے جلسوں کے کئی صدروں کی تقریریں انھوں نے لکھیں۔ اس کا ذکر وہ کبھی کبھی دبے لفظوں میں کیا کرتے تھے۔

وہ سب سے برابر کی سطح پر تعلق رکھتے تھے۔ نہ کسی کو اپنے سے بڑا سمجھتے تھے' نہ خود اس طرح بڑا ہونے کی کوشش کرتے تھے کہ دوسرے کو چھوٹا قرار دیں۔ کسی کی وزارت یا امارت سے وہ مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

وہ زود نویس اور بسیار نگار مصنف تھے۔ شب و روز کے مختلف اوقات میں مختلف موضوعات پر لکھتے اور کئی کئی پبلشروں کو بھگتاتے تھے۔ بات بنانا اور اسے ترتیب دینا انھیں خوب آتا تھا۔ اگر کہیں غلطی ہو گئی تو گھبراتے نہیں تھے۔ فوراً اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ سنیے۔ ایک مرتبہ وہ دو پبلشروں کے لیے بہ یک وقت دو ناول لکھ رہے تھے اور دوسرے تیسرے دن دونوں کو الگ الگ مسودے بھجوا دیتے تھے۔ ایک دن یہ ہوا کہ ایک ناول کا مسودہ جو دس گیارہ صفحات پر مشتمل تھا' غلطی سے دوسرے پبلشر کو بھجوا دیا گیا۔ اس کی کتابت بھی ہو گئی اور پبلشر نے کسی سے پروف ریڈنگ بھی کرا لی' اس کے بعد وہ ناول چھپ بھی گیا۔ ابھی اس کی فروخت شروع نہیں ہوئی تھی کہ اسے پبلشر نے دیکھا اور اتفاق

سے انھی صفحات پر نظر پڑی جو دوسرے ناول سے متعلق تھے۔انھیں بار بار پڑھا' لیکن عبارت کا ربط قائم نہیں ہو رہا تھا۔رئیس صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا اور وہ مقام دکھایا گیا تو بولے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔پہلے مضمون سے ابھی ربط قائم ہو جائے گا۔قلم پکڑ کر چند سطریں شروع کی بدلیں' چند آخر کی بدلیں' کچھ الفاظ درمیان سے بڑھائے' کچھ گھٹائے اور مسئلہ حل ہو گیا۔کہا صرف یہ ہو گا کہ اس کاپی کو دوبارہ کتابت کرانا پڑے گا۔باقی سب ٹھیک ہے------ اور واقعی ٹھیک تھا۔

ان کی تصنیفات و تالیفات' تراجم و تشریحات' تنقیدات و تبصرات اور تلخیصات و انتخابات کو شمار میں لانا مشکل ہے۔انھیں خود بھی علم نہیں تھا کہ انھوں نے کون کون سی کتابیں تصنیف کیں اور ان کی تعداد کتنی ہے۔میرے خیال میں ان کی تصنیفات و تالیفات کی کثرت اب ان کے وارثوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہو گی۔ان کی زیادہ تر کتابیں ان کی معاشی مجبوری کا نتیجہ تھیں۔اگر بیس پچیس کتابیں ہوتیں اور اہم موضوعات پر معرض تصنیف میں لائی جاتیں تو انھیں بھی یاد ہوتیں' لوگوں کے بھی ذہن میں رہتیں اور ان کا حلقہ اشاعت بھی قائم رہتا۔مولانا حنیف ندوی نے بارہا ان سے کہا کہ وہ کتابوں کے سلسلے میں کیفیت اور کمیت کے فرق کو ملحوظ خاطر رکھیں۔لیکن ان سے یہ نہ ہو سکا۔

رئیس صاحب میرے بہت مہربان تھے اور دفتری معاملات میں میرا خیال رکھتے تھے۔جب اکرام صاحب ادارے کے ڈائریکٹر مقرر ہو کر آئے' اس وقت ادارے سے میرے انسلاک پر سات آٹھ مہینے گزر چکے تھے اور میرا پراویڈنٹ فنڈ جاری نہیں ہوا تھا۔میں میاں شریف صاحب کے زمانے میں ادارے سے منسلک ہوا تھا' میاں صاحب اس سے ایک مہینہ بیس دن بعد اچانک وفات پا گئے تھے۔ان کے بعد اکرام صاحب آئے تو ان سے رئیس صاحب نے میرے توجہ دلائے بغیر میرے پراویڈنٹ فنڈ کے اجرا کے لیے کہا' انھوں نے فوراً اس کی منظوری دے دی اور پراویڈنٹ فنڈ جاری ہو گیا۔

وہ جس بات کو صحیح سمجھتے اس کے اظہار میں بڑے بے باک تھے۔۱۹۶۴ء میں صدر ایوب اور فاطمہ جناح کے درمیان صدارتی مقابلہ ہوا تو وہ فاطمہ جناح کے حامی تھے' جو کونسل مسلم لیگ' جناح مسلم لیگ' جماعت اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی وغیرہ کی طرف سے صدارتی انتخاب لڑ رہی تھیں۔ان کی حمایت میں انھوں نے ''نوائے وقت'' میں مضامین

لکھے- ان دنوں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر میاں شریف تھے- جس زمانے میں میاں شریف صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پڑھاتے تھے' ایوب خاں اس زمانے میں یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور میاں صاحب کے شاگرد تھے- شاگردی کی بنا پر وہ میاں صاحب کا بہت احترام کرتے تھے اور استاد کے کہنے سے ایک مرتبہ ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تشریف بھی لائے تھے- انھوں نے صدارتی انتخاب کے دنوں میں ٹیلی فون کے ذریعے میاں صاحب کو رئیس احمد جعفری کے مضامین کے بارے میں کہلوایا کہ یہ سلسلہ بند کر دیا جائے- میاں صاحب نے رئیس صاحب سے بات کی تو انھوں نے جواب دیا: جس بات کو میں صحیح سمجھتا ہوں اس کے اظہار سے رکنا میرے لیے مشکل ہے-

انھوں نے صدارتی انتخاب میں صدر ایوب کی مخالفت کی' لیکن ۱۹۶۶ء میں صدر ایوب نے انھیں اردو کی امتیازی خدمات کا اعزاز عطا کیا-

رئیس صاحب کے دور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے تین سید وابستہ تھے- سید محمد جعفر شاہ پھلواروی' سید رئیس احمد جعفری اور سید شاہد حسین رزاقی---! کہنا چاہیے کہ ادارے کی حیثیت اس دور میں "سادات منزل" کی تھی- اب ان میں سے ایک سید زندہ ہیں اور وہ ہیں سید شاہد حسین رزاقی- لیکن یہ اب ادارے سے منسلک نہیں ہیں' کئی سال پہلے اپنی صحت اور بعض مجبوریوں کی بنا پر ادارے سے علیحدہ ہو گئے تھے-

ان دنوں تین ہی ندوی ادارے میں تصنیفی خدمات سر انجام دے رہے تھے- مولانا محمد حنیف ندوی' شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی اور سید رئیس احمد جعفری ندوی- اس اعتبار سے اس دور کے ادارہ ثقافت اسلامیہ کو "ندوۃ العلما" کے نام سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے-

میں غیر ندوی تھا' رئیس صاحب نے کئی دفعہ مجھ سے کہا کہ میں شاہ صاحب یا حنیف ندوی صاحب کو حدیث کی کسی کتاب کی چند احادیث اور کسی خاص فن سے متعلق کسی کتاب کے دو چار مقامات سنا کر ان سے سند ندویت لے لوں اور اپنے نام کے ساتھ ندوی لکھنا شروع کر دوں' لیکن میں نے اسے جعل سازی اور اپنے نفس کی جھوٹی تسکین قرار دیا اور عرض کیا کہ یہ کام میں نہیں کروں گا- انھوں نے بارہا اس قسم کے حصول سند کی چند مثالیں دیں' اور کہا کہ ہمارے اکابر علما سندیں لیتے رہے ہیں- مگر میرا دل نہ مانا اور میں نے بناوٹی ندوی بننا گوارا نہ کیا-

رئیس صاحب کٹر مسلم لیگی تھے اور انھوں نے بمبئی سے روزنامہ "انقلاب" جاری کر لیا تھا۔ یہ اخبار بمبئی شہر اور صوبے میں تحریک پاکستان کا بہت بڑا نقیب تھا۔ اسی "جرم" میں ان کو آزادی کے بعد ہندوستان سے نکالا گیا تھا۔ بمبئی میں ان کا پریس بھی تھا' اخبار بھی تھا' تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا' جس کی وجہ سے معاشی اور معاشرتی اعتبار سے ان کو وہاں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی' لیکن چوں کہ وہ مسلم لیگی تھے اور قیام پاکستان کے داعی تھے' اس لیے ہندوستان میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ رہی تھی اور وہ جنوری ۱۹۴۸ء میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کراچی آگئے تھے۔ کراچی میں ان کے ساتھ کیا ہوا---؟ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ یہاں آنے کے بعد یہ حالت ہوئی کہ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

بمبئی سے نکلتے وقت (ایک روایت کے مطابق) وہ اپنا پریس ایک عزیز کو دے آئے تھے۔ میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ اپنے وطن سیتاپور (یو-پی) میں خاندانی لحاظ سے آپ اچھی حیثیت کے مالک تھے۔ پاکستان آنے کے بعد مکان وغیرہ کا کلیم داخل کرایا تھا یا نہیں---؟

جواب دیا: کلیم فارم پر کیا تھا۔ ایک دفتر میں داخل کرانے گیا تو وہاں سے دوسرے دفتر میں بھیج دیا گیا' وہاں پہنچا تو ایک اور دفتر کی نشان دہی کی گئی۔ اس کے اہل کاروں سے ملا تو ایک اور دفتر کی طرف اشارہ کیا گیا۔ اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو کہیں اور جانے کا حکم ہوا۔ اس بھاگ دوڑ سے تنگ آکر وہیں اسے پھاڑا اور ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیا' اس طرح اس مصیبت سے نجات حاصل کی۔

رئیس صاحب شاعر بھی تھے' لیکن بہت کم شعر کہتے تھے' ویسے بھی جو لطف ان کی نثر میں ہے وہ نظم میں نہیں۔ الفاظ کے جس ذخیرے اور مضامین کی جس رنگارنگی سے وہ اپنے قارئین کو نثر میں متعارف کراتے ہیں' نظم میں نہیں کراتے۔

وہ سخاوت اور ہم دردی کا خوش نما پیکر تھے۔ مجھے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوئے پندرہ بیس دن ہوئے ہوں گے کہ ایک دن وہ دفتر آتے ہی میرے کمرے میں تشریف لائے۔ خیر و عافیت پوچھی اور میرے کام کے بارے میں دریافت کیا۔ پھر کہا آپ ان شاءاللہ

یہاں مطمئن رہیں گے۔ یہ آپ کے ذوق کا کام ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا: آپ یہاں علمی کام کریں گے۔ اس کے بعد بیگ کھولا' اس سے چیک بک نکالی اور میرے نام کا ساٹھ روپے کا چیک کاٹ کر مجھے دیا۔ یہ نیشنل بینک کا چیک تھا۔ میں نے سمجھا ساٹھ روپے مجھ سے بینک سے منگوانا چاہتے ہیں۔

عرض کیا: ابھی لے آؤں یا کل دفتر آتے ہوئے لیتا آؤں؟

بولے: یہ میرے نہیں' آپ کے ہیں' آج لے آئیں یا کل لے لیں۔

عرض کیا: یہ عنایت کس خوشی میں ہوئی؟

کہا: کسی خوشی میں نہیں' دو تین روز سے میرا جی چاہ رہا تھا کہ آپ کو کچھ پیش کروں۔ کسی کو بتایئے گا نہیں۔

چار پانچ مہینے کے بعد ڈیرہ اسماعیل خاں کی طرف سے ان کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے جو پرانے ندوی تھے اور زمانہ طالب علمی سے ان سے ان کے تعلقات تھے۔ ان کے اسلوب کلام میں کچھ سختی کا عنصر پایا جاتا تھا اور ناز نخرہ بھی تھا۔ رئیس صاحب ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ شخص بڑا نخرے باز ہے۔ وہ کئی دن ان کے پاس رہتے۔ جاتے وقت رئیس صاحب ان کی خدمت میں دوسروں سے چھپا کر کچھ رقم پیش کرتے۔

رئیس صاحب فروٹ کی اچھی سی دکان سے ہمیشہ کیلئے کنو اور امرود خریدتے تھے جو وہ کھانے اور ناشتے کے بعد کھاتے تھے۔ لیکن بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے کسی چھابڑی والے یا ریڑھی والے کو دیکھا' خیال کیا کہ یہ غریب آدمی ہے اور اس کے پاس اچھی چیزیں نہیں ہیں' اس لیے اس سے بہت کم لوگ کوئی چیز خریدتے ہوں گے اور مشکل سے گھر کا خرچ چلتا ہوگا' انھوں نے بلا ضرورت اس سے دو تین روپے کی چیزیں خرید لیں۔

یہ چیزیں ان کے کسی کام میں نہیں آتی تھیں' مگر ایک غریب کی تھوڑی بہت امداد ہو جاتی تھی۔

ایسا بھی ہوتا کہ بازار سے کوئی چیز کھانے کو ان کا جی چاہا' لیکن بیماری کی وجہ سے یا ڈاکٹر کے روکنے کی وجہ سے وہ اسے کھا نہیں سکتے' وہی چیز وہ حسین الزمان کو کھلا دیتے جو عام طور سے ان کے ساتھ رہتے تھے' اس سے ان کی تسلی ہو جاتی اور وہ سمجھ لیتے کہ یہ چیز انھوں نے

خود ہی کھائی ہے- یہ ان کی زندگی کا ایسا عجیب و غریب پہلو تھا' جس میں وہ منفرد تھے-

دواؤں کے استعمال میں وہ بہت محتاط تھے- اپنے معالج کی تجویز کردہ دوا کے علاوہ کوئی دوا استعمال نہیں کرتے تھے- اگر کوئی شخص کسی دوا کے لیے کہتا' بے شک وہ کتنا بڑا طبیب ہوتا' نہ اس سے علاج کراتے' نہ اس کی بتائی ہوئی دوا استعمال کرتے- اس کی باتیں سنتے اور جواب میں ہاں ہاں کہتے رہتے-

ایک مرتبہ کراچی سے ایک حکیم صاحب تشریف لائے اور لاہور کے ایک علاقے میں اپنا مطب کھولا- وہ نابینا تھے- انھوں نے کچھ لوگوں سے پوچھ پاچھ کر چند ایسے افراد کی فہرست بنائی جو ان کے خیال میں ان کے کاروبار طبابت کے لیے فائدہ مند ہو سکتے تھے- پھر ان سے تعلقات استوار کیے- اتفاق سے میں اور مولانا حنیف ندوی بھی ان کی مرتب کردہ فہرست میں شامل تھے- انھوں نے ہم سے رابطہ پیدا کیا اور ہمارے ان سے اچھے مراسم قائم ہو گئے- وہ مختلف اوقات میں ہماری نبض دیکھتے اور دوا کے لیے کہتے رہتے' لیکن ہمیں کسی دوا کی ضرورت نہ تھی- ایک دن ہم رئیس صاحب کو ان کے پاس لے گئے' وہ حسب عادت بہت اچھی طرح ملے' رئیس صاحب کی نبض دیکھی' کچھ طبیعت کا حال معلوم کیا اور چند دوائیں تجویز کیں اور فرمایا یہ دوائیں ان کے پاس موجود ہیں' ان کے استعمال کے فوائد بھی بیان کیے- رئیس صاحب آرام سے بیٹھے سنتے رہے اور ٹھیک ہے ٹھیک ہے' کہتے رہے- ان سے اجازت لے کر ہم تینوں باہر آئے تو رئیس صاحب نے کہا: میں ان کی بتائی ہوئی دوا استعمال نہیں کروں گا- بس اتنا بہت ہے کہ ان سے ملاقات ہو گئی- کسی سے ملاقات کرنا تو اچھی بات ہے' لیکن اس کی تجویز کردہ دوا استعمال کرنا اچھی بات نہیں-

نومبر ۱۹۵۴ء میں رئیس صاحب سے میرا تعلق پیدا ہوا جو ان کی وفات (اکتوبر ۱۹۶۸ء) تک چودہ سال قائم رہا- میں جب ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوا' اس وقت وہ اس کے مجلّہ "ثقافت" کے ایڈیٹر تھے' مجھ سے انھوں نے بعض عربی رسائل کے مضامین کا ترجمہ کرایا' اور یہ ترجمہ شدہ مضامین "ثقافت" میں شائع ہوئے-

ان سے متعلق یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ممکن ہے' کسی کے نزدیک دلچسپی کا باعث نہ ہوں' لیکن مجھے ان سے دلچسپی ہے' اسی لیے یہ میرے ذہن میں محفوظ رہے اور اب موقع ملا تو کاغذ پر منتقل کر دیے گئے-

ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہونے سے کچھ عرصہ بعد انھیں ادارے کا مینجر بنا دیا گیا تھا‘ بعض مطبوعات پر بطور مینجر کے ان کا نام شائع بھی ہوا‘ لیکن اس اثنا میں انھوں نے اپنے ایک پرانے دوست پر بعض معاملات میں بہت زیادہ اعتماد کیا اور وہ ان کے اعتماد پر پورے نہ اترے‘ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں یہ منصب چھوڑنا پڑا۔ تھوڑا عرصہ ہی وہ مینجر رہے۔ میرے خیال میں یہ منصب انھیں زیب بھی نہیں دیتا تھا‘ وہ ادارے کے ریسرچ فیلو اور ”ثقافت“ کے ایڈیٹر تھے۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا جو ان کی شان کے عین مطابق تھا۔

وہ کہا کرتے تھے کہ ہر شخص میں بعض کم زوریاں ہوتی ہیں۔ اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے‘ جس کی کم زوریاں اللہ نے لوگوں پر ظاہر نہیں کیں۔ نہ اپنی کم زوریاں کسی کو بتانی چاہئیں اور نہ دوسروں کی کم زوریاں لوگوں کے سامنے بیان کرنی چاہئیں۔ یہ ان کی زندگی کا نہایت اچھا پہلو تھا۔ میں نے ان کو کسی کی کم زوری کسی کے سامنے بیان کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

متحدہ ہندوستان میں ان کا اخبار ”انقلاب“ تحریک پاکستان کا بہت بڑا داعی اور نقیب تھا اور اسی بنا پر آزادی کے بعد انھیں بمبئی سے جبراً پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔ وہ اس کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ اگر انھیں کسی شخص کے بارے میں‘ اگرچہ وہ کتنی بڑی حیثیت کا مالک ہوتا یہ شبہ پڑ جاتا کہ وہ کسی عنوان سے بھی پاکستان کے لیے ضرر رساں ہو سکتا ہے تو اس کی ڈٹ کر مخالفت کرتے۔

ایک مرتبہ ہندوستان کے ایک مشہور اور بہت بڑے پیر (خواجہ حسن نظامی) کے متعلق (جو اردو کے بہت اچھے مصنف اور ادیب بھی تھے) یہ خبر اخباروں میں چھپی کہ وہ ہندوستان کی سکونت ترک کر کے مستقل طور سے پاکستان آرہے ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر رئیس صاحب نے اپنے حلقہ احباب میں کہا کہ یہ بزرگ پاکستان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوں گے‘ بڑے لوگوں سے مراسم بڑھائیں گے اور پاکستان کی خبریں ہندوستان کی حکومت کو پہنچایا کریں گے۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں یہ ملک کی سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں سے انگریزی حکومت کو مطلع کیا کرتے تھے۔

وہ دوستوں کے بے حد بہی خواہ تھے اور ان کی خوشی پر خوشی کا اظہار کرتے اور ان کی

تکلیف سے غم زدہ ہوتے تھے- میں نے ۱۹۶۶ء میں اپنا مکان بنانے کے لیے لاہور کے علاقہ سانده میں اپنی حیثیت کے مطابق تھوڑی سی جگہ خریدی تو بہت خوش ہوئے- کہا اب کسی طرح مکان بنالو- اگر اچھا مکان نہیں بنا سکتے تو بے شک کٹیا بنالو' اپنی کٹیا بھی بہت ہوتی ہے- اس میں رہائش اختیار کرو' ہر مہینے کرایہ دینے سے بچو گے-

بہت سے واقعات ان کے خزانہ ذہن میں محفوظ تھے- برصغیر کی سیاسی و مذہبی جماعتوں کے اکابر و اعیان سے متعلق بے شمار باتیں انھیں معلوم تھیں- وہ انھیں قلم بند کرنا چاہتے تھے- میرے خیال میں اس ارادے کو عملی شکل نہیں دے سکے- اگر انھیں قلم و قرطاس کے حوالے کر دیا جاتا تو یہ باتیں برصغیر کی علمی' مذہبی' سیاسی اور معاشرتی تاریخ کا ایک اہم حصہ قرار پاتیں اور لوگ اس سے مستفید ہوتے-

وہ نومبر ۱۹۵۴ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہوئے تھے اور پھر زندگی کی آخری سانس ۷-۲ اکتوبر ۱۹۶۸ء تک (چودہ سال) ادارے سے منسلک رہے- یہاں انھوں نے یکے بعد دیگرے تین ڈائریکٹروں کا زمانہ دیکھا- خلیفہ عبدالحکیم کا' ایم-ایم شریف کا اور ڈاکٹر شیخ محمد اکرام کا- چودہ سال کے عرصے میں انھوں نے ادارے کے لیے پانچ کتابیں لکھیں' جن کا مختصر تعارف مندرجہ ذیل سطور میں کرایا جاتا ہے-

## ۱- اسلام اور رواداری:

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے- اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جس نے غیر مسلم محکوموں اور اقلیتوں کے ساتھ اس درجے روادارانہ برتاؤ کیا کہ خیبر کے یہودی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر مسلمانوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے تھے' دنیا اسی انصاف پر قائم رہے ----- حمص کے عیسائی علی الاعلان اپنے مسلمان فرماں رواؤں کے لیے دعائے خیر کیا کرتے تھے اور خدا سے التجا کرتے تھے کہ عیسائی حکمران اب کبھی واپس نہ آئیں ----- اس کتاب میں اسلام کی داستان رواداری دلکش اور روح پرور انداز میں بیان کی گئی ہے-

## ۲- اسلام اور عدل و احسان:

اسلام کے مخالف عام طور سے کہا کرتے ہیں کہ اسلام تشدد کا مذہب ہے اور اسلامی عبادات و معتقدات ''عسر'' پر مبنی ہیں- اس کتاب میں اس غلط بیانی کی تاریخی شواہد اور قرآن

و حدیث کی روشنی میں عمدہ پیرائے میں تردید کی گئی ہے' اور ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام رحم' عدل' احسان اور محبت کا مذہب ہے-

### ۳-سیاست شرعیہ:

یہ مشہور مصری محقق علامہ عبدالوہاب خلاف کی کتاب کا شگفتہ اور سلیس ترجمہ ہے-اس میں حکومت الہیہ کی وضع و ہیئت اور اس سے متعلق بہت سی ضروری باتیں تفصیل سے بتائی گئی ہیں-

### ۴-اسلامی جمہوریت:

اس میں بیان کیا گیا ہے کہ جمہوریت کیا ہے؟اس کے خصائص و حدود اور خدو خال کیا ہیں؟اس کا تحفظ کس طرح کیا جاتا ہے؟اس کتاب میں بسط و تفصیل' صحت و استناد اور کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی جمہوریت کی وضاحت کی گئی ہے-

### ۵-تاریخ دولت فاطمیہ:

اس میں مصر کے فاطمیین کی تاریخ تفصیل سے بیان کی گئی ہے- یہ کتاب ان کی فتوحات' علم کی ترویج' غیر مسلموں سے روابط' ان کے عقائد و اعمال اور سیاسی کارناموں کا دلآویز مرقع ہے-

آخر عمر میں وہ ادارے کے لیے ''اسلامی اندلس'' کے نام سے کتاب لکھنا چاہتے تھے اور مواد جمع کر رہے تھے' مگر موت نے مہلت نہ دی-

علاوہ ازیں وہ کئی سال ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ماہانہ رسالے ''ثقافت'' کے ایڈیٹر رہے- ''المعارف'' کی ادارتی ذمہ داریاں بھی کچھ عرصہ ان کے سپرد رہیں- پھر ان چودہ سالوں میں دوسرے اداروں کے لیے بھی وہ تالیفات و تراجم کی خدمات سرانجام دیتے رہے-

۲۲- فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے وفات پائی اور اس سے گیارہ مہینے بعد جنوری ۱۹۵۹ء میں ان کی آخری تصنیف ''انڈیا ونس فریڈم'' پہلی مرتبہ شائع ہوئی- کتاب مولانا غلام رسول مہر کو ملی تو انھوں نے اس کے اردو ترجمے کا ارادہ کیا اور ترجمہ کر بھی لیا- غالباً پاکستان کی اس دور کی حکومت نے کتاب پر پابندی عائد کر دی تھی' اس لیے ترجمہ چھپ

نہ سکا- اس ترجمے کی صرف ایک ہی کاپی ہے جو ہمارے دوست جناب محمد عالم مختار حق کے پاس موجود ہے- پھر جب اخبارات میں اس کے بعض اقتباسات شائع ہوئے تو پابندی ختم کر دی گئی اور لوگ ہندوستان سے کتاب منگوا کر اس کا مطالعہ کرنے لگے- انھی دنوں رئیس صاحب کے ترجمے کا اعلان ہوا اور دیواروں پر بڑے بڑے اشتہار چسپاں ہوئے---- مجھے یاد پڑتا ہے ''آزادی ہند'' کے نام سے رئیس صاحب کا ترجمہ شائع ہوا تھا- یہ ''ترجمہ'' بہت چھپا اور بہت بکا- لیکن ترجمہ کیسا تھا---؟ چند سطریں کتاب کے ترجمے کی اور پھر اس پر اچھی خاصی تنقید---! ایک دن میں نے ان سے کہا' یہ ترجمہ ہے یا تنقید---؟ مسکراتے ہوئے جواب دیا: میری جان یہاں سب چلتا ہے-

بلاشبہ ان کی زندگی میں ان کا لکھا ہوا ''سب چلتا'' تھا- ناشر چھاپتے تھے اور لوگ پڑھتے تھے- لیکن ان کی وفات کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا- کچھ پتا نہیں کوئی ناشر ان کی کوئی کتاب چھاپتا ہے یا نہیں- میرا خیال ہے' ان کی کتابوں کی پہلی سی مانگ نہیں رہی-

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ان کی پانچ کتابیں شائع ہوئی تھیں' جہاں تک مجھے یاد ہے وہ صرف ایک مرتبہ شائع ہوئیں' دوبارہ غالباً کسی کتاب کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی- حالاں کہ یہ بہت اچھی اور معلوماتی کتابیں ہیں-

وہ زندگی میں بہت سے لوگوں سے ملے- ایک دن بتایا کہ وہ مولانا عبدالحلیم شرر سے بھی لکھنؤ میں ان کے دولت کدے پر ملے تھے- بقول ان کے مولانا عبدالحلیم شرر کا معمول تھا کہ دوپہر کے بعد چار بجے کھانا کھاتے اور پھر تھوڑی دیر بعد لکھنے پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتے- صبح چار بجے تک پڑھتے اور لکھتے رہتے- صبح چار بجے پھر کھانا کھاتے اور فجر کی نماز کے بعد سو جاتے-

ملازم پیشہ لوگوں کی ماہانہ آمدنی اور ان کے گزر اوقات کے بارے میں ایک دن انھوں نے کہا:

پہلا ہفتہ ہنسی خوشی
دوسرا ہفتہ کشاکشی
تیسرا ہفتہ فاقہ کشی
چوتھا ہفتہ خودکشی----!

رئیس صاحب کا آبائی وطن ہندوستان کے صوبہ یوپی کا شہر سیتاپور تھا- ان کے خاندان کو وہاں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا- ضلع سیتاپور میں ایک قصبہ خیر آباد تھا- رئیس صاحب کے ننھیال خیر آباد کے رہنے والے تھے- ان کے نانا سید نیاز احمد تھے' جو اردو کے مشہور شاعر ریاض خیر آبادی کے چھوٹے بھائی تھے-

رئیس صاحب ایک روایت کے مطابق ۱۹۰۷ء میں اور ایک روایت کی رو سے ۱۹۱۲ء میں لیکھم پور میں پیدا ہوئے' جہاں ان کے والد سید ناظر حسین ملازم تھے- والد کا انتقال عالم جوانی میں ہو گیا تھا' جب کہ رئیس احمد بہت کم عمر تھے' اس لیے ان کی تربیت اپنے ننھیال خیر آباد میں سید ریاض احمد خیر آبادی کی نگرانی میں ہوئی-

سید ناظر حسین چوں کہ عالم شباب میں وفات پاگئے تھے' اس لیے ان کی زمین جائداد کی مناسب طریقے سے حفاظت نہ ہو سکی- یہی وجہ ہے کہ رئیس احمد اور ان کے بڑے بھائی عقیل احمد کی تعلیم کی راہیں کشادہ نہ ہو سکیں- عقیل احمد تو آٹھویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے- البتہ رئیس احمد نے پریشانیوں کے باوجود ذاتی محنت وہمت سے اپنے لیے ایک راستہ بنا لیا-

۱۹۲۲ء میں یا اس سے تھوڑا عرصہ بعد رئیس احمد نے لکھنؤ کا عزم کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا- ندوہ کے جن اساتذہ کرام سے حصول علم کے مواقع میسر آئے' ان میں مولانا حیدر حسن ٹونکی' مولانا حفیظ اللہ' مولانا عبدالحلیم صدیقی' مولانا عبدالرحمٰن نگرامی' مولانا عبدالودود جیراج پوری' مولانا سید علی' مولانا شبلی فقیہ' مولانا حکیم اللہ بہرائچی اور مولانا محمد سلیم کنتوری کے اسمائے گرامی شامل ہیں-

۱۹۳۰ء میں ندوہ کے طلبا میں ایک احتجاجی تحریک شروع ہوئی اور ہڑتال تک نوبت پہنچی جس کے نتیجے میں رئیس صاحب کو ندوہ سے نکال دیا گیا اور وہ دہلی جاکر جامعہ ملیہ میں داخل ہو گئے- جامعہ ملیہ کے زمانہ طالب علمی میں انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کے حالات میں ''سیرت محمد علی'' لکھی جو ان کی پہلی تصنیف ہے اور مولانا محمد علی کے بارے میں بھی یہ اولین کتاب ہے' اپنے موضوع میں یہ ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے-

دہلی سے مولانا شوکت علی انھیں بمبئی لے گئے اور وہ خلافت کمیٹی کے اخبار روزنامہ ''خلافت'' کے ایڈیٹر مقرر کیے گئے- بعد ازاں بمبئی سے روزنامہ ''انقلاب'' جاری کیا- اس

اخبار میں انھوں نے تحریک پاکستان کی پرزور تائید کی۔

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ملک آزاد ہوا تو صوبہ بمبئی کا وزیر داخلہ مرارجی ڈیسائی کو بنایا گیا تھا۔ یہ وہی مرارجی ڈیسائی ہیں جو کئی برس بعد اندرا گاندھی کو انتخابی شکست دے کر ہندوستان کے وزیراعظم بنے، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ان کی حکومت ناکام ہو گئی اور انھیں ایوان وزارت عظمیٰ سے نکلنا پڑا۔ موصوف کٹر ہندو تھے اور گائے کا پیشاب ہر کھانے سے پہلے نوش جان فرماتے اور اسے ہر بیماری کا علاج قرار دیتے تھے۔

جنرل ضیاء الحق کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے انھیں ستارۂ پاکستان دینے کا اعلان کیا تھا، لیکن بے نظیر بھٹو نے ضیا کی وفات کے بعد وزارت عظمیٰ پر فائز ہوتے ہی ان کو یہ نشان دینے سے انکار کر دیا تھا۔

آزادیِ برصغیر کے وقت رئیس صاحب بمبئی میں تھے اور وہاں سے روزنامہ ''انقلاب'' نکالتے تھے۔ آزادی کے بعد مرارجی ڈیسائی اور بعض اخبار نویسوں پر مشتمل ایک کونسل نے رئیس احمد جعفری صاحب کے ان اداریوں کی فائل بنائی جن میں انھوں نے تحریک پاکستان کی حمایت اور کانگرس کی مخالفت کی تھی۔ اس ''جرم'' میں انھیں ہندوستان سے نکال دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ رئیس صاحب کا کیس اس کونسل کے سامنے پیش ہوا جس کی صدارت خود مرارجی ڈیسائی کر رہے تھے۔ ڈیسائی نے پوچھا: سماعت انگریزی میں ہو یا اردو میں؟

رئیس احمد جعفری نے دبنگ لہجے میں جواب دیا:

انگریزی نہ آپ کی زبان ہے نہ میری ---- گجراتی زبان آپ سمجھتے ہیں، میں نہیں سمجھتا۔ کارروائی اردو میں ہونی چاہیے، جسے آپ بھی سمجھتے ہیں، میں بھی سمجھتا ہوں۔

سوال ہوا: آپ کا وطن کون سا ہے؟

جواب دیا: جہاں میں اس وقت موجود ہوں!

کہا گیا: آپ نے پاکستان کی حمایت کر کے ایک قومی جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس لیے آپ کو اس ملک سے نکل جانا چاہیے۔

جواب دیا: میں نے انگریزوں کے دور میں ترکی کی حمایت میں انگریزی حکومت کے خلاف لکھا، لیکن انگریز نے مجھے قسطنطنیہ کی راہ نہیں دکھائی۔ میں نے مصر کی حمایت اور

انگریزوں کی مخالفت کی' لیکن مجھے قاہرہ چلے جانے کا کسی نے حکم نہ دیا---اب آپ مجھے ہندوستان چھوڑنے کا حکم بھی نہیں دے سکتے- قانون' اخلاق' تہذیب' کسی لحاظ سے بھی آپ کا حکم مبنی بر صحت نہیں-

حکم ہوا: آپ کو ہندوستان کی سکونت ترک کر دینا پڑے گی- چوبیس گھنٹے کے اندر اندر اس ملک سے نکل جایئے

چنانچہ انھوں نے فوری طور پر ہندوستان کو خیرباد کہا اور کراچی آ گئے- وہاں آکر روزنامہ "خورشید" جاری کیا' لیکن وہ چل نہ سکا' پھر ایک ماہانہ رسالہ "ریاض" نکالا' وہ بھی زندہ نہ رہ سکا-

نومبر ۱۹۵۴ء میں وہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوئے اور تصنیفی خدمات انجام دینے لگے- ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی شام کو لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر سیر کے لیے گئے- ان کے دوست حسین الزماں ان کے ساتھ تھے- وہ تو ایک جگہ بیٹھ گئے اور رئیس صاحب پلیٹ فارم پر چکر لگانے لگے- تیسرے چکر میں حسین الزمان نے دیکھا کہ ایک جگہ ایک دم لوگوں کا ہجوم ہو گیا ہے- وہ بھاگ کر گئے تو دیکھا رئیس صاحب زمین پر پڑے تھے اور چلتے ہوئے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے تھے- ان کی اہلیہ کراچی میں تھیں' انھیں اطلاع دی گی- وہ لاہور آئیں اور نامدار شوہر کی میت بذریعہ ہوائی جہاز کراچی لے گئیں' جہاں وہ آسودۂ لحد ہیں- انا للّٰه و انا الیه راجعون

رئیس صاحب کی خدمات بوقلموں کا دائرہ بہت وسیع ہے' بلکہ کہنا چاہیے کہ ہمہ گیر ہے' انھوں نے اپنے اسلوب خاص سے قرآن کی خدمت کی اور اپنی بہت سی تصنیفات میں اس کتاب ہدیٰ اور صحیفہ نور کی آیات مبارکہ سے استشہاد کیا- حدیث رسول ﷺ کو مرکز خدمت اور محور استدلال بنایا اور اردو خواں طبقے میں ارشادات پیغمبر کی نشرو اشاعت کا فریضہ سرانجام دیا- اللہ کے نزدیک اس دنیا کی پسندیدہ مخلوق رسول ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں' جن کے بارے میں فرمان خداوندی ہے: رضی اللّٰه عنهم و رضوا عنه (اللہ ان پر راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے) رئیس احمد جعفری نے اپنی بعض کتابوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات و حالات تحریر کیے اور لوگوں کو ان کے کردار پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دی----انھوں نے ہزاروں صفحات میں ائمہ کرام کے سوانح حیات قلم

بند کیے -- وہ بزرگان دین کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ انھوں نے فقہائے عظام اور مسائل فقہ پر لکھا۔ تاریخی واقعات کو ضبط کتابت میں لائے۔ غرض انھوں نے ہر اس موضوع پر لکھا، جس میں دین کی خدمت اور معاشرے کی بھلائی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا تھا۔ ان مساعی گوناگوں اور خدمت بوقلموں کے پیش نظر ہم عاجز بندوں کو یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام لغزشیں معاف کر دی ہیں اور انھیں جنت الفردوس میں داخل فرما دیا گیا ہے۔

# قاضی عبدالعزیز منصور پوری

۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں ہم لوگ اپنے موجودہ گاؤں میں آباد ہوئے تھے۔اس وقت جو حالت مشرقی پنجاب سے آنے والے دوسرے لوگوں کی تھی وہی ہماری تھی۔۱۹۴۸ء کے مئی میں گندم کی کٹائی ختم ہوئی تو ہم چار آدمیوں نے مل کر ایک کاروبار شروع کیا' اور وہ چار آدمی تھے' حاجی عمر دین' کرامت علی' عبدالشکور نمبردار اور ان سطور کا راقم -----ان چار میں سے تین وفات پا چکے ہیں اور میں اس واقعے کا راوی زندہ ہوں۔

کاروبار ہم نے یہ کیا کہ آٹھ سو من بھوسا خریدا' جسے پنجابی میں "توڑی" کہا جاتا ہے' اور آئندہ سطور میں اسے "توڑی" ہی لکھا جائے گا۔ہم نے سنا تھا کہ لاہور میں توڑی کا بھاؤ بہت تیز ہے اور یہ بے حد منافع کا سودا ہے۔جس بھوک ننگ کے دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں' لاہور کے دو تین چکروں سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہمارا اشمار اس علاقے کے بڑے کاروباری اور امیر لوگوں میں ہونے لگے گا۔

اب ہم چار آدمیوں نے کسی طرح سو روپے کی رقم اکٹھی کی اور اپنے گاؤں کے کھلیانوں میں توڑی خریدنے چل پڑے۔گاؤں کے سب لوگ ہمیں جانتے تھے اور ہم سبھی مشرقی پنجاب کے ایک ہی شہر (کوٹ کپورہ) کے رہنے والے تھے۔انھیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ چند روز میں ہم بہت بڑے امیر بننے والے ہیں-----ہم جس کھلیان اور کھیت میں جاتے ہماری بے حد آؤ بھگت کی جاتی۔سیاسی اور سرکاری زبان میں کہنا چاہیے کہ ہمیں مکمل پروٹوکول دیا جاتا۔ہمیں دیکھتے ہی بیٹھے ہوئے لوگ کھڑے ہو جاتے اور کام کرنے والے کام بند کر دیتے اور اچھی طرح کھیس جھاڑ کر ہمارے بیٹھنے کے لیے درخت کے سائے میں بچھا دیا جاتا اور پینے کے لیے پانی یا لسی کے گلاس خوب دھو کر ہمیں پیش کیے جاتے۔

ہم نے چھ آنے من کے حساب سے توڑی خریدنا شروع کی۔جب خریداری بڑھ گئی تو کچھ توڑی آٹھ آنے کے حساب سے بھی خریدی۔اس طرح ہم نے آٹھ سو من توڑی خریدی-----گاؤں کے کھلیانوں میں چاروں طرف ہماری توڑی کے لمبے چوڑے ڈھیر

دکھائی دیتے تھے۔

ہم نے اسے گڈوں پر لادا اور جڑانوالہ کے ریلوے اسٹیشن پر لے آئے۔ وہاں سے مال گاڑی کے دو ڈبے بھر کر جن میں چار سو من توڑی ڈالی گئی تھی' لاہور کے بادامی باغ ریلوے اسٹیشن پر آئے۔ یہاں دیکھا تو بھاؤ بالکل مختلف تھا۔ میں اور حاجی عمر دین مرحوم یعنی دو بیوپاری جڑانوالے سے ٹرک پر کرایہ خرچ کیے بغیر لاہور آئے تھے۔ یہاں ہمارا قیام ایک عزیز کے ہاں رہا۔ ہمارا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود بیس روپے گھاٹا پڑا ----یعنی لینے کے بجائے دینے پڑ گئے۔ یہ کل چار سو من توڑی تھی۔

اب چار سو من توڑی باقی تھی۔ اس کے بارے میں ہمیں بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ راولپنڈی لے جاؤ۔ وہاں بہت مہنگی بکے گی۔ چنانچہ ہم اسے مال گاڑی کے دو ڈبوں میں بھر کر راولپنڈی لے گئے۔ اس زمانے میں بذریعہ بس جڑانوالے سے راولپنڈی کا کرایہ (براستہ لاہور) چھے روپے تھا۔ لیکن میں وہاں سے رات کو ٹرک پر سوار ہوا اور صبح کو راولپنڈی پہنچ گیا۔ کرائے کا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا۔

راولپنڈی کے ریلوے اسٹیشن پر توڑی کے ایک آڑھتی سے میں نے بات کی اور اس نے توڑی ریل کے دو ڈبوں سے اتروا کر اپنی تحویل میں لے لی اور مجھے وصولی کی رسید دے دی۔ اس نے میرا نام لکھا۔ "محمد اسحاق خاں۔ جڑانوالہ"

اس زمانے میں ہمارے ایک بزرگ قاضی عبدالعلی' راولپنڈی کے سید پور روڈ پر رہتے تھے اور وہاں ایک ہائی سکول میں معلم تھے۔ وہ ریاست فرید کوٹ کے غالباً پہلے مسلمان تھے' جنھوں نے بی' اے پاس کیا تھا۔ یہ ۱۹۱۵ء کی بات ہے---- میں پوچھتا پچھاتا' دن غروب ہونے سے پہلے ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہ تنہا رہتے تھے' ان کے اہل و عیال ہمارے گاؤں میں مقیم تھے اور وہیں ان کی زمین تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ حیران بھی ہوئے اور خوش بھی---- میں نے ان کو آمد کی وجہ بیان کی تو کہا ریلوے اسٹیشن پر توڑی لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں آڑھتی کئی قسم کے اخراجات وصول کرے گا۔ مجھ سے رابطہ قائم کرتے' میں کسی ٹال والے کو کہتا اور وہ توڑی خرید لیتا۔

اب مجھے دو فکر کے لاحق تھے' ایک یہ کہ توڑی معلوم نہیں کیا بھاؤ بکے گی۔ دوسرا جو

بہت بڑا فکر تھا یہ تھا کہ میں نے اپنا نام آڑھتی کو محمد اسحاق بتایا تھا، لیکن اس نے "محمد اسحاق خاں" لکھ دیا تھا۔ مجھے خیال گزرا کہ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے اور وہ توڑی کی رقم کسی اپنے آدمی محمد اسحاق خاں کو دے دے گا---- تمام رات میں اس بہت بڑے مسئلے پر فکر مند رہا۔ اپنے آپ کو کوستا بھی رہا کہ کیوں اس وقت آڑھتی سے اپنے نام کے ساتھ لکھا ہوا "خاں" کا لفظ حذف نہ کرا دیا۔

صبح ہوئی اور دن چڑھا تو پتا چلا کہ ریلوے اسٹیشن پر توڑی کے جو ڈھیر پڑے تھے، انھیں آگ لگ گئی ہے اور وہ سب جل گئے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی مصیبت تھی جو اچانک پیش آگئی تھی۔ اس سے قاضی عبدالعلی (مرحوم) بھی پریشان ہوئے، لیکن انھوں نے مجھے تسلی بھی دی کہ گھبراؤ نہیں، تمھاری توڑی تک آگ نہیں پہنچی ہوگی۔

کچھ دیر بعد میں ریلوے اسٹیشن پہنچا تو دیکھا کہ توڑی کے بہت سے بیوپاری پریشانی کے عالم میں ماتھے (بلکہ ماتھوں) پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ ان کی اس حالت پر بڑا ترس آیا، لیکن کیا کیا جا سکتا تھا جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔

میں آگے بڑھ کر اپنے آڑھتی کے پاس پہنچا تو پتا چلا کہ میری توڑی کا چار سو من کا ڈھیر آگ سے محفوظ رہا ہے۔ میں نے اس پر اللہ کا شکر ادا کیا اور جن لوگوں کی توڑی جل گئی تھی، ان سے اظہار ہمدردی اور اظہار افسوس کیا۔

بہت بڑی مقدار میں توڑی جل جانے کی وجہ سے جو توڑی باقی رہ گئی تھی، وہ مہنگی ہو گئی اور مجھے تمام اخراجات نکال کر اور لاہور کا بیس روپے کا خسارہ پورا کرنے کے بعد پچپن روپے کا منافع ہوا۔ اب میں اپنی اس تجارت پر نہایت خوش تھا۔ لیکن ہماری یہ آخری تجارت تھی۔ اس کے بعد تین چار دن میں وہاں رہا۔ یہ جون کا مہینہ تھا اور راولپنڈی کا میرا یہ پہلا سفر تھا۔ ہمارے علاقے کا موسم وہاں کے موسم سے کافی مختلف تھا۔ ہم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور راولپنڈی کی خوب سیر کی۔

اس اثنا میں ایک دن ایک چھوٹی سی مسجد میں عصر کی نماز پڑھی تو دیکھا کہ صحن میں ایک صاحب مصلے پر تشریف فرما ہیں۔ گندمی رنگ، سفید داڑھی، نہ زیادہ چھوٹی نہ بہت بڑی، اعتدال کے خوب صورت زاویے کی دل کش تصویر۔ کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، چہرے کے نقوش ان کی ذہانت کے آئینہ دار۔ سفید قمیص اور سفید لٹھے کا پاجامہ زیب تن۔ بیٹھے

ہوئے میانے قد کے معلوم ہوتے تھے۔ان کے آگے رحل پر انگریزی ترجمے کا قرآن مجید رکھا ہوا تھا۔اور وہ درس قرآن دے رہے تھے۔اٹھارہ بیس ان کے سامعین ہوں گے اور اس مسجد کے حجم کے پیش نظر سامعین کی یہ اچھی خاصی تعداد تھی۔انداز کلام جہاں دھیمے پن اور متانت کا پہلو لیے ہوئے تھا' وہاں مطالب کی گہرائی اور مقرر کے جذبہ محبت قرآن کی غمازی بھی کرتا تھا۔لوگ بڑے غور اور شوق سے ان کی باتیں سن رہے تھے اور ماحول کے آثار شہادت دیتے تھے کہ سننے والے ان سے بہت متاثر ہیں۔درس ختم ہوا تو پوچھنے پر کسی نے بتایا کہ یہ قاضی عبدالعزیز منصور پوری ہیں' قاضی محمد سلیمان منصور پوری مصنف (رحمۃ للعالمین) کے صاحب زادۂ گرامی قدر ------ان کے ایک عزیز (میجر جنرل) غلام عمر اور بیٹے قاضی عبدالباری وہاں ملٹری میں خدمات انجام دیتے تھے۔اس وقت وہ انہی کے پاس اقامت گزیں تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے قاضی عبدالعزیز کو دیکھا اور چند منٹ ان کا درس قرآن سننے کا شرف حاصل کیا۔ان کا نام البتہ اس سے پیشتر کئی دفعہ سن چکا تھا۔

اس واقعہ سے کچھ عرصے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور میں لاہور آگیا۔ایک مرتبہ قاضی حبیب الرحمٰن لاہور آئے اور میرے پاس شیش محل روڈ پر قیام فرما ہوئے (ان کا تذکرہ "نقوش عظمت رفتہ" میں ہو چکا ہے)۔یہ علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے بھتیجے اور قاضی عبدالعزیز کے چچازاد تھے۔ایک دن کسی کام سے کرشن نگر گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔واپسی پر ایک مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے فرمایا: اس مکان میں قاضی عبدالعزیز رہتے ہیں۔

یہ مکان سنت نگر میں تھا' اور یاد پڑتا ہے کہ جس راستے سے ہم آرہے تھے اس راستے کے دائیں جانب تھا' لال سے رنگ کے اوپر کے دو کمرے تھے اور راستے ہی سے اوپر کو سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔سامنے کوئی آبادی نہ تھی' اجاڑ سی تھی۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکان آؤٹ فال روڈ پر تھا جو گھوڑا ہسپتال کے قریب سے آگے کو چلی جاتی ہے۔اب وہاں کا نقشہ بالکل بدل گیا ہے اور دور تک آبادی پھیل گئی ہے۔

اب سے پچاس سال پہلے کے نقشے کی صحیح طور سے نشان دہی کرنا ممکن نہیں۔یہ وہ زمانہ تھا جب قاضی عبدالعزیز راولپنڈی سے لاہور منتقل ہو گئے تھے اور مستقل طور سے یہیں سکونت

اختیار کر لی تھی- ایک مرتبہ سردیوں کا موسم تھا- رات کے آٹھ بج چکے تھے اور میں شیش محل روڈ پر اپنے کمرے میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ نیچے سے آواز کان میں پڑی- ''اسحاق کتھے ایں-''

میں نے آواز پہچان لی تھی- یہ ہمارے ایک بزرگ صوفی محمد کی آواز تھی' جو آزادیٔ وطن کے بعد ہمارے گاؤں سے تیرہ چودہ میل کے فاصلے پر چک نمبر ۳۶ گ ب (نزد ستیانہ بنگلہ) میں جا بسے تھے- اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے' نہایت نیک اور پرہیزگار بزرگ تھے' اور کوٹ کپورہ میں عیدین کے امام تھے-

گزشتہ دور کے لوگ مخلص' ملنسار' بلند اخلاق اور نہایت عالی کردار تھے- ایسے لوگ اب کہاں ملیں گے- جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں' یہ سیاست زدہ اور مادیت کے جراثیم سے بھرا ہوا دور ہے- اس میں اخلاص کی جگہ مطلب پرستی نے لے لی ہے اور اخلاق و کردار کی حسین قدروں کو بدنیتی کا گھن کھائے جا رہا ہے- میل جول اور تعلقات و معاملات کی اصل بنیاد مطلب اور ضرورت ہے- اگر کسی سے کوئی مطلب ہے اور کسی معاملے میں اس کی ضرورت پڑ گئی ہے تو وہ عزیز ہے' دوست ہے' رشتے دار ہے' ورنہ تم کون اور ہم کون-----!

صوفی محمد مرحوم کی آواز سن کر میں جلدی سے نیچے آیا' نہایت ادب کے ساتھ سلام عرض کیا اور اوپر اپنے کمرے میں تشریف لے جانے کی درخواست کی- کھانے اور چائے کے لیے عرض کیا-

انھوں نے فرمایا' وہ ٹمپل روڈ پر میاں محمد حسین کے ہاں گئے تھے اور اب وہیں سے آ رہے ہیں' کھانا وہیں کھایا تھا- میاں محمد حسین کوٹ کپورے کے رہنے والے تھے اور ہمارے پرانے دوست تھے' ٹمپل روڈ پر میاں چیمبر کے نام سے ان کے بیٹے میاں محمد یوسف کاروبار کرتے ہیں-

صوفی صاحب نے کہا: میں عبدالعزیز سے ملنا چاہتا ہوں' تم میرے ساتھ چلو'

عرض کیا: کون عبدالعزیز؟

فرمایا: قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے بیٹے---!

ان کا یہ فرمان سن کر میں نے ان سے چار باتیں عرض کیں-

ایک یہ کہ کئی مہینے ہوئے میں نے ان کا مکان دیکھا تھا' لیکن اب وہاں پہنچنا مشکل

ہے۔

دوسری یہ کہ مجھے کچھ پتا نہیں' ان کے کیا معمولات ہیں۔ رات کو جلدی سو جانے کے عادی ہیں یا دیر سے۔ اگر ان کا مکان تلاش کرنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو بہت دیر ہو جائے گی۔ ممکن ہے اس وقت تک وہ سو گئے ہوں یا سونے کی تیاری کر رہے ہوں۔

تیسری یہ کہ باہر سے ان کا مکان چھوٹا سا معلوم ہوتا تھا' معلوم نہیں' مہمانوں کو بٹھانے کے لیے کوئی الگ جگہ ہے یا نہیں۔

چوتھی بات یہ کہ وہ رات کو ہمیں دیکھ کر پریشان ہوں گے اور ان کے ذہن میں یہ بات آئے گی کہ ممکن ہے مہمان یہیں رات رہنا چاہتے ہوں' ان کے لیے سونے کا کیا انتظام کیا جائے۔

صوفی محمد پرانے دور کے بزرگ تھے۔ اس قسم کی باتوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ پہلی بات کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ تم لاہور میں رہتے ہو اور تمھیں اتنے بڑے آدمی کے مکان کا پتا نہیں۔ تم یہ بھی کہتے ہو کہ ایک دفعہ مکان دیکھا تھا۔ اگر ایک دفعہ دیکھا تھا تو اب دوسری دفعہ وہاں جانا کون سا مشکل کام ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ دیا کہ ہم انھیں ملنے جا رہے ہیں۔ اگر وہ سو بھی گئے تو جگا لیں گے۔ لوگ تو ان کے باپ کو جگا لیتے تھے' ہم بیٹے کو کیوں نہیں جگا سکتے۔

تیسری بات کا جواب یہ ارشاد فرمایا کہ چھوٹے مکانوں میں رہنے والوں کے ہاں بھی تو مہمان اور رشتے دار آتے جاتے ہیں اور وہ ان سے ملتے اور باتیں کرتے ہیں۔ جہاں وہ خود بیٹھتے ہیں' وہیں مہمانوں کو بٹھا لیتے ہیں۔

چوتھی بات کے متعلق فرمایا کہ وہ ہمیں دیکھ کر پریشان نہیں ہوں گے' خوش ہوں گے۔ ان کے والد بھی مہمانوں کی آمد پر خوش ہوتے تھے۔ یہ بھی باپ کی طرح خوش ہوں گے۔ ہم نے وہاں رہنا تو نہیں ہے' چند منٹ کی بات ہے' خیر و عافیت پوچھ کر واپس آ جائیں گے۔

صوفی محمد مرحوم کے مجبور کرنے پر میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ مکان کے محل وقوع کا تھوڑا بہت نقشہ ذہن میں محفوظ تھا' پندرہ بیس منٹ کے بعد ہم ان کے مکان کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ سوچ ہی رہے تھے کہ اوپر کیسے اطلاع دیں' اتنے میں مکان کی سیڑھیوں

سے آٹھ دس سال کی ایک بچی نیچے آئی۔

میں نے اس سے پوچھا: یہ قاضی عبدالعزیز کا مکان ہے؟

اس نے نہایت ادب سے جواب دیا: جی ہاں! انہی کا مکان ہے۔

پوچھا: قاضی صاحب مکان پر تشریف رکھتے ہیں؟

بچی نے اسی مودبانہ لہجے میں جواب دیا: جی ہاں---!

سوال کیا: سو تو نہیں گئے؟

بولی: سوئے نہیں جاگ رہے ہیں۔

میں نے بچی سے کہا: قاضی صاحب سے کہو' شیش محل روڈ سے دو آدمی آئے ہیں۔وہ آپ کو سلام کرنا چاہتے ہیں' زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے۔ سلام کر کے پانچ سات منٹ میں واپس چلے جائیں گے۔

دو یا تین منٹ کے بعد بچی نیچے آئی اور ہمیں اوپر لے گئی۔ ہم گئے تو قاضی صاحب سر پر کپڑا لیے اور گرم چادر اوڑھے پلنگ پر بیٹھے تھے۔ آثار سے معلوم ہوتا تھا کہ ہمارا پیغام پہنچنے کے بعد جلدی جلدی کپڑا لیا اور گرم چادر اوڑھی ہے۔ سیڑھیوں کے اوپر کا دروازہ کمرے میں کھلتا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور کمرہ تھا۔ ہم نے سلام عرض کیا تو قاضی صاحب نے کھڑے ہو کر بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور سلام کا جواب دیا۔ پلنگ کے ساتھ دو کرسیاں پڑی تھیں جو غالباً ہمارے جانے کی اطلاع پا کر رکھی گئی تھیں۔ ان کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: تشریف رکھیے۔

ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ قاضی صاحب سامنے پلنگ پر تشریف فرما تھے۔ پلنگ پر بستر بچھا ہوا تھا اور پائنتی کی طرف رضائی رکھی ہوئی تھی۔ میرے خیال میں ہمارے جانے سے پہلے وہ رضائی اوڑھے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ پلنگ کے ساتھ والی دیوار سے گڑی ہوئی کلی پر شیروانی لٹک رہی تھی۔

میں نے ان سے صوفی صاحب کا تعارف کرانے کے بعد عرض کیا کہ ایک مدت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی تمنا تھی' آج صوفی صاحب تشریف لائے تو یہ تمنا بر آئی۔

انھوں نے شکریہ ادا کیا اور خیر و عافیت پوچھی۔ بات چیت کا ایسا انداز اختیار فرمایا'

جیسے ہمارے انتظار میں بیٹھے ہوں۔

صوفی صاحب نے پنجابی میں ان سے کہا: تکڑے او- تندرست او- گھر دے سارے جی ٹھیک نیں۔

اس کے بعد صوفی صاحب خاموش ہوگئے اور میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بند ہیں اور وہ کرسی پر بیٹھے سو رہے ہیں۔

اتنے میں چاے اور بسکٹ آگئے اور میں نے صوفی صاحب کو جگایا کہ چاے پی لیں۔

اب قاضی صاحب میری طرف متوجہ ہوئے- فرمایا:

آپ نے صوفی صاحب کا تعارف تو کرادیا لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا- یہ وسط نومبر ۱۹۵۱ء کی بات ہے- اس وقت اخبار "الاعتصام" کے اجرا پر دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور میں اس سے منسلک تھا- اخبار قاضی صاحب کے ملاحظہ گرامی میں بھی آتا تھا۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ میں لاہور ہی میں رہتا ہوں اور جماعت اہل حدیث کے ہفت روزہ "الاعتصام" میں کام کرتا ہوں- ساتھ ہی بتایا کہ میرا وطنی تعلق کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) سے ہے۔

مشفقانہ لہجے میں فرمایا: بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر اور اس سے مزید خوشی ہوئی کہ آپ کا تعلق کوٹ کپورے سے ہے۔

صوفی صاحب کرسی پر سو رہے تھے اور قاضی صاحب اور اس فقیر کا سلسلہ گفتگو جاری تھا- قاضی صاحب نے بتایا کہ انھوں نے کسی زمانے میں "رحمۃ للعالمین" کا انگریزی ترجمہ کیا تھا- لیکن وہ ترجمہ پنجاب کی ایک معروف سیاسی شخصیت غلام بھیک نیرنگ نے لیا' پھر ان سے کہیں کھو گیا تھا یا یہ فرمایا کہ وہ تقسیم ملک کے دور میں دیگر کاغذات اور کتابوں کے ساتھ ضائع ہو گیا۔

گھنٹے سوا گھنٹے تک قاضی صاحب کے ساتھ ہماری نشست رہی- اجازت لے کر چلنے لگے تو ان کے صاحب زادے قاضی عبدالکبیر آگئے' ان سے گفتگو ہوئی تو پتا چلا کہ وہ علی آٹو میں کام کرتے ہیں- اس سے نو سال قبل ۱۹۴۲ء میں اورینٹل کالج کے ہاسٹل میں شب کو آٹھ بجے کے قریب ان سے ملاقات ہوئی تھی' انھیں تو اس کا پتا نہیں ہو گا لیکن مجھے یاد ہے اس وقت وہ کالج میں مولوی فاضل کی تیاری کر رہے تھے- میں بھی اسی سلسلے میں گیا تھا۔

ایک دوست (مولوی محمد افضل بوریوالہ) سے ملا تو انھوں نے بتایا کہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے پوتے عبدالکبیر بھی کالج میں داخل ہیں اور مولوی فاضل کا امتحان دینا چاہتے ہیں۔ وہ مجھے ان کے کمرے میں لے گئے اور چند منٹ ان سے باتیں ہوئیں۔

اب نو سال کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے ساتھ ہی نیچے اترے اور باتیں کرتے کرتے دور تک چھوڑنے آئے۔ دبلے پتلے گورا رنگ' داڑھی مونچھ صاف' میانہ سا قد' تیکھے نقوش' سفید لٹھے کا پاجامہ اور کالی شیروانی پہنے ہوئے۔ یہ ان کا اس وقت کا حلیہ اور لباس تھا۔ اب تو ماشاءاللہ ان کی حالت بالکل بدلی ہوئی ہے اور داڑھی کے طول و عرض میں اتنا غیر معمولی پھیلاؤ آگیا ہے کہ اس نے چہرے کے تمام رقبے کو گھیر لیا ہے۔

قاضی عبدالعزیز سے ملاقات میرے لیے انتہائی مسرت اور اہمیت کی حامل تھی' دوسرے دن میں نے مولانا داؤد غزنوی' مولانا محمد حنیف ندوی اور مولانا عطاءاللہ حنیف سے اس کا ذکر کیا۔ ان میں سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ علامہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے صاحب زادے قاضی عبدالعزیز لاہور میں سکونت پذیر ہیں۔ انھوں نے یہ خبر سن کر تعجب کا اظہار کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کا سلام پہنچاؤں اور عرض کروں کہ یہ حضرات ان سے ملاقات کے متمنی ہیں اور ان سے یہ معلوم کروں کہ وہ کس دن اور کس وقت ملنا پسند فرمائیں گے۔ چنانچہ میں دوبارہ ان کے در دولت پر حاضر ہوا اور ان کا سلام پہنچایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور میرے لیے ''شکریہ'' کا لفظ استعمال فرمایا جو اس فقیر پر ان کی بہت بڑی شفقت اور مہربانی کا پہلو لیے ہوئے تھا۔

فرمایا: بے شک آج ہی تشریف لے آئیں۔ وہ جب بھی آئیں گے' مجھ پر احسان کریں گے۔

دراصل قاضی عبدالعزیز کم آمیز' کم گو' متانت پسند اور گوشہ گیر قسم کے اہل علم تھے۔ کہیں آنے جانے اور گھومنے پھرنے کی انھیں عادت نہ تھی۔ جو صاحب ان کے گھر آئے' ان سے بہت اچھی طرح ملے اور انتہائی احترام سے پیش آئے۔ لیکن میرا خیال ہے' خود کم ہی کسی کے ہاں گئے ہوں گے۔

دوسرے دن مندرجہ ذیل حضرات ان کے پاس گئے۔ اسمائے گرامی تاریخ ہائے وفات کی ترتیب سے ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) صوفی نذیر حسین: اس وقت مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب صدر تھے۔ قاضی

محمد سلیمان منصور پوری کے خاص معتقدین میں سے تھے- قاضی عبدالعزیز کو بھائی جان کہا کرتے تھے-دراصل امرتسر کے رہنے والے تھے- آزادیٔ وطن کے بعد گوجرانوالہ چلے گئے تھے اور وہیں کاروبار شروع کر دیا تھا- کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے- لفظ "صوفی" کشمیریوں کی ایک "گوت" کے لیے بولا جاتا ہے----۲۷-فرروی ۱۹۵۴ء کو فوت ہوئے-

(۲) مولانا سید محمد داؤد غزنوی: ۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو وفات پائی-

(۳) مولانا محمد اسماعیل: مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم اعلیٰ تھے- مولانا غزنوی کی وفات کے بعد اس کے امیر منتخب کیے گئے-۲۰ فروری ۱۹۶۸ء کو انتقال ہوا-

(۴) حاجی محمد اسحاق حنیف: اصلاً امرتسر سے تعلق رکھتے تھے- مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن تھے-۸ ستمبر ۱۹۶۹ء کی صبح کو لارنس روڈ پر اپنی گاڑی میں ڈرائیور سیٹ پر مردہ پائے گئے- وجہ قتل کا آج تک پتہ نہ چل سکا-

(۵) مولانا محمد حنیف ندوی: ۱۲ جولائی ۱۹۸۷ء کو رحلت فرمائی-

(۶) مولانا عطاء اللہ حنیف: ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو سفر آخرت اختیار کیا-

(۷) میاں عبدالمجید: مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم مالیات تھے- تاریخ وفات ۲۲ جون ۱۹۹۲ ہے-

(۸) راقم الحروف محمد اسحاق بھٹی: آج ۴ نومبر ۱۹۹۸ء کو جب کہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، زندہ ہے-

قاضی صاحب ہمیں دیکھ کر انتہائی خوش ہوئے-مکان بے شک چھوٹا تھا، لیکن مکین کا دل بڑا تھا-اس گنہگار کے سوا سب مہمانوں کو معزز کہنا چاہیے، جن کی انھوں نے بڑی تواضع کی اور آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی بعض علمی و فکری مساعی زیر بحث آئیں- رحمۃ للعالمین کا انگریزی ترجمہ بالخصوص ہدف گفتگو رہا اور اس کی گم شدگی کا واقعہ بھی زیر بحث آیا-

اس مجلس میں قاضی صاحب کے بڑے صاحب زادے قاضی عبدالباقی بھی موجود تھے اور ان سے پہلی دفعہ وہیں تعارف ہوا تھا-

گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی یہ مجلس بڑی دلچسپ رہی- اس کے بعد ہم لوگ مولانا داؤد غزنوی کے ساتھ ان کے مکان پر چلے گئے- وہاں فیصلہ ہوا کہ "رحمۃ للعالمین ٹرسٹ" قائم کیا جائے- اس کے لیے ضروری انتظامات کی ذمہ داری میاں عبدالمجید، حاجی محمد اسحاق حنیف

اور صوفی نذیر حسین نے قبول کی۔

اس موقعے پر یہ بھی طے پایا کہ ''الاعتصام'' کی آئندہ اشاعت میں ''رحمۃ للعالمین ٹرسٹ'' کے عنوان سے مضمون لکھا جائے۔ مضمون لکھنے کی ذمہ داری اس فقیر پر ڈالی گئی۔ اس زمانے میں مولانا محمد حنیف ندوی ''الاعتصام'' کے ایڈیٹر اور میں معاون ایڈیٹر تھا۔ چنانچہ میں نے مضمون لکھا جو ''الاعتصام'' کے ۳۰ نومبر ۱۹۵۱ء (۲۹ صفر ۱۳۷۱ھ) کے شمارے میں بصورت اداریہ شائع ہوا۔

یہاں یہ عرض کر دوں کہ رحمۃ للعالمین ٹرسٹ قائم ہوا' اس کی چند میٹنگیں بھی میاں عبدالمجید مرحوم کے مکان پر ہوئیں' لیکن افسوس ہے ٹرسٹ کی طرف سے کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو سکا۔

قاضی عبدالعزیز ۱۸۸۷ء میں منصور پور (ریاست پٹیالہ) میں پیدا ہوئے۔ دینیات کی تعلیم گھر میں اپنے والد محترم قاضی محمد سلیمان منصور پوری سے حاصل کی۔ میٹرک پٹیالہ کے ہائی سکول سے پاس کیا۔ ایف اے ۱۹۰۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ۱۹۰۷ء میں بی اے کی سند لی۔ پڑھنے میں بڑے تیز تھے اور سکول و کالج کے ذہین طلبا میں شمار ہوتے تھے۔

قاضی عبدالعزیز مرحوم نے سکھ ریاست میں جنم لیا اور وہیں نشوونما پائی۔ ان کے والد (علامہ قاضی محمد سلیمان منصورپوری) اس ریاست میں سیشن جج کے منصب پر فائز تھے۔ علاوہ ازیں وہ بعض انتظامی مناصب پر بھی متمکن رہے تھے۔ ریاستوں کا ماحول انگریزی علاقے سے بالکل مختلف تھا۔ نواب اور راجے مہاراجے اپنی اپنی ریاستوں کے مالک کی حیثیت رکھتے تھے۔ برصغیر میں پانچ سو چھپن ریاستیں تھیں' جن میں سے بعض بڑی اور بعض چھوٹی تھیں۔ کشمیر' بہاول پور' حیدر آباد (دکن) رام پور' بھوپال' گوالیار' پٹیالہ اور چند دیگر ریاستوں کا شمار بڑی ریاستوں میں ہوتا تھا' جب کہ بھدوڑھ' مالیر کوٹلہ' منڈی' کلسیہ' کپورتھلہ' فرید کوٹ' نالاگڑھ کی ریاستیں چھوٹی تھیں۔ لیکن تمام ریاستوں کے حکمرانوں کے تیور ایک سے تھے۔ ایک سی مغرورانہ نفسیات اور ایک سی متکبرانہ ذہنیت۔ کسی ریاست میں سیاست کرنے اور حکمران کو نشانہ تنقید بنانے کی اجازت نہ تھی۔ اگر کسی ریاست کا کوئی شخص سیاسیات میں حصہ لینے کا شائق ہوتا تو وہ اپنا یہ شوق حدود ریاست سے باہر انگریزی علاقے

میں جا کر پورا کرتا---- انگریزی علاقہ اس علاقے کو کہا جاتا تھا جو براہِ راست انگریزی حکومت کے ماتحت تھا۔

ریاست کے اہل کاروں کے بیٹے عام طور پر اپنی ریاست ہی میں کوئی ملازمت اختیار کر لیتے تھے۔ لیکن قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے بیٹے نے تعلیم سے فراغت کے فوری بعد ریاست پٹیالہ میں ملازمت کے لیے کوشش نہیں کی۔ وہ تحریر و نگارش کے شائق تھے اور علی گڑھ کے کھلے ماحول اور وہاں کی تعلیمی فضا میں ان کا ذہن بہت حد تک بدل گیا تھا‘ اس لیے انھوں نے بی اے کی سند حاصل کرتے ہی صحافت کی وادی میں قدم رکھا اور صحافت بھی وہ جو برطانوی حکومت سے متصادم تھی۔

کچھ عرصہ وہ لکھنؤ کے مشہور اخبار ''اودھ پنچ'' کے عملہ ادارت کے رکن رہے۔ اس اخبار میں سیاست کا گزر زیادہ نہ تھا‘ ادبی‘ اور مزاحیہ قسم کا اخبار تھا‘ اور مزاحیہ انداز میں سیاسی مسائل پر اظہار رائے کیا جاتا تھا۔

اس کے بعد عازم کلکتہ ہوئے۔ وہاں سے ایک اخبار ''صداقت'' کے نام سے جاری تھا‘ اس سے وابستہ ہو گئے۔ اس میں سیاست کی آمیزش تو تھی‘ مگر زیادہ نہ تھی۔

پھر جلد ہی ایک وقت آیا کہ مولانا محمد علی جوہر سے ان کا رابطہ قائم ہو گیا اور انھیں اخبار ''ہمدرد'' کے ادارتی عملے میں شامل کر لیا گیا۔ ''ہمدرد'' کا پہلا شمارہ ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء کو دہلی سے شائع ہوا تھا‘ لیکن ۳۱ مئی (تین مہینے سے کچھ اوپر) تک یہ اخبار ایک ورقہ یا دو ورقہ چھپتا رہا۔ یکم جون ۱۹۱۳ء سے یہ پوری آب و تاب اور خاص حجم و ضخامت کے ساتھ مطلع صحافت پر نمودار ہوا۔ اس کے عملہ ادارت کی جو فہرست ملا واحدی نے اپنی تصنیف ''میرے زمانے کی دلی'' میں دی ہے‘ اس میں قاضی عبدالغفار‘ عارف ہسوی‘ قاری عباس حسین‘ محمد فاروق گورکھ پوری اور قاضی عبدالعزیز کے نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

ضیاء الدین ''عظمت رفتہ'' میں لکھتے ہیں کہ ''ہمدرد'' میں علی گڑھ کے اولڈ بوائے محمد فاروق ایم اے گورکھ پوری اور قاضی عبدالعزیز منصور پوری لائے گئے---- یہ ''ہمدرد'' کے دورِ اول کی بات ہے۔ یہ دور دو سال پر محیط ہے۔ جو جون ۱۹۱۳ء سے شروع ہو کر جون ۱۹۱۵ء تک چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ دورِ اول کے ''ہمدرد'' نے صرف دو سال عمر پائی جس میں قاضی عبدالعزیز منصور پوری اس کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔

ہمدرد کے دوسرے دور کا آغاز نومبر ۱۹۲۴ء سے ہوتا ہے اور اپریل ۱۹۲۹ء میں یہ دور اختتام کو پہنچ جاتا ہے۔اس دور میں قاضی عبدالعزیز عملہ ہمدرد میں شامل نہیں تھے۔اس وقت وہ پٹیالہ میں انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر متمکن تھے۔

مولانا محمد علی جوہر بہت بڑے سیاسی رہنما' نہایت دلیر صحافی' پرجوش مقرر اور انگریزی حکومت کے سخت حریف تھے۔ان کے انگریزی اخبار "کامریڈ" اور اردو اخبار "ہمدرد" نے بڑی شہرت پائی---زبان کا نکھار' اسلوب بیان کا طنطنہ' دلائل کی قوت' ادبیت کا زور' الفاظ کا تسلسل' طرز کلام کی بوقلمونی اور قلم کی گرفت ان کے وہ اوصاف تھے جن کی جھلک ان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے میں نمایاں تھی اور اسی وجہ سے یہ اخبار مخالف و موافق ہر حلقے میں انتہائی شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ان اخباروں نے عمر بے شک تھوڑی پائی' لیکن مقبولیت بہت حاصل کی۔

مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ وہی لوگ کام کر سکتے تھے اور کرتے تھے جو ان کے عمل و فکر سے متفق تھے' اور زبان کے تیوروں سے آگاہ تھے' جن کا ذہن انگریز کی مخالفت کی آماجگاہ تھا اور جن کے قلم کا تیکھا پن مخالف کے نقطہ نظر کو مجروح کرنے کی پوری طاقت رکھتا تھا۔مولانا محمد علی سے قاضی عبدالعزیز کی رفاقت اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ ان میں وہ تمام اوصاف موجود تھے' جو محمد علی کو مطلوب تھے اور جن کا ہمدرد کی مجلس ادارت کے کسی رکن میں پایا جانا اس وقت ضروری سمجھا جاتا تھا۔

ایک روایت کے مطابق قاضی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ "الہلال" (یا البلاغ) میں بھی کچھ عرصہ کام کیا۔مولانا آزاد کا معیار انتخاب رجال مولانا محمد علی سے بھی اونچا تھا۔وہ انگریزی کے ساتھ عربی اور فارسی کو بھی ضروری قرار دیتے تھے' اور قاضی صاحب ان زبانوں کے نشیب و فراز سے آگاہ تھے۔یعنی وہ اردو' انگریزی' عربی' فارسی چاروں زبانوں میں دسترس رکھتے تھے' اور اس زمانے کی اس صحافت کے لیے جسے مولانا محمد علی اور مولانا آزاد نے رواج دیا تھا' ان زبانوں کا جاننا ضروری تھا۔

اس کے بعد حالات نے ایک اور کروٹ لی اور وہ اپنے وطن پٹیالے واپس آگئے اور اپنے آبائی علاقے کے لوگوں کی خدمت کا فیصلہ کر لیا۔مہاراجا پٹیالہ نے ان کے علم و قابلیت کے مطابق ان سے برتاؤ کیا اور انھیں ریاست کے انسپکٹر آف سکولز کا منصب عطا کیا جو ان کی

شان کے عین مطابق تھا۔

پٹیالہ میں انھوں نے بڑا کام کیا اور نہایت اہم خدمات سر انجام دیں۔ مثلاً ''انجمن خادم الناس'' قائم کی' جس کا مقصد بلا امتیاز مذہب و ملت لوگوں کی علمی اور اخلاقی اصلاح کرنا' معاشرے کو بہتر اقدار سے روشناس کرانا اور عوام و خواص کو صاف ستھرے عمل و کردار کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ اس انجمن کا نام خالص عربی انداز کا ہے اور اس سے ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس کا مقصد' محض مسلمانوں کی اصلاح ہوگا۔ بے شک اس میں یہ مقصد بھی پنہاں تھا' اور نام کی وجہ سے اور قاضی صاحب کی وجہ سے اس سے زیادہ دلچسپی مسلمان ہی لیتے تھے' لیکن عملی اعتبار سے اس کا میدان تنگ و تاز وسیع تھا اور مسلمان و غیر مسلم اس کے منصوبوں سے یکساں مستفید ہوتے تھے۔

پٹیالہ میں قاضی صاحب نے ایک مسلم ہائی سکول قائم کیا۔ اس سکول نے بڑی کامیابی حاصل کی اور اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں بالخصوص تعلیم کا جذبہ ابھرا اور عام ہوا۔ اس سکول کا معیار تعلیم اتنا اونچا تھا کہ غیر مسلم لڑکے بھی اس میں داخلہ لیتے اور نہایت شوق سے تعلیم پاتے تھے۔ قاضی صاحب کے بیٹوں نے بھی میٹرک تک اسی سکول میں تعلیم حاصل کی۔

اپنے محلے کی مسجد میں قاضی عبدالعزیز صاحب خطبہ جمعہ باقاعدہ ارشاد فرماتے تھے' جس میں پٹیالہ کے پڑھے لکھے لوگ خاص طور سے شامل ہوتے تھے۔

قاضی صاحب شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ طالب علمی کے ابتدائی زمانے ہی میں وہ شعر کہنے لگے تھے۔ علی گڑھ کے دوران قیام میں یہ ذوق مزید نکھر گیا تھا۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ پتا چلا ہے کہ زرعی یونیورسٹی (فیصل آباد) کے ایک استاد نے ''سہ آتشہ'' کے نام سے ایک شعری مجموعہ ترتیب دیا تھا۔ اس مجموعے میں قاضی عبدالعزیز کی ایک نظم بھی شامل ہے۔ یہ نظم لارڈ ٹینی سن کی ایک انگریزی نظم کا' جو عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے متعلق ہے' منظوم ترجمہ ہے-------ان کے بہت سے اشعار ان کے صاحب زادے قاضی عبدالباقی کے پاس ایک رجسٹر میں محفوظ ہیں۔ اس رجسٹر کو ہم قاضی صاحب کی ''بیاض'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری کو متحدہ ہندوستان کے اکثر تبلیغی و اصلاحی

جلسوں میں دعوت شرکت دی جاتی تھی اور وہ ان جلسوں میں تشریف لے جاتے اور تقریر کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد بعض لوگ ان کے فرزند گرامی قدر قاضی عبدالعزیز کو بلانے لگے۔ اس ضمن میں ایک مرتبہ مولانا عبداللہ گورداس پوری (خطیب جامع مسجد اہل حدیث بورے والا) نے بتایا کہ بٹالہ (ضلع گورداس پور) کی انجمن خادم المسلمین کا قیام ۱۹۲۸ء میں حضرت قاضی محمد سلیمان کے حکم سے عمل میں آیا تھا اور اس کا تبلیغی جلسہ بالالتزام ہر سال منعقد ہوتا تھا، جس میں حضرت قاضی صاحبؒ شمولیت فرماتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد انجمن کا جو پہلا جلسہ ہوا، اس میں قاضی عبدالعزیز کی خدمت میں دعوت نامہ بھیجا گیا، وہ اپنے والد محترم کی جگہ تشریف لائے اور تقریر کی۔ دوسرے سال کے جلسے میں بھی انھوں نے شرکت فرمائی ----- عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عالی قدر باپ کی وفات کے بعد قاضی عبدالعزیز نے تبلیغ و اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا۔

پٹیالہ کے ایک صاحب نے جو تقسیم ملک کے بعد گوجرانوالہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، ایک مرتبہ بتایا کہ قاضی عبدالعزیز کے لکھنے پڑھنے کا عجیب معاملہ تھا۔ اگر لکھنے بیٹھے ہیں تو لکھتے ہی جا رہے ہیں، نہ رکنے کا نام لیتے ہیں نہ آرام کا ----- کئی کئی گھنٹے مسلسل قلم چل رہا ہے۔ اگر کسی کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا ہے تو اس میں منہمک ہو گئے ہیں، کہیں رکاوٹ یا ٹھہراؤ نہیں۔ لیکن اگر قلم رکھ دیا ہے یا کتاب بند کر دی ہے تو پھر آرام ہی آرام ہے۔ کئی کئی دن بلا لکھنے پڑھنے کے گزر جاتے ----- دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مغل حکمران نصیر الدین محمد ہمایوں جیسا معاملہ تھا۔ اگر وہ لڑنے پر آیا ہے تو کئی کئی مہینے میدان جنگ میں گزار دیے ہیں، اگر گھر میں بیٹھ گیا ہے تو باہر نکلنے کا نام نہیں لیتا۔

یوں بھی لکھنے پڑھنے والے کا مزاج شاہانہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات چھوٹی سی بات کو بڑی سمجھ لیتا ہے اور بعض دفعہ بڑی سے بڑی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔

آزادیٔ وطن کے بعد قاضی صاحب پاکستان آ گئے۔ کچھ عرصہ اپنے بڑے صاحب زادے قاضی عبدالباری کے پاس راولپنڈی رہے۔ بعد ازاں لاہور کا عزم کیا اور سنت نگر کے علاقے میں ایک چھوٹے سے مکان میں سکونت پذیر ہو گئے۔ تین سال سے کچھ زیادہ مدت یہ مکان ان کا مسکن رہا ----- ۱۹۵۳ء کے مارچ میں وہ گارڈن ٹاؤن کی کوٹھی نمبر ۵ میں منتقل ہوئے۔ یہ کوٹھی فیروز پور روڈ پر واقع تھی۔

اس کوٹھی میں بارہا میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا- لیکن اب افسوس ہوتا ہے کہ کبھی ان کے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہ کی اور ان کے دور گزشتہ کے واقعات معلوم کرنے کی طرف دھیان نہ گیا' حالانکہ یہ میری دلچسپی کا موضوع تھا-

وہ بڑے متحمل مزاج' بلند ہمت اور خوش اطوار و عالی کردار شخص تھے- علم و تحقیق کی آغوش میں تربیت کی منزلیں طے کیں- اپنے عہد کی عظیم شخصیتوں کے ساتھ انھیں کام کرنے کے مواقع ملے اور ملک و قوم کی بڑی خدمت کی-

لیکن انسانی زندگی عارضی ہے- ہمیشہ رہے نام اللہ کا- اتوار کا دن تھا اور تاریخ ۲۶ اگست ۱۹۵۶ء (قمری حساب سے ۱۸ محرم ۱۳۷۶ھ تھی) کہ قاضی عبدالباقی کا ٹیلی فون آیا- اطلاع دی کہ آج والد گرامی قاضی عبدالعزیز وفات پا گئے ہیں- انھوں نے فرمایا کہ میں مولانا داؤد غزنوی سے عرض کروں کہ نماز جنازہ وہی پڑھائیں گے- چنانچہ میں نے مولانا کو ان کا پیغام دیا اور ہم ان کے مکان پر پہنچے- نماز عصر کے بعد ان کی کوٹھی (نمبر ۵) گارڈن ٹاؤن میں ان کا جنازہ مولانا غزنوی نے پڑھایا اور ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں انھیں دفن کر دیا گیا-

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَ ارْحَمْہُ وَ عَافِہٖ وَ اعْفُ عَنْہُ

ان کی وفات کی اطلاع ہمیں اس وقت پہنچی تھی جب ''الاعتصام'' کا ۳۱ اگست ۱۹۵۶ء کا شمارہ طباعت کے لیے پریس بھجوایا جا رہا تھا- اسی وقت میں نے تعزیتی شذرہ لکھا جو ۳۱ اگست کے الاعتصام کے صفحہ ۳ پر شائع ہوا- الاعتصام کا یہ شمارہ لکھنو میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے مطالعے میں آیا تو انھوں نے ''الاعتصام'' کے حوالے سے اپنے ہفت روزہ ''صدق جدید'' میں قاضی صاحب پر شذرہ تحریر فرمایا اور ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ وہ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ''ہمدرد'' کے عملہ ادارت میں شامل تھے اور اپنے دور کے منجھے ہوئے محنتی صحافی تھے-

قاضی صاحب کی اولاد نرینہ چار بیٹے ہیں-

۱- بڑے بیٹے کا نام قاضی عبدالباقی ہے اور پھر ان کے چار بیٹے ہیں- سلمان سعید' احمد رشید' فاروق حمید' شاہد فرید- قاضی عبدالباقی نے رحمۃ للعالمین کی تینوں جلدوں کا انگریزی ترجمہ مکمل کر دیا ہے- یہ بہت بڑی خدمت ہے جو انھوں نے سر انجام دی-

۲- ان سے چھوٹے قاضی عبدالباری ہیں' ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں' بیٹیاں ہیں-

۳- ان سے چھوٹے قاضی عبدالکبیر ہیں' ان کی صرف ایک بیٹی ہے-

۴- سب سے چھوٹے قاضی حسن معزالدین ہیں' ان کے دو بیٹے ہیں-

قاضی عبدالعزیز منصور پوری کے تمام بیٹے بیٹیاں اور نواسے نواسیاں ماشاءاللہ تعلیم یافتہ' مہذب اور خوش اطوار و خوش اخلاق ہیں-

اللہ ان سب کو خوش رکھے اور ان کے دینی و دنیوی معاملات میں برکت پیدا فرمائے- آمین

ان کے چاروں بیٹوں کا ان شاءاللہ شخصیات کے کسی مجموعے میں الگ الگ تعارف کرایا جائے گا-

# مولانا محمد صدیق لائل پوری

۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں ہم اپنے موجودہ گاؤں میں جا کر آباد ہوئے تھے۔ ضلع فیصل آباد کی تحصیل سمندری میں ایک گاؤں چک نمبر ۴۷۲ گ ب جھوک دادو کے نام سے موسوم ہے جو تاندلیاں والا سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہاں ایک بزرگ میاں محمد باقر فروکش تھے۔ وہ استاذ پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد تھے اور نہایت متدین اور متقی عالم دین تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے' بڑے بیٹے کا نام حافظ محمد زکریا تھا۔۔۔۔ ۴۱-۱۹۴۲ء میں وہ گوجرانوالہ میں حضرت حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے حلقہ شاگردی میں شامل تھے' اس وقت میں بھی وہاں تعلیم حاصل کرتا تھا اور حافظ محمد زکریا کا ہم جماعت تھا۔

تقسیم ملک کے بعد ہم اپنے نئے گاؤں میں آئے تو پتا چلا کہ حافظ محمد زکریا کا گاؤں یہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر ہے۔ چنانچہ ان سے ملاقات کے لیے میں ایک دن وہاں پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے اور تعجب سے پوچھا: تم یہاں کیسے آ گئے؟

میں نے ان کو بتایا کہ ہم نے جڑانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں ڈیرے ڈال لیے ہیں۔۔۔۔

یہ شام کے بعد کا واقعہ ہے۔

دوسرے دن طلوع آفتاب سے کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ ایک صاحب نہایت سنجیدہ شکل بنائے' مسجد کے صحن میں سورج کی جانب رخ کیے' آلتی پالتی مارے دھوپ میں بیٹھے ہیں۔۔۔۔ یہ پچاس برس قبل کی بات ہے' لیکن ان کی اس وقت کی ہیئت کذائی' اسلوب نشست اور حلیہ اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔۔۔۔ سیاہ داڑھی اور اس زمانے کے عام رواج کے مطابق کلے پر سفید طرے دار پگڑی' سفید لٹھے کا تہبند' قمیص کے اوپر سویٹر' بھرا ہوا گول چہرہ' کھلی ہڈی پسلی کا گداز جسم' تیکھی ناک' کشادہ پیشانی' روشن آنکھیں' چھبیس ستائیس سال کی عمر کا متناسب الاعضا جوان۔

پتا چلا کہ ان کا نام مولانا محمد صدیق ہے۔ یہاں سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کا نام "کرپالا" ہے‘ یہ اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں اور اس گاؤں کی طرف نسبت کر کے انھیں مولانا محمد صدیق کرپالوی کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر یہاں (میاں محمد باقر کے قائم کردہ مدرسے میں) تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں۔ اب یہاں مدرس کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں‘ صبح کے وقت روزانہ کرپالا سے آتے ہیں اور طلبا کو پڑھا کر واپس چلے جاتے ہیں۔

یہ پہلا دن تھا کہ میں نے مولانا محمد صدیق کرپالوی کو دیکھا‘ جنھیں اس سے کئی سال بعد مولانا محمد صدیق لائل پوری کہا جانے لگا۔ اس دن نہ میں نے ان سے کوئی بات کی‘ نہ انھوں نے مجھ سے مخاطب ہونے کی ضرورت محسوس کی۔ انھوں نے اجنبی سمجھ کر مجھے غور سے دیکھا‘ میں نے بھی ان کو اچھی طرح دیکھا اور ان کا پورا سراپا میری نظروں میں سما گیا‘ ----- میرا خیال ہے‘ ہم نے ایک دوسرے کو سلام بھی نہیں کیا۔ وہ طلبا کو پڑھا رہے تھے کہ میں وہاں سے چل پڑا۔

اب آئندہ سطور میں مولانا محمد صدیق کے واقعات و حالات سے آگاہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں-----

سنا ہے ان کے آباواجداد کا اصل تعلق ضلع جھنگ سے تھا‘ وہاں ان کے والد یا دادے پر قتل کا مقدمہ قائم ہوا اور اس کے نتیجے میں نقل مکانی کر کے یہ سارا خاندان تاندلیاں والا کے قریب موضع کرپالا میں مقیم ہو گیا۔ کرپالا میں انھوں نے اچھی خاصی زمین خریدی اور علاقے کے صاحب حیثیت لوگوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

مولانا کے والد کا نام چوہدری سردار علی تھا اور وہ اپنے گاؤں کرپالا کے نمبردار تھے۔ مسلکی اعتبار سے شیعہ تھے اور اس گاؤں میں زیادہ آبادی شیعہ حضرات کی تھی۔ اہل سنت سے ان کے مناظروں اور مباحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

مولانا محمد صدیق ۴ فروری ۱۹۲۱ء کو کرپالا میں پیدا ہوئے اور والدین نے ان کا نام صادق علی رکھا----- بعد میں انھوں نے اپنے مطالعے کی روشنی میں شیعیت ترک کر دی اور خود ہی اپنا نام محمد صدیق رکھ لیا۔ اسی اثنا میں دل میں مزید حصول علم کا جذبہ ابھرا۔ جیسا کہ پہلے بتایا گیا میاں محمد باقر مرحوم کا گاؤں ان کے گاؤں کے بالکل قریب تھا اور وہاں میاں

صاحب کا دینی مدرسہ بھی تھا' اس میں محمد صدیق تعلیم حاصل کرنے لگے۔ کچھ درسی کتابیں میاں محمد باقر مرحوم سے پڑھیں۔ ان کے علاوہ ایک بزرگ مولوی دین محمد سے شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں پڑھیں جو اس زمانے کے دینی مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں ---- علم صرف کی بعض کتابوں کی تکمیل بھی انہی سے کی' جن میں فصول اکبری اور شافیہ شامل ہیں۔ علم نحو کی کتاب شرح جامی بھی مولوی دین محمد سے پڑھی۔

آزادیٔ وطن سے قبل حضرت مولانا حافظ عبداللہ بڈھیمالوی چک نمبر ۴۲۷ جھوک دادو میں خدمت تدریس سر انجام دیتے تھے۔ ان سے حدیث و فقہ اور دیگر علوم مروجہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی سے بھی مستفید ہوئے' ان سے قبل از آزادیٔ وطن اوڈانوالہ میں کتب حدیث پڑھیں۔ اس زمانے میں مولانا عبدالقادر ندوی (صدر دارالعلوم تعلیم الاسلام ماموں کانجن) ان کے ہم درس تھے۔

یہ وہ دور تھا جب حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی فارغ التحصیل طلبا کو دورۂ تفسیر کراتے تھے' مولانا محمد صدیق ان کی خدمت میں سیالکوٹ گئے اور ان کے حضور دورۂ تفسیر مکمل کیا ---- مولانا سیالکوٹی سے متعلق وہ کچھ واقعات بھی بیان کیا کرتے تھے' جو مولانا سیالکوٹی کے حالات میں بیان کیے گئے ہیں۔

آزادی کے بعد حضرت مولانا شرف الدین دہلوی پاکستان تشریف لے آئے تھے۔ کچھ عرصہ وہ میاں محمد باقر کے مدرسے میں چک نمبر ۴۲۷ جھوک دادو بھی رہے تھے' ان دنوں مولانا محمد صدیق نے ان سے دوبارہ حدیث کی کتابیں پڑھیں ---- اس طرح انھوں نے درس نظامی کی تمام کتابیں جید اساتذہ سے پڑھیں اور مروجہ نصاب مکمل کیا۔

تکمیل تعلیم کے بعد وہ تاندلیاں والا میں پڑھاتے رہے اور خطبہ جمعہ بھی دیتے رہے۔ بہت اچھے مدرس اور بہت اچھے خطیب و مقرر تھے۔

میرا ان سے تعارف مرکزی جمعیت اہل حدیث کے قیام (جولائی ۱۹۴۸) کے بعد ہوا۔ پہلی دفعہ میں نے ان کو نہایت سنجیدگی کے عالم میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن جب ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور انھیں قریب سے دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کے مواقع میسر آئے تو پتا چلا کہ وہ نہایت ہنس مکھ' انتہائی دلچسپ اور بہت ہی بے تکلف آدمی ہیں۔ "حقیقی سنجیدگی" کا ان کے ہاں کوئی عمل دخل نہیں ہے' وہ پہلی سنجیدگی "مصنوعی سنجیدگی" یا

"استادی سنجیدگی" تھی جو شاگردوں کے سامنے "استاد" کی حیثیت سے اختیار کر رکھی تھی۔

ان کی خطابت اور تقریر کی بڑی شہرت تھی' وہ حاضر جواب مناظر بھی تھے اور شیعہ حضرات کے بعض اہل علم سے ان کے کئی مناظرے ہوئے۔ کتب شیعہ پر ان کی گہری نظر تھی اور اہل سنت اور شیعہ کے اختلافی مسائل سے وہ خوب آگاہ تھے۔ شیعی مسلک کے ایک عالم مولانا محمد اسماعیل تھے جو گوجرہ (ضلع فیصل آباد) کے رہنے والے تھے اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے' اس لیے انھیں مولانا محمد اسماعیل دیوبندی کہا جاتا تھا۔ ان سے مولانا محمد صدیق کی بحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

شیعہ مسلک کی بہت سی کتابیں مولانا صدیق کے پاس موجود تھیں۔ جس نئی کتاب کا انھیں پتا چلتا کہ کسی اور ملک سے چھپ کر آئی ہے وہ اسے خریدنے کے لیے بے تاب ہو جاتے۔ غالباً ۱۹۶۱ کی بات ہے جون کا مہینا تھا' شدید دھوپ میں دوپہر کے وقت وہ میرے پاس شیش محل روڈ پر دفتر "الاعتصام" میں آئے۔ اس گرم موسم اور گرم وقت میں انھیں دیکھ کر میں سخت حیران ہوا----- ان کے چہرے پر عام طور سے مسرت لہراتی اور ہنسی مچلتی رہتی تھی' اپنے انداز خاص سے ہنستے ہوئے کہا اٹھو' ایک ضروری کام ہے' میرے ساتھ چلو-----



عرض کیا: بیٹھیے' پانی پیجیے' کچھ آرام فرمایے اور آرام سے کام کی نوعیت بیان کیجیے۔

بولے: کام کی نوعیت راستے میں بتاؤں گا۔ اب تم کھڑے ہو جاؤ۔

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ موچی دروازے کے اندر فلاں نام کے ایک شیعہ عالم سکونت پذیر ہیں' چند روز پیشتر وہ ایران سے ہو کر آئے ہیں اور اپنے مسلک کی بہت سی کتابیں لائے ہیں جو قابل فروخت ہیں۔ میں وہ کتابیں خریدنا چاہتا ہوں' ایسا نہ ہو کہ کوئی اور خرید لے یا وہ صاحب لاہور سے کسی اور جگہ چلے جائیں۔ چنانچہ ہم موچی دروازے میں ان کے مکان پر پہنچے۔ اس وقت ڈیڑھ بجا تھا اور سخت دھوپ تھی۔ گھنٹی بجائی' وہ باہر آئے۔ میں نے مولانا محمد صدیق کا تعارف کرایا اور اپنے بارے میں بتایا اور اس وقت حاضر ہونے اور انھیں زحمت دینے کی وجہ بیان کی اور معذرت بھی چاہی----- وہ اتفاق سے غائبانہ طور پر ہم دونوں کو جانتے تھے۔ نہایت خوش ہوئے' شربت پلایا اور کتابیں دکھائیں۔ کچھ کتابیں مولانا نے خریدیں اور ہم ان کا شکریہ ادا کر کے ان کے گھر سے نکل

آئے۔

اس وقت یہ لطیفہ بھی ہوا کہ میں نے باہر آکر مولانا سے ہنستے ہوئے کہا کہ سنا ہے شیعہ حضرات اہل سنت کے کسی شخص کو پانی وغیرہ پلائیں تو پلانے سے پہلے اس میں تھوک دیتے ہیں ---- ہنستے ہوئے فرمایا میں نے بھی یہ بات سنی ہے۔

میں نے کہا لیکن یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے ---- پھر کچھ عرصے بعد میں نے ایک بے تکلف شیعہ دوست کو یہ واقعہ سنایا اور پوچھا کہ سچ بتاؤ' یہ بات صحیح ہے۔ وہ خوب ہنسے اور کہا میں نے اہل سنت کے بعض دوستوں سے سنا ہے کہ شیعہ کسی سنی کو کچھ پلائیں تو اس میں تھوک دیتے ہیں' لیکن یہ بالکل غلط ہے ---- بہرحال یہ ایک لطیفہ تھا' اس کا میرے خیال میں حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تاندلیاں والا سے وہ فیصل آباد آگئے تھے اور جامع مسجد اہل حدیث (واقع امین پور بازار) کی خطابت ان کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اس وقت اس شہر پر اس کے اولین اور پیدائشی نام "لائل پور" کا اطلاق ہوتا تھا اور اسے مشرف بہ اسلام کر کے یا اس کی تاریخ بگاڑ کر اسے فیصل آباد نہیں بنایا گیا تھا ---- اس شہر میں آنے کے بعد مولانا کی نسبت لائل پور کی طرف کی جانے لگی اور انھیں مولانا محمد صدیق لائل پوری کہا جانے لگا۔

فیصل آباد (سابق لائل پور) کی یہ مسجد مسلک اہل حدیث سے تعلق رکھنے والوں کی اس شہر میں پہلی مسجد تھی جو مولانا عبدالواحد مرحوم کی سعی و کوشش سے تقسیم ملک سے بہت عرصہ قبل تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی آمدنی کی تفصیلات حضرت مولانا ثناء اللہ مرحوم و مغفور کے اخبار "اہل حدیث" (امرتسر) میں رسیدوں کے نمبروں کے ساتھ باقاعدہ چھپتی رہیں اور لوگوں کو اس سے باخبر رکھا گیا کہ فلاں جگہ کے فلاں شخص نے اتنے روپے دیے اور فلاں شخص کی معرفت یہ روپے وصول ہوئے اور ان کی وصولی کا رسید نمبر یہ ہے۔ اسی طرح اس کے اخراجات کی تمام مدات کی وضاحت بھی "اہل حدیث" اخبار میں معرض اشاعت میں آتی رہی۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے اس مسجد کی تعمیر کے لیے بہت کوشش کی اور مولانا عبدالواحد نے اس کے لیے دور و نزدیک کے قصبات و دیہات کے بے شمار سفر کیے۔ وہ اس مسجد کے اولین امام تھے اور زندگی کے آخری دم تک یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ خطابت

کے فرائض کی انجام دہی کسی دوسرے عالم کے سپرد رہی۔

مولانا محمد صدیق اس کے منصب خطابت پر متعین ہوئے تو ان کی تقریروں اور جمعے کے خطبوں نے خوب رنگ باندھا۔ وہ نہایت موثر تقریر کرتے تھے اور سامعین کو نئے سے نئے معلومات سے نوازتے تھے۔

وہ چوہدری قسم کے عالم دین تھے' اچھے خاصے زمیندار تھے' اپنے گاؤں کے نمبردار تھے' صاحب جائداد تھے اور ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ سب سے بنا کر رکھتے تھے' خواہ مخواہ کسی سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ فیصل آباد کی جناح کالونی میں شان دار کوٹھی تعمیر کی۔ میں ایک دفعہ بعض عزیزوں کے ساتھ ان سے ملنے گیا تو نہایت خوش ہوئے۔ ہنس کر کہنے لگے' مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ تم کبھی میرے گھر آؤ گے اور مجھ سے ملنے کا عزم کرو گے۔

علما کے حلقے میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے کار خریدی۔ وہ جلسوں میں یا کسی سے میل ملاقات کو فیصل آباد یا اس سے باہر کہیں جاتے تو اپنی کار پر جاتے اور پستول ان کے گلے میں لٹکا ہوتا۔ جمعے کے علاوہ اگر وہ کہیں تقریر کرتے تو پستول ان کے گلے کی زینت ہوتا۔۔۔۔وہ سفر میں اپنا پستول خود اپنے پاس رکھتے' ساتھی کو نہیں دیتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہتھیار وہ جو اپنے پاس ہو اور سواری وہ جس کی لگام اپنے ہاتھ میں ہو۔۔۔۔۔اپنا ہتھیار کسی دوسرے کے سپرد کر دینا کہ تم اس کے ذریعے میری حفاظت کرو اور اپنی سواری کی لگام کسی دوسرے کو تھما دینا کہ تم اس کے اوپر بٹھا کر مجھے فلاں جگہ لے جاؤ' ان کے نزدیک بے وقوفی کی علامت تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اللہ پر توکل کر کے اپنی حفاظت خود کرنی چاہیے اور اپنی سواری کی لگام اپنے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ چنانچہ وہ اپنی کار خود چلاتے تھے۔ البتہ اگر کسی بیٹے کو ساتھ لے جاتے تو بالعموم وہ چلاتا تھا۔

وہ بلند حوصلہ اور جری عالم دین تھے۔ وہ زمانہ بھی موجودہ زمانے سے مختلف تھا۔ لوگ تحمل سے ایک دوسرے کی بات سنتے اور برداشت کرتے تھے۔ اگر کسی پر تنقید کی جاتی اور وہ تنقید کا جواب دینا چاہتا تو اسے جواب دینے اور اصل حقیقت بیان کرنے کا کھلے دل سے موقع دیا جاتا تھا۔ وہ کلاشن کوفوں' موزروں اور خنجروں کا زمانہ نہ تھا اور اپنے سے اختلاف کرنے والوں کو مارنے دھاڑنے اور قتل کرنے والوں کا دور تھا۔ وہ عزت و آبرو کا دور تھا' احترام و تکریم کا دور تھا۔۔۔۔اس کی بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

فیصل آباد میں اپنی کوٹھی تعمیر کرنے سے پہلے مولانا محمد صدیق امین پور بازار میں جامع مسجد اہل حدیث کے قریب سکونت پذیر تھے۔ایک دفعہ مسجد سے کچھ فاصلے پر رات کے وقت شیعہ حضرات کا جلسہ ہو رہا تھا۔لاؤڈ سپیکر کے ذریعے مقرر کی آواز مولانا کے گھر پہنچ رہی تھی اور مولانا تقریر سن رہے تھے۔مقرر نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر تنقید کی۔مولانا اسی وقت گھر سے نکلے اور جلسہ گاہ میں سٹیج پر مقرر کے ساتھ مائیک کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔لوگ یہ منظر دیکھ کر بڑے متحیر ہوئے۔مقرر سے فرمایا' صدیق کا دفاع صدیق کرنا چاہتا ہے۔شیعہ مقرر کا دل گردہ ملاحظہ ہو کہ وہ مائیک چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے اور مولانا صدیق کو تقریر کا موقع دیا۔شیعہ سامعین نے نہایت بردباری کا ثبوت بہم پہنچایا' اور مولانا صدیق نے اپنی تقریر میں حضرت صدیق کا دفاع کیا۔

یہ تھا وہ زمانہ ----- نہ کسی نے خنجر چلایا' نہ بندوق اٹھائی' نہ چھرا ہاتھ میں پکڑا' پھر تقریر ختم کر کے وہ وہیں بیٹھ گئے۔شیعہ مقرر کی تقریر سنی اور جلسہ ختم ہونے کے بعد گھر گئے۔

سیاسیات میں مولانا محمد صدیق کا تعلق مسلم لیگ سے تھا اور وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔مرکزی جمعیت ان معنوں میں سیاسی جماعت نہ تھی' جن معنوں میں یہ لفظ سیاسی جماعتوں پر بولا جاتا ہے۔البتہ اس کے بہت سے ارکان سیاسیات میں حصہ لیتے تھے اور ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق جس سیاسی جماعت سے تعلق رکھنا چاہتا ہے رکھے ----- لیکن جماعتی تنظیم اور کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے مسلک کی اشاعت سے روگردانی نہ کرے۔

غالباً ۱۹۵۶ء کی بات ہے کہ معلوم نہیں کس بنا پر مرکزی جمعیت کی مجلس شوریٰ نے ایک قرارداد منظور کی جس کا مفاد یہ تھا کہ مرکزی جمعیت کا کوئی رکن کسی سیاسی جماعت میں شامل نہیں ہو سکتا۔اس قرارداد کی مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ نے بھی توثیق کر دی۔مولانا محمد صدیق مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔جمعیت کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے ان کو نوٹس بھجوایا کہ آپ مرکزی جمعیت کے فیصلے کے برخلاف مسلم لیگ میں شامل ہوئے ہیں' کیوں نہ آپ کو جمعیت سے خارج کر دیا جائے ---- دس دن کے اندر اندر اس کا جواب دیں۔

اب یاد نہیں رہا کہ انھوں نے اس کا کیا جواب دیا' لیکن کچھ عرصے کے بعد یہ پابندی ختم کر دی گئی تھی۔ مولانا محمد صدیق قیامِ پاکستان کے قبل ہی سے مسلم لیگ میں شامل تھے۔ انھوں نے دو یا تین مرتبہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اپنے حلقے سے انتخاب بھی لڑا۔ لیکن ہر انتخاب میں ناکام رہے۔

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی کے زمانے میں فیصل آباد کے چار آدمی مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ وہ تھے مولانا عبیداللہ احرار' مولانا محمد اسحاق چیمہ' مولانا محمد صدیق اور حکیم محمد یعقوب ----! حکیم صاحب نہایت سنجیدہ اور کم گو تھے' لیکن وہ تینوں آپس میں بے تکلف تھے۔ چیمہ صاحب کی نظر کم زور تھی' وہ عینک لگاتے تھے' عبیداللہ احرار اور مولانا صدیق انھیں انھاں (نابینا) کہا کرتے تھے ---- مولانا غزنوی کو کسی نے بتا دیا کہ یہ تینوں آپس کی گفتگو میں تو بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہی ہیں' دوسروں کے سامنے بھی ان کا انداز وہی ہوتا ہے۔ مولانا نے ایک دن ان سے کہا کہ میں نے آپ تینوں کے بارے میں سنا ہے کہ آپ ہر جگہ بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ انداز آپ کے مقام و منصب کے منافی ہے۔

انھوں نے مولانا کے سامنے تو گزشتہ طریق عمل پر معذرت کی اور آئندہ کے لیے یہ انداز اختیار نہ کرنے کا وعدہ کیا' لیکن عملاً وہی سلسلہ قائم رکھا جو پہلے سے چلا آ رہا تھا۔

بعض معاملات میں باہم اختلاف کے باوجود ان کا دوستانہ بہت گہرا تھا۔ ان میں سے سب سے پہلے ۲۰۔ فروری ۱۹۷۵ کو مولانا عبیداللہ احرار نے وفات پائی۔ پھر ۱۲۔ ستمبر ۱۹۸۹ء کو مولانا محمد صدیق نے سفر آخرت اختیار کیا اور آخر میں ۲۳۔ مارچ ۱۹۹۳ء کو مولانا محمد اسحاق چیمہ نے اس دنیائے فانی سے منہ موڑا۔

۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ ضلع فیصل آباد کی جمعیت اہل حدیث کی صدارت کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا۔ دو امیدوار میدان میں اترے۔ ایک مولانا محمد صدیق اور دوسرے مولانا محمد اسحاق چیمہ۔ بہت کوشش کی کہ مقابلے تک نوبت نہ پہنچے' دونوں میں سے ایک بیٹھ جائے۔ لیکن دونوں دوست اپنی اپنی جگہ اڑے ہوئے تھے ---- میرا ووٹ اپنے گاؤں میں تھا اور ضلع فیصل آباد کے کوٹے سے میں مرکزی مجلس شوریٰ کا رکن تھا۔ میں چیمہ صاحب کا حامی تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ ماندلیاں والا اور اس کے قرب و جوار اور دیگر متعدد مقامات سے

مولانا صدیق صاحب کے ووٹروں سے بہت سی بسیں اور کاریں بھری ہوئی آئیں۔ چیمہ صاحب کے ووٹروں نے بھی اسی طرح فیصل آباد کا رخ کیا۔ آخر چیمہ صاحب جیت گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محمد صدیق مجھ سے روٹھ گئے' جہاں ملے' یہی کہا کہ تم نے انھے (نابینے یعنی چیمے) کی مدد کی۔ اب ضلعے میں جس مقام پر جماعت کا جلسہ ہو' وہاں تقریر بھی "انھے" سے کرانا' نہ میں ضلعے کے کسی جلسے میں شامل ہوں گا' نہ تقریر کروں گا' ہر جلسے میں "انھاں" تقریر کرے گا---- لیکن ان سب شکوے شکایتوں میں ان کا انداز وہی پہلے کی سی ہنسی مذاق کا رہا' خفگی کے آثار کسی وقت ان کے چہرے پر نمایاں نہیں ہوئے۔ خود چیمہ صاحب سے بھی وہ یہی کہتے رہے "انھے" "تم نے میرا مقابلہ کیا اور مجھے ہرا دیا' آئندہ ضلعے کے جلسوں میں تو ہی تقریر کرے گا جو ضلعے کی جمعیت کا صدر بنا بیٹھا ہے۔ چیمہ صاحب جواب دیتے' جانگلی میں نے تم کو نہیں ہرایا' تیری قسمت نے تمھیں ہرایا ہے' تیری قسمت میں ہارنا ہی لکھا ہے۔ مسلم لیگ کا انتخاب ہو یا جمعیت اہل حدیث کا' تو ہر جماعت کے انتخاب میں ہارتا ہے۔

سچی بات ہے' اب وہ لوگ بہت یاد آتے ہیں' بڑے پیارے' نہایت مخلص اور انتہائی بے تکلف دوست تھے----- ان کے ساتھ بڑی لمبی مجلسیں ہوتی تھیں' جن میں ہر قسم کی باتیں کی جاتی تھیں۔ وہ بہت یاد آتے ہیں اور زندگی بھر یاد آتے رہیں گے۔ اب نہ وہ لوگ رہے ہیں' نہ وہ باتیں رہی ہیں اور نہ وہ جماعتی سلسلے رہے ہیں۔

ایک مرتبہ ہمارے گاؤں میں جلسہ تھا اور مقرر صرف مولانا محمد صدیق تھے۔ اشتہار چھپ گئے' اعلان ہو گیا۔ ارد گرد کے لوگوں کو پتا چل گیا کہ مولانا محمد صدیق تقریر کریں گے۔ گاؤں کے کچھ لوگ ان کی خدمت میں گئے تو فرمایا اب وہاں انھاں تقریر کرے گا یا بھٹی کرے گا۔ ان دونوں کو بلا لو' وہ بہت بڑے مقرر ہیں' میری کیا ضرورت ہے۔ لیکن جلسے میں تشریف لے جانے سے انکار نہیں کیا' بس اس قسم کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کہا بھٹی کے بھائی محمد حسین کو بھیجو---- محمد حسین میرا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ گیا تو ہنسی مذاق میں میرا شکوہ کیا اور تقریر کا وعدہ کر لیا' لیکن یہ بھی فرمایا کہ جلسے میں لاہور سے بھٹی کو ضرور بلاؤ۔ وہ اگر نہ آیا تو میں آئندہ تمھارے گاؤں میں نہیں جاؤں گا۔

مجھے اطلاع دی گئی۔ میں اس وقت وہاں پہنچا' جب نماز عشا کے بعد مولانا محمد صدیق

تقریر کر رہے تھے- ان کی گاڑی پنڈال کے باہر کھڑی تھی اور وہ حسب معمول گلے میں پستول لٹکائے تقریر فرما رہے تھے ---- دور سے مجھے دیکھ کر آواز دی-

"اوئے بھٹی تو آگیا ایں' دور کیوں کھلائیں' میرے کول آ-"

میں گیا تو وہیں سٹیج پر مجھ سے بغل گیر ہوئے اور ہنستے ہوئے فرمایا:

مینوں ہراون والیاں وچ ایہ میرا یار وی شامل اے' تے ایہ سارا پنڈ وی شامل اے' جتھے میں تقریر کر رہیاں آں-

مولانا محمد صدیق کا تدریس میں بھی ایک خاص مقام تھا- کافی عرصہ مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ناظم تعلیمات رہے- جامعہ سلفیہ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں-

جن حضرات نے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کی تعمیر و ترقی میں تگ و تاز کی' ان میں مولانا محمد صدیق کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے ------

مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تنظیم میں بھی انھوں نے بھاگ دوڑ کی- جمعیت کی تیسری سالانہ کانفرنس ۳' ۴ اپریل ۱۹۵۵ء کو مولانا اسماعیل غزنوی کے زیر صدارت لائل پور میں منعقد ہوئی تھی- اس کے صدر استقبالیہ مولانا محمد صدیق تھے- ان کا خطبہ استقبالیہ بہت سی معلومات پر مشتمل تھا-

۱۹۸۷ء کے آخر میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کی مجلس عاملہ کا اجلاس مولانا معین الدین لکھوی کی صدارت میں ہوا- میں بھی اس میں شامل تھا اور مولانا محمد صدیق بھی- ہم دونوں قریب قریب بیٹھے تھے- بولے بھائی! میں بیمار رہتا ہوں' معلوم نہیں کب آخری وقت آجائے' میں نے تمھیں معاف کیا' تم بھی مجھے معاف کر دو- ان کی ایک کتاب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی (ام کلثوم) سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نکاح سے متعلق ہے' جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بہ طیب خاطر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح کیا تھا- اپنے موضوع کی یہ ایک تحقیقی کتاب ہے ---- وہ کتاب انھوں نے میرا نام لکھ کر اپنے دستخط کے ساتھ مجھے عنایت فرمائی اور حسب عادت ہنستے ہوئے کہا' یہ میری نشانی اپنے پاس رکھو-

اس سے کچھ عرصہ بعد کی بات ہے کہ میں اپنے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) جا رہا تھا'

گورنمنٹ کالج کے سامنے ایک کار میرے قریب آکر رکی اور اس میں سے آواز آئی 'السلام علیکم - میں نے پلٹ کر دیکھا تو اس میں مولانا محمد صدیق بیٹھے تھے' اور ان کے صاحب زادے گاڑی چلا رہے تھے ----- نہایت تپاک سے ملے - کافی دیر باتیں ہوتی رہیں - بیماری کی وجہ سے انھیں احساس ہو گیا تھا کہ اب چل چلاؤ کا وقت قریب آ رہا ہے - اس ملاقات میں بھی انھوں نے کہا کہ بہت عرصے سے تمھارے ساتھ تعلقات چلے آ رہے ہیں - اس اثنا میں اگر میری کوئی بات تمھیں ناگوار گزری ہو تو میں تم سے معافی چاہتا ہوں 'اگر تم نے کوئی بات میرے متعلق کہی ہے تو میں نے تمھیں معاف کیا -

یوں تو یہ بات انھوں نے حسب عادت ہنس کر ہی کہی 'لیکن مجھ پر اس کا بے حد اثر ہوا اور ذہن میں آیا کہ ان کا کاروان حیات واقعی آخری موڑ پر پہنچنے والا ہے - میں انھیں دیکھتا رہا اور خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہا ------

اس سے تین چار مہینے بعد میں اپنے چند عزیزوں کے ساتھ فیصل آباد گیا اور ان سے ملاقات کی ----- یہ ان سے آخری ملاقات تھی ----- ۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ء کو انھوں نے وفات پائی - اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے -----

جہاں تک میں جانتا ہوں 'وعظ و تقریر اور تدریس و خطابت کے ذریعے انھوں نے اسلام کی بہت خدمت کی - اپنے مسلک کے لیے وہ نہایت غیور اور جری تھے - ہم گنہگاروں کے نزدیک ان کی نیکیوں کا تناسب ان لغزشوں سے بھاری تھا جو بہ حیثیت انسان سرزد ہو جاتی ہیں -----

فیصل آباد کے یہ دوست جن میں مولانا عبیداللہ احرار 'مولانا محمد اسحاق چیمہ اور مولانا محمد صدیق شامل تھے' یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں - میں کبھی وہاں جاتا ہوں تو یہ حضرات بہت یاد آتے ہیں اور پھر یہ شعر ذہن میں گھومنے لگتا ہے -

آیا نہیں پلٹ، کے کوئی بھی گیا ہوا
میں خود ہی جاؤں گا اب انھیں ڈھونڈتا ہوا

# حکیم عبدالشکور شکراوی

میوات کی سرزمین نے جن اصحاب علم کو جنم دیا ان میں مولانا حکیم عبدالشکور شکراوی کا نام نامی لائق تذکرہ ہے۔ان کا آبائی وطن علاقہ میوات کا ایک قصبہ "نوح" تھا اور وہ نومر نسل ڈیروال میو تھے۔ان کے اجداد نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزی حکومت کے خلاف مجاہدانہ کردار ادا کیا تھا، جس کے نتیجے میں ان کے دادا وزیر خاں کو اور دادا کے بھائی جواہر خاں کو انگریزوں نے گرفتار کرکے پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ دونوں بھائی اپنے علاقے کے اچھے خاصے زمیندار تھے۔ان کی زمین سرکار نے ضبط کرلی تھی اور پورے خاندان کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کردیا گیا تھا۔اس کا ردعمل یہ ہوا کہ حکیم عبدالشکور ہمیشہ انگریزی اقتدار سے برسرپیکار رہے اور ان طاقتوں کی رفاقت اختیار کیے رکھی جو اس کی حکومت کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔

حکیم عبدالشکور کا مولد میوات کا ایک مقام فیروز پور نمک ہے۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔پھر دہلی آگئے اور مدرسہ فتح پوری کے اساتذہ سے حصول علم کرنے لگے۔حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے حلقہ بیعت میں بھی شامل ہوئے۔

درس نظامی کی تکمیل کے بعد لکھنؤ کا عزم کیا، وہاں حکیم عبدالرحمٰن رعب لکھنوی فروکش تھے جن کا شمار اس دور کے ممتاز اطبا میں ہوتا تھا، ان سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

بعد ازاں اپنے وطن میوات آگئے اور وہاں تعلیمی و تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔میواتیوں کی اکثریت اسلامی احکام سے بے بہرہ اور دینی امور سے بے خبر تھی، حکیم صاحب نے ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اللہ نے اس کار خیر میں ان کو کامیابی عطا فرمائی۔ انھوں نے اپنے علاقے کی سیاسیات میں بھی حصہ لیا اور اصلاحی خدمات کا سلسلہ بھی پورے جوش اور جذبے کے ساتھ جاری رکھا۔

ان کے دادا وزیر خاں نے مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور سید احمد شہید بریلوی کی

تحریک جہاد میں حصہ لیا تھا۔اس کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا اور پھر انگریزی حکومت نے جیسا کہ پہلے بتایا گیا' وزیر خاں اور ان کے بھائی جواہر خاں کو گرفتار کر کے تختہ دار پر لٹکا دیا تھا۔

حکیم عبدالشکور نے میوات کے متعدد مقامات پر چھوٹے یا بڑے پیمانے کے مکاتب جاری کیے اور لوگوں کو کلمہ حق سکھانے اور اسلامی تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے میدان عمل میں اترے۔اس کے ساتھ ساتھ تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں' جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

## ۱۔ تاریخ میوات:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب علاقہ میوات کی تاریخ' وہاں کے اہل علم کے حالات اور اس نواح کی برادریوں کے واقعات و کوائف پر مشتمل ہے۔ پہلی دفعہ یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تھی۔کتاب اگرچہ مختصر تھی مگر اس موضوع پر یہ اولیں کتاب تھی جو ایک خاص انداز میں لکھی گئی تھی' اس لیے اس نے بڑی شہرت پائی۔

## ۲۔ آفتاب میوات:

یہ ایک اخبار تھا جو انھوں نے ۱۹۲۶ء میں جاری کیا۔میوات کا یہ پہلا اخبار تھا۔دیگر مضامین کے علاوہ اس میں علاقہ میوات' باشندگان میوات اور ان کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں مضامین شائع کیے جاتے تھے۔یہ اخبار ۱۹۴۶ء تک جاری رہا۔

## ۳۔ تاریخ میوچھتری:

اس میں میو قوم کی ابتدائی تاریخ سے لے کر ۱۹۴۵ء (یعنی کتاب کے سال تصنیف) تک کے واقعات حسن ترتیب کے ساتھ ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔میواتیوں کے قبول اسلام' تبلیغی سرگرمیوں' ولی اللہی نقطہ فکر سے ان کی وابستگی اور سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی مجاہدانہ تگ و تاز سے ان کے تعلق و تاثر وغیرہ کے ضروری کوائف سے بحث کی گئی ہے۔ نیز میو قوم کے مختلف خاندانوں اور خاندانوں کی شاخوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ پھر ان کی رسوم و رواج' بول چال کے اسالیب' ان کے شاعروں' گویوں' وغیرہ کا ذکر ہے۔ان کی سیاسی سرگرمیوں اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس کے بعد

آزادیٔ ملک تک کی سیاسی جدوجہد میں انھوں نے جس انداز میں حصہ لیا، اس کی عہد بہ عہد تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی یہ مستند کتاب ہے۔

### ۴۔ کتاب التبلیغ:

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس میں تبلیغ اسلام کی اہمیت اور اس کے اصول و ضوابط کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

### ۵۔ کتابت حدیث:

یہ کتاب تدوین حدیث کے متعلق ہے اور ان کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو اخبار ”اہل حدیث“ (دہلی) میں قسط وار شائع ہوتے رہے ہیں۔

### ۶۔ مقام حدیث:

یہ بھی ان مضامین و مقالات پر مشتمل ایک رسالہ ہے جو اخبار ”اہل حدیث“ (دہلی) میں چھپتے رہے ہیں۔

### ۷۔ براہین الہدیٰ فی وجوب الجمعہ فی القریٰ:

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے، جس کا نام عربی قسم کا ہے، لیکن رسالہ اردو زبان میں ہے ---- کسی زمانے میں اہل حدیث اور احناف کے درمیان یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ دیہات میں جمعہ پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ اہل حدیث دیہات میں جمعے کی فرضیت کے قائل تھے، جب کہ حضرات احناف اس سے اختلاف کرتے تھے۔ اس موضوع سے متعلق فریقین کی طرف سے مختلف اوقات میں رسائل و کتب کی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا حکیم عبدالشکور شکراوی کا یہ رسالہ اسی بحث سے متعلق ہے۔ اس میں دیہات میں جمعے کو فرض قرار دیا گیا ہے۔

### ۸۔ تذکرہ ثنائیہ:

حکیم صاحب مرحوم کو حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری سے بے حد تعلق تھا اور وہ ان کی علمی و تصنیفی مساعی سے انتہائی متاثر تھے۔ ان کے حالات میں ”تذکرہ ثنائیہ“ کے نام سے انھوں نے کتاب لکھی، لیکن افسوس ہے، ابھی تک چھپ نہیں سکی۔

### ۹- تذکرہ نذیریہ:

یہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی سیرت و سوانح سے متعلق ہے- لیکن غیر مرتب مسودہ ہے جو مصنف مرحوم کے صاحب زادے حکیم اجمل خاں کے پاس محفوظ ہے-

### ۱۰- احسن البیان فی تنقید مذاہب الادیان:

اس میں تمام مذاہب کے بنیادی اور اساسی امور بیان کیے گئے ہیں- پھر ان کی خامیوں اور نقائص کی نشان دہی کی گئی ہے- ان کے مقابلے میں اسلامی تعلیم کی صداقت اور حقانیت کو واضح کیا گیا ہے- یہ بھی غیر مطبوعہ ہے اور مسودے کی صورت میں ان کے فرزند گرامی قدر حکیم اجمل خاں کے پاس موجود ہے- اس کا نام بھی عربی قسم کا ہے' لیکن کتاب اردو میں ہے-

### ۱۱- امام کاذب:

حضرت مولانا عبدالوہاب دہلوی اپنے عہد کے ممتاز عالم دین اور بہت بڑے واعظ و مقرر تھے- بعض مسائل میں بہت سے حضرات علما کو ان سے اختلاف تھا' جس کا اظہار تحریر و تقریر کے ذریعے ہوتا رہتا تھا- اس میں بعض اوقات سختی بھی آجاتی تھی' وہ ایک دور تھا جو عرصہ ہوا اپنی دلچسپ بحثوں کے ساتھ گزر گیا- اب وہ تمام باتیں مباحث و مناظرات کی اس تاریخ کا ایک حصہ بن کر رہ گئی ہیں' جس میں بسا اوقات تشدد کا پہلو ابھر آتا تھا- یہ کتاب اسی دور کی ایک نشانی ہے- اب نہ وہ لوگ رہے ہیں' نہ وہ بحثیں کبھی سننے میں آئی ہیں- راقم کو اپنی زندگی کے عہد آغاز میں اس قسم کی بہت سی باتیں سننے کا اتفاق ہوا' لیکن آزادی وطن کے بعد نئے نئے مسائل ظہور میں آگئے ہیں' جن کے سامنے اس نوعیت کی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی-

### ۱۲- پندرہ روزہ "اہل حدیث":

آزادی وطن سے کچھ عرصہ بعد انھوں نے اور مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی نے دہلی سے پندرہ روزہ "اہل حدیث" اخبار جاری کیا تھا' جسے مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اخبار "اہل حدیث" (امرتسر) کا قائم مقام قرار دیا گیا تھا' لیکن یہ اخبار تو عرصہ ہوا بند ہو گیا' اب ان کے فرزند ارجمند حکیم اجمل خاں صاحب پندرہ روزہ "مجلّہ اہل حدیث" دہلی سے شائع کرتے

ہیں-یہ ایک علمی اور تحقیقی اخبار ہے جو اٹھارہ انیس سال سے جاری ہے-شائقین کو اس کے لیے ''دارالکتاب ۱۴۸۸ پٹودی ہاؤس' دریا گنج' نئی دہلی سے پر رابطہ قائم کرنا چاہیے-

یہ تو تھیں حکیم عبدالشکور کی تصنیفی خدمات---!اب ان کی تدریسی' اصلاحی اور سیاسی خدمات کی طرف آئیے-

۱۹۳۰ء(۱۳۵۱ھ) انھوں نے اپنے قصبے ''شکراوہ'' میں ایک دارالعلوم کی بنیاد رکھی-یہ اس نواح کا غالباً پہلا دارالعلوم تھا' جس میں دینی اور مذہبی تعلیم کے حصول کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا-اس میں اس دور اور علاقے کے متعدد حضرات خدمت تدریس انجام دیتے رہے ہیں-درس نظامی کی تدریس کے علاوہ حفظ قرآن کا بھی وہاں معقول انتظام تھا-مقامی طلبا بھی اس سے استفادہ کرتے تھے اور بیرونی طلبا بھی اچھی خاصی تعداد میں حصول علم میں مشغول تھے-

یہ دارالعلوم مولانا محمد سورتی' مولانا ثناءاللہ امرتسری' مولانا عبدالحنان (مدیر ہفت روزہ ''اہل حدیث گزٹ'' دہلی) اور حافظ حمیداللہ کے مشورے اور تجویز سے قائم کیا گیا تھا-قیام دارالعلوم کے بعد شکراوہ میں جو پہلا تبلیغی جلسہ عام منعقد ہوا' اس میں یہ حضرات شامل تھے-حافظ حمیداللہ صاحب دہلی کے مشہور تاجر تھے جو مساجد و مدارس کی خدمت میں خاص شہرت رکھتے تھے- انھوں نے اس دارالعلوم کی مالی اعانت کا عہد کیا اور وہ اس کی اعانت کرتے رہے-

دارالعلوم شکراوہ میں جن علمائے کرام اور مدرسین عالی مقام نے مختلف اوقات میں مسند تدریس آراستہ کیے رکھی' ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں-

۱-- مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی

۲-- مولانا عبدالجبار شکراوی

۳-- مولانا حکیم عبدالشکور شکراوی

۴-- مولانا محمد داؤد راز

۵-- مولانا عبدالرشید لداخی

۶-- مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی

۷-- مولانا عبدالرحمٰن ندوی

۸-- مولانا محمد اسرائیل ندوی

۹-- مولانا اثیر الدین

۱۰-- مولانا عبدالوحید

۱۱-- مولانا رفیق احمد سلفی بستوی

۱۲-- مولانا محمد اسرائیل رحمانی گونڈوی

۱۳-- مولانا محمد فاروق ندوی

۱۴-- مولانا عبدالقدوس گلالتوی

۱۵-- مولانا بدر الزمان نیپالی

حکیم عبدالشکور کو جماعت علما میں تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور لوگ ان کی خدمات گوناگوں کے معترف تھے- ان کی وجہ سے مولانا ثناء اللہ امرتسری اور دیگر بہت سے علمائے کرام علاقہ میوات میں تشریف لے جاتے رہے بارہا وہ وہاں کے تبلیغی اجتماعات میں شریک ہوئے اور تقریریں کیں- توحید و سنت کا وہاں جو غلغلہ بلند ہوا' اس کا باعث یہی برگزیدہ لوگ تھے- رحمہم اللہ تعالیٰ-

اصلاح عوام اور رفاہ عامہ سے متعلق کام کرنے کا بھی حکیم عبدالشکور بے پناہ جذبہ رکھتے تھے- چنانچہ انھوں نے دیہات سدھار قسم کی کمیٹیاں بنائیں اور ان کے ذریعے میواتیوں کی بڑی خدمت کی- یہ ایک تحریک تھی جو انھوں نے جاری کی اور جس سے لوگوں میں بے داری پیدا ہوئی اور غلط رسوم سے کنارہ کش ہو کر انھوں نے صحیح راہ اپنائی-

آل انڈیا میو پنچایت کا قیام بھی ان کے زرخیز ذہن کا نتیجہ تھا- اس پنچایتی نظام سے انھوں نے بڑا کام لیا- دیہات اور محلوں کے بہت سے جھگڑے اس کی وساطت سے ختم ہو جاتے تھے-

انجمن اتحاد و ترقی میوات بھی ان کی کوششوں سے وجود میں آئی- اس کے مقاصد اور پروگرام خالص اصلاحی اور لوگوں کے لیے فائدہ مند تھے-

وہ ملکی سیاسیات سے بھی تعلق رکھتے اور اس میں حصہ لیتے تھے- ۱۹۳۶ء میں انھوں نے اپنے شہر شکراوہ میں کانگرس کمیٹی قائم کی اور اس کے پلیٹ فارم پر آزادیٔ برصغیر کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا-

وہ بہت اچھے مقرر تھے۔ سیاسی، مذہبی، اصلاحی ہر موضوع پر گفتگو کرتے تھے اور ان کی بات غور سے سنی جاتی تھی۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر آزاد ہوا، اور اس کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو پہاڑ ٹوٹا، اس کی تفصیلات کا سب کو علم ہے۔ اس وقت ہندوستان کے بے شمار مسلمانوں نے پاکستان کا قصد کر لیا تھا۔ لیکن حکیم عبدالشکور نے مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کی تلقین کی اور پاکستان آنے کی سخت مخالفت کی۔ ان کا زاویہ نظریہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے ملک میں رہ کر یہاں کے مسلمانوں کی خدمت کرنی چاہیے۔ آرام کے دن یہاں گزرے ہیں، تکلیف کا زمانہ بھی یہیں بسر کرنا چاہیے۔ عارضی تکلیف سے گھبرا کر ملک چھوڑ جانا ان کے نزدیک قرینِ دانش نہیں تھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے، وہ ۱۹۵۷ء میں پاکستان آئے تھے اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کی سوانح حیات کا مسودہ (تذکرہ ثنائیہ) ان کے پاس تھا۔ اس کے لیے وہ مزید معلومات کے متلاشی تھے۔ میں اس وقت "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا اور دفتر ہی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ کئی دن وہ یہاں رہے تھے اور خوب باتیں ہوئی تھیں۔ اچھا خاصا قد، بھاری بھرکم جسم، مگر قد سے بالکل متناسب۔ چوڑا چہرہ، کشادہ پیشانی، خوش مزاج و خوش طبع۔

اب اس کینڈے کے لوگ کہاں پیدا ہوں گے۔ تاریخ سے انھیں خاص طور سے شغف تھا، اور تاریخ کے بھی اسلامی پہلو سے زیادہ مناسبت تھی۔ پھر تذکرۂ رجال تو یوں سمجھیے کہ ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔

زبان بہت اچھی تھی اور خوب صورت انداز میں اظہار رائے کرتے تھے۔ میں نے ان کی بعض کتابیں بھی پڑھی ہیں اور اخبارات میں مختلف عنوانات پر ان کے مضامین بھی پڑھتا رہا ہوں۔ رواں دواں زبان میں اپنا مدعا بیان کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی ہمت سے نوازا تھا کہ انھوں نے میوات کے علاقے میں توحید و سنت کا جھنڈا بلند کیا۔ دینی اعتبار سے وہ سنگلاخ زمین ہے، جس میں انھوں نے طبع آزمائی کی اور ان لوگوں کو راہِ راست پر لائے جو صدیوں سے غیر اسلامی راہوں پر گامزن تھے۔ ان سے بعض لوگوں نے شاید اللہ اور اس کے رسول کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔ یہاں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

۱۹۵۶ء کی مئی یا جون کا مہینہ تھا اور میں اپنے دفتر اخبار ''الاعتصام'' میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور السلام علیکم کی آواز میرے کان میں پڑی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو دو آدمی سامنے کھڑے تھے۔ تعارف سے معلوم ہوا کہ ایک قاضی زین العابدین میرٹھی ہیں جو اس وقت جامعہ ملیہ دہلی میں تفسیر قرآن کے پروفیسر تھے اور دوسرے صاحب کا نام احمد خاں ہے۔ احمد خاں پنجابی میں بات کرتے تھے اور شلوار قمیص میں ملبوس تھے۔

میں نے احمد خاں صاحب سے پوچھا کہ آپ لاہور رہتے ہیں؟

انھوں نے بتایا: میں شملے رہتا ہوں اور قالینوں کا کاروبار کرتا ہوں۔ شملے کی مال روڈ پر میری دکان ہے اور وہیں قالین تیار کیے جاتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے مجلس احرار سے تعلق رکھتا ہوں، لیکن اب مجلس احرار وہاں نہیں ہے، اس لیے دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لیے کبھی کبھی تبلیغ کے لیے تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ کاروبار لڑکوں کے سپرد ہے۔ میں فارغ ہوں اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے ان لوگوں کی رفاقت اختیار کر لیتا ہوں۔

انھوں نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ تبلیغ کے لیے ضلع گوڑگانواں میں میواتیوں کے ایک گاؤں میں گئے۔ ربیع الاول کا مہینا تھا۔ جماعت کے امیر نے سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر تقریر کی اور آنحضرت کی بہادری، سخاوت اور لوگوں سے ہمدردی کے سلسلے کے واقعات بیان کیے۔ سامعین کی اچھی خاصی تعداد تھی، جن میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی تھے۔ مقرر کے عین سامنے ایک چوہدری قسم کے آدمی بیٹھے تھے، جنھوں نے وہاں کے رواج اور ثقافت کے مطابق سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ سفید داڑھی اور سفید مونچھیں، دھوتی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے نکال کر باندھی ہوئی اور ہاتھ میں لاٹھی۔ نہایت انہماک اور توجہ سے تقریر سن رہے تھے۔ تقریر سے دلچسپی کے باعث مقرر کی نگاہیں بھی ان پر گڑی ہوئی تھیں۔

تقریر ختم ہوئی تو چوہدری صاحب لاٹھی کے سہارے اٹھے اور مقرر کے پاس آ بیٹھے۔

پوچھا: جناب جس شخص کی آپ نے اتنی تعریف کی ہے وہ کون تھے؟

جواب دیا: وہ اللہ کے رسول تھے، پیغمبر تھے، جنھیں اوتار کہا جاتا ہے۔

سوال ہوا: وہ تھے کون؟

کہا: میں عرض تو کر رہا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول اور نبی تھے اور ان کا اسم گرامی محمد تھا (ﷺ)۔

بولے: وہ تو میں سمجھ گیا کہ وہ نبی تھے' اوتار تھے' لیکن تھے کون؟ انھوں نے پھر یہی جواب دیا کہ اللہ کے نبی تھے۔

بولے: میرا مطلب یہ ہے کہ ان کی برادری کون سی تھی؟

جواب دیا: وہ قریشی تھے' ہاشمی تھے' جنھیں ہمارے ہاں سید کہا جاتا ہے۔

چوہدری صاحب نے کہا: ان کی صفتیں تو آپ نے راجپوتوں کی سی بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ وہ بہادر تھے' سخی تھے اور لوگوں کے ہمدرد تھے۔ کوئی حملہ کرتا تھا تو مقابلے کے لیے سب سے آگے ہوتے تھے۔ لیکن برادری ان کی قریشی اور ہاشمی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

یہ تھیں اسلام اور اللہ اور رسول کے بارے میں ان لوگوں کی معلومات۔ ان کو سمجھانا اور صحیح صورت حال سے آگاہ کرنا بہت بڑا کام تھا۔ جن حضرات نے اس علاقے میں تبلیغ کی اور وہاں کے باشندوں کو احکام اسلام سے آگاہ کیا' وہ انتہائی باہمت اور مخلص ترین مبلغ اسلام ہیں' اور بے حد تعریف کے لائق-----!

میں لاہور کے جس علاقے میں رہتا ہوں' وہاں میوتی اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں اور بڑے پیار اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ ایک گلی میں انھوں نے ایک چھوٹی مسجد بنائی ہے' جسے عام طور سے لوگ "میوواں دی مسجد" کہتے ہیں۔ چند سال ہوئے یہاں ایک شخص رہتے تھے' جن کا نام میاں حسن تھا۔ وہ میو تھے' نہایت نیک اور مخلص! میرے مکان کے آگے سے گزر کر وہ مسجد کو جاتے تو مجھے پیار بھرے خلوص سے آواز دیتے: "بھٹی صاحب! مہجت میں آجاؤ-----" مسجد کو یہ لوگ مہجت کہتے ہیں۔

میاں حسن تبلیغی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور اس کی نصابی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں لاوڈ سپیکر پر مولانا محمد زکریا صاحب مرحوم کی کوئی کتاب پڑھنا شروع کر دیتے اور گھروں میں بیٹھے لوگوں کو ستاتے رہتے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے' تبلیغ دین میں بڑے تیز تھے۔

بعض اوقات یہ لوگ بالکل ٹکسالی زبان بولتے ہیں۔ ایک دفعہ میرے محلے کے ایک

میواتی کے ہاں شادی تھی۔ دوپہر کا کھانا تھا' مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ میں کچھ دیر سے پہنچا۔ خاتون خانہ جو بالکل ان پڑھ ہیں' باہر کھڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں۔ بھٹی بھائی! آپ اتنی دیر سے آئے' ہم کب سے آپ کا انتظار کھینچ رہے ہیں ------ "انتظار کھینچ رہے ہیں" سن کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی اور غالب کا شعر یاد آگیا۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں' انتظار ساغر کھینچ

حکیم عبدالشکور شکراوی اور دوسرے بہت سے بزرگوں نے شب و روز کی محنت سے اپنے علاقے کے میواتیوں میں دین سے محبت کا جذبہ اور اس کے احکام پر عمل کا داعیہ پیدا کیا اور ان کو تحصیل علم کی راہوں پر لگایا۔

۱۹۵۶ء کی بات ہے' کراچی کے نشر و اشاعت کتب کے ایک مشہور ادارے کارخانہ نور محمد نے معروف مصنف و مقرر مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کی تفسیر محمدی (اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر) ان کے وارثوں کی اجازت و علم کے بغیر چھاپ لی تھی اور اس پر تفسیر کے مترجم مولانا محمد جوناگڑھی کا نام بھی نہیں لکھا تھا۔ لوگوں کے اصرار پر ایک مدت کے بعد جلد اول پر "علامہ محمد میمن" کی مہر لگادی گئی تھی۔ جب اس پر اعتراض کیا گیا تو ارشاد ہوا کہ جو شخص نام لکھنے کے لیے کہتا ہے' اس کی کتاب پر مہر لگادی جاتی ہے۔ یعنی پہلے کتاب منگواؤ' پھر اگر نام نہ لکھنے پر شکایت ہو تو اسے واپس بھیجو تاکہ وہ مہر لگا کر شکایت رفع فرمادیں۔ اسے کہتے ہیں "بگلا پکڑنے کا استادی طریقہ۔"

(مولانا محمد جوناگڑھی کی یہ تفسیر اب مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور نے کمپیوٹر پر شائع کی ہے۔ کاغذ' طباعت' جلد نہایت عمدہ ہے)

اس پر میں نے "الاعتصام" میں کارخانہ نور محمد والوں سے احتجاج کیا تو انھوں نے اپنے ماہانہ رسالے "تذکرہ" میں اس کا جواب دیا' جس سے ایک اخباری بحث شروع ہوگئی۔ حکیم عبدالشکور شکراوی نے اس باب میں کارخانہ نور محمد والوں کی حمایت کی اور فرمایا کہ مولانا محمد جوناگڑھی مرحوم کے ورثا کی مالی حالت انتہائی کمزور ہے اور وہ اپنے باپ کی کتابیں چھاپنے کی سکت نہیں رکھتے۔ یہ کتابیں چھپنی چاہئیں۔

حکیم صاحب' مولانا محمد جوناگڑھی سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے مداح تھے۔

مولانا جوناگڑھی کی اولاد سے بھی ان کو ہمدردی تھی' لیکن اشاعت کتب کے سلسلے میں وہ کارخانہ نور محمد (کراچی) کے حامی تھے- انھوں نے شکراوہ (ضلع گوڑگانواں' ہریانہ) سے یکے بعد دیگرے دو مکتوب مجھے لکھے جو میرے پاس محفوظ ہیں اور یہاں درج کیے جا رہے ہیں-ان کا خط (ہینڈ رائٹنگ) باریک' صاف اور بہت اچھا تھا-

مولانا محمد جوناگڑھی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے اور خود ہی ان کے ناشر تھے- ان کی ہر کتاب کے نام کا آخری جز ''محمدی'' ہے- مثلاً زکوٰۃ محمدی' صلوٰۃ محمدی' دین محمدی' اخلاق محمدی' خطبات محمدی' طریق محمدی وغیرہ- ان کی چار بیویاں تھیں اور جس طرح وہ کثیر التصانیف تھے' اسی طرح کثیر الاولاد تھے- ان کے ایک بیٹے کا نام محمد محمود میمن تھا' وہ میرے بے تکلف دوست تھے اور کراچی رہتے تھے- تین سال قبل انھوں نے اچانک وفات پائی- ان کی وفات سے مجھے انتہائی صدمہ ہوا- میں انھیں کہا کرتا تھا کہ تمھارے چھوٹی بڑی تقریباً سو کتابیں تصنیف کی ہیں جنھیں ''محمدیات'' کہا جاتا ہے- اب تم ایک کتاب ''اولاد محمدی'' کے نام سے کتاب لکھ ڈالو-

مولانا مرحوم کا شمار دہلی کے اصحاب ثروت مسلمانوں میں ہوتا تھا- وہ بہت بڑی کوٹھی میں امیرانہ شان سے رہتے تھے- تقریر اتنی موثر اور زوردار ہوتی تھی کہ ایک دفعہ مولانا محمد علی جوہر نے سنی تو ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی' حالاں کہ وہ خود بھی بہت بڑے مقرر تھے-

جماعت اہل حدیث کے مشہور رہنما اور قومی اسمبلی کے رکن مولانا معین الدین لکھوی کی شادی مولانا جوناگڑھی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی- مولانا جوناگڑھی نے ۱۹۴۱ء میں وفات پائی- غالباً مارچ کا مہینا تھا-

بات کہاں سے کہاں نکل گئی اب حکیم صاحب کے مکتوبات پڑھیے-

شکراوہ

۵-اپریل ۱۹۵۷ء

باسمہ سبحانہ

محترم المقام! دام عنایتہ- السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ- مزاج گرامی! جریدہ الاعتصام میں نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی کے خلاف پہلے آپ کا ایک نوٹ

پڑھا تھا پھر دوبارہ اب ایک اچھا خاصا مضمون ''الاعتصام'' میں نظر سے گزرا۔ پھر ''تذکرہ'' میں جو کچھ پہلے نوٹ کے جواب میں لکھا گیا تھا وہ بھی میری نظر سے گزرا۔ واقعیت اور حقیقت خواہ کچھ بھی ہو مگر دینی کتابوں کی اشاعت کے متعلق ہمیں اپنی وسعت نظر کا ثبوت دینا چاہیے۔ تفسیر ابن کثیر کی اشاعت اپنے نقطہ نظر سے ایک اہم چیز ہے' بالخصوص اس زمانے میں جب کہ کتاب و سنت کے ساتھ ہمارے بھائیوں کا سلوک اچھا نہیں ہے۔ایسے حال میں اگر ایک شخص ایسا کام کر لیتا ہے تو نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ابنائے مولوی محمد محمدی تصانیف کی بالکلیہ اشاعت سے مجبور ہیں دوسرے لوگ اگر ان کو پبلش کر رہے ہیں تو اصل مقصد حاصل ہونے کی توقع تو ہے پھر جو کچھ ہو گیا اس کی تلافی کی بھی کوئی صورت نہیں' اس حال میں اس طرح لکھنے پڑھنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اب دیکھیے آپ کے دوسرے نمبر کا وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ میرے خیال میں کارخانہ نور محمد سے زیادہ شکایت ہمیں ان لوگوں سے ہو سکتی ہے جو کراچی میں محمدیات کی اشاعت کر رہے ہیں۔ آپ کے اخبار کی حیثیت جماعتی ہے اور بات جماعتی تقاضے کی حد کے اندر رہنی چاہیے اس لیے میرے خیال میں صرف نظر ہی بہتر ہے۔ پھر یہ کہ ہندوستان و پاکستان میں یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ اخلاق و دیانت کا خون کیا جا رہا ہے۔ چونکہ یہ ادارہ بہت ہی اچھی دینی خدمت کر رہا ہے اور جو ہمارے کرنے کا کام تھا' اسے وہ کر رہا ہے اس لیے معافی کے قابل ہے۔ ''تذکرہ'' میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی صفائی بھی پیش کر دی ہے اس لیے آگے بات نہ بڑھنی چاہیے۔ ان کے کارخانے کو ٹھیس لگے گی۔

حضرت مولانا داؤد غزنوی صاحب اور حضرت مولانا محمد اسماعیل اور حضرت مولانا عطاء اللہ صاحبان کی خدمت میں سلام مسنون پیش کر دیجیے۔

مکرر آنکہ مولوی نور محمد کے کتب خانے والوں کو بھی میں نے لکھ دیا ہے کہ بات آگے نہ بڑھے۔

(حکیم) عبدالشکور' شکراوی۔

اب دوسرا مکتوب ملاحظہ گرامی میں لایے۔ یہ ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ شمسی حساب سے یہ تاریخ اپریل ۱۹۵۷ء بنتی ہے۔

محترم المقام!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ- مزاج گرامی

''تفسیر محمدی'' کی اشاعت کی چپقلش ''الاعتصام'' اور ''تذکرہ'' میں نظر سے گزری- ''تذکرہ'' کا یہ عمل کہ انھوں نے میرے خطوط شائع کر دیے ان کے اضطراب کا نتیجہ ہے- میں نے جب آپ کو خط لکھا تھا' اسی وقت ان کو بھی لکھا تھا- مجھے حقیقت میں اس امر سے خوشی ہے کہ ہماری کتابوں کو دوسرے اصحاب شائع کریں اور پھر ان کو دوسرے لوگ پڑھیں بھی- تفسیر محمدی حقیقت میں مسلک عمل بالحدیث کی پوری عکاسی کرتی ہے- اور پھر یہی کچھ دونوں ملکوں میں عام ہو رہا ہے- ادارہ نور محمد بڑی حد تک تفسیر وحدیث کی خدمت کے لیے لاثانی شہرت کا حامل ہے اور یہ مسلمہ امر ہے کہ ابنائے مولانا محمد صاحب مرحوم اپنی کتابوں کو چھاپنے کی سکت نہیں رکھتے-

اب اگر کوئی اسے دوبارہ شائع کرنا چاہے تو امر مانع کچھ نہیں- میں سمجھتا ہوں کہ تذکرہ کے خطوط میں جو میرے الفاظ آپ نے پڑھے ہوں گے ان سے آپ کو اذیت ضرور پہنچی ہو گی مگر لکل امرء مانوی پر بھی نظر رہنی چاہیے- میری دلی خواہش ہے کہ آئندہ اس چپقلش کو ختم کر دیا جائے- اس سے ہمیں اپنی وسیع النظری کا ثبوت دینا چاہیے- اور پھر ہمارے امامیہ دوستوں نے ان کی ساری کتابیں شائع کر لی ہیں-

والسلام

حکیم عبدالشکور شکراوی

شوال میں ملاقات کی توقع کر رہا ہوں- حضرت مولانا داؤد صاحب و اسماعیل صاحب وعطاءاللہ کو سلام عرض کریں-

''امامیہ'' سے غربائے اہل حدیث مراد ہیں-

اب ذیل میں ان کا ایک اور خط پیش کیا جا رہا ہے- یہ خط بھی ہے اور ان کے دو مسودوں (تذکرہ نذیریہ اور تذکرہ ثنائیہ) کی اشاعت کے سلسلے میں درخواست اعانت بھی- اس پر کوئی تاریخ مرقوم نہیں ہے لیکن اس کا تعلق ۱۹۵۷ء یا اس کے پس و پیش سے ہے-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از دفتر تذکرۂ نذیریہ وثنائیہ دارالعلوم شکراوہ

محترم المقام!

ادام اللہ فیوضکم وبرکاتکم

بعد ہدیہ سلام مسنون واضح ہو کہ

ایک قطعہ مضمون بابت تذکرہ نذیریہ مرسل خدمت ہے۔ توقع ہے کہ اسے اشاعت قریب میں اندراج کا موقع دیں گے۔

اچھا دیکھیے میں خیریت لکھنا بھول گیا اور وہ اس لیے کہ خود مجھے خیر و عافیت حاصل نہیں، بلکہ صحت میں ہر وقت گڑبڑ رہتی ہے۔ دونوں تذکروں کی تسوید و تالیف نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا ہے۔ آپ کے قارئین بھی کوئی مدد نہیں فرماتے۔ اپنے منطقے کے لوگوں کی کیا شکایت کریں وہ خود بے چارے اپنی بدحالی و پریشانی میں مبتلا ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ مضمون کے شروع یا آخر میں جناب اپنے قارئین کو اس طرف توجہ دلا کر مجھے خوشی کا موقع دیں گے۔ عزیزی مولوی عطاء اللہ خاں صاحب کو بعد ہدیہ سلام میرا یہ سندیسہ پہنچا دیں کہ آپ نے جو تذکرہ نذیریہ کے متعلق جواب تحریر فرمایا ہے اسے میں جواب پر محمول نہیں کرتا، بلکہ اس کی تکلیف دہی کا وزن برابر رہے گا۔ ملنے جلنے والوں کو بھی اس طرف توجہ دلاے گا۔ قطرہ قطرہ دریا شود والی کہاوت پر نظر رہے۔ امیر الطائفہ مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو بھی اس طرف توجہ دلا دیں۔ ان کے رشحات قلم ہماری راہ یابی کا ذریعہ بن جائیں گے۔

فقط والسلام مع الاکرام

خادم الجماعت

عبدالشکور

مہتمم دارالعلوم شکراوہ

(پونا ہانہ)

ضلع گورگانواں

(مشرقی پنجاب)

حکیم صاحب ممدوح پر نصف فروری ۱۹۶۱ء میں فالج کا حملہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں پورا مہینا بے ہوش رہے۔ اس کے بعد ۲۰۔۲۱۔ مارچ کو طبیعت سنبھلی اور خاصا افاقہ محسوس کرنے لگے۔ غذا کے استعمال اور ہضم میں بھی کافی فرق پڑ گیا اور خیال کیا کہ اب وہ صحت یاب ہیں۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد ۲۸۔ مارچ کو پھر حالت بدل گئی اور بے ہوشی طاری ہو گئی۔ ۱۷۔ اپریل کو طبیعت زیادہ بگڑ گئی اور ۱۸۔ اپریل ۱۹۶۱ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے علاقہ میوات کے اس مرد مجاہد کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

انا للّٰہ وانا الیہ راجعون

حکیم عبدالشکور مرحوم کے صاحب زادے حکیم اجمل خاں بھی بہت سے معاملات میں عالی قدر باپ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے "میو گزٹ" جاری کیا جو ۱۹۷۲ء تک جاری رہا۔ بعد ازاں پنجاب وقف بورڈ کے ترجمان سہ ماہی مجلّے "اوقاف" کی زمام ادارت ہاتھ میں لی۔ کم و بیش تین سال اس سے وابستہ رہے۔ یہ پرچہ بند ہو گیا تو پندرہ "روزہ اہل حدیث" (دہلی) کے منصب ادارت پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۷ء میں وہ بھی بند ہو گیا تو ۱۹۷۸ء میں "مجلّہ اہل حدیث" کے نام سے پندرہ روزہ رسالہ جاری کیا جو ماشاء اللہ ایک علمی پرچہ ہے اور اس کے مندرجات سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

# مُفتی جعفر حسین

۲۱'۲۲'۲۳'۲۴- جنوری ۱۹۵۱ء (۱۲'۱۳'۱۴'۱۵ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ) کو کراچی میں سید سلیمان ندوی کے زیر صدارت مختلف مکاتب فقہ کے اکتیس علمائے کرام کا ایک اجلاس ہوا تھا' جس میں کامل غور و فکر کے بعد اسلامی مملکت کے بنیادی اصول مرتب کیے گئے تھے' جو بائیس نکات پر مشتمل تھے۔

اس اجلاس کے انعقاد سے آٹھ دس روز پیشتر مولانا سید داؤد غزنوی نے تمام مسالک فقہ کے چند علماوزعما کو اپنے مکان پر تشریف لانے کی دعوت دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کراچی کے اجلاس میں جن مسائل پر بحث کرنا مقصود ہے' ان پر غور کر لیا جائے تاکہ اس اجلاس میں کسی واضح نتیجے پر پہنچنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ مولانا داؤد غزنوی کی دعوت پر جو حضرات تشریف لائے' ان میں معروف شیعہ عالم و مجتہد مفتی جعفر حسین بھی شامل تھے۔ گندمی سا رنگ' چھوٹی کالی داڑھی' درمیانہ قد' نہ فربہ نہ زیادہ دبلے پتلے۔ کھلے پائنچے کا پاجامہ اور اس کے اوپر لمبی سیاہ رنگ کی قبا پہنے ہوئے۔ کسرتی سے جسم کے جوان عالم دین۔ لہجہ نرم اور بات پختہ۔ اسلوب گفتگو میں انکسار مگر دلائل میں وزن۔ بات زبان سے نکالنے سے پہلے دلیل کی میزان میں تولتے۔ انداز منجھا ہوا اور الفاظ ادیبانہ۔ جملوں کی ساخت ایسی دل کش کہ گفتگو شروع کرتے تو ہر شخص توجہ سے سننے پر مجبور ہوتا۔

میں نے ان کو پہلی دفعہ دیکھا اور پہلی دفعہ ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا۔ یوں تو عام طور سے اکثر شیعہ مجتہد اور ذاکر صاف ستھری زبان بولتے ہیں اور الفاظ کا ذخیرہ ان کے پاس کافی ہوتا ہے' لیکن مفتی صاحب کو میں نے دیکھا کہ وہ بے تکلفی سے خوب صورت طریقے اور روانی سے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے تھے۔ بات کرتے وقت انھیں کہیں بھی کوئی الجھن پیش نہیں آتی تھی۔

مفتی جعفر حسین ۱۹۱۴ء میں گوجرانوالہ کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے' جسے خاندان حکیماں کہا جاتا تھا۔ اس خاندان کے ایک فرد حکیم ظہور الدین تھے' جو فارسی ادب پر

عبور رکھتے تھے۔ کہتے ہیں حافظ شیرازی کے اشعار انھیں کثرت سے یاد تھے اور وجد آفریں عالم میں پڑھا کرتے تھے۔

حکیم ظہور الدین اپنے زمانے میں گوجرانوالہ کے ایک سکول کے ٹیچر تھے اور وہاں کے معروف عالم اور طبیب حکیم شہاب الدین کے فرزند تھے' مفتی جعفر حسین کے یہ تایازاد بھائی تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ حکیم شہاب الدین جو علم دین اور علم طب میں گوجرانوالہ میں اچھی خاصی شہرت رکھتے تھے' مفتی صاحب کے تایا تھے۔ حکیم صاحب فارسی اور پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ مفتی صاحب نے حصول علم کا آغاز انھی سے کیا تھا۔

مفتی صاحب کے والد کا اسم گرامی حکیم چراغ الدین تھا۔ وہ بھی پڑھے لکھے بزرگ تھے اور شہر اور علاقے کے ممتاز طبیب گردانے جاتے تھے۔ بلند اخلاق' مخلص اور لوگوں کے ہم درد۔ عدالتی و قانونی قسم کے بعض مسائل سے باخبر تھے اور اس نوعیت کی درخواستیں لوگ ان سے لکھوایا کرتے تھے۔ بعض حضرات کے کہنے سے اس کے لیے انھوں نے (گوجرانوالہ میں) بڑے ڈاک خانے کے قریب بیٹھنے کے لیے جگہ کا انتظام کر لیا تھا' جہاں لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے درخواستیں لکھوایا کرتے تھے۔

مفتی جعفر حسین کے ابتدائی دور طالب علمی میں گوجرانوالہ شہر کو دینی علوم اور مذہبی فنون کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ اہل حدیث علما میں سے مولانا محمد اسماعیل اور قاضی عبدالرحیم وہاں کی مسند تدریس پر متمکن تھے' جن کا شمار اس عہد اور اس نواح کے مشہور علما و مدرسین میں ہوتا تھا۔ دیوبندی مکتب فکر کے عالم مولانا محمد چراغ تھے' جو علمی و تدریسی حلقوں میں بڑی شہرت رکھتے تھے' مفتی صاحب نے ان تینوں سے استفادہ کیا اور تینوں کے طریق تعلیم کو سمجھنے کی کوشش کی۔ قاضی عبدالرحیم سے وہ بالخصوص مستفید ہوئے اور کافی عرصہ ان کے حلقہ درس میں گزارا۔

جن دنوں مفتی صاحب مولانا اسماعیل صاحب کے دارالعلوم میں تعلیم حاصل کرتے تھے' ممتاز عالم و مصنف مولانا محمد حنیف ندوی ان کے ہم درس تھے۔ یعنی ابتدا میں دونوں نے ایک ہی استاد کے سامنے زانوے شاگردی تہہ کیا تھا۔

مولانا حنیف ندوی بھی اصلاً گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے اور مفتی جعفر حسین کا مسکن بھی یہی شہر تھا۔ پھر دونوں کی ابتدائی تعلیم ایک ہی مدرسے اور ایک ہی استاد سے ہوئی تھی'

یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں کا' اختلاف مسالک کے باوجود باہمی تعلق ہمیشہ قابل رشک رہا- دونوں ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ کرتے اور باہم عزت و احترام سے پیش آتے تھے-

گوجرانوالہ کے ممتاز اساتذہ سے حصول علم کے بعد مزید تعلیم کے لیے مفتی صاحب نے لکھنؤ کا عزم کیا' جسے اس زمانے میں شیعہ علما و مجتہدین کا مرکز سمجھا جاتا تھا اور جہاں اس نقطہ فکر کے متعدد دارالعلوم قائم تھے' جن میں دور دراز سے طلبا آکر مختلف علوم و فنون حاصل کرتے تھے- ان میں ایک مدرسہ ناظمیہ تھا' جس میں مشہور شیعہ عالم و مدرس سید نجم الحسن فریضہ تدریس سرانجام دیتے تھے- اس دارالعلوم کے اساتذہ سے مفتی جعفر حسین نے خوب استفادہ کیا' بالخصوص سید نجم الحسن سے بہت مستفید ہوئے-

لکھنؤ میں مفتی صاحب کے دور طالب علمی میں مولانا حنیف ندوی جوان کے پرانے ہم درس اور ہم شہر تھے' دارالعلوم ندوۃ العلما میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور وہاں دونوں کی ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا- کبھی مولانا ان کے ہاں چلے جاتے اور کبھی مفتی صاحب مولانا کے ہاں آجاتے- یعنی جس طرح اپنے آبائی شہر گوجرانوالہ میں دونوں کے میل جول کا سلسلہ جاری رہتا تھا' اسی طرح تعلیمی شہر لکھنؤ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا-

مفتی جعفر حسین مدرسہ ناظمیہ (لکھنؤ) سے سند فراغ حاصل کر چکے تو استاذ مکرم سید نجم الحسن نے خواہش ظاہر کی کہ اس مدرسے میں وہ معلم کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیں- درسی کتابیں انھوں نے نہایت محنت اور غور و انہماک سے پڑھی تھیں اور اللہ نے ذہانت و فطانت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی' پھر پڑھنے پڑھانے کا شوق بھی تھا' لہٰذا لائق شاگرد نے مہربان استاد کی خواہش کو اپنے لیے غنیمت جانا اور جس مدرسے میں طالب علم رہے تھے' اس میں مدرس کی حیثیت سے کام شروع کر دیا- دور طالب علمی میں وہاں ان کو یہ اعزاز حاصل رہا تھا کہ مدرسے کی مجلس مقاصدہ کے ناظم منتخب کیے گئے تھے' اب اپنی اس مہد علمی کی خدمت تدریس ان کے سپرد ہو گئی تھی- دونوں اعتبار سے خوب کام کیا اور اس حلقے میں اپنی خدمات کی بنا پر بڑی شہرت پائی-

۱۹۳۶ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے نجف اشرف (عراق) چلے گئے' جہاں شیعہ حضرات کا بہت بڑا اور مشہور دارالعلوم ہے جسے ''حوزہ علمیہ'' کہتے ہیں' اور جس کے فارغ

التحصیل کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے- نجف اشرف کے حوزہ علمیہ کے اساتذہ سے انھوں نے خوب استفادہ کیا اور وہاں درجہ اجتہاد پر فائز ہوئے-

نجف اشرف سے واپس آئے تو صوبہ یوپی ضلع مراد آباد کے ایک مقام "نوگاؤں سادات" کی علمی درس گاہ کے ارباب اہتمام نے ان کی خدمات حاصل کر لیں- وہ یوپی کے ایک قصبے میں شیعہ حضرات کا ایک مشہور تعلیمی مرکز تھا اور اس دور میں وہاں کثیر تعداد میں طلبا حصول علم میں مصروف اور متعدد اساتذہ خدمت تدریس میں مشغول تھے- مفتی صاحب کی خدمات اس درس گاہ کے پرنسپل کی حیثیت سے حاصل کی گئی تھیں- آزادیٔ وطن (۱۹۴۷ء) تک وہ نوگاؤں سادات میں اقامت گزیں رہے-

آزادی کے بعد ان کی خدمات کا ایک دوسرا دور شروع ہوا- اب حالات بدل چکے تھے' پاکستان معرض قیام میں آچکا تھا اور حالات کی روشنی میں اسلامی مملکت کے باشندوں کی ذہنی و فکری تربیت نئے انداز سے کرنا ضروری قرار پا گیا تھا' اس کے لیے حکومت پاکستان نے جن علمائے دین کی خدمات حاصل کرنا ضروری سمجھا' ان میں جناب مفتی جعفر حسین کا اسم گرامی بھی شامل تھا- چنانچہ ۱۹۴۹ء میں انھیں رکن بورڈ آف تعلیمات اسلامی مجلس دستور ساز پاکستان بنایا گیا- اس وقت ان کی عمر چھتیس برس کی تھی- اس بورڈ کے صدر علامہ سید سلیمان ندوی تھے- دیگر ارکان میں سے مولانا مفتی محمد شفیع' پروفیسر عبدالخالق اور مولانا ظفر احمد انصاری کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں-

مفتی صاحب ہمیشہ ہر اس کمیٹی میں شامل رہے' جو مشترکہ مقاصد کے حصول کی غرض سے ملک کے تمام مکاتب فکر (شیعہ' حنفی' اہل حدیث) سے تعلق رکھنے والے علما و زعما پر مشتمل ہوتی- اس نوع کی کمیٹیوں میں ان کی رائے کو اہمیت دی گئی- قیام پاکستان کے بعد اسلامی مملکت کے بنیادی و اساسی اصول مرتب کرنے کی غرض سے ۲۱' ۲۲' ۲۳' ۲۴- جنوری ۱۹۵۱ء کو اکتیس علما کی اس میٹنگ میں بھی مفتی صاحب شریک تھے' جس میں اسلامی حکومت کے بائیس نکات ترتیب دیے گئے تھے- اس میٹنگ میں دوسرے شیعہ عالم و مجتہد حافظ کفایت حسین شامل تھے' اور ان دونوں حضرات کو تمام مسالک فقہ کے علما و زعما کے نزدیک قدر و منزلت حاصل تھی-

قیام پاکستان کے بعد اب تک اس ملک میں جو لوگ اقتدار میں آئے ہیں' انھوں

نے اسلام کا نام خوب استعمال کیا اور لوگوں کو یقین دلایا کہ زمام اختیار ہاتھ میں لیتے ہی وہ پہلا کام یہ کریں گے کہ یہاں اسلامی دستور کا نفاذ عمل میں لائیں گے' لیکن جب تخت حکومت پر متمکن ہوگئے تو کچھ اور قسم کی باتیں ہونے لگیں- ایک بہت بڑی بات یہ ہونے لگی کہ ہم تو اسلامی دستور کی تنفیذ کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں' علمائے کرام ہی کسی متفقہ نقطے پر جمع نہیں ہو رہے ہیں- اسلامی دستور کے بارے میں علما کے درمیان اتنا شدید اختلاف پایا جاتا ہے کہ ہم اس سے سخت پریشانی میں مبتلا ہیں- یہ متفق ہو جائیں' ہم فوراً اسلامی دستور لے آئیں گے-

ارباب حکومت اس قسم کی باتیں شروع ہی سے کرتے آئے ہیں- اس کا جواب علمائے کرام نے قیام پاکستان کے فوراً بعد دے دیا تھا اور ملک کے مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے اکتیس اصحاب علم نے جمع ہو کر وہ بائیس نکات مرتب کر کے اس دور کی حکومت کو پیش کر دیے تھے' جن کی حیثیت اسلامی مملکت کے رہنما اصولوں کی تھی- یہ رہنما اصول عارضی یا وقتی نہیں تھے' اب بھی ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے-

اسلامی نظریاتی کونسل ملک کے تمام فقہی مسالک سے تعلق رکھنے والے اصحاب فکر اور اہل علم پر مشتمل ہے' مفتی صاحب شروع ہی سے اس کے رکن چلے آ رہے تھے' لیکن ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دور حکومت میں اس بنا پر اس کی رکنیت سے استعفا دے دیا تھا کہ اس کی کارکردگی سے وہ مطمئن نہیں تھے' اور جو کام ان کے نقطہ نظر سے اطمینان بخش اور باعث تسلی نہیں تھا' اس میں وہ حصے دار نہیں بننا چاہتے تھے-

صدر ضیاء الحق نے ملک کی زمام حکومت ہاتھ میں لی تو مفتی صاحب کو دوبارہ اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن مقرر کیا گیا- وہ کچھ عرصہ اس کے رکن رہے' لیکن فقہ جعفریہ کے بعض بنیادی مسائل کے متعلق حکومت سے اختلاف پیدا ہوا تو ۳۰- اپریل ۱۹۷۸ء کو اس کی رکنیت سے مستعفی ہوگئے-

اس سے چند روز پہلے ۱۲- اپریل ۱۹۷۸ء کو بھکر میں شیعہ حضرات کا ایک بہت بڑا اجتماع ہوا تھا' جس میں شیعہ عوام کے علاوہ اس مسلک کے علما و زعما بھی شریک ہوئے تھے- اس اجتماع میں مفتی صاحب کو قائد ملت جعفریہ منتخب کیا گیا تھا اور یہ بہت بڑا اعزاز تھا جس کے وہ شیعہ حضرات کی طرف سے متفقہ طور پر مستحق سمجھے گئے تھے-

۲۰- جون ۱۹۸۰ء کو اس دور کی حکومت نے زکوٰۃ اور عشر کا نظام جاری کیا' شیعہ اصحاب علم کو اپنے مسلک کی رو سے اس کے بعض گوشوں سے اختلاف تھا- ۵ جولائی ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد میں مفتی صاحب کی قیادت میں شیعان پاکستان کا ایک بہت بڑا جلوس نکلا' اس جلوس کی صورت میں ان حضرات نے زکوٰۃ و عشر کے بارے میں اپنا موقف حکومت کے سامنے پیش کیا- اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ایک معاہدے کے ذریعے شیعہ حضرات کو زکوٰۃ اور عشر کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دے دیا-

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا مفتی صاحب نے حصول علم کا آغاز اپنے شہر گوجرانوالہ سے کیا تھا اور اس دور میں انھوں نے تین اساتذہ سے استفادہ کیا تھا' قاضی عبدالرحیم صاحب سے' مولانا محمد اسماعیل صاحب سے اور مولانا محمد چراغ صاحب سے- مولانا حنیف ندوی ان کے ہم درس اور دوست تھے- مفتی صاحب کا مکان چوک نیائیں میں مولانا اسماعیل صاحب کی مسجد کے قریب تھا- قاضی صاحب طبیب تھے' ان کا مطب مولانا کی مسجد سے متصل تھا- ہفت روزہ ''الاعتصام'' ابتدا میں گوجرانوالہ سے جاری ہوا تھا- اس کا دفتر بھی اسی چوک میں مولانا اسماعیل صاحب کی مسجد سے ملحق تھا- مولانا حنیف ندوی اس کے ایڈیٹر تھے' میں بھی اسی اخبار میں کام کرتا تھا- مفتی صاحب کبھی مولانا اسماعیل صاحب سے ملنے آتے' کبھی قاضی صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لاتے اور کبھی مولانا حنیف ندوی کے پاس ''الاعتصام'' کے دفتر آتے- مولانا حنیف ندوی بھی کبھی کبھی ان کے مکان پر جاتے اور ان سے بے تکلفانہ انداز میں باتیں کرتے-

گوجرانوالہ کے ہر مسلک کے لوگ مفتی صاحب کا احترام کرتے تھے' وہ بھی سب سے کھلے دل سے ملتے اور سب کو مستحق تکریم قرار دیتے تھے-

مولانا حنیف ندوی کے ساتھ میں بھی کئی دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا' اکیلا بھی ان کے دولت کدے پر گیا- وہ ہمیشہ شفقت سے پیش آئے اور بہت اچھی طرح ملے-

ان سے آخری ملاقات وفات سے چند مہینے قبل لاہور میں بھاٹی دروازے کے باہر ہوئی- گرمیوں کا موسم تھا' سورج غروب ہونے سے کچھ دیر بعد میں اور مولانا حنیف ندوی بھاٹی دروازے کے باہر کہیں جا رہے تھے کہ انھوں نے مجھ سے کہا وہ دیکھو سامنے معلوم ہوتا ہے' مفتی جعفر حسین صاحب جا رہے ہیں-

میں نے کہا: شاید وہی ہوں گے۔

فرمایا: چال ڈھال انہی کی سی ہے۔

مفتی صاحب لمبی سی عبا کاندھوں پر رکھے آہستہ آہستہ چل رہے تھے' ایک آدمی ان کے ساتھ تھا۔ میں کچھ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ان تک پہنچا اور آگے بڑھ کر سلام کیا' ساتھ ہی عرض کیا کہ مولانا حنیف ندوی تشریف لا رہے ہیں۔ وہ رکے اور مولانا کو سلام کرنے کے لیے چند قدم پیچھے کو مڑے' ادھر سے مولانا آگئے اور دونوں پرانے دوست اور ہم شہر و ہم درس بغل گیر ہو گئے۔

دو تین منٹ میں وہاں کھڑے کھڑے ایک دوسرے سے خیر و عافیت پوچھی۔ پھر مولانا نے کہا آیئے کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چاے پیتے ہیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا دہی کی لسی پینے کو جی چاہتا ہے۔ قریب ہی ایک ہوٹل میں جا کر سب نے لسی کا ایک ایک گلاس پیا۔

اس زمانے میں حدود و تعزیرات اور زکوٰۃ و عشر کے مسائل بعض علمی و قانونی حلقوں میں موضوع بحث بنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے ان مسائل میں شیعی نقطہ نظر اہل سنت سے مختلف ہے۔ میں نے بعض شیعہ اہل علم سے ان دنوں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ترجمان ''المعارف'' میں چھاپنے کے لیے (جس کا میں اڈیٹر تھا) تین مضمون مانگے تھے اور درخواست کی تھی کہ صرف اپنا نقطہ نظر دلائل سے ثابت کیا جائے' کسی مسلک کی مخالفت نہ کی جائے۔

ایک کتب اربعہ کا تعارف۔

دوسرا حدود و تعزیرات میں شیعہ کا موقف۔

تیسرا زکوٰۃ و عشر میں شیعی نقطہ نظر۔

یہی بات میں نے مفتی صاحب سے عرض کی۔ انھوں نے فرمایا' میں چند روز میں یکے بعد دیگرے تینوں عنوانات پر مضامین بھیجوں گا' مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے ان عنوانات سے متعلق مجھ سے مضامین کے لیے کہا ہے۔

میں نے عرض کیا: میں ان مضامین کے لیے آپ کو دفتر سے خط لکھوں؟

فرمایا: خط لکھنے کی ضرورت نہیں' مجھے یہ بات یاد رہے گی۔

اس سے چند روز بعد پتا چلا کہ مفتی صاحب بیمار ہو گئے ہیں اور بیماری نے اس قدر شدت اختیار کر لی ہے کہ لکھنا پڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔

مفتی صاحب بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ عربی' فارسی اور اردو پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ کبھی موج میں آتے تو عربی میں شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن اپنے اشعار کو انھوں نے کہیں محفوظ نہیں کیا کاغذ پر چند شعر لکھے اور پھر کاغذ ضائع ہو گیا۔

ان کی تصنیفات و تراجم میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

۱۔ نہج البلاغہ۔ ترجمہ و حواشی

۲۔ صحیفہ کاملہ۔ ترجمہ و حواشی

۳۔ سیرت امیر المومنین۔ مشتمل بر دو جلد

وفات سے تین سال قبل انھوں نے گوجرانوالہ میں جی ٹی روڈ پر جامعہ جعفریہ کی بنیاد رکھی تھی۔

مفتی صاحب ایک مدت سے پھیپھڑے کے سرطان میں مبتلا تھے۔ وفات سے تین مہینے قبل یہ مرض شدت اختیار کر گیا تھا۔ ۲۶۔ جولائی ۱۹۸۳ء کو علاج کے لیے لندن گئے۔ وہاں ان کا طبی معائنہ کیا گیا تو ڈاکٹروں نے لاہور کے علاج پر اطمینان کا اظہار کیا' جس کا مطلب ان کی زندگی سے اظہار مایوسی تھا۔ ۱۴ اگست کو وہ واپس آ گئے۔ یہاں میو ہسپتال میں زیر علاج تھے کہ ۲۹ اگست ۱۹۸۳ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ ان کے جنازے میں ہر مکتب فقہ کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی اور انھیں کربلا گامے شاہ (لاہور) میں دفن کیا گیا۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

مفتی صاحب اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ ان کی ایک بیٹی ہیں جو لاہور میں لڑکیوں کے ایک کالج میں تدریس کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔

# میاں محمد شفیع (م ش)

۱۹۵۰ء میں پروفیسر محمد سرور جامعی نے لاہور سے ہفت روزہ ''آفاق'' جاری کیا' جس کا دفتر ریگل سینما کے قریب ٹمپل روڈ پر تھا۔ ''آفاق'' کے عملہ ادارت میں میاں محمد شفیع (م ش) کا نام بھی درج تھا۔ وہ اس اخبار میں لاہور کی ڈائری لکھتے تھے۔ یہ کالم ملک کے سیاسی حلقوں میں شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔

میاں محمد شفیع نہایت مستعد اور محنتی شخص تھے۔ وہ ۱۹۱۴ء کے پس و پیش ضلع جالندھر کی تحصیل نکودر کے موضع راہوں میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ارائیں برادری سے تھا اور نسبتاً غریب گھرانے کے فرد تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی۔ پھر لاہور آگئے اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا۔ ان کا شمار قبل از آزادی کے ان طلبا میں ہوتا ہے' جنھوں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے کالجوں کے مسلمان طلبا کی تنظیم قائم کی تھی' جس کے ذریعے آگے چل کر طلبا میں تحریک پاکستان کے میدان میں اترنے کا جذبہ ابھرا تھا۔

وہ باہمت اور متحرک آدمی تھے۔ انھوں نے بڑی دنیا دیکھی تھی اور بے شمار اہم شخصیتوں سے ان کے روابط رہے تھے ----- پکے مسلم لیگی اور مخلص ترین پاکستانی تھے۔

انھوں نے اخبار نویسی اور کالم نگاری میں بڑا نام پایا۔ انگریزی اخباروں میں سے سول اینڈ ملٹری گزٹ' ڈان اور پاکستان ٹائمز میں رپورٹر اور چیف رپورٹر کی حیثیت سے طویل عرصے تک کام کیا اور حصول پاکستان کے سلسلے میں ایک خاص انداز سے مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی وضاحت کی اور اسے لوگوں تک پہنچایا۔ اردو اخبارات میں سے ''نوائے وقت'' میں خوب لکھا اور بہت لکھا۔ ان کی تحریر سے نئی باتیں ملتی تھیں۔

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ بعد چند دوستوں کے ساتھ مل کر انھوں نے ہفت روزہ ''اقدام'' جاری کیا تھا۔ اس میں وہ اپنے کالم ''لاہور کی ڈائری'' میں ملکی سیاسیات کے بعض دلچسپ خفیہ گوشوں کی نشان دہی کر جاتے تھے' جن تک ہر اخبار نویس کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی تھی۔

آزادی سے قبل متحدہ ہندوستان میں انگریز اور ہندو اخبار نویس ایک خاص اسلوب سے صحافتی میدان میں سرگرم عمل تھے' ان کا مقابلہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ م ش نے اس دور میں بڑی محنت سے کام کیا اور اپنی بات پورے زور اور موثر طریقے سے لوگوں تک پہنچائی۔

ایک خاص نقطہ نظر کے حامل ہونے کے باوجود ان میں یہ خوبی تھی کہ سب سے بنا کر رکھتے تھے اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ اپنے ہم عصر اخبار نویسوں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین وارکان میں سے جو لوگ ان کے افکار و خیالات سے متفق نہیں تھے' ان سے بھی ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ وہ بھی ان کی عزت کرتے تھے اور یہ بھی ان کا احترام بجا لاتے تھے۔ کسی سے لڑنا جھگڑنا اور مخالفت کا محاذ قائم کیے رکھنا ان کا شیوا نہ تھا۔ وہ خود مسلم لیگی تھے' لیکن اکالی رہنماؤں سے بھی ان کے مراسم تھے' کانگرس سے تعلق رکھنے والوں سے بھی ان کے روابط تھے' مجلس احرار اور دوسری جماعتوں کے ارباب قیادت سے بھی وہ تکریم سے پیش آتے تھے۔ ملکی سیاسیات میں ہمیشہ مختلف ذہن کار فرما ہوتے ہیں اور سوچ بچار کے پیمانے بدلتے رہتے ہیں' کسی کا کوئی زاویہ فکر ہے اور کسی نے اپنے علم و مطالعے کی روشنی میں کوئی دوسری راہ اختیار کر لی ہے۔ اسے مسئلہ بنا لینا اور اپنے نقطہ نگاہ کے علاوہ سب کو غلط قرار دے دینا اور ان سے بول چال بند کر دینا' کار عقل منداں نہیں۔ میاں محمد شفیع سب کو اختلاف رائے کا حق دیتے تھے اور کسی سے بگاڑ پیدا نہیں کرتے تھے۔

۱۹۵۱ء میں انھوں نے ضلع اوکاڑا کی ایک دیہاتی (مہاجر) سیٹ سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئے۔ یہ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری انتخابی کامیابی تھی' لیکن ۱۹۵۳ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے موقعے پر جب پنجاب میں مارشل لا نافذ کیا گیا اور ممتاز دولتانہ کی حکومت ختم کر کے فیروز خاں نون کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا تو میاں محمد شفیع مسلم لیگ (یعنی حزب اقتدار) کو چھوڑ کر جناح مسلم لیگ یعنی ممدوٹ گروپ میں شامل ہو گئے تھے۔ پنجاب اسمبلی کی یہ اپوزیشن پارٹی تھی جو صرف گیارہ افراد پر مشتمل تھی۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور میاں عبدالباری کا تعلق پہلے ہی سے جناح مسلم لیگ سے تھا اور وہ اسی کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچے تھے۔ اس اپوزیشن میں دو غیر مسلم بھی شامل تھے اور وہ تھے مسٹر سی ای گبن اور مسٹر سنگھا۔ میاں محمد شفیع حزب اختلاف میں آئے تو انھیں اس کا

سیکرٹری جنرل بنادیا گیا تھا۔

ان کا سیاسی کردار ملاحظہ ہو کہ لوگ حزب اقتدار کی طرف دوڑتے ہیں اور یہ حزب اقتدار کو چھوڑ کر حزب اختلاف میں جا بیٹھے ہیں' جب کہ انھی دنوں حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی حزب اختلاف کے کئی ارکان حزب اقتدار میں چلے گئے تھے۔

۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد ایوبی دور میں بنیادی جمہوریتوں (بی ڈی سسٹم) کے تحت ۱۹۶۲ء میں انتخابات ہوئے تو میاں محمد شفیع (م ش) نے پھر اوکاڑا سے الیکشن لڑا۔ مجھے یاد ہے ان دنوں وہ مولانا داؤد غزنوی کے پاس آئے اور کہا کہ وہ اپنی جماعت کے بی ڈی ممبروں کو انھیں ووٹ دینے کے لیے کہیں' چنانچہ مولانا غزنوی نے مولانا معین الدین لکھوی کو خط لکھا' جس میں یہ الفاظ مرقوم تھے۔

"میاں محمد شفیع اسمبلی کے شیر ہیں' ان کی مدد سے گریز نہ کیا جائے"۔

میاں صاحب اس انتخاب میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں سکہ بند ارائیں ہوں' لیکن اس حلقے میں ارائیں برادری نے میری مخالفت کی"۔

جن حضرات نے ان کی مخالفت کی تھی' ان کے نام بھی وہ لیا کرتے تھے۔

میرا کم و بیش چالیس برس سے ان سے میل جول تھا' جب اور جہاں ملاقات ہوتی بڑی شفقت سے پیش آتے۔ کبھی کبھار ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر بھی آجاتے تھے اور دیر تک بات چیت کا سلسلہ چلتا تھا۔ میرے ساتھ پنجابی میں گفتگو کرتے تھے اور بے تکلفانہ انداز میں مجھے ہمیشہ صیغہ واحد سے پکارتے تھے۔

"تیرا کی حال اے۔ اج کل کی کر رہیاں ایں۔ توں ملدا کیوں نئیں' کتھے رہناں ایں؟"

لیکن میرا کسی سے تعارف کراتے تو بہت بڑا عالم فاضل بنا دیتے۔

ہندوستان کے سابق صدر گیانی ذیل سنگھ کا تعلق میرے قدیم وطن (ریاست فرید کوٹ) سے تھا اور میرے ان سے مراسم تھے۔ اس کا میاں صاحب کو علم تھا۔ ایک دن مجھ سے کہا۔

توں اپنے یار گیانی ذیل سنگھ نوں چھٹی چھٹی لکھدا رہیا کر۔ کدے کھدر دا چنگا موگا وی اونھوں تحفے دے طور تے بھیج دیا کر۔ یاری نبھانی چاہیدی اے' توڑنی نئیں چاہیدی۔

ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ میں تین کمزوریاں پائی جاتی ہیں' تم بتاؤ ان

میں کوئی برائی تو نہیں؟

اول: سیاسیات میں مسلم لیگی کو غیر مسلم لیگی پر ترجیح دیتا ہوں۔

دوم: فقہی مسلک میں احناف کے بریلوی نقطہ نظر کا حامل ہوں اور بریلویوں کو دیوبندیوں کی نسبت اچھا سمجھتا ہوں۔

سوم: ارائیں ہونے کی بنا پر ارائیں برادری سے تعلق رکھنے والوں سے زیادہ قرب کا اظہار کرتا ہوں۔ اگر ارائیں برادری کا کوئی شخص پڑھا لکھا ہو اور غریب ہو اور ملازمت وغیرہ کے لیے کوشاں ہو تو وہ میرے نزدیک زیادہ ہمدردی کا مستحق ہے۔

میں نے کہا میں تو اسے کمزوری نہیں سمجھتا اور نہ اس میں میرے نزدیک کوئی برائی پائی جاتی ہے۔ اپنی برادری اور رشتے داروں سے بہتر سلوک روا رکھنا اور ان کے وقار اور احترام میں اضافے کے لیے کوشاں ہونا صلہ رحمی میں داخل ہے اور قرآن وسنت کے مطابق ہے۔

اسی طرح اپنے ہم خیال و ہم مسلک لوگوں کی عزت کرنا اور ان کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھنا بھی اچھی بات ہے۔ اس سے باہمی تعلقات بڑھتے ہیں' آپس کے روابط مضبوط ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے خیر خواہی کے داعیوں میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ یہ احتیاط البتہ ہونی چاہیے کہ کسی دوسرے کو اس سے تکلیف نہ پہنچے اور اس کی حق تلفی نہ ہو۔

اپنے فقہی مسلک کی بات انھوں نے ایک مرتبہ مولانا داؤد غزنوی سے ان الفاظ میں کی کہ وہ اہل سنت والجماعت میں بریلوی مکتب فکر کے پیرو ہیں اور اس لحاظ سے دیوبندی مکتب فکر کے کسی حد تک ناقد ہیں۔

مولانا نے ان کو اپنے انداز میں انتہائی شفقت سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ دیوبندی حضرات بھی اسی طرح مسلک امام ابوحنیفہ کے پیرو ہیں' جس طرح بریلوی حضرات ان کے مقلد اور پیرو ہیں۔

۱۹۶۱ء کی بات ہے کہ میاں محمد شفیع کے ہفت روزہ "اقدام" میں اس دور کے ایک مشہور مصنف (ملک شیر محمد اعوان) نے مولانا اسماعیل شہید دہلوی اور جماعت مجاہدین کے بارے میں کچھ ایسی باتیں لکھیں جو صحیح نہ تھیں۔ میں نے "اقدام" ہی میں اس کا جواب دیا۔ اس کے بعد اس موضوع پر ایک بحث شروع ہو گئی۔ انھوں نے بھی لکھا' میں نے بھی لکھا'

کئی ہفتے یہ بحث جاری رہی- میں اس زمانے میں ہفت روزہ "الاعتصام" کا ایڈیٹر تھا- ایک دن مولانا داؤد غزنوی نے میاں محمد شفیع کو بھی اپنے ہاں بلایا اور مجھے بھی حاضر ہونے کا حکم دیا- مجھے ارشاد فرمایا کہ آپ اس موضوع پر لکھنا بند کر دیں' اور میاں صاحب سے کہا کہ آپ آئندہ اس موضوع کا کوئی مضمون شائع نہ کریں- اس طرح یہ بحث ختم ہو گئی-

ان کا ایک نوجوان بیٹا تبلیغی جماعت سے منسلک تھا- ایک دفعہ وہ رائے ونڈ گیا اور واپس آتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گیا- پولیس نے لاش لاوارث سمجھ کر دفن کر دی- کئی دن بعد میاں صاحب کو پتا چلا تو نہایت مغموم ہوئے- میرے ایک دوست چوہدری غلام نبی عزیز جو واپڈا کے ایک شعبے کے ڈائریکٹر ہیں' اپنے دور طالب علمی میں اس لڑکے کو پڑھاتے رہے تھے- بقول ان کے میاں صاحب ان پر اس لیے شفقت کرتے تھے کہ وہ ارائیں ہیں-

میں اور چوہدری غلام نبی عزیز تعزیت کے لیے میاں صاحب کے گھر ماڈل ٹاؤن گئے- ہمیں کچھ فاصلے پر آتے دیکھا تو اٹھ کر ہماری طرف بڑھے اور بغل گیر ہو کر ملے- جو لوگ وہاں بیٹھے تھے' ان سے میرا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ یہ ہندوستان کے صدر گیانی ذیل سنگھ کا دوست ہے- پھر کہا کہ بہت بڑا عالم فاضل ہے وغیرہ وغیرہ-

چوہدری غلام نبی عزیز سے مصافحہ تو کیا' لیکن ان کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوئے---- ہم نے بیٹے کے متعلق پوچھا تو انھوں نے تفصیل بتائی- کچھ دیر اظہار حزن و ملال کیا- اجازت لے کر آنے لگے تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے- میں نے چوہدری غلام نبی عزیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میاں صاحب سے کہا' شاید آپ نے ان کو پہچانا نہیں- غور سے دیکھ کر کہا' کچھ پہچان تو رہا ہوں' لیکن پوری بات ذہن میں نہیں آ رہی-

چوہدری صاحب نے خود اپنا تعارف کرایا اور ان کے مرحوم بیٹے کو پڑھانے کا ذکر کیا تو ذہن کئی برس پہلے کے واقعات کی طرف منتقل ہوا-

بولے: ہاں مجھے یاد آیا- آپ ارائیں ہیں اور فلاں شخص ہیں- اس کے بعد انھیں اپنی بیوی کے پاس لے گئے اور انھیں بتایا کہ یہ غلام نبی عزیز ہیں جو کسی زمانے میں ہمارے بیٹے کو پڑھایا کرتے تھے-

میاں محمد شفیع دلچسپ آدمی تھے- بہت سالوں کی بات ہے' وہ ایک وفد کے ساتھ چند اسلامی ملکوں کے دورے پر گئے- وفد کے سربراہ کشمیر کے میر واعظ مولانا محمد یوسف مرحوم

تھے-وفد کا مقصد کشمیر کے مسئلے سے متعلق اسلامی ممالک کے سربراہوں اور سرکردہ لوگوں کو پاکستان کے موقف سے آگاہ کرنا تھا-اس سفر میں کسی خاص تاثر کی بنا پر میاں صاحب نے داڑھی رکھ لی اور واپس آکر شلوار قمیص اور شیروانی پہننے لگے-داڑھی بالکل سفید تھی-کچھ عرصہ اسی شکل وہیئت میں رہے-بعدازاں پھر پہلی حالت میں آگئے-

وہ سدابہار قسم کے آدمی تھے-درمیانہ قد'اکہرا جسم'تیکھے نقوش'متحرک وتیز'سیاسی ومذہبی عمل وعقیدے میں پکے'لیکن نرم کلام-سردیوں میں کوٹ پتلون میں ملبوس اور ٹائی لگائے ہوئے---گرمیوں میں پینٹ بوشرٹ پہنے ہوئے-

صحت بہت اچھی تھی'لیکن آخری دور میں بیماری کی وجہ سے چہرے پر کمزوری کے آثار ابھر آئے تھے-

ہر مسلک کے اہل علم کو قابل احترام گردانتے تھے اور عالم دین کے لیے بالعموم حضرت مولانا کا لفظ استعمال کیا کرتے تھے-

مولانا محمد حنیف ندوی کے بہت مداح تھے اور ان کے پاس ان کی آمدورفت رہتی تھی-۱۲جولائی ۱۹۸۷ء کو مولانا فوت ہوئے تو وہ نماز جنازہ میں شریک نہیں تھے-چار پانچ روز کے بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ کے دفتر آئے اور آتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو کر اونچی آواز میں رونے لگے-اور کہا میں لاہور سے باہر تھا'اس لیے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا-رات آیا ہوں'سوچا کہ ان کا افسوس تمھارے ساتھ ہی ہو سکتا ہے-دعاے مغفرت کی'چند منٹ بیٹھے'پھر چلے گئے-

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ ذاتی اور معاشرتی تعلقات میں سیاسی وابستگی کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے'انھوں نے اسی (۸۰) سال عمر پا کر یکم اور ۲ ستمبر ۱۹۹۳ء کی درمیانی شب کو وفات پائی-ان کی وفات کے ساتھ ہی ہماری قبل از آزادی کی صحافت کا وہ باب ختم ہو گیا'جس میں مسلمان اور غیر مسلم صحافی اختلاف مذہب وفکر کے باوجود ایک ہی اخبار میں ایک ہی میز پر اکٹھے کام کرتے نظر آتے تھے-

# مولانا معین الدین لکھوی

۱۹۳۷ء کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ یعنی یکم جنوری کو میں اور میرے ایک ہم جماعت حاجی محمد رفیق' استاذ محترم حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کے ساتھ طالب علم کی حیثیت سے مرکز الاسلام پہنچے۔ فیروز پور سے براستہ بنگلہ فاضلکا' بہاول نگر اور سمہ سٹہ جانے والی ٹرین' دن کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے فیروز پور سے روانہ ہوتی تھی' ہم اسی ٹرین سے گئے تھے۔ پہلا اسٹیشن کھائی پھیمکی اور دوسرا جھوک ٹہل سنگھ تھا' جو فیروز پور سے بجانب مغرب چودہ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور کرایہ تھا چار آنے---!

جھوک ٹہل سنگھ کے ریلوے اسٹیشن سے نصف میل کے فاصلے پر دوسرے سگنل کے قریب دائیں جانب مرکز الاسلام تھا۔ بارہ بجے کے قریب ٹرین سے اتر کر ہم مرکز الاسلام کی حد میں داخل ہوئے تو وہاں کا جو سب سے پہلا باشندہ ہمیں ملا' میں آج سے ساٹھ سال قبل کے اس کے حلیے کی وساطت سے آپ کو اس سے ملانے کی کوشش کرتا ہوں۔

کشیدہ قامت' متوازن صحت مند جسم' اٹھتی جوانی' سرخی مائل گورا رنگ' آنکھوں میں حیا کے عنصر کا غلبہ' مناسب چہرہ نہ لمبا نہ گول' ناک نقشہ جاذب نظر' چھوٹے چھوٹے دانت' باریک ہونٹ' سفید لباس میں ملبوس' اس زمانے کے عام رواج کے مطابق تہبند باندھے ہوئے' چہرے پر معصومیت کے آثار نمایاں اور متانت کے جوہر ہویدا۔ چہرہ مہرہ بالوں کے جنجال سے آزاد---- چڑھتی جوانی بالعموم دوسروں کے لیے جذبہ احترام سے بے پروا ہوتی ہے' لیکن اس نے گردن جھکا کر اور نگاہیں نیچی کر کے نہایت احترام کے ساتھ انتہائی نرم آواز میں السلام علیکم کہہ کر پہلے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے اور مصافحہ کیا۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہوا۔

یہ وہ جوان رعنا تھا' جس نے شمسی حساب کے مطابق اس واقعے سے ٹھیک ساٹھ سال ایک مہینہ بعد ۳۔ فروری ۱۹۹۷ء کو ضلع قصور کی تحصیل چونیاں کے ایک بہت بڑے زمیندار اور صوبہ پنجاب کے بھاری بھرکم اور امیر ترین وزیر اعلیٰ سردار عارف نکئی کو قومی اسمبلی کے

انتخاب میں پینتیس ہزار سے زائد ووٹ حاصل کر کے ان کے گھر میں شکست دی ----- یعنی مولانا معین الدین لکھوی ----! حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے فرزند ارجمند ---- متحدہ پنجاب کے اولین مفسر قرآن حضرت حافظ محمد لکھوی کے پڑپوتے- میرا ان سے باسٹھ سال سے تعلق ہے اور بہت گہرا تعلق ہے- لیکن میں چوں کہ سیاسیات سے عملی دلچسپی نہیں رکھتا' اس لیے گہرے تعلق کے باوجود مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ ان کا مقابلہ سردار عارف نکئی سے ہوا تھا- وہ تو خدا بھلا کرے عزیز القدر مولانا محمود احمد غضنفر کا کہ کامیابی کے بعد انھوں نے بتایا کہ ان کے مد مقابل سردار صاحب موصوف تھے- تعجب ہوا کہ معین الدین ان کے مقابلے میں کیسے جیت گئے- نہ ان کے جتنی زمینیں' نہ ان کے جتنے مکانات' نہ ان کے جتنی کاریں' نہ ان کے جتنا پیٹ کا پھیر' نہ ان کے جتنی معدے کی لمبائی چوڑائی' نہ ان کے جتنا جسم کا بوجھ' نہ ان کے جتنا چوڑا چہرہ' نہ ان کے جتنی موٹی گردن ----! انتخاب جیتنے کے ان اوصاف میں سے کوئی صفت بھی ان میں نہیں پائی جاتی-

بہر حال جو ہونا تھا ہو گیا- تقدیر میں ایسے ہی لکھا تھا- سردار صاحب کے ساتھ افسوس کرنے سے اب کچھ حاصل نہ ہو گا- آج ۲۱- مارچ ۱۹۹۸ء ہے- اب تو اس شکست کا چالیسواں بھی ہو چکا ---- ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنا آئندہ سفر شروع کریں ----- آیے ذرا ہمارا ساتھ دیجیے-

۳۴ ویں پشت میں معین الدین کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہ کی وساطت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے- میں ان میں سے یہاں آٹھ واسطوں کا ذکر کرتا ہوں ---- اس سے آگے کا سلسلہ آپ خود کہیں سے تلاش کیجیے' اگر مل جائے تو مجھے بھی بتایے ----

معین الدین بن مولانا محمد علی بن مولانا محی الدین عبدالرحمٰن بن حافظ محمد بن حافظ بارک اللہ بن حافظ احمد بن حافظ محمد امین بن ابو داؤد شاہ-

میرا یارانہ تو معین الدین سے بے شک ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا ان سے کوئی جوڑ نہیں اور میں کسی پہلو سے بھی ان سے ہم سری کا تصور نہیں کر سکتا --- یہ دودمان فضل و کمال کے صاحب علم رکن' میں ایک معمولی گھرانے کا نیم خواندہ فرد- انھوں نے معرفت و ادراک کی فضا میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا' میں نے بے علمی کے ماحول میں پرورش پائی- یہ

تقویٰ و صالحیت کے خوش نما دائروں میں پلے بڑھے' میں نے بے عملی کے سایوں میں ماہ و سال کے سفر کا آغاز کیا--- یہ ہر آن خدمت دین میں متحرک و مستعد رہے' میں نے آوارگی و بے پروائی کے عالم میں وقت ضائع کیا--- یہ اپنی محنت اور اللہ کی مدد سے دینی و دنیوی اعتبار سے اونچے مرتبے کو پہنچے' میں اپنی سست روی و کاہلی کے باعث قلم کی مزدوری سے آگے نہ بڑھ پایا- تاہم میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اس کے باوجود انھوں نے مجھے تعلق خاطر کا مستحق گردانا اور اپنے وسعت پذیر حلقہ احباب میں شامل رکھنے کا اعزاز بخشا- پھر ان کے والد مکرم حضرت مولانا محمد علی لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فقیر کو نگاہ شفقت سے نوازا' جس کی تفصیل اس طویل مضمون میں بیان کی گئی ہے جو اسی کتاب میں ان کے متعلق مندرج ہے- ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین لکھوی مرحوم نے بھی مجھے یاد رکھا اور ان کی طرف سے میرے لیے ہمیشہ بے پناہ اپنایت کا اظہار ہوا-

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا معین الدین سے ۱۹۳۷ء کے شروع میں رسم و راہ کی ابتدا ہوئی تھی جو جلد ہی مضبوط تعلقات کے سانچے میں ڈھل گئی- یہ پورا تعلیمی سال بطور طالب علم کے میں مرکز الاسلام رہا جو مولانا معین الدین کا مسکن تھا اور ان کے گھر سمیت چار گھروں پر محیط تھا- صحاح ستہ کی مشہور کتاب سنن نسائی ہم نے ایک ساتھ پڑھی- ہمارے ایک ہم درس حاجی محمد رفیق تھے' وہ ۱۹۳۸ء میں حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کی خدمت میں کھنڈیلہ (ریاست جودھ پور) چلے گئے تھے اور میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقہ درس میں فیروز پور آ گیا تھا- مولانا عطاء اللہ صاحب مرکز الاسلام صرف ایک سال رہے تھے' بعد ازاں فیروز پور کی جماعت اہل حدیث کے اصحاب انتظام انھیں فیروز پور لے گئے تھے----
فیروز پور سے میں کئی دفعہ محی الدین اور معین الدین سے ملنے مرکز الاسلام گیا- حاجی رفیق بقدر اپنے قد کے ایک چھوٹی سی جوتی اور ایک نیلے رنگ کا تہبند' جسے مختصر ہونے کی بنا پر پنجابی میں ''تہمتی'' کہنا چاہیے' مرکز الاسلام چھوڑ آیا تھا' جو اس کچے کمرے یا کوٹھے کی ''کلی'' یا کھونٹی پر لٹکی رہتی تھی' جس میں ہمارا بسیرا تھا-

رفیق' معین الدین کا دوست تھا' اس کی ''تہمتی'' کا معین الدین نے بڑا صحیح اور ٹھیک ٹھاک نام رکھا تھا' میں فیروز پور سے جب بھی ان سے ملنے مرکز الاسلام گیا' انھوں نے اس کی ''تہمتی'' بھی مجھے دکھائی اور اس کی جوتی بھی دکھائی' جو مسجد کے باہر اس جگہ پڑی رہتی

تھی' جہاں لوگ جوتیاں اتارتے تھے- معین الدین کے پاؤں کا انگوٹھا' اس کی جوتی میں بڑی مشکل سے پھنستا تھا' لیکن یہ اس میں ضرور انگوٹھا ڈالتے تھے- کئی سال یہ دونوں چیزیں اسی حال میں رہیں- میرے اور معین الدین کے اس بے تکلف اور مخلص دوست نے ۲-نومبر ۱۹۹۶ء کو ہمارے گاؤں چک نمبر ۵۳ گ ب میں وفات پائی---- میں نے اس کی موت سے چار دن پہلے جب وہ بیمار تھا اور جڑانوالہ کے سرکاری ہسپتال میں داخل تھا' اس کی "تھمتی" سے متعلق معین الدین کا ساٹھ سال قبل کا لطیفہ سنایا تو وہ حالت مرض میں سب کے سامنے کھل کھلا کر ہنس پڑا اور دیر تک محظوظ ہوتا اور معین الدین کی حس مزاح کی داد دیتا رہا-

مرکز الاسلام میں مہمان بکثرت آتے تھے' بعض اوقات روزانہ تیس بتیس مہمان جمع ہو جاتے تھے اور ان کا کھانا معین الدین کے گھر سے آتا تھا جو ان کی قابل احترام خواتین تیار کرتی تھیں-

معین الدین یکم جنوری ۱۹۲۱ کو لکھو کے میں پیدا ہوئے- کچھ ہوش سنبھالا تو سرکاری سکول میں داخل کرا دیے گئے----- ابتدائی دینیات کی تعلیم گھر میں حاصل کی- بعد ازاں مروجہ نصاب کی بہت سی کتابیں اپنے والد گرامی قدر مولانا محمد علی لکھوی اور اپنے لائق احترام ماموں استاذ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی سے پڑھیں- بعض کتابوں کے لیے مولانا عطاء اللہ حنیف کے حضور زانوے شاگردی تہہ کیا- پھر گوجرانوالا کا عزم کیا' وہاں حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی سے تفسیر و حدیث اور فقہ واصول وغیرہ علوم متداولہ کی انتہائی کتابیں پڑھیں-

رائج الوقت علوم و فنون سے فراغت کے بعد یکے بعد دیگرے حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے دورۂ تفسیر قرآن کی تکمیل فرمائی اور امتحان میں دونوں مقامات پر درجہ اول میں کامیاب ہوئے----

مولانا احمد علی صاحب کے حلقہ درس تفسیر میں کامیابی حاصل کرنے والوں میں اس سال سندات و انعامات مولانا عبید اللہ سندھی نے تقسیم کیے تھے- یہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے- معین الدین کو سند اور انعام عطا فرماتے ہوئے مولانا سندھی نے فرمایا تھا کہ اس لڑکے کو تفسیر میں اول ہی آنا چاہیے تھا- پنجاب میں پہلی تفسیر اس کے پردادے حضرت حافظ محمد

لکھوی نے لکھی تھی جو تفسیر محمدی کے نام سے سات ضخیم جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے ---- پھر انھوں نے فرمایا کہ مجھ پر اس خاندان کا بہت بڑا احسان ہے۔ میں اس لڑکے کے پردادے حافظ محمد کی تصنیف "احوال الآخرت" پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا۔

اس فقیر نے اپنی کتاب "نقوش عظمت رفتہ" میں مولانا عبیداللہ سندھی کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور ان کے قبول اسلام اور ان کی علمی و سیاسی زندگی کی پوری داستان بیان کر دی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۹۶ء کے آخر میں مکتبہ قدوسیہ 'اردو بازار' لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔ ساڑھے چھ سو صفحات کی اس کتاب میں ان بڑی بڑی اکیس شخصیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا شمار اہل علم 'اہل سیاست' اہل صحافت 'اہل قلم اور مشاہیر خطبا و مقررین میں ہوتا ہے اور یہ وہ شخصیات ہیں 'جن سے اس فقیر کا تھوڑا یا زیادہ تعلق رہا ہے۔

میں ۱۹۳۷ء میں بطور طالب علم اور اپریل ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک بطور مدرس مرکز الاسلام رہا۔ اس اثنا میں نہایت قریب سے معین الدین کو دیکھنے کا موقع ملا اور ان سے مستحکم تعلقات قائم ہوئے۔ کئی چھوٹے بڑے سفر ان کے ساتھ کیے اور بہت سے لوگوں سے ان کی معیت میں ملاقات کے مواقع میسر آئے۔ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق وہ سفید لٹھے کا تہبند اور سفید قمیص زیب تن کرتے تھے 'پاؤں میں بوٹ پہنتے اور سر پر طرے دار سفید ململ کی پگڑی باندھتے تھے اور بڑی شان سے رہتے تھے۔ گھوڑیاں رکھنے اور ان پر سوار ہونے کا انھیں بڑا شوق تھا اور فرید کوٹ سے پولو کھیلنے والی تیز رفتار مہنگی قیمت کی گھوڑی خرید کر لاتے تھے۔

کبڈی وغیرہ قسم کے کھیل کہیں نزدیک میں ہوتے تو وہ بھی دیکھنے جاتے۔ ایک دفعہ قریب کے گاؤں "دلارام" میں کبڈی کا کھیل تھا اور دور دور سے لوگ آئے تھے۔ میں اور معین الدین بھی کبڈی دیکھنے گئے۔ کبڈی جیتنے والے نے رواج کے مطابق فاتحانہ انداز سے اکھاڑے کا چکر لگایا تو معین الدین نے اسے شاباش دیتے ہوئے تھپکی دی اور پیسے بھی دیے۔ اسے ان کی شخصیت کا پتا چلا تو جھک کر سلام کیا۔

سیاسی اور دینی رہنماؤں کو دیکھنے 'ان کی تقریریں سننے اور ان سے میل ملاپ کا بھی معین الدین کو بے حد شوق تھا --- ۱۹۴۰ء کے فروری کی بات ہے 'میں فیروز پور میں مولانا عطاء اللہ حنیف کے حلقہ درس میں شامل تھا کہ ایک دن معین الدین آئے اور رات وہیں

رہے- صبح کو اخبار پڑھا تو اس میں یہ خبر نمایاں طور سے درج تھی کہ آج لاہور میں موچی دروازے کے باہر مولانا ابوالکلام آزاد تقریر کریں گے- ہم دونوں لاہور کے لئے تیار ہو گئے- لاہور پہنچے تو پتا چلا کہ آج مولانا کہیں تقریر نہیں کریں گے' البتہ گول باغ میں ان کے اعزاز میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے چائے کی دعوت دی گئی ہے' اس میں شرکت کریں گے- پوچھتے پچھاتے ہم گول باغ پہنچے تو مولانا کی زیارت ہو گئی' اور ہم شام کو واپس فیروز پور آ گئے- معین الدین رات وہیں رہے- دوسرے دن اخبار میں پھر خبر شائع ہوئی کہ آج مولانا لاہور میں موچی دروازے کے باہر تقریر کریں گے- یہ تو مرکزالاسلام چلے گئے' لیکن میں لاہور آیا اور مولانا کی تقریر سننے کا شرف حاصل کیا- اس کی تفصیل میں نے اس مضمون میں بیان کی ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق ہے اور اس کتاب میں درج ہے-

اپریل ۱۹۴۳ء سے جون ۱۹۴۷ء تک کا چار سال کا زمانہ بڑا عجیب و غریب زمانہ تھا- اس زمانے میں' میں مرکزالاسلام میں معلم کے فرائض انجام دیتا تھا- عام طور سے دس بارہ روز کے بعد ہم نو بجے کی ٹرین سے فیروز پور چلے جاتے' ادھر ادھر کے چکر لگاتے اور جس کام سے گئے تھے' اس سے فراغت کے بعد' دہلی دروازے کے اندر بڑے بازار کے ایک ہوٹل میں بیٹھ جاتے اور اکل و شرب کا دور شروع ہو جاتا-

معین الدین علمی اور روحانی اعتبار سے بڑے خاندان کے فرزند تھے' عالم دین اور علاقے میں صاحب اثر و رسوخ----- لکھوکے اور مرکزالاسلام کے دو مدرسوں کے مہتمم و ناظم ----- عالم شباب ہی میں تدین و تقویٰ کے اوصاف سے بہرہ ور ----- لیکن ان خصائص کے باوصف نہایت خوش مزاج اور خوش طبع ----- لطیف حس مزاح کے مالک تھے اور مالک ہیں ----- جیسا کہ دوستوں کا معمول ہوتا ہے' ہماری مجلس میں ہر قسم کی باتیں ہوتی تھیں اور بے تکلفی سے ہوتی تھیں' لیکن بے تکلفی کا ہم نے ایک خاص دائرہ مقرر کر رکھا تھا' اس سے باہر کبھی نہیں نکلے- اسی کے احاطے میں رہتے تھے- اسے آپ "محیط الدائرہ" بھی کہہ سکتے ہیں- اگر اس دائرے سے کبھی باہر نکلا بھی تو میں ہی نکلا' ایسے موقع پر معین الدین نے خاموشی اختیار کر لی اور مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ دائرے سے باہر نکل گیا ہوں ----- اور مجھے عام طور سے احساس بات کرنے اور عمل کی منزل سے گزر جانے کے بعد ہی ہوتا ہے' کیونکہ بچپن سے لے کر جوانی کے آغاز تک میرا تعلق ان لوگوں سے رہا ہے'

جو عمل و حرکت کے بعد سوچنے کے عادی ہیں -- اب میں ایک معین الدین کے لیے ان ہزاروں لوگوں کو کیسے بھول جاؤں جو میرے دائیں بائیں آباد تھے اور جن سے ہر وقت کا تعلق تھا --- اب بھی اگر اس عقل و شکل کے لوگ لاہور آئیں اور میں انھیں دیکھ لوں تو جی میں ایک جذبہ سا ابھرتا ہے اور ذہن ان سے ہم کلام ہونے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ ذوق نے شاید میرے ہی دل کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا ہے۔

اے ذوق! کسی ہم دم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

سنا ہے' مشرقی پنجاب میں میرے پرانے ساتھیوں کی حکومت قائم ہو رہی ہے۔ میں ان کے قریب ہونے کی کوشش کروں تو ممکن ہے' مجھے بھی اس میں تھوڑا بہت حصہ مل جائے۔ دنیا امید پر قائم ہے' میں بھی امید لگا لوں تو میرے خیال میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

بات مولانا معین الدین کے بارے میں ہو رہی تھی۔ میں نے ان کے ساتھ بہت سے سفر کیے اور انھیں نہایت اچھا رفیق سفر پایا----- مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کی تعریف کی' حضرت عمر نے بات سنی اور خاموش رہے۔ چند روز کے بعد اس نے پھر اس کے متعلق تعریفی الفاظ کہے۔ حضرت عمر اب بھی خاموش رہے۔ کچھ دن گزرے تھے کہ اس نے پھر اسی قسم کے الفاظ میں اس کا تذکرہ کیا۔

اب حضرت عمر نے اس شخص کے متعلق اس سے چند سوالات کیے' جن میں ایک سوال یہ تھا کہ تم نے کبھی اس شخص کے ساتھ سفر کیا ہے-----؟ جواب دیا نہیں۔ ! فرمایا پھر تمھیں کیا معلوم کہ وہ شخص کیسا ہے۔ کسی شخص کی اچھائی کا علم جن باتوں سے ہو سکتا ہے' ان میں ایک رفاقت سفر بھی ہے----- سفر میں کھانے پینے' خرچ اخراجات اور آرام و تکلیف کے متعدد مراحل سے گزرنا پڑتا ہے' جو شخص ان معاملات میں دوسرے کا خیال رکھتا اور اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دیتا اور اس کو سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے' وہ بہترین شخص ہے۔

میں نے معین الدین کے ساتھ کئی سفر کیے ہیں' ریل کا طویل سفر بھی' بس کا سفر

بھی' تانگے کا بھی اور پیدل بھی- پھر ہم مسلسل کئی کئی دن سفر میں رہے ہیں---- سچی بات ہے' معین الدین میرے لیے ہمیشہ بہترین رفیق سفر ثابت ہوئے ہیں- ذیل میں چند سفروں کا ذکر کرتا ہوں-

۱۹۴۵ء کے وسط میں دوسری عالم گیر جنگ ختم ہوئی تو ملک کی مختلف جیلوں سے انگریزی حکومت نے سیاسی قیدیوں کو رہا کرنا شروع کر دیا تھا- رہا ہونے والوں میں سیاسی رہنما بھی تھے اور عام کارکن بھی-! ایک دن ہمیں پتا چلا کہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری آج قصور میں تقریر کریں گے اور رہائی کے بعد اس نواح میں ان کی یہ پہلی تقریر ہو گی- ہمیں ان دنوں سیاسی رہنماؤں کی تقریریں سننے کی عادت تھی- سخت سردیوں کا موسم تھا- میں اور معین الدین مرکز الاسلام سے تین بجے کی ٹرین پر سوار ہوئے اور فیروز پور آ گئے- فیروز پور سے قصور پندرہ میل کی مسافت پر ہے' وہاں سے ریل پر بیٹھے اور قصور آ اترے- جلسہ گاہ میں بہت بڑا مجمع تھا' شاہ جی نے رات کو نو بجے کے بعد تقریر شروع کی اور آدھی رات سے زیادہ دیر تک ان کا سلسلہ تقریر جاری رہا' ہم دو دن قصور اور اس کے ارد گرد میں رہے' اور نہایت خوش و خرم---!

اسی طرح ایک دن اخبار میں پڑھا کہ آج پنڈت جواہر لال نہرو فیروز پور میں جلسہ عام میں تقریر کریں گے- میں نے اور معین الدین نے فیروز پور کا عزم کر لیا- یہ ۱۹۴۵ء کے ستمبر کا مہینہ تھا- جواہر لال اس سے تھوڑا عرصہ پیشتر کانگرس کی "ہندوستان خالی کرو" کی تحریک میں تین سال کی قید سے رہا ہوئے تھے- اس جلسے کی جو باتیں مجھے یاد ہیں' وہ یہ ہیں کہ ایک ہندو کانگرسی نے جواہر لال کو اردو میں سپاس نامہ پیش کیا' جس میں فارسی الفاظ کی کثرت تھی- فارسی کے چند اشعار بھی سپاس نامے میں پڑھے گئے تھے- جواہر لال نے اپنی تقریر میں سپاس نامے کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میرے بھائی نے فارسی الفاظ کھلے دل سے استعمال کیے ہیں اور فارسی اشعار بھی پڑھے ہیں- فارسی میں نے بھی پڑھی ہے' لیکن ابھی تیل نہیں بیچنے لگا---- یہ "پڑھے فارسی اور بیچے تیل" کے مشہور محاورے کی طرف اشارہ تھا-

اس تقریر میں جواہر لال نے "اتنی" کو "اتی" اور "اتنے" کو "اتے" وغیرہ الفاظ بولے---- یہ الفاظ دلی اور یوپی کے لوگ بول چال میں استعمال کرتے ہیں' لیکن میں نے پہلی دفعہ سنے تھے- پہلے تو خیال گزرا کہ شاید جواہر لال توتلے ہیں' یہ "اتنی" اور "اتنے"

وغیرہ الفاظ نہیں بول سکتے۔ پھر پتا چلا کہ یوپی میں روز مرہ کی گھریلو بولی میں یہی چلتا ہے۔

جواہر لال کی تقریر میں یہ بھی سنا کہ انھوں نے کوئی بات کی اور کہا کہ

اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے' یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے' وغیرہ

ہم نے یہ کیا' یہ کیا' وغیرہ۔

انگریزی حکومت کا نقطہ نظر یہ بھی ہو سکتا ہے' یہ بھی ہو سکتا ہے وغیرہ۔

تقریر چار بجے کے لگ بھگ ختم ہوئی اور ہم شام کو چھ بجے کی ٹرین سے واپس مرکز الاسلام آگئے۔

جواہر لال ٹھہر ٹھہر کر دھیرے دھیرے بولتے تھے۔ تقریر کے بعد معین الدین نے ان کے لفظ "وغیرہ" کے بارے میں ایک عمدہ نکتہ بیان کیا۔۔ کہا معلوم ہوتا ہے جواہر لال کے پاس تقریر کے لیے الفاظ کا زیادہ ذخیرہ نہیں ہے' اسی لیے "وغیرہ" کا لفظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور الفاظ کی کمی پوری کرنے کا یہ ایک مہذبانہ طریقہ ہے۔

یہ جواہر لال کی دوسری تقریر تھی جو میں نے سنی تھی۔ اس سے ساڑھے چھ سال پہلے فروری ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لدھیانہ میں ان کی تقریر سننے کا موقع ملا تھا۔

مولانا محی الدین اور معین الدین کے حلقہ احباب کے ایک رکن چوہدری برکت علی تھے' جن کا تعلق سکونت فیروز پور کے قریب کے ایک گاؤں سے تھا۔ وہ لاہور میں اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں کسی اچھے خاصے منصب پر فائز تھے' نہایت خوش مزاج اور ہنس مکھ۔ ان کی وجہ سے میرے ساتھ بھی ان کے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ وہ ان دنوں اچھرے میں قبرستان کے قریب کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ لاہور میں رتن چند روڈ اور میکلوڈ روڈ کے درمیان ایک اچھا خاصا وسیع میدان تھا' جسے پٹیالہ گراؤنڈ کہا جاتا تھا' جنوری فروری کے دنوں میں یہاں مختلف اشیا کی نمائش لگائی جاتی تھی جو بڑی بارونق ہوتی تھی۔ چوہدری برکت علی نے ایک مرتبہ ہمیں لاہور آکر نمائش دیکھنے کی دعوت دی' ہم یہاں آئے' کئی دن لاہور رہے' اور خوب سیر سپاٹے کیے۔

یہ تو تھیں چند چھوٹی چھوٹی "سفریاں"۔۔۔۔۔! اب ایک یادگار اور دلچسپ سفر کی کہانی سنیے۔ یہ سفر دس بارہ دن پر مشتمل تھا۔

ایک دن مرکز الاسلام میں میں نے ایک سکھ دیکھا- پورے قد کا جوان- اس دور کے رواج کے مطابق خاکی زین کی پتلون پہنے ہوئے' سر پر خاکی رنگ کی پٹیالے شاہی پگڑی- پاؤں میں بوٹ- کچھ سانولا سا رنگ- منہ پر چیچک کے داغ- وہ معین الدین کے ساتھ مہمان خانے سے باہر نکلا- یہ ۱۹۴۵ء کے اکتوبر کے آخری ہفتے کی بات ہے- دن کے دو بجے کا عمل ہوگا-

میں نے اس سے کوئی دو گھنٹے بعد معین الدین سے پوچھا: یہ کون صاحب ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟



انھوں نے بتایا کہ یہ رام پورہ پھول کے رہنے والے ہیں' کل دوپہر کی ٹرین سے آئے تھے- ان کے ساتھ ان کی بیوی بھی آئی ہیں- بیوی کو "جن" کی شکایت ہے- کسی کے کہنے سے یہاں آگئے' میں نے جن نکالنے کی کوشش کی' لیکن نکلا نہیں- مجھ سے انھوں نے پرسوں رام پورہ پھول پہنچنے کا وعدہ لیا ہے- یہ دونوں میاں بیوی آج تین بجے کی ٹرین سے واپس چلے گئے ہیں- اب پرسوں میں اور تم رام پورہ پھول جائیں گے-

یہ تو ہوئی ایک بات-----!

دوسری بات یہ ہے کہ اس سے کئی دن پہلے معین الدین کے بڑے بھائی مولانا محی الدین لکھوی نے مسلم لیگ کے امیدوار نواب افتخار حسین خاں آف ممدوٹ کے مقابلے میں مجلس احرار کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا تھا- یہ صوبائی انتخابات تھے' جنھیں ۱۹۴۵ء کے انتخابات بھی کہا جاتا ہے اور ۱۹۴۶ء کے بھی-----۱۹۴۵ء کے اس لیے کہ نومبر ۱۹۴۵ء میں شروع ہوئے تھے' اور ۱۹۴۶ء کے اس لیے کہ مارچ ۱۹۴۶ء میں ختم ہوئے تھے----ان میاں بیوی کی آمد سے چھ سات دن پہلے سے میں نے اور معین الدین نے یہ پروگرام طے کر رکھا تھا کہ ہم مولانا محی الدین کے حلقہ انتخاب میں جائیں گے اور ان کے حق میں تقریریں کریں گے-

قصہ مختصر یہ کہ جو گاڑی اس وقت تین بجے کے لگ بھگ لاہور سے دہلی کے لیے روانہ ہوتی تھی' وہ پانچ بجے کے قریب فیروز پور پہنچتی تھی- ہم فیروز پور سے اس گاڑی پر سوار ہوئے اور شب کے نو بجے کے پس و پیش بھٹنڈہ ریلوے اسٹیشن پر اترے- بھٹنڈے سے چوتھا اسٹیشن رام پورہ پھول تھا جو انبالہ بھٹنڈہ ریلوے لائن پر واقع تھا- دس بجے ہم بھٹنڈے

سے انبالے جانے والی ٹرین پر بیٹھے اور رات کو سوا گیارہ بجے رام پورہ پھول پہنچے۔

رام پورہ اور پھول الگ الگ دو قصبے ہیں اور ایک دوسرے سے متصل ہیں----- جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں' اس زمانے میں رام پورہ ریاست پٹیالہ میں واقع تھا اور پھول ریاست نابھہ میں۔! اور دونوں اس طرح باہم ملے ہوئے اور ایک دوسرے سے قریب تر تھے کہ ایک قصبے کے مکان کی دیوار ریاست پٹیالہ کی حد میں ہے تو چوتھا ریاست نابھہ کی حد میں ----! اس قرب واتصال کی وجہ سے دونوں قصبے الگ الگ ناموں کے باوجود صوتی اعتبار سے ایک ہی مقام کا رنگ اختیار کر گئے تھے۔یعنی ''رام پورہ پھول۔''

ہم شب کے سوا گیارہ بجے رام پورہ پھول ریلوے اسٹیشن پر اترے تو خود میزبان اور اس کے ساتھ ایک اور سکھ یعنی دو آدمی اسٹیشن پر موجود تھے ---- بعد میں معلوم ہوا کہ دوسرا ساتھی' اس کا ملازم تھا۔ دونوں نے اپنے مذہبی طریقے کے مطابق ہاتھ جوڑ کر ہمیں سلام کیا----- وہاں سے وہ ہمیں مہمان خانے میں لے گئے جو دوسری منزل میں تین یا چار کمروں پر مشتمل تھا۔ بہت شان دار مکان۔ جس کمرے میں ہماری چارپائیاں بچھائی گئی تھیں' اس میں اٹیچڈ باتھ تھا جس میں ایک بڑا ٹب پانی کا بھر کر رکھا ہوا تھا۔ نماز کے لیے الگ کمرے میں نیا کپڑا بچھایا گیا تھا۔

میزبان نے نہایت ادب کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر مولانا معین الدین سے کہا کہ آپ دونوں کے لیے ایک پرہیز گار اور نماز روزے کے پابند مسلمان کے گھر سے کھانا تیار کرایا گیا ہے۔ اور جلیبیاں بھی مسلمان حلوائی سے بنوائی گئی ہیں ---- کھانا مسلمان نے میز پر رکھا اور وہی دودھ لایا۔

کھانا کھا چکے تو میزبان نے باتیں شروع کر دیں اور ماضی کے اوراق کھول کر بیٹھ گیا---- اس نے بتایا کہ ایک میرا بڑا بھائی تھا۔ اور وہ بیمار تھا' جس کمرے میں ہم اس وقت بیٹھے ہیں' اس میں ایک دن وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اس کے پاس بیٹھی تھی۔ اسے بیماری کا اتنا سخت دورہ پڑا کہ وہ مر گیا۔ اس کی بیوی نے کسی کو اطلاع نہیں دی' چپکے سے ایک شخص کو بلایا' اس سے کاغذ پر لکھوایا کہ میں نے اتنی زمین اپنی بیوی کو دی اور پھر اس کاغذ پر میرے مردہ بھائی کا انگوٹھا لگوا لیا---- بعد ازاں اس شخص کو گھر سے نکال کر رونا پیٹنا شروع کر دیا ----- وہ شخص ہمیں یہ باتیں بھی بتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ باقاعدہ جگہ کی نشان دہی بھی کر

رہا تھا کہ یہاں میرا بھائی مرا تھا' یہاں اس کی لاش پڑی تھی اور یہاں اس کا انگوٹھا لگوایا گیا تھا اور یہاں وہ عورت بیٹھی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک سکھ میزبان ہمیں یہ کتھا سناتا رہا اور ساتھ ساتھ موقع واردات کی نشان دہی کرتا رہا--- سامنے تھوڑی دور مرگھٹ تھا' اس نے اشارہ کر کے بتایا کہ یہاں سے اس کی ارتھی اٹھائی گئی اور وہاں اسے جلایا گیا۔

اندازہ کیجیے' ایک تو گئے جن نکالنے' دوسرے جگہ اجنبی' تیسرے پوری نشان دہی کے ساتھ بتانے والا موقع واردات کا تعین کر رہا ہے' چوتھے گھر غیر مسلم کا---- میں تو سچی بات ہے ڈر گیا-- بار بار جی چاہا کہ اس سے کہوں کہ یا تو آپ یہاں سے تشریف لے جائیے یا یہ رام کہانی بند کیجیے------ سنتے سنتے برا حال ہو گیا تھا اور دل دہلنے لگا۔

خدا خدا کرے وہ اٹھا تو معین الدین سے میں نے کہا' مجھے سخت پیشاب لگ رہا ہے۔

حضرت نے نہایت آرام سے فرمایا' یہ غسل خانہ ساتھ ہی تو ہے' اٹھو' پیشاب کر لو۔

عرض کیا: میرا سارا جسم مارے ڈر کے کانپ رہا ہے------ موت سامنے کھڑی نظر آ رہی ہے------ اگر یہی حالت رہی تو میں تھوڑی دیر کو مر جاؤں گا------ میں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں------ مجھے اٹھا کر یا ہاتھ سے پکڑ کر پیشاب کرنے والی جگہ پر بٹھاؤ۔

وہ ہنستے اور مجھ بے حال کا مذاق اڑاتے ہوئے اٹھے اور پیشاب کرایا--- اب اندھے کی طرح مجھے بازوؤں سے پکڑ کر چارپائی پر بٹھانے لگے تو میں نے کہا میں تو اکیلا نہیں لیٹوں گا۔ آپ کے ساتھ ہی لیٹوں گا۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ ہی لیٹا اور تین چار گھنٹوں کی جو رات رہ گئی تھی وہ جن بھوتوں کے تصور میں کٹی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے سامنے جن ناچ رہا ہے اور ادھر بھوت دوڑا آ رہا ہے۔

صبح ہوئی تو ناشتا آ گیا اور میزبان ہمیں پھر تسلی کرانے لگا کہ یہ ناشتا مسلمان کے گھر سے تیار کرایا گیا ہے------ مجھے تو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ کس کے گھر کا ہے' جو کسی نے دیا' کھا پی لیا' معین الدین کے بارے میں پتا نہیں کہ وہ غیر مسلمان کے گھر سے کھانے پینے سے پرہیز کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔

اب ہم نے بالکونی پر کھڑے ہو کر دیکھا تو نیچے دور تک پھیلے ہوئے دالان میں کتنے ہی کچے مکان اور جھونپڑیاں سی تھیں۔ میزبان نے بتایا کہ یہ اس کے مزارعوں کے گھر ہیں۔

نو بجے کے قریب وہ بیوی کا جن نکالنے کے لیے ہمیں اپنے گھر لے گیا۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ معین الدین جن کیسے نکالتے ہیں۔

مہمان خانے سے چند قدم کے فاصلے پر ہم میزبان کے مکان پر تھے۔ ایک صاف ستھرے کمرے میں چارپائی پر وہ خاتون لیٹی ہوئی تھی۔ تین کرسیاں رکھی گئی تھیں' ایک پر خاتون کا شوہر بیٹھ گیا اور دو پر ہم بیٹھ گئے۔ معین الدین نے اس کے شوہر سے کہا:

بی بی پر بڑی سی چادر ڈال دو۔۔۔۔

چادر ڈال دی گئی تو انھوں نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اتنے میں بھاری بھرکم سی آواز عورت کے حلق سے بلند ہوئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جن حاضر ہو گیا ہے۔ اب خاتون کے پاؤں سے گھبراہٹ کی وجہ سے سفید چادر سرک گئی تھی۔ مولانا نے اس کے شوہر سے کہا:

بی بی کے پاؤں پر چادر ڈال دو۔

یہ آج سے باون ترپن برس پہلے (اکتوبر ۱۹۴۵ء) کی بات ہے' مولانا معین الدین اور جن کا جو مکالمہ مجھے یاد ہے' وہ آپ سے عرض کرتا ہوں۔ خاتون کی آواز عجیب طرح کی ہو گئی تھی اور وہ دراصل جن کی آواز تھی۔ دونوں کے درمیان مکالمہ پنجابی میں ہوا تھا۔ میں اس کا اردو ترجمہ کر رہا ہوں۔

مولانا: تمھارا نام کیا ہے؟

جن: نور محمد۔!

مولانا: کہاں کے رہنے والے ہو؟

جن: ضلع حصار کا۔

مولانا: اس بے چاری عورت ذات کو کیوں پریشان کرتے ہو؟

جن: اس نے میرا نقصان کیا ہے۔

مولانا: کیا نقصان کیا ہے؟

جن: میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھا روٹی پکا رہا تھا۔ یہ وہاں سے گزری۔ میرے آٹے کو پاؤں کی ٹھوکر ماری اور وہ مٹی میں مل گیا۔

مولانا: اس نے تمھیں روٹی پکاتے اور آٹا لیے بیٹھا دیکھا تھا؟

جن: نہیں۔

مولانا: تم نے اسے اپنی طرف اور اپنے آٹے کی طرف آتے ہوئے دیکھا تھا؟

جن: جی ہاں دیکھا تھا۔

مولانا: اس نے تو تمھیں نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔اگر تم نے اسے دیکھ لیا تھا تو آٹا اٹھا کر اس کے راستے سے دور کیوں نہیں کیا؟

اس پر وہ خاموش ہو گیا۔ اب مولانا نے کھڑے ہو کر دونوں کانوں میں انگلیاں ڈالیں اور اونچی آواز سے اذان دینا شروع کر دی۔۔۔ادھر اذان کا پہلا کلمہ بلند ہوا' اور ادھر آواز آنے لگی' ہائے جل گیا' ہائے مر گیا۔۔۔اس اثنا میں چادر پھر خاتون کے پاؤں سے سرک گئی اور اس کی پنڈلیاں نظر آنے لگیں۔۔۔ مولانا نے اس کے شوہر سے کہا' بی بی کے پاؤں اور ٹانگوں پر اچھی طرح چادر ڈال دو'۔۔۔۔۔چادر ہاتھوں سے دبائے رکھو' اترنے نہ دو۔

مولانا جن سے مخاطب ہوئے: تم صحیح صحیح بتاؤ کون ہو؟

جن: میں آپ کے پردادے حافظ محمد کا شاگرد ہوں۔

مولانا: ان کے حلقۂ شاگردی میں کہاں رہے؟

جن: لکھو کے میں۔

مولانا: کیا تم نے میرے پردادے سے یہ تعلیم حاصل کی ہے کہ عورتوں کو پریشان کرو؟ یہ تعلیم اسلام کے خلاف ہے' میرے پردادے نے ہرگز کسی کو یہ تعلیم نہیں دی۔ تم اس عورت کو پریشان نہ کرو اور چلے جاؤ۔

جن: میں آپ کا بہت احترام کرتا ہوں اور آپ کے حکم سے چلا جاتا ہوں۔

مولانا: کوئی نشانی دے جاؤ۔

اس نے مکان کی پختہ دیوار سے ایک پختہ اینٹ نیچے گرائی اور بھاری بھرکم آواز میں السلام علیکم کہہ کر چلا گیا۔

کہتے ہیں' جن جاتے ہوئے اگر اس طرح کوئی نشانی دے جائے تو دوبارہ نہیں آتا۔

اب وہ خاتون نڈھال ہو گئی تھی۔ اس نے تمام جسم پر اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح چادر لپیٹی اور کروٹ لے کر دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

مولانا نے فرمایا: اب ان شاءاللہ بی بی کو یہ شکایت نہیں ہو گی۔۔۔۔۔اور ہم اسی دن دوپہر کے وقت بھٹنڈے آنے والی ٹرین پر سوار ہوئے اور ایک مقام پر آ گئے' جس کا نام

"جھنبا" تھا- یہاں ہمارے دو دوست رہتے تھے- ایک کا نام حکیم محمد یاسین تھا اور دوسرے ان کے عزیز تھے' محمد جمیل' جو ان سے علم طب پڑھتے تھے- ایک رات ہم وہاں رہے-

رام پورہ پھول کے ہمارے اس سکھ میزبان کے گھر میں میں نے دیکھا کہ کوئی بچہ یا چھوٹا بڑا کوئی فرد نہ تھا- صرف دونوں میاں بیوی تھے اور تیسرا ان کا ملازم تھا- میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کے بچے کہاں ہیں؟

اس نے بتایا کہ ایک بیٹی ہے اور ایک بیٹا ہے- دونوں امرتسر کے ایک کالج میں تعلیم حاصل کرتے ہیں-

سکھ مرد کے مقابلے میں سکھ عورت نہایت خوب صورت تھی- دونوں کو دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے پری دیو کا ساتھ ہو' اس کی پنڈلیاں اس کی سفید چادر سے ہم رنگ تھیں-----

اب جھنبا سے ہمارے نئے سفر کا آغاز ہوتا ہے اور ہم نئی مہم پر روانہ ہوتے ہیں- یہ وہی سفر اور وہی مہم ہے' جس کا پروگرام ہم نے رام پورہ پھول کی طرف روانہ ہونے سے کئی دن پہلے سے بنا رکھا تھا- یعنی مولانا محی الدین کی انتخابی جدوجہد کا پروگرام-!

اس سفر میں ہم نے کئی دیہات کا دورہ کیا' ہر جگہ انتخابی تقریریں کیں اور لوگوں سے مولانا محی الدین لکھوی کو ووٹ دینے کی اپیل کی- دس گیارہ دن ہم اس مہم پر رہے- ایک دن ہم ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو جا رہے تھے کہ سخت بھوک لگی- آج کل کی طرح اس زمانے میں نہ سڑکیں تھیں' نہ تانگے تھے اور نہ بسیں تھیں- کچے راستے تھے اور پیدل کا سفر- اب تو ہر گاؤں میں چائے خانے کھلے ہیں' کھانے پینے کی ہر شے دکانوں سے مل جاتی ہے اور سڑکوں نے دیہات کو چھوٹے چھوٹے شہروں کی شکل میں بدل دیا ہے- اس وقت تو اس کا تصور بھی نہیں تھا------ ہمارا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا- کچھ آگے نکلے تو ایسا راستہ آیا' جس کے دونوں طرف جھاڑیاں پھیلی ہوئی اور بیروں سے لدی ہوئی تھیں- ہم ان پر یہ کہہ کر ٹوٹ پڑے کہ اصل ووٹ یہی ہیں جو ان جھاڑیوں کو لگے ہوئے ہیں- یہ بیر ہمارے لیے نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتے تھے- جتنے کھائے جا سکتے تھے' ہم نے کھائے-

ایک دن ایک گاؤں میں ہمیں رات پڑ گئی' نہ کوئی جان نہ پہچان- مسجد میں عشا کی نماز پڑھی اور بیٹھ گئے- وہاں سے ہمیں کوئی شے ملنے کی امید نہ تھی- گڑ شکر کی کوئی دکان بھی کھلی

نہ تھی- اب تو دیہات میں رات کو قمقموں کی بہار آجاتی اور فضا میں ہر سو روشنی کی چادر تن جاتی ہے- ٹیلی ویژن سے گانے سنے جاتے ہیں اور وی سی آر پر فلمیں دیکھی جاتی ہیں- اس وقت یہ رونقیں کہاں تھیں- سورج غروب ہوتے ہی رات پڑ جاتی تھی اور لوگ گھروں میں گھس جاتے تھے-

عشا سے کافی دیر بعد ایک شخص آیا- ہمیں بستر بھی دے گیا اور کھانا بھی کھلا گیا- وہ سرسوں کا ساگ اور باجرے کی روٹی لے کر آیا تھا-

ایک گاؤں میں ایک سکھ نے نہایت احترام کے ساتھ ہمیں کھانا کھلایا اور چائے پلائی- رات رہنے کو کہا' لیکن ہم نہیں رہے-

دیہات کے عام لوگ لکھوی حضرات کو جانتے تھے' بس ذرا نام لیا' لوگ جمع ہو گئے- ہماری باتیں بھی غور سے سنیں' تقریر بھی سنی اور خدمت بھی خوب کی- لیکن بعض مقامات ایسے بھی تھے' جہاں کے لوگ زیادہ نہیں جانتے تھے' جن دیہات میں ہم انتخابی سلسلے میں گئے' ان سب کے نام تو اب یاد نہیں رہے' البتہ اس دورے کا آخری دن مشہور مدرس و مصنف حضرت مولانا محمد عبدہ کے گاؤں موضع وٹو اور اس سے متصل موضع مراڑھ میں گزرا تھا- مراڑھ میں ہم نے رات کو تقریریں بھی کی تھیں جو لوگوں نے نہایت شوق سے سنی تھیں- ان دونوں مقامات کے لوگوں سے ہمارے ذاتی تعلقات بھی تھے-

دس بارہ دن کے بعد ہم واپس مرکز الاسلام پہنچے- کچھ دن آرام کیا- آئندہ دورے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ جماعت مجاہدین کے سربراہ حضرت مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کا کسی کے ہاتھ خط آگیا کہ نواب افتخار حسین خاں کا مقابلہ نہ کیا جائے- اس خط کی آمد کے ساتھ ہی ہمارے تمام منصوبے ختم ہو گئے ------ مجموعی طور سے ہمارا یہ دورہ بہت کامیاب رہا تھا- اور لوگوں نے جس شوق اور توجہ سے ہماری باتیں سنی تھیں' اس سے ہمارے حوصلے بلند ہوئے تھے-

معین الدین کی شادی حضرت مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کی صاحب زادی سے ہوئی تھی- مولانا موصوف بہت بڑے مصنف' مشہور مترجم اور معروف مقرر تھے- علاوہ ازیں ان کا شمار دہلی کے دولت مند مسلمانوں میں ہوتا تھا- وہ مارچ ۱۹۴۱ء میں فوت ہوئے تھے- مدرسہ رحمانیہ کے قریب باڑہ ہندو راؤ میں ان کی شان دار کوٹھی تھی' جو ان کی وفات کے بعد

ایک ٹرسٹ (یا مجلس منتظمہ) نے اپنی تحویل میں لے لی تھی اور ان کے اہل و عیال کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے۔ یہ مکان غالباً دہلی کے محلّہ کرشن گنج میں تھا۔

جون ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ میں اور معین الدین اور ہمارے ایک مرحوم دوست قاضی عبیداللہ دہلی گئے' دو دن ہم اسی مکان میں رہے' جس میں مولانا معین الدین کے سسرال رہتے تھے۔ اس اثنا میں ہم نے ۲۱۔ جون کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی سے اور ۲۲۔جون کو مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی۔ مولانا محمد عبدہ اس وقت مدرسہ رحمانیہ میں خدمت تدریس انجام دیتے تھے' اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کے وقت ہمارے ساتھ تھے۔ مولانا ان دنوں ہندوستان کی عارضی حکومت میں وزیر تعلیم تھے اور ۲۲ پرتھوی راج روڈ' نئی دہلی میں قیام پذیر تھے۔ اسی کوٹھی میں ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ملک میں آبادیوں کی اس طرح اتھل پتھل ہو گی کہ لوگ کہیں سے کہیں چلے جائیں گے۔

مولانا معین الدین نے مولانا آزاد سے سوال کیا کہ ہم لوگ جو دینی مدارس چلا رہے ہیں' آزاد ہندوستان میں ان مدارس کی کیا حیثیت ہو گی؟

انھوں نے فرمایا کہ آپ لوگ ان مدارس کو ان حالات کے مطابق چلائیں گے جو اس وقت پیدا ہوں گے اور اپنی استطاعت کے مطابق کام کریں گے ---- لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا۔

قرآن کے یہ الفاظ مولانا آزاد نے کچھ اس انداز سے پڑھے کہ گویا اسی موقع پر ابھی نازل ہوئے ہیں۔

مولانا آزاد نے اس سے چند روز پیشتر لکھنؤ میں ایک تعلیمی کانفرنس منعقد کی تھی' جس میں دینی مدارس کے بعض اصحاب انتظام نے بھی شرکت کی تھی۔ معین الدین کے سوال کے جواب میں مولانا آزاد نے اس کانفرنس کے انعقاد اور اس میں منظور شدہ تجاویز کا حوالہ بھی دیا تھا۔

دہلی کے اس سفر کی تفصیل اس مضمون میں بیان کر چکا ہوں جو مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق لکھا گیا ہے اور اس کتاب میں درج ہے ----- یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ معین الدین کے ساتھ میں نے دہلی کا سفر بھی کیا تھا اور وہ دلچسپ اور یادگار سفر تھا۔

ایک دفعہ معین الدین بیمار ہو گئے اور ان کی کلائی پر ایک پھوڑا سا نکل آیا' جس نے نازک صورت اختیار کر لی- فیروز پور کے سرکاری ہسپتال کے منتظم اعلیٰ ایک مسلمان ڈاکٹر تھے- چھوٹی چھوٹی سیاہ داڑھی' نہایت شریف آدمی اور نماز کے پابند- انھوں نے معین الدین کا آپریشن کیا- چند روز ہسپتال میں داخل رہے- ڈاکٹر ان کا بہت احترام کرتے تھے- اس آپریشن کا نشان اب بھی ان کی کلائی پر موجود ہے-----

اس سے پہلے انھیں بخار ہونے لگا تھا اور کئی دن بخار رہا تو کسی نے ٹی بی کے شبہے میں ڈال دیا- بڑی پریشانی ہوئی- اس وقت فیروز پور میں ملتانی دروازے کے باہر ایک مشہور طبیب رہتے تھے' جن کا نام حکیم احمد الدین تھا- وہ حکیم محمد اجمل خاں کے شاگرد تھے- دور و نزدیک سے بے شمار لوگ ان سے علاج کرانے آتے تھے- ان کی تشخیص بھی صحیح ہوتی تھی اور علاج بھی- لمبا قد' پتلے دبلے' پاجامہ پہنتے تھے' ناک میں بولتے تھے اور زبان کے سخت تھے- کسی کا لحاظ نہیں کرتے تھے- نماز وغیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا-

مولانا محی الدین ان کو معین الدین کے علاج کے لیے لکھو کے سے لے گئے- رات کو سوئے تو صبح ہو گئی' سورج نکل آیا مگر حکیم صاحب اٹھنے کا نام نہیں لیتے- کسی کو جگانے کی جرات بھی نہیں ہو رہی تھی- آخر مولانا محی الدین نے کہا' حکیم صاحب اٹھیے' سورج نکل آیا ہے' ناشتا کیجیے- حکیم صاحب اٹھے اور آلتی پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ گئے- بولے لاؤ ناشتا---! مولانا محی الدین نے کہا' ہاتھ منہ تو دھو لیجیے-

پنجابی میں جواب دیا: میں رات کوئی گویا تھپ دا رہیاں کہ منہ ہتھ دھوواں- منجی تے لماں پیا رہیاں-



لکھو کے میں ایک ڈوگر تھا' جس کا نام کالو تھا- اس نے حکیم صاحب سے کہا: ''چھوہر بڑا چنگا سی' انھوں بچا دیو'' حکیم صاحب نے جواب دیا' میں تو علاج کرنے والا ہوں' بچانے والا اللہ ہے-

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مرکز الاسلام میں مہمانوں کی بکثرت آمد و رفت رہتی تھی- ایک دن رات کو آٹھ بجے کے قریب میں اور چوہدری غلام حسین اپنے کمرے میں بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی- سردیوں کا موسم تھا اور اندھیری شب--- جنگل کی فضا میں ایسے معلوم ہوتا تھا' جیسے نصف رات بیت چکی ہے- میں نے

دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان لڑکی کھڑے ہیں۔ مرد کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گٹھری ہے۔ بولا:

ہم مسافر ہیں اور یہاں رات رہنا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا: اس وقت کہاں سے آئے؟

کہا: ریل سے اترے ہیں۔

میں نے کہا: ریل کو گزرے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا ہے' اس وقت تک کہاں رہے؟

جواب دیا: راستہ بھول گئے تھے۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو وہاں ستاروں کی حکمرانی تھی۔ اور بڑے چھوٹے بے شمار ستارے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے تھے۔

مرد سے کہا: بی بی کو عورتوں میں مولانا کے گھر بھیج دیتے ہیں' تم مہمان خانے میں لیٹ جاؤ۔

اس نے کہا: یہ گھر نہیں جائے گی' میرے پاس ہی رہے گی۔ عورت نے بھی یہی کہا کہ میں اسی کے پاس رہوں گی' گھر نہیں جاؤں گی۔

وہ مہمان خانے میں چلے گئے تو میں نے چوہدری غلام حسین سے کہا: یہ شخص اس عورت کو اغوا کر کے لایا ہے۔

انھوں نے کہا: تمھیں کیسے پتا چلا؟

میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ولی را ولی می شناسد۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے معین الدین کو بھی بلا لیا۔ یہ ہمارے کمرے میں بیٹھ گئے۔ میں نے جا کر مہمان خانے کا دروازہ کھٹکھٹایا' مگر کوئی جواب نہ آیا۔ پھر کھٹکھٹایا تو اب بھی خاموشی رہی۔ تیسری دفعہ دروازہ کھٹکھٹا کر میں نے سختی سے کہا: دروازہ کھولتے ہو یا نہیں۔

دروازہ کھلا تو میں نے پوچھا: سچ بتاؤ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟

مرد نے کہا: یہ میری بیوی ہے۔ عورت نے بھی یہی جواب دیا۔۔۔۔ میں نے چند سوالات کیے تو مرد کے قدم اکھڑ گئے۔ لیکن عورت اپنے موقف پر قائم رہی۔ پھر دو چار سوال اس سے پوچھے تو وہ بھی اپنی جگہ سے ہل گئی۔۔۔۔ میں نے کہا اگر کھوج لگاتے ہوئے تمھارے وارث یہاں آ گئے تو کیا ہو گا۔ بہر حال نماز فجر سے پہلے ہی وہ مہمان خانہ خالی کر

گئے۔

۱۹۴۷ء کے جون میں دو مہینے کی چھٹیاں ہوئیں تو ہم لوگ مرکز الاسلام سے اپنے گھر چلے گئے‘ مولانا معین الدین چندے کے لیے تحصیل چونیاں کو روانہ ہو گئے۔ تحصیل چونیاں اس وقت ضلع لاہور کی تحصیل تھی‘ اب ضلع قصور کی تحصیل ہے۔ معین الدین تحصیل چونیاں کے موضع روڈے والا میں تھے کہ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا اور ساتھ ہی قتل و غارت کے سلسلے شروع ہو گئے۔ ان کے اعزہ و اقارب اور بہن بھائی سب لکھوکے اور مرکز الاسلام یعنی مشرقی پنجاب ضلع فیروز پور میں تھے‘ اور یہ وہ علاقہ تھا جس میں مسلمانوں پر سکھ سخت مظالم ڈھا رہے تھے۔ معین الدین شدید پریشانی میں مبتلا تھے۔ اپنے اقربا کی خیر و عافیت کے لیے وہ دعا ہی کر سکتے تھے‘ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اگر ان کے عزیز اور رشتے دار خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں تو وہ اپنی پوری زندگی اللہ کے دین کے لیے وقف کر دیں گے۔ دعا قبول ہوئی۔ ان کے تمام عزیز خیر و عافیت سے پاکستان آ گئے اور انھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا‘ اس کے مطابق اپنے آپ کو اللہ کے دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

معین الدین اور ان کے رشتے دار اوکاڑے آ گئے۔ ہم لوگوں نے جڑانوالہ (ضلع فیصل آباد) کے ایک گاؤں کو اپنا مسکن قرار دے لیا۔ مجھے پتا چلا کہ مولانا معین الدین اوکاڑا میں مقیم ہیں‘ ان سے ملاقات کے لیے اوکاڑے گیا۔ انھوں نے اپنی لکھوکے والی درس گاہ (جامعہ محمدیہ) کے تبادلے میں اوکاڑا میں ایک بلڈنگ الاٹ کرا لی تھی۔ اپنے دو تین عزیزوں کے ساتھ یہ اس میں مقیم تھے۔ میں وہاں پہنچا تو چوہدری غلام حسین تہاڑیہ بھی آ گئے۔ انھوں نے ضلع قصور کے ایک مقام ”تلونڈی“ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہ بھی مرکز الاسلام میں معلم تھے اور انگریزی پڑھاتے تھے۔

اب تو اوکاڑا ”ضلع“ ہے۔ اس وقت ضلع منٹگمری (حال ساہیوال) کی ایک تحصیل تھا۔ معین الدین کے رشتے دار اس تحصیل کے مختلف مقامات میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین نے دیپال پور کے قریب ایک گاؤں ”تارا سنگھ“ کو اپنا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ انھوں نے پہلے اس کا نام ”مرکز الاسلام“ رکھا‘ پھر ”الہ آباد“ کے نام سے موسوم کیا۔۔۔۔

معین الدین کو زمینوں کی الاٹ منٹ کے سلسلے میں کئی جگہ جانا اور پٹواریوں اور تحصیل

داروں سے ملنا پڑتا تھا۔ زمینوں کی الاٹ منٹ کو اس زمانے میں "عارضی مستقل الاٹ منٹ" کہا جاتا تھا' یعنی آباد کاری کے محکمے نے اس میں دو تضاد جمع کر دیے تھے۔ ان کے نزدیک یہ الاٹ منٹ عارضی بھی تھی اور مستقل بھی۔!

اس بھاگ دوڑ کے لیے انھوں نے ساٹھ روپے کا نیا سائیکل خرید لیا تھا۔ مجھے اور چوہدری غلام حسین کو ان کا یہ سائیکل دیکھ کر بڑا رشک آتا تھا۔ معین الدین ترس کھا کر ہم میں سے کسی کو کبھی یہ سائیکل دے دیتے تھے کہ جاؤ تم بھی میرے نئے سائیکل کی سواری سے لطف اندوز ہو جاؤ اور کچھ سیر سپاٹا کر آؤ۔

معین الدین ادھر ادھر کا چکر لگا کر عام طور سے رات کو اوکاڑے آجاتے تھے۔

اب سنیے ہمارے کھانے پینے کے بارے میں۔۔۔۔!

معین الدین چوتھے پانچویں دن کہیں سے دس پانچ سیر آٹا لے آتے تھے۔ جامعہ محمدیہ کی ایک دیوار کے ساتھ ہم نے اینٹوں کا چولھا بنا لیا تھا۔ دو تین برتن بھی حاصل کر لیے تھے اور لوہے کا توا بھی لے لیا تھا۔ بالعموم روٹی میں پکاتا تھا' معین الدین اور چوہدری غلام حسین چولھے کے آگے بیٹھ کر روٹی سینکتے تھے۔ جس طرح کی میں الٹی سیدھی یا ونگ تڑنگی روٹی پکاتا تھا' اسی طرح یہ میرے دونوں معاون کچی پکی سی روٹی سینکتے تھے۔ چولھے میں لکڑی ڈالنا اور "آگ ڈھانا" بھی انہی کے فرائض میں شامل تھا۔۔۔۔ مجھے آپ اگر ماچھی تصور کر لیں تو وارث شاہ کے یہ شعر ہم تینوں کی حالت کی میرے خیال میں بالکل صحیح عکاسی کریں گے' جو اس نے ہیر کی نند سہتی کی زبانی اس وقت کہلائے تھے' جب رانجھا جوگی کا روپ دھار کر ہیر کے پیچھے رنگ پور کھیڑیاں گیا تھا اور ہیر کے "دیاندڑ" سیدے کھیڑے کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے خیرات اور بچھیا مانگنے کی صدا دی تھی۔ اس وقت سہتی بھینس کا دودھ دوہ یعنی چو رہی تھی اور جوگی کی آواز سن کر بھینس ڈر گئی تھی اور اس نے پاؤں ہلائے تو برتن زمین پر گر پڑا اور دودھ "رڑھ گیا" تھا۔ پھر غصے میں سہتی نے ڈنڈا مار کر جوگی کا ٹھوٹھا (کشکول) توڑ دیا تھا۔ یہ اسی قسم کا کشکول اور ٹھوٹھا تھا جس کے بارے میں ۱۹۹۶ء کی انتخابی تقریروں میں نواز شریف نے کہا تھا کہ میں اسے توڑ دوں گا۔ نواز شریف سے تو یہ نہیں ٹوٹا تھا اور ٹوٹے گا بھی نہیں' البتہ سہتی نے توڑ دیا تھا۔۔۔۔ جوگی نے اسے برا مانا تو سہتی نے کہا تھا کہ تقدیر میں ایسے ہی لکھا تھا۔۔۔۔ تو اب بتایئے یہ شعر ہماری اس وقت کی

کیفیت کے اظہار کے لیے کیسے رہیں گے جب کہ ایک بڑے خاندان کا ایک بڑا عالم اور ایک چوہدری چولھے میں آگ جھونک رہے ہیں اور میں ماچھی بن کر روٹیاں پکا رہا ہوں۔

دوسرے شعر کا دوسرا مصرع بالخصوص قابل توجہ ہے۔

گیا بھج تقدیر دے نال ٹھوٹھا لے جا ساتھوں قیمت مت دی وے
تقدیر اللہ دی کون موڑے تقدیر پہاڑاں نوں پٹ دی وے
آدم حوا نوں کڈھ بہشت وچوں تقدیر زمین تے سٹ دی وے
سلیمان جھوکے بھٹھ ماچھیاں دے تختوں چا تقدیر پلٹ دی وے

آخری دو شعر ملاحظہ ہوں۔

پنچھی مرگ پھاہی وچ آن پھاہے، نہیں خبر تقدیر دے جھٹ دی وے
تقدیر جس دے سر تے تاج رکھے قدم او سدے پر تھی چپٹ دی وے
دتی زہر تقدیر نے حسن تائیں، سیس شاہ حسین دا کٹ دی وے
وارث نبی دا دند شہید ہویا، تقدیر نہ کسے تو ہٹ دی وے

یہاں یہ عرض کر دوں کہ معین الدین ہر روز ہمارے ساتھ روٹی میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ تیسرے چوتھے دن منہ کا مزہ بدلنے اور باتیں کرنے کے لیے شرکت کرتے تھے۔ ان کے عزیز اوکاڑے رہتے تھے، زیادہ تر وہ ان کے ہاں کھانا کھاتے تھے۔ البتہ سوتے عام طور سے جامعہ محمدیہ میں ہمارے ساتھ ہی تھے، جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

صبح کو اپنے ہاتھ سے حلال کی کمائی کی پکائی ہوئی روٹی کھا کر میں اور چوہدری غلام حسین اوکاڑے کی سیر کو نکل جاتے۔ وہاں فرید کوٹ اور ضلع فیروز پور کے بہت سے لوگ ہمارے واقف تھے، ان سے بھی میل جول کا سلسلہ جاری رہتا۔

ایک دن ہم سے کسی نے پوچھا: آپ یہاں کیا کام کرتے ہیں؟

چوہدری غلام حسین نے فوراً جواب دیا:

ہمیں بہت اچھا کام مل گیا ہے۔ ہم یہاں روڈ انسپکٹر ہیں-----

اس کے بعد کچھ لوگ ہمیں روڈ انسپکٹر کہنے لگے تھے۔

ایک دن ہم ریلوے اسٹیشن کے اس طرف چلے گئے، جس طرف مال گاڑیوں کے ڈبے کھڑے تھے۔ وہاں ہم نے ایک عجیب عمارت دیکھی، اس قسم کی عمارت پہلے کبھی نہیں دیکھی

تھی ---- ہم اس کے نیچے بیٹھ گئے - دیکھا کہ اس کی چھت کا ایک حصہ گولائی کی شکل میں ہے اور بہت نیچے کو جھکا ہوا ہے، جس پر لوہے کے کنڈے لگے ہوئے ہیں - اس کے ساتھ ہی کچھ حصہ اوپر کو ہے ---- پھر ایک حصہ گولائی کی شکل میں نیچے کو جھکا ہے، پھر اس کے ساتھ کا حصہ اوپر کو ہے، ساری چھت اسی قسم کی بے ڈھنگی سی ہے اور اوپر نیچے کو ہے - تمام عمارت سیمنٹ کی بنی ہوئی ہے اور مضبوط ہے - ہم حیران ہو کر اسے دیکھ رہے ہیں، اس کی چھت پر آسانی سے ہمارے ہاتھ پہنچ جاتے ہیں - ہم نے اسے چل پھر کر چاروں طرف سے دیکھا، کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا عمارت ہے اور اس کا کیا مصرف ہے - نہ اس کا کوئی دروازہ کھڑکی ہے اور نہ یہ رہائش کے قابل ہے - یہ ہے کیا شے - اور یہ کیوں بنائی گئی ہے؟ اور کس نے اس پر فضول پیسہ خرچ کیا ہے؟

اس کے نیچے ہماری طرح کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہیں، لیکن ان کے انداز نشست سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساخت اور بناوٹ سے وہ ہماری طرح متعجب نہیں ہیں ---- تین چار بھینسیں اور بکریاں بھی وہاں بیٹھی ہیں -

دو تین گھنٹے ہم نے اس اہم مسئلے پر غور کیا، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے - اب ہم وہاں سے اٹھے اور دوسرے مقامات کی سیر کے لیے روانہ ہو گئے -

دوسرے دن پھر وہاں پہنچے - پھر اس عمارت کے چکر لگائے - لیکن اب بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا -

تیسرے دن بھی ہم نے اس پر دماغ خرچ کیا - لیکن ناکام ----!

اب میں نے چوہدری غلام حسین سے کہا، یہ بالکل فضول عمارت ہے - اگر یہ کسی کام کی ہوتی تو اس کے دروازے ہوتے، کھڑکیاں ہوتیں، روشن دان ہوتے اور لوگ اس میں رہائش اختیار کرتے - پناہ گزین اس پر قبضہ کر لیتے -

یہ سب باتیں معلوم نہیں، میرے دوست چوہدری غلام حسین کو یاد ہیں یا نہیں ---- مجھے بہر حال یاد ہیں ---- ہمارا معاملہ میراثی کا سا تھا -

میراثی کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اس کو سفید لٹھے کا نیا پاجامہ کسی کا گرا ہوا ملا - میراثی نے اسے اٹھایا اور کھول کر دیکھا - اسے خیال گزرا کہ یہ پہننے کی چیز ہے ---- اب وہ اسے پہننے کی کوشش کرتا ہے - پہلے تو اس نے اس کے دونوں پائنچے دونوں بازوؤں میں ڈالے اور

اس کا گھیر چھاتی پر کیا- وہ صحیح طور سے موزوں نہ ہوا' تو دونوں ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور گھیر سر میں ڈالا- پہننے کے اس طریقے سے اسے کچھ دیکھنا اور چلنا مشکل ہو گیا تو اس نے گھیر کو پاؤں کی طرف کر کے پائنچے ٹانگوں پر چڑھانا شروع کیے- یہ طریقہ بھی صحیح نہ ثابت ہوا تو اس نے ایک پائنچا سر میں ڈالا اور دوسرا بازو میں-----! یہ بھی ٹھیک نہ رہا تو ایک پائنچا ایک ٹانگ میں ڈالا اور دوسرا ایک بازو میں----- یہ بھی درست نہ ثابت ہوا تو اس کا گھیر گردن میں ڈالا اور پائنچے نیچے گرا لیے- اس طرح بھی چلنا ممکن نہ رہا تو اسے یہ کہہ کر زمین پر پھینک دیا کہ اگر تو کوئی اچھی چیز ہوتی اور کسی کے کام آ سکتی تو تمھیں کوئی یہاں پھینک کر کیوں جاتا-

بس یہی معاملہ میں نے سوچا کہ اس عمارت کا ہے- اگر یہ کسی کام کی ہوتی تو خالی کیوں پڑی رہتی' کسی کے مصرف میں نہ آتی؟

لیکن جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو خیال ہوا کہ کسی سے پوچھ ہی لیں کہ یہ کیا شے ہے؟ ایک عورت لوہے کے تسلے (یا کڑاہئے) میں گوبر اکٹھا کر رہی تھی----- میں نے اس سے نہایت ادب سے پوچھا:

بی بی یہ کیا عمارت ہے؟

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے' الٹا مجھ ہی سے سوال کر ڈالا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟

اس کا مطلب یہ تھا کہ تم جانگلی معلوم ہوتے ہو جنھیں یہ بھی پتا نہیں کہ یہ کیا شے ہے- پھر بتایا کہ اس میں گندم' جو اور چنے وغیرہ سرکاری غلہ ڈالا جاتا ہے- پلے دار یا مزدور لکڑی کے سیدھے پھٹے لگا کر اس کے اوپر غلے کی بھری ہوئی بوریاں لے جاتے ہیں اور اس میں ڈال دیتے ہیں----- پھر جب سرکار کو اس میں سے غلہ نکالنے کی ضرورت پڑتی ہے تو نیچے سے کنڈی کھول کر اسے نکال لیا جاتا ہے-

اب ہمارے رات کو سونے کا قصہ سنیے-

ہم دو آدمی تھے- میں اور چوہدری غلام حسین' اور ایک بستر تھا جو ہم نے ایک پرانی صف پر بچھا رکھا تھا- ہم دونوں میں سے ہر ایک رات کو لحاف اپنی طرف کھینچتا رہتا- اور تقریباً ساری رات لحاف کی کھینچا کھینچائی کا عمل ہمارے درمیان جاری رہتا-

ایک دن ایک مہمان آئے اور رات ہمارے پاس رہے- ان کے لیے مولانا معین

الدین نے کہیں سے بستر مہیا کر دیا تھا۔ لیکن بستر کے سلسلے میں ہماری حیثیت ان پر واضح ہو گئی تھی۔ صبح ہوئی تو انھوں نے مجھ سے رازداری سے پوچھا:

تم کون ہو؟

میں نے اپنا پرانا وطن اور پتا ٹھکانا بتایا۔ نئے وطن کی بھی نشان دہی کی۔ حسنِ اتفاق سے وہ ہمارے بعض رشتے داروں کو جانتے تھے اور اپنے قدیم وطن میں ہماری جو حالت تھی، اس کا انھیں تھوڑا بہت علم تھا۔ میں نے اپنی کسی تکلیف یا ضرورت کا ان سے اظہار نہیں کیا، لیکن میرے قدیم مسکن اور خاندان کے متعلق سنتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ------ مجھ سے کہا میں پتوکی رہتا ہوں، تم میرے ساتھ چلو، میں تمھیں بستر دوں گا ------

اوکاڑے سے پتوکی کا فاصلہ تیس میل کے لگ بھگ ہے۔ اس زمانے میں وہاں سے پتوکی کا کرایہ آٹھ آنے تھا۔ میں بستر کے لالچ میں ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار تو ہو گیا، مگر سوچنے لگا کہ اخلاقاً یہاں سے پتوکی کا کرایہ تو یہ ادا کر دیں گے، لیکن واپسی کا کرایہ کون دے گا۔ بہرحال ہم پتوکی جانے والی بس پر سوار ہو گئے، لیکن ذہن میں یہی بات رہی کہ واپسی کیسے ہو گی۔

رات انھوں نے مجھے اپنے پاس رکھا۔ صبح کو کھانا کھلا کر کھدر کا ایک ٹھیکا ہوا بڑا سا لحاف، ایک تکیہ اور ایک دوتہی مضبوط سی رسی میں باندھ کر مجھے کہا، یہ ہے تمھارا بستر۔ اب تم ایک آدھ دن یہاں رہنا چاہتے ہو تو شوق سے رہو، اگر نہیں رہنا چاہتے تو چلو تمھیں اوکاڑے جانے والی بس پر سوار کرا دوں۔

جی میں آیا کہ یہاں رہ پڑوں اور چپکے سے بازار چلا جاؤں اور مزدوری کر کے ایک روپیہ کما لوں، پھر اوکاڑے کو روانہ ہو جاؤں گا۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ انھوں نے پھر کہا، اگر یہاں رہنے کا ارادہ نہیں ہے تو آؤ اڈے پر چلیں۔ انھوں نے ایک لڑکے کے سر پر بستر رکھا اور بس سٹاپ کی طرف چل پڑے۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے، کرایے کے معاملے میں میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ بس آئی تو مجھے ایک روپیہ دیا اور کہا آٹھ آنے تمھارا کرایہ اور آٹھ آنے تمھارے خرچ کے لیے ------ یہ تھے مولانا عبدالرحیم ---- مولانا معین الدین کے والد محترم حضرت مولانا محمد علی لکھوی کے شاگرد۔ جامعہ محمدیہ کے ایک استاذ مولانا عبدالحلیم کے والد گرامی قدر --- سیاسی مسلک کے اعتبار سے

احراری تھے اور اچھے مقرر تھے۔ میں انھیں پہلے سے جانتا تھا' یہ مجھے نہیں جانتے تھے۔
رات ہوئی تو ہم نے اپنا بستر کھولا اور مزے سے لیٹ گئے۔ یہ دونوں حیران کہ یہ بستر اسے کہاں سے ملا۔

اللہ اللہ! کتنی سخت تکلیف میں مبتلا تھے وہ لوگ جو قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پنجاب سے مغربی پنجاب میں آئے تھے۔ اب تو ہم ہنس ہنس کر اس دور کی باتیں کرتے ہیں' اس وقت جو کچھ بیت رہی تھی' اس کا اندازہ انہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو گھر بار چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ یہ لوگ بھوک سے مر رہے تھے اور یہاں کے اکثر مقامی باشندے لوٹ کھسوٹ میں لگے ہوئے تھے۔ اب یہ لوگ سکھوں کے حامی بنے ہوئے ہیں۔

چوہدری غلام حسین تہاڑیہ کا نام ان سطور میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ نئے لوگوں سے ان کا تعارف اس طرح کرایا جائے گا کہ یہ ہمارے ملک کے مشہور صحافی و ادیب اسد اللہ غالب کے سسر ہیں۔ آج کل تلونڈی ضلع قصور میں رہتے ہیں۔ میں اپنے اس پرانے دوست پر مستقل مضمون لکھوں گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

کچھ دن میں مولانا معین الدین کے پاس اوکاڑے رہا۔ پھر اپنے نئے وطن چک نمبر ۵۳ گ ب چلا گیا اور اس سے دو تین مہینے بعد لاہور آگیا اور اب تک یہیں ہوں۔ قلم کی مزدوری میرا پیشہ ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مولانا معین الدین میرے متعلق کیا خیالات رکھتے ہیں' لیکن میرے دل میں ان کا انتہائی احترام بھی ہے اور ان سے بے حد پیار بھی---!
بسا اوقات کئی کئی مہینے ملاقات نہیں ہوتی' لیکن باہمی تعلقات کبھی غبار آلود نہیں ہوئے۔ مجھے ان کے سیاسی افکار سے اتفاق نہیں' نہ میں ضیاء الحق کو صحیح سمجھتا ہوں' نہ مسلم لیگی ہوں۔ لیکن اس عدم اتفاق کو نہ انھوں نے کبھی اہمیت دی ہے اور نہ میرے نزدیک یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ ہے۔ نہ ان سے اتفاق کرنے والے ہاتھ میں جنت کا ٹکٹ لیے پھرتے ہیں اور نہ اختلاف کرنے والوں کو دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے۔ جو کسی کا جی چاہے سیاسی خیالات رکھے' یہ ہرگز کفر و اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کو کفر و اسلام کا مسئلہ قرار دینے والے نہ کفر کی حقیقت سے آگاہ ہیں اور نہ اسلام کو سمجھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس پر لڑائی جھگڑا کرنا عقل مندوں کا کام نہیں۔

معین الدین مسلکی اور دینی اعتبار سے نہایت نازک احساسات کے مالک ہیں۔ ۱۹۵۳ء

کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایک عرصے تک اپنے کئی رفقا سمیت ساہیوال جیل میں قید رہے۔

۱۹۵۱ء میں انھوں نے مہاجر سیٹ سے صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے لیے اوکاڑا سے کاغذات نامزدگی داخل کرائے۔ دوسری طرف ہمارے دوست رانا غلام صابر خاں تھے جو اپنے عزیزوں کی اونچی ملازمتوں کی بنا پر سرکاری حلقوں میں خاص اثر ورسوخ رکھتے تھے، جس کی وجہ سے معین الدین کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیے گئے اور رانا صاحب اسمبلی میں پہنچ گئے۔ معین الدین نے انتخابی عذرداری دائر کر دی، قانونی اعتبار سے ان کا موقف مضبوط تھا، لہٰذا رانا صاحب سخت پریشان ہوئے، ان کی رکنیت خطرے میں تھی۔ انھوں نے مجھ سے اور حضرت مولانا داؤد غزنوی سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ مولانا معین الدین عذرداری واپس لے لیں۔ مولانا ان دنوں تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں ساہیوال جیل میں تھے اور جامعہ محمدیہ کے آدھے حصے پر پناہ گزینوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ رانا صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ جامعہ محمدیہ سے پناہ گزینوں کا قبضہ ختم کرا دیں گے۔ معین الدین نے عذرداری واپس لے لی، لیکن رانا صاحب اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ اس کی تفصیل اس مضمون میں ملاحظہ کیجیے جو حضرت مولانا محمد علی لکھوی پر لکھا گیا ہے اور اس کتاب میں درج ہے۔

معین الدین کو اللہ تعالیٰ نے بڑی عزت دی اور وہ تین مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

۲۴-جولائی ۱۹۴۸ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی تاسیس ہوئی تو یہ اس اجلاس میں موجود تھے۔ مولانا داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب کے زمانہ صدارت میں یہ مرکزی جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے اور بعض کمیٹیوں اور سب کمیٹیوں میں بھی انھیں رکھا گیا۔ اس کی نشان دہی میں اپنی کتاب "نقوشِ عظمتِ رفتہ" کے ان مضامین میں کر چکا ہوں جو مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔

ایک مرتبہ میں کسی کام سے اسلام آباد گیا۔ اس وقت قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا اور مولانا معین الدین اسلام آباد میں تھے۔ میرا قیام راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں تھا۔ ایک دن شام کو معین الدین سے ملنے ایم این اے ہوسٹل چلا گیا۔ کافی دیر ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ واپس آنے لگا تو کہا، کچھ دیر بیٹھو، کھانا کھا کر چلے جانا۔ میں کھانے کے لالچ میں بیٹھ

گیا---- انھوں نے ایک شخص سے کہا جاؤ' دو تین پلیٹیں دال کی لاؤ۔

دال کا نام سن کر میں کھڑا ہو گیا اور عرض کیا' آپ دال کھائیے اور مجھے اجازت دیجیے۔ دال تو لاہور ہمارے گھر میں بھی مل جاتی ہے۔ اس کے لیے اتنی دور آنے اور ایم این اے سے ملنے کی کیا ضرورت تھی۔

بولے: یہاں کا گوشت اچھا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا ذبیحہ بھی مشکوک ہے اور گوشت کے جانور بھی ایسے ہی ہیں۔

میں نے کہا: آپ یہ گوشت بالکل نہ کھائیے' لیکن ہمیں کیوں روکتے ہیں۔

فرمایا: لادو بھائی اس کے لیے گوشت کی پلیٹ۔

کھانا کھا چکے تو برفی کا ڈبہ الماری سے نکالا۔ کہا یہ برفی ایک شخص دے گیا ہے۔ اس کے رنگ روپ سے بالکل پتا نہیں چلتا کہ یہ دودھ سے بنائی گئی ہے---- میں نے وہ ڈبہ پکڑ کر کہا یہ ہمیں دیجیے اور آپ خالص دودھ کی بنی ہوئی کھائیے۔

دال کے متعلق میں نے ان کو لطیفہ سنایا کہ میراثی کو کسی چوہدری نے ایک چوہدری کے پاس کوئی پیغام دے کر شہر بھیجا۔ راستے میں میراثی سوچتا گیا کہ چوہدری گوشت کھلائے گا' حلوا کھلائے گا' مٹھائی کھلائے گا---- کھانے کا وقت ہوا تو دال آگئی۔ میراثی نے دال کی چھنی اٹھائی اور اسے دیکھنے لگا------ چوہدری نے کہا دیکھتے کیا ہو' کھاؤ۔

بولا: میں اسے پوچھ رہا ہوں کہ میں تمھیں گھر چھوڑ کر آیا تھا' تم میرے پیچھے کیسے آ گئی تمھیں کس نے بتایا کہ میں چوہدری کے پاس شہر آیا ہوں۔

ایک دن معین الدین سے ملنے کو جی چاہا تو میں لاہور سے اوکاڑے پہنچ گیا۔ وہ تعویذ لکھ رہے تھے اور ارد گرد ہجوم عاشقاں تھا۔ حسب معمول بہت اچھی طرح ملے اور خوب کھلایا پلایا' چند باتیں بھی کیں' لیکن مصروفیت تعویذات ہی میں رہی---- کچھ دیر کے بعد میں نے کہا' اب بس کرو' بہت کما لیا ہے' میرے ساتھ بھی کوئی بات کرو' میں نے واپس لاہور جانا ہے۔

آہستہ سے بولے' خاموشی سے بیٹھے رہو' تم آج رات میرے پاس رہو گے۔ اس آمدنی سے رات کو تمھیں پیٹ بھر کر آم کھلاؤں گا اور صبح جاتے وقت لاہور کا کرایہ بھی دوں گا---- چنانچہ میں آموں کے لالچ میں خاموش ہو گیا' رات کو بیس سیر بہترین آم

منگوائے جو ہم نے خوب کھائے ---- میرا خیال ہے ساری رات ہی کھاتے رہے۔

ایک دن بتایا کہ ایک شخص ان کے پاس کسی مریض کو لے کر آیا کہ اس کے لیے تعویذ لکھ دیں۔ انھوں نے تعویذ لکھ دیا اور ساتھ ہی ایک طبی نسخہ لکھ دیا کہ یہ بھی استعمال کراؤ۔ نسخے میں چینی ڈالنا تھی۔ اسے بتایا کہ اس میں مناسب چینی ڈال لیں ---- وہ شخص تیسرے دن آیا اور کہا جناب دوا تو جو آپ نے لکھی تھی' مل گئی ہے' لیکن "مناسب چینی" کہیں سے نہیں ملی۔ اوکاڑے کی ہر دکان پر گیا ہوں' "مناسب چینی" کسی کے پاس نہیں ہے' اب ساہیوال جا رہا ہوں' شاید وہاں سے مل جائے۔

فرمایا! نسخہ دکھاؤ۔ نسخے کے اجزاد یکھے اور دکان سے ایک چھٹانک چینی منگوا کر اس کو دی اور کہا اس کا نام ہے "مناسب چینی" یہ نسخے میں ڈال کر مریض کو دو۔

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ مولانا معین الدین کچھ سست سے ہیں۔ "کچھ سست سے ہیں" تو میں نے کہا ہے' وہ تو انھیں بہت سست قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے متعلق ان کا یہی تجربہ ہو' لیکن میں اپنے پیارے دوست پر یہ "الزام" عائد نہیں کر سکتا۔ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ دور گزشتہ میں اگر کہیں ہمارا اکٹھے جانے کا ارادہ ہوتا تو میں انھیں تین دن پہلے کہہ دیتا تھا کہ پگڑی باندھ کر اور کپڑے پہن کر آج ہی سے تیار ہو کر چارپائی پر بیٹھ جایے۔

اگر وہ گھر سے دیر سے نکلتے اور میں انھیں کہتا کہ آپ نے دیر لگا دی ہے تو وہ مجھ سے اس کی "تصدیق" کراتے اور پوچھتے واقعی دیر ہو گئی ہے؟ میں ان کے سوال کا جواب اثبات میں دیتا تو دوڑ پڑتے اور مجھے کہتے سستی نہ کرو' جلدی کرو' بھاگو دیر ہو گئی ہے۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کی وفات کے بعد مرکزی جمعیت کے امیر کے انتخاب کے لیے مجلس شوریٰ کا اجلاس موچی دروازے کے باہر برکت علی ہال میں ہوا تھا۔ کچھ ارکان شوریٰ حضرت حافظ محمد گوندلوی ؒ کو امیر منتخب کرنا چاہتے تھے اور کچھ مولانا معین الدین کو ----! اجلاس کا وقت دس بجے کا تھا۔ لیکن مولانا تشریف نہ لائے۔ ہم لوگ جو انھیں امیر منتخب کرنا چاہتے تھے' پریشانی کے عالم میں ہال سے باہر نکل کر ان کا انتظار کرنے لگے۔ جو گاڑی' جو کار اور جو ٹیکسی وہاں رکتی' ہم دوڑ کر دیکھتے کہ شاید اس میں مولانا معین الدین ہوں ---- دس بجنے میں دو چار منٹ باقی تھے کہ حضرت تشریف لائے اور

ہماری جان میں جان آئی۔

میں ان کے بارے میں دو چار اس قسم کی باتیں تو کہہ سکتا ہوں، مگر انھیں "ست" نہیں قرار دے سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بسا اوقات وہ تیار ہونے اور گھر سے نکلنے میں بہت احتیاط کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔

مولانا داؤد غزنوی کے زمانے میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کا دفتر شیش محل روڈ پر تھا"" الاعتصام "کا دفتر بھی وہیں تھا اور میں اس کا ایڈیٹر تھا۔ مولانا معین الدین جمعیت کی مجلس عاملہ کے رکن تھے۔ عاملہ کے اجلاس کے وقت اگر کبھی انھیں رات لاہور رہنا پڑتا تو ہمارا معمول تھا کہ رات کے کھانے کے بعد بھاٹی دروازے کے باہر نور افشاں ہوٹل میں چلے جاتے اور وہاں چائے وغیرہ پیتے اور دو دو کریم رول ضرور کھاتے۔ کریم رول کھانا ہمارے فرائض میں شامل تھا۔

صبح کو ناشتا ہمارے گھر میں ہوتا اور دیسی گھی کا حلوا اور دیسی گھی کے پراٹھے پکائے جاتے۔ میں ان دنوں لوہاری دروازے کے اندر رہتا تھا۔

اب وہ دور بیت گیا اور وہ سلسلے ختم ہوگئے۔ صرف باتیں رہ گئی ہیں، تھوڑی کر لیجیے یا زیادہ------!

معین الدین دلچسپ آدمی ہیں۔ ایک دفعہ میں اوکاڑے گیا اور رات وہاں رہا۔ دوسرے دن چلنے لگا تو کہا اتنی جلدی کیوں جارہے ہو؟ عرض کیا کپڑے میلے ہوگئے ہیں، اب میں جارہا ہوں۔ بولے اچھے بھلے کپڑے ہیں۔ اس قسم کے کپڑے پہن کر تو ہم ڈی' سی کو ملنے جایا کرتے ہیں۔

یہ تو پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مولانا معین الدین کی شادی حضرت مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی مرحوم کی صاحب زادی سے ہوئی تھی۔ مولانا مرحوم کی چار بیویاں تھیں۔ ایک بیوی کا تعلق بنگال سے تھا اور قیام پاکستان کے بعد انھوں نے اپنے بچوں سمیت مشرقی پاکستان کے ایک مقام نرائن گنج کے قریب کہیں سکونت اختیار کرلی تھی---مولانا جونا گڑھی کے بھانجے اور داماد سیٹھ عبدالقادر ہالائی کا پٹ سن کا بہت بڑا کاروبار تھا، وہ بھی وہیں رہتے تھے اور مولانا معین الدین کے ہم زلف تھے۔ مولانا ایک دفعہ ان سے ملنے مشرقی پاکستان گئے، انہی کے مکان پر ان کا قیام تھا۔ ان کے بنگالی سالے کو پتا چلا تو وہ ملاقات کو آیا اور کہا کہ وہ اس کے گاؤں

چلیں۔ مولانا تیار ہو گئے۔ اس نے دو سائیکل لیے' ایک اپنے لیے اور ایک مولانا کے لیے۔
مولانا نے بتایا کہ اس نے ایک بانس لے کر اس پر کپڑا باندھا اور اسے جھنڈے کی
سی شکل دی۔۔۔۔۔ خود سائیکل پر آگے ہوا' اور مجھے پیچھے کیا۔ اب اس کے ایک ہاتھ میں
جھنڈا ہے اور ایک ہاتھ سے سائیکل کا ہینڈل پکڑا ہوا ہے۔ وہ سائیکل چلاتے ہوئے زور زور
سے نعرے لگا رہا ہے۔

یہ میرے ساتھ مولانا معین الدین ہیں۔۔۔۔ میں ان کا سالا ہوں۔۔۔۔ لوگو پیچھے
ہٹ جاؤ۔۔۔۔ نعروں کا یہ سلسلہ پورے زور اور پوری طاقت سے جاری ہے۔ اس میں
کہیں رکاوٹ نہیں ہوتی۔ مولانا فرماتے ہیں' یہ عجیب منظر تھا' میں سخت پریشان اور شرمندہ
ہو رہا ہوں اور یہ حضرت اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔۔۔۔ میں کہتا ہوں باوا چپ رہو' مگر
اس کے جواب میں ادھر زبان سے نعرہ بلند ہوا' اور ادھر۔۔۔۔ جھنڈا اوپر کو اٹھا۔۔۔۔ لوگ
گھروں سے باہر نکل آئے ہیں اور ہمیں دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔ اسی حالت میں ہم گھر پہنچے۔۔!

میں نے کہا یہ تم نے کیا حرکت کی۔!

جواب دیا: یہاں کا یہی رواج ہے۔ معزز مہمان کہیں سے آئے تو اسی طرح اسے گھر
لایا جاتا ہے اور اسی انداز سے اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

مولانا معین الدین کی مرحومہ بیوی کے ایک حقیقی بھائی محمد محمود میمن دہلوی
تھے۔۔۔۔ وہ نہایت دلچسپ آدمی تھے۔ میرے دوست تھے اور دو سال سے زیادہ عرصہ
میرے "الاعتصام" کے زمانہ ادارت میں اس اخبار کے منیجر رہے تھے۔۔۔۔ وہ کسی سے اپنا
تعارف ان الفاظ میں کرایا کرتے تھے!

"میں مولانا معین الدین کا سالا ہوں"

وہ کراچی چلے گئے تھے۔ وہیں اچانک وفات پائی۔ ان کی وفات کا سن کر مجھے انتہائی
افسوس ہوا۔۔۔۔ اب بھی ذہن میں آتا ہے کہ محمود کو ابھی مرنا نہیں چاہیے تھا۔

وہ کراچی میں روزنامہ "وفاق" کے کسی شعبے سے منسلک تھے اور "قومی ڈائجسٹ"
میں کسی شخصیت سے متعلق میرا کوئی مضمون چھپتا تو وہ ضرور پڑھتے۔ کبھی کبھی مجھے ٹیلی فون
بھی کرتے تھے۔۔۔۔ ایک دن ٹیلی فون کیا!

اسحاق صاحب! محمود میمن بول رہا ہوں۔۔۔۔ جلدی سے دو باتیں سنیے۔ ایک

بات یہ کہ جس طرح کا مضمون آپ لکھا کرتے ہیں' اسی قسم کا مضمون اپنے بارے میں لکھ کر مجھے بھجوا دیجیے۔ میں وہ مضمون آپ کے مرنے کے بعد اپنے نام سے کسی اخبار یا رسالے میں چھپواؤں گا۔ دوسرا مضمون میری مرحومہ بہن ہاجرہ پر لکھیے۔ اچھا خدا حافظ! السلام علیکم ---- ٹیلی فون بند۔

ہاجرہ مولانا معین الدین لکھوی کی بیوی تھیں' جو ۱۱ ستمبر ۱۹۸۴ء کو فوت ہوئیں۔ محمود کے اس ٹیلی فون کے بارے میں ان بہت سے دوستوں کو میں نے بتایا جو محمود کے انداز گفتگو سے آگاہ تھے ---- افسوس ہے محمود میرے مرنے کے بعد' میرے بارے میں میرا مضمون اپنے نام سے چھپوانے سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔

معین الدین چودہ پندرہ سال مرکزی جمعیت کے منصب امارت پر فائز رہے اور اس اثنا میں انھوں نے بڑی خدمات انجام دیں -- متحدہ مرکزی جمعیت کے رہنما کی حیثیت سے بھی ان کے جماعتی کارنامے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ضیاء الحق کے ساتھ ان کے بڑے گہرے مراسم تھے' اس نے مجلس شوریٰ بنائی تو ان کو اس کا رکن نامزد کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ مجلس تھی اور نہ شوریٰ ---- بس اسی قسم کا ایک اکٹھ سا تھا جو حکمران اپنی حکمرانی کی عمر لمبی کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مولانا کی نیکی اور دین داری سے متاثر تھا۔

اسلام آباد میں جامعہ سلفیہ کے لیے قطعہ زمین کے سلسلے میں ایک مرتبہ ضیاء الحق نے مولانا معین الدین کو اوکاڑے رات کے ڈیڑھ بجے ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ متعلقہ سیکرٹری کو باقاعدہ حکم دے کر زمین مستقل طور سے جامعہ سلفیہ کے نام منتقل کر دی گئی ہے۔ اب اس میں کسی قسم کی گڑبڑ کا امکان نہیں رہا ---- یہ ٹیلی فون اس نے کسی غیر ملکی دورے پر روانہ ہونے سے تین گھنٹے پہلے کیا تھا۔ مولانا سے دعا کی درخواست بھی کی تھی۔

ایک مرتبہ مولانا معین الدین اور ان کے بعض ساتھیوں نے ایک بل تیار کیا تھا' جس کا نام شریعت بل رکھا گیا تھا۔ دراصل یہ حضرات اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ یہ بل پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کا ذریعہ ثابت ہو گا۔ وہ بل کن الفاظ پر مشتمل تھا؟ اس کا مجھے علم نہیں۔ کئی دوستوں نے مجھے وہ بل پڑھنے کے لیے دیا' لیکن میں نے نہیں پڑھا۔ میں نے ان دوستوں سے کہا کہ اسے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش میں کیوں وقت ضائع کیا

جائے۔ یہی وقت کسی اچھے کام میں صرف کرنا چاہیے۔ ہزاروں دفعہ ہزاروں بل پیش کیے جائیں‘ اس ملک کے حکمران یہاں اسلام ہر گز نافذ نہیں کریں گے۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں کہ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑا ماریں----- نہ ضیاء الحق اسلام کا نفاذ چاہتا تھا‘ نہ یہ چاہتے ہیں۔ پچاس سال سے سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں‘ اور بولتے بولتے اڑ جاتے ہیں۔

اس بل کا چند روز اخباروں میں اور بعض مجلسوں میں چرچا رہا‘ پھر کچھ پتا نہ چلا کہ اس مرحوم بل کے ساتھ کیا بیتی اور وہ کدھر گیا---- اب شاید اس کے لیے کوئی دعائے مغفرت بھی نہیں کرتا ہوگا--

آخر میں یہ بھی عرض کر دیں کہ اوکاڑہ اور اس کے دور و نزدیک کے علاقوں میں جہاں مولانا معین الدین لکھوی کی بے پناہ پذیرائی ہوئی اور انھیں بہ درجہ غایت مستحق تکریم گردانا گیا‘ وہاں مقامی طور پر چند حضرات کی طرف سے انھیں ذہنی پریشانی سے بھی دوچار ہونا پڑا---- کچھ لوگ خواہ مخواہ ان پر حسد کرنے لگے اور بغیر کسی وجہ کے مخالفت پر اتر آئے----- اس سلسلے میں انھوں نے عجیب و غریب حرکتیں کیں۔ ان کی داڑھی قدرتی طور پر مختصر ہے اور اس کا طول و عرض محدود ہے‘ لیکن بالوں کی پیمائش کرنے والے بعض حضرات نے یہ کہنا شروع کیا کہ داڑھی کا یہ اختصار اور چہرے کے بالوں کی یہ محدودیت‘ عمل مقراض کا نتیجہ ہے‘ حالانکہ ان کی داڑھی کے بال کبھی آشنائے مقراض نہیں ہوئے۔ مگر ان کو اطمینان نہیں ہوا‘ انھوں نے اس حجام سے رابطہ قائم کیا‘ جس سے مولانا حجامت بنواتے تھے‘ ان کے دوستوں سے صحیح صورت حال کا پتا لینے کی کوشش کی اور چھپ چھپ کر حجام کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور انھیں اپنی آنکھوں سے حجامت بنواتے دیکھا---- پھر کہیں اس بہت بڑے مسئلے کی ریسرچ پایہ تکمیل کو پہنچی کہ ان کی داڑھی قدرتی طور پر مختصر اور محدود ہے‘ اس میں کوئی بیرونی اثر کار فرما نہیں ہے۔

بہر حال معین الدین سے ہماری بے تکلفی ہے اور ان سے بہت سی باتیں ہو جاتی ہیں۔ اپنے علمی خاندان کی یہ آبرو ہیں اور ان کی خدمات گوناگوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ میں نے ان کی زندگی کا ہر دور دیکھا ہے‘ ہر پہلو سے ان کا جائزہ لیا ہے اور سفر و حضر میں انھیں خوب پرکھا ہے۔ میں اپنے معلومات کی روشنی میں انھیں مخاطب کر کے کہوں گا:

مانند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

# ڈاکٹر اسرار احمد

۳۰- مئی ۱۹۶۵ء کو میں ہفت روزہ "الاعتصام" کی ادارت سے علیحدہ ہوا تو اس سے کچھ عرصہ بعد یہ خدمت مولوی محی الدین سلفی انجام دینے لگے تھے' ان کا تعلق جماعت اسلامی سے رہا تھا' اس لیے انھوں نے اخبار کے لیے مضامین کے سلسلے میں اپنے بعض پرانے احباب سے رابطہ قائم کیا- چنانچہ میں نے ایک دن "الاعتصام" میں ڈاکٹر اسرار احمد کا مضمون پڑھا' جس میں مولانا داؤد غزنوی کے بارے میں چند باتیں تحریر کی گئی تھیں اور اس ملاقات کا ذکر کیا گیا تھا جو انھوں نے ایک دفعہ ساہی وال میں مولانا سے کی تھی اور ان سے بعض مسائل سے متعلق چند سوالات پوچھے تھے-

ڈاکٹر صاحب کے نام سے میں پہلی دفعہ ان کے اسی مضمون کی وساطت سے آگاہ ہوا تھا- یہ آج سے کم و بیش پینتیس سال قبل کی بات ہے- مضمون کے خاص قسم کے الفاظ و اسلوب سے اندازہ ہوتا تھا کہ مضمون نگار کا تعلق جماعت اسلامی سے ہے- اس کا ذکر میں نے محی الدین سے کیا تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں اور کہا کہ وہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو چکے ہیں-

میں جماعت اسلامی کے بہت سے ارکان و متاثرین کو جانتا تھا اور بعض سے اچھے خاصے مراسم بھی تھے' جس کا تذکرہ اختصار کے ساتھ اپنی کتاب "نقوشِ عظمتِ رفتہ" کے اس مضمون میں کر چکا ہوں جو مولانا کوثر نیازی پر لکھا گیا ہے- لیکن ڈاکٹر اسرار احمد کے نام اور کام سے میں آگاہ نہ تھا-

اس کے بعد ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء کو میں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہو گیا اور تصنیف و تالیف کو اپنا مشغلہ قرار دے لیا- ۱۹۶۹ء میں پروفیسر محمد سرور جامعی ادارے سے منسلک ہوئے تو انھوں نے ایک دن بتایا کہ کل کرشن نگر کی ایک مسجد میں انھیں ڈاکٹر اسرار احمد کا درسِ قرآن سننے کا اتفاق ہوا- ان کی آواز بڑی کھنک دار اور مقررانہ ہے' وہ جرأت مندانہ لہجے میں اپنی بات کہتے ہیں اور لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں- ان کے اندازِ بیان سے پتا چلتا

ہے کہ جو بات ان کی زبان پر آتی ہے' وہ دل کی گہرائی سے نکلتی ہے ----اس قسم کی انھوں نے کئی باتیں بیان کیں۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ روایت باللفظ ہے' البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ ان کے تاثرات یہی تھے اور ان تاثرات کا اظہار انھوں نے اسی قسم کے الفاظ میں کیا تھا۔ بہ الفاظ دیگر میری اس روایت کو روایت بالمعنی سمجھئے -----اور محدثین کے نزدیک روایت بالمعنی کو بھی قابل عمل اور لائق حجت گردانا جاتا ہے۔

اس واقعہ سے چند روز بعد میں بخار' نزلہ اور زکام کی گرفت میں آگیا اور ایک ڈاکٹر سے علاج کرانے لگا۔ ایک دن اپنے معالج کے پاس جارہا تھا کہ اتفاق سے مولوی محی الدین سلفی سے ملاقات ہوگئی۔ ان سے داستان مرض بیان کی تو کہا تم ڈاکٹر اسرار احمد سے علاج کراؤ۔

میں نے پوچھا: ان کا کلینک کہاں ہے؟

جواب دیا: تمھارے قریب ہی کرشن نگر میں۔!

میں اس زمانے میں اندرون لوہاری دروازے سے نقل مکانی کرکے سانده میں آگیا تھا۔ میں نے محی الدین سے کہا: آج تو میں اپنے پہلے معالج ہی سے دوا لوں گا' کل تم میرے گھر آؤ اور مجھے ڈاکٹر اسرار احمد کے پاس لے جاؤ۔

ان سے میری بے تکلفی تھی' وہ دوسرے دن شام کو آئے اور مجھے ڈاکٹر اسرار احمد کے کلینک میں لے گئے۔ محی الدین نے میرا ان سے تعارف کرایا' انھوں نے مجھے چیک کیا اور دوا دی۔ ساتھ ہی کہا کہ چار پانچ دن دفتر نہ جاؤ' آرام کرو ----- یہ کہہ کر خود ہی مجھے میڈیکل سرٹیفکیٹ دے دیا۔

محی الدین اور ڈاکٹر صاحب باتیں کرتے رہے اور میں سنتا رہا۔ سرور صاحب کی بات صحیح تھی' ان کا لہجہ واقعی مقررانہ تھا۔ اس دن میں نے ڈاکٹر صاحب سے کوئی بات نہیں کی' سامع کی حیثیت سے بیٹھا رہا۔ مقرر کو سامعین کی ضرورت ہوتی ہے' لہٰذا میں نے اس مجلس میں فریضہ سماعت انجام دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوا ایک دن کی دی تھی اور ارشاد فرمایا تھا کہ کل پھر آنا۔ ویسے تو میں ہر معاملے میں کم زور ہوں' لیکن جغرافیے میں بالخصوص کم زور ہوں۔ اگر امتحان میں

ناکامی یا کم زوری کی کوئی اچھی ڈویژن ہو سکتی ہے تو میں اس میں فرسٹ ڈویژن کا مستحق قرار پاؤں گا- حیران ہوتا ہوں کہ تنگ بازاروں میں لوگوں کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دکان ان کی ہے- یہ لوگ صبح جاتے ہیں اور آرام سے اپنی دکان کا تالا جا کھولتے ہیں- انھیں اپنی دکان تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی- اگر میں دکان دار ہوتا تو کبھی کسی دکان کے تالے میں چابی جا پھنساتا اور کبھی کسی کے دروازے پر جا کھڑا ہوتا ----- روزانہ چوکی دار مجھے پکڑتا اور میرا اس سے جھگڑا رہتا- ہفتے میں ایک آدھ دفعہ ضرور تالا توڑنے کے جرم میں تھانے پہنچایا جاتا-

ایک دن میرے ایک عزیز کوئی چیز خریدنے کے لیے مجھے شاہ عالمی دروازے کے اندر کی دکانوں میں لے گئے- میں پہلی دفعہ اس علاقے میں گیا تھا' دیکھا کہ پیچ در پیچ چھوٹی چھوٹی دکانوں کا لمبا چوڑا جال بچھا ہوا ہے- اپنے ساتھی سے کہا اگر تم مجھے یہاں چھوڑ جاؤ تو میں اس جال میں پھنسا رہوں گا' اس سے باہر نہیں نکل پاؤں گا اور پھر رات کو چوری کے جرم میں پکڑا جاؤں گا-

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا کلینک کرشن نگر میں مین روڈ کے بالکل قریب ایک کھلی گلی میں تھا' لیکن میں نے کلینک سے باہر نکل کر اسے اچھی طرح دیکھا اور دوسرے دن وہاں پہنچنے کے لیے یہ نشانی رکھی کہ مین روڈ پر کمیٹی کا پانی کا نلکا ہے' اور اس سے ذرا آگے بائیں جانب گلی کے دوسرے مکان میں ڈاکٹر صاحب کا کلینک ہے-

ایک روایتی محبوب نے محبوبہ سے پوچھا تھا کہ میں تیرے گھر کس طرح پہنچوں' اس کی کوئی نشانی بتاؤ- پنجابی لوک گیت میں بتایا گیا ہے کہ محبوبہ نے اس سے کہا تھا-

چپل نشانی میرا گھر دے

اسی طرح ہم نے ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں پہنچنے کے لیے کمیٹی کے پانی کے نلکے کو نشانی بنایا-

یہ بات میں نے ایک دوست سے بیان کی تو اس نے ایک عجیب لطیفہ سنایا---- اس نے کہا کہ لندن میں ایک سی گلیاں اور ایک سے مکان ہوتے ہیں- پاکستان اور ہندوستان کے کچھ لوگ وہاں نئے نئے گئے تو وہ صبح کو اپنے اپنے کام پر جاتے وقت مکان کے دروازے پر کوئی نشانی رکھ جاتے تھے تاکہ مکان کی پہچان رہے- کسی نے اینٹ رکھ دی' کسی نے روڑا رکھ دیا'

کسی نے لکڑی رکھ دی- گلی کے انگریز بچوں کو اس کا پتا چلا تو وہ بعض اوقات یہ کرتے کہ جس دروازے پر اینٹ رکھی گئی ہے' اسے اٹھا کر لکڑی والے دروازے پر رکھ دیا' اور لکڑی والے دروازے پر روڑا رکھ دیا' یا اینٹ اور روڑا وہاں سے غائب کر دیے- مکان والے شام کو آتے تو اپنی اپنی نشانیوں کے مطابق اسے اپنا مکان نہ پا کر پریشان ہوتے- اس طرح ایک لطیفہ سا بنا رہتا-

وہ تو خیر لندن کی بات ہے' میں اپنی لاہور کی بات سناتا ہوں----- ایک دفعہ مجھے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے محاضرات قرآنی میں عشا کے بعد ان کے دفتر ۳۶----- کے بلاک' ماڈل ٹاؤن میں مقالہ پڑھنا تھا- ڈاکٹر صاحب کے صاحب زادے حافظ عاکف سعید صاحب شام کے بعد مجھے وہاں لے گئے- (ان کا میرے ساتھ یہی معمول تھا- مجھے ان کے کسی اجلاس میں کبھی مقالہ پڑھنا ہوتا تو وہ مجھے لے بھی جاتے اور چھوڑ بھی جاتے) مقالے سے فارغ ہو کر وہ مجھے اپنی گاڑی سے چھوڑنے آئے تو کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ مجھے کدھر لے جا رہے ہیں- میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر روٹ سمجھنے کی بہت کوشش کی' مگر کچھ نہ سمجھ سکا- اچھرے آئے تو سڑک کے اوپر کا پل دیکھ کر سمجھ میں آیا کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں-

میں حیران ہوتا ہوں کہ یہ پائلٹ کیوں کر فضا میں سونگھ لیتے ہیں کہ ان کے ہوائی جہاز کا روٹ کون سا ہے اور وہ کدھر جا رہے ہیں- اگر خدانخواستہ میں پائلٹ ہوتا تو لاہور سے چل کر دلی کے ہوائی اڈے پر اترنے کے بجائے بمبئی جا اترتا' اور بمبئی سے پیرس جانا ہوتا تو واشنگٹن جا لینڈ کرتا اور پھر وہاں سے برلن جانے کا عزم ہوتا تو ماسکو کا رخ کر لیتا- اس طرح ہوابازوں کی برادری میں اضحوکہ بنا رہتا اور ہمیشہ فضائی حدود کی خلاف ورزی کے مقدمات بھگتتا رہتا' اسی لیے شاید مجھے اللہ نے اس قسم کے کام میں نہیں لگایا-

ڈاکٹر اسرار احمد سے تعارف کا پہلا ذریعہ جیسا کہ بتایا جا چکا' مولوی محی الدین سلفی ہوئے تھے' لیکن تعارف کے ابتدائی دور ہی سے میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کا معاملہ ہمیشہ اخلاص اور ہمدردی کا رہا----- ۱۹۷۱ء کی سردیوں کے دن تھے کہ میری لڑکی اچانک شدید بیمار ہو گئی- رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا- نہایت پریشانی ہوئی کہ اب کیا کیا جائے- اس زمانے میں سانده ایک اجنبی سی جگہ تھی اور آبادی کا یہ سلسلہ نہ تھا جو اب ہے- نہ سڑک' نہ

صاف رستہ' نہ گلیاں' کہیں دو چار مکان بنے ہوئے ہیں تو ساتھ خالی زمین پڑی ہے' اور کہیں لوگوں نے سبزیاں بو رکھی ہیں- اس کے مقابلے میں ڈاکٹر صاحب کا مسکن کرشن نگر نہایت صاف ستھرا علاقہ تھا جو سانڈے سے متصل ہے ---- اور سچی بات یہ ہے کہ رہائش کے اعتبار سے سارے لاہور میں بہترین علاقہ کرشن نگر کا ہے' جسے ہم نے مسلمان بنا کر "اسلام پورہ" کے نام سے موسوم کر دیا ہے- اور سانڈہ اس لحاظ سے سب سے پسماندہ ہے-

میں رات کے گیارہ بجے کے بعد ڈاکٹر صاحب کے مکان پر کرشن نگر پہنچا اور اپنی پریشانی بیان کی- انھوں نے اسی آن دواؤں کا بیگ پکڑا اور میرے ساتھ چل پڑے- اس وقت کوئی سواری میسر نہ تھی- الٹے ٹیڑھے راستے سے پیدل میرے گھر آئے- لڑکی کو دیکھا اور ایک گھنٹے کے قریب وہاں بیٹھے رہے- پھر اسی طرح پیدل واپس گئے- میں تھوڑی دور ان کے ساتھ گیا تو کہا آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں' گھر جایئے' میں چلا جاؤں گا- میری وجہ سے پریشان نہ ہوں-

یہ آج سے چھبیس ستائیس برس پہلے کی بات ہے- اس وقت وہ جوان تھے- سیاہ داڑھی کتر بیونت کے عمل سے پاک' اچھی طرح ترشوائی ہوئی مونچھیں' لمبا قد' گھٹا ہوا جسم' تیکھے نقوش' سر پر قراقلی ٹوپی' ٹخنوں سے اوپر سفید لٹھے کی شلوار' سفید رنگ کا کرتا اور شیروانی زیب تن' صاف گرج دار آواز- چال میں تمکنت' چہرے پر متانت کا غلبہ- یہ تھے اس وقت کے ڈاکٹر اسرار احمد جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی- اب بھی وہی صورت حال ہے' بجز اس کے کہ سیاہ داڑھی' سفیدی میں بدل گئی ہے اور گھٹنوں پر درد نے غلبہ پا لیا ہے جس کی وجہ سے ان کے لیے پیدل چلنا مشکل ہو گیا ہے- کچھ عرصہ پیشتر وہ امریکہ سے گھٹنوں کا آپریشن کرا کے آئے ہیں' اس لیے بفضل خدا اب حالت بہتر ہے- اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں صحت عطا فرمائے اور ہر مرض اور تکلیف سے محفوظ رکھے-

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک اور بات سنتے جایئے- ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ادارے کی طرف سے "میثاق" کے نام سے جو ماہانہ رسالہ کئی سال سے جاری ہے' اس کا ڈیکلریشن دراصل مولوی محی الدین سلفی نے اپنے نام سے حاصل کیا تھا- ہوا یہ تھا کہ میں نے ۱۹۵۷ء کے آخر میں ایک سہ روزہ اخبار جاری کرنے کا فیصلہ کیا- اس کے نام پر غور کیا تو دو نام ذہن میں آئے- ایک "منہاج" اور دوسرا "میثاق" ---- خیال یہ تھا کہ ان دو ناموں

میں سے ایک نام سے اخبار جاری کیا جائے گا----- اسی اثنا میں ایک دن محی الدین سلفی سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ وہ ماہانہ رسالہ جاری کرنا چاہتے ہیں' جس کے مدیر و مرتب مولانا امین احسن اصلاحی ہوں گے' تم اس کا کوئی اچھا سا نام تجویز کر دو۔

میں نے یہ دو نام انھیں بتائے اور کہا کہ "منہاج" کا ڈیکلریشن میں حاصل کر لیتا ہوں "میثاق" کا آپ کر لیں' چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے ہفت روزہ "الاعتصام" سے علیحدگی اختیار کر کے جنوری ۱۹۵۸ء میں سہ روزہ "منہاج" جاری کیا جو چودہ پندرہ مہینے جاری رہا اور پھر اسے بند کر کے دوبارہ "الاعتصام" کی ادارت سنبھال لی۔

"میثاق" کے پبلشر طویل عرصے تک محی الدین رہے اور پھر یہ ذمے داری کسی اور صاحب کے سپرد کر دی گئی۔ یہ رسالہ اللہ کے فضل سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور بہت اچھا رسالہ ہے۔ "میثاق" کے ابتدائی دور اجرا میں اس کی لوح پر عیسوی سنہ نہیں لکھا جاتا تھا' ہجری سنہ تحریر کیا جاتا تھا۔ مثلاً شعبان ۱۳۸۲ھ ----- اس طرح "میثاق" کے اصحاب انتظام نے کیلنڈر کی حد تک اسے اسلامی بنا لیا تھا' جسے ہم "کیلنڈری اسلام" کا نام دے سکتے ہیں' اور میرے خیال میں اس ملک میں اسی قسم کے اسلام پر عمل ہو جائے تو بہت ہے۔

آیئے اب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ماضی کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے ہیں' اس کے بعد مستقبل کو اللہ کے حوالے کر کے حال کی بات کریں گے "حال" سے مراد "زمانہ حال" ہے ----- وہ حال نہیں جس کے متعلق عام طور سے ملنے والے سے پوچھا جاتا ہے "کیا حال چال ہیں۔"

اس وقت ۱۲۱ اکتوبر ۱۹۹۶ء کا ہفت روزہ "ندائے خلافت" پیش نگاہ ہے۔ اس کے صفحہ چار پر چوکھٹے میں ڈاکٹر صاحب کے متعلق چند سطور لکھی گئی ہیں' جن کا مفاد یہ ہے۔

۱۔ وہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۲ء کو حصار میں پیدا ہوئے جو اس وقت مشرقی پاکستان کا مشہور اور بہت بڑا ضلع تھا۔ اب صوبہ ہریانہ میں شامل ہے۔

۲۔ ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔

۳۔ دور طالب علمی میں تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اپنے ضلع کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔

۴۔ ۱۹۴۶ء میں اسلامیہ کالج (لاہور) کے حبیبیہ ہال میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن

کے ایک اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح تشریف لائے تھے۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے تمام اضلاع کے دو دو نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس موقعے پر اپنے ضلعے کی نمائندگی ڈاکٹر اسرار احمد نے کی تھی۔

۵۔ قیام پاکستان کے بعد نفاذ اسلام اور تکمیل تحریک پاکستان کے لیے جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے۔

۶۔ کچھ عرصہ جماعت میں "ہم درد" کے طور پر رہے۔ پھر اسلامی جمعیت میں چلے گئے۔ پہلے میڈیکل کالج کی جمعیت کے ناظم بنائے گئے۔ پھر لاہور کی جمعیت کے منصب نظامت پر فائز ہوئے۔ بعد ازاں پنجاب کی جمعیت کے ناظم مقرر (یا منتخب) کیے گئے۔

۷۔ تعلیم سے فراغت اور ایم بی بی ایس کی تکمیل کے بعد جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کر لی۔

۸۔ تین سال جماعت سے وابستہ رہے۔ پھر اصولی اختلافات کی بنا پر اس سے علیحدہ ہو گئے۔

۹۔ "اصولی اختلافات" کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ جماعت نے الیکشن کے میدان میں آکر اپنی اصولی' اسلامی' انقلابی جماعت کی حیثیت ختم کر کے اسلام پسند' قومی' سیاسی جماعت کا کردار اختیار کر لیا تھا۔۔۔۔ اس موضوع پر وقتاً فوقتاً ان کے افکار و خیالات کتابوں کے علاوہ اخبارات میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ "تحریک جماعت اسلامی" کے نام سے ان کا ایک' تحقیقی مقالہ بھی اس سلسلے میں چھپ چکا ہے۔

۱۰۔ ۱۹۶۵ء کے بعد سات سال تک انفرادی طور پر اسلام کا انقلابی پیغام لاہور کی مختلف بستیوں میں پھیلاتے رہے۔ کرشن نگر میں میڈیکل پریکٹس بھی جاری رکھی۔ بعض علاقوں میں درس قرآن کے حلقے قائم کیے۔

۱۱۔ ان کی انھی شبانہ روز کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۷۲ء میں "مرکزی انجمن خدام القرآن" کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کے تحت قرآن اکیڈمی' قرآن کالج اور کئی ذیلی انجمنیں قائم ہوئیں۔ کراچی' ملتان اور فیصل آباد میں بھی قرآن اکیڈمیاں قائم ہوئیں۔

۱۲۔ ۱۹۷۵ء میں "تنظیم اسلامی" قائم کی۔ ۱۹۷۷ء میں "بیعت" کا نظام اختیار کیا۔ پھر تحریک خلافت کی بنیاد رکھی تاکہ پاکستان میں صحیح خطوط پر خلافت کا نظام قائم کرنے کی

جدوجہد کی جا سکے۔

یہ ہے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اب تک کے حالات کا نہایت مختصر متن۔۔۔۔۔ اس کی شرح ہر شخص اپنے نقطہ نظر کی روشنی میں جتنی چاہے کر سکتا ہے اور جہاں تک مناسب سمجھے اسے پھیلا سکتا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آغاز عمر ہی سے ڈاکٹر صاحب متحرک اور مستعد رہے ہیں۔ ان کے ذہن میں وہ منصوبے پیدا ہوتے اور گھومتے رہتے ہیں' جنھیں اپنی تحقیق کے مطابق یہ اسلامی انقلاب کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور پھر انھیں عمل کے قالب میں ڈھالنے کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں۔

ان کے منصوبوں اور سعی و حرکت کے مختلف گوشوں سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور اتفاق بھی۔ نہ اختلاف کرنے والے کو قرآن و حدیث کی رو سے جہنم کی سزا کا مستوجب ٹھہرایا گیا ہے اور نہ اتفاق کرنے والے کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ذہانت اور علم سے لگن اور تعلق کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں نمایاں نمبروں سے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اور پھر اس سے بھی قبل چودہ سال کی عمر میں انھیں اپنے ضلع (حصار) کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سیکرٹری منتخب کر لیا گیا تھا۔ اسی عمر میں وہ اپنے ضلعے کی فیڈریشن کے نمائندے کی حیثیت سے فیڈریشن کے اس اجلاس میں شامل ہوئے تھے' جس میں قائداعظم محمد علی جناح تشریف لائے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو ابتدائے شعور ہی سے غلبہ اسلام اور اس کی نشر و اشاعت سے گہری دلچسپی تھی اور اس موضوع کی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ اس دور کے ہندوستان میں اپنے اپنے انداز سے جو حضرات اسلام کی تبلیغ و ترویج کے لیے کوشاں تھے' ان سے بھی یہ آگاہ تھے' چنانچہ اسی دور میں انھوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا لٹریچر پڑھ کر جماعت اسلامی سے وابستگی اختیار کی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے اسلام کے سوا انھیں کوئی اسلام نہیں جچا۔ یہی اسلام ان کے نزدیک اس وقت صحیح اور قابل عمل تھا۔ بعد ازاں یہ اسلام بھی ان کے نقطۂ نظر سے صحیح نہ رہا اور قابل عمل بھی نہ رہا۔

ہمارے سامنے کی بات ہے کہ طلبا کی تنظیموں سے تعلق رکھنے والے متعدد طلبا کئی کئی سال ایف اے میں پھنسے رہے' پھر بی اے سے نکلنے کا نام نہ لیا اور کئی سال اس میں کھپا

دیے۔ بعض نے یونیورسٹیوں میں جا کر ایم اے کے دائرے سے باہر آنا مناسب نہ سمجھا کہ یہاں اسلام کا ڈنکا بجانا ضروری ہے' تعلیم کی تکمیل ثانوی شے ہے۔ وہ سالہا سال پیشہ ور طالب علم رہے اور تعلیم گاہوں میں اس "پیشہ وری" کو جاری رکھنا اسلام کا جزو اولین قرار دیا اور قرار دے رہے ہیں کہ ان کے نزدیک اسلام کو غالب کرنے اور غالب رکھنے کا اصل ذریعہ یہی ہے۔ لیکن تعجب ہے ڈاکٹر اسرار احمد اسلامی جمعیت سے تعلق بلکہ اس کے عہدے دار ہونے کے باوصف تیزی کے ساتھ سکول اور کالج میں حصول علم کی منزلیں طے کرتے رہے' اور اسلام کے اس ماحول نے ان پر کوئی اثر نہ ڈالا۔ اس کی دو ہی وجہیں ذہن میں آتی ہیں یا تو اس دور میں جمعیت کے ارکان پر اسلام نے زیادہ اثر نہ ڈالا ہو گا یا پھر ڈاکٹر صاحب کے ذہن اور ہاتھوں پر اسلام کا اتنا نشہ نہ چڑھا ہو گا' ورنہ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جوانی کی بہار ہو' طالب علمی کا دور ہو' کسی طلبا تنظیم سے انسلاک ہو' اور ذہن میں حصول علم کا شوق اور ہاتھ میں کتاب ہو --- یہ "تضادات" اسرار احمد ہی میں جمع ہو سکتے ہیں' ہر تنظیمی طالب علم میں نہیں ہو سکتے۔

ڈاکٹر صاحب کی جماعت اسلامی میں سرگرمیوں کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ نہ اس زمانے میں ہم نے ان کا نام سنا تھا اور نہ ان کے کام سے واقفیت تھی۔ ہم نے ان کا نام بہت بعد میں سنا اور بہت بعد میں ان سے تعارف ہوا' جب کہ ان کا "جماعتی اسلام" ختم ہو چکا تھا۔ یہ جماعت اسلامی سے کیوں نکلے' اس کی وجہ پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ ہمارے خیال میں انھوں نے جماعت اسلامی سے نکلنے کے بعد جو کام کیا ہے اور کر رہے ہیں اور جس انداز سے کر رہے ہیں' وہ جماعت اسلامی میں رہ کر ہرگز نہ کر سکتے۔ وہاں انتخابات کے چکر ہی میں پھنسے رہتے' جیتنے کا تو اللہ کے فضل سے سوال ہی پیدا نہ ہوتا' بس یہی چیز ذہن پر سوار رہتی کہ کس حلقے سے انتخاب لڑیں اور کس اسمبلی کا لڑیں' صوبائی کا یا قومی کا۔ پھر کس کا مقابلہ کریں اور کس انداز سے کریں۔ کس سے ہاریں اور ہار کر کس انداز میں یہ ثابت کریں کہ پوری قوم ہمارے ساتھ ہے اور ہمیں مجموعی طور پر اتنے ووٹ ملے ہیں اور ہمارے مخالف کو اتنے ملے ہیں' اور وہ اتنے تھوڑے ووٹ حاصل کرنے کے باوجود کیوں کر جیت گیا ہے۔ جیت کا اعلان اس کا نہیں ہمارا ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح ووٹوں کے اعداد و شمار کا اے جی آفس کھلا ہوتا اور ڈاکٹر صاحب اپنے ارکان عملہ کے ساتھ اس میں بیٹھے حساب کتاب کر رہے ہوتے۔

جماعت اسلامی سے مختلف اوقات میں بہت سے حضرات علیحدہ ہوئے' جن میں بڑے بڑے علمائے دین بھی تھے اور واعظین و مقررین بھی تھے' ان میں سے بعض بزرگوں نے جماعت سے علیحدگی کے بعد انفرادی طور پر بہت اچھے کام بھی کیے اور کر رہے ہیں' لیکن اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر صاحب ان سب سے بازی لے گئے ہیں اور انھوں نے وہ کام کیے ہیں اور کر رہے ہیں' جن کی اس دور میں فی الواقع ضرورت تھی۔ ان کا حلقہ اثر ان سب سے زیادہ اور سب سے موثر ہے۔ ہمیں ان کی سرگرمیوں کے ہر پہلو سے اتفاق نہیں' لیکن یہ بہر حال ماننا پڑے گا کہ ان کی جدوجہد کا دائرہ بہت وسیع ہے' جس کے اثرات پاکستان میں بھی نمایاں طور سے دکھائی دیتے ہیں اور پاکستان سے باہر سمندر پار کے ملکوں میں بھی---! سب سے زیادہ موثر اور قابل ذکر ہمارے نزدیک ان کا حلقہ درس قرآن ہے۔ صاف الفاظ اور واضح اسلوب میں اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں اور ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جو بات ان کی زبان سے نکل رہی ہے' وہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھی ہے اور دل اور زبان کا آپس میں گہرا رابطہ ہے۔

اپریل ۱۹۸۱ء سے جون ۱۹۸۲ء تک پندرہ مہینے ٹیلی ویژن پر ان کے درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا جو اپنی نوعیت کا منفرد سلسلہ تھا۔ ٹیلی ویژن پر بے شمار لوگوں نے درس قرآن دیا اور ہمیشہ دیتے ہیں' لیکن ڈاکٹر اسرار احمد نے جس نہج سے درس دیا اور جس طریقے سے اپنی بات لوگوں کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کی' اس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ بلاشبہ ٹیلی ویژن کا ذریعہ ابلاغ پہلی مرتبہ اس اسلوب درس سے آشنا ہوا----- اور میرا خیال ہے کہ آخری مرتبہ بھی----!

ڈاکٹر اسرار احمد سے میرا کوئی بہت گہرا تعلق نہیں' نہ میں ان کی جماعت کا رکن ہوں' نہ ان سے علاقہ بیعت رکھتا ہوں' نہ ان کا مقتدی ہوں' نہ ان کا ہمسایہ ہوں' نہ خاص طور سے انھیں کبھی ملنے گیا ہوں' نہ ان کا ہم جماعت یا ہم درس رہا ہوں' نہ مجھے کبھی ان سے کوئی کام پڑا ہے' نہ ان کے کسی رشتے دار سے میرا کوئی بہت زیادہ واسطہ ہے اور نہ میں ان کے تمام افکار اور ان کے نقطہ نظر کے ہر پہلو کو مبنی بر صحت قرار دیتا ہوں۔ لیکن اللہ نے انھیں جن خوبیوں سے نوازا ہے اور جن صلاحیتوں سے بہرہ ور کیا ہے' اس کا کھلے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔

لاہور میں بے شمار مقامات پر نماز جمعہ پڑھی جاتی ہے' ہر مسلک فقہی کی مسجدوں میں خطبائے کرام الگ الگ مجمعوں میں قال اللہ و قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کرتے ہیں اور پورے التزام واہتمام کے ساتھ منبر و محراب سے آوازۂ حق گونجتا اور لاتعداد لوگوں کے قلوب و اذہان پر دستک دیتا ہے۔خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اللہ کے کلام کا اس پیمانے پر اعلان کرتے ہیں اور بلند بخت ہیں وہ بندگان خدا جو اسے سننے اور سمجھنے کی نعمت سے بہرہ یاب ہیں۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ لاہور کے لارنس گارڈن کی مسجد دارالسلام میں جمعہ اور عیدین کے مواقع پر بہت سے لوگ جمع ہوتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی لارنس روڈ پر مرکز اہل حدیث میں بھی بے شمار حضرات یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور یہاں کے خطیب ڈاکٹر صاحب کی طرح خطبے میں کوئی سیاسی نوعیت کی بات نہیں کرتے' صرف کتاب و سنت کے بیان تک اپنے آپ کو محدود رکھتے ہیں ----اس پر نہ کسی خطیب کو حسد کرنا چاہیے اور نہ انھیں مجمعے کی کثرت دیکھ کر اترانا چاہیے ----- بس یہی بات ذہن میں رکھنی چاہیے اور اس پر اللہ کا شکر بجالانا چاہیے کہ اللہ نے ان کو کلمۂ حق کہنے کی توفیق بخشی ہے اور یہ بہت بڑی سعادت ہے جو بارگاہِ الٰہی سے انھیں عطا فرمائی گئی ہے۔ذَالِكَ فضل اللّٰه یوتیه من یشاء۔

میں نے صرف ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی اقتدا میں جمعے کی نماز پڑھی ہے اور ایک ہی مرتبہ عید کی ----!

جمعے کی نماز پڑھنے کا پس منظر یہ ہے کہ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ ان کے کراچی کے ایک دوست نے ایک کتاب لکھوائی ہے' جو مختلف عنوانات پر مشتمل ہے اور یہ عنوانات قرآن مجید سے لیے گئے ہیں۔ مثلاً اخلاق' آداب معاشرت' صلہ رحمی' تقویٰ' ہمسایہ کے حقوق وغیرہ۔ان میں سے ہر عنوان سے متعلق قرآن مجید کی آیات سے مدد لی گئی ہے ----اسی قسم کی ایک کتاب وہ حدیث کی روشنی میں لکھوانا چاہتے ہیں' میں نے ان سے تمھارا ذکر کیا ہے اور تم یہ کتاب مکمل کردو۔

دوسرے دن ڈاکٹر صاحب میرے دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) از راہ کرم خود تشریف لائے اور وہ کتاب مجھے دکھائی جو قرآن کی آیات کے حوالے سے لکھی گئی تھی اور فرمایا کہ انہی عنوانات کی حدیثیں جمع کرکے ان کا ترجمہ کردو' کتاب مکمل ہو جائے گی۔

یہ بدھ کا دن تھا۔انھوں نے کہا کہ پرسوں جمعہ مسجد دارالسلام میں پڑھو' جمعے کے

بعد بیٹھیں گے اور پھر آخری فیصلہ کریں گے- فرمایا سوا بارہ بجے وہاں پہنچ جاؤ-

میں نے وہاں جمعہ پڑھا' ڈاکٹر صاحب سے ملا- بولے اہل حدیث حضرات سے بھی ہم نے پہلے جمعہ پڑھ لیا ہے ---- میں نے کہا واقعی پہلے پڑھ لیا ہے-

وہاں سے مجھے وہ ماڈل ٹاؤن کے بی بلاک میں اپنے ایک دوست شکیل احمد صاحب کے گھر لے گئے- وہاں ہم نے کھانا کھایا اور کتاب کا ذکر شروع ہو گیا---- لیکن میں یہ خدمت انجام نہیں دے سکا-

اسی طرح عید کی نماز کے لیے ایک مرتبہ میرے ایک دوست پیر محمد علی بودلہ مجھے صبح صبح ڈاکٹر صاحب کے ہاں مسجد دارالسلام لے گئے- میں نے کسی غیر اہل حدیث کی اقتدا میں پہلی دفعہ عید کی نماز پڑھی- انھوں نے دونوں رکعات میں معلوم نہیں کس انداز میں دو یا تین تکبیریں کہیں' اور سچی بات ہے میں کچھ سمجھ نہ پایا کہ امام کی اقتدا کس طرح کروں- میری سمجھ میں نماز عید پڑھنے کا یہ طریقہ اسی صورت میں آ سکتا تھا کہ میں ایک معروف مسلمان لیڈر کی طرح دائیں بائیں جانب کے نمازیوں کو دیکھتا رہتا کہ یہ کس طرح اس مشکل سے عہدہ برا ہوتے ہیں' جو وہ کرتے' انھیں دیکھ کر میں کرتا رہتا-

نماز عید کا مسنون طریقہ جو حدیث میں مذکور اور نبی ﷺ سے مروی ہے' یہ ہے کہ پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے علاوہ سات اضافی تکبیریں اور دوسری میں پانچ اضافی تکبیریں کہی جائیں' اس طرح دونوں رکعات میں بارہ تکبیروں کا اضافہ کیا جائے- یہ وہ تکبیریں ہیں' جنھیں زائد ہونے کی وجہ سے "تکبیرات زوائد" کہا جاتا ہے-

اسی طرح جمعے کا بھی حضرات احناف کا عجیب طریقہ ہے' ان کے نزدیک اردو کی تقریر خطبہ جمعہ نہیں ہے' صرف عربی کے الفاظ خطبہ کہلاتے ہیں- پھر وہ الفاظ ایک چھوٹی سی کتاب کھول کر پڑھے جاتے ہیں ---- میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا- یہ ان کی موج ہے جو کچھ کرتے ہیں' کرتے جائیں ---- میں یہاں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کو لاہور میں یہ اولیت اور خصوصیت حاصل ہے کہ وہ اول وقت میں نماز جمعہ اور اول وقت میں نماز عید پڑھاتے ہیں-

ڈاکٹر صاحب کسی خاص فقہی مسلک کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہیں کرتے- یعنی نہ حنفی کہلاتے ہیں نہ اہل حدیث- لیکن نماز ہمیشہ احناف کی طرح پڑھتے ہیں- یہی حال

جماعت اسلامی کے سربراہوں کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی خاص فقہی مسلک کی طرف عدم انتخاب کا دعویٰ محض ان کی زبانی باتیں ہیں۔ اگر اس دعوے کا تعلق عمل سے ہو تو کبھی سنت نبوی کے مطابق اہل حدیث کی طرح بھی نماز پڑھ لیا کریں۔۔۔۔۔ ان کے نزدیک یہ مذہبی تعصب ہے، لیکن جو خود کرتے ہیں وہ تعصب نہیں ہے۔ عجیب اندازِ فکر ہے۔

یہاں یہ عرض کر دیں کہ آج کل جہاں مسجد دارالسلام قائم ہے، جس میں ڈاکٹر صاحب نماز عید اور جمعہ پڑھاتے ہیں، وہاں سب سے پہلے ۱۹۵۴ء میں قرآن مجید کے درس کا سلسلہ کرنل سلامت اللہ مرحوم کی تجویز و تحریک سے مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب نے شروع کیا تھا۔ کرنل صاحب لمبے قد کے سوٹڈ بوٹڈ بزرگ تھے اور کسی زمانے میں صوبہ یو پی کے آئی جی جیل خانہ جات رہے تھے۔ مذہبی ذہن کے آدمی تھے، قرآن مجید سے انھیں خاص تعلق تھا۔ مولانا محمد علی قصوری مرحوم سے ان کا دوستانہ تھا۔ انھوں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ نماز مغرب سے پہلے یہاں درس قرآن ہونا چاہیے اور درس کے بعد یہیں نماز مغرب ادا کی جائے۔ چنانچہ وہاں کھلی جگہ میں صفیں بچھا دی گئیں اور سلسلہ درس کا آغاز کر دیا گیا۔ شام کو جو لوگ وہاں سیر کے لیے جایا کرتے تھے، ان میں سے بھی کچھ لوگ درس سننے اور وہاں نماز پڑھنے لگے۔ ایک دن چلتے پھرتے وہاں مشہور اخبار نویس میاں محمد شفیع (م ش) مرحوم پہنچ گئے۔ انھوں نے بھی درس سنا اور نماز پڑھی۔ وہ روزنامہ "نوائے وقت" میں کالم لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے کالم میں اس نیک کام کا ذکر کیا۔ اس کے بعد سامعین کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہو گیا۔

مولانا محمد علی قصوری اس وقت ٹمپل روڈ کی کوٹھی نمبر ۲۱ میں سکونت پذیر تھے، جہاں آج کل علی ہسپتال قائم ہے۔ بعد ازاں وہ سمن آباد چلے گئے تھے، لیکن انھوں نے درس کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء کو فوت ہوئے۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین احمد قصوری یہ خدمت انجام دینے لگے۔ کبھی کبھی مولانا محمد حنیف ندوی بھی درس کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔

آہستہ آہستہ کرنل سلامت اللہ کی کوشش سے یہاں مسجد تعمیر ہو گئی، جس میں مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے امامت و خطابت کا فریضہ انجام دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے

خطبہ جمعہ اور خطبہ عیدین دینا شروع کیا تو معاملہ بالکل بدل گیا اور اسے ایک بہت بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی- وہاں دار السلام لائبریری بھی ہے' جس کے چیف لائبریرین بہت عرصے تک ہمارے بزرگ دوست الطاف شوکت صاحب رہے-

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے گزارش ہے کہ وہ اس مقام پر درس قرآن کا آغاز کرنے والے اولین درویشوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور اگر کبھی خطبہ جمعہ کے سیاسی موضوعات کے ہنگاموں سے فرصت ملے اور ان لوگوں کے نام اور کام کی طرف ذہن منتقل ہو جائے تو اپنے لائق احترام سامعین سے بھی ان کے لیے دعاے مغفرت کی درخواست کر دیا کریں---- دعا کرنے والے کو بھی بارگاہ الٰہی میں مستحق اجر گردانا جاتا ہے اور دعا کرانے والے کو بھی---! نبی ﷺ کا فرمان ہے کہ جن اوقات میں اللہ تعالیٰ اپنے عاجز بندوں کی دعا کو شرف قبول بخشتا ہے' ان اوقات میں جمعے کا وقت بھی شامل ہے---- یہ مفت کا ثواب ہے' جسے حاصل کرنے کی کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کو کوشش کرنی چاہیے-

قرآن مجید ڈاکٹر صاحب کا اصل موضوع ہے اور اس موضوع سے متعلق ان کی ایک اہم خدمت یہ ہے کہ محاضرات قرآنی کے نام سے انھوں نے مختلف اہل علم سے تقریریں کرائیں اور مقالے پڑھائے' ان مقرروں اور مقالے پڑھنے والوں کی وسیع فہرست میں مولانا محمد حنیف ندوی' مولانا محمد طاسین' مولانا سعید احمد اکبر آبادی' مولانا اخلاق حسین قاسمی' ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری اور مولانا سعید الرحمٰن علوی شامل ہیں- ان سطور کے گنہگار راقم کا نام بھی اس فہرست کے کسی کونے کھدرے میں موجود ہو گا-

مولانا محمد حنیف ندوی تو ان محاضرات کے مقررین کی اس معزز جماعت کے بزرگ ہیں' جن کا شمار السابقون الاولون میں ہوتا ہے- مولانا نہایت زندہ دل عالم تھے اور قرآن مجید کے مضامین پر عمیق نگاہ رکھتے تھے' اس سلسلے میں ندوۃ العلما لکھنو میں انھوں نے درجہ تخصص کیا تھا اور ۱۹۳۴ء میں "سراج البیان" کے نام سے ایک تفسیر لکھی تھی جو پندرہ سولہ دفعہ چھپ چکی ہے- وہ بالعموم ہر سال محاضرات میں تقریر کرتے تھے- ایک دفعہ وہ سخت مصروف تھے' لیکن ڈاکٹر صاحب ہر قیمت پر ان سے تقریر کرانا چاہتے تھے- مولانا چلے گئے اور انھوں نے تقریر کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ میں بے حد مصروف ہوں' لیکن ڈاکٹر اسرار کا اصرار تھا کہ اس اجتماع میں ضرور آؤں' اس لیے حاضر ہو گیا ہوں- اسرار کے ساتھ

اصرار کے قافیے سے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

محاضرات قرآنی کا ذکر چھڑا ہے تو جی چاہا کہ موقعے کی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک عرض کروں' اگرچہ اونچے ایوانوں میں عام طور سے فغان درویش سنی نہیں جاتی' یعنی اسے قابل عمل یا لائق التفات نہیں ٹھہرایا جاتا' تاہم درویش کی پکار جاری رہتی ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب اتنا لکھتے اور بولتے ہیں' ان کی ساری باتیں کون مانتا ہے' اگر ڈاکٹر صاحب میری نہیں مانیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ ماننا یا نہ ماننا ان کا کام ہے' ہمارا کام صدا دینا ہے' تو ہم صدا دے کر اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

محاضرات کا سلسلہ کئی سال سے جاری ہے۔ اس کے کتنے ہی قابل تکریم مقرر وفات پا چکے ہیں اور ممکن ہے ہر سال کوئی نہ کوئی مقرر آسودۂ لحد ہو جاتا ہو' ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ ہر سال کے محاضرات کی ابتدا ہوتے ہی ان حضرات کے لیے قرارداد تعزیت پیش کیا کریں یا کسی سے کرائیں' جنھوں نے اس سال وفات پائی ہو۔ نیز ان کے لیے دعاے مغفرت فرمائی جائے۔

محاضرات کے ہر مقرر کے تھوڑے بہت حالات اور ان کی دینی و ملی خدمات بھی ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں ہونی چاہئیں۔ اور اس کے لیے ایک مستقل رجسٹر بنانا چاہیے۔

برصغیر کے جن حضرات نے قرآن مجید کے بارے میں کسی نہج سے خدمات سر انجام دی ہیں' ان میں سے محاضرات میں دو تین بزرگوں پر ہر سال مقالے پڑھے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب اس اجتماع کی اپنی تقریر میں عام طور سے مولانا مودودی کا ذکر زیادہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کا براے وزن بیت ذکر کر کے بات ختم کر دیتے ہیں------ان کے علاوہ بھی بہت سے مترجم اور مفسر ہیں' جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں' ان کا تذکرہ بھی ہونا چاہیے۔ ترجموں کے الگ الگ اسلوب پر بھی گفتگو ہونی چاہیے۔

جن حضرات نے پنجابی' سندھی' پشتو اور بنگلہ وغیرہ زبانوں میں تفسیری خدمات انجام دی ہیں' ان کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔ انگریزی کے ترجموں کی طرف بھی عنان توجہ مبذول کرنی چاہیے۔

۱۹۷۷ء سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے حلقے میں شامل ہونے والوں کے لیے "بیعت" کا نظام اختیار کیا ہے۔ جماعت اہل حدیث کے پرانے بزرگوں کا بھی یہ معمول تھا کہ ان کے

عقیدت مندوں میں سے اگر کوئی ان کے حلقہ بیعت میں شامل ہونے کا متمنی ہوتا تو وہ اس سے بیعت لیتے تھے' لیکن بیعت ان کے نزدیک ضروری اور لازمی نہ تھی- میرے لیے بھی میرے دادا میاں محمد مرحوم نے حضرت شاہ محمد شریف گھڑیالویؒ سے درخواست کی تھی کہ یہ میرا پوتا ہے' اسے آپ اپنے حلقہ بیعت میں داخل فرمالیں- شاہ صاحب نہایت متقی بزرگ تھے- میری عمر اس وقت بارہ تیرہ سال تھی اور میں نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی تھی- بہت سے اہل حدیث شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے- وہ کئی سال انجمن اہل حدیث پنجاب کے امیر رہے-

حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد مجھے حضرت مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے ایک بزرگ مولوی کمال الدین کے حلقہ بیعت میں شامل کرادیا تھا- مولوی صاحب مرحوم چھوٹے قد کے دبلے پتلے آدمی تھے' انھیں دیکھ کر اور ان کی باتیں سن کر ہر شخص کے دل پر نیکی کا تاثر ابھرتا تھا- وہ ڈوگر برادری کے کھاتے پیتے گھر کے فرد تھے اور ضلع فیروزپور کے ایک گاؤں چھینبیاں والی کے رہنے والے تھے- ان کے مبایعین کی فہرست کافی وسیع تھی-

غزنوی اور لکھوی متحدہ پنجاب کے وہ دو خاندان ہیں' جن کے اصحاب علم سے اہل حدیث علما و طلبا نے بالخصوص استفادہ کیا' ان کے بزرگ بھی بیعت کے خواہش مندوں سے بیعت لیتے تھے- حضرت مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ) کی خدمت میں بھی لوگ بیعت کے لیے حاضر ہوتے تھے- لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا' حصول فیض اور رشد و ہدایت کے لیے وہ بیعت کو ضروری نہ قرار دیتے تھے-

بیعت تین قسم کی ہوتی ہے- بیعت توبہ' بیعت جہاد اور بیعت اطاعت------!
معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب بیعت کی ان تین اقسام میں سے کس قسم کی بیعت لیتے ہیں- پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ خود ڈاکٹر صاحب نے کسی بزرگ کی بیعت کی ہے یا نہیں- البتہ جیسا کہ ابھی عرض کیا اس فقیر کو یکے بعد دیگرے دو بزرگوں کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کا شرف حاصل ہے- اس لیے یہ فقیر اس مسئلے پر غور کر رہا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اللہ کا نام لے کر لوگوں سے بیعت لینے کا سلسلہ شروع کردیا جائے- مجھے یہ حق اس لیے حاصل ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب سے عمر میں بڑا ہوں اور ان کے لیے اچھے خاصے بزرگ کی حیثیت رکھتا

ہوں ---- پھر دو بزرگوں سے باقاعدہ بیعت یافتہ ہوں - میرا خیال یہ ہے کہ ہر مبایع سے بہ یک وقت تین قسم کی بیعت لی جائے -

پہلے اس سے گزشتہ گناہوں سے توبہ کراؤں اور خود بھی اگر ممکن ہو تو توبہ کرنے کی کوشش کروں - یہ بیعت توبہ ہوئی -

پھر اس سے برائی کے خلاف جہاد کرنے کا اقرار کراؤں اور عہد لوں کہ وہ تمام غلط کاموں کے خلاف جہاد کرے گا - خود اس سے اگر کوئی غلط کام سرزد ہو جاتا ہے تو اسے اپنی بشری کمزوری تصور کر کے بے شک نظر انداز کر دے ' لیکن دوسرے کو برائی سے روکنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرے ' کیوں کہ شریعت میں برائی سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے ' جسے نہی عن المنکر کہا جاتا ہے - یہ بیعت جہاد ہوئی -

پھر اسی لمحے اس سے کہا جائے گا کہ وہ برائی کا قلع قمع کرنے میں امیر کی (یعنی میری) اطاعت کرے ' لیکن خود میری برائیوں اور غلطیوں کا کسی سے اظہار نہ کرے - اگر وہ ایسا کرے گا تو بیعت فسخ ہو جائے گی ' یہ بیعت اطاعت ہوئی -

میں چاہتا ہوں کہ سلسلہ بیعت کا آغاز اپنے گھر سے کروں - مگر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ میرے گھر کا کوئی فرد میری کوئی بات نہیں مانے گا ---- کیوں کہ گھر کے سب افراد جانتے ہیں کہ میں کتنے پانی میں ہوں -

ڈاکٹر صاحب نے تحریک خلافت شروع کی ہے ' غالباً اس سے ان کا مقصد خلافت راشدہ کا نظام ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شروع ہو کر حضرت علی ؓ پر ختم ہو گیا تھا - یہ نظام تیس سال قائم رہا تھا جو دنیا کا بہترین نظام حکومت تھا - نہ اس سے پہلے چشم فلک نے اس قسم کا نظام دیکھا تھا اور نہ اس کے بعد روئے زمین پر اس کی کوئی ادنیٰ جھلک کسی کو دکھائی دی - وہ اپنی نوعیت کا واحد ' منفرد اور عدیم المثال نظام تھا ' جو خیر القرون میں خاتم النبیین ﷺ کے صحابہ کرام کی مقدس جماعت نے قائم کیا تھا ' اور خالص کتاب و سنت کی بنیادوں پر استوار تھا - اگرچہ اس بے مثال نظام حکومت نے زیادہ عمر نہ پائی ' تاہم تاریخ حکمرانی کا یہ ایک نہایت درخشاں عنوان بن گیا ' اس کے سانچے میں اپنی زندگیوں کو ڈھالنا تو بہت مشکل ہے ' لیکن یہ ضرور ہے کہ اسے لوگ ہمیشہ حوالے کے طور پر پیش کرتے رہیں گے -

دراصل ہر نظام حکومت کا ایک دور ہوتا ہے جو خاص ماحول اور خاص فضا کے نتیجے

میں عالم وجود میں آتا ہے- خلافت راشدہ کا بھی ایک نظام تھا جو نبی کریم ﷺ کے تربیت یافتہ معاشرے نے قائم کیا تھا' اور یہ وہ معاشرہ تھا جس کے افراد کے متعلق قرآن نے رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ کے الفاظ ارشاد فرمائے-

کسی زمانے میں بادشاہت کا نظام دنیا میں قائم رہا' اب بھی بعض ملکوں میں قائم ہے- قبائلی نظام بھی معرض ظہور میں آیا- ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو کسی نظام حکومت کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں- موجودہ دور جمہوریت کا دور ہے جو اسلامی ممالک میں صحیح طور سے رائج کیا جائے تو اسلامی حکومت سے ہم آہنگ ثابت ہو گا- صحت مندانہ اصول جمہوریت خلافت راشدہ سے متصادم نہیں-

حالات بے شک سازگار نہیں اور مزاج حکمرانی پوری دنیا میں بدلا ہوا ہے' تاہم ہماری دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پاکستان میں خلافت راشدہ کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوں-

اس وقت ڈاکٹر صاحب کے اخبار ہفت روزہ "ندائے خلافت" کا ۱۵ تا ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۶ء کا شمارہ سامنے ہے' اس میں ان کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا ہے جو انھوں نے لاہور کے ایک روزنامے کو دیا ہے- انٹرویو "ندائے خلافت" کے صفحہ چار سے لے کر صفحہ دس تک پھیلا ہوا ہے اور بہت سے مسائل کو محیط ہے --- اخبار کے نمائندے نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کیا ہے جو صفحہ چھ کے پہلے کالم میں درج ہے- سوال یہ ہے

"فرقہ واریت کا مسئلہ حل کرنے کا موثر طریقہ کیا ہے؟"

ڈاکٹر صاحب جواب دیتے ہیں-

"ہمارے ہاں اصل میں فرقے صرف دو ہی ہیں اور ان کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ان کی واقعی کوئی فرقہ وارانہ تقسیم ہے- ایک شیعہ اور دوسرے سنی ہیں- سنی عظیم اکثریت ہیں اور وہ حنفی ہیں- یہ ایک ہی فقہ کو ماننے والے ہیں- اگر نفاذ اسلام کے حوالے سے بات آئے تو مسئلہ صرف شیعہ اور سنی کا باقی رہ جاتا ہے-"

یہ حرف بحرف وہی الفاظ ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے خود اپنے اخبار میں چھپے ہیں- یہاں "سنی" سے ڈاکٹر صاحب کی مراد "اہل سنت" ہے- "سنی" ایک عوامی لفظ ہے' جسے اہل علم تحریر و تقریر میں بہت کم استعمال کرتے ہیں-

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ہم عرض کریں گے کہ اہل سنت کا اطلاق صرف احناف پر نہیں ہوتا۔ یہ اصطلاح دراصل معتزلہ' جھمیہ' خوارج اور روافض و شیعہ وغیرہ فرقوں کے مقابلے میں وضع ہوئی تھی' جس میں احناف' موالک' شوافع اور حنابلہ چاروں مسالک کے لوگ شامل ہیں۔' ظاہری اور اصحاب الحدیث یا اہل الحدیث یا محدثین بھی اسی جماعت (اہل سنت) کو کہا جاتا ہے ---- سیاق کلام کی رو سے "اہل سنت" کی اصطلاح کہیں معتزلہ کے مقابلے میں استعمال ہوئی ہے' کہیں خوارج کے مقابلے میں اور کہیں جھمیہ اور شیعہ کے مقابلے میں۔

بعض لوگ دوسروں کو مستثنیٰ کرکے صرف حنفی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے لیے کہا کرتے ہیں کہ یہ سنی مسلمان ہیں' یہ غیر علمی عوامی لفظ ہے' اور غیر واقعاتی بھی ---!

ڈاکٹر صاحب کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ان کے نزدیک بھی اہل سنت سے مراد صرف احناف ہیں' اگر بات یہی ہے تو ان کا یہ نقطہ نظر حقیقت کے خلاف ہے --- کیا یہ واقعہ انھیں معلوم نہیں کہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا جنازہ اٹھا تو لوگوں کی بے پناہ کثرت دیکھ کر کسی نے کہا تھا ھکذا تکون جنائز اھل السنۃ۔ اسی قسم کے الفاظ امام ابن تیمیہؒ کے جنازے پر کہے گئے تھے' اس میں بھی بے انتہا لوگ شامل تھے ----- گزارش کا مقصد یہ ہے کہ یہاں "اہل سنت" کا لفظ غیر احناف کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی حنابلہ کے لیے۔

ڈاکٹر صاحب بے شک حنفی ہیں اور بعض مسائل میں اگرچہ وہ سنت پر عامل نہیں ہیں تاہم انھیں ہم "اہل سنت" قرار دیتے ہیں۔ براہ کرم وہ بھی غیر حنفیوں کو اہل سنت سے خارج نہ فرمائیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے چالیس سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ اور ان کا حلقہ بھی ماشاءاللہ مضبوط ہے۔ لیکن وہ اب بھی اپنی تقریروں اور مضمونوں میں اس بات کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی والے ان کی فلاں فلاں بات مان لیں تو وہ اپنے حلقے سمیت جماعت میں شامل ہونے کو تیار ہیں۔ میرا خیال ہے جماعت والوں نے ان کی اس قسم کی شرطوں یا پیش کشوں کا کبھی کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کے نزدیک یہ غیر ضروری باتیں ہیں۔

معاملہ اصل میں یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کسی جماعت کے ساتھ چل نہیں سکتے۔

کسی کی ماتحتی قبول کرنا طبعی طور پر ان کے لیے مشکل ہے-اب تو وہ خود طویل مدت سے ایک اچھی بھلی تنظیم کے امیر ہیں اور ان کا سلسلہ بیعت بھی ہے' اب ان کے لیے مامور کی حیثیت سے کام کرنا ممکن نہیں رہا-جو شخص خود کام کے منصوبے بنائے اور پروگرام مرتب کرے' وہ دوسروں کے طے کردہ منصوبوں اور مرتب کردہ پروگراموں کے مطابق کس طرح چل سکتا ہے-

جماعت اسلامی والے بھی ان کی شمولیت یا جماعت میں ان کے کسی قسم کے تعلق کو پسند نہیں کریں گے- وہ خود مالک ہیں اور جو جی چاہے کرتے ہیں' ڈاکٹر صاحب کے زور کلام اور قوت بیانیہ کا سامنا کرنا ان کے لیے مشکل ہو گا-میاں طفیل محمد صاحب کی بولی میں کہنا چاہیے کہ ان کی مت ماری ہے کہ کسی زوردار آدمی کو اپنی "اسلامی مملکت" میں لا کر پریشانیوں میں مبتلا ہوں-

ڈاکٹر صاحب اپنے دل میں اسلام کا سچا درد رکھتے ہیں-اگر کہیں انھیں اسلام نظر نہ آئے تو فوراً پیچھے ہٹ جاتے ہیں-۱۹۷۷ء میں ضیاء الحق نے حکومت پر قبضہ کیا تو کچھ عرصے کے بعد کسی صاحب کی معرفت ڈاکٹر صاحب کو وزارت کی پیش کش کی' مگر ڈاکٹر صاحب نے یہ پیش کش ماننے سے معذرت کر دی----- یہ ڈاکٹر صاحب ہی کا دل گردہ ہے' ورنہ اس دور میں کون ہے جو گھر میں آئی لکشمی واپس کر دے-----

ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ وزارتوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور نہایت ذلت کے ساتھ ہاتھ میں کشکول لیے ہر اس دروازے پر پہنچتے ہیں' جہاں سے یہ خیرات ملنے کی امید ہو' لیکن ڈاکٹر صاحب اسے ٹھکرا رہے ہیں-بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کا یہ بہت بڑا کیریکٹر ہے-

پھر ضیاء الحق صاحب نے مجلس شوریٰ بنائی تو ڈاکٹر صاحب کو اس کا رکن نامزد کیا گیا' لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ بالکل بے مقصد شے ہے تو اس سے استعفا دے دیا----- یہ بھی ان کے عظیم کردار کی علامت ہے-

مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف مرحوم و مغفور کو بھی ضیاء الحق نے اپنی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا تھا-وہ اس قسم کی سرکاری مجلسوں اور کمیٹیوں سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتے تھے' معلوم نہیں انھوں نے کس طرح اس مجلس شوریٰ کی رکنیت قبول فرمائی جو نہ مجلس تھی' نہ شوریٰ----!

اس مجلس کے ایک رکن سردار عطا محمد لغاری تھے ---- ان دونوں کی نشستیں قریب قریب تھیں' مولانا عطاء اللہ صاحب کے صاحب زادۂ گرامی حافظ احمد شاکر نے بتایا کہ ایک روز یہ دونوں شوریٰ ہال سے باہر نکلے تو سردار عطا محمد لغاری نے مولانا کو اپنی گاڑی میں بٹھالیا اور ان سے باتیں کرتے ہوئے پوچھا کہ اس مجلس شوریٰ کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟ مولانا نے جواب میں یہ شعر پڑھ دیا۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہے سو آپ کرے ہے' ہم کو عبث بدنام کیا

یہ شعر سن کر عطا محمد لغاری نہایت محظوظ ہوئے ---- ضیاء الحق کی قائم کردہ اس مجلس شوریٰ پر بہت لوگوں نے بہت کچھ کہا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بھی اس کے متعلق اظہار خیال کیا' لیکن اس شعر کی روشنی میں مولانا عطاء اللہ صاحب کا تبصرہ نہایت بلیغ اور مبنی برحقیقت ہے۔

اب ڈاکٹر صاحب سے چند باتیں سمجھنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر وہ خفا نہ ہوں تو عرض کریں ---- وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں زور شور اور شدومد کے ساتھ فرمایا کرتے ہیں کہ پاکستان محض اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا' اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہ تھا۔ نہ معاشی' نہ اقتصادی' نہ سیاسی' نہ کوئی اور ---- اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر قیام پاکستان کا یہی مقصد تھا اور اس میں اسلام کا نفاذ ہی مطلوب تھا تو۔

○ ---- کیا وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی یا اس کی جنرل کونسل کے کسی ایسے فیصلے یا ریزولیوشن کی نشان دہی کر سکتے ہیں' جس میں یہ وضاحت کی گئی ہو کہ پاکستان اسلام کے لیے بنایا جا رہا ہے اور اس میں اسلامی نظام نافذ ہو گا؟

○ ---- کیا اس دور کے کسی سرکردہ مسلم لیگی رہنما نے یہ بتایا کہ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے اور ہم اسے کس طرح ملک میں نافذ کریں گے؟

○ ---- ہندوستان اس وقت گیارہ صوبوں پر مشتمل تھا۔ کیا کسی صوبائی مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اس طرح کا کوئی ریزولیوشن یا فیصلہ ڈاکٹر صاحب یا کسی اور صاحب کے علم میں ہے' جس میں اسلامی نظام کے نفاذ کے بارے میں کوئی بات کہی گئی ہو؟

○ ---- کیا مسلم لیگ کے اکابر (یعنی قائداعظم محمد علی جناح' لیاقت علی خاں' خواجہ ناظم

الدین' سید حسین شہید سہروردی' سردار عبدالرب نشتر' چوہدری خلیق الزمان اور اسماعیل ابراہیم چندریگر وغیرہ) حضرات میں سے کسی لائق احترام شخصیت کی ایسی تقریر یا تحریر موجود ہے' جس میں انھوں نے فرمایا ہو کہ اس ملک میں اسلام نافذ ہو گا اور اسلام ہی کی حکمرانی ہو گی؟

○ ---- کیا آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے کوئی ایسے بزرگ بھی رکن تھے جنھیں باقاعدہ عالم دین کہا جاتا ہو؟

یہ گزارشات معاملے کو صحیح طور سے سمجھنے اور اپنے محدود مطالعے میں اضافے کے لیے پیش خدمت کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اور بعض دیگر حضرات بڑی تحدی کے ساتھ فرمایا کرتے ہیں کہ اس ملک کے حصول کی تہہ میں صرف اسلامی نظام کا نفاذ تھا' اس کے علاوہ کوئی دوسری بات نہ تھی' اس لیے ان کی خدمت میں یہ معروضات پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ---- اس دعوے کے ثبوت کے لیے ان کے پاس اس زمانے کے اخبارات و رسائل یا اس دور کی کتابیں ضرور موجود ہوں گی' جن میں یہ باتیں لکھی ہوں گی۔ تمام سیاسی جماعتوں کا ریکارڈ موجود ہے' مسلم لیگ کا بھی کہیں ہو گا اور اس کے فیصلے بہت سے رجسٹروں میں محفوظ ہوں گے۔

یہ صرف پچاس برس قبل کا مسئلہ ہے۔ میں تاریخ کا نہایت ادنیٰ طالب علم ہوں اور جو دعویٰ کروں' اس کے ثبوت میں سیکڑوں سال قبل کی باتیں پورے حوالے کے ساتھ ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں۔ پچاس برس قبل کی باتوں کا ثبوت دینا تو ان حضرات کے لیے بالکل آسان ہو گا۔

جواب میں طعن و تشنیع نہیں ہونا چاہیے اور نہ کفر کی میزان لگانی چاہیے اور نہ یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اتنا قتل و غارت آخر کیوں ہوا ---- یہ کسی سوال کا جواب نہیں ہے بلکہ جواب سے بچنے کا ایک طریقہ ہے۔ یہ طریقہ براہ کرم یہاں بیان نہ فرمایا جائے ---- یہ تو ہر انقلاب کے موقعے پر ہوتا ہے۔

ہم چوں کہ پاکستان میں اسلام کا نعرہ بلند کرتے ہیں' اس لیے لوگ ہم سے اس کا ثبوت مانگتے ہیں۔ ضروری ہے کہ اس ضمن میں اعتراض کنندگان کو مطمئن کیا جائے' اس لیے آپ کے باب علم پر دستک دی جا رہی ہے۔ ٹھوس ثبوت کی ضرورت ہے' جذباتی باتوں

سے کام نہیں چلے گا۔ اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اس میں مزید الجھاؤ پیدا ہوتا ہے اور لوگوں پر برا اثر پڑتا ہے۔

پھر ایک گزارش یہاں یہ ہے کہ اگر قیامِ پاکستان کا مقصد محض اسلام تھا اور اسی کو اس ملک میں نافذ کرنا مقصود تھا تو پھر حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے (جو اس وقت اسلام کے اتنے بڑے مبلغ تھے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے' اور انہی کی تحریروں سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے) قیامِ پاکستان کی کیوں تائید نہ کی اور تحریکِ پاکستان میں کیوں حصہ نہ لیا؟ انھوں نے کیوں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" کے سلسلہ مضامین میں مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں پر تنقید فرمائی؟ ۱۹۴۵ء کے انتخابات قیامِ پاکستان کے سلسلے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے' جماعت اسلامی نے کیوں ان کا مقاطعہ کیا اور کیوں اسلام کے لیے مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیا؟

اس وقت مسلم لیگ اور قیامِ پاکستان کی تحریک ایک ہی چیز کا نام تھا اور مسلم لیگ کی مخالفت درحقیقت قیامِ پاکستان کی مخالفت تھی ------ اور یہ کام مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے کھل کر کیا' جس سے ڈاکٹر صاحب متاثر تھے۔

یہاں ایک گزارش ڈاکٹر صاحب سے اور ہے' اور وہ یہ کہ قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے جو کابینہ بنائی اس میں دو رکن غیر مسلم لیے گئے' ایک جوگندر ناتھ منڈل اور دوسرے چوہدری ظفر اللہ (مرزائی) اور انھیں علی الترتیب قانون اور امور خارجہ کے محکمے دیے گئے جو نہایت اہم محکمے تھے۔

اگر یہاں اسلامی قانون نافذ کرنا مقصود تھا تو کیا یہ قانون غیر مسلم وزیر نے ترتیب دینا تھا؟ اور اسلامی ممالک سے غیر مسلم وزیر خارجہ نے تعلقات استوار کرنا تھے؟

مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا حسین احمد مدنی' مفتی کفایت اللہ' مولانا احمد سعید' سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور جمعیت علمائے ہند اور مجلس احرار کے دیگر حضرات علما کی ہم اس وقت بات نہیں کرتے کہ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم نوا' ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہوں' اور ان کا نام لینے سے انھیں کتنی تکلیف ہوتی ہو۔

صاف بات یہ ہے کہ ہمیں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے کہ قیامِ پاکستان کا مقصد اسلام تھا یا نہیں تھا۔ بات صرف یہ کرنی چاہیے کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے اور یہاں کے

مسلمانوں کا مطمحِ نظر اس میں اسلام کا نفاذ ہے' لہٰذا اسے اسلام کے حوالے کر دینا چاہیے۔ یہ سیدھی سی بات ہے جس میں کوئی جھگڑا جھمیلا نہیں ہے۔

بعض لائق احترام حضرات فرمایا کرتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے زمانے میں یہ الفاظ عام طور پر مسلمان کہا کرتے تھے کہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ" یہ الفاظ ان کے نزدیک اس بات کی بہت بڑی دلیل ہیں کہ پاکستان اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔



سوال یہ ہے کہ یہ الفاظ مسلم لیگ کے منشور میں داخل تھے؟ یا مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن کا حصہ تھے؟ یا قائداعظم محمد علی جناح یا کسی سرکردہ مسلم لیگی نے یہ نعرہ لگایا تھا؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی مسلم لیگ میں شامل تھے اور وہ اسلام ہی کے لیے شامل ہوئے تھے۔

گزارش یہ ہے کہ یہ دونوں قابل تکریم بزرگ مسلم لیگ کے رکن نہیں تھے' البتہ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں جمعیت علمائے ہند کے مقابلے میں جمعیت علمائے اسلام قائم کی تھی جو مسلم لیگ کی حلیف جماعت تھی اور قیام پاکستان کی حامی تھی ------ اس کا بھی ایک خاص پس منظر تھا' جس کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں ------ اس کا تذکرہ ان شاء اللہ اس مضمون میں کیا جائے گا جو مولانا سیالکوٹی پر لکھا جائے گا۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ علمائے کرام مسلم لیگ میں شامل تھے اور محض پاکستان میں نفاذ اسلام کی غرض سے مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے تو انھوں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر مسلم لیگ سے نفاذ اسلام کے سلسلے کی قرارداد کیوں منظور نہ کرائی؟ اور کیوں اسے مسلم لیگ کے منشور کا حصہ نہ بنایا اور اس ملک گیر جدوجہد کا اصل مقصد اسلام ہی کیوں قرار دیا؟ کیا یہ دونوں یا ان میں سے کوئی بزرگ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی یا جنرل کونسل کے رکن تھے؟

پھر یہ بھی یاد رہے کہ قیام پاکستان کی حمایت کمیونسٹوں نے کی تھی۔ کیا وہ بھی یہاں اسلام کے نفاذ کے خواہاں تھے؟

ڈاکٹر صاحب چند سالوں سے ملک میں خلافت کا نظام قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ اس سعی خیر میں کامیاب ہوں' اپنے نظام خلافت کے خلیفہ بھی

خود ہی ہوں - اگر وہ نظام خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور انھیں خلیفہ بھی مقرر یا منتخب کر لیا جائے تو ہمیں ضرور یاد رکھیں - یہ مسئلہ تو انھیں معلوم ہی ہے کہ ۱۹۵۱ء تک کوئی عہدہ طلب کرنا حرام تھا' اس کے بعد جو شریعت آئی اس میں حلال ہو گیا تھا - اب تو کئی برس سے عہدہ طلب کرنا فرائض میں شامل کر لیا گیا ہے' بلکہ شاید اسلام کا بنیادی رکن ہی قرار پا گیا ہو - اس کے لیے حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر حاضری دینا اور بھنگڑا ڈالنا بھی ضروری ہے -

۲۱ - ۲۲ - ۲۳ - ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء کو ملک کے مختلف مکاتب فکر کے اکتیس علمائے کرام نے اسلامی مملکت کے بائیس نکات مرتب کیے تھے' وہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو یہاں درج کی جا رہی ہے اور اسے مرتب کرنے والے علمائے کرام کے اسمائے گرامی بھی درج کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ روداد اس کتاب میں بھی محفوظ ہو جائے' نیز یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ نکات بھی نظام خلافت کے ہم آہنگ ہیں -

ہم نے یہ پوری تحریر علمائے عظام کے دستخطوں اور مختلف مذہبی و دینی جماعتوں میں ان کے عہدوں کی وضاحت کے ساتھ ۹ فروری ۱۹۵۱ء کے "الاعتصام" میں درج کی تھی - اس کا عنوان تھا -

"اسلامی مملکت کے بنیادی اصول"

"جنھیں پاکستان کے ہر مکتب خیال اور تمام اسلامی فرقوں کے مشاہیر علما نے مرتب کیا ہے -" اب اس پوری تحریر کا مطالعہ کیجیے -

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

"ایک مدت دراز سے اسلامی دستور مملکت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں - اسلام کا کوئی دستور مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اصول کیا ہیں؟ اور اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے' جس پر مختلف اسلامی فرقوں کے علما متفق ہو سکیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں' جن کے متعلق عام طور پر ایک ذہنی پریشانی پائی جاتی ہے اور اس ذہنی پریشانی میں ان مختلف دستوری تجویزوں نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے' جو مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں' اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام اسلامی

فرقوں کے چیدہ اور معتمد علیہ علما کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور وہ بالاتفاق صرف اسلامی دستور کے بنیادی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفانہ کرے بلکہ ان اصولوں کے مطابق ایک ایسا دستوری خاکہ بھی مرتب کر دے جو تمام اسلامی فرقوں کے لیے قابل قبول ہو۔

"اس غرض کے لیے ایک اجتماع بتاریخ ۱۲- ۱۳- ۱۴- ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱ - ۲۲ - ۲۳ - ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء بصدارت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں اسلامی دستور کے جو بنیادی اصول بالاتفاق طے ہوئے ہیں انھیں فائدہ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔

"مجلس دستور ساز پاکستان کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق جو سفارشات پیش کی ہیں' ان کے بارے میں اس اجتماع کی یہ متفقہ رائے ہے کہ یہ سفارشات اسلامی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں۔

"اس اجتماع کی خواہش تھی کہ اس موقعے پر اسلامی اصولوں کے مطابق ایک تفصیلی خاکہ بھی مرتب کر دیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لیے مجلس دستور ساز پاکستان کے صدر سے درخواست کی گئی کہ وہ تعلیمات اسلامی بورڈ کی سفارشات کا نسخہ اس اجتماع کو مہیا کر دے تاکہ وہ اگر اسلامی اصولوں کے مطابق درست ہو تو اس کی توثیق کر دی جائے یا اگر اس میں کچھ کمی ہو تو اسے پورا کر دیا جائے' اور نئے سرے سے ایک چیز مرتب کرنے میں محنت صرف کرنی نہ پڑے' لیکن صاحب موصوف نے بعض وجوہ سے اس درخواست کو قبول نہ فرمایا۔ اب یہ اجتماع سر دست ملتوی کیا جاتا ہے' اور تمام اسلامی فکر رکھنے والے اصحاب اور اداروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ ان متفقہ اصولوں کی روشنی میں دستور اسلامی کے متعلق اپنی اپنی تجاویز ۱۵ مارچ ۱۹۵۱ء تک حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی جیکب لائنز کراچی کے پاس بھیج دیں۔ اس کے بعد جلد ہی یہ اجتماع دوبارہ منعقد کیا جائے گا اور تمام تجاویز پر غور کر کے ایک تفصیلی خاکہ مرتب کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز۔

"اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل اصول کی تصریح لازمی ہے۔

۱ ---- اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

۲ ---- ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو گا اور کوئی ایسا اصول نہ بنایا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیے جائیں۔

۳---- مملکت کسی جغرافیائی' نسلی' لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں' بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہو گی' جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطہ حیات ہے۔

۴---- اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے' منکرات کو مٹائے' اور شعائرِ اسلام کے احیاو اعلااور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵---- اسلامی مملکت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیت جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی' لسانی' علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملت اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶---- مملکت بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا' لباس' مسکن' معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہو گی' جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں' یا عارضی طور پر بے روزگاری' بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیِ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷---- باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعت اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں' یعنی حدود قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو' آزادیٔ مذہب و مسلک' آزادیٔ عبادت' آزادیٔ ذات' آزادیٔ اظہار رائے' آزادیٔ نقل و حرکت' آزادیٔ اجتماع' آزادیٔ اکتسابِ رزق' ترقی کے مواقع میں یکسانی' اور رفاہی ادارات سے استفادے کا حق۔

۸---- مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا' اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعہ صفائی و فیصلہ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹---- مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہو گا' وہ اپنے خیالات کی

آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے' ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے' اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی فیصلے کریں۔

۱۰---- غیر مسلم باشندگان مملکت کو حدود قانون کے اندر مذہب و عبادت' تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی' اور انھیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم ورواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۱---- غیر مسلم باشندگان مملکت سے حدود شرعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں گے' ان کی پابندی لازمی ہوگی اور جن حقوق شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگان ملک اور مسلم باشندگان ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲---- رئیس مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے' جس کے تدین' صلاحیت' اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳---- رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا' البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۱۴---- رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں' بلکہ شورائی ہوگی' یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمائندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵---- رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً" یا جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶---- جو جماعت رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

۱۷---- رئیس مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا' اور قانونی تقاضے سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸---- ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا' دونوں پر عام عدالتیں ہی اسے نافذ کریں گی۔

۱۹---- محکمہ عدلیہ' محکمہ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰---- ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی

اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱---- ملک کے مختلف ولایات واقطاع' مملکت واحدہ کے اجزاانتظامی حلقے ہوں گے' ان کی حیثیت نسلی' لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں' بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنھیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع' انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا' مگر انھیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔

۲۲---- دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی' جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

## اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس:

۱۔ (علامہ) سید سلیمان ندوی (صدر مجلس ہذا)

۲۔ (مولانا) سید ابوالاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی پاکستان)

۳۔ (مولانا) شمس الحق افغانی (وزیر معارف' ریاست قلات)

۴۔ (مولانا) محمد بدر عالم (استاذ الحدیث' دارالعلوم الاسلامیہ' اشرف آباد' ٹنڈو الہ یار' سندھ)

۵۔ (مولانا) احتشام الحق تھانوی (مہتمم دارالعلوم اسلامیہ' اشرف آباد' سندھ)

۶۔ (مولانا) محمد عبد الحامد قادری بدایونی (صدر جمعیت العلما پاکستان سندھ)

۷۔ مفتی محمد شفیع (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلامی' مجلس دستور ساز پاکستان)

۸۔ (مولانا) محمد ادریس (شیخ الجامعہ' جامعہ عباسیہ' بہاول پور)

۹۔ (مولانا) خیر محمد (مہتمم مدرسہ خیر المدارس' ملتان شہر)

۱۰۔ (مولانا مفتی) محمد حسن (مہتمم جامعہ اشرفیہ' نیلا گنبد' لاہور)

۱۱۔ (پیر صاحب) محمد امین الحسنات (مانکی شریف' سرحد)

۱۲۔ (مولانا) محمد یوسف بنوری (شیخ التفسیر' دارالعلوم الاسلامیہ' اشرف آباد' سندھ)

۱۳۔ (حاجی) خادم الاسلام محمد امین (المجاہد آباد' پشاور' صوبہ سرحد) خلیفہ حاجی ترنگ زئی

۱۴۔ (قاضی) عبدالصمد سربازی (قاضی قلات' بلوچستان)

۱۵۔ (مولانا) اطہر علی (صدر جمعیت العلما اسلام' مشرقی پاکستان)

۱۶۔ (مولانا) ابو جعفر محمد صالح (امیر جمعیت حزب اللہ' مشرقی پاکستان)

۱۷۔ (مولانا) راغب احسن (نائب صدر جمعیت العلما اسلام مشرقی پاکستان)

۱۸۔ (مولانا) محمد حبیب الرحمٰن (نائب صدر جمعیت المدرسین' سرسینہ شریف' مشرقی پاکستان)

۱۹- (مولانا) محمد علی جالندہری (مجلس احرار اسلام' پاکستان)

۲۰- (مولانا) داؤد غزنوی (صدر جمعیت اہل حدیث 'مغربی پاکستان)

۲۱- (مفتی) جعفر حسین مجتہد (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلامی' مجلس دستور ساز پاکستان)

۲۲- (مفتی حافظ) کفایت حسین مجتہد (ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان)

۲۳- (مولانا) محمد اسماعیل (ناظم جمعیت اہل حدیث 'مغربی پاکستان 'گوجرانوالہ)

۲۴- (مولانا) حبیب اللہ (جامعہ دینیہ دار الہدیٰ 'ٹیڑھی' خیر پور میر)

۲۵- (مولانا) احمد علی (امیر انجمن خدام الدین شیر انوالہ دروازہ' لاہور)

۲۶- (مولانا) محمد صادق (مہتمم مدرسہ مظہر العلوم 'کھڈہ' کراچی)

۲۷- (پروفیسر) عبد الخالق (رکن بورڈ آف تعلیمات اسلامی' مجلس دستور ساز' پاکستان)

۲۸- (مولانا) شمس الحق فرید پوری (صدر مہتمم مدرسہ اشرف العلوم' ڈھاکہ)

۲۹- (مفتی) محمد صاحب داد (سندھ 'مدرستہ الاسلام' کراچی)

۳۰- (مولانا) محمد ظفر احمد انصاری (سیکرٹری بورڈ آف تعلیمات اسلامی' مجلس دستور ساز' پاکستان)

۳۱- (پیر صاحب) محمد ہاشم مجددی (ٹنڈو سائیں داد' سندھ)

یہ تھے اسلامی مملکت کے بائیس نکات جو مندرجہ بالا اکتیس علما نے مرتب اور منظور کر کے حکومت کو پیش کیے تھے۔

یہ نکات ہم نے ۹- فروری ۱۹۵۱ء کے "الاعتصام" میں درج کیے تھے- اس وقت قیام پاکستان پر صرف ساڑھے تین سال کا عرصہ گزرا تھا- ان نکات کے فاضل مرتبین نے یہ بالکل نہیں کہا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا' اس لیے اسلام کی تحویل میں دے دیا جائے- یہ اس بنا پر نہیں کہا کہ ان تمام حضرات کو اصل حقیقت کا پورا علم تھا- انھوں نے صرف یہ کہا اور پورے زور سے کہا کہ یہاں اسلام نافذ ہونا چاہیے- اور یہی صحیح بات تھی اب بھی یہی بات صحیح ہے ----- قیام پاکستان کی وجہ اگرچہ کوئی ہو' لیکن یہ مسلمانوں کا ملک ہے' لہٰذا یہاں اسلام ہی کا بول بالا ہونا چاہیے -----

۹- فروری ۱۹۵۱ء کے الاعتصام ہی میں "کراچی میں علما کا اجتماع ----- کیا یہ سفارشات مانی جائیں گی-" کے عنوان سے ہم نے مندرجہ ذیل اداریہ لکھا تھا- ملاحظہ فرمایے-

"الاعتصام کے اسی شمارے میں اس اجلاس کی مکمل روداد چھپ رہی ہے جو کراچی میں اس غرض سے منعقد ہوا کہ تمام مدرسہ خیال کے علما جمع ہو کر اسلامی آئین کا ایسا مجمل خاکہ تیار کریں، جس کی روشنی میں آئندہ تفصیلی دستور کی طرح ڈالی جا سکے' اور ان اساسی و بنیادی خطوط کی نشان دہی فرمائیں، جن سے ترتیب پا کر اسلامی ریاست کا مرقع تیار ہوتا ہے۔

"الحمد للہ ان حضرات کی مساعی کامیاب ہوئیں اور انھوں نے بغیر اس کے کہ بھاری بھر کم مصارف کا بار حکومت کے کندھوں پر ڈالیں' وقت ضائع کریں اور آئین و ضابطے کی بے معنی موشگافیوں میں الجھیں' اسلام کا ایسا اقل قلیل آئینی ڈھانچا بنا دیا کہ اگر آئندہ قانونی تفصیلات میں وہ منعکس ہوتا ہے تو پاکستان اسلامی ریاست ہے' ورنہ نہیں۔

"اب برسر اقتدار طبقہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ علما نے اپنا فرض نہیں پہچانا یا اس طبقے نے ہماری رہنمائی نہیں کی یا ہمارے سامنے اسلامی نقطہ نظر کو اس خوبی اور سلجھاؤ کے ساتھ واضح نہیں کیا گیا کہ ہم اس سے استفادہ کر سکتے اور یہ جان سکتے کہ اسلام کس ڈھب کی ریاست معرض وجود میں لانا چاہتا ہے۔

"اس حد تک یقیناً اتمام حجت ہو چکا اور لیاقت علی نے جو یہ کہا تھا کہ ہمیں بتاؤ اسلامی دستور کیا ہے' اس کا جواب بھی دیا جا چکا۔ اب اگلا قدم دیانت داری سے یہ ہونا چاہیے کہ حکومت انہی علما سے پھر استصواب کرے اور تفصیلی جزئیات کے لیے ان سے مشورہ کرے اور اس دستور ساز اسمبلی کو ختم کر دے جس نے تین سال کے لمبے عرصے میں کوئی کام نہیں کیا اور بلا ادنیٰ زحمت و محنت کے لمبی لمبی تنخواہیں وصول کیں۔

"لیکن یہ نہیں ہو گا۔ دستور ساز اسمبلی قائم رہے گی' علما کی سفارشات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے گا اور اس انگریز قانون دان کی طرف بار بار رجوع ہو گا' جس کو ساٹھ ستر ہزار روپے سالانہ تنخواہ پر بلایا گیا ہے' کیوں کہ وہ قانون بناتے وقت اس بات کا برابر خیال رکھے گا کہ موجودہ طبقے کا ذہن کیسا ہے' ان کے زندگی کے متعلق کیا نظریات ہیں اور ان میں کس قسم کی کمزوریاں ہیں' جن کو بہرحال ملحوظ رکھنا ہے۔ یہ انگریز جو سانچا بنائے گا وہ ہر اعتبار سے "ماڈرن" ہو گا۔ نئی زندگی اور نئے خیالات کو پھیلانے میں ممد و معاون ہو سکے گا۔

"علما اور حکومت کے نقطہ نظر میں اصولی فرق یہ ہے کہ علما ایک ایسی مثالی اسلامی ریاست قائم کرنے کے درپے ہیں' جس کی بنیاد خدا پرستی کا عقیدہ ہو' جس میں عدل و انصاف

ہو' نیکی اور تقوے کو فضیلت و برتری کا معیار قرار دیا جائے اور پاک بازی و عفاف انسانیت کے بہترین جوہر سمجھے جائیں' مگر یہاں یہ الجھن ہے کہ شراب ناب کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا' رقص و سرود جان ثقافت ہیں' فواحش و منکرات کی گرم بازاری سے تمدن و معاشرت کے گھر کی رونق وابستہ ہے' اور ان میں معیار فضیلت کیریکٹر کے بجائے مال و دولت ہے۔ گورنمنٹ ان خیالات کو آخر کیوں کر نظر انداز کر سکتی ہے۔ انگریز قانون دان کو اسی لیے دعوت دی گئی ہے کہ وہ ان تمام باریکیوں پر نظر رکھے گا اور ایسا آئینی چوکھٹا بنائے گا' جو موجودہ رجحانات کا ساتھ دے سکے اور اسلام کی ایسی مغربی تعبیر پیش کر سکے جس میں خاص لچک اور وسعت ہو۔

"ہمارا یہ شبہ محض سوءِ ظن پر مبنی نہیں بلکہ ہماری یہ نپی تلی رائے ہے کہ پاکستان میں اسلام ان لوگوں کی وجہ سے کبھی برسر اقتدار نہیں آ سکے گا' کیوں کہ ان کی زندگی کی سمتیں اور ہیں' اور اسلام جس ڈھب کی زندگی کا متقاضی ہے اس کے اشارے اور ہیں' اور دونوں میں جو خلیج حائل ہے اس کا پاٹنا ناممکن ہے۔

"اگر یہ ناممکن ہے کہ علما یورپ کے لوگوں کے لیے ان کے معاشرے کے معائب کو قائم رکھتے ہوئے ایسا پاکیزہ اصول زندگی وضع کر سکیں' جو کتاب و سنت کی روشنی پر مبنی ہو' تو پھر یہ بھی ناممکن ہے کہ ایسا گروہ جو فکر و عمل کے اعتبار سے اسلام کے ساتھ کوئی لگاؤ نہیں رکھتا' اپنے لیے ایسی پابندیوں کو گوارا کر لے' جن کو وہ عملی زندگی میں عائد کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں ہوتا ----- آخر اس حسن ظن کی بھی کوئی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلامیات کا مطالعہ نہیں کیا' اس کے عملیات سے واقف نہیں' اس کے اصول زندگی پر عمل پیرا نہیں' اس کے فلسفہ و عظمت سے آگاہ نہیں' بلکہ جو اسلام کو سرے سے اس لائق ہی نہیں سمجھتے کہ وہ اس دور میں ان کی راہ نمائی کر سکے' جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام کے معنی تنگ نظری اور جہالت کے ہیں اور جن کی رائے میں اسلامی قانون کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ یہ صرف ایک شخص کی زندگی کے گرد گھومتا ہے' کیا وہ کتاب و سنت کے مطابق قانون نافذ کریں گے؟

"یہ بالکل موٹی سی بات ہے' جس کی تہہ تک ہر شخص بادنیٰ تامل پہنچ سکتا ہے کہ اگر واقعی اسلام کو نافذ کرنا ان لوگوں کا نصب العین ہوتا تو اس میں رکاوٹ کیا ہے؟ کیا ہمارے

دیکھتے دیکھتے ہندوستان نے آئین وضع نہیں کر لیا ہے؟ کیا اس کے سامنے الجھنیں نہ تھیں؟ کیا اس نے ساڑھے پانچ سو سے زاید ریاستوں کو ختم نہیں کر ڈالا؟ کیا اس کے لیے مسئلہ کشمیر پریشانیوں کا سبب نہیں؟ کیا غذا کی قلت اور سیاسی اختلافات کی بوقلمونی ان لوگوں کی راہ میں حائل نہیں تھی؟ لیکن وہ چوں کہ یہ کام کرنا چاہتے تھے' اس لیے ان تمام دشواریوں کے باوجود انھوں نے کر ڈالا ------ اور ہمارے حکمران اس لیے حیص بیص اور ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں کہ یہ لوگ یہ کام کرنا نہیں چاہتے۔

''کون نہیں جانتا کہ ان بنیادی نکات کی توضیح سے پہلے تعلیمات اسلامی بورڈ کے ارکان نے سفارشات کی ایک فہرست تیار کی' مگر چوں کہ وہ خداوندان اقتدار کے مزاج کے مطابق نہیں تھی' اس لیے اسے شائع نہیں کیا گیا' بلکہ جب اس اجتماع میں مطالبہ کیا گیا کہ ہمیں ان سفارشات کی ایک جھلک دکھائی جائے تو انکار کر دیا گیا۔ کیا یہ کھلا ہوا ثبوت اس دعوے کا نہیں ہے کہ یہاں اسلامی آئین کی تیاری کا کوئی ارادہ نہیں' بلکہ یہ محض ایک طرح کی مجبوری ہے' جس کو نبھایا جا رہا ہے' اور علما خواہ مخواہ اس پر زور ڈال رہے ہیں۔

''ہمارے نزدیک کراچی کے اس فیصلے کا صرف یہ مطلب ہے کہ ان حضرات علما نے اسلامی آئین کے تیار کرنے اور اسے ملک میں مقبول و متعارف ٹھہرانے کی ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر ڈال لیا ہے' یعنی آئندہ اگر پاکستان میں موجودہ دستور ساز اسمبلی یہ اہم کام نہ کر سکی تو یہ علما کوشش کریں گے کہ خود اس فریضے سے عہدہ براہوں' اب ان سب حضرات کو سعی و حرکت کا کوئی ایسا جچا تلا پروگرام وضع کرنا ہوگا جو انھیں منزل مقصود تک پہنچا سکے اور اس راہ کی دشواریوں کو دور کر سکے۔ یہ بات یوں بھی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کام جو اصل میں انہی حضرات کے کرنے کا ہے' وہ لوگ انجام دیں جو اس کے لیے ذوق و فکر کی کوئی مناسبت ہی اپنے میں نہیں پاتے۔

''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان گرامی قدر علما نے یہ قدم اٹھا کر جہاں اپنی ذمہ داریوں کو بڑھا لیا ہے' وہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کے بارے میں کوئی چال بازی نہیں چل سکتی۔ اور یہ کہ وہ متعین خاکہ ہے' جسے تدوین آئین کے وقت بہرحال سامنے رکھنا پڑے گا۔''

یہ اداریہ قارئین کرام نے پڑھ لیا ------ آج سے تقریباً پچاس سال پیشتر ۱۹۵۱ء میں ہم نے پیش گوئی کی تھی کہ ملک کے اکتیس علما کی سفارشات حکومت نہیں مانے گی' اور

اس نے نہیں مانیں' اور ہماری پیش گوئی سچی ثابت ہوئی ---- اب ہم ڈاکٹر صاحب سے معذرت کے ساتھ آئندہ پچاس سال کے لیے پھر پیش گوئی کرتے ہیں کہ آنے والی نصف صدی میں بھی کوئی حکومت یہاں ایسا اسلامی نظام نافذ نہیں کرے گی جو اسلام کو مطلوب ہے اور تعلیماتِ اسلامی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے-اس کے ساتھ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اگر خود ڈاکٹر صاحب کی خلافت قائم ہو گئی تو بھی وہ اسلامی نظام نہیں آئے گا' جس کی ڈاکٹر صاحب اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس وقت تبلیغ فرما رہے ہیں-جب ڈاکٹر صاحب خود خلیفہ یا صدر یا وزیرِ اعظم بنیں گے تو معاملات کی پیچیدگیاں ان کے سامنے آئیں گی-

نعرہ تو نواز شریف نے بھی لگایا تھا کہ میں کامیاب ہو کر خلافت راشدہ قائم کر دوں گا-وہ کامیاب ہو گئے' لیکن اس خلیفۂ راشد کی خلافت راشدہ کا ابھی تک سراغ نہیں ملا کہ وہ کہاں ہے اور کس طرف کو بھاگ گئی ہے-

اسلامی نظام صرف سزائیں دینے کا نام نہیں ہے' اس میں اقتصادیات' معاشیات' مساوات' دولت کی عادلانہ و مساویانہ تقسیم' معاشرتی مسائل' مزدور اور کارخانہ دار کے مسائل' زمیندار اور مزارع کے مسائل' عدل اجتماعی' عفت' پاک دامنی' سود کا خاتمہ' معاشرے سے غربت اور اونچ نیچ کا خاتمہ' تعلیم عام کرنا' ہر شخص کو روزگار مہیا کرنا وغیرہ بے شمار چیزیں شامل ہیں- اور یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں حکمران مرکزِ توجہ ٹھہرانے کے لیے تیار نہیں' اس لیے کہ اس سے خود ان کے مفادات پر زد پڑتی ہے-جب تک یہ چیزیں نہیں ہوں گی' اسلامی نظام نافذ نہیں ہو گا-

ڈاکٹر اسرار احمد پر خلوص اور پر جوش لہجے میں فرمایا کرتے ہیں کہ ہمارا اصل مقصد غلبۂ اسلام ہے اور اسلام بہرحال غالب ہونا چاہیے-

سوال یہ ہے کہ اسلام مغلوب کب تھا؟ اللہ کے فضل سے اسلام ہمیشہ غالب رہا ہے اور ان شاء اللہ غالب رہے گا-اسے کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی- مسلمان عملی اعتبار سے بے شک کمزور ہو سکتے ہیں' لیکن ان کی کمزوری کو اسلام کی مغلوبیت ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا-

دعا ہے اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کو اور تمام مسلمانوں کو ان کے نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے-آمین یا رب العالمین-

# مولانا عبداللہ گورداس پوری

وقت گزرتے پتا نہیں چلتا-ماہ وسال کے حساب سے دیکھیں تو یہ آج سے اڑتالیس برس پیشتر جون ۱۹۵۰ء کی بات ہے اور اسے زاویہ تصور میں لائیں تو کل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے--- غور کیا جائے تو انسان کی ساری زندگی کا یہی حال ہے' کوئی شخص عمر کی بیس منزلیں طے کر چکا ہے یا ایک سو بیس' وہ پیچھے گردن موڑ کر دیکھے گا تو کچھ نظر نہیں آئے گا- ہر چیز کی کچھ نہ کچھ حیثیت ہے' ہر شے میں تھوڑی بہت پائیداری پائی جاتی ہے جو دیکھنے والے کو نظر آتی ہے اور ٹٹولنے والے کے ہاتھ اس پر پڑتے ہیں' لیکن انسانی زندگی بہت زیادہ باحیثیت اور پائیدار ہونے کے باوصف' نہ کوئی حیثیت رکھتی ہے' نہ کسی نوع کی پائیداری کی حامل ہے' نہ ہاتھ اسے مس کر سکتا ہے اور نہ آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے-وہ ایسی غیر مرئی اور غیر محسوس چیز ہے جو مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی اپنا سفر تیزی کے ساتھ طے کرتی رہتی ہے-یہی حال اس معاملے کا ہے جو آئندہ سطور میں عرض کرنا مقصود ہے-

۱۹۵۰ء کے ماہ جون کے پہلے ہفتے میں میں نے ''الاعتصام'' کی توسیع اشاعت کے لیے جنوبی پنجاب کے بعض علاقوں کا رخ کیا-اس وقت یہ اخبار گوجرانوالہ سے شائع ہوتا تھا اور میں اس سے منسلک تھا- ایک یا دو دن اوکاڑے رہا' وہاں مولانا معین الدین لکھوی کی کوشش اور مدد سے چند سالانہ خریدار بنائے اور جامعہ محمدیہ کے ایک صاحب غالباً محمد یعقوب (جلد ساز) نے اس کی ایجنسی لی-

اس کے بعد ساہیوال گیا-وہاں چوہدری عبدالقادر (علیگ) مرحوم نے میرا ساتھ دیا اور وہ اخبار کے خریداروں کی تعداد میں اضافے کا باعث بنے-

ساہیوال سے میاں چنوں کا عزم کیا- وہاں اس زمانے میں مولانا محمد داؤد ارشد مرحوم خدمت تدریس انجام دیتے تھے' وہ نہایت مستعد' متحرک' مہمان نواز' ملنسار اور ہمدرد عالم دین تھے- میں ان سے مل کر بے حد خوش ہوا' انھوں نے بھی بہ درجہ غایت احترام کا برتاؤ کیا اور جس کام کے لیے میں گیا تھا' اسے اپنے ذاتی کام سے زیادہ اہمیت دی-دو

دن اور دو راتیں وہاں رہا۔

ایک تو وہ موسم گرمی کا تھا‘ دوسرے علاقہ گرم تھا‘ یوں سمجھیے کہ آگ برس رہی تھی۔ پھر زیادہ تر راستے کچے تھے‘ سڑکوں کا یہ سلسلہ نہ تھا جو اب ہم دیکھ رہے ہیں‘ کچے راستوں پر بسیں چلتی تھیں اور وہ بھی بہت کم۔

میاں چنوں سے میرا پروگرام بوریوالہ جانے کا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ میاں چنوں سے بوریوالہ کتنی مسافت پر ہے‘ لیکن پتا چلا کہ کچا راستہ ہے اور دن میں تین یا چار بسیں چلتی ہیں۔ صبح سات بجے کے قریب‘ گیارہ بجے کے پس و پیش اور تین بجے کے لگ بھگ ----- اس وقت سات بجے کی بس نکل چکی تھی ----- میں گیارہ بجے کی بس پر سوار ہوا۔ مولانا داؤد ارشد بس شاپ تک میرے ساتھ آئے اور اپنی دانست میں اچھی سیٹ پر مجھے بٹھایا۔

سخت گرمی پڑ رہی تھی اور پسینے نچڑ رہے تھے۔ بس کے چلتے ہی کچے راستے نے فضا کو گرد و غبار سے بھر دیا۔ کسی نے سر اور منہ کپڑے سے ڈھانپ لیے اور کسی نے چادر جسم پر اوڑھ لی۔ میرے پاس اس قسم کا کوئی کپڑا نہ تھا‘ میں مٹی سے بری طرح اٹ گیا۔

میں پہلی مرتبہ بوریوالے گیا تھا۔ وہاں میرے بعض رشتے دار بھی تھے اور دوست بھی۔ رشتے داروں میں عبدالعزیز چکی والے‘ محمد ایوب بھٹی اور عبدالعزیز نمبردار شامل تھے ----- اور دوستوں میں مولوی محمد افضل اور میاں اکبر علی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بوریوالے پہنچ کر بس سے اترا اور گرد و غبار جھاڑنا شروع کیا تو حسن اتفاق سے سامنے عبدالعزیز نمبردار کھڑے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو تیزی سے میری طرف بڑھے اور گرد و غبار جھاڑنے میں میری مدد کی۔ سخت پیاس لگ رہی تھی۔ انھوں نے دہی کی لسی پلائی۔ وہ تو وہیں رہے اور مجھے ایک شخص کے ساتھ اپنے گھر بھیج دیا۔ وہاں کھانا کھایا اور آرام کیا۔

عصر کی نماز کے لیے مسجد میں گیا تو بہت سے رشتے داروں اور دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں زیادہ تر وہ حضرات تھے‘ جن سے تین سال (یعنی قیام پاکستان) کے بعد ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مولوی افضل صاحب بھی وہیں تھے اور وہاں کے ہائی سکول میں ٹیچر تھے۔

انھوں نے مسجد ہی میں ایک صاحب سے تعارف کرایا۔ میانہ قد‘ سیاہ داڑھی‘ پینتیس چھتیس سال کی جوان عمر‘ گندم گوں‘ چہرے پر بشاشت‘ لباس میں نفاست‘ بات چیت

میں مٹھاس، خوب صورت نقش و نگار، کلے پر طرے دار سفید پگڑی ---- یہ تھے مولانا عبداللہ گورداس پوری - بوریوالے کی مسجد اہل حدیث کے خطیب و امام ---- وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملے - میں نے پہلی دفعہ انھیں دیکھا اور پہلی دفعہ ہی ان کا نام سنا تھا ---- یہ عصر کی جماعت کھڑی ہونے سے پہلے کی بات ہے -

نماز سے فارغ ہوئے تو انھوں نے مجھے اور افضل صاحب سے کہا: آئیے چائے پئیں -

لیکن افضل صاحب ہم دونوں کو اپنے مکان پر لے گئے اور ہم نے وہیں چائے پی -

افضل صاحب کے متعلق تو مجھے معلوم تھا کہ وہ جدی پشتی چائے نوش ہیں - اب مولانا عبداللہ کے بارے میں پتا چلا کہ وہ بھی چائے کے رسیا ہیں اور عمدہ چائے پیتے ہیں، اور مہمان کی خاص طور سے چائے کے ساتھ تواضع فرماتے ہیں - انھوں نے گھر میں بکری رکھی ہے، اس کے تھنوں سے دودھ نکالا اور چائے بنالی - دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ بکری گھر میں رکھنے اور اس کی ٹہل سیوا کرنے کے سلسلے میں ان کا مقام گاندھی جی کے برابر ہے - گاندھی جی اپنی بکری کو بادام کھلایا کرتے تھے، ممکن ہے انھوں نے بھی گھر میں باداموں کی بوری رکھی ہو، چار بادام بکری کو کھلائے اور آٹھ اپنے منہ میں ڈال لے - پنجابی محاورہ ہے، بچے دا بج تے ماں دا رج - یعنی بچے کے بہانے ماں پیٹ بھر لیتی ہے -

افضل صاحب کے گھر مولانا عبداللہ کے ساتھ چائے نوشی کے وقت پتا چلا کہ وہ نہایت دلچسپ آدمی ہیں اور ان کی ہر بات میں خوش طبعی اور بذلہ سنجی کا عنصر نمایاں رہتا ہے - نہ خود تکلف سے کام لیتے ہیں، نہ دوسرے کو تکلف میں مبتلا کرتے ہیں -

یہ جمعرات کا دن تھا ---- دوسرے دن جمعہ تھا - جمعہ انھی کی اقتدا میں پڑھا اور ان کا خطبہ جمعہ سن کر لطف آگیا - لطیفانہ انداز کلام اور حکیمانہ اسلوب وعظ -

اب آیئے ان کے کاروان حیات کی مختلف سمتوں کی ٹوہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں -

وہ ۱۹۱۶ء میں ضلع گورداس پور (مشرقی پنجاب) کے ایک مقام ''وڑائچ'' میں پیدا ہوئے - والد کا اسم گرامی حکیم امام الدین تھا جو علمائے کرام اور واعظین عظام کی عزت و توقیر میں اس نواح میں خاص شہرت رکھتے تھے - نیک اور صالح بزرگ تھے ---- ان کا یہ بچہ کچھ شناسائے فہم ہوا تو انھوں نے اسے سرکاری سکول میں داخل کرا دیا، جہاں بچے نے مڈل کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا - بعد ازاں خالصہ ہائی سکول بھاگووال میں داخل کرا

دیا گیا۔

عبداللہ جب ہائی سکول میں گئے اس وقت وہ پندرہ سولہ سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے اور حالات کی رفتار اور واقعات کی چال کو سمجھنے کی ان میں اچھی خاصی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔انہی دنوں کی بات ہے کہ اس علاقے میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا‘ جس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے اور ان کی تقریروں سے لوگ نہایت متاثر ہوئے تھے۔

عبداللہ نے بھی یہ تقریریں سنیں اور وہ بھی ان تقریروں سے اثر پذیر ہوئے‘ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے سکول کی تعلیم ترک کر کے دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ذہن میں آیا کہ اصل زندگی اور اصل تعلیم تو ان لوگوں کی ہے‘ جن کے جلسوں میں اس قدر کثیر تعداد میں لوگ شامل ہوتے اور نہایت ذوق و شوق سے ان کی تقریریں سنتے ہیں‘ اور پھر اپنے قافلہ حیات کو راہ مستقیم پر لگا لیتے ہیں‘ اور یہی وہ راہ ہے‘ جس پر گام زن ہونے والا دنیا و آخرت کی فلاح حاصل کر لیتا ہے۔اس کا اظہار انھوں نے اپنے والد محترم حکیم امام الدین سے کیا اور سکول کی تعلیم ترک کر کے بٹالہ کے ایک دینی مدرسے میں داخل ہو گئے‘ جس کا نام مدرسہ دارالسلام تھا۔یہ مدرسہ وہاں کی انجمن خادم المسلمین کے زیر انتظام جاری کیا گیا تھا اور اس علاقے کے ایک نہایت متقی بزرگ اور جید عالم مولانا عطاء اللہ صاحب اس میں خدمت تدریس انجام دیتے تھے‘ جنھیں اگست ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں سکھوں نے شہید کر دیا تھا۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بٹالہ کے لوگ مولانا قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری سے بہت متاثر تھے اور قاضی صاحب مرحوم وہاں کے سالانہ جلسوں میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔انجمن خادم المسلمین بٹالہ ۱۹۲۸ء میں قاضی صاحب ہی نے قائم کی تھی۔ قاضی صاحب نے حج بیت اللہ سے واپسی کے وقت ۳۰۔ مئی ۱۹۳۰ء کو بحری جہاز میں وفات پائی تھی۔ان کی وفات کے بعد قاضی صاحب کے صاحب زادۂ گرامی قدر قاضی عبدالعزیز منصور پوری کو انجمن کے جلسوں میں دعوت شرکت دی جاتی تھی اور وہ تشریف لاتے اور تقریر ارشاد فرماتے تھے۔

مولانا عبداللہ نے درس نظامی کی تکمیل مدرسہ دارالسلام بٹالہ میں مولانا عطاء اللہ

شہید سے کی۔اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے انھوں نے امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کا عزم کیا اور وہاں کے لائق احترام اساتذہ سے کچھ درسی کتابیں پڑھیں' پھر مدرسہ رحمانیہ (دہلی) کے لیے رختِ سفر باندھا اور کچھ عرصہ وہاں قیام فرما رہے۔دارالعلوم دیوبند بھی گئے اور وہاں کے جید اساتذہ کے حضور زانوے شاگردی تہ کیا۔حضرت مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کی خدمت اقدس میں بھی حاضری دی اور ان کے دورۂ تفسیر میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

حصولِ علم کے بعد ۱۹۳۷ء میں انھوں نے خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔دھاریوال میں اس زمانے میں ایک بہت بڑی وولن مل تھی' جس کا مالک انگریز تھا۔اس میں ہندو' مسلمان' سکھ اور عیسائی ہر مذہب کے اٹھائیس ہزار مزدور کام کرتے تھے'انگریز مالک نے مل کے احاطے میں ایک مسجد تعمیر کرائی' ایک گوردوارا بنوایا اور ایک مندر اور ایک گرجا تعمیر کرایا تاکہ ہر مذہب کے لوگ اپنے مذہب کے مطابق اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کر سکیں' گوردوارے میں گیانی' مندر میں پنڈت' گرجے میں پادری اور مسجد میں خطیب و امام مقرر کیے گئے۔پنڈت' گیانی' پادری اور خطیب کی تنخواہ پچاس پچاس روپے ماہانہ مقرر کی گئی تھی اور ان مذہبی مقامات کی صفائی کرنے والوں کو پندرہ پندرہ روپے ماہانہ دیے جاتے تھے۔ سستا زمانہ تھا اور اس دور کے مطابق یہ بڑی معقول تنخواہیں تھیں۔

وولن مل دھاریوال کی مسجد کے منصب خطابت پر مولانا عبداللہ گورداس پوری کو متعین کیا گیا تھا۔یہ خدمت انھوں نے ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک دس سال سر انجام دی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں کی مسجد اہل حدیث کے دارالعلوم میں تدریسی فریضہ ان کے سپرد کیا گیا اور اس اثنا میں انھوں نے قرآن و حدیث اور دیگر مروجہ علوم کی چند کتابیں طلبا کو پڑھائیں۔

مولانا محمود احمد غضنفر نے ۳۰ اگست ۱۹۹۶ء کے ہفت روزہ ''تنظیم اہل حدیث'' میں مولانا عبداللہ گورداس پوری سے متعلق ایک مضمون تحریر کیا تھا' ذیل میں ہم اس مضمون سے بعض چیزیں مستعار لے کر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

دھاریوال کے دوران قیام میں جس شخصیت نے مولانا عبداللہ کو سب سے زیادہ متاثر کیا' وہ سید محمد حسین شاہ ربانی تھے۔وہ ایک مقامی سکول میں ٹیچر تھے۔ڈھیلا ڈھالا سا کھدر کا لباس پہنتے اور ہر وقت ذکر الٰہی میں مصروف رہتے۔شادی کی لیکن راس نہ آئی۔ان کا روزانہ

کا معمول یہ تھا کہ سکول سے فارغ ہو کر دو پیسے کا گندم اور چنے کا آٹا خریدتے اور اس کی دو روٹیاں پکاتے' پھر کسی درخت کے پتے لیتے اور اس کی چٹنی بناتے اور اس میں تھوڑا سا گھی ڈال کر کھا لیتے۔

دور دراز کے علاقوں سے لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے دعا کی درخواست کرتے' اللہ ان کی دعا قبول فرماتا تھا۔

انھوں نے بہت سے کبوتر اپنے گھر میں جمع کر رکھے تھے' ان کے لیے دانے دنکے کا خوب انتظام تھا۔ ان کے عقیدت مند بھی کبوتروں کے لیے گندم وغیرہ دے جاتے تھے۔ کبوتر ان کے صحن میں گھومتے رہتے تھے۔

سکول کی تنخواہ سے بھی ہر مہینے کچھ پیسے بچ جاتے اور لوگ بھی ان کی خدمت کرتے تھے' اس رقم سے وہ کسی مناسب مقام پر مسجد تعمیر کرا دیتے' اس طرح انھوں نے اپنی زندگی میں چار مسجدیں تعمیر کرائیں۔

ایک دن انھوں نے مولانا عبداللہ کو اپنے گھر بلایا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں میری تعمیر کردہ تمام مسجدیں ربانی وقف کے نام سے انجمن اہل حدیث دھاریوال کے نام منتقل کر دی جائیں اور اس وقف کی نگرانی آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کرے۔

مولانا عبداللہ اس تجویز سے انتہائی خوش ہوئے اور مولانا ثناء اللہ صاحب کی خدمت میں امرتسر گئے' ان سے انھوں نے سید محمد حسین شاہ ربانی کی اس تجویز کا ذکر کیا۔ مولانا ثناء اللہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے ناظم اعلیٰ تھے۔ انھوں نے اس تجویز پر مسرت کا اظہار فرمایا اور ارشاد ہوا کہ دھاریوال میں ایک جلسہ منعقد کیا جائے اور اس جلسے میں سید صاحب کی اس تجویز کا اعلان کیا جائے۔

مولانا عبداللہ کو اس جلسے کے انعقاد کی تشہیر پر مامور کیا گیا۔ انھوں نے سائیکل لیا اور گورداس پور کے تمام ضلعے کا دورہ کیا اور مختلف دیہات و قصبات میں تقریریں کر کے اس جلسے کی خوب تشہیر کی۔ جلسے میں ضلع گورداس پور اور بعض دیگر اضلاع کے واعظین و مقررین آئے اور ان کے مواعظ حسنہ سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔

جلسے کی صدارت حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے کی تھی۔ انھوں نے صدارتی تقریر "قد افلح من تزکی" کے موضوع پر ارشاد فرمائی۔ مولانا کا اسلوب بیان نہایت

موثر تھا۔ سامعین میں ایک بزرگ جناب سید پیر جماعت علی شاہ صاحب کے ارادت مند بھی موجود تھے۔ وہ سب سے زیادہ متاثر تھے اور ان پر رقت طاری تھی۔ تقریر ختم ہوئی تو انھوں نے مولانا کے متعلق کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا: بلاشبہ یہ شخص اللہ کا ولی ہے۔

کھانے کا وقت ہوا تو سب حاضرین کو عام لنگر میں کھانے کی دعوت دی گئی اور حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب سے شہر کے بعض حضرات نے کھانے کے لیے اپنے مکان پر تشریف لے جانے کی درخواست کی، مگر انھوں نے کسی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں آج سید محمد حسین شاہ ربانی کا مہمان ہوں، انھی کے ساتھ کھانا کھاؤں گا۔ میزبان کے ہاں گئے تو دیکھا کہ وہ اپنے چبوترے پر بیٹھے باسی روٹی کھا رہے ہیں۔۔۔۔۔ مولانا بھی وہیں جا بیٹھے اور بسم اللہ پڑھ کر ان کے ساتھ کھانا شروع کر دیا، وہی باسی روٹی کھائی جو شاہ صاحب کھا رہے تھے۔

مولانا عبداللہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک دس سال وولن مل دھاریوال کی مسجد میں فریضہ خطابت سر انجام دیتے رہے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں مشرقی پنجاب کے سکھوں نے مسلمانوں کو قتل و غارت کا نشانہ بنایا تو وہ اپنے خاندان کے ہمراہ براستہ ڈیرہ بابا نانک پاکستان میں داخل ہوئے۔ چند روز نارووال میں قیام کیا۔ پھر سیالکوٹ، وزیر آباد، سوہدرہ اور گوجرانوالہ سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے۔ لاہور سے رائے ونڈ کا عزم کیا۔ رائے ونڈ میں ان کے برادر نسبتی قیام پذیر تھے۔

مولانا کا قافلہ پچاس ساٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ ایک بہت بڑی حویلی ان کے برادر نسبتی کے قبضے میں تھی، مولانا عبداللہ اور ان کے ساتھیوں نے اسی حویلی میں پڑاؤ کیا۔

اس وقت عیدالاضحیٰ میں چار دن باقی تھے۔ مولانا نے چالیس روپے میں قربانی کے لیے گائے خریدی۔

رائے ونڈ میں اس وقت ایک ہی مسجد تھی، جس کی رجسٹری حاجی محمد عاشق کے نام تھی اور وہ اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا عید کی نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ حاجی محمد عاشق کو کسی نے کہہ دیا کہ یہ عالم دین ہیں۔ حاجی صاحب ان کے پاس آئے اور نماز عید پڑھانے اور خطبہ ارشاد فرمانے کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے نماز عید پڑھائی اور خطبہ دیا۔

خطبے کا موضوع حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ ہجرت اور ان کا جذبہ قربانی تھا۔ سامعین میں اکثریت مشرقی پنجاب سے آنے والے لوگوں کی تھی اور ترک وطن کے زخم ابھی تازہ تھے۔ تقریر کے الفاظ و انداز کی اثر پذیری سے ہر آنکھ پرنم تھی اور ہر دل تڑپ رہا تھا۔

عید کے بعد مولانا اپنی قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور گائے کی قربانی میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ حاجی محمد عاشق ریڑھی لیے کھڑے ہیں، جس پر ایک بوری آٹے کی اور ایک بوری چاولوں کی ہے۔ کہا یہ حقیر سی خدمت قبول فرمایے۔ ساتھ ہی پانچ سو روپے نقد عنایت کیے۔ یہ بہت بڑی مدد تھی جو اس وقت انھوں نے فرمائی اور لٹے پٹے قافلے کو سہارا دیا۔

رائے ونڈ کے دوران قیام میں مولانا نے لاہور کے علاقہ سنت نگر میں کپڑا بنانے کی ایک چھوٹی سی مل الاٹ کرالی تھی۔ رائے ونڈ کی مسجد میں وہ بغیر کوئی حق خدمت وصول کیے خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے تھے۔ اس مسجد کی توسیع میں بھی انھوں نے بڑا کردار ادا کیا۔

۱۹۴۸ء میں قصور کی جامع مسجد اہل حدیث میں بھی (جسے جامع فریدیہ کہا جاتا ہے) کچھ عرصہ وہ خطبہ جمعہ دیتے رہے۔

بعد ازاں ۱۹۴۹ء میں بوریوالہ کی جماعت اہل حدیث کے بعض حضرات کی درخواست پر بوریوالہ تشریف لے گئے اور اب تک وہیں ہیں۔ اس وقت بوریوالہ میں ایک چبوترے کی صورت میں چھوٹی سی مسجد تھی۔ اب ماشاء اللہ بہت بڑی مسجد بن گئی ہے۔ بوریوالہ میں انھوں نے جو پہلا خطبہ دیا، اس میں سورہ عصر کی تفسیر بیان کی گئی تھی، جس سے سامعین بہت مستفید ہوئے تھے۔۔۔۔۔ مولانا ابتدا ہی سے شیروانی پہنتے تھے۔

محمود احمد غضنفر صاحب مولانا سے روایت کرتے ہیں کہ پاکستان آنے کے بعد انھوں نے پہلی شیروانی بازار سے دس آنے میں خریدی تھی جو ایک عرصے تک ان کے پاس رہی۔ وہ اسے خطبہ جمعہ کے وقت پہنا کرتے تھے۔

مولانا عبداللہ صاف بیان، عمدہ کلام اور منجھے ہوئے مقرر ہیں۔ تقریر کا انداز کچھ ایسا ہے کہ اس سے نہ صرف سامعین اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نہایت خوشی کے ساتھ ان کی تقریر سنی جاتی ہے اور لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ تقریر کا سلسلہ

جاری رہے-

تقریر کے علاوہ ان کی عام مجلس بھی مسرت آفرینی کا باعث ہوتی ہے- وہ لطیفے کے انداز میں بڑی پیاری اور میٹھی باتیں کرتے ہیں- دوسرے کی بات بھی نہایت توجہ سے سنتے ہیں اور اپنی بھی دلچسپ پیرائے میں دوسرے کو سناتے ہیں-

وہ جماعت اہل حدیث کے پرانے بزرگوں کی باتیں (جن میں مولانا ثناءاللہ صاحب امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں) بڑے اہتمام اور شوق سے بیان کیا کرتے ہیں- جماعت کے پرانے عوامی واعظوں اور مقرروں کے واقعات بھی انھیں خوب یاد ہیں- مثلاً مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی' ان کے بڑے بھائی مرحوم حافظ اسماعیل روپڑی' مولانا علی محمد صمصام اور مولانا میر محمد بھامبڑی کا تذکرہ خوب صورت اسلوب میں بیان فرماتے ہیں-

وہ خوش مزاج' خوش طبع' خوش اخلاق' خوش کلام عالم ہیں- چھوٹے بڑے ہر شخص سے خوش دلی سے ملتے اور ہر شخص سے اس کے مرتبے کے مطابق بات کرتے ہیں' سب کی عزت کرتے ہیں اور سب سے عزت کراتے ہیں- اپنے ہم مسلک حضرات میں بھی مستحق تکریم سمجھے جاتے ہیں اور غیر مسلک کے حاملین میں بھی اکرام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں-

ان کی حس مزاح اتنی تیز ہے کہ بات بات میں لطیفہ پیدا کر لیتے ہیں---- ان کے بہت سے لطائف میں سے چند لطیفے ملاحظہ ہوں-

(۱) کئی سال ہوئے' ان کی بیوی فوت ہو گئی تھی- ایک دوست نے بتایا کہ وہ بوریوالہ میں ان کی بیوی کی تعزیت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے----- تعزیتی باتیں ہو رہی تھیں کہ مولانا کی ایک شخص پر نظر پڑی جو ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے- آواز دے کر انھیں اپنے قریب بلایا اور ان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا' یہ میرے کلاس فیلو ہیں- وہ عمر میں ان سے بہت چھوٹے تھے- پوچھا' آپ کے کلاس فیلو کیسے ہو گئے' یہ تو آپ سے بہت کم عمر ہیں---- فرمایا ان کی بیوی بھی فوت ہو گئی ہے' میری بیوی بھی فوت ہو گئی ہے' جب دونوں ایک سے ہیں تو کلاس فیلو ہوئے-

(۲) ایک دفعہ ضلع سیالکوٹ کے کسی گاؤں میں گئے- وہاں لوگوں نے وعظ کے لیے کہا تو

وعظ کہا----- وعظ کے بعد ایک شخص نے کھانے کی دعوت دی اور وہ انھیں اپنے گھر لے گیا---- کھانے کے بعد عرض کی کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے وہ انھیں بیٹا عطا فرمائے۔

پوچھا: ایک بیٹے کے لیے دعا کروں یا دو کے لیے؟

اس نے جواب دیا: ذرا ٹھہریے' میں گھر سے پوچھ آؤں کہ دو بیٹے چاہئیں یا ایک ہی کافی ہے۔

(۳) بوریوالہ کے قریب ایک گاؤں میں ایک شخص وفات پا گیا۔ وہ بوڑھا آدمی تھا۔ اس کی بیوی نے ایک دن مولانا کو اپنے گھر بلایا۔ وہ گئے تو خاتون نے کہا:

سر سے پگڑی اتارو۔

پوچھا: کیا بات ہے؟ پگڑی کیوں اتاروں؟

بولی: ضروری بات ہے' بس پگڑی اتارو۔

خاتون کے مجبور کرنے پر پگڑی اتاری تو اس نے ان کے سر پر ایک پھٹا پرانا قرآن مجید رکھا اور کہا بیٹا:

تیرے بابے کا کہنا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد یہ قرآن مجید تجھے دیا جائے' اسے حفاظت سے رکھنا اور پڑھتے رہنا تاکہ تیرے بابے کو ثواب پہنچے۔

بولے: میرے بابے نے یہ پھٹا پرانا قرآن ہی مجھے دینے کو کہا تھا۔ کوئی بھینس' گائے' بکری' نقد روپے' زیور اور زمین جائداد دینے کو نہیں کہا تھا؟ ان چیزوں کا بھی تو میرے بابے کو ثواب پہنچے گا۔

بولی: یہ دو جہانوں کا سردار ہے' اسے لے جاؤ' پڑھو' ثواب کماؤ اور موج کرو۔

(۴) میں بوریوالے جاؤں تو ان سے ملنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک دن گیا اور ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نوجوان باہر نکلا۔ اس سے مولانا کا پوچھا تو کہا بازار گئے ہیں۔ میں نے اپنا نام بتایا اور کہا جلدی سے بلا لاؤ۔

تھوڑی دیر بعد وہ نوجوان آیا اور کہا آرہے ہیں----- میں وہیں کھڑا رہا۔ مولانا آئے اور حسبِ معمول نہایت تپاک سے ملے۔ فرمایا بچے نے مجھے کہا کہ میں مہمان کو مسجد میں بٹھا دوں؟ میں نے کہا نہیں----- میں آرہا ہوں' مہمان جہاں کھڑے

ہیں' وہیں کھڑے رہنے دو۔ وہ مسجد والے نہیں ہیں۔

(۵) ۔ان کے دروازے کے سامنے کار کھڑی تھی ۔۔۔۔۔ اس کی طرف اشارہ کر کے کہا یہ گاڑی میں نے خریدی ہے۔ یہ میری ہم عمر ہے ۔۔۔۔۔ میرے گھٹنوں میں اب درد ہونے لگی ہے۔ اس گاڑی کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی گاؤں میں کسی کے ہاں بچہ پیدا ہو اور وہ اس کے کان میں اذان دینے کے لیے مجھے لے جانا چاہے تو میں اس گاڑی پر چلا جاتا ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی عقیقے یا نکاح یا ولیمے پر بلائے تو یہ گاڑی مجھے لے بھی جاتی ہے اور پھر لے بھی آتی ہے۔

وہ زندہ دل اور وسیع القلب عالم ہیں ۔۔۔۔۔ میں جب بھی ان سے ملا اور جہاں ملا' بہت ہی کھلے دل سے ملے اور بے حد اپنایت کا اظہار کیا۔ عمل و اخلاق کی اس سطح کے علما سے اب دنیا تیزی سے خالی ہو رہی ہے ۔۔۔۔۔ اسی اخلاق اور اسی کردار کے لوگوں کی تبلیغ اور طریق گفتگو سے اسلام پھیلا اور لوگوں کے سامنے کتاب و سنت پر عمل کی راہیں کشادہ ہوئیں۔ اسلام کی ترویج عذوبتِ لسان اور لطافت کلام کی خواہاں ہے۔ سختی' تشدد اور لاٹھی ڈنڈے سے نفرت پیدا ہوتی ہے اور یہ حرکتیں لوگوں کو اسلام سے دور ہٹانے کا باعث بنتی ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے مبلغین اسلام نے تلخی اور سختی کی راہ کو اپنایا ہے' ملک میں جھگڑے فساد نے سر اٹھا لیا ہے اور قتل و غارت تک نوبت پہنچ گئی ہے۔

جو شخص ایک میٹھا بول نہیں بول سکتا' زبان کو نرمی کے جوہر سے آشنا نہیں کر سکتا' لوگوں کی نفسیات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور وعظ و تبلیغ میں مخاطب کی ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا' اسے اسلام کی تبلیغ کے بجائے' کوئی اور دھندا کرنا چاہیے ۔۔۔۔۔ اہل حدیث مبلغین کو بالخصوص اپنے طرز عمل پر غور کرنے کی ضرورت ہے' ان کے پیش نظر صاحب حدیث (ﷺ) کا اسوہ و عمل رہنا چاہیے اور انھیں سوچنا چاہیے کہ آنحضرت کس انداز میں فریضہ تبلیغ سر انجام دیتے تھے اور آپؐ کے صحابہ کرام کا کیا نہج کلام تھا۔

پھر یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ ہر دور' ہر مقام اور ہر معاشرے میں طریق تبلیغ بدل جاتا ہے' جس طرح معاشرہ بدلتا اور حالات میں تغیر رونما ہوتا ہے' اسی طرح اسلام کی نشر و اشاعت کا اسلوب بھی تبدیلی سے دوچار ہوتا ہے۔

بے شک مولانا عبداللہ گورداس پوری انسانی نفسیات کے بہت بڑے ماہر نہیں ہیں'

انھیں ملکی سیاسیات سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے‘ کسی بیرونی ملک میں بھی طریق تبلیغ کا انھیں بہت زیادہ تجربہ نہیں ہے‘ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ اس دور کے بہترین مبلغ ہیں‘ وہ لوگوں کی ذہنی اور فکری سطح کے مطابق بات کرتے ہیں‘ وہ معاشرے کی بیماریوں اور کمزوریوں کی صحیح نشان دہی کرتے ہیں اور پھر اس کا جو علاج تجویز کرتے ہیں‘ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہوتا ہے ---- میں نے ان کی بہت سی تقریریں سنی ہیں اور اسی نقطہ نظر سے سنی ہیں۔

ان کے میٹھے انداز کی تقریروں ہی کا نتیجہ ہے کہ بوریوالہ میں ان کے ہم مسلک لوگوں میں بہت اضافہ ہوا ہے اور اہل حدیث کے نقطہ نظر کے حاملین کی تعداد کافی بڑھی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ان کا اصل میدان وعظ و تقریر ہے۔ تحریر و نگارش کے وہ زیادہ عادی نہیں ہیں‘ تاہم جماعت اہل حدیث کے بعض اخباروں میں کبھی کبھار ان کے مضامین شائع ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کا مجھے علم نہیں‘ البتہ میں ان کے مضامین دلچسپی سے پڑھتا ہوں‘ جن سے اکابر علما کے بارے میں بعض نئی باتیں مطالعے میں آتی ہیں جو معلومات میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔

مولانا عبداللہ کے بارے میں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ صرف وعظ و تقریر ہی کو کافی نہیں سمجھتے‘ بلکہ عمل و حرکت اور جدوجہد بھی ان کی زندگی کے بنیادی اجزا ہیں اور اسلام کے لیے انھوں نے بڑی تکالیف اٹھائی ہیں ------ ۱۹۵۳ء میں مرزائیوں کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی تھی‘ اس میں اس مردِ مجاہد نے اہل حدیث علما و عوام کی طرح پورے جوش و جذبے سے حصہ لیا تھا اور اس کے نتیجے میں گرفتار ہو کر کافی عرصہ جیل میں رہے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں بھی انھوں نے اس نہایت اہم مسئلے میں اپنی خدمات پیش کیں۔ سیفٹی ایکٹ میں بھی انھیں گرفتار کیا گیا۔ ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ کے مطالبے کے سلسلے میں بھی انھوں نے ملک کے بہت سے مقامات کے دورے کیے اور لوگوں کو اس کی برکات سے آگاہ کیا۔ حکومت کو بھی اپنے اندازِ خاص سے ہدفِ تنقید ٹھہرایا۔ جماعت اہل حدیث کی تنظیم کے بارے میں بھی انھوں نے بے حد بھاگ دوڑ کی اور بہت سے مقامات پر جماعتی تنظیمیں قائم کیں۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی اور دیگر تمام اکابر جماعت ان پر اعتماد کرتے اور ان کی بات کو بے حد اہمیت دیتے تھے۔

بلا شبہ اس پر خلوص عالم و مقرر نے خدمتِ اسلام اور اشاعتِ کتاب و سنت کے لیے ہر محاذ پر کام کیا اور ہر موقعے پر جرأت کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔

مولانا عبداللہ کے ماشاء اللہ دس بیٹے بیٹیاں ہیں۔ چار بیٹے اور چھ بیٹیاں ----- بیٹوں کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر — نیو کیسل یونیورسٹی (برطانیہ) میں پروفیسر ہیں

۲۔ حافظ محمد لقمان — فاضل مدینہ یونیورسٹی ----- جامع مسجد اہل حدیث میاں چنوں میں فریضہ خطابت انجام دے رہے ہیں۔

۳۔ ریاض قدیر — کویت میں مصروف خدمت ہیں۔

۴۔ زبیر احمد — بی اے بی ٹی۔ بوریوالہ کے ایک سکول میں معلم ہیں

مولانا کے ان چار صاحب زادوں میں سے میرا زیادہ تعلق پروفیسر ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر سے ہے۔ کسی زمانے میں وہ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ انھوں نے برطانیہ کی نیو کیسل یونیورسٹی سے پی' ایچ' ڈی کیا۔ اس سے کچھ عرصہ بعد وہ جامعہ اسلامیہ بہاول پور کے شعبہ اسلامیات سے منسلک ہو گئے۔ لکھنے پڑھنے کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ مختلف عنوانات سے متعلق کئی رسالے لکھے اور متعدد جرائد و اخبارات میں بہت اچھے مضامین تحریر کیے -----

میں ماہنامہ "المعارف" کا ایڈیٹر تھا اور یہ خالص تحقیقی رسالہ تھا۔ اس میں ان کے متعدد مقالات شائع ہوئے ---- ایک بہترین مقالہ جو اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ تھا' "المعارف" میں اس موضوع پر شائع ہوا کہ مرزا غلام احمد کے دعوائے نبوت کرنے کے بعد ان پر سب سے پہلے ۱۸۹۰ء میں کفر کا فتویٰ حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی نے لگایا تھا ----- یہ مقالہ ۱۹۸۴ء کے "المعارف" کے کسی شمارے میں چھپا تھا۔

پھر حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ بعض حضرات نے جامعہ اسلامیہ بہاول پور میں ان کے خلاف ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ اس کا ایک خاص پس منظر تھا' لیکن کہا یہ گیا کہ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے میں بعض قابل اعتراض چیزیں لکھی گئی ہیں' حالاں کہ اس وقت مقالے کی تکمیل پر کئی سال گزر چکے تھے۔ مگر قابل اعتراض چیزیں انھیں اب نظر آئی تھیں۔ اللہ حسد و رقابت سے سب کو محفوظ رکھے۔

قصہ مختصر یہ کہ وہ بہاول پور یونیورسٹی سے نکل کر برطانیہ کی نیو کیسل یونیورسٹی میں چلے گئے اور اپنی جگہ خوش و خرم ہیں۔

مولانا عبداللہ گورداس پوری سراپا خلوص واعظ و مبلغ ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے اہل و عیال کو خیر و عافیت سے نوازے رکھے۔ آمین

# ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

۱۹۶۴ء کی سردیوں کا موسم تھا کہ ایک دن صبح کے وقت ایک صاحب اپنے کسی دوست کی رفاقت میں میرے گھر تشریف لائے- میں ان دنوں لوہاری دروازے کے اندر ڈاک خانے کے قریب رہتا تھا- بائیس تیئس سال کی عمر' میانہ قد' بڑی عمدگی سے کتر بیونت کی ہوئی چھوٹی سیاہ داڑھی' سرخی مائل رنگ' کتابی چہرہ' خوب صورت نقش و نگار' روشن آنکھیں' چوڑا ماتھا' معتدل جسم' لہجے کی شائستگی اور زبان کی روانی سننے والے کو متاثر کرتی تھی- پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوئے------ یہ تھے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری جو کراچی سے لاہور آئے تھے-

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری پاکستان کے معروف مصنف و مولف ہیں- اللہ نے ان کو ذہانت و قابلیت کے جوہر سے خوب نوازا ہے اور ان کی علمی اور تصنیفی خدمات بے حد لائق تحسین ہیں-

ڈاکٹر صاحب کے والد کا اسم گرامی محمد حسین خاں تھا- وہ پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور دراصل صوبہ سرحد کے رہنے والے تھے- اس قبیلے کے بعض افراد پانچویں مغل حکمران شہاب الدین محمد شاہ جہان کے عہد حکومت میں ترک وطن کر کے بہتر روزگار کی تلاش میں ہندوستان کے صوبہ یوپی میں چلے گئے تھے- اس قبیلے کی ایک شاخ کے سربراہ کا نام نواب بہادر خاں تھا- قصبہ شاہ جہان پور کی بنیاد انھی نواب بہادر خاں نے رکھی تھی- مغل حکومت کی طرف سے وہاں انھیں بہت بڑی جاگیر عطا کی گئی تھی- اس جاگیر کے علاوہ انھوں نے اور اس خاندان کے دیگر افراد نے اپنی ہمت و محنت سے اور بھی بہت کچھ حاصل کر لیا تھا اور یہ لوگ ہر قسم کی دنیوی آسودگی اور مادی آسائش سے بہرہ مند ہو گئے تھے- اسی شہر شاہ جہان پور میں ۳۰ جنوری ۱۹۴۰ء کو ڈاکٹر ابوسلمان پیدا ہوئے- والدین نے ان کا نام تصدق حسین خاں رکھا- تعلیم کا آغاز وہیں ہو گیا تھا-

قدرت کی نیرنگیاں دیکھیے کہ جس خاندان کے اکابر نے شاہ جہان پور کی بنیاد رکھی

اور اسے آباد کیا تھا' ایک وقت آیا کہ اس کے اسلاف اس کی سکونت ترک کرنے پر مجبور ہو گئے- چنانچہ قیام پاکستان سے تقریباً تین سال بعد مئی ۱۹۵۰ میں اس خاندان کے کچھ لوگوں نے جو صدیوں سے شاہ جہان پور میں آباد تھے' اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہہ کر اپنے قومی وطن پاکستان کی طرف مراجعت کی- ان لوگوں میں تصدق حسین خاں کا گھرانا بھی شامل تھا- تصدق حسین خاں کی عمر اس وقت ساڑھے دس سال تھی- پاکستان آکر خاندان کے مختلف افراد بری طرح بکھر گئے- کچھ پنجاب میں آباد ہو گئے' بعض نے صوبہ سرحد کا عزم کیا اور کچھ لوگوں نے سندھ کے مختلف شہروں اور قصبوں میں سکونت اختیار کر لی- تصدق حسین خاں اور ان کے بڑے بھائی کچھ عرصہ تو تلاش روزگار کے لیے سندھ کے بعض علاقوں میں گھومتے رہے' آخر کراچی چلے گئے اور وہیں اقامت گزیں ہو گئے-

پاکستان آنے کے چند سال بعد تصدق حسین خان نے تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا تو ۱۹۶۲ میں میٹرک کا امتحان دیا اور ۱۹۶۸ میں بی اے' پھر ۱۹۷۰ میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) پاس کیا- اس سے دس سال بعد ۱۹۸۰ میں سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی-

اب ان کی ملازمت کی طرف آیئے- فروری ۱۹۷۲ء میں سندھ ایجوکیشن سروس سے وابستہ ہوئے- آج کل کراچی کے ایک گورنمنٹ ڈگری کالج کے شعبہ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے ہیں-

تحریر و نگارش سے انھوں نے سترہ سال کی عمر میں ۱۹۵۷ء میں رابطہ پیدا کیا اور اسی دور میں اپنا اصل نام تصدق حسین خاں ترک کر دیا- پہلے "ابو سلمان الہندی" کے نام سے لکھنا شروع کیا- پھر "الہندی" کا لاحقہ بدل کر اپنے وطن مالوف شاہ جہان پور سے نسبت قائم کر لی اور "ابو سلمان شاہ جہان پوری" کے نام سے مشہور ہوئے- اب یوں سمجھیے کہ اصل نام یہی ہے اور اسی سے پہچانے جاتے ہیں- تصدق حسین خاں کا کسی کو علم نہیں-

۱۹۵۷ء سے ۱۹۹۷ء تک چالیس برس کے عرصے میں انھوں نے ادب' تاریخ' مذہب' سیاست' سوانح' صحافت وغیرہ موضوعات سے متعلق پچاس سے زیادہ کتابیں شائع کیں جو اہل علم کے مطالعے میں آئیں- ان کتابوں میں ان کی تصنیفات بھی شامل ہیں اور وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو ان کی کوشش و محنت سے ترتیب و تدوین کے مراحل سے گزریں

اور جن پر انھوں نے گراں قدر مقدمات و حواشی تحریر کیے۔

اگر چہ ان کا پیشہ ورانہ تعلق اردو زبان و ادب سے ہے، لیکن ان کا علمی و تحقیقی کام زیادہ تر سیاست اور تاریخ سیاست کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ واضح لفظوں میں کہنا چاہیے کہ ان کی سعی و کاوش کا اصل میدان یہی ہے۔ اس میں سے بھی ان کا خاص موضوع جس سے یہ بے حد دلچسپی رکھتے ہیں، ۱۹۴۷ء تک کی برصغیر پاک و ہند کی قومی و انقلابی شخصیات اور سیاسی تحریکات سے متعلق ہے۔ ان شخصیات میں سے انھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کے بارے میں خاص طور سے کام کیا اور ان کا یہ کام پاک و ہند میں خوب پھیلا اور لوگوں کے علم و مطالعے میں آیا۔ تاہم حجم و ضخامت کے اعتبار سے ان کا زیادہ تر کام مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق ہے۔ جو نہایت مستند اور بہت سی معلومات پر مشتمل ہے۔

ان کی پہلی کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی، جس میں لائف انشورنس کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ دوسری کتاب ۱۹۶۲ء میں معرض اشاعت میں آئی جو مولانا ابوالکلام آزاد کے حالات میں "امام الہند" کے نام سے موسوم ہے۔ تیسری کتاب کا نام ہے "مکاتیب ابوالکلام آزاد" یہ کتاب مولانا کے مکتوبات پر مشتمل ہے۔ چوتھی کتاب ہے۔ "مولانا ابوالکلام آزاد ------ ایک شخصیت، ایک مطالعہ" ان کتابوں کے علاوہ مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، عبدالرحمن پشاوری، مولانا دین محمد وفائی، سردار محمد امین خاں کھوسو وغیرہ حضرات سے متعلق بارہ تیرہ کتابیں لکھیں یا مرتب کیں۔

قومی تحریکات کے سلسلے میں انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ترکی خلافت اور حجاز میں مقامات مقدسہ کے تحفظ کی تحریک، انجمن خدام کعبہ و تحریک خلافت و ترک موالات، تحریک ہجرت، مولانا ابوالکلام آزاد کی نظم جماعت کی تحریک، مولانا عبید اللہ سندھی کا سرور اجیہ حکومت کا پروگرام اور بعض اسکیمیں۔ مولانا غلام رسول مہر اور پاکستان کی اسکیم وغیرہ متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

پھر اردو کی ترقی میں مولانا ابوالکلام آزاد کا حصہ، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابوالکلام آزاد بہ حیثیت مفسر و محدث، افادات آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد (سیرت اور

کارنامے) مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین' مولانا محمد علی اور ان کی صحافت- مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت- مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور کتاب "انڈیا ونس فریڈم" پر حواشی اور ایک مبسوط مقدمہ- اس میں وہ تیس صفحات بھی شامل ہیں جو پہلے روک لیے گئے تھے' پھر ۱۹۸۸ء میں شائع کیے گئے- شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ' مولانا احتشام الحق تھانوی کی آپ بیتی-

اس طرح یہ پچاس سے زائد کتابیں ہیں جن میں ان کی تصنیفات بھی شامل ہیں اور مرتبات بھی---! ان کتابوں کے علاوہ مولانا عبید اللہ سندھی کے مکاتیب ترتیب دیے' سید سلیمان ندوی اور مولانا محمد علی جوہر کے بعض اہم مکتوب مرتب کیے- علامہ اقبال کے وہ خطوط مرتب کیے جو انھوں نے مختلف اوقات میں سید سلیمان ندوی کے نام تحریر کیے- ان کے متعدد مقامات پر حواشی رقم کیے- مولانا عبدالماجد دریا بادی کے علمی و ادبی خطوط مکاتیب ماجدی کے نام سے ترتیب دیے اور ان پر ضروری حواشی لکھے اور طویل مقدمہ تحریر کیا- مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفتہ وار اخبار پیغام بذریعہ عکسی طباعت شائع کیا جو ۱۹۲۱ء میں مولانا کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا اور خلافت کمیٹی کا ترجمان تھا' اس کے ایڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے- مولانا ابوالکلام آزاد کے ماہنامہ "لسان الصدق" کی عکسی طباعت کا اعزاز بھی انھیں حاصل ہے- مولانا آزاد' علامہ اقبال' مولانا محمد علی جوہر اور مولانا عبدالماجد دریا بادی پر تحریر کردہ مضامین "پانچ مقالے" کے نام سے شائع کیے- مولانا آزاد کے ابتدائی دور کے مضامین اور ان کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ "ارمغان آزاد" کے نام سے شائع کیا-

تصنیفات و تالیفات کے علاوہ انھوں نے پاکستان اور ہندوستان کے بہت سے رسائل و جرائد میں مختلف عنوانات پر بے شمار مضامین سپرد قلم کیے- مثلاً معارف (اعظم گڑھ) برہان (دہلی) اردو ادب (علی گڑھ و دہلی) فکر و نظر (علی گڑھ) ہماری زبان (علی گڑھ و دہلی) جامعہ (دہلی) مدینہ (بجنور) الجمعیت (دہلی) سب رس (حیدر آباد دکن) خدا بخش لائبریری جرنل (پٹنہ) دور حیات (بمبئی)

اسی طرح پاکستان کے اخبارات و رسائل میں سے اردو' اردو نامہ' قومی زبان' افکار' فکر و نظر' العلم' جنگ' حریت' جسارت' الرحیم' الولی' مہران' ترجمان الحدیث' محدث' میثاق' ترجمان اسلام' الاعتصام' چٹان' الحق' خدام الدین' المنبر' نصرۃ العلوم اور دیگر بہت سے

اخباروں اور رسالوں میں بے شمار مضامین لکھے۔

ان کا سب سے پہلا مضمون ہفت روزہ ''چٹان'' (لاہور) میں چھپا تھا۔ یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء تک ''چٹان'' میں ان کے بے شمار مضامین چھپے۔ بعض رسائل و جرائد میں ان کے مضامین و مقالات ان کے اصلی نام سے اور بعض میں فرضی ناموں سے چھپے اور مختلف عنوانات پر چھپے۔

مجلّاتی صحافت سے بھی ایک عرصے تک ان کا تعلق رہا' مثلاً ماہنامہ ''امام'' سے ۱۹۵۸ سے ۱۹۶۶ تک منسلک رہے۔ سہ ماہی اردو میں ۱۹۸۵ سے ۱۹۸۹ء تک خدمت انجام دی' گورنمنٹ نیشنل کالج کراچی کے سال نامہ ''علم و آگہی'' میں کام کیا۔ ''علم و آگہی'' کے سال ناموں میں انھوں نے متعدد تحقیقی مضامین لکھے' جن سے اہل علم نے استفادہ کیا۔ اس کے چھ سات خاص نمبر شائع کیے' جن میں مولانا محمد علی جوہر' قائداعظم محمد علی جناح' تحریک پاکستان۔ علمی' ادبی اور تعلیمی ادارے۔ تحریکات ملی اور پاکستان میں تعلیم و تدریس کے مسائل کے متعلق نمبر شامل ہیں۔

ان کے علاوہ ماہنامہ الولی حیدر آباد (سندھ) کے دو ضخیم نمبر مولانا عبیداللہ سندھی کے حالات و خدمات کے متعلق مرتب کیے اور ایک نمبر مولانا دین محمد وفائی کی حیات و سیرت اور افکار و خدمات کے موضوع پر ترتیب دیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' ان کا مستقل پیشہ ورانہ تعلق سندھ ایجوکیشن سروس سے ہے' لیکن اس کے علاوہ کئی علمی و تحقیقی اداروں سے تعلق رہا' مثلاً انجمن ترقی اردو پاکستان کے شعبہ قاموس الکتب میں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۰ء تک ریسرچ فیلو اور ۱۹۸۵ء سے ۱۹۸۹ء تک انجمن کے ریسرچ جرنل اردو کے نائب مدیر رہے۔ ۱۹۸۰-۱۹۸۱ میں ایک سال نیشنل لینگویج اتھارٹی (پاکستان) میں معاون علمی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اب کئی سال سے مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان اور مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ آخرالذکر دونوں ادارے پرائیویٹ ہیں۔

مختلف اوقات میں کراچی' لاہور اور اسلام آباد میں منعقدہ سیمناروں میں شرکت کی اور

ان میں قرآنیات، تاریخ، سیاست، شخصیات، لسانیات اور قومی مسائل کے عنوانات پر مقالے پڑھے۔

دہلی کے ایک سیمینار میں بھی انھیں دعوت دی گئی تھی جو مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق منعقد کیا گیا تھا، اس سیمینار میں خود تو شامل نہیں ہو سکے تھے، لیکن مقالے لکھ کر بھیج دیے تھے جو وہاں پڑھے گئے۔

ایک سیمینار ایبٹ آباد میں مفتی محمود پر ہوا تھا، اس میں بھی خود شریک نہیں ہو سکے تھے، البتہ سیمینار کا اہتمام کرنے والی انجمن کے ذمہ داروں کو مقالہ بھیج دیا تھا۔

دہلی اور ایبٹ آباد کے سیمناروں میں بھیجے گئے یہ مقالے سیمناروں کی روداد وں کے ساتھ الگ مجموعوں میں اور اخبارات و جرائد میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کی ابتدائی تربیت اور ذہنی نشو و نما خالص مذہبی گھرانے اور دینی ماحول میں ہوئی، لیکن وہ پاکستانی سیاست کے طویل و عمیق مشاہدے، اپنے علمی مطالعے اور غور و فکر کے بعد مذہبی انتہا پسندی اور سیاست میں فرقہ وارانہ انداز فکر، فرقہ وارانہ تنظیم اور مذہب کے نام پر سیاسی عمل کے شدید مخالف ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ سیاسی مسائل کو سیاسی اصولوں کے مطابق حل کرنا چاہیے اور مذہبی معاملات کو مذہبی بنیادوں کی روشنی میں موضوع فکر بنانا چاہیے۔ ان کے خیال میں فرقہ واریت کی بنیاد خواہ نسل اور وطن ہو، خواہ مذہب، تہذیب اور زبان ہو، ملک اور انسانیت کے لیے سخت نقصان کا باعث ہے۔

ڈاکٹر صاحب صاف بیان اہل علم ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر پاکستان میں کبھی انقلاب نہیں آسکتا۔ پاکستان میں حنفیوں کی اکثریت ہے۔ لیکن حنفیوں کے اسلامی اور فقہی اصولوں پر ہرگز انقلاب بپا نہیں ہو سکے گا۔ اپنے اپنے مذہبی نقطہ نگاہ سے ملک میں انقلاب کا نعرہ بلند کرنے والی جماعتوں کے طرز عمل سے انتشار تو بے شک ابھرے گا جو لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کرے گا، لیکن اتحاد کی فضا کبھی پیدا نہیں ہو سکے گی۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ سیاست کے ہر مقام پر مذہب کا استعمال اور کسی خاص مسلک کے مطابق قانون کی ترویج کے لیے تگ و دو ملک میں اختلاف اور افتراق کو جنم دے گی، جس کے نتائج نہایت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ ملک کی فلاح و بہبود کا تقاضا یہ ہے

اور حکومت کا استحکام اسی میں مضمر ہے کہ پیش آئند مسائل پر قومی نقطہ نظر سے غور کیا جائے اور اسی سوچ کو بنیادی نصب العین قرار دیا جائے' حکومتی اور قانونی و آئینی اعتبار سے کسی خاص مذہبی زاویہ نگاہ کو معیار فکر نہ ٹھہرایا جائے۔

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے ۱۹۵۷ء سے لے کر اب تک ماشاء اللہ بہت لکھا ہے اور ان شاء اللہ آئندہ لکھیں گے۔ بعض حضرات ان کے بے حد مداح ہیں' انھوں نے ان کے کام کا جائزہ لیا ہے' اور اس کی تحسین کی ہے' اور ان کی تصنیفات کے مختلف گوشوں کی وضاحت کی ہے' لیکن بعض حضرات نے ان پر سخت تنقید کی ہے اور ان کی تصنیفی خدمات کے بعض پہلوؤں کو نقد و جرح کا نشانہ بنایا ہے ----- لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو انہی کے ساتھ مخصوص ہو۔ جو شخص بھی تصنیف و تالیف کے میدان میں اترتا اور تحریر و نگارش کی وادیوں میں قدم زن ہوتا ہے' اسے مختلف رجحانات کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے' کوئی اس کی تعریف کرتا ہے اور کوئی اسے ہدف تنقید ٹھہراتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں قسم کے لوگ اس کے محسن ہیں۔ تعریف کرنے والے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور تنقید کرنے والے اسے مزید سوچنے کا موقع دیتے ہیں' بشرطیکہ تنقید خلوص پر مبنی ہو۔ اس میں رقابت اور بغض و عناد کا جذبہ کار فرمانہ ہو۔

یہاں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ لکھنے والے کا اصل قاری وہی ہوتا ہے جو اس پر تنقید کرتا ہے۔ وہ اس کا ہر لفظ پڑھتا اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ بے شک وہ اس کی تحریر سے غلط نتائج اخذ کرے اور ایسے مطالب کا استنباط کرے جو لکھنے والے کے ذہن و فکر کے کسی گوشے میں بھی نہ ہوں' مگر اس کا اصل قاری وہی ہے۔

ناقد بھی کئی قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو قوت برداشت سے محروم ہیں' انھوں نے ایک چیز اپنی منشا اور اپنے ذہن کے خلاف دیکھی اور بھڑک اٹھے' پھر اس کی مخالفت میں جو دل میں آیا کہنا شروع کر دیا۔

دوسرے وہ جنھوں نے اپنے دماغ میں حسد کے جراثیم پال رکھے ہیں' ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ فلاں شخص نے فلاں موضوع پر کیوں لکھا ہے' اس کی تنقید بلکہ تنقیص کرنی چاہیے۔ اس ذہن و فکر کے لوگ خود تو کچھ کر نہیں سکتے اور نہ کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر تنقید و تنقیص میں بڑے تیز ہیں اور اس کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ جو کچھ

کسی نے لکھا اس پر تنقید کا کلہاڑا چلانا شروع کر دیا- یہ پیشہ ور ناقد بلکہ "ناقص" کہلاتے ہیں اور ان کے فکر و فہم کا کاروبار اسی پر چلتا ہے- انھیں معذور سمجھنا چاہیے کیوں کہ علمی اعتبار سے ان کے گزر بسر کا اصل ذریعہ یہی ہے- اگر وہ اسے ترک کر دیں تو ان کے پاس کوئی چیز باقی نہیں رہتی- انھوں نے اپنے ذہن کی تربیت ہی ایسی کی ہے جس کا نتیجہ تنقید و تنقیص اور مخالفت ہی ہو سکتا ہے-

تیسرے وہ جن کی تنقید میں مخالفت یا تنقیص کا نہیں بلکہ اصلاح اور خلوص کا عنصر پایا جاتا ہے- ان کی تنقید بالکل برحق ہوتی ہے لیکن اس صاف ستھرے ذہن کے ناقد اب کہاں ہیں ---- یہ اس قسم کے ناقدوں کا نہیں بلکہ "ناقصوں" کا دور ہے- بہر حال لکھنے والے کو سب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے- اللہ ان سب کو خوش رکھے اور جو انداز اظہار انھوں نے اپنا رکھا ہے وہ انھیں مبارک ہو اور اس پر وہ قائم و دائم رہیں ----

یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو شخص کسی کو ہدف تنقید ٹھہراتا یا اسے مستحق تحسین قرار دیتا ہے اس نے اس کے باوجود اور اس کی قوت استدلال کو مان لیا ہے- اگر اسے نہ مانا ہوتا تو کسی عنوان سے اس کا ذکر ہی نہ کرتا-



اصل معاملہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جو موضوع اپنے لیے منتخب کر رکھا ہے اور اپنے علم و مطالعہ اور تحقیق کی روشنی میں جس نقطہ فکر کے وہ حامل ہیں اس سے کچھ لوگوں کا ان سے اختلاف کرنا بلکہ اس کے بعض پہلوؤں پر بیخ پا ہونا قدرتی بات ہے-

ہر شخص کا اپنا ذہن اور اپنی سوچ ہے اور اپنا پیمانہ فکر ہے- میں یہ سمجھتا ہوں اور میرے ساتھ ہزاروں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے گزشتہ چالیس بیالیس سال میں جو مواد برصغیر پاک و ہند کے اہل علم کو دیا ہے اور جس زبان و انداز میں دیا ہے اور جس شائستگی اور حسن اسلوب میں دیا ہے وہ قابل قدر اور لائق توصیف ہے- میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے پاس ان کی تمام تصنیفات و تالیفات یا مرتبات و مدونات موجود ہیں لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ ان کی بہت سی کتابیں میرے پاس موجود ہیں اور میں نے ان کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے- حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ہزاروں قارئین کی طرح میں نے ان سے استفادہ کیا ہے اور ان سے متاثر ہوا ہوں-

وہ شگفتہ قلم اور شائستہ بیان مصنف ہیں- الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے خزانۂ ذہن

میں محفوظ ہے- جملوں کا دروبست نہایت عمدہ اور اظہار مدعا کا طریقہ بڑا دل آویز----- وہ سنجیدہ فکر اہل قلم اور پختہ ذہن کے مصنف ہیں-

انھوں نے بہت سی نایاب و نادر کتابوں سے لوگوں کو متعارف کرایا اور ان پر مناسب انداز میں مقدمات و حواشی لکھ کر قارئین پر بے حد احسان کیا ہے-

حلقہ اہل علم کی ایک مشہور شخصیت جناب محمد عالم مختار حق صاحب نے مولانا غلام رسول مہر کے وہ مضامین مرتب کیے ہیں جو برصغیر پاک و ہند کے مختلف رسائل و جرائد میں مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں شائع ہوئے ہیں- یہ مضامین "مولانا ابوالکلام آزاد- ایک نادر روزگار شخصیت" کے نام سے مہر سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ- ۱۳- سلام سٹریٹ- مسلم ٹاؤن' لاہور کی طرف سے کتابی شکل میں شائع کیے گئے ہیں- ان میں مولانا آزاد کی شخصیت اور حیات طیبہ کے بہت سے پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے---- ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے اس پر ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے' جس میں مولانا آزاد اور مولانا مہر کے فضل و کمال اور ان کے ذاتی اور علمی و فکری روابط کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے-

۱۹۹۷ء میں ڈاکٹر صاحب نے جو کتابیں مرتب کیں' ان میں چند مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں-

## ۱- نقوش و آثار:

یہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ان تاریخی و سیاسی خطوط اور احکام و ہدایات کا مجموعہ ہے جو نیشنل آرکائیوز آف انڈیا نئی دہلی میں محفوظ ہیں----- یہ تمام تحریریں مولانا کے زمانہ وزارت کی ہیں اور آئی سی سی آر کی فائلوں اور دیگر ذرائع سے ماخوذ ہیں- ان میں ایک خط ملک غلام محمد (سابق) گورنر جنرل پاکستان کے نام ہے جو ۲۳ مئی ۱۹۵۳ء کا تحریر فرمودہ ہے ----ملک غلام محمد اکتوبر ۱۹۵۱ء سے اگست ۱۹۵۵ء تک پاکستان کے گورنر جنرل رہے- ۲۹ اگست ۱۹۵۶ء کو ان کا انتقال ہوا-

دو خط راجا غضنفر علی کے نام ہیں- یہ اس زمانے کے خطوط ہیں جب انھیں پاکستان کی طرف سے ہندوستان کا سفیر مقرر کر کے بھیجا گیا تھا- راجا صاحب نے ۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء کو وفات پائی-

تیسرا خط محمد علی بوگرا کے نام ہے-وہ اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم تھے جو اپریل ۱۹۵۳ء سے اگست ۱۹۵۵ء تک اس منصب پر فائز رہے------ان کی وفات ۲۳-جنوری ۱۹۶۳ء کو ہوئی-

محمد علی بوگرا نے مولانا کو کوئی خط تحریر کیا تھا- مولانا نے اس کا جواب دیا ہے یہ خط ۲۳-مئی ۱۹۵۳ء کا رقم فرمودہ ہے-

اس کی تفصیل اس مضمون میں ملاحظہ فرمایئے جو اسی کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق لکھا گیا ہے-

یہ کتاب جو ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے ''آثار و نقوش'' کے نام سے شائع کی ہے' مولانا کے دو سو چالیس سرکاری خطوط و ہدایات کا مجموعہ ہے- اس میں راجستان اور پنجاب کے گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کے نام بھی متعدد خطوط درج ہیں جن میں لدھیانہ' راجستان اور گوڑگاواں وغیرہ کی مسجدوں کی واگذاری کے لیے لکھا ہے- سرہند میں حضرت مجدد الف ثانی کے مزار کی مرمت کے لیے بھی ہدایات دی گئی ہیں------یہ نہایت دلچسپ مجموعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مولانا کس انداز میں خدمت کرتے تھے اور ان کی تکلیف سے انھیں کس قدر تکلیف پہنچتی تھی- کتاب پر ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کا طویل مقدمہ ہے' اور مختلف خطوط و ہدایات پر فاضل مرتب نے حواشی تحریر کیے ہیں- یہ کتاب ۲۴۲ صفحات پر مشتمل ہے- اس کے مطالعے سے آج سے سینتالیس اڑتالیس برس پہلے کے دور کی بے شمار باتوں کا پتا چلتا ہے-

## ۲-جامع الشواہد فی دخول غیر المسلمین فی المساجد:

ہندوستان کی انگریزی حکومت سے ترک موالات اور عدم تعاون کا سلسلہ پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوا تھا اور برصغیر میں وہ ہندو مسلم اتحاد کا دور تھا- اس زمانے میں مسلمان گوردواروں میں اور مندروں میں جاتے اور انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے تھے' اسی طرح ہندو مساجد میں جا کر غیر ملکی اقتدار کی مخالفت میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے تھے- بعض لوگوں کو اعتراض تھا کہ غیر مسلموں کو مسجد میں نہیں لے جانا چاہیے' اس لیے کہ وہ قرآن کی رو سے نجس اور پلید ہیں' انھیں مسجدوں سے دور رکھا جائے- مولانا

ابوالکلام آزاد نے اس ضمن میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس کا نام "جامع الشواہد فی دخول غیر المسلمین فی المساجد" رکھا تھا۔ یہ رسالہ پہلی دفعہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا، اس میں مولانا نے شرعی دلائل سے ثابت کیا تھا کہ غیر مسلموں کا مسجدوں میں داخل ہونا اور وہاں منعقد ہونے والی مجلسوں میں شمولیت کرنا جائز ہے۔

یہ رسالہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے اپنے طویل مقدمے کے ساتھ ۱۹۹۷ء میں شائع کیا ہے۔ فاضل مرتب نے مقدمے میں اس دور کے سیاسی حالات پر تفصیل سے بحث کی ہے جو نہایت معلومات افزا ہے۔ اس رسالے کی تدوین و تقدیم ڈاکٹر صاحب کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ مرتب کے مقدمے سمیت یہ رسالہ ۱۷۵ صفحات پر محیط ہے۔

## ۳۔ انڈیا ونس فریڈم:

یہ مولانا آزاد کی انگریزی کتاب ہے، جس کا اردو ترجمہ "ہماری آزادی" کے نام سے جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر محمد مجیب مرحوم نے کیا تھا۔ کتاب کے انگریزی اور اردو ایڈیشن کئی دفعہ چھپ چکے ہیں۔ مولانا کی دیگر کتابوں کی طرح اس کتاب نے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی۔

یہ کتاب متعدد ناشروں نے شائع کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے بالکل دوسرے انداز سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے۔ اس پر دو طویل مقدمے درج ہیں، ایک مقدمہ خود فاضل مرتب ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری نے لکھا ہے۔ دوسرا مقدمہ مولانا آزاد کے "صدیق مکرم" نواب حبیب الرحمٰن شروانی کے لائق پوتے ڈاکٹر ریاض الرحمٰن شروانی کا ہے۔ قلعہ احمد نگر سے "غبار خاطر" کے لازوال خطوط مولانا نے انہی نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام لکھے تھے۔

یہ دونوں مقدمے بہت سے سیاسی اور علمی معلومات کو اپنے دامن صفحات میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کے شائع کردہ اس ایڈیشن میں وہ تیس صفحات بھی شامل ہیں جن کے متعلق فیصلہ کیا گیا تھا کہ مولانا کی وفات سے تیس سال بعد (۱۹۸۸ء) میں معرض اشاعت میں لائے جائیں گے۔ کتاب کا یہ ایڈیشن دوسرے ایڈیشنوں سے مختلف اور بہت سی نئی معلومات پر مشتمل ہے۔ کتاب ۳۷۸ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

## ۴- مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے چند بزرگ دوست اور عقیدت مند:

یہ کتاب بھی اپنی جگہ بڑی اہمیت کی حامل ہے- اس میں مولانا آزاد کے بعض دوستوں کا تعارف کرایا گیا ہے- کتاب کے صفحات میں پورے ایک دور کی تاریخ اور ایک عہد کی سیاسی، علمی اور صحافتی سرگرمیوں کا احاطہ کر لیا گیا ہے- اس کی ترتیب اس طرح ہے-

| | |
|---|---|
| ۱- غالب اور ابوالکلام آزاد | از محمد عتیق صدیقی |
| ۲- مولانا آزاد پر سرسید کے اثرات | از پروفیسر خلیق احمد نظامی |
| ۳- سرسید احمد خاں مولانا ابوالکلام کی نظر میں | از ابو سلمان شاہ جہان پوری |
| ۴- شبلی اور ابوالکلام | از معین الدین احمد انصاری |
| ۵- شبلی اور ابوالکلام | از پروفیسر مسعود الحسن |
| ۶- علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں | از ابو علی اثری- (اعظم گڑھ) |
| ۷- مولانا آزاد اور مولانا غلام رسول مہر | از ابو سلمان شاہ جہان پوری |
| ۸- مولانا آزاد اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی | از ابو سلمان شاہ جہان پوری |
| ۹- مولانا ابوالکلام آزاد اور شورش کاشمیری | از پروفیسر ابوالکلام خواجہ |
| ۱۰- مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک محقق- مالک رام | از ابو سلمان شاہ جہان پوری |

۱۷۶ صفحات کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے اور ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کے فن ترتیب کا اعلیٰ نمونہ-

## ۵- کلیاتِ آزاد:

یہ کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کی شاعری کو اجاگر کرتی ہے، اس میں ان کا وہ تمام کلام درج کر دیا گیا ہے جو ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کو میسر آیا- کتاب کے لائق مولف و مرتب نے مقدمے میں مولانا کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا ہے اور جہاں جہاں ان کا کلام چھپا ہے، اس کی نشان دہی کی ہے اور ان حضرات کا ذکر کیا ہے، جن سے مولانا نے اپنے فارسی اور اردو کلام کے سلسلے میں اصلاح لی- اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ مولانا کے اپنے قلم سے لکھا ہوا کلام درج ہے، یعنی مولانا کے خط کا عکس --- یہ کتاب "ارمغان آزاد" سے بہت مختلف

ہے-

## ٦-ابو النصر آہ کا کلام:

مولانا کے بڑے بھائی غلام یاسین ابو النصر آہ تھے-وہ بہت اچھے شاعر تھے اور چھوٹی عمر میں وفات پا گئے تھے-ڈاکٹر صاحب نے ان کا کلام بھی جمع اور مرتب کر دیا ہے اور ان کے حالات بھی قلم بند کیے ہیں-

بہر کیف ڈاکٹر صاحب نے نہایت محنت سے بہت سی کتابیں تصنیف کیں یا ترتیب دی ہیں اور یہ کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں-

اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے اور زیادہ سے زیادہ کام کے مواقع عطا فرمائے-وہ عالی ظرف اور حوصلہ مند اہل قلم ہیں-خوش مزاج اور خوش اخلاق-

میرے کم و بیش چھتیس سال سے ان سے مراسم ہیں-میں نے ان کو اصحاب علم کا انتہائی قدر دان پایا ہے-وہ ۱-۹ علی گڑھ کالونی کراچی میں قیام پذیر ہیں-اپنی تمام کتابیں انھوں نے خود شائع کی ہیں جو مکتبہ شاہد' ۱-۹ علی گڑھ کالونی کراچی ۷۵۸۰۰ سے مل سکتی ہیں-

وہ وضع دار آدمی ہیں اور ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ جس سے ایک دفعہ تعلقات قائم ہو گئے' وہ قائم رہیں-زمانے نے جو چال اختیار کر لی ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئندہ اس وضع کے لوگوں کا ملنا بہت مشکل ہو گا-

انسانوں کی فکری تربیت اور ذہنی نشو و نما کا بھی ایک خاص موسم' خاص دور اور خاص ماحول ہوتا ہے-آثار بتاتے ہیں کہ وہ موسم اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ختم ہو گیا' وہ دور اپنی سب خوبیوں سمیت رخصت ہو گیا اور وہ ماحول اپنے ہر نوع کے اوصاف کے ساتھ رخت سفر باندھ گیا-زمانے کے تیور بدل گئے اور وقت کی رفتار دگرگوں ہو گئی-اب اس قسم کے اصحاب تحقیق شاید پیدا نہیں ہوں گے' جن پر اعتماد کیا جا سکے اور جو صاف ستھرے انداز میں اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوں' جو اپنے سے اختلاف کرنے والوں کی بات ٹھنڈے دل سے سننے کی ہمت رکھتے ہوں اور جن میں حریف کے نقطہ نظر کو برداشت کرنے کا حوصلہ پایا جاتا ہو-اہل علم کی کمی تو بے شک نہیں ہو گی' لیکن ان اوصاف

کے حامل لوگوں کی تعداد یقیناً گھٹ جائے گی، جن کی تحقیقی کاوشوں پر بھروسا کیا جا سکے۔

ضیاء الحق کے دور سے کراچی فسادات کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری بھی اس کی زد میں آگئے۔ فسادی عناصر نے ان کے گھر پر حملہ بول دیا اور اسے آگ لگا دی۔ آگ نے جہاں ان کے تمام گھریلو سامان کو اپنی لپیٹ میں لیا، وہاں ان کا کتب خانہ بھی جلا دیا۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا جو انھیں پہنچا اور بہت بڑا حادثہ تھا جس سے وہ دو چار ہوئے۔ ہزاروں کتابیں جل گئیں، بے شمار مسودات راکھ کا ڈھیر ہو گئے اور بہت سے اہم کاغذات چند لمحوں میں نذر آتش ہو گئے۔ اس حادثے کی خبر اخبارات میں پڑھی تو بے حد افسوس ہوا اور میں نے ان کو خط لکھا ----- حادثے کی جو تفصیل کراچی کے اخباروں میں چھپی تھی، میرے خط کے جواب میں انھوں نے اس کے تراشے بھیجے اور مندرجہ ذیل مکتوب ارسال کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

۱۴ دسمبر ۱۹۸۶ء کو علی گڑھ کالونی میں آتش زنی اور لوٹ مار میں میرے مکان اور کتب خانے کے جلنے کے الم ناک حادثے پر آپ نے جو دلی ہمدردی اور تاسف کا اظہار فرمایا ہے، وہ آپ کی علم دوستی اور خاک سار کے ساتھ آپ کے اخلاص و محبت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کے اخلاص و محبت کے لیے شکر گزار ہوں۔

خاک سار

ابو سلمان

اس خط سے پتا چلتا ہے کہ وہ نہایت صابر و ضابط شخص ہیں ----- اتنے بڑے نقصان پر بھی وہ گھبرائے اور مضطرب نہیں ہوئے۔ جو اللہ کو منظور تھا، وقوع پذیر ہو گیا۔ اضطراب کا اظہار کرنے اور پریشان ہونے سے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکتی اور جو واقعہ ہو چکا ہے، اس کا تدارک ممکن نہیں۔

میرے جب سے ان کے ساتھ تعلقات قائم ہوئے ہیں، ان سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہے اور میرا خیال ہے ان کے تمام خطوط میرے پاس محفوظ ہیں ----- اگر میری

غلطی سے ضائع بھی ہوئے ہوں گے تو بہت کم۔

۱۹۹۶ء کے آخر میں شخصیات سے متعلق میری کتاب "نقوش عظمت رفتہ" شائع ہوئی تو ان کی خدمت میں بھیجی گئی' انھوں از راہ کرم مطالعہ کیا اور ۹ فروری ۱۹۹۷ کو مجھے خط لکھا' جس میں میری نہایت حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

کتاب کے ناشر مکتبہ قدوسیہ کو بھی اسی قسم کا خط لکھا' لیکن ان دونوں خطوط کا تعلق چوں کہ میری ذات سے ہے' اس لیے انھیں یہاں درج کرنا مناسب نہیں۔

وہ لاہور تشریف لائیں تو مجھ سے ضرور رابطہ پیدا کرتے ہیں اور پھر متعدد موضوعات پر باتیں ہوتی ہیں ------ ایک مرتبہ صبح نو بجے کے قریب دفتر (ادارہ ثقافت اسلامیہ) پہنچ گئے' میں انھیں اچانک دیکھ کر بڑا متحیر ہوا' پوچھا کب آئے؟ کہا آج ہی آیا ہوں۔ سامان پروفیسر محمد سرور جامعی کے ہاں رکھا' وہیں ناشتا کیا اور اب تمھارے پاس آگیا۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے محاضرات قرآنی میں شرکت کے لیے آئے۔ مجھے ٹیلی فون پر اطلاع دی تو میں ان کی قیام گاہ پر ۳۶ کے' ماڈل ٹاؤن پہنچا اور کافی دیر سلسلہ گفتگو جاری رہا ------ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" کے بارے میں مقالہ پڑھنا تھا ----- میں بھی محاضرات میں مدعو تھا اور مجھے بھی کسی موضوع پر گزارشات پیش کرنا تھیں۔

لاہور میں وہ بعض دفعہ بالکل پنجابی لباس یعنی شلوار قمیص زیب تن کرتے ہیں اور بعض اوقات پاجامہ اور شیروانی پہن کر خالص یوپی بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ علمی خدمات کے مواقع فراہم کرے۔ وہ نہایت خوش اطوار' خوش خصال' شستہ قلم اور شگفتہ مزاج دوست ہیں۔

# آنے والے مجموعوں میں شامل چند اہم شخصیات



علامہ احسان الٰہی ظہیر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مولانا عبدالقادر رائے پوری

مفتی محمد شفیع

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

پروفیسر عبدالقیوم ملک

ملک حسن علی جامعی

امتیاز علی عرشی

بشیر احمد ڈار

ڈاکٹر حامد خاں حامد

حکیم محمد عبداللہ

# نقوشِ عظمتِ رفتہ

محترم محمد اسحاق بھٹی صاحب کی مختلف شخصیات کے خاکوں پر مشتمل پہلی کتاب نقوش عظمتِ رفتہ کے نام منظر عام پر آچکی ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل شخصیات کا تذکرہ شامل ہے۔

سید محمد داؤد غزنوی
مولانا محمد اسماعیل سلفی
مولانا محمد عطاءاللہ حنیف بھوجیانی
مولانا عبدالقدوس میواتی
مولانا احمد علی لاہوری
خواجہ عبدالوحید
سید محمد متین ہاشمی
سید ابوالحسنات قادری
قاضی حبیب الرحمٰن منصورپوری
ڈاکٹر محمد ایوب قادری
مولوی شمس الدین

حافظ محمد گوندلوی
مولانا کرم الٰہی
مولانا عبدالخالق قدوسی
مولانا عبیداللہ سندھی
مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری
خواجہ عبدالحی فاروقی
حمید نظامی
کوثر نیازی
گیانی ذیل سنگھ
سحر گل خاں